ماہنامہ

ذرا تال سُر کے ساتھ

(فوٹو فضل الرحمن)

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی

جلد ٦ جنوری ١٩٦٩ء شمارہ ١

ایڈیٹر

محمد حسین حسّان ندوی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر نئی دہلی ٢٥

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اردو بازار دہلی ٦

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنسس بلڈنگ بمبئی ٣

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

شمشاد مارکیٹ علیگڈھ

قیمت سالنامہ ٢/-

سالانہ چندہ ٦/-

عام پرچہ ٠/٦٠

نیا سال مبارک
نئے سال کی خوشی میں سالنامے کا یہ حسین تحفہ قبول کیجیے۔
ہم بڑی خوشی سے اس مبارک موقعے پر ـــــ پچھلے سال کی طرح اس سال بھی ـــــ آپ کے لیے اچھی اور عمدہ کتابوں پر معقول رعایت کا اعلان کرتے ہیں۔
اگر آپ نیچے دی گئی کتابوں میں سے ـــ پانچ یا اس سے زیادہ روپوں کی کتابیں منگوائیں گے تو ہم آپ سے محصول ڈاک نہیں لیں گے اور اس طرح آپ کو کم از کم سوا روپے کی بچت ہو جائے گی۔
اس رعایت سے آپ اور آپ کے دوست سب ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اپنی پسند کی کتابوں کا نام اور ان کی قیمت ـــ منی آرڈر فوراً بھجوایئے۔ منی آرڈر ۱۵ فروری سے پہلے پہلے بھیجیے۔ ہاں ایک خاص بات اور ـــ خط کے شروع میں یہ ضرور لکھ دیجیے
س، پ، ت
مذھب
رسول پاک ۱/۵۰
سرکارِ دو عالم ۲/۰۰
نبیوں کے قصے ۱/-
چار یار ۱/۳۰
مسلمان بیبیاں ۰/۷۵
کہانیاں
ابو خاں کی بکری ۲/۵۰
پاک کہانیاں (۲ حصے) ۲/۳۰
ترکوں کی کہانیاں ۰/۵۵
چقماق کی ڈبیا ۰/۴۰
چاند بی بی ۰/۳۱
اس نے کیا کر نہ جانا ۰/۳۷
چپاوت کا آدم خور شیر ۰/۳۵
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا ۰/۳۰
مزے دار پہیلیاں ۰/۶۵
سفید ہاتھی ۰/۲۵
شاہی موچی ۰/۲۵
گلنار بیگم ۰/۳۱
گھڑی ساز کی بیٹی ۰/۲۵
نیلم ۰/۳۷
بچوں کی کہانیاں ۰/۳۷
مزہ چکھائیں گے ۰/۳۵
ننھا ٹٹو ۰/۳۰
چنبیلی ۰/۵۰
ناول
کوے وا وا ۱/۷۵
تین اناڑی ۱/۴۰
جن حسن عبدالرحمن (۲ حصے) ۴/۰۰
ڈاکو کی گرفتاری ۰/۵۰
خیالی پلاؤ ۱/۷۵
معلومات
انوکھا عجائب خانہ (۴ حصے) ۱/۸۰
خبر رسانی کے طریقے ۰/۸۵
مقناطیس کی کہانی ۰/۴۴
قدرت کے کرشمے ۰/۶۲
چٹانوں کی کہانی /۷۵
ہماری پارلیمنٹ /۵۰
رابندر ناتھ ٹیگور /۲۵
دادا نہرو /۵۰
سمندر کے کنارے ۱/۳۰
سمندر کے نیچے /-
ڈرامے
پریم کی جیت /۳۷
شمو کی عید /۵۰
کیمپ فائر کی نقلیں (دو حصے) /۵۰
آؤ ڈراما کریں /۶۰
اپنی فرمائش اور منی آرڈر اس پتے پر بھیجیے
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

فہرست

پیامیوں کو عید مبارک۔ عجیب اتفاق ہے اس مرتبہ اس سنہ عیسوی میں تین بار عید کی خوشیاں نصیب ہوئیں۔ اسی کو کہتے ہیں حسنِ اتفاق!

اور ہاں نیا سال بھی مبارک! یہ نیا سال خدا کرے ہمارے آپ کے لیے نئی خوشیاں لائے۔ ہم میں اچھے اچھے کام کرنے، آگے بڑھنے، ترقی کرنے کے حوصلے پیدا ہوں، جوش اور ولولہ پیدا ہو۔ آمین

پرانا سال رخصت ہوا۔ اس میں پیامِ تعلیم کی مقبولیت بڑھی۔ آپ نے بھی اپنے پرچے میں خوب دلچسپی لی۔ خریدار بھی اچھے خاصے بڑھے مگر اتنے نہیں کہ پیامِ تعلیم اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ کاش آپ اس سال اس طرف پوری توجہ فرمائیں اپنے پیامِ تعلیم کے لیے مستقل زندگی کا سامان ہم پہنچائیں ہر پیامی ایک ایک خریدار بھی بنا دے تو آپ کا پیامِ تعلیم کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔

نئے سال کی خوشی میں سالنامہ کا تحفہ قبول کیجیے۔ ہم نے آپ کی دلچسپی کے لیے اس گلدستے کو طرح طرح کے پھولوں سے سجایا ہے۔ خدا کرے یہ آپ کو پسند آئے۔ ہماری محنت ٹھکانے لگے۔

اچھا تو آئیے سب سے پہلے تو نیر صاحب کی نظم پڑھیے

نئے سال پر کتنی مزیدار ہے۔ پھر تایا جان یوسف ناظم صاحب کا "مشورہ" پڑھیے۔ اللہ رکھے تایا جان نے آپ کو اچھے اچھے مشورے دیے ہیں۔ غور سے پڑھیے اور انھیں دھیان میں رکھیے۔ مولانا عبدالسلام قدوائی صاحب نے وقار الملک مرحوم کی انسان دوستی کی کہانی لکھی ہے۔ بہت سبق آموز ہے۔ بہت انوکھی ہے۔

پھر ہمارے پرانے بہت ہی پرانے سرپرست سید ابو تمیم صاحب فریدآبادی کا مضمون "ماموں جان کے دانت" کیسے مزے کی چیز ہے۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہے گا۔ محترم ٹونکی صاحب نے "قلندر" کے عنوان سے مغلیہ سلطنت کے بانی بابر کی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کا خاص انداز میں ذکر کیا ہے۔ خدا ہمیں آپ کو بھی یہ حوصلہ عطا فرمائے۔

محترم غلام ربانی صاحب نے مغلوں کے سیر وشکار کا حال لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ اب سے تین چار سو برس پہلے کن کن طریقوں سے شکار کھیلا جاتا تھا۔

ہمارے محترم بزرگ پروفیسر اکبرالدین صاحب ہر سال آپ کو حیدرآباد کی کسی تاریخی عمارت کی سیر کراتے ہیں۔ اب کے انھوں نے ہزار کھم والے دیول (مندر) کا حال لکھا ہے

اور جناب منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اظہر افسر کا ڈرامہ پڑھیے

مزاحیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ ایک ڈرامہ سلیم تمنائی کا ہے۔ یہ بھی تُک کا ہے۔

محترمہ صبا حنفی ہماری نئی مضمون نگار ہیں "جب شہروں میں جنگل تھے" ان کا دوسرا مضمون ہے۔ "ڈیا چڑیا گھر" پر کیسے اچھے انداز سے لکھا ہے۔ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ محترمہ آصفہ مجیب نے اس مرتبہ حضرت شیخ سعدیؒ پر مضمون مرحمت فرمایا ہے شیخ سعدیؒ کے علاوہ چند اور بڑی شخصیتوں کا حال بھی سالنامہ میں پڑھیے۔ مثلاً ہیلن کیلر، ڈاکٹر ہنی مین (موجد ہومیوپیتھک) سید احمد شہیدؒ۔

محترم غلام یزدانی نے اس مرتبہ کرۂ ہوائی کا حال بہت سہل سادہ اور دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ خالد عرفان صاحب نے بجلی کے کھیلوں سے آپ کا جی بہلانے کی کوشش کی ہے۔ قیصر سرمست صاحب نے بتایا ہے کہ جانور اپنی حفاظت کے لیے کیا طریقے اختیار کرتے ہیں۔ شہود مفتی صاحب نے دنیا کی سب سے ننھی چڑیا کا خاکہ کھینچا ہے۔ فرزانہ انصاری نے مکڑیوں پر لکھا ہے، مزاحیہ انداز میں لکھا ہے، سائنس کے مضمون کو ہنسی کھیل بنا دیا ہے۔

اور پھر جناب کاغذ کی کہانی، کتاب کی کہانی اور دنیا کی سب سے بڑی لائبریری کا حال پڑھیے۔ یہ تینوں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ کتاب کی کہانی ہمارے نئے مضمون نگار جمیل قریشی صاحب نے لکھی ہے۔ یہ ہماری جامعہ لائبریری میں کام کرتے ہیں۔

۱۹۴۷ء سے پہلے پیام تعلیم میں بہت سے مشغلوں پر مضمون چھپتے تھے۔ خاص طور پر ڈاک کے ٹکٹوں پر ڈاکٹر شمیم بہاری نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس نئے دور میں ہم نے باغبانی سے شروعات کی تھی۔ اس پرچے میں آپ ڈاک کے ٹکٹوں پر ایک دلچسپ مضمون پڑھیں گے۔ ایک مضمون آٹوگراف (دستخط) جمع

کرنے پر ہے۔ یہ بھی بہت پرانا مشغلہ ہے مگر اردو میں اس مشغلے پر کوئی مضمون نظر سے نہیں گزرا۔

اچھا اور کشمیر کی سیر کیجیے۔ اتھوپیا کی سیر کیجیے۔ سوڈان کی ایک دلچسپ شادی کا حال پڑھیے۔ مزے مزے کی کہانیاں اور لوک کہانیاں پڑھیے۔ اور پھر نظمیں! کیسی اچھی اچھی نظمیں!! نئے سال پر اور دوسرے دلچسپ عنوانوں پر۔

اس دفعہ سالنامے کی ترتیب میں معمول کے خلاف بڑی دقتوں بڑی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارے محترم مدیر سید احمد ولی صاحب کی آنکھوں میں تکلیف ہو گئی۔ کاتب صاحب کی انگلی پک گئی، عین وقت پر میں خود فلو کا شکار ہو گیا۔ اچھا ہوں لیکن کمزوری باقی ہے سب سے آخر میں ڈاکخانے کے انتظام میں خلل پڑ جانے سے بہت پریشانی ہوئی مضمون نگاروں کو کئی کئی خط لکھے گئے کہیں پہنچے کہیں نہیں پہنچے۔ بہت سے اچھے مضمون دیر میں ملے۔ انھیں اسباب سے یہ پرچہ آپ کو کچھ دیر میں ملے گا۔

آخر میں ہم اپنے تمام ساتھیوں کے شکر گزار ہیں انھوں نے ہر طرح ہماری مدد کی خصوصاً دینا ناتھ جی تو ہر وقت ہماری مدد کو تیار رہے پھر جناب جاوید اشرف کے، جناب گلیڈون میسی صاحب کے۔ پیام تعلیم کا ٹائٹل اس مرتبہ جاوید میاں نے بنایا ہے۔ ولی صاحب باوجود آنکھوں کی تکلیف کے وقتاً فوقتاً مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔

عادل جعفری صاحب نے اس مرتبہ تین خریدار مرحمت فرمائے ہیں، تین خریدار معین صاحب لیکچرر ٹیچرس کالج جامعہ اور تین رئیس احمد خاں صاحب نے مرحمت فرمائے ہیں۔ ان سب کا دلی شکریہ

جناب محمد شفیع الدین نیّر

نیا سال مُبارک

نیا سال آیا، مبارک ہو سب کو — نیا دور لایا، مبارک ہو سب کو
ہم اس وقت سب مل کے خوشیاں منائیں — یہ اللہ سے اپنے مانگیں دعائیں
خدایا۔ نئے سال کا یہ اثر ہو — کہ سال اپنا سارا خوشی میں بسر ہو
خوشی پھول ہر سمت برسا رہی ہو — فضائیں خوشی ہر طرف چھا رہی ہو

رہیں تندرستی کی خوشیاں میسر — ہو کام اپنا اس سال بہتر سے بہتر
ترقی کریں علم میں اور ہنر میں — بلندی ہو پیدا ہماری نظر میں
مشقت سے محنت سے گھبرا نہ جائیں — مصیبت میں ہمت کے جوہر دکھائیں
سائنس کا علم، یا وہ ادب ہو — ہمارا ہی بھارت میں جھنڈا نصب ہو
ہر مقصد، معیّن ہو منزل — ہو تکمیل میں اس کی اپنا لگا دل
وقت اپنا بیکار جھگڑوں میں جائے — نہ مشکل میں بل اپنے ماتھے پہ آئے
ڈھونڈھیں کسی غیر کا ہم سہارا — ہو اپنے ہی بازو پہ تکیہ ہمارا

کریں جان اور دل سے خدمت وطن کی — بڑھے اپنی کوشش سے عظمت وطن کی
ہیں جن کے تعلیم کے ہم پیامی — ملے کامیابی ملے نیک نامی
نئے ساز پر ہم نئی گت بجائیں — نیا کام کر کے نیا نام پائیں

مبارک ہو سب کو نیا سال نیّر
خوشی کے چراغوں سے روشن ہو گھر گھر

مشورہ

جناب یوسف ناظم

بچوں کو ایک بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے وہ یہ کہ لاڈ اور پیار کی باتیں کرنی ہوں تو ماں سے کریں اور عقل کی کوئی بات کرنی ہو تو باپ سے کریں۔ اگر انھوں نے لاڈ کی بات، ابا سے کی، اور عقل کی بات امی سے تو انھیں پچھتانا پڑے گا۔ کیوں کہ قدرت نے کچھ ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ مائیں لاڈ اور پیار کی باتیں سن کر بہت خوش ہوا کرتی ہیں۔

زبان سے چاہے وہ کچھ بھی کہیں لیکن چھوٹی عمر کے بچوں کا تو کوئی سوال ہی نہیں، بڑی عمر کے بچوں سے بھی بچکانا باتیں سن کر ان کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہتا۔

مثلاً ناشتہ کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد کوئی بچہ یہ کہے کہ امی بھوک لگی ہے، کچھ دیجیے۔ تو پہلی مرتبہ تو یہ ہوگا کہ امی ایسا ظاہر کریں گی جیسے انھوں نے سنا ہی نہیں۔ بچہ دوبارہ وہی بات کہے گا تو امی صرف مڑ کر اس کی طرف دیکھ لیں گی۔ لیکن امی کے صرف مڑ کر دیکھ لینے سے بچے کی بھوک نہیں مٹ جاتی، اور جب وہ تیسری مرتبہ امی سے کہے گا کہ امی کچھ دیجیے نا۔ تو امی زبان سے تو یہی کہیں گی۔ اے لو ناشتہ کر کے ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا کہ انھیں بھوک لگ گئی۔ اِن کے لیے تو ہمیشہ چھٹے بیٹھے تیار ہی رہنا چاہئیں۔ باتیں وہ ایسی ہی کریں گی لیکن نعمت خانہ کھول کر کوئی نہ کوئی چیز اپنے لاڈلے بیٹے کو ضرور دیں گی۔

وہ بچے کو نہ صرف کھانے کی چیز دیں گی بلکہ ان کی کوئی سہیلی ملنے آجائے تو اس سے بھی شکایت بھرے لہجے میں کہیں گی۔ ہمارا منّا تو ایسا خراب ہوگیا ہے کہ جب دیکھو اسے کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے چاہیے۔ میں کتنا کہتی ہوں کہ پیٹ بھر کر کھانا کھایا کرو تو وہ اس سے ہوتا نہیں۔ ہر دو منٹ کو البتہ کیلے، بسکٹ اور چیکو، کی بھوک اسے ضرور لگتی ہے۔

پھر امی منّے میاں کی طرف دیکھ کر کہیں گی۔ ہنس بھی رہا ہے اپنی حرکتوں پر، آنٹی بیٹھی ہیں نا اس لیے کچھ مانگا نہیں۔ امی کی یہ ساری شکایتیں دکھاوے کی ہوتی ہیں۔ ورنہ وہ اصل میں یہ کہنا چاہتی ہیں کہ دیکھو بی بی میں اپنے بچے کا کتنا خیال رکھتی ہوں۔

ماؤں سے لاڈ کرنے کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہوتا۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی لاڈ شروع کر دینا چاہیے اور

رات تک جاری رکھنا چاہیے۔ صبح جب امّی آواز دیں "نجو
بیٹی اب اٹھ جاؤ، سات بج رہے ہیں۔"

یہ سن کر نجو بیٹی کو کہنا چاہیے :" اونہہ امّی۔
ٹھہریئے بھی۔ بس یہ خواب تھوڑا اور دیکھ لوں۔ اور
بستر چھوڑنے کے بعد امّی سے شکایت کرنی چاہیے۔
"امّی آپ بھی عجیب ہیں۔ میں اتنا اچھا خواب دیکھ رہی تھی
آپ نے سارا کھیل بگاڑ دیا ـــــ ایک بہت بڑا
باغ تھا۔ ہرے بھرے درخت تھے۔ ہر طرف پھول ہی
پھول تھے۔ میں سیب کے درخت سے ایک سیب توڑ کر
کر کھانے ہی والی تھی کہ آپ نے جگا دیا۔ امّی ایسے لال
لال سیب تھے کہ بس۔ مزے میں میٹھے ہی ہوں گے لیکن
آپ نے کھانے ہی نہیں دئے۔"

امّی یہ سن کر کہیں گی :" نجو بیٹی میں تمھارے لیے
ابھی سیب منگوائے دیتی ہوں۔ خواب میں سیب کھا کر
تم موٹی ہونے سے تو رہیں۔ اچھا جاؤ، منھ ہاتھ دھو کر
تیار ہو جاؤ۔ میں ناشتہ بھیجتی ہوں۔"

پھر امّی اپنی پرانی ماما سے کہیں گی۔ یہ نجو بھی
کتنی بھولی ہے۔ مجھے تو ڈر ہی لگتا ہے۔ اس کی باتیں
سن کر اس کی سہیلیاں اسے نظر نہ لگا دیں۔ اور میں
تو سمجھتی ہوں اسے بہت جلد نظر لگتی ہے۔ جبھی تو ہر دوسرے
تیسرے دن اسے زکام ہو جاتا ہے۔ (امّی یہ نہیں سوچتیں
کہ ان کی نجو دن بھر فریج میں سے ٹھنڈا پانی پی پی کر اپنا
حلق خراب کرتی رہتی ہے)

پرانی ماما امّی کی باتیں سن کر ہنسے گی اور
کہے گی :" بی بی نجو بی بی بالکل آپ پر گئی ہیں۔ آپ بھی
جب چھوٹی تھیں۔ بستر میں سے نکلنے پر راضی ہی نہیں
ہوتی تھیں اور بڑی بیگم آپ کے پلنگ کی پٹی پر آپ
کی خوشامد کیا کرتی تھیں۔"

اپنی پرانی ماما سے یہ بات سن کر پھولے نہیں
سمائیں گی اور نجو بیٹی کے پراٹھے پر تھوڑا سا گھی اور چھڑک
دیں گی۔

یہ تو چھوٹوں کی باتیں ہوئیں لیکن بڑی عمر
کے بچوں کو بھی لاڈ کی باتیں ماں ہی سے کرنی چاہئیں
سینما جانے کی اجازت ممّی ہی سے ملتی ہے۔ عمدہ کپڑے
بھی ممّی ہی کے دربار سے فراہم ہوتے ہیں۔ ابّا سے کوئی
کام لینا ہے تو امّی ہی کی سفارش کی ضرورت پڑتی ہے۔
ابا اور بچوں کے بیچ میں امّی سفیر کی طرح کے فرائض انجام
دیتی ہیں۔ امّی اگر بچوں کے معاملے میں سفارش کرنا چھوڑ
دیں تو بچوں کے آدھے کام یونہی رہ جائیں۔

ایک بات البتہ یاد رکھنی چاہیے کہ بچے امّی سے
کبھی کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے یہ ظاہر ہو کہ بچے
امّی کو کوئی نئی بات سکھا رہے ہیں۔ مثلاً اگر شبو میاں
امّی سے یہ کہیں کہ ردّی آپ نے سستے داموں بیچ دی یا
چائے کی پیالیاں مہنگے داموں خرید لیں تو پھر امّی کا سارا
لاڈ پیار ختم ہو جائے گا۔ اور شبو میاں کی وہ خبر لی جائے گی
انھیں دن میں تارے نظر آ جائیں۔ امّی کہیں گی:" ذرا دیکھو
اس لڑکے کو ٹانگ برابر کا ہے نہیں اور مجھے حساب
سکھا رہا ہے۔ اپنے آپ کو افلاطون سمجھتا ہے۔"

شبو میاں کہیں گے :" امّی افلاطون کو حساب
سے کیا تعلق۔ حساب کا ماہر تو آئن اسٹائن تھا۔"

امّی کے غصے کا پارہ اور اوپر چڑھ جائے گا۔
شبو میاں پر برس پڑیں گی :" بس چپ رہو۔ میں جب
ردی لے جانے کے لیے کہتی ہوں تو کوئی تیار نہیں ہوتا
اور بعد میں سب قابلیت بگھارنے کے لیے تیار ہو جاتے

ہیں ۔ اب ٹھہرو تو میں گھر میں اخبار ہی آنا بند کر دیتی ہوں ۔ نہ اخبار آئے گا اور نہ ردی نکلے گی ——— بیٹے میں دُو دُو پیالیاں خود توڑتے ہیں اور پھر ڈھٹائی سے کھڑے رہ کر کہتے ہیں کہ میں مہنگی خرید کر لاتی ہوں ۔ جیسے سارے بازار کے دام انھیں ہی معلوم ہیں ۔"

اب شبو میاں کی خیریت اسی میں ہے کہ چپکے سے کہیں نکل جائیں ——— شبو میاں کو بالکل نہیں چاہیے تھا کہ وہ امّی سے بھاؤ تاؤ کی بات کرتے ۔

بھاؤ تاؤ کی باتیں ابا سے کرنی چاہئیں ۔ ابا کے حضور میں لاڈ کی باتیں نہیں چلتیں ۔ ایک دن بشیر میاں نے ابا سے سینما جانے کی اجازت مانگی تو ان پر وہ بے بھاؤ کی پڑی ہیں کہ پھر ان کا دل سینما جانے کو چاہا ہی نہیں ۔ کہاں سینما کی اجازت اور کہاں پورے اسکول کی ہسٹری ۔ ان کے ابا نے وہ تناڑا کہ بشیر میاں سمجھ ہی نہیں سکے کہ ان سے کیا قصور ہو گیا ۔ دنیا کے سارے ابا بالکل ڈی ۔ ایس ۔ پی کی طرح کے ہوا کرتے ہیں ۔ کبھی کبھار بھولے سے یہ لاڈ کی کوئی بات کر لیتے ہیں ، زیادہ سے زیادہ سال میں دو مرتبہ ۔ ان کا اصول ہوتا ہے خاموش محبت ۔ ایسا نہیں کہ ابا لوگ بچوں کو چاہتے ہی نہیں ۔ چاہتے ضرور ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے ایسا کرنے سے ان کی شان میں فرق آتا ہے ۔

گھر میں حکم تو امّی ہی کا چلتا ہے لیکن بچوں کو ابا کے حضور میں زیادہ ادب قاعدے سے رہنا چاہیے کیونکہ دستخط سب جگہ ابا ہی کے چلتے ہیں ۔

امّی کو بچے ہمیشہ ڈسٹرب کر سکتے ہیں کیونکہ امّی کے سارے کام شور اور ہنگامے ہی میں ہوتے ہیں اباؤں کو گھروں میں کچھ کام نہیں ہوتا ۔ لیکن وہ خاموشی اور ڈسپلن چاہتے ہیں ۔ اس لیے انھیں بالکل ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے ۔ ابا اگر صبح کا اخبار ، شام کو دوبارہ پڑھیں بھی تو کسی بچے کو کچھ پوچھنا نہیں چاہیے کیونکہ بعض ابا صرف خبریں پڑھتے ہی نہیں یاد بھی کرتے ہیں ۔ اور بعض صرف اشتہارات پڑھتے ہیں ۔ کسی بھی اشتہار سے انھیں کچھ لینا دینا نہیں ہوتا لیکن پھر بھی وہ اشتہار پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں ۔

ایسے موقعے پر اگر کوئی بچّہ اُن سے جا کر یہ کہے ۔ ابا جی ۔ ہمارے اسکول سے لڑکے پکنک کے لیے آرے ملک کالونی جا رہے ہیں کیا میں بھی ان کے ساتھ جاؤں ۔ تو ابا جو اس وقت کسی ریڈیوگرام کی فروخت کا اشتہار پڑھ رہے ہوں گے ۔ فوراً جواب دیں گے ۔ تمھارے اسکول میں پکنک کے سوا کچھ اور بھی ہوتا ہے ؟ اور تم ابھی پچھلے مہینے تو ایلیفنٹا کے غار دیکھنے گئے تھے ۔ کیا تم کو پکنک کے کسی مقابلے میں حصّہ لینا ہے ۔ جب دیکھو پارٹی جب دیکھو پکنک ۔ مجھے معلوم ہے تمھاری پچھلی رپورٹ کیسی تھی ——— کیا اس مرتبہ بھی ویسی ہی رپورٹ لانے کا ارادہ ہے ۔ چلیے قصہ ختم ہو گیا ۔

اسی لیے تو ہمارا مشورہ ہے کہ لاڈ پیار کی کوئی بات کرنی ہو تو امّی ہی سے کرو ۔

جناب مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

مدد ایسے بھی کی جاتی ہے

نواب وقارالملک کا نام تو تم نے سنا ہوگا۔ سرسید احمد خاں کے مشہور ساتھی ہیں۔ علی گڈھ کالج کی تعمیر و ترقی میں انھوں نے بڑا کام کیا تھا۔ سرسید کے بعد نواب محسن الملک علی گڈھ کالج کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اور نواب محسن الملک کے بعد نواب وقارالملک کو یہ عہدہ ملا اور انھوں نے بڑی قابلیت، محنت اور ہمت کے ساتھ یہ خدمت انجام دی۔ بڑے ہوکر تم ان کی سوانح عمری وقار حیات پڑھوگے تو تم کو نواب صاحب کی لیاقت، ایمان داری، سچائی، فیاضی بہادری اور کارکردگی کا اندازہ ہوگا اور تمھیں معلوم ہوگا کہ انھوں نے قوم و ملک کی کیسی اہم خدمت کی ہے۔

آج ہم نواب صاحب کا ایک واقعہ تمھیں سنا رہے ہیں۔ جس سے تم کو ان کی ہمدردی اور غریب پروری کا اندازہ ہوگا۔ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن اگر تم اپنی زندگی میں اس مثال کو سامنے رکھوگے تو آگے چل کر تم بھی بڑی عزت اور نیک نامی حاصل کروگے۔

نواب صاحب غریبوں اور حاجت مندوں کا بہت خیال رکھتے تھے اور اپنی دولت کا بڑا حصّہ ان کی مدد میں صرف کرتے تھے لیکن بعض غریب ایسے خود دار ہوتے ہیں کہ فاقوں پر فاقے کرتے ہیں مگر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارا نہیں کرتے۔ ہاتھ پھیلانا تو دور کی بات ہے ان کی خودداری تو یہ بھی گوارا نہیں کرتی کہ چپ چپاتے بھی کوئی ان کی مدد کردے۔ تم نے شاید کبھی اپنے کسی بزرگ کو فارسی کا یہ شعر پڑھتے سنا ہو۔

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بہ پائمردئ ہمسایہ در بہشت

شاعر کسی کی مدد سے جنت میں جانا بھی دوزخ کے عذاب کے برابر سمجھتا ہے بعض لوگ ایسی ہی اونچی طبیعت کے ہوتے ہیں۔ ان کو مرجانا منظور ہوتا ہے۔ مگر کسی کے سہارے زندہ رہنا پسند نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کی مدد کرنا مشکل ہوتا ہے۔

لیکن کسی رحم دل اور انسان دوست شخص کے لیے یہ بھی دشوار ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی پریشانیوں اور تکلیفوں کو دیکھے اور برداشت کرے یہ عجیب نازک وقت ہوتا ہے۔ ایک

طرف حاجت مند کی خودداری اس کو کسی سے کچھ مدد نہیں
لینے دیتی دوسری طرف فیاضی اور انسان دوست امیر کی ہمدردی
اور انسان دوستی اسے چین نہیں لینے دیتی اور مجبور کرتی ہے
کہ جس طرح بھی ہو سکے اس غریب کی پریشانی دور کی جائے
اس مشکل کو حل کرنے کے لیے بڑی سمجھ اور تدبیر سے کام لینا پڑتا ہے
نواب صاحب کو بھی ایک ایسے ہی خوددار غریب
سے سابقہ پڑا۔ دیکھو انھوں نے کس خوش اسلوبی کے ساتھ
اس کی مدد کی اس کی ضرورت پوری ہوتی رہی لیکن اس کو
زندگی بھر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ نواب صاحب کی فیاضی کا نتیجہ
ہے۔

نواب صاحب کے قریب ایک لاوارث اور غریب
بڑی بی رہتی تھیں۔ آمدنی کا کوئی قابل اطمینان ذریعہ نہ تھا
بڑی مصیبت کے دن کٹتے تھے۔ آئے دن فاقہ ہوتا رہتا تھا۔
لیکن اپنی شرافت اور اپنے بزرگوں کی عزت کا اتنا زیادہ
خیال تھا کہ کسی کی مدد لینا گوارا نہ تھا۔ بستی میں بہت سے خوش
حال لوگ تھے۔ وہ ان کی خدمت بھی کرنا چاہتے تھے۔ مگر
بڑی بی کی خودداری روک بن جاتی تھی۔ کسی بڑے سے بڑے
آدمی کی مجال نہ تھی کہ اس غریب عورت کی سرپرستی کا خیال
کر سکے تم نے ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر پڑھا ہوگا۔

غریبی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

اللہ کے پاک بندوں کے بارے میں کہتے ہیں غریبی
میں بھی وہ لوگ اتنے غیرت مند تھے کہ خوش حال لوگوں کو ان
کی غیرت و خودداری کی وجہ سے بخشش کی ہمت نہ ہوتی تھی۔
یہ بڑی بی بس اس شعر کی عملی تصویر تھیں۔ حد سے
زیادہ غریب لیکن اس سے بڑھ کر خوددار اور غیرت مند۔ مدد
کرنے والے بہت تھے مگر کسی کو جرات نہ ہوتی تھی کہ بڑی
بی کی کوئی خدمت کر سکے۔

نواب وقار الملک مرحوم بھی ان کی پریشانیوں کو
سن کر بے چین تھے لیکن ایسی باغیرت خاتون کی مدد کی کوئی
صورت سمجھ میں نہ آتی تھی۔ نواب صاحب برابر سوچتے رہے
آخر ایک راہ نکل آئی۔ معلوم ہوا کہ بڑی بی حضرت شیخ عبدالقادر
جیلانی کی بہت معتقد ہیں۔ محبت اور عقیدت سے ان کا ذکر
کرتی رہتی ہیں اور بڑی پابندی سے ان کا فاتحہ کرتی ہیں
ان کا یہ حال معلوم کر کے نواب صاحب بہت خوش
ہوئے۔ انھیں ان کی خدمت کی راہ نظر آگئی۔ ایک اندھیری
رات میں جب لوگ سو گئے اور بستی میں خوب سناٹا ہو گیا تو نواب
صاحب نے روپیوں کی ایک تھیلی ہاتھ میں لی اور بھیس بدل کر
چپکے سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ خاموشی کے ساتھ بڑی بی
کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اپنی آواز بدل کر انھیں پکارا ۔
"او نیک بخت تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی عقیدت مند
ہے۔ بڑی محبت اور ادب کے ساتھ ان کا ذکر کرتی رہتی ہے
اور ان کا فاتحہ دلا کر ان کی خدمت میں ثواب کا تحفہ بھیجتی رہتی
ہے۔ شیخ تیری اس عقیدت و محبت سے بہت خوش ہوئے ہیں
اور تجھے یہ انعام بھیجا ہے۔"
یہ کہہ کر تھیلی گھر کے اندر پھینک دی۔ بڑی بی شیخ
کی خوشنودی کی اطلاع سے بہت خوش ہوئیں اور بڑھ کر
انعام کی تھیلی اٹھائی، اسے ہونٹوں سے چوما آنکھوں سے لگایا
اور خدا کا شکر ادا کیا۔

اپنی اس تدبیر سے نواب صاحب بہت خوش ہوئے
اور جب تک بڑی بی زندہ رہیں اسی طرح انھیں ضرورت
کے مطابق مدد پہنچاتے رہے اور بڑی بی یہ سمجھتی رہیں کہ
شیخ عبد جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں سے انعام مل رہا ہے۔

یک تجارت یہ بھی ہے :-

حضرت عثمان سے تو تم ضرور واقف ہو گے . رسول
للہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی اور تیسرے خلیفہ ہیں
ن کے حالات بھی تم نے کسی نہ کسی کتاب میں
بڑھے ہوں گے . بڑے مال دار تھے . اسلام لانے کے بعد
ان کی دولت سے مسلمانوں کو بہت فایدہ پہنچا . آج ہم ان
کا ایک عجیب واقعہ سنا رہے ہیں جس سے تمھیں اندازہ ہو گا کہ
ان کی انسان دوستی، خدمت خلق اور نیک نفسی کا کیا حال تھا اگر
آج ان کا نام لینے والے ان کی محبت کا دم بھرنے والے
اور ان کے ساتھ عقیدت رکھنے والے ان کی مثال کو سامنے
رکھیں اور خدا کے بندوں کی خدمت اپنی زندگی کا مقصد بنائیں
تو مسلمانوں کی قسمت بدل جائے .

حضرت عثمان تجارت کرتے تھے ان کا کاروبار
دور دور تک پھیلا ہوا تھا . ایک مرتبہ انھوں نے شام سے
غلہ منگایا . کچھ دنوں کے بعد سینکڑوں اونٹوں پر لدا ہوا اناج
مدینہ منورہ پہنچا اس زمانہ میں مدینہ منورہ میں غلہ کی کمی تھی
غلہ کے سوداگروں کو معلوم ہوا تو چاروں طرف سے دوڑ
پڑے اور غلہ کو خریدنے کی کوشش کرنے لگے حضرت عثمان
سے کہا کہ آپ یہ سارا غلہ ہمارے ہاتھ فروخت کر دیجیے . انھوں
نے پوچھا کہ تم مجھے کتنا نفع دے سکتے ہو . کسی نے کہا . دس
فی صدی، کسی نے بیس فی صد، کوئی بولا "میں ڈیوڑھے پر
سودا کرنے کو تیار ہوں" اسی طرح ایک دوسرے سے بڑھ
چڑھ کر دام لگا رہے تھے لیکن حضرت عثمان کہتے تھے مجھے
تو اس سے زیادہ نفع مل سکتا ہے . سوداگر اور دام بڑھتے
تھے . مگر وہ یہی جواب دیتے تھے کہ یہ تو کم ہے مجھے تو اس
سے زیادہ مل جائے گا . اب سوداگر اور آگے بڑھے اور تگنی
قیمت دینے پر تیار ہو گئے لیکن اب بھی حضرت عثمان نے یہی
کہا کہ مجھے ایک دینے والا اس سے زیادہ دینے کو کہتا
ہے . ان لوگوں نے پوچھا آخر وہ کیا دے رہا ہے . فرمایا
کہ کم از کم دس گنا تو مل ہی جائے گا .

یہ سن کر سوداگر سناٹے میں آ گئے . انھوں نے کہا
ہم تو اتنی ہمت نہیں کر سکتے . آپ اس دس گنا دینے والے
کو دیجیے . یہ سن کر حضرت عثمان نے کہا "سنو میں یہ سارا
غلہ خدا کے نام پر غریبوں کو دے رہا ہوں"

ان کی اس فیاضی نے مدینہ منورہ کے ہزاروں گھروں
میں خوشی کی لہر دوڑا دی اور غریبوں کو نئی زندگی بخش دی .

جناب رشید الوحیدی جامعہ کالج

حضورؐ کی پیدائش

بدی کا زور تھا ہر سو جہالت کی گھٹائیں تھیں
فساد و ظلم کی چاروں طرف پھیلی ہوائیں تھیں

خدا کے حکم سے نا آشنا مکّے کی بستی تھی
گناہ و جرم سے چاروں طرف وحشت برستی تھی

ذرا سی بات پر تلوار جو چلتی تھی آپس میں
تو پھر یہ جنگ آتی ہی نہ تھی دو چار کے بس میں

خدا کے دین کو اک کھیل بچوں کا سمجھتے تھے
خدا کو چھوڑ کر ہر چیز کو معبود کہتے تھے

اگر لڑکی کی پیدائش کا گھر میں ذکر سن لیتے
تو اس معصوم کو زندہ زمیں میں دفن کر دیتے

وہ اپنے ہاتھ ہی سے پتھروں کے بت بناتے تھے
اسی کے سامنے جھکتے اسی کے گیت گاتے تھے

کسی کا نام 'عزیٰ' تھا کسی کو 'لات' کہتے تھے
'ہُبل' نامی بڑے بُت کو بُتوں کا باپ کہتے تھے!

غرض جو بھی بُرائی تھی سب ان میں پائی جاتی تھی
نہ تھی شرم و حیا آنکھوں میں گھر گھر بے حیائی تھی

مگر اللہ نے ان پر جب اپنا رحم فرمایا
تو عبداللہ کے گھر میں خدا کا لاڈلا آیا

عرب کے بتکدوں میں گر پڑے تھرّا کے بت سارے
بجھا ایران کا آتش کدہ بھی خوف کے مارے

عرب کے لوگ اس بچے کا جب اعزاز کرتے تھے
تو عبدالمطلب قسمت پہ اپنی ناز کرتے تھے

خدا کے دین کا پھر بول بالا ہونے والا تھا
محمدؐ سے جہاں میں پھر اجالا ہونے والا تھا

...م ربانی

مغلوں کے سیر و شکار

ایشیا شکار کا گھر ہے، اس میں ہندوستان شکاریوں کی جنت ہے، یہاں کے بہت سے قصّے کہانیاں شکار کے پیچھے گھوڑا ڈالنے سے شروع ہوتی ہیں۔ مغلوں سے پہلے تیر کمان شکار کا بہت بڑا آلہ تھا۔ مگر بابر کے بعد سے یہاں بندوق کا رواج ہوگیا، جس سے شکار میں آسانی پیدا ہوگئی۔

مغلوں کے زمانہ میں جہاں بہت سارے فنوں کو ترقی ہوئی۔ وہاں فن شکار میں بھی بڑی بڑی جدتیں ہوئیں

ان کے عہد میں شکار کا ایک مستقل محکمہ قایم تھا۔ جس کے حالات اس وقت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس موقع پر توزک بابری اور توزک جہانگیری سے کچھ واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ توزک سوانح عمری کو کہتے ہیں۔ بابر اور جہانگیر نے اپنی اپنی سوانح عمریاں لکھی ہیں۔

بابر بڑا اولوالعزم بادشاہ تھا، تقدیر نے اس کے ساتھ مذاق بھی کیا تھا، کئی دفعہ اس پر ایسا وقت پڑا کہ اسے چھپنے کے لیے جگہ نہیں ملتی تھی۔ جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا، شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ اسے جنگل بہت پسند تھا اور قدرتی منظر کا دلدادہ تھا۔ ہندوستان آنے سے پہلے وہ کچھ مدت کابل میں رہا۔ اپنی توزک میں لکھتا ہے۔

"کابل کی نواح میں ہرن کم ہیں، البتہ بہار کے موسم میں ہرنوں کی ڈاریں ملتی ہیں جن کو شوقین کتوں سے شکار کراتے ہیں۔ سرخاب اور گورخر اس نواح میں ملتا ہے۔" آگے چل کر اس علاقہ

کے مختلف جانوروں اور ان کے شکار کے حالات بیان کیے ہیں۔

دریائے باران میں مچھلی کے شکار کی ایک عجیب ترکیب بیان کی ہے۔ لکھتا ہے کہ سردی کے موسم میں یہاں ایک قسم کی گھاس اگتی ہے جب وہ بڑی ہو جاتی ہے اور اس میں پھول کھل کر بیج آجاتے ہیں تو اس کو کاٹ لیتے ہیں اور دس بارہ گٹھے باندھ کر دریا پر لاتے ہیں، یہاں ان کی کٹی کی جاتی ہے، پھر ان ٹکڑوں کو دریا میں ڈال دیتے ہیں اور خود بھی پانی میں اتر جاتے ہیں۔ اس گھاس میں ایک قسم کا نشہ ہوتا ہے جس سے مچھلیاں مست ہو کر اوپر آجاتی ہیں اور اس کثرت سے پکڑی جاتی ہیں کہ ڈھیر لگ جاتا ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ دریا کی طرف کوس بھر چلے تھے کہ ایک اچنبا دیکھا یعنی دریا کی سطح سے آسمان تک ایک سرخ سی چیز دکھائی دیتی تھی اور کبھی غائب ہو جاتی تھی۔ اس کے پاس پہنچنے تک یہی تماشا رہا۔ جب بالکل قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ قازیں ہیں۔ بیس ہزار کے لگ بھگ ہوں گی۔ جب وہ اڑتیں یا پھڑپھڑاتیں تو ان کے لال لال پر کبھی دکھائی دیتے اور کبھی چھپ جاتے تھے یہ نظارہ بہت دلچسپ تھا۔

ایک جگہ لکھتا ہے کہ یہاں ایک قسم کا ہرن ہوتا ہے جس کو کلہرہ کہتے ہیں، اس کی پیٹھ سیاہ اور پیٹ سفید ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس کا نام کلہرہ یعنی کالا ہرن پڑ گیا ہے۔ لوگ اس کو شکار کے لیے پالتے ہیں۔

شکار کی ترکیب یہ ہے کہ اس کے سینگوں میں ایک جال کا حلقہ مضبوط باندھ دیتے ہیں اور ایک خاصا وزنی پتھر اس کے پاؤں میں باندھ کر لٹکا دیتے ہیں تاکہ وہ بھاگ نہ سکے۔ اس کو جنگل میں لے جاتے ہیں اور جہاں جنگلی ہرن نظر آتا ہے۔ اس پر اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ جانور بڑا لڑاکا ہوتا ہے۔ ایک ہرن دوسرے ہرن کو نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ جنگلی ہرن پالتو پر لپکتا ہے اور فوراً اس سے بھڑ جاتا ہے پھر دونوں میں ٹکریں ہوتی ہیں۔ اچھل اچھل کر ٹکر مارتے اور ایک دوسرے کو دھکیلتے ہیں، اس دھکاپیل میں جنگلی ہرن کا سینگ اس جال کے حلقے میں پھنس جاتا ہے۔ جو پالتو ہرن کے سینگ میں بندھا ہوتا ہے اب جنگلی ہرن بھاگ نہیں سکتا، کیونکہ پالتو کے پاؤں میں پتھر بندھا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ بے بس ہو کر پکڑا جاتا ہے۔

انسان بڑا ظالم ہے شکاری جانوروں اور پرندوں سے اپنے لیے شکار کرتا ہے۔ مختلف ملکوں میں کتوں اور چیتوں سے شکار کرانے کا رواج عام تھا

شہنشاہ اکبر کے چیتے خانے میں ایک ہزار چیتے تھے پرانی تصویروں میں اکثر بادشاہوں اور امیروں

کے ہاتھوں پر باز یا شکرے کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔
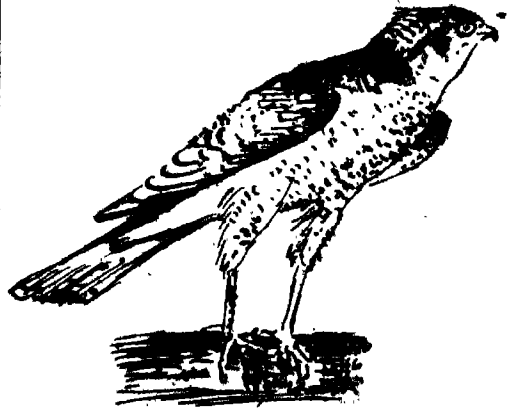
جہانگیر شکار کا رسیا تھا۔ ایک دفعہ اس نے حکم دیا کہ ہمارے سامنے فہرست پیش کی جائے جس سے معلوم ہو کہ ہم نے اب تک کتنے جانور شکار کیے۔ چنانچہ فہرست پیش ہوئی، معلوم ہوا کہ کل شکار کی تعداد ۲۸،۲۲۰ تھی، ان میں ۱۷،۱۶۷ جانور ایسے تھے جن کو خود شہنشاہ نے اپنی بندوق سے شکار کیا تھا۔ چرند جانوروں میں ۳۲۰۳، شیر ۸۶، ریچھ، چیتے اود بلاؤ اور نیل گائے ۸۹۹، ہرن، چکارے، چیتل پاڑے ۱۶۷۰، بھیڑیے ۴۶، ارنے بھینسے ۶۳، سور ۹۰ اور سرخ ہرن ۲۱۵ مختلف پرندے کوئی تیس ہزار تھے۔

ایک جگہ لکھا ہے کہ الہ آباد میں ہم ندی کے کنارے پانی بہت صاف تھا، ہم نے خرم (شاہ جہاں) کو حکم دیا کہ وہ تلوار سے مچھلیاں کاٹے پھر دوسرے سرداروں سے کہا کہ وہ بھی تلواریں چلائیں سب نے تلوار بازی کی۔ شکار کے بعد معلوم ہوا کہ شہزادے نے سب سے زیادہ مچھلیاں کاٹیں، پھر ہم نے وہ مچھلیاں خاص لوگوں کو عنایت کیں۔

جہانگیر عجیب طبیعت لایا تھا، جہاں کوئی اچھی جگہ دیکھتا۔ وہیں ڈیرے ڈال دیتا۔ ایک دفعہ کشمیر میں کسی مقام سے گزر رہا تھا، راستے میں ایک نالا آگیا۔ حکم دیا اس نالے کو کود کر پار کریں۔ اب کیا تھا۔ فوراً بڑے بڑے سردار کودنے لگے، بعض دھڑام دھڑام کرنے لگے، بعض کود گئے۔ جہانگیر نے بھی جست لگائی مگر دھڑام سے پانی میں گر پڑا۔

ہرن بڑا بدنصیب جانور ہے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اس کو شکار کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔ چنانچہ شکار اور ہرن ہم معنی لفظ ہو گئے ہیں۔

پالم جو اب دلی کا ہوائی اڈا ہے۔ مغلوں کی شکارگاہ تھا۔ ایک دفعہ جہانگیر نے پالم کی نواح میں شکار کھیلا اور بارہ دن میں ۶۲۴ ہرن شکار ہوئے یہ سب ہرن چیتوں سے پکڑوائے تھے۔

اپنی توزک میں ایک جگہ جہانگیر نے لکھا ہے کہ ہم مالوے میں شکار کو جا رہے تھے۔ جنگل میں ایک بہت بڑا سانپ دیکھا جو ڈھائی گز لمبا اور ڈیڑھ ہاتھ موٹا تھا۔ ایک خرگوش اس کے منہ میں تھا۔ جب اس کو قراول میرے پاس لائے تو خرگوش اس کے منہ سے نکل گیا۔ ہر چند کوشش

کی گئی کہ وہ خرگوش پھر اس کے منہ میں دیا جائے مگر ایسا نہ ہوسکا۔ آخر میرے حکم سے اس کا پیٹ چاک کیا گیا۔ اتفاق سے اس میں سے ایک پورا خرگوش نکلا۔ اس سانپ کو چیتل (غالباً چیت سانپ) کہتے ہیں۔

مغلوں کے شکار کا ایک طریقہ بہت دلچسپ تھا اس کو قمرغہ کہتے تھے۔ صورت اس کی یہ ہوتی تھی کہ فوج کا ایک بڑا دستہ جنگل کو گھیر لیتا تھا۔ سپاہی تیر کمان، تلوار اور برچھوں سے لیس ہوتے تھے۔ اور اس طرح برابر برابر کھڑے ہوتے کہ کوئی جانور نکلنے نہ پائے۔ رفتہ رفتہ اس حلقہ کو تنگ کرتے جاتے جانور گھبرا کر ادھر اُدھر پھرتے اور سمٹ کر بیچ میں آجاتے اور ایک وقت میں سینکڑوں جانور شکار ہو جاتے۔

اس شکار کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سپاہیوں میں پھرتی پیدا ہو اور دوڑ دھوپ کی مشق رہے۔

کہتے ہیں کہ شکاری جو دوسروں کی جان لیتا ہے بعض وقت اپنی جان بھی اسی میں گنواتا ہے۔ یہ بات جہانگیر پر پوری اترتی ہے۔

ایک دن بیرم کلہ میں شکار کھیل رہا تھا، یہ ایک بلند پہاڑ تھا، اس کے نیچے بندوقچیوں کے لیے بیٹھکیں بنا رکھی تھیں۔ وہاں کے لوگ ہرنوں کو بھگا کر پہاڑ پر چڑھا دیتے تھے۔ جب یہ ہرن بادشاہ کی نظر کے سامنے آتے تو بندوقچی ان کو گولی مارتے اور وہ زخمی ہو کر چٹان سے الگ ہو کر زمین پر گرتے ان کے معلق گرنے کا تماشا دیکھنے میں آتا۔

اس اثنا میں ایک لڑکے نے ہرن کو پہاڑ پر ہانکا۔ اس دوڑ میں اس کا پاؤں پھسلا وہ قلابازیاں کھاتا ہوا زمین پر گرا اور فوراً مر گیا۔ اس کی ماں رونے پیٹنے لگی۔ بادشاہ نے اس کو بہت کچھ دے کر اس کی تسلی کی مگر اس واقعہ سے بادشاہ اتنا رنجیدہ ہوا کہ شکار موقوف کیا گیا۔ لیکن حادثہ کا اثر اس کے دل پر ایسا ہوا کہ بے قراری بڑھتی گئی اور بیرم کلہ سے ٹھٹھ جاتے ہوئے موضع راجورہ میں قیام کیا طبیعت برابر بگڑتی گئی۔ یہاں تک کہ اسی راہ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

جناب سید ابو تمیم، فرید آبادی

ماموں جان کے دانت

ان کی عمر تو کچھ زیادہ نہیں ہوئی، یہی ساٹھ باسٹھ کے ہوں گے، اور مثل مشہور ہے، ساٹھا پاٹھا۔ وہ خوب صحت مند اور چونچال بھی ہیں۔ مگر بچارے کے دانت سب چوہے کے بل میں پہنچے۔

ہاں یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔ جب دانتوں نے ان کے منھ سے ہجرت کرکے چوہے کے بل میں رہائش اختیار کرلی تو ان کو چوکا بنوانا پڑا۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت بڑھیا دندان ساز نے یہ چوکا بنایا ہے۔ دوسرے گاہکوں سے وہ ایسے چوکے کے تین سو روپے لیتا ہے، ان کا دوست تھا، تیس روپے میں بنا دیئے۔

جب دانت کا چوکا نیا نیا منھ میں فٹ کیا جاتا ہے تو منھ والے پر کیا بیتتی ہے؟ اس کا حال تو وہ جانے یا اس کا خدا، ہاں دوسرے دیکھنے والے یہ دیکھتے ہیں کہ منھ والے کا منھ کچھ جوان جوان سا ہوگیا۔ جھریاں غائب غلّہ، کلّے کے پلّو جیسے گدے ابھرے ابھرے، اور سب سے عجیب بلکہ بہت نرالی بات یہ نظر آتی ہے کہ منھ والے کے دانت سفید جھاگ، جیسے چودھویں رات یا تو پیلے اودے، سبز، زردی مایل کا مجموعہ تھے، یا اب گویا سیاہ دیواروں پر قلعی پھر گئی ہے۔ پہلے پھپھوندی جھلکتی تھی اب چاندی کا پانی پھرا ہوا نظر آتا ہے۔ عجب تیری قدرت عجب تیرے کھیل۔

دوسری بات یہ ہوتی ہے کہ نئے چوکے والا کبھی ہونٹ سکیڑتا ہے، کبھی پھیلاتا ہے، کبھی دونوں ہونٹ کواڑوں کی طرح بالکل برابر کرکے بند کرتا ہے، کبھی دانت پیسنے کی طرز میں منھ بناتا ہے۔ غرض ہونٹوں اور منھ سے سب کچھ یا بہت کچھ کرتا ہے۔ نہیں کرتا تو یہ کہ آرام سے ہونٹ بند نہیں رکھتا۔

تیسری بات ان دوسے نرالی، یہ ہوتی ہے کہ وہ چوکا دھونے کے بعد رکھتا کہیں ہے اور ضرورت پڑنے پر اسے ڈھونڈھتا کہیں اور ہے۔

ماموں جان کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا ہفتے میں دو دفعہ ان کے دانت کھو جاتے، اور ہفتے میں تین دفعہ مل جاتے۔ تین دفعہ اس طرح کہ چوکا، تو ملکا ہوتا منھ کے اندر ہی، مگر ان کو شبہ یہ ہوتا کہ کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں۔ بڑی ڈھونڈیا مچتی ...... غسل خانے کی ہر چیز الٹ پلٹ کر دیکھتے، لکھنے کی میز کی ساری درازیں نکال

کر زمین پر الٹ دیتے، کپڑوں کی الماری کا ایک ایک خانہ
اور خانے کا ایک ایک کپڑا جھاڑ کر رکھ دیتے۔
پر اس دفعہ دانت ایسے کھوئے کہ ملے ہی نہیں۔
دو دن، تین دن .... سات دن گزر گئے۔ گھر کا کوئی کونہ
نہیں بچا جہاں چوکا تلاش نہ کیا گیا ہو۔ ان کا بس چلتا تو
گھر کی دیواریں توڑ کر یا چھت اکھیڑ کر چوکا تلاش کرتے،
مگر کرایے کے مکان میں اصل مشکل، بلکہ تکلیف یہی ہوتی
ہے کہ کرایہ دار نہ اس کی دیوار توڑ سکتا ہے نہ چھت اکھڑوا
سکتا ہے .... آہ، مجبوری ...

کرایہ دار پر مجھے اس وقت ایک قاضی نامی
کرایے دار یاد آگئے۔ ان کا بھی چوکا ایک دن سالم
کھویا رہا، دوسرے دن وہ اخبار میں "تلاش گم شدہ"
کا اشتہار دے رہے تھے کہ خیال آیا مہترانی سے
کام لیا جائے۔ ان کو کچھ ایسا شبہ ہوا کہ "کل صبح
جب میں قدمچے پر بیٹھا ہوا تھا بہت زور کی چھینک
آئی تھی، شاید چھینک کے بلغم کے ساتھ چوکا بھی قدمچے میں
گر پڑا ہوگا..." ان کی مہترانی نے قدمچہ چھوڑ گھر کی ساری
نالیوں بلکہ پڑوسیوں کی نالیوں تک میں بانس ڈال دیکھے
اونہہ، کس کا چوکا، کہاں کا چوکا۔

خیر، وہ ایک دیگچی کے اندر ملا۔ ہوا یہ تھا کہ صبح
منہ ہاتھ دھوتے وقت انھوں نے چوکا ایک کھڑکی کی
دہلیز پر رکھا، اٹھانا بھول گئے اور دوسرے کاموں میں
لگ گئے۔ ان کی ایک لڑکی نے چوکا حفاظت کی خاطر
ایک دیگچی میں رکھ دیا۔ دوسری لڑکی نے صبح کا کھانا
پکانے کے لیے دیگچی کو اندر سے دیکھے بغیر اس کے اندر
دال ڈالی، پانی ڈالا اور چولہے پر دیگچی رکھ دی ....
ہنڈیا پکتی رہی کھدر کھدر۔

آٹھویں دن، ماموں جان کی بھانجی اور ان کے
ساتھ ان کے دو آفت کے پرکالے بچے مہمان آئے۔ یہ
مہمان کوئی سال بھر بعد آئے تھے۔ ماموں جان نے،
ان کے لڑکوں نے، ممانی جان نے، سب نے خوشی
کا اظہار کیا۔ ماموں جان چند منٹ تک خوش رہے، پھر
اپنے دانتوں کو یاد کرکے بسورنے لگے۔ یہ بات بالکل
حق بہ جانب تھی۔ آٹھ دن سے روٹی کھانی مشکل ہو رہی
تھی، اور آج، بھانجی کی خاطر میں، ممانی نے دسترخوان
کے لیے کئی لذیذ کھانوں کا سامان شروع کر دیا تھا۔
ڈنٹی مرچوں کا قورمہ، ماموں جان کو دل و جان سے
زیادہ پیارا ہے۔ وہی پکنے والا تھا ..... آہ اللہ!
اب کیا ہو؟ ؟ — صبر۔

ماموں، ممانی اور بھانجی ایک کمرے میں باتوں
میں مصروف ہو گئے۔ بھانجی کے لڑکے نے اپنی چھوٹی
بہن سے کہا "آؤ، کوکو نانا جان کا گھر دیکھیں۔" کوکو
نے کہا "میں تو نانا جان کی گڑیاں دیکھوں گی۔" بھائی نے
کہا "کوکو، تم پاگل ہو۔ کہیں بوڑھے لوگ گڑیاں کھیلتے
ہیں۔" کوکو نے ساری بات نہیں سنی۔ "تم پاگل ہو!" سنتے
ہی بھائی کے منہ پر تھوکا اور بھاگی۔ بھائی پیچھے دوڑا۔
اب چوہے بلی کی دوڑ شروع ہوئی۔ اس گھر میں کئی کمرے
ہیں، اس لیے کہ تین منزلہ ہے۔ پہلی اور دوسری منزل
تک بھائی جان کوکو کو نہ پکڑ سکے۔ تیسری منزل کے بعد
آسمان تھا۔ کوکو پکڑی گئی۔ فری اسٹائل کشتی سب بچے
جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کشتی کی قسم کسی سیانے نے
دیوانے بچوں کی کشتی دیکھ کر ہی ایجاد کی ہے۔

تیسری منزل کی جب دری چاندنی، سکڑ سکڑا کر
رہ گئی، تو کوکو نے سوچا کہ کسی نئے اکھاڑے میں اترنا

چاہیے۔ کہنے لگی "بھئی اب میں تھک گئی"
بھائی نے کہا "توبہ کرو۔ اب نہ تھوکنا"
کوکو نے وعدہ کر لیا۔ بیچ کی منزل میں دونوں پہنچے۔
یہیں ایک کمرے میں ماموں، ممانی اور بھانجی بیٹھی تھیں۔ دوسرا کمرہ "اظہر کا کمرہ" تھا۔ بہت سجا سجایا، الماریاں، تصویریں، صوفہ قالین وغیرہ۔
کوکو نے اس کمرے کے اندر جھانک کر کہا "آباجی۔ یہاں تو ڈھیر ساری تصویریں ہیں۔ آؤ منو بھائی، تصویریں دیکھیں" تصویریں دیکھتے دیکھتے دونوں میں فساد ہو گیا۔ کوکو کہتی تھی کہ "یہ چھوٹے بچے والی تصویر اتار دو"
منو کہتے تھے "میرا ہاتھ وہاں تک نہیں جا سکتا"
کوکو نے زور لگا کر ایک کرسی وہاں تک گھسیٹی "لو اب تو ہاتھ چلا جائے گا"
منو بھائی نے اب یہ عذر کیا کہ تصویر جس ستلی سے بندھی ہوئی ہے، وہ بہت موٹی ہے" اس بات پر فساد ہوا کوکو نے منو کو دھکا دیا۔ منو نے گرنے سے بچنے کو "کارنس" کا سہارا لیا۔ نہیں گرے۔ کوکو کی اسکیم فیل ہو رہی تھی، کوکو نے کرسی گرانی چاہی، منو نے ایک لات ماری، جو مناسب بات تھی، مگر لات کوکو کے لگنے کی بجائے کرسی کی کمر پر لگی، یعنی منو کے پاؤں میں چوٹ آئی، وہ لڑکھڑائے کارنس پر ریشمی کپڑا بچھا ہوا تھا۔ منو نے اس کا سہارا لیا کوکو نے دوسرا دھکا دیا۔ منو کے ساتھ ساتھ کارنس پر رکھا ہوا چینی کا مرتبان گرا، زور سے چھن کی آواز پر ماموں، ممانی، بھانجی دوڑے دوڑے پہنچے۔ مرتبان تو دس بارہ روپے کا ہوگا، مگر ماموں جان نے دیکھا اس کے ٹکڑوں کے پاس ان کا پوکا دانت بکوس رہا ہے۔ ماموں جان بہت خوش ہوئے، ممانی نے کہا۔ "ہائے ہائے"
میری یاد پر پتھر پڑ گئے۔ پچھلی اتوار کو میں نے ہی احتیاط کے مارے یہ دانت اس مرتبان میں رکھے تھے"
ماموں جان بولے "اجی تم قورمہ پکاؤ"

جناب خالد رحیم

شریر غزل

اپنی شرارتوں کا صلہ پا رہا ہوں میں
بیٹھے ہیں یار بینچ پہ لیکن کھڑا ہوں میں

باجی کے زوردار طمانچے کا ہے اثر
صوفے سے جو الٹ کے زمیں پر گرا ہوں میں

مکتب نہ جا کے کل میں سنیما چلا گیا
اتنی ہی سی خطا پہ تو مرغا بنا ہوں میں

اکبر تھا کون؟ اور جہانگیر کون تھا؟
یارو! مجھے بتاؤ ذرا بھولتا ہوں میں

اسلم کی ہو پٹائی اسی وجہ سے پھر آج
اپنی کتاب پھاڑ کے خود رو پڑا ہوں میں

امی نے کل جو لڈو بنائے تھے دوستو
الماری میں رکھے ہیں وہ سب جانتا ہوں میں

جناب تاج الدین اشعرؔ رام نگری

تین۳ سوال

مری امّی! مجھے جب آپ کچھ کھانے کو دیتی ہیں!
ڈبل روٹی ہو، بسکٹ ہو، جلیبی ہو، بتاشہ ہو
وہ برفی ہو، امرتی ہو، پکوڑی ہو، سموسہ ہو
بس اک کالا سا کوّا اس پہ جھٹ قبضہ جماتا ہے
منڈیروں پر اسے لے جا کے خوش ہو ہو کے کھاتا ہے
مرے رونے پہ ظالم اور میرا مُنھ چڑھاتا ہے
کمینے کو، وہ جیسے اس کے دادا نے دِلایا ہے!
مری امّی! خدا نے ایسا کوّا کیوں بنایا ہے؟

مری امّی! سویرے جب بھی میں اسکول جاتا ہوں
سنبھالے اپنے بستے میں کتابیں اور قلم اپنا
میں چپ چاپ اپنے رستے پر بڑھاتا ہوں قدم اپنا
خدا جانے کہاں سے ایک کُتّا آ نکلتا ہے
وہ "بھوں بھوں" کر کے غرّاتا ہے اور مجھ پر اُچھلتا ہے
کوئی رہ گیر اس کو ڈانٹتا ہے تب ہی ٹلتا ہے
میں تم سے کیا کہوں اس نے مجھے کتنا ڈرایا ہے!
مری امّی! خدا نے ایسا کُتّا کیوں بنایا ہے؟
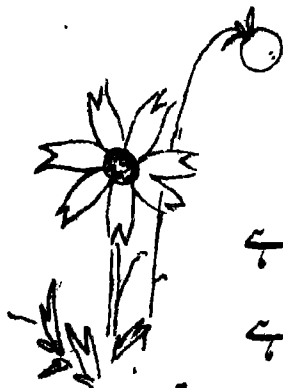
مری امّی! میں گھر کے باغ میں جس وقت جاتا ہوں
وہاں ہر قسم کے پھولوں کی رنگت مجھ کو بھاتی ہے
گلابوں کی کیاری اور بھی دِل کو لُبھاتی ہے
میں پھولوں کے لیے جیسے ہی ہاتھ اپنا بڑھاتا ہوں
تو کانٹے کی چُبھن محسوس کر کے تلملاتا ہوں
بڑی حسرت سے خالی ہاتھ واپس لوٹ آتا ہوں
مجھے پھولوں نے للچایا ہے، کانٹوں نے ستایا ہے
مری امّی! خدا نے ایسا کانٹا کیوں بنایا ہے؟

جناب محمد اکبر الدین صاحب صدیقی ریڈر عثمانیہ یونیورسٹی
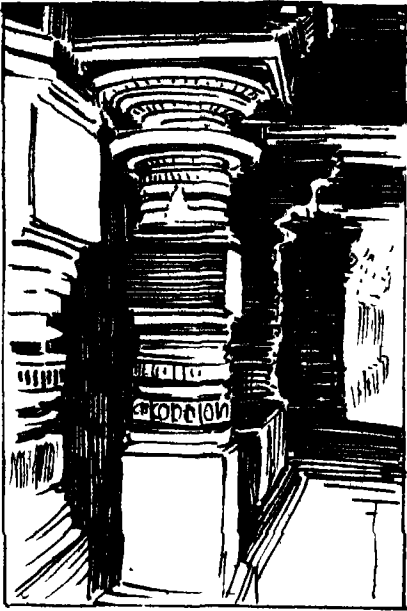
ہزار کھم کا دیول

کہتے ہیں ورنگل کے آباد ہونے سے پہلے ہنم کنڈہ چالوکیہ سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ پھر کاکیتیا سلطنت کا پایۂ تخت بنا ہنم کنڈو کو ورنگل سے ملانے والی سڑک پر ہنم کنڈہ سے قریب ہی سیدھی طرف ایک بہت شان دار مندر عہدِ قدیم کی یادگار ہے۔ یہ "ہزار کھم کا دیول" کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر ۱۱۶۲ء میں سلطنت کاکیتیا کے راجہ رودرا دیوا اول کے زمانے میں شروع ہوئی اور تکمیل کبھی نہ ہو سکی۔ کاکیتیا دور میں بنی ہوئی یہ عمارت چالوکیہ عہد کی صنعت کاری کا شان دار نمونہ ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سڑک سے جب ہم مندر کے احاطہ میں داخل ہوتے ہیں تو ایک بہت بڑا صحن رہا ہوگا۔ صحن کی سیدھی طرف اور بائیں طرف دو عظیم الشان عمارتیں ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل الگ وضع قطع کی ہیں۔

دونوں کے درمیان نند (بیل) کی مورت ہے جو بیٹھی ہوئی شکل میں ہے۔ یہ مورت بہت حسین انداز میں تراشی گئی ہے۔ مورت کے پچھلے حصہ پر آہستہ تھپکنے سے ایسی آواز آتی ہے۔ جیسے وہ خول ہو۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ اس میں ہیرے جواہرات بھرے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس کو نقصان پہنچایا۔ لیکن جب ان لالچیوں کو کچھ نہ ملا تو مایوس ہو گئے۔ اصل میں یہ بنانے والوں کی کاریگری کا کمال اور پتھر کی خصوصیت تھی کہ ہلکی سی ضرب سے خول کی آواز آتی ہے۔ اس قسم کا ایک پتھر ایجنٹا کے ایک غار کے صرف ایک کھم میں بھی استعمال ہوا ہے۔

دیول سے قریب ایک کھم پر قدیم تلنگی زبان میں جو سنسکرت سے ملی ہوئی ہے ایک بڑا کتبہ کھدا ہوا ہے جس پر کاکیتیوں کا سلسلہ نسب اور دیول کے بانی راجہ رودرا دیوا اول کے کارنامے لکھے گئے ہیں۔ یہ قدیم کتبوں میں سب سے طویل کتبہ معلوم ہوتا ہے اور پرانے زمانے کی تاریخ جاننے والوں کے لیے اس کی بڑی اہمیت ہے۔

نند کے سامنے مغربی رُخ پر تقریباً چھ فٹ اونچا چبوترہ ہے اور اس کے تینوں ضلعوں پر تین کمرے اس صورت میں بنے ہیں کہ ہم ایک ہال میں آکر سیدھے، مقابل میں اور بائیں طرف، اسی طرح تینوں کمروں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ ہال عرف عام میں منڈپ کہلاتا ہے جس کی چھت نقاشی کا نادر نمونہ ہے اور اس چھت کو پتھر کے بہت خوبصورت نقش و نگار کے کھم سہارے ہوئے ہیں۔ (یہ کھم تصویر میں نظر آتے ہیں)، کمروں کے دروازوں

دیول ہزار کھم کے دو منظر

(بشکریہ شری سومیشور راؤ. ہیڈ ماسٹر اے. وی. دی ملٹی پرپز ہائی اسکول ورنگل)

ہمارے چند لکھنے والے

اظہر افسر

محمد ابراہیم فکری

مناظر عاشق

سعادت نظیر

حمید عثمانی

سلیم تنائی

کے اطراف یکے بعد دیگرے کئی خوبصورت کام کے حاشیے دیئے ہیں۔ تمام دروازوں کے بازوؤں پر اور اوپر ہندو مذہب کی داستانیں تصویروں میں تراشی گئی ہیں۔ آج بھی ان میں جگمگاہٹ اور جوت موجود ہے۔ نزاکت کا یہ عالم ہے کہ بس آنکھ دیکھنے سے سیر نہیں ہوتی۔ کھموں پر جو کنگورے اور ان پر مورتیاں اور نقش و نگار ہیں۔ ان کی خوبی اور حسن کو بیان کرنا ممکن نہیں۔

اس مندر کی خصوصیت یہ ہے کہ کمروں کی جو دیوار مسلسل چلی گئی ہے۔ اس میں ایک کھم سے دوسرا کھم ملا ہوا ہے۔ جہاں موڑ آتے ہیں۔ وہاں کئی کھم مل کر دیوار میں ایک برجی کی شکل بنا دیتے ہیں اور پھر کھم سے کھم مل کر یہ سلسلہ آگے کو بڑھتا ہے۔ اس طرح منڈپ کے تینوں طرف کے کمروں کی دیواریں کھموں ہی سے بنی ہوئی ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ان کمروں میں دیواریں ہیں ہی نہیں بلکہ کھموں کا ایک طویل سلسلہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کمروں میں سے ایک میں شیوجی کا پتھر کا لنگ بنا ہے جس کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس کی چمک دمک بہت زیادہ ہے۔

ممکن ہے کہ نند کے بازو مشرق اور مغرب کا حصہ کسی زمانے میں ایک دیوار سے ملا ہوا ہو جس کے آثار بھی اب نہیں ملتے۔ مشرقی حصہ مسلسل کھموں کی بجائے کھلے کھلے ایک دوسرے سے علیحدہ کھموں سے بنا ہے جو ایک بہت بڑی چھت کو سہارے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ وہار یا خانقاہ ہے جہاں پجاری پنڈت اور ان کے چیلے رہتے تھے۔ جو اپنے مذہب کی کتابوں کی تعلیم دیتے تھے۔

ورنگل کی بستی ہنم کنڈہ کی چالوکیہ سلطنت کے مٹنے کے بعد آباد ہوئی اور یہ کاکتیا اور اندھرا کی عظیم سلطنت کا پایۂ تخت رہا۔ تقریباً دو سو سال تک اندھرا اس پر حکومت کرتے رہے۔ ملک کافور کے حملوں کے بعد حکومت کو زوال آیا۔ اس دو سو سال کی مدت میں بھی اس سلطنت میں کئی مندر بنے لیکن اس قدر وسیع اور شان و شوکت کا مندر نہ بن سکا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مندر برسوں بنتے رہے۔ ایک راجہ کا انتقال ہوا تو دوسرے نے کام کو آگے بڑھایا اور جب سلطنت مٹ گئی تو کام بھی ختم ہو گیا۔

پتھروں میں جو خوبصورت باریک نقش و نگار کیے گئے ہیں انھیں دیکھ کر ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ معماروں اور سنگ تراشوں نے سنگ خارا کو موم سے زیادہ سخت نہ سمجھا اور اپنے سوئی کے جیسے باریک اوزاروں سے پہاڑوں کا جگر چیر کر پتھروں میں سے ایسی حسین شکلیں نکالیں کہ آج بھی ہم انھیں دیکھ کر محو حیرت ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ آج کے انسان کے لیے چاند پر جانا تو آسان ہے مگر پتھر کو انسان، پھول، کلی، پنکھڑی اور تیتری جیسی نازک چیزوں میں منتقل کرنا ممکن نہیں۔

جناب اظہر افسر

شاطر لڑکا

(ڈرامہ)

کام کرنے والے:۔

موتی (ایک لڑکا جس کی عمر بارہ سال ہے)

چاری (پہلے اسکول کے ہیڈ ماسٹر عمر ۴۰ سال)

راؤ (دوسرے اسکول کے ہیڈ ماسٹر عمر ۴۵ سال)

منظر! پہلے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا کمرہ۔ درمیان میں بڑی سی میز ہے جس کے اطراف کرسیاں ہیں، دیواروں پر گاندھی جی اور نہرو جی اور دوسرے نیتاؤں کی تصویریں لگی ہیں، میز پر دنیا کا نقشہ ہے، ایک طرف چھوٹی سی میز پر شیلڈ اور کپس رکھے ہیں۔ پردہ اٹھتا ہے تو مسٹر چاری ایک سفید لفافہ بند کرکے موتی کو دیتے ہیں۔

چاری: موتی اتنا سمجھ لو تم بڑی طرح ہار جاؤ گے۔

موتی:۔ (لفافہ لیتے ہوئے) جی یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔

چاری:۔ وہ میری طرح نہیں ہیں بڑے غصیلے ہیڈ ماسٹر ہیں۔

موتی:۔ جی رہنے دیجیے میں ان سے کوئی ایسی بات ہی نہیں کہوں گا جس پر وہ ناراض ہوں۔

چاری: تو تم بالکل تیار رہو۔

موتی:۔ جی بالکل۔

چاری:۔ میں نے تمھاری رپورٹ تیار کر دی ہے، اور میں نے ساتھ ہی ساتھ ایک خط بھی لکھ دیا ہے۔

موتی:۔ آپ نے خط میں اس شرط کے بارے میں تو کوئی بات نہیں لکھی؟

چاری:۔ نہیں۔ ہاں یہ ضرور لکھ دیا ہے کہ اس لڑکے سے ہوشیار رہیے۔ یہ بات بات پر شرط لگانے کو تیار ہو جاتا ہے۔

موتی:۔ بس اتنا ہی؟ تو مجھے اجازت دیجیے۔ وہ

سو روپیہ تو آپ کو اچھی طرح یاد ہوں گے ۔

چاری:۔ (ہنستے ہیں) پہلے تم وہاں سے صحیح سلامت تو واپس آجاؤ پھر دیکھا جائے گا ۔

موتی:۔ سچ سچ ہیڈ ماسٹر صاحب آپ جیسے استاد تو دنیا میں بہت کم ہوں گے ۔ بچوں سے جس قدر محبت آپ کو ہے مشکل ہی سے کوئی ماں اپنے سب بچوں کو اس طرح یکساں عزیز رکھتی ہوگی اور کوئی کچھ کہے نہ کہے میں تو ہمیشہ یہی کہوں گا آپ جیسے محبت والے رحم دل اور ہر دل عزیز ہیڈ ماسٹر دنیا میں بہت کم ہوں گے

چاری:۔ اچھا اچھا اب جاؤ زیادہ باتیں نہ بناؤ، میں سختی اور مار کی بجائے محبت اور رحم دلی کو زیادہ پسند کرتا ہوں، لیکن تم زیادہ تعریف کروگے تو میں اپنی عادتیں بدلنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔ (ہنستے ہیں)

موتی:۔ (ہنستا ہے) جی اچھا ہیڈ ماسٹر صاحب اب میں چلتا ہوں ۔ نمستے ۔

چاری: نمستے ۔

منظر ۲ دوسرے ہیڈ ماسٹر، راؤ کا کمرہ۔ کمرہ ویسا ہی ہے جیسا پچھلے منظر میں ہے۔ البتہ راؤ کی شکل بڑی غصیلی ہے اور بڑی بڑی مونچھیں ہیں ۔

دائیں جانب سے موتی داخل ہوتا ہے۔

موتی:۔ نمستے ہیڈ ماسٹر صاحب

راؤ:۔ ہوں ۔

موتی:۔ نام پلّی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب مسٹر چاری نے یہ خط آپ کے لیے دیا ہے ۔

راؤ:۔ (لفافے کو پڑھتا ہے) تمھارا نام ؟

موتی:۔ جی موتی ۔

راؤ:۔ تو تمھارے نام پلّی اسکول سے نکالے جانے کا سبب ہے کہ تم حد سے زیادہ شرطیں باندھتے ہو ۔

موتی:۔ جی ۔

راؤ:۔ مگر شاید تمھیں پتہ نہیں کہ میں بڑے سے بڑے لڑکے کو ٹھیک کرچکا ہوں، تمھاری ساری عادتیں اچھی ہیں صرف یہی بُرائی ہے کہ تم بات بات پر شرط لگاتے ہو۔

موتی:۔ جی ۔

راؤ:۔ مگر اس اسکول میں کوئی لڑکا زیادہ دنوں اپنی برائی باقی نہیں رکھ سکتا (کھانستا ہے)، میں بہت جلد تمھیں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ تم شرطوں ورطوں کے بکھیڑوں کو چھوڑ کر ایک اچھے بچے بن جاؤ۔

موتی:۔ (اشارہ کرکے) یہ پچھلے ہیڈ ماسٹر صاحب کی رپورٹ ہے ۔

راؤ:۔ میں دیکھ رہا ہوں ۔ ہوں اس وقت بھی تم کوئی شرط باندھنے کو تیار ہو ؟

موتی: جی۔

راؤ: میں پوچھتا ہوں اس وقت بھی تم کوئی شرط بدنے کو تیار ہو ؟

موتی:۔ جی ۔ وہ ۔ اگر آپ خفا نہ ہوں۔

راؤ:۔ (کھنکارتا ہے) نہیں، نہیں مجھے کیا اعتراض

ہو سکتا ہے۔

موتی: جی۔ تو پھر میں تیار ہوں۔

راؤ: اچھی بات ہے، کس بات کی شرط بدتے ہو۔

موتی: (سوچتے ہوئے) ہوں۔ میرا خیال ہے آپ کی پیٹھ پر ایک تل ہے۔

راؤ: (بھنویں سکیڑ کر) تل؟

موتی: جی ہاں۔

راؤ: کچھ دیوانے ہوئے ہو۔

موتی: اگر آپ کو انکار ہے تو میں شرط بدنے کو تیار ہوں۔

راؤ: شرط؟

موتی: جی ہاں۔ اگر میری بات غلط نکلے تو یہ بیس ۲۰ روپے جو میں اپنی فیس داخلے کے لیے لایا ہوں آپ لے سکتے ہیں۔

راؤ: خیر ہے تم آج پہلی مرتبہ مجھ سے مل رہے ہو اور میں بھی آج پہلی بار تمھیں دیکھ رہا ہوں۔ تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ میری پیٹھ پر کوئی تل ہے۔

موتی: جی میرا یہ خیال ہے جو بالکل صحیح ہے۔

راؤ: لڑکے مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میری پیٹھ پر کوئی تل نہیں۔

موتی: لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کی پیٹھ پر ایک تل ہے، اسی وجہ سے شرط بھی بد رہا ہوں۔

راؤ: تم ہار جاؤ گے؟

موتی: کوئی بات نہیں، میں ہار گیا تو آپ بیس روپے لے لیں۔

راؤ: یہ بات ہے؟

موتی: جی۔

راؤ: تو تم کسی طرح اپنے بیس ۲۰ روپے کھونے پر تلے ہوئے ہو۔

موتی: جی نہیں اتنے ہی روپے جیتنے پر۔

راؤ: (قہقہہ لگاتا ہے) اچھا۔ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے یہ لو میں اپنا کوٹ اتار رہا ہوں (کوٹ اتارتا ہے) اور یہ لو قمیص بھی یہ رہی، (قمیص اتار کر میز پر رکھتا ہے) لاکھ اپنی پیٹھ انسان کو آپ دکھائی نہ دے تو کیا ہوا۔ اسے کیا اپنی پیٹھ کی خبر نہیں ہوتی لو۔ لو دیکھو ہے کوئی تل میری پیٹھ پر جھوٹ بولو گے تو کھال ادھیڑ دوں گا۔

موتی: جی۔

راؤ: ہے کوئی تل؟ بولتے کیوں نہیں۔

موتی: جی نہیں۔ تل تو آپ کی پیٹھ پر کوئی نہیں حیرت ہے؟

راؤ: (قہقہہ لگاتا ہے) ہنھ بات بات پر شرطیں باندھتے ہو۔

موتی: جی میں شرمندہ ہوں۔

راؤ: نہ نہ نہ نہ شرمندہ ورمندہ ہونے سے کچھ کام نہیں چلے گا، یہ بیس روپے جو فیس کے ہیں تمھارے نہیں رہے۔

موتی: ہیڈ ماسٹر صاحب۔

راؤ: کچھ نہیں، اب تم جا سکتے ہو، اب میں تمھیں اپنے اسکول میں داخلہ بھی نہیں دوں گا۔ جاؤ جاؤ ٹھنڈی ہوا کھاؤ۔ میں رپورٹ بھی تمھاری واپس نہیں کروں گا۔ اپنے پچھلے ہیڈ ماسٹر سے کہہ کر دوسری بنوا لو جاؤ۔

موتی: جی۔ نمستے۔

راؤ: ہوں۔ (موتی دائیں جانب سے چلا جاتا ہے)

(راؤ پاس کی چھوٹی سی میز پر رکھا ہوا ٹیلیفون
اٹھاتا ہے۔ نمبر ملا کر) ہلو۔کون ؟ مسٹر چاری۔
(چاری کی بھرائی ہوئی آواز جیسے ٹیلیفون کی دوسری
طرف سنائی دیتی ہے) ہاں میں چاری بات کر رہا
ہوں۔کہیے۔

راؤ :۔ ابھی ابھی تم نے جس لڑکے کو میرے پاس
بھیجا ہے۔

چاری:۔ وہ جو بات بات پر شرطیں باندھتا ہے ؟

راؤ :۔ ہاں وہی۔ آج میں نے اسے ایسا سبق سکھایا
ہے کہ عمر بھر یاد کرے گا۔

چاری:۔ اچھا۔ کیا ہوا۔

راؤ :۔ آج ابھی اس نے مجھ سے بیس روپے ہارے
ہیں۔

چاری:۔ کیا آپ سے بھی اس نے کوئی شرط باندھی ہے۔

راؤ :۔ ہاں مگر آج میں نے اسے وہ مزہ چکھایا ہے
کہ بس یاد ہی کرے گا۔ شرطیں بدنا تو دور رہا
اب شرط کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھے گا۔

چاری:۔ اچھا ۔ ؟

راؤ :۔ ہاں میں نے تمھاری رپورٹ اور نوٹ دیکھتے
ہی اس سے پوچھا کہ کیا تم اس وقت بھی کوئی
شرط لگانے کو تیار ہو ؟

چاری:۔ کیا کہا اس نے ؟

راؤ :۔ بولا ہاں ہیڈ ماسٹر صاحب اگر آپ خفا نہ ہوں
تو میں اب بھی شرط بدنے کو تیار رہوں، کہتا
تھا آپ کی پیٹھ پر تل ہے مجھے پورا یقین ہے۔

چاری:۔ میری ۔ ؟

راؤ :۔ نہیں نہیں میری پیٹھ پر تل ہے، وہ کہتا تھا۔

چاری:۔ پھر آپ نے کیا کہا ؟

راؤ :۔ میں نے کہا ہوشیار ہو جاؤ۔ تمھیں ان بیس
روپوں سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔" بولا
مجھے منظور ہے۔

چاری:۔ کیا آپ کی پیٹھ پر کوئی تل ہے ۔ ؟

راؤ :۔ کیا بات کرتے ہو چاری، لاکھ اپنی پیٹھ اپنے
کو دکھائی نہ دے، کیا مجھے اتنی بھی خبر نہیں کہ
میری پیٹھ پر کوئی تل ہے یا نہیں، میں نے فوراً
کوٹ اور قمیص اتار کر میز پر رکھ دی اور پیٹھ
دکھادی اسے، اگر وہ جھوٹ بولتا تو کچھ اور
لوگوں کو بلوالیتا۔

چاری:۔ آپ نے اپنا کوٹ اور قمیص اتار کر میز پر رکھ
دی ؟

راؤ :۔ ہاں میں نے اسے اپنی پیٹھ اچھی طرح دکھا دی،
وہاں کوئی تل نہ تھا اور (قہقہہ لگاتا ہے) تمھارا
وہ شاطر لڑکا شرط ہار گیا۔

چاری:۔ یہ تو بڑا غضب ہوگیا ۔

راؤ :۔ کیوں کیا بات ہوگئی ؟

چاری:۔ آپ نے اپنا کوٹ اور قمیص اتار دی ؟

راؤ :۔ ہاں ہاں اس میں کیا ہرج ہے ؟

چاری:۔ اوفوہ ــــ ارے صاحب، آپ نہیں جانتے
وہ مجھ سے یہاں سو روپے شرط لگا گیا ہے
کہ جس اسکول میں آپ مجھے بھیج رہے ہیں ۔
وہاں کے ہیڈ ماسٹر صاحب سے پہلی ملاقات
میں ان کا کوٹ اور قمیص اتروا تا ہوں

راؤ :۔ (زور سے) کیا کہتے ہو ۔

چاری:۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں ۔ اگر آپ نے کوٹ

اور قمیص اتاری بھی تھی تو اب آپ نے مجھ سے ٹیلیفون پر کیوں کہہ دیا۔ اوفوہ اب میں کیا کروں، وہ اب میرے پاس آتا ہی ہوگا۔ خدا مجھے اس شاطر لڑکے سے اوفوہ لیکن میں اب اپنے سامنے بٹھا کر اس سے عہد لوں گا کہ آیندہ وہ کوئی شرط نہ باندھے گا اور ایک اچھا لڑکا بن جائے گا۔

راؤ:۔ ہیں۔ ہیں ۔ (راؤ اپنے کپڑے نوچتا ہوا کود رہا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

جناب عادل جعفری

چھبّیس ۲۶ جنوری

خوشی منائیں کہ چھبیس جنوری آئی
ترانے گائیں کہ چھبیس جنوری آئی

ہمارے ملک کی یہ ہے بہت اہم تاریخ
زمانہ میں ہوا کرتی ہے ایسی کم تاریخ

ہمیشہ کرتی ہے تعریف اس کی عقلِ سلیم
یہی تو ہے جسے کہتے ہیں لوگ روزِ عظیم

یہ چند اچھے دنوں میں شمار ہوتا ہے
اسی طرح کا تو دن یادگار ہوتا ہے

ہمارے دامنِ امید بھر گئے اس روز
جو چاہتے تھے وہ ہم لوگ کر گئے اس روز

بہت دنوں سے تھے دوچار ہم غلامی سے
اسی نے آکے ملایا تھا نیک نامی سے

ہماری قوم بھی اب شاد ہوئی جاتی ہے
وہ پورے طور پہ آزاد ہوتی جاتی ہے

جھکی ہوئی جو نگاہیں تھیں اٹھ گئیں یک لخت
بلند ہو گئے جذبات جو تھے اب تک پست

ادب کے ساتھ جھکے احترام کرنے لگے
جو رخ ملاتے نہ تھے وہ سلام کرنے لگے

خدا کرے کہ یہ تاریخ بار بار آئے
ہزار بار نہیں سو ہزار بار آئے!

جناب سید محمد ٹونکی

قلندر

گل رنگ بیگم، گل چہرہ بیگم، گل رعنا بیگم، گل نار بیگم، گل عذار بیگم، گل بدن بیگم یہ ایک شخص کی بیٹیوں کے نام ہیں۔ خیال کیجیے کہ وہ کتنا رنگین مزاج تھا۔ مانا کہ اس کی لڑکیاں بہت حسین اور پیاری تھیں مگر حسن کے لیے دوسرے لفظ اور ترکیبیں بھی آپ نے پڑھی ہی ہوں گی۔ ماہ وش، مہ لقا، خورشید لقا، مہ جبین، نگار، طلعت آرا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اوپر کے ناموں سے اس کی رنگین مزاج اور مستی کا تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے۔

گیارہ برس کی عمر کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے۔ کھیل کود ہی میں مزا آتا ہے۔ ہاکی فٹ بال، کرکٹ کا میچ کتنا پیارا ہوتا ہے۔ کھیل تو ایک گھنٹہ یا زیادہ سے زیادہ ایک یا دو دن کا، مگر اتنا پیارا کہ دنوں اُچک اچک کر ہمک ہمک کر اس کے تذکرے ہوتے ہیں۔ اس چھوٹی سی عمر میں اُس پر ذمہ داری پڑی اور ذمہ داری بھی بھاری۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھا اور سلطنت سنبھالنی پڑی، کھیل کا میدان نہیں سلطنت کا انتظام حصے میں آیا۔

کوئی اور ہوتا تو ڈر جاتا، یا عیش و عشرت میں پڑ جاتا۔ اِس لڑکے کی ہمت نے باپ کی سلطنت پر بس نہیں کیا، بلکہ بزرگوں کی پوری سلطنت لینے کی کوشش کی۔ نوعمری اور یہ حوصلہ! دھاوا بولا کامیاب ہوا۔ زندگی کو حوصلے کی رنگینی، ہمت کی مستی ملی۔

یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ نوعمر اور مخالف سن رسیدہ، آزمودہ کار، جہاں دیدہ، چپ کیسے بیٹھتے۔ پھر ایک نوعمر کے مقابلے میں۔ اُبھرے اور نئی سلطنت سے اکھاڑ پھینکا۔ یہ ہار اس عمر میں بڑی ہار تھی۔ مگر ہمت نہ ہاری پھر حملہ کیا اور کامیاب ہوا۔ نوعمری اور اس میدان میں یہ آن مستوں ہی کے حصے میں آتی ہے۔

یہ لڑائیاں چلتی رہیں اور دشمن بھی ڈٹے رہے اور انھوں نے سوچا کہ یہ روز روز کی لڑائی کا روگ جان کو لگ گیا ہے اس سے جبھی پیچھا چھوٹے گا جب اس کی آبائی سلطنت بھی ہم لیں اور جب بانس ہی نہ رہے گا تو بانسری کیا بجے گی۔ انھوں نے توڑ جوڑ شروع کیے اور کامیاب ہو گئے۔

سلطنت ہی نہیں گئی گھر بھی گیا۔ اب نہ گھر رہا نہ در۔ مگر ہمت نے ساتھ نہ چھوڑا۔ دشمن پیچھے پڑ گئے۔ بھاگنا پڑا۔ شہر شہر قصبے قصبے، گاؤں گاؤں پھر بھی

دشمنوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ جاں باز سپاہی، دوست، رشتے دار ایک ایک کر کے چھوٹ گئے۔ جان کے لالے پڑ گئے لیکن مستی کا یہ عالم کہ ہمت جوان حوصلہ بلند، اس مصیبت، بے زری بے دری اور کس مپرسی کے عالم میں بھی یقین اور یقین کامل تھا کہ ایک نہ ایک دن پھر تخت پر بیٹھا ہے اور بیٹھوں گا۔ بچتا بچاتا کابل پہنچا۔ سکون ملا دل جمعی ہوئی۔ جماعت بنائی سیر و شکار سے دل بہلانے لگا ایک دفعہ شکار کو نکلا۔ دور تک گیا دن لگ گئے برف پڑنے لگی۔ راستے ڈھک گئے۔ مارا مارا پھرا ایک جگہ پہاڑ کی کھو کا شک ہوا۔ پھاوڑے سے کھودنا شروع کیا۔ کھو نکلی۔ ساتھیوں نے کہا پہلے آپ کھو میں چلیں۔ کہا سب سے پہلے سب سے بوڑھا ساتھی جائے۔ اس طرح جب سب ساتھی اندر چلے گئے تو سب کے آخر میں اس پہاڑ کی کھو میں داخل ہوا۔ یہ ظہیر الدین محمد بابر تھا جس کا نام آپ جانتے ہیں۔

یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ ایک دن وہ ہندوستان کا بادشاہ ہوا لیکن ہندوستان کی بادشاہت دلی اور آگرے کی سلطنت اس کی رنگینی اور مستی کو نہ لوٹ سکی۔ طبیعت پر سادگی اور رنگینی غالب رہی۔ ایک دن دریا چڑھا اور خوب چڑھا جمنا دونو پاٹ آئی ہوئی تھی۔ یہ دیکھتے ہی بدن میں پھریری آئی اور بھرے دریا میں کود پڑا، اور بھرے دریا کے دو چکر لگائے۔

فرغانہ کے ٹھنڈے ملک میں پیدا ہوا جوانی کابل کی وادیوں میں کاٹی۔ سلطنت ملی آگرہ اور دہلی کی جہاں کی گرمی اور لو فرغانہ اور کابل کا بدل۔ مئی کا مہینہ آگرہ کی لو، گھر سے نکلا تو بیوی نے تاکید کی کہ جمعہ کی نماز پڑھ کر سیدھے محل آنا لو بہت تیز ہے۔ یہ نماز پڑھ کر ملنے ملانے چلا گیا۔ بیگم نے شکایت کی تو جواب دیا "ابوسعید مرزا یہاں نہیں ہیں ان کی بچیاں یہاں ہیں یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان کو پوچھنے نہ جاؤں"۔

ہندوستان آیا ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا اور لکھا کہ "ہندوستان میں بہتے پانی کے چشمے نہیں ہیں۔ یہاں باغ نہیں ہیں پھل نہیں ہیں، پھول نہیں ہیں۔ یہاں شمع نہیں۔ شمع دان نہیں، یہاں ایک چیز ہے جسے دیوٹ کہتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ دوستی کا لطف نہیں جانتے"۔

سلطنت و حکومت اس کی زندگی کا مقصد نہیں، وہ باغ کی رنگینی اور دوستی کی رعنائی و بےخودی کا متلاشی ہے۔ ممکن ہے۔ لوگ کہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہندوستان ایسے بڑے ملک میں باغ نہ ہوں خصوصاً جب کہ ہر صبح کو پوجا کے وقت پھول چڑھانا لازمی ہے۔ لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں ان کی نظر "گلستاں" اور "بوستاں" پر نہیں گئی جو مغلوں کے باغ کے تصور کی عکاسی کرتے ہیں۔ یعنی بعض صرف رنگینی کے لیے لگائے جاتے تھے اور گلستان کہلاتے تھے۔ جن میں یہ اہتمام ہوتا تھا کہ کس رنگ کے پھول کس رنگ کے پھولوں سے میچ کرتے اور رنگینی کی بہار دکھاتے ہیں اور بعض باغ خوش بو کے لیے لگائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ میدانی اور پہاڑی باغوں میں فرق تھا۔ محل کے باغ مقبروں کے باغوں سے مختلف ہوتے تھے۔

باغوں کی یہ رنگارنگی تو تھی ہی لیکن دوستی کی مستی کا یہ عالم ہے کہ ہندوستان کا بادشاہ ایک دن قلعہ میں تربوز کھاتا ہے تو لکھتا ہے "آج وہ دن یاد آ رہا ہے۔ جب دشمن میرا پیچھا کر رہے تھے۔ کئی دن

تک گھوڑے کی پیٹھ سے نہ اتر سکا تھا، صرف ایک دوست ساتھ تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا کوئی دشمن نظر نہ آیا۔ سامنے تربوزوں کا کھیت تھا۔ دونو گھوڑوں سے اترے تربوز لیا کھانا شروع کیا۔ میں نے اس کے چھلکا مارا۔ اس نے میرے۔ دیر تک چھلکے بازی کرتے رہے پھر میں نے کہا۔ یار اپنی غزل سنانا۔ اس نے غزل سنائی دیر تک غزلیں ہوتی رہیں۔ پھر ہم مگن ہو کر کھیت سے نکلے۔ دشمن پیچھے ہے۔ موت سر پر منڈلا رہی ہے۔ گھر دور نہیں ہے لیکن قلندرانہ مستی کا یہ عالم کہ تربوز کھاتے جا رہے ہیں اور چھلکے بازی ہو رہی ہے۔"

اور پھر اس واقعہ کی یہ اہمیت کہ آگرہ کے قلعہ میں اس کو یاد کر کے لکھتا ہے تو پڑھنے والے پر کیفیت سی طاری ہوتی ہے۔ اسی مستی نے وہ رنگینی دی اور یہ سب دین تھی "عمل پیہم محبت فاتح عالم" کی۔

اس رنگینی و مستی کا لطف اٹھانا ہے تو بابر کی اپنے ہاتھ کی لکھی سوانح عمری "توزک بابری" پڑھیے۔ جس میں ایسے نہ معلوم کتنے واقعات ملیں گے جو آپ کی زندگی کو رنگین کر جائیں گے اور اس کو مستی بخشیں گے۔

لطیفے

ایک آدمی کی رسی اور ڈول چوری ہو گیا۔ اس نے اخبار میں اشتہار دیا "چور صاحب مہربانی فرما کر کنواں بھی اٹھا کر لے جائیں کیوں کہ اب میرے پاس بے کار ہے۔"

سپاہی (غصے سے) میرے اشارے کے باوجود تم نے کار کیوں نہیں روکی؟
ڈرائیور: جناب میں یہ سمجھا کہ آپ مجھے سلامی دے رہے ہیں۔

جناب عقیل الرحمن

ہم بچے

ہم سب ہندوستانی بچے
ویر، جیالے، بات کے سچے

لکھتے جائیں، پڑھتے جائیں
زینہ زینہ چڑھتے جائیں

ہم تاریخ کا سرمایا ہیں!
ہم عظمت کا مینارا ہیں!

ہم گیانی ہم بل والے ہیں
صاحبِ عرفان دل والے ہیں

چارمنارا فن کی عظمت
اور اجنتا گیان کی رفعت

تاج محل ہے پیار کی دولت
یہ ہے اپنی شان اور شوکت

لکھنا پڑھنا کام ہمارا
عقل و فراست نام ہمارا

بھارت کی تقدیر ہمیں ہیں
صبح کی اک تصویر ہمیں ہیں

حسین کرنو

جناب سیف سہسرامی

(۱)

اے سالِ نَو کی حسین کرنو
ہمارے دل میں بھی نور بھر دو
جہالتوں کا گھنا اندھیرا
ہماری دھرتی سے دور کر دو

(۲)

تمہارے قدموں کی برکتوں سے
بہار آئی ہے گلستاں میں
ملا ہے محنت کا پھل سبھی کو
ہوئے ہیں ہم پاس امتحاں میں

(۳)

تمہارے جلووں سے نور لے کر
ادب کا گلشن سجا رہے ہیں
ترقیوں کے چراغ لے کر
ہم اپنی منزل کو جا رہے ہیں

(۴)

تمہی سے علم و ہنر کا گلشن
ہرا بھرا ہے لہک رہا ہے
بکھر رہی ہے وفا کی خوشبو
تمام عالم مہک رہا ہے

(۵)

اے سالِ نَو کی حسین کرنو
ہیں سیفؔ کی بھی یہی دعائیں
کہ ہو کے اک دن جواں یہ بچے
محبتوں کے جہاں بسائیں
سجا کے اپنے وطن کا گلشن!
گلوں کے سائے میں مسکرائیں

محترمہ صبا حنفی ایم-اے

جب شہروں میں جنگل بسے

بندر نے کٹگھرے میں اچھل کود کا ناچ دکھایا۔ بچے خوش سے تالیاں بجاتے رہے۔ مونگ پھلی، کاجو اور کشمش دے دے کر بندر کو خوش کرتے رہے۔ کتنا لطف آیا!

آپ جب کبھی چڑیا گھر میں جاتے ہیں آپ کو ایسا ہی مزہ آتا ہے۔ ٹافی، لیمن ڈراپ کھیل تماشے اور سرکس کا لطف بھی آپ کچھ دیر کے لیے بھول جاتے ہیں۔ اچھلتے ہوئے کنگارو، نقلیں اتارتے ہوئے شریر بندر، گرجتے ہوئے شیر، قلانچیں مارتے ہوئے ہرن، چنگھاڑتے ہوئے ہاتھی۔ یہ سب دیکھ کر آپ کیسی عجیب، دلچسپ اور مزیدار دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی آپ سے یہ کہے کر ذرا جنگل میں جائیے اور وہاں گھوم پھر کر جانوروں کی حرکتیں دیکھیے تو آپ ڈر سے کانوں پر ہاتھ رکھ لیں گے "نا بابا نا! کون اپنی جان مصیبت میں ڈالے"

اب ایک بات سنیئے۔ آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جنگلوں میں چکر لگانے والے جانور شہروں میں کیسے پہنچے؟ اگر شہروں میں چڑیا گھر نہ ہوتے تو جانوروں کی دنیا کا لطف آپ کیسے پاتے؟

ہمارے ملک میں اب سے لگ بھگ سوا چار سو سال پہلے اکبر کی حکومت تھی۔ وہی اکبر جو اکبر اعظم کہلاتے ہیں اور مغلیہ خاندان کے بڑے مشہور بادشاہ گذرے ہیں۔ اکبر اعظم ہی نے ہمارے ملک میں پہلا چڑیا گھر بنوایا۔ طرح طرح کے ہزاروں جانور جنگلوں سے نکال کر اس چڑیا گھر میں رکھے۔

لیکن اکبر اعظم نے جو چڑیا گھر بنوایا، وہ صرف شاہی خاندان والوں، شاہزادوں، شہزادیوں اور بڑے بڑے رئیس لوگوں کی تفریح کے لیے تھا۔ غریب اور چھوٹے موٹے لوگوں کے بچے وہاں نہیں جا سکتے تھے۔ بے چارے!

سو سال سے کچھ زیادہ ہونے کو آئے جب مدراس شہر میں عام اور خاص ہر طرح کے لوگوں کے لیے ایک چڑیا گھر بنا۔ اس کے بعد ہی ترِوَنَندرم میں، پھر بڑودا، حیدرآباد، جے پور، جوناگڈھ،

کوٹا، میسور، کوچین، اور اودے پور میں چڑیا گھر بنتے گئے۔ بچوں کو تفریح اور تماشے کا سامان ملتا گیا۔ کلکتہ کے علی پور چڑیا گھر اور بمبئی کے وکٹوریا گارڈنس کی شہرت تو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ انھیں دنیا کے بہترین چڑیا گھروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

سو سال پہلے، چڑیا گھروں میں سارے جانور قیدیوں کی طرح رکھے جاتے تھے۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ ہم جانوروں کی جیل میں پہنچ گئے ہیں۔ موٹی موٹی سلاخوں کے کمرے اور کٹگھرے اور ان میں سر جھکائے اداس بیٹھے ہوئے جانوروں کو دیکھ کر کتنا ترس آتا ہوگا۔ کہاں جنگل کی آزادی اور کہاں یہ قید۔ بچے بھی جانوروں کو بس دور سے دیکھ لیتے تھے۔

لیکن اب جانوروں کے بارے میں ہمارا علم بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اب ہمیں ان کی ضرورت اور مزاج کے مطابق ماحول بنانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔ چڑیا گھروں میں اب چھوٹے چھوٹے نقلی پہاڑ، جھرنے، درختوں کے جھرمٹ جھاڑیاں اور کنج، ندی اور نالے، غار اور چٹانیں سبھی کچھ نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ شہر میں ایک چھوٹا موٹا سا جنگل بسا دیا گیا ہے یا کسی جادو کے زور سے شہر کو جنگل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس ماحول میں جانوروں کو بھی اپنے گھر جیسا مزہ ملتا ہے۔ وہ خوب خوش رہتے ہیں اور ہمیں بھی یہ سب اچھا لگتا ہے۔

لکھنو، گوالیار اور بیکانیر کے چڑیا گھروں میں جنگل کا بالکل جیتا جاگتا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح حیدرآباد، پونا، احمد آباد، دار جلنگ اور شملہ کے چڑیا گھروں کی شان دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

دلّی کا چڑیا گھر ۱۹۵۹ء میں تیار ہوا۔ اس چڑیا گھر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ بہت کھلا ہوا اور پھیلا ہوا ہے۔ جس طرح ہمیں رہنے کے لیے ایک اچھے گھر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح جانوروں کو بھی ہنسی خوشی رہنے کے لیے کافی جگہ چاہیے۔ سلاخوں لگے کمروں میں ان کا دم گھٹتا ہے۔ دلّی کے چڑیا گھر میں ہر جانور کو اس کی ضرورت اور مزاج کے مطابق ماحول اور جگہ دی گئی ہے۔ وہاں شاید اسے یہ خیال بھی نہیں آتا ہوگا کہ اسے جنگل سے دور کر دیا گیا ہے۔

آپ نے اگر چڑیا گھر دیکھا ہے تو میری ایک بات بھی مان لیجیے۔ یہ چڑیا گھر بچّوں کے لیے محض تفریح کی جگہ نہیں، اسکول بھی ہیں۔ بہت سے ملکوں میں تو بچوں کے لیے پڑھائی کی طرح چڑیا گھروں کا بھی باقاعدہ انتظام ہے۔ بچے وہاں اسی طرح کچھ سیکھنے اور سمجھنے کے لیے جاتے ہیں۔ جیسے کلاس میں جاتے ہیں۔ آپ بھی جب کسی چڑیا گھر میں جاتے ہیں تو جنگل کی فضا، مناظر، جانوروں کی عادتوں اور مزاج کے بارے میں بہت سی باتیں جان لیتے ہیں۔ یہ باتیں کتابوں سے اتنی جلدی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ آنکھوں دیکھی دنیا کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے!

جناب حرمت الاکرام

علم

شمع دیتی ہے نور محفل کو
علم دیتا ہے روشنی دل کو

آدمی کو سنوارتا ہے یہ
زندگی کو نکھارتا ہے یہ

ذہن کو استوار کرتا ہے
ہر بُرائی پہ وار کرتا ہے

علم اِدراک کو جگاتا ہے
موتیاں، قلزموں سے لاتا ہے

روشن اس سے زمیں کی محفل ہے
قمقموں میں اسی کی جھلمل ہے

ندیوں سے خراج لیتا ہے
بند موجوں پہ باندھ دیتا ہے

جنگلوں کو بنا دیا گلزار
راستوں سے ہٹا دیے کہسار

رُخ ہواؤں کا موڑ موڑ دیا
بادلوں کا غرور توڑ دیا

کی خلاؤں میں بزم آرائی
آسمانوں کی راہ دکھلائی

چاند تک آدمی کو پہنچایا
دیپ کس کس جگہ جلا آیا

یہ کرشمے تمام کس کے ہیں
راکٹ اس کے جہاز اس کے ہیں

اس نے کتنوں کو باکمال کیا
اس نے کتنوں کو لازوال کیا

علم حاصل کرو سنور جاؤ
تم بھی دنیا میں نام کر جاؤ

محترمہ آصف مجیب

شیخ سعدیؒ شیرازی

دنیا میں بڑے بڑے عالم فاضل گزرے ہیں۔
شیخ سعدی کا شمار بھی اپنے وقت کے بہت عالم فاضل لوگوں میں تھا۔ وہ بہت بڑے عالم بہت بزرگ اور بہت اچھے شاعر تھے۔ ایران کے ایک سرسبز شاداب شہر شیراز میں ۱۱۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ فقیر منش آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے بچے کو چھوٹی سی عمر میں نماز اور روزے کے مسئلے مسائل سکھا دیے۔ شیخ سعدی بڑے شوق سے قرآن شریف پڑھا کرتے اور رات کو عبادت کیا کرتے۔

باپ کو اس کا بڑا خیال تھا کہ ان میں اچھی اچھی باتوں کی عادت ڈالیں۔ اس لیے ہر بات کی نگرانی کرتے زیادہ وقت اپنے ساتھ رکھتے کہ کہیں آوارہ نہ پھرنے پائیں۔ مذہبی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ کرتے۔ مگر وہ چھوٹے ہی تھے جب باپ کا انتقال ہو گیا۔

جب بڑے ہوئے ہوش سنبھالا تو شیراز میں جو عالم گرد و نواح سے آکر جمع ہو گئے تھے ان کا شہرہ سنا۔ اور بزرگوں سے عالموں اور باکمالوں کے تذکرے سن سن کر ان کے دل میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں جگہ جگہ مدرسے کھلے تھے۔ سب سے زیادہ مدرسہ نظامیہ بغداد کی تعریف سنی جسے خواجہ نظام الملک طوسی نے بنوایا تھا اور وہاں سے بہت سے عالم اور فاضل لوگ تعلیم پا کر نکلے تھے۔ شیخ سعدی نے اس میں تعلیم شروع کر دی۔ وہاں سے کچھ وظیفہ بھی ملا۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ جب وہ پڑھتے تھے کسی موضوع پر کوئی تقریر کرتے تو ان کے کچھ ساتھی ان کی خوش بیانی سے جلتے اور ان سے حسد کرتے۔ ایک دن اپنے استاد سے انھوں نے شکایت کی کہ جب آپس میں بیٹھ کر میں کوئی علمی مسئلہ بیان کرتا ہوں تو فلاں ساتھی مجھے رشک اور حسد کی نظروں سے دیکھتا ہے۔

یہ سن کر استاد نے ان کو ڈانٹا اور غصہ سے کہا۔
"تم کو یہ کہنا نہیں چاہیے دوسروں کے رشک اور حسد کی تو شکایت کرتے ہو اور یہ نہیں سمجھتے کہ تم خود جو دل میں اتنی بدگمانی رکھتے ہو۔ اپنے بھائی کی غیبت کر رہے ہو۔ یہ کتنی بری چیز ہے۔ تم دونوں اپنی عاقبت خراب کر رہے ہو وہ رشک و حسد سے اور تم پیٹھ پیچھے برائی اور بدگوئی کرنے سے۔"

شیخ سعدی نے اتنا سیکھا اور پڑھا کہ سچ پوچھیے تو ان کے علم کی تھاہ نہیں مل پاتی۔ سب سے زیادہ علم ادب میں کمال حاصل کیا اور شہرت پائی کئی زبانیں سیکھیں۔

جن دنوں وہ پڑھتے تھے بغداد کی آخری شان و

شوکت کا زمانہ تھا۔ اس چراغ کو ٹمٹاتے اور پھر گل ہوتے دیکھا۔ ان کی نظروں کے سامنے تاتاریوں نے مسلمانوں پر جو ظلم اور زیادتیاں کیں اور جو تباہی مچی اس سے انھوں نے بہت سے سبق لیے اور دل پر بہت اثر ہوا۔ بس جبھی سے وہ قوم اور ملک کی خدمت ہر طبقہ ہر آدمی کی بھلائی اور اصلاح کے کاموں میں لگ گئے اور ساری عمر اسی میں گذاری۔

اسی دھن میں انھوں نے دور دور کے سفر کیے تاریخ میں ابن بطوطہ کے بعد سیاحی میں شیخ سعدی کا نام آتا ہے۔ عرب، ایران، مصر، شام، حبش، کاشغر اور بہت سے ملکوں کی سیر کی۔ کئی سفر پیدل کیے۔ سفر میں انھوں نے بڑی بڑی سختیاں اور مصیبتیں جھیلیں۔ آپ سمجھیے اس زمانہ میں سفر کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔ نہ ریل تھی نہ موٹر نہ جہاز نہ ہوائی جہاز نہ کہیں ٹھنڈا پانی نہ گرم چائے اور پکا پکایا کھانا۔ آرام کا کچھ سامان نہیں تھا۔ کتنی ہمت کا کام ہے۔ اور یہ وہی کر سکتا ہے جسے کچھ خود سیکھنے کرنے اور سیکھ کر، برت کر، اپنے سب بھائی بہنوں اور بچوں کو سکھانے بتانے اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے اور سب سے بھلائی کرنے کی ایسی لو لگی ہو جیسی شیخ سعدی کو تھی۔ وہ وعظ کہتے اچھی اچھی باتیں بتاتے جس سے انسان ایک اچھا انسان بنتا ہے۔ اچھے کام کرتا ہے۔

انھوں نے گلستاں بوستاں دو مشہور کتابیں لکھیں جو کہنا چاہیے کہ ان کی سیاحت کا ان کے تجربوں کا نچوڑ ہیں۔ آنکھوں دیکھی سچی اور اچھی باتیں اور واقعات ہیں۔ اور پھر بیان ایسا کہ جو کہتے ہیں جی میں اتر جاتا ہے۔ زبان کی مٹھاس، معنوں کی گہرائی اور اثر، بیان کا انوکھا پن شگفتگی سب چیزیں گھلی ملی ہیں جب ہی تو دنیا کی بہت سی زبانوں میں ان کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ عالموں نے ادیبوں نے اور عام لوگوں نے انھیں آنکھوں سے لگایا۔ سب نے ان قیمتی ادب پاروں کی قدر کی بعض کتابیں خاص کر گلستاں، بوستاں تو سینکڑوں برس تک مکتبوں میں مدرسوں میں پڑھائی گئیں۔ کہیں کہیں اب تک پڑھائی جاتی ہیں۔

کہتے ہیں فارسی نثر میں گلستاں سے زیادہ کوئی کتاب نہیں پسند کی گئی۔ یہ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل کی گئی۔ یہ جیسی بڑوں کے لیے دلچسپ اور سبق سکھانے والی ہے ویسے ہی بچوں کے لیے بھی۔ مزے مزے کی حکایتیں ہیں اور بڑے پتہ پتہ کی باتیں جن سے اخلاق سدھرتا ہے۔ آدمی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے سمجھ سکتا ہے۔ اب سے کچھ برس پہلے تک جب ہندوستان میں فارسی پڑھنے کا عام رواج تھا۔ بچوں کو گلستاں ضرور پڑھائی جاتی۔ وہ شوق سے پڑھتے جیسے کوئی کہانی پڑھ رہے ہوں۔ اچھی اچھی باتیں اور نصیحتیں ان کی طبیعت اور اخلاق بناتی سدھارتی تھیں۔ بچپن میں جو نقش دل پر بیٹھ جائے وہ کبھی نہیں مٹتا۔ گلستاں کی یہی ایک خوبی اور بڑائی کیا کم ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا تو اچھا ہوتا۔ اب شاید کوئی کوئی پڑھتا ہے۔

اردو میں گلستاں کے فقرے اور مصرعے ایسے رچ بس گئے کہ بات چیت میں کہاوت کی طرح زبان پر آجاتے۔

آئیے گلستان کی ایک چھوٹی سی کہانی آپ کو سنائیں

ایک بادشاہ کشتی میں بیٹھا اس کے ساتھ ایک ملازم تھا اس بے چارے نے کبھی دریا نہ دیکھا تھا اور نہ کبھی کشتی میں بیٹھا تھا۔ لگا رونے پیٹنے چلانے، مارے ڈر کے تھر تھر

کانپ رہا تھا۔ بادشاہ کو بڑی پریشانی ہوئی۔ ایک عقل مند آدمی نے بادشاہ سے عرض کیا۔ آپ اجازت دیں تو میں اسے خاموش کر دوں۔ بادشاہ نے خوشی سے اجازت دے دی۔ اور ملازم کو دریا میں ڈال دیا گیا۔ اور جب اس نے چند غوطے کھائے تو بال پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔ بے چارا کشتی کے ایک کونے میں چپکا ہو کر بیٹھ گیا۔ رونا دھونا سب ختم۔ بادشاہ کو یہ بات عجیب سی لگی۔ پوچھا: اس میں کیا حکمت تھی۔ جواب ملا۔ از اوّل محنت غرق شدن نہ دیدہ بود و قدر سلامتِ کشتی ندانستہ ہمچنیں قدر عافیت کسی داند کہ بمصیبتے گرفتار آید (یعنی اس سے پہلے اس نے ڈوبنے کی مصیبت نہ دیکھی تھی آرام اور عافیت کی قدر وہی جانتا ہے جس پر کوئی مصیبت پڑتی ہے۔

اس ملازم کو پہلے احساس نہیں ہوا کہ وہ چین سے بیٹھا ہے اور پانی سے محفوظ ہے۔ یہ رونے کا سبب نہیں تھا۔ جب واقعی وہ پانی میں گیا اور اس سے باہر نکلا تب سمجھا کہ وہ تو بڑے آرام سے ہے اور پہلے بھی وہ آرام سے بیٹھا تھا۔

سچ پوچھیے تو آدمی کو اکثر ایسے حالات اور واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اگر وہ سوچے تو اپنی حالت پر شکر کرے اور اسے اچھائی اور برائی میں فرق معلوم ہو جائے۔ ہمت بندھی رکھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں تونگری بہ دل ست نہ بہ مال۔ (بہت روپیہ پیسہ سے کوئی بڑا نہیں ہوتا۔ جس کا دل بڑا ہو اصل میں وہ بڑا ہے۔)

بوستاں کی ایک نظم۔ ترجمہ

ابر باراں سے ایک قطرہ گرا لیکن دریا کی وسعت اور گہرائی دیکھ کر شرمندہ ہو گیا کہ اتنے بڑے دریا کے سامنے میری کیا ہستی ہے۔ سیپی نے اس کی انکساری دیکھی تو اسے اپنی گود میں لے لیا۔ قدرت نے اس قطرے کو نامور قیمتی موتی بنا دیا۔ بلندی اس کو ملتی ہے جس میں انکسار ہوتا ہے۔

جناب غلام حیدر

رنگ برنگی دنیا
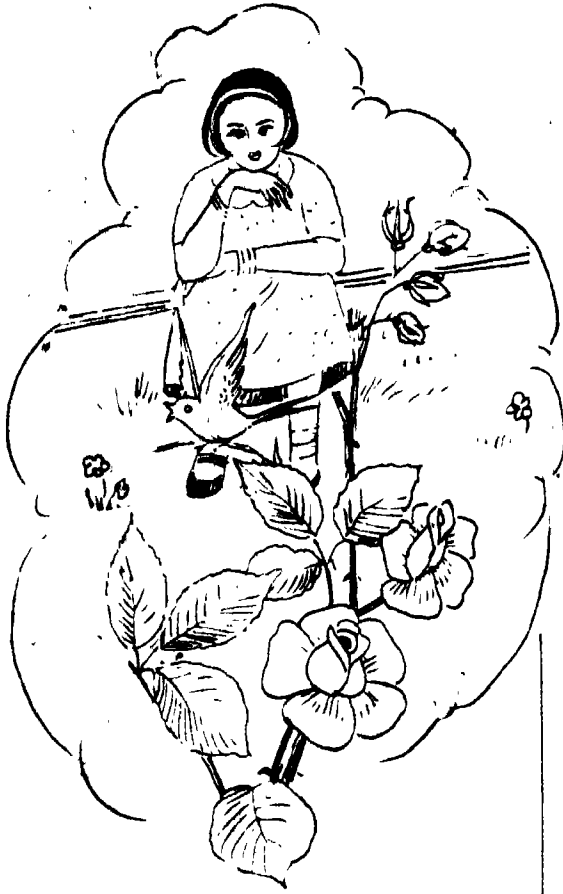
منّی ایک دن اپنے گھر کے باغ میں چپ چاپ بیٹھی تھی ۔ وہ آج بڑی اُداس تھی ۔ ابھی ابھی اس پر کافی ڈانٹ پڑی تھی ۔ اس نے اپنا سبق یاد نہیں کیا تھا ۔ اس نے دل میں سوچا، کتنا اچھا ہوتا اگر بچّوں کو اپنا سبق یاد نہ کرنا پڑتا ۔

تھوڑی دیر میں وہاں ایک چھوٹی سی چڑیا اُڑتی ہوئی آئی اور اس کے سامنے گلاب کے ایک پودے پر بیٹھ گئی ۔ منّی نے اتنی عجیب اور اتنی خوبصورت چڑیا پہلے کبھی نہ دیکھی تھی ۔ بالکل ہرے رنگ کی تھی ۔ منّی اسے کافی دیر تک حیرت سے گھورتی رہی ۔ چڑیا منّی سے ڈر بھی نہیں رہی تھی ۔ تھوڑی دیر میں وہ پھدکتی پھدکتی منّی کی بینچ پر اُس کے بالکل پاس آکر بیٹھ گئی ۔

”منّی سی چڑیا ۔ ! تم بہت خوبصورت ہو“ منّی نے خوش ہوکر پیار سے کہا ۔

اور جب اس کے جواب میں چڑیا کی چہچہاتی ہوئی آواز منّی کے کان میں آئی تو اُس کی حیرت کی حد نہ رہی ۔ ”بہت بہت شکریہ ، تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو ۔ تم نے مجھے خوبصورت کہا ہے ۔ میں تم سے بہت خوش ہوں“ چڑیا نے کہا ۔

”ارے تمھیں بولنا کس نے سکھایا ؟“

” ساری چڑیاں بولنا جانتی ہیں“ ہری چڑیا نے جواب دیا ” مگر بہت کم لوگ ان کی باتیں سمجھ سکتے ہیں ۔“

” تم کہاں رہتی ہو ۔ ؟“

” میں جہاں رہتی ہوں وہاں لال لال گھاس اُگتی ہے ۔“

” سچ ! کہاں ؟ منّی نے خوشی سے پوچھا ۔“

” وہ دنیا یہاں سے بہت دور نہیں ہے ۔ وہ بڑی عجیب جگہ ہے ۔ وہاں کی گھاس لال ہوتی ہے ۔

درختوں کے پتے جامنی رنگ کے ہوتے ہیں۔ وہاں
ہر وقت بہار رہتی ہے۔ ہر وقت پکے پکے پھل مل
سکتے ہیں۔ رنگ برنگے پھول کھلے رہتے ہیں جن پر
خوبصورت تتلیاں کھیلتی پھرتی ہیں اور درختوں پر خوب
صورت خوبصورت چڑیاں چہچہاتی رہتی ہیں۔ اور پھر سب
سے بڑی بات یہ ہے کہ وہاں کوئی کچھ کام نہیں کرتا۔"

"کتنی اچھی جگہ ہوگی وہ۔!"

"اچھا، اب میں جا رہی ہوں" چڑیا نے کہا۔
"مگر میں جانے سے پہلے تمھیں ایک انعام دینا چاہتی
ہوں۔ دیکھو۔ تمھاری کوئی سی بھی تین خواہشیں خود
بخود پوری ہو جائیں گی۔"

"سچ! تم کتنی اچھی ہو۔" منی نے خوشی سے
تالی بجائی۔

"ہاں اگر تم چاہو کہ تمھارا سبق یاد ہو جائے
تو وہ خود بخود ہو جائے گا۔ اگر تمھارا حساب کمزور ہو
اور تم چاہو کہ تمھیں اپنی کلاس کے سارے سوال کرنے
آجائیں تو وہ بھی آجائیں گے۔ اور اگر تم اچھی طرح
لکھنا چاہتی ہو تو وہ بھی تمھیں آجائے گا۔" یہ کہہ کر
چڑیا اڑ گئی۔

تھوڑی دیر تو منی بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر اسے
خیال آیا کہ سبق، حساب، اور لکھنا تو کسی نہ کسی طرح
آ ہی جائے گا، میں کوئی اور اچھی چیز کیوں نہ سوچوں۔
میں تو چاہتی ہوں کہ اس دنیا کی سیر کر آؤں جہاں
لال لال گھاس اگتی ہے۔"

بس اس نے یہ بات ابھی پوری کی ہی تھی
کہ اسے ایسا لگا جیسے وہ آہستہ آہستہ ہوا میں اڑی
جا رہی ہے۔ اسے ذرا بھی ڈر نہ لگا۔ تھوڑی دیر
میں ہی وہ اس عجیب دنیا میں پہنچ گئی۔ اس نے چاروں
طرف دیکھا۔ سچ مچ وہاں کی ہر چیز عجیب تھی۔ گھاس اتنی
لال تھی جیسے زمین پر گلاب کی پتیاں بکھیر دی ہوں۔
درختوں پر گہرے جامنی رنگ کے پتے ہوا میں جھوم رہے
تھے۔ ہر طرف اتنے بہت سے رنگوں کے پھول کھلے تھے
جیسے زمین پر دھنک نکل آئی ہو۔ سیب کے درختوں کی
شاخوں میں سنہری سنہری پھول بھی کھلے تھے اور
سرخ سرخ سیب بھی لٹک رہے تھے۔ ایسے ہی انار
کے درختوں میں لال لال پھول بھی کھلے ہوئے تھے اور
بڑے بڑے انار بھی جھول رہے تھے۔ یہ سب کچھ اسے
بہت اچھا لگا۔ منی کا جی چاہا کہ کوئی پھل توڑ کر کھالے
مگر درخت بہت اونچے تھے اور اس کا ہاتھ نہیں پہنچ
سکتا تھا۔

وہ یوں ہی خوبصورت خوبصورت درختوں کے
سائے میں لال لال گھاس پر تتلیوں کے پیچھے دوڑ رہی
تھی کہ اسے ایک بہت خوبصورت حوض نظر آیا اس میں
بالکل سنہرا پانی بھرا ہوا تھا اور رنگ برنگی مچھلیاں
ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ وہ کافی دیر
تک ان مچھلیوں کو کھیلتے دیکھتی رہی۔ پھر جیسے ہی اس
نے آگے چلنے کے لیے سر اٹھایا اسے اپنے سامنے
ایک چھوٹا سا محل نظر آیا جو چاندی کا بنا ہوا تھا۔
اور دھوپ میں خوب چمک رہا تھا۔

اب گھومتے گھومتے اسے بڑی زور کی بھوک
لگنے لگی تھی۔ اس نے اتنا خوبصورت گھر دیکھ کر دل
میں کہا "کتنا اچھا ہوتا اگر میں اس محل میں بیٹھ کر
کھانا کھاتی۔"

اور ابھی اس کا جملہ پورا ہوا تھا کہ اسے ایسا

لگا جیسے وہ پھر ہوا میں دھیرے دھیرے اڑ رہی ہے۔ پھر وہ محل کے بالکل پاس پہنچ گئی اور تھوڑی دیر میں ایک کھڑکی کے راستہ سے اڑتی ہوئی وہ کھانے کے کمرے میں میز کے پاس ایک کرسی پر خود بخود بیٹھ گئی۔ کھانے کی میز سونے کی بنی ہوئی تھی اور خوب چمک رہی تھی۔ اس پر چاندی کی اور چمکدار شیشے کی بڑی خوبصورت پلیٹیں رکھی تھیں جن میں مزے مزے کے کھانے، مٹھائیاں، عمدہ عمدہ حلوے، آئس کریم، انگور، سیب اور بہت سی میٹھی، نمکین مزے مزے کی چیزیں بھری ہوئی تھیں، جنھیں دیکھ کر منی کے منھ میں پانی بھر آیا۔ منی کے کرسی پر بیٹھتے ہی ایک بالکل ہرے رنگ کا بونا دوڑتا ہوا میز کے پاس آیا اور منی سے کہنے لگا

"آؤ، آؤ، ہمیں بہت خوشی ہے کہ تم یہاں آئی ہو۔ کھانا بالکل تیار رکھا ہے، اور اس کو کھانے والا یہاں کوئی نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمیشہ یہیں رہو۔"

"ارے!" منی بولی "میں تو یوں ہی گھومتی پھرتی یہاں چلی آئی ہوں۔ ان مزے مزے کی چیزوں میں سے کچھ کھانے کے بعد میں فوراً اپنے گھر چلی جاؤں گی۔"

"نہیں نہیں" بونے نے کہا "ایسا نہیں ہوسکتا۔ تمھیں یہاں ہمیشہ رہنا پڑے گا ہمارے ساتھ۔ یہ بہت اچھا گھر ہے، تم یہاں بہت خوش رہو گی۔ پھر تمھیں یہاں سبق بھی یاد نہیں کرنا پڑیں گے۔ یہاں کوئی کام بھی نہیں ہے۔ کوئی استاد بھی یہاں نہیں ہے۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ اس گھر میں تمھارے اور کچھ نوکروں کے علاوہ کوئی اور ہے ہی نہیں۔ سارے نوکر انتظار کر رہے ہیں کہ وہ کسی کا کام کریں۔"

منی ہنسی "میں یہاں آجایا کروں گی کبھی کبھی مگر میں زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتی۔"

"تم نے خود ہی۔۔ تو یہاں آنے کی خواہش کی تھی" بونے نے کہا "اور اب تمھیں یہاں رہنا بھی پڑے گا۔ جب تم یہاں کے پھل، حلوے اور مٹھائیاں کھاؤ گی تو خود ہی تمھارا جی یہاں سے جانے کو نہ چاہے گا۔ تمھاری اپنی طبیعت ہی بدل جائے گی۔ اور پھر ہم بھی پوری پوری کوشش کریں گے کہ تمھیں خوش رکھیں۔"

"مگر میں کہہ چکی ہوں کہ مجھے یہاں ہمیشہ نہیں رہنا" منی نے پکے ارادے سے کہا "کھانا کھاتے ہی مجھے اپنے گھر واپس جانا ہے۔"

اتنے میں اس چھوٹے ہرے سے آدمی نے تالی بجائی اور فوراً چاروں طرف سے کچھ عجیب عجیب سے آدمی کمرے میں آگئے۔ ان میں سے کچھ دروازے کے پاس اور کچھ میز کے چاروں طرف کھڑے ہوگئے۔ انھیں دیکھ کر منی کو ڈر لگنے لگا۔ ان کی صورتیں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ کچھ کے سر بڑی بڑی چڑیوں جیسے تھے جن میں لمبی لمبی نوک دار چونچیں لگی تھیں، کچھ کے منھ بالکل شیروں جیسے تھے۔ کچھ کے چہرے چیتوں اور بھیڑیوں جیسے تھے اور ان کے لمبے لمبے دانت چمک رہے تھے۔ کچھ بڑے بڑے بندروں کی شکل کے تھے۔ اور کچھ بڑے بڑے کتوں اور بلیوں کی طرح اس کو گھور رہے تھے۔

"یہ یہاں کے چوکیدار ہیں" ہرے رنگ کے بونے نے کہا "یہ سب تمھاری چوکیداری کریں گے کہ تم یہاں سے بھاگ نہ جاؤ۔"

اب منّی نے رونا شروع کر دیا۔

"روؤ نہیں" بونے نے سمجھایا "کچھ کھاؤ پیو اور خوش ہو جاؤ"

"مجھے کچھ نہیں کھانا۔ میں تو جانا چاہتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے میں یہاں کیوں آئی"

"اگر تم نہیں کھاؤ گی تو یہ چوکیدار تم سے ناراض ہو جائیں گے۔ پھر بھی اگر تم کچھ نہیں کھاؤ گی تو تمھیں دیکھ دیکھ کر غرّائیں گے۔ اگر پھر بھی تم نے کھانا نہ شروع کیا تو یہ تمھیں کاٹیں گے اور اگر اس کے بعد بھی نہ مانیں اور روتی رہیں تو یہ تمھیں ——"

منّی نے اگلا لفظ سُنے بغیر روتے ہوئے ہی کہنا شروع کیا "میں چاہتی ہوں کہ میں اپنے گھر واپس چلی جاؤں"

یہ کہتے ہی اسے ایسا لگا جیسے وہ پھر اُڑنے لگی ہے اور تھوڑی دیر میں وہ پھر اپنے باغ میں گلاب کے پودے کے پاس بنچ پر بیٹھی تھی۔

چڑیاں چہچہا رہی تھیں، پھول کھلے ہوئے تھے، دھوپ خوب چمک رہی تھی اور باغ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ ہری سی خوبصورت چڑیا گلاب کے پودے پر آ کر بیٹھی اور پھدکتی ہوئی منّی کے بالکل پاس آ گئی۔

"تم نے اپنی تینوں باتیں مانگ لیں؟" چڑیا نے پوچھا۔

"ہاں! اور مجھے خوشی ہے کہ میں گھر واپس آ گئی ہوں" منّی نے جواب دیا۔

"تمھیں اپنا سبق یاد ہو گیا؟ حساب کے سوال آ گئے؟ اور کیا تم نے اچھا اچھا لکھنا سیکھ لیا؟" چڑیا نے پوچھا۔

"بہت جلد مجھے یہ سب آ جائے گا" منّی نے جواب دیا "ایسی الٹی سیدھی باتوں کی خواہش کرنے سے، جو بعد میں ہمیں مصیبت میں پھنسا دیں یہ کہیں اچھا ہے کہ ہم کام کی باتیں سیکھنے کی خواہش کریں"

"ٹھیک ہے! اب تم زیادہ سمجھ داری کی باتیں کر رہی ہو" ہری چڑیا نے اپنی چہچہاتی سریلی آواز میں کہا۔ اور پھُر سے اُڑ گئی۔

اور اس کے ساتھ ہی منّی کی آنکھ کھل گئی۔

اسے ایسا لگا جیسے وہیں بنچ پر بیٹھی بیٹھی سو گئی تھی۔ اسے اب جاگتے میں بھی اپنا باغ، اپنا گھر، یہاں کے پھول پتّے، اور سبق یاد کرنا اچھا لگا۔ اس نے اس خوبصورت باغ، وہاں کے سنہری پھولوں، پکے پھلوں اور چاندی کے محل میں رکھی مٹھائیوں کے متعلق پھر کبھی نہیں سوچا، اس لیے کہ ساتھ ہی ساتھ اس بونے اور ان چوکیداروں کا خیال بھی آ جاتا تھا۔

ماخوذ از پریوں کی کہانیاں
ڈونالڈ، اے، میکینزی

لطیفہ

ایک آدمی سو رہا تھا۔ اسے ایک مچھر نے کاٹا جسے اس نے مار دیا۔ پھر دوسرا مچھر آیا۔ اس نے بھی کاٹا۔ اسے بھی مار دیا۔ اس طرف سے ایک جگنو کا گزر ہوا تو اس آدمی نے چیخ کر کہا "نادان کہیں کا اب ٹارچ لے کر آیا ہے!"

جناب علقمہ شبلی

بھارت درشن

ہندوستان ہے دیس ہمارا
تن، من اور جیون سے پیارا
تہذیبوں کا سنگم ہے یہ
اپنی جگہ پر قائم ہے یہ
پھولوں کا گل دستہ ہے
ایک دھنک رنگوں کا ہے
آؤ دیکھیں رنگِ گلشن
ہم بھی کر لیں بھارت درشن

پہلے دیکھو دل بھارت کا،
دلّی، جو ہے شہر پرانا
اس کی شوکت کا کیا کہنا؟
اس کی عظمت کا کیا کہنا؟
لال قلعے میں دیکھو اب بھی
شانِ گذشتہ اپنے وطن کی
دیکھو مسجد شاہ جہانی،
مہرولی میں لاٹ قطب کی
برلا کا یہ مندر دیکھو
اور یہ جنتر منتر دیکھو

روضہ ہے یہ تاج محل کا
پھول ہے گویا ایک کنول کا
پیار کی خوشبو اس میں بسی ہے
فن کی بڑائی اس میں رچی ہے
شاہ جہاں کا ہے یہ تحفہ
سپنا ہے ممتاز محل کا!

کاشی کے یہ گھاٹ بھی دیکھو
گنگا کا یہ پاٹ بھی دیکھو
ہے یہ زبانِ لکھنؤ سن لو
شانِ اودھ کی بات نہ پوچھو

سانچی کا ہے یہ استوپا
یہ ہے مندر ایلورا کا
غاروں میں یہ مورت دیکھو

گوتم جیون کا آئینہ
فن کاری کا ہے یہ نمونہ
دیوتاؤں کی صورت دیکھو

بمبئی کی چوپاٹی ہے یہ
پارک ہے سُندر یہ بھی دیکھو
جوتا ہے یا گاڑی؟ کہو تم
پودا ہے یا شیر کھڑا ہے؟

زرے بڑھ کرمائی ہے یہ
بچوں کی اک جنت کہہ لو
پتھر ہے یا ہاتھی؟ کہو تم
گھانسوں پر یا سانپ پڑا ہے

کلکتہ ہے شہر انوکھا
ہنگاموں کا مرکز سمجھو
چورنگی تو شان ہے اسکی
نرناری اور بوڑھے بچے
سامنے ہی وکٹوریہ بھی ہے
کالی کا یہ مندر دیکھو

اس کا ہر انداز نرالا
"شہر جلوسوں کا" یا کہہ لو
سچ پوچھو تو جان ہے اسکی
سب کا یہاں ہے میلہ جیسے
دھرتی پر یا "چاندپری" ہے
ہُگلی کا یہ منظر دیکھو

روپ ہیں یہ چند اپنے وطن کے
سب کو دیکھو ممکن ہے کب
اور کرو اندازہ ان سے
اپنے اپنے گھر کو چلو اب

بات یہ میری سنتے جاؤ
اپنے وطن کی شان بڑھاؤ
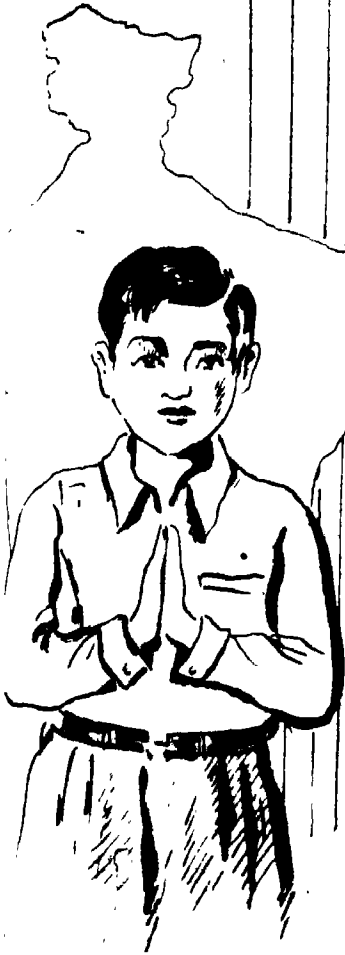
ہمارے چند لکھنے والے

شمیم حنفی — خالد عرفان — عادل جعفری

تایا یوسف ناظم — محمد امین — وقار خلیل
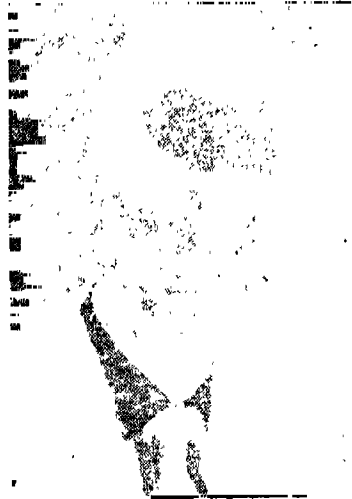
دنیا کی سب سے بڑی لائبریری "لائبریری آف کانگریس" (واشنگٹن) کا ایک اندرونی منظر

(بشکریہ یو، ایس، آئی، ایس)

جناب دینا ناتھ گردھر

دُنیا کی سب سے بڑی لائبریری

آپ کے مدرسہ میں لائبریری تو ہوگی۔ اور آپ اس لائبریری سے کتابیں لے کر پڑھتے بھی ہوں گے۔ شاید آپ کے محلے یا قصبے میں بھی کوئی لائبریری ہوگی۔ وہاں محلے یا قصبے کے لوگ اخبار، رسالے اور کتابیں پڑھتے ہیں اور اس طرح اپنی معلومات بڑھاتے ہیں —

پہلے ہمارے دیس میں لائبریریاں بہت کم تھیں اور جہاں تھیں بھی، وہاں بہت کم لوگ جاتے تھے۔ آزادی کے بعد جیسے جیسے تعلیم کا رواج بڑھتا گیا لوگوں میں اخبار اور کتابیں پڑھنے کا شوق بھی بڑھتا گیا۔ ہماری سرکار نے دیس کے مختلف حصوں میں کافی بڑی بڑی لائبریریاں قائم کی ہیں اور اس مطلب کے لیے لاکھوں روپے ہر سال نئی کتابیں، اخبار اور رسالے منگانے پر خرچ کیے جاتے ہیں۔

ہمارے دیس سے باہر دوسرے ملکوں میں، خاص کر امریکہ اور یورپ کے مختلف ملکوں میں تو اور بھی بہت بڑی بڑی لائبریریاں ہیں اور ان میں بڑی تعداد میں لوگ مطالعہ کے لیے جاتے ہیں۔

آیئے آج آپ کو ایک ایسی لائبریری کی سیر کرائیں جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی لائبریری ہے۔ یہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے دارالخلافہ واشنگٹن میں ہے۔ جس کو لائبریری آف کانگریس (یعنی کانگریس کی لائبریری) کہتے ہیں۔ جی ہاں، دنیا کی یہ سب سے بڑی لائبریری ہے۔

یہ لائبریری کئی عمارتوں میں ہے۔ ان میں سے دو عمارتیں تو اتنی بڑی ہیں جیسے شاہی محل ہوں۔ ہر عمارت کی ظاہری شکل و صورت اتنی ہی دل فریب اور دیدہ زیب ہے جتنی ان کے اندر کتابوں اور دوسری چیزوں کی قرینے سے ترتیب اور سجاوٹ۔

لائبریری کیا ہے، علم و ادب کا نادر خزانہ ہے۔ مطالعہ، تحقیق اور ریسرچ کا بے مثال مرکز اور لاکھوں سیاحوں کے لیے کشش کی جگہ ہے۔

اس لائبریری میں ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ کتابیں ہیں۔ اور چھ کروڑ سے زیادہ تعلیمی گراموفون ریکارڈ۔ نقشے۔ چارٹ۔ کھلونے اور دوسری دل چسپی کی چیزیں ہیں۔ یہاں ہر سال لگ بھگ، دو کروڑ لوگ مطالعہ کے لیے آتے ہیں۔

لائبریری کتنی بڑی ہے اس بات کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکیں گے کہ اس کی مختلف عمارتوں میں کل ملا کر ایک ہزار سے زیادہ کمرے ہیں۔ اس میں کتابوں اور دوسری چیزوں کے کمرے مطالعہ کے کمروں سے بالکل الگ ہیں۔

مطالعہ کے لیے ایک سو کے قریب بڑے بڑے ہال ہیں۔ جن میں بیک وقت پچاس ہزار آدمی بیٹھ کر مطالعہ کرسکتے ہیں ہر ایک آدمی کے لیے ایک کرسی۔ ایک چھوٹی میز۔ قلم دوات۔

خالی کاغذ مہیا کیے جاتے ہیں تاکہ مطالعہ کے دوران اگر کوئی بات لکھ لینے کی ہو تو لکھ لی جائے۔ ہر ہال کے ساتھ چار چار ہاتھ روم بنائے گئے ہیں۔ ہال کے اندر آرام کرنے کے لیے کئی کئی صوفے مہیا کیے گئے ہیں۔ تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو تھکان محسوس ہو تو ان صوفوں پر آرام کرلیا کریں۔

لائبریری کے اندر ایسے کمرے بھی بنائے گئے ہیں جہاں کنسرٹ، ناچ گانے، لیکچر، نمائشیں ہوتی ہیں۔ دنیا میں جرمن زبان میں سب سے پہلی جو مکمل بائبل تیار ہوئی تھی وہ یہاں ہے۔ امریکہ کے بڑے بڑے رہنماؤں کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے مسودے ان کے خط ان کی بنائی ہوئی تصویریں جمع کی گئی ہیں

امریکہ کی آزادی کے اعلان کا رف مسودہ جو اس وقت کے صدر ٹامس جیفرسن نے ہاتھ سے تیار کیا تھا اور جس میں کئی جگہ کاٹ چھانٹ اور اصلاحیں کی گئی تھیں وہ رف ڈرافٹ بھی محفوظ ہے۔

امریکہ میں امیر لوگ غریب لوگوں کو باقاعدہ خرید لیتے تھے اور انھیں غلام بناتے تھے ایک غلام کے ساتھ اس کی بیوی بچے بھی غلام بن جاتے تھے۔ ابراہم لنکن نے وہاں کا صدر بننے کے بعد اس غلامی کا خاتمہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر امریکہ کا وہ طبقہ جو غلامی کے حق میں تھا اور زیادہ مالدار اور طاقت ور بھی تھا۔ لنکن کے خلاف ہوگیا۔ لنکن کے حامیوں اور غلامی کے حامیوں میں ایک طویل اور خوفناک جنگ ہوئی۔ اس موقع پر لنکن نے ایک تقریر کی جسے گٹس برگ تقریر کہتے ہیں۔ یہ تقریر ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے بعد بھی آج دنیا کے آزاد ملکوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ اس تقریر کے پہلے دو رف مسودے جو لنکن کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اس لائبریری میں موجود ہیں۔

لائبریری میں لوگوں کو کتابیں ڈھونڈنا نہیں پڑتیں۔ مطالعہ کرنے والے اسی مطلب کے بنے ہوئے کسی ہال میں جاتے ہیں اپنی مطلب کی کتاب کا نام اس کے مصنف کا نام اس کا نفس مضمون کتاب کا نمبر وغیرہ جو کچھ بھی معلوم ہو ایک کاغذ پر لکھ کر اپنی میز پر رکھ دیتے ہیں۔ بٹن دباتے ہی وہ کاغذ اس ہال کے لائبریرین کے پاس پہنچ جاتا ہے اور کتاب چاہے لائبریری کے کسی حصے میں ہو فوراً حاضر ہوجاتی ہے۔ اگر وہ کتاب اتفاق سے نہ مل سکے تو نئی مہیا کی جاتی ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے فوری طور پر ایک کتاب دیکھنی چاہی۔ اتفاق سے وہ کتاب کئی دن پہلے امریکہ کے صدر کے دفتر نے منگائی تھی اور صدر اس کا مطالعہ کر رہے تھے۔ لائبریری سے کتاب کی فوری واپسی کے لیے فون کیا گیا اور نصف گھنٹے کے اندر اندر وہ کتاب اس شخص کی میز پر پہنچ گئی۔

لائبریری کی کچھ خاص خاص باتیں سنیے۔

(۱) یہاں ڈیڑھ کروڑ کتابیں اور چھ کروڑ دوسری چیزیں ہیں — ہر ماہ ان میں سترہ ہزار کا اضافہ ہوتا ہے۔

(۲) لائبریری دنیا کے مختلف ممالک کی ستائیس ہزار دوسری لائبریریوں سے حسب ضرورت کتابوں کا تبادلہ کرتی ہے۔

(۳) لائبریری کی کتابوں اور دوسری چیزوں کا انڈکس مکمل رکھنے پر ہر سال ستر لاکھ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ اس سے آپ کتابوں اور دوسری چیزوں کی اپنی قیمت کا اندازہ کرسکتے ہیں —

(۴) لائبریری میں اردو، ہندی، پشتو، جیسی زبانوں کو ملا کر ۱۸۳ زبانوں میں کتابیں ہیں۔

(۵) کتابوں اور دوسرے سامان کو رکھنے کے لیے جو شیلف بنائے گئے ہیں ان کی کل لمبائی تین سو میل کے قریب ہے۔

اردو لکھیے — اردو پڑھیے — اردو بولیے

بلغاریائی کہانی
ترجمہ حمید عثمانی

سیر کا سوا سیر

ایک کسان تھا وہ بہت بے ایمان تھا۔ لوگوں کے ہاتھ اناج بیچتا اور انھیں خوب دھوکا دیتا۔ کسی کو کم اناج دیتا اور کسی سے زیادہ پیسے وصول کرلیتا۔ اس طرح بے ایمانی کر کرکے اس نے بہت دولت جمع کرلی۔

ایک سال کی بات ہے۔ کسان نے اناج بویا، بارش اچھی ہونے سے فصل بھی بہت اچھی ہوئی۔ کسان کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ جدھر نظر دوڑاتا ہریالی ہی ہریالی دکھائی دیتی۔ ہوا چلتی تو اناج کے پودے لہراتے اور ان سے سرسر کی آواز آتی یہ سب دیکھ کر کسان کا دل خوشی سے ناچ اٹھتا کب اس کو کاٹوں اور دام کھرے کروں۔ یہی خیال اس کو دن رات گھیرے رہتا۔ بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کرکے انھیں خیالوں میں گم وہ لوگوں کو اناج خریدتے اور پیسے دیتے دیکھتا۔ پھر ان پیسوں کی بڑی بڑی ڈھیریاں بنتے دیکھتا۔ یوں ہی تصور میں وہ بہت سے خیالی محل بنا ڈالتا۔

اب کھیت کاٹنے کی باری آئی۔ اس کا کھیت بہت بڑا نہیں تھا۔ اس نے سوچا لاؤ ایک مزدور بلا کر اس سے کھیت کٹوالو زیادہ پیسے بھی نہ خرچ ہوں گے اور گاؤں والوں پر رعب بھی پڑے گا۔ یہ سوچ کر وہ دوسرے ہی دن گاؤں سے ایک غریب مزدور پکڑ لایا، اور اس کے ہاتھ میں درانتی دے کر رعب دار آواز میں بولا۔

"اے یہ لے درانتی اور جلدی کام شروع کر اندھیرا ہونے تک کام کرنا پڑے گا۔ اس کے بدلے میں ایک تھیلی اناج ملے گا بول منظور ہے؟" اس غریب نے خوشی خوشی ہاں کردی اور کھیت کاٹنا شروع کردیا۔

کٹائی کے لیے کافی طاقت کی ضرورت تھی مگر اس میں اتنی طاقت ہی کہاں تھی ـ بے چارہ دو تین دن کا بھوکا تھا اور آہستہ آہستہ کام کر رہا تھا ۔ کسان نے یہ دیکھا مگر کچھ بولا نہیں ۔

شام ہوئی اور اندھیرا چھانے لگا ۔ دھیرے دھیرے سورج بھی چھپ گیا ۔ تمام دن اس مزدور نے محنت کی مگر وہ پورا کھیت نہ کاٹ سکا ۔ معاہدے کے مطابق وہ کسان کے پاس آیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا ۔

"کیا بات ہے" کسان نے لال پیلی آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا ۔

"مالک اناج کے لیے تھیلی لینے جاتا ہے" مزدور نے دھیرے سے کہا ۔

"ارے مگر ابھی اندھیرا ہوا ہی کہاں" کسان نے جھلا کر کہا ۔

مزدور دنگ رہ گیا اور سوچنے لگا یہ آخر کیا کہہ رہا ہے ۔ اندھیرا تو کب کا ہو چکا ہے کہیں اس کا دماغ تو نہیں چل گیا !

پھر کسان نے ڈانٹتے ہوئے کہا "اندھیرا ہوا ہی کہاں سورج گیا تو چاند آ گیا یہ بھی تو روشنی دیتا ہے ۔ ہاں یہ نہ نکلا ہوتا تو اندھیرا ہوتا ۔ پر دیکھ تو کس طرح جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے ۔ ہے نا اور پھر یہ تو سورج کا بھائی ہی ہے چل جا سیدھا کھیت پر ۔

مزدور اس قدر عجیب جواب سن کر حیران تو ہوا ہی ساتھ ہی اسے ناامیدی بھی ہوئی مگر وہ کچھ بولا نہیں اور ہاتھ میں درانتی لے کر کام کرنے لگا ۔

ایک تو اسے زور سے بھوک لگ رہی تھی ۔ اس پر اس قدر لالچی اور بے ایمان مالک مل جانے کی کوفت سے اس کا پورا جسم جلنے لگا ۔ اس کا جی چاہا کہ کام چھوڑ کر بھاگ جائے مگر پھر بال بچوں کا خیال آ گیا ۔ مجبوری کا نام صبر ہے ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ مگر وہ انھیں پی گیا اور چپ چاپ کام کرتا رہا ۔

کھیت میں بیٹھا ہوا کسان یہ سب دیکھ رہا تھا اور مزدور کو بے وقوف بنا کر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا مزدور بے چارا بے بس کبھی ادھر دیکھتا کبھی ادھر اس کا دل رو رہا تھا ۔

وہ اللہ میاں کی گائے کی طرح چپ چاپ کام کرتا رہا اور صبح ہوتے ہوتے اس نے پورا کھیت کاٹ کر صاف کر دیا ۔ بس اب اناج ملنے ہی والا ہے یہ سوچ کر وہ رات کا دکھ بھول گیا ۔ درانتی ایک کنارے ڈال دی اور کسان کی چارپائی کے پاس آ کھڑا ہوا ۔

"چل جلدی تھیلی لے آ" تھوڑی دیر وہ کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر گھر کی طرف بھاگا اتنی دیر میں کسان اناج لے کر بیٹھ گیا اور مزدور کی راہ دیکھنے لگا ۔

مزدور ان باتوں کے باوجود ہراساں نہیں ہوا تھا ۔ اس نے بھی ایک ایسا تھیلا اٹھایا جس میں پانچ فٹ کا پورا آدمی سما جائے اور کسان کے پاس جا پہنچا ۔

"ارے یہ کیا لے آیا" اتنا بڑا تھیلا دیکھتے ہی کسان بولا ۔

"تھیلا" فوراً ہی اس نے جواب دیا ۔

"لیکن میں نے تو تم سے تھیلی لانے کے لیے کہا تھا نا" کسان نے متعجب ہو کر پوچھا ۔

"کیوں سیٹھ اب اس میں کیا عذر ہے یہ تو تھیلی کا بھائی ہے" اس نے ہنستے ہوئے کہا ۔

"چل چل تھیلا بھی کہیں تھیلی کا بھائی ہوتا ہے" کسان نے غصے میں کہا ۔

"کیوں نہیں آپ تو کمال کرتے ہیں" اس نے بن کر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔

"ارے مجھے سمجھا تو سہی" کسان نے غصے میں آگ بگولا ہو کر مزدور سے دریافت کیا ۔

"اس میں سمجھانے کو ہے ہی کیا جس طرح چاند سورج کا بھائی ہوتا ہے ۔ اسی طرح تھیلا تھیلی کا بھائی ہوتا ہے" مزدور نے زور سے ہنستے ہوئے کہا ۔

(گجراتی سے)

یہ سن کر کسان لاجواب ہوگیا۔ ساتھ ہی اسے بہت دکھ بھی ہوا۔ اب اسے اپنی بے ایمانی پر پچھتاوا ہو رہا تھا وہ اندر ہی اندر جل بھن کر راکھ ہوا جا رہا تھا۔ مگر اس نے پورا تھیلا اناج سے بھر کر دے دیا۔

اناج سے بھرا ہوا تھیلا پاکر مزدور ناچتا کودتا گھر کی طرف بھاگا۔

نظر کا دھوکا

بتائیے کون سی لائن بڑی ہے
ا ب —؟ یا ب ج —؟
ب ج۔! کیوں ٹھیک ہے نا؟
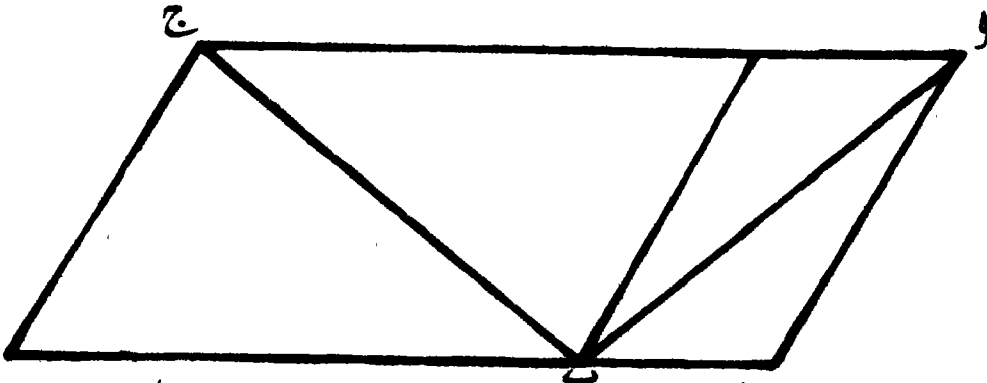
جی نہیں آپ دھوکا کھا گئے — دونوں لائنیں بالکل برابر ہیں۔! یقین نہیں آتا ہے تو ناپ کر دیکھ لیجیے۔

جناب مختار بارہ بنکوی
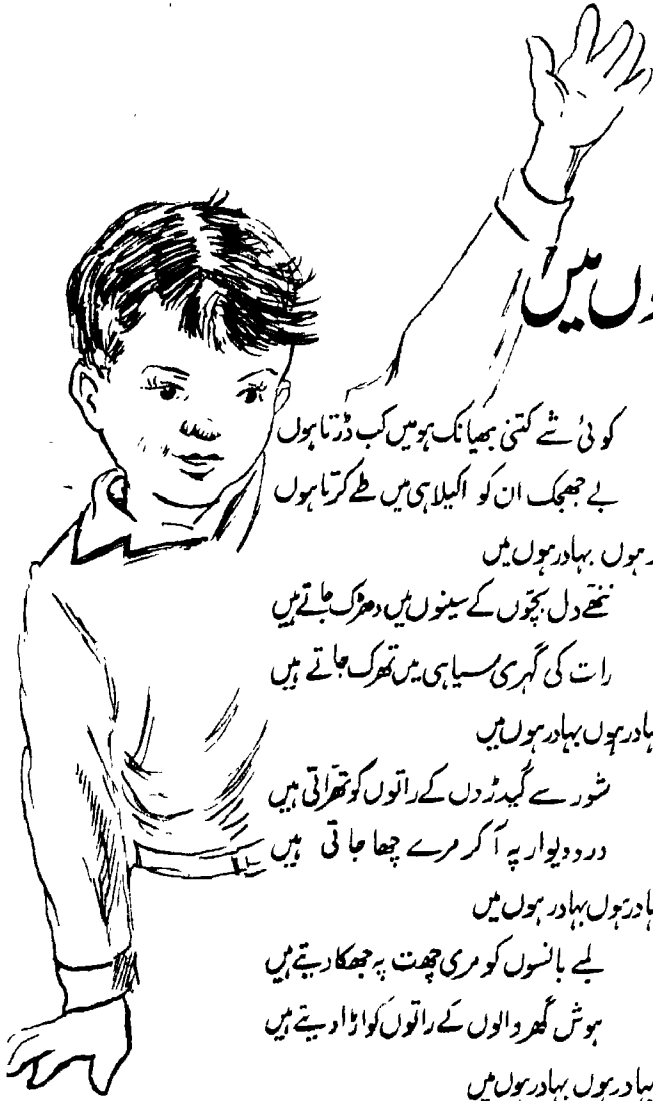
بہادر ہوں میں

عمر میری تو بہت کم ہے مگر ہمت ہے — کوئی شے کتنی بھیانک ہو میں کب ڈرتا ہوں
رات اندھیری ہو گھنا بن ہو کھنڈر ہو کوئی — بے جھجک ان کو اکیلا ہی میں طے کرتا ہوں
منچلا ہوں میں بہادر ہوں بہادر ہوں میں

میاؤں کرتی ہے جو بلّی کوئی اندھیارے میں — ننھے دل بچوں کے سینوں میں دھڑک جاتے ہیں
چمچاتی ہوئی آنکھوں کے بھیانک شعلے — رات کی گہری سیاہی میں تھرک جاتے ہیں
کیوں ڈروں میں کہ بہادر ہوں بہادر ہوں میں

میرے پچھواڑے کی گنجان و گھنیری جھاڑیں — شور سے گیدڑوں کے راتوں کو تھراتی ہیں
چادریں ٹھنڈے دھندلکے کی جو بڑھتے بڑھتے — درودیوار پہ آکر مرے چھا جاتی ہیں
کیوں ڈروں میں کہ بہادر ہوں بہادر ہوں میں

سنسناتی ہوئی راتوں میں ہوا کے جھونکے — لمبے بانسوں کو مری چھت پہ جھکا دیتے ہیں
چیختی شامیں دھڑکتے سے تنے پیڑ دلکے — ہوش گھر والوں کے راتوں کو اڑا دیتے ہیں
کیوں ڈروں میں کہ بہادر ہوں بہادر ہوں میں

غول بادل کے جو بپھرے ہوئے دیووں کی طرح — چیخ کر قلب کو سینوں میں ہلا دیتے ہیں
خوں میں لتھڑے ہوئے طوفانوں کے ظالم پنجے — کود دریا کو مسل کر جو ملا دیتے ہیں
کیوں ڈروں میں کہ بہادر ہوں بہادر ہوں میں
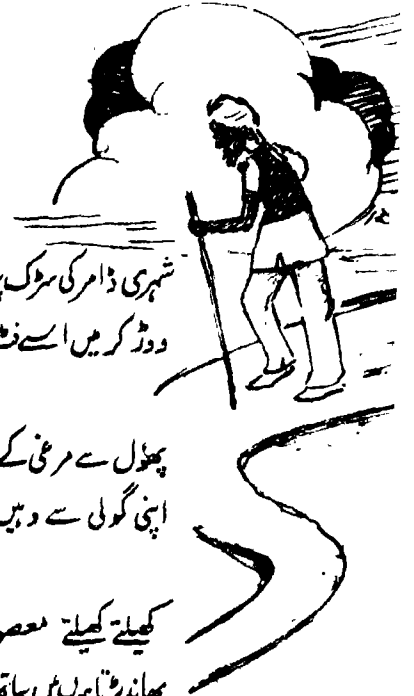
شہری ڈامر کی سڑک پر جو اپاہج بوڑھا ہانپتا چلتا ہے اور چل کے ٹھہر جاتا ہے
دوڑ کر میں اسے فٹ پاتھ پہ کر دیتا ہوں شور کرتا ہوا جب کوئی ٹرک آتا ہے

اک خدا ترس بہادر ہوں بہادر ہوں میں

پھول سے مرغی کے بچے کو گڑو کر پنجے نوچ کر کھانے کو جب چیل اٹھا لیتی ہے
اپنی گولی سے وہیں میری ہوائی بندوق ننھی سی جان کو ظالم سے چھڑا لیتی ہے

اک خدا ترس بہادر ہوں بہادر ہوں میں

کھیلتے کھیلتے معصوم سا ننھا ناداں گھر کے اک گہرے کنوئیں میں جو لڑھک جاتا ہے
پھاند پڑتا ہوں میں ساتھ اس کے کنوئیں کے اندر زندہ جاں وہ مری ہمت سے نکل آتا ہے

ایک ہمدرد بہادر ہوں بہادر ہوں میں

ملک اور قوم کی خدمت کو سمجھتا ہوں میں فرض تیر جاؤں گا اگر آگ کا دریا آجائے
رات دن ہے مری کوشش کہ مرے دیش کا بھی آسمانوں کی بلندی پہ ستارہ آجائے

خادمِ ملک بہادر ہوں بہادر ہوں میں!

جناب غلام یزدانی

ہمارا کرۂ ہوائی

ہماری زمین کے چاروں طرف کئی سو میل کی بلندی تک ہوا پھیلی ہوئی ہے اور اُسے ایک غلاف کی طرح گھیرے ہوئے ہے۔ ہوا کے اسی غلاف کو کرۂ ہوائی کہتے ہیں۔ جس طرح مچھلیاں پانی میں رہتی ہیں اسی طرح ہم ہوا کے سمندر میں رہتے ہیں۔ مچھلیاں پانی کے بغیر کچھ دیر زندہ رہ سکتی ہیں مگر ہم ہوا کے بغیر چند منٹ بھی نہیں جی سکتے۔ ہوا کی مدد سے بادبانی کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں۔ بعض ملکوں میں اس سے چکیاں چلاتے ہیں جن سے آٹا پیستے اور بجلی پیدا کرتے ہیں۔ اسی کی بدولت ہم ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر آسمانوں کی سیر کرتے ہیں۔ اور مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہوا سے اور بہت سے فائدے ہیں۔ ان میں سے چند کے بارے میں ہم کچھ مزے دار باتیں بتاتے ہیں۔

دنیا میں بے شمار قسم کے چھوٹے بڑے درخت ہیں ان میں رنگ رنگ کے پھول پتے ہوتے ہیں جن سے ہماری زمین اتنی خوبصورت بن گئی ہے۔ درخت اپنی خوراک دو طرح سے حاصل کرتے ہیں۔ ایک جڑوں کے ذریعے زمین سے اور دوسرے پتوں کے ذریعے ہوا سے۔ اگر درخت کو بہت دنوں تک پانی نہ ملے تو اس کے پتے ہوا سے اپنی خوراک حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اگر ہوا نہ ہوتی تو نہ انسان اور حیوان زندہ رہتے اور نہ کوئی درخت باقی رہتا۔

ایک چھوٹی سی موم بتی کو شیشے کے گلاس میں رکھ کر جلاؤ اور گلاس کو اوپر سے ڈھک دو۔ بہت جلد موم بتی بجھ جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ موم بتی ہوا کے بغیر نہیں جل سکتی۔ موم بتی ہی نہیں ہر چیز کے جلنے کے لیے ہوا کا ہونا ضروری ہے۔ اور جب تک کسی چیز کو جلایا نہ جائے آگ پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر دنیا میں ہوا نہ ہوتی تو آگ بھی نہ ہوتی۔ اب سوچو اگر آگ نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ نہ تمھارا کھانا پکتا نہ تمھارے گھر میں رات کو روشنی ہوتی۔ نہ سردی میں نہلانے کے لیے تمھیں گرم گرم پانی ملتا اور نہ ہاتھ تاپنے کے لیے انگیٹھی میں دہکتی ہوئی آگ۔

جس طرح پانی میں لہریں پیدا ہوتی ہیں اسی طرح ہوا کے سمندر میں آواز کی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر تم تالی بجاؤ تو اس صدمے سے ہاتھ کے قریب کی ہوا میں آواز کی لہریں پیدا ہوں گی اور یہ لہریں ہمارے کان تک پہنچیں گی۔ اسی کو آواز کہتے ہیں۔ اگر ہوا نہ ہو تو آواز کی لہریں ہمارے کان تک نہیں پہنچ سکتیں اور ہم کو کوئی آواز سنائی نہیں دے گی۔ اب غور کرو اگر ہوا نہ ہوتی تو ہماری دنیا کا کیا حال ہوتا۔ ہر طرف ایک سناٹا چھایا ہوتا۔ نہ کوئی آواز ہوتی نہ شور و غل۔ نہ آسمان پر بادل گرجتے، نہ باغوں میں چڑیوں کے چہچہے ہوتے۔ ہمارے برابر سے موٹریں اور ریلیں گزر جاتیں اور ہمیں خبر تک نہ ہوتی!

گراموفون ہوتے نہ ریڈیو۔ بس یوں سمجھ لو ساری دنیا خاموش
وں کی طرح ہوتی اور سب کام اشاروں سے ہوتے۔

کسی شیشے کے گلاس میں برف بھر کر رکھ دو تھوڑی دیر میں دیکھو گے کہ گلاس کی باہر کی سطح پر ننھی ننھی بوندیں جمع ہو گئی ہیں۔ بھلا یہ بوندیں کہاں سے آگئیں۔ یہ کام بھی ہوا ہی کا ہے۔ ہوا میں پانی کے اجزات ملے ہوتے ہیں جب یہ اجزات گلاس کی ٹھنڈی سطح سے چھوتے ہیں تو جم کر پانی بن جاتے ہیں۔ صبح کو ہری ہری گھاس پر شبنم کی جو بوندیں ہوتی ہیں اور پھولوں پر جو اوس کے قطرے ہوتے ہیں وہ یہی رطوبت ہوتی ہے۔ ہوا میں جو یہ رطوبت ہوتی ہے اس سے ہمیں بہت سے فائدے ہیں۔ سورج کی کرنوں میں بڑی گرمی ہوتی ہے۔ جب یہ کرنیں زمین پر پڑتی ہیں تو ہوا کی یہ رطوبت کرنوں کی گرمی کو کم کر دیتی ہے۔ اگر ہوا میں یہ رطوبت نہ ہوتی تو سورج کی کرنیں ہم کو ایک ہی دن میں جھلس دیتیں۔ دن بھر سورج کی کرنوں سے زمین میں جو حرارت جمع ہوتی رہتی ہے سورج چھپتے ہی یہ حرارت زمین سے نکل بھاگنا چاہتی ہے۔ مگر ہوا کی یہ رطوبت اس حرارت کو نکلنے سے روکتی ہے اور خود گرم ہو جاتی ہے۔ اگر ہوا میں یہ رطوبت نہ ہوتی تو زمین ایک ہی رات میں اتنی ٹھنڈی ہو جاتی کہ ہم ٹھٹھر کر رہ جاتے۔ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر جو ہمیشہ برف جمی رہتی ہے اس کی بھی یہی وجہ ہے۔ جوں جوں ہم زمین سے اوپر جاتے ہیں ہوا ہلکی ہوتی جاتی ہے اور ہمالیہ کی چوٹی کے قریب یہ ہوا اتنی ہلکی ہو جاتی ہے کہ زمین کی گرمی کو نکلنے سے نہیں روک سکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بلند پہاڑوں کی چوٹیاں ٹھنڈی ہو کر برف سے ڈھک جاتی ہیں۔ پہاڑوں کی بلند چوٹیاں میدانوں کی نسبت سورج سے زیادہ قریب ہیں۔ وہاں زیادہ گرمی ہونی چاہیے مگر چوں کہ وہاں کی ہوا اتنی بھاری نہیں ہے کہ وہ سورج سے آئی ہوئی گرمی کو نکلنے سے روک سکے اس لیے وہاں ہر طرف برف جمی رہتی ہے۔ چاند میں ہوا نہیں ہے اس لیے وہاں دن میں اتنی گرمی ہوتی ہے کہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ اور رات میں اتنی سردی کہ آدمی ٹھٹھر کر رہ جائے۔ اب تمھیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہمارا یہ کرۂ ہوائی زمین کے لیے ایک ایسے لحاف کا کام کرتا ہے جو ہمیں گرمی اور سردی دونوں سے بچاتا ہے۔

تالابوں، ندی نالوں، دریاؤں اور سمندروں کا پانی سورج کی گرمی سے بخار بن کر ہوا میں ملتا رہتا ہے۔ یہی بخارات بادل بنتے ہیں جن کو ہوا اپنے کندھوں پر لیے پھرتی ہے اور جہاں چاہتی ہے مینھ برسا دیتی ہے۔ کبھی جی چاہتا ہے تو اولے بھی برسا دیتی ہے جن کو تم بڑی خوشی سے چنتے ہو۔ غرض کہر، پالا، اوس اور مینھ سب ہوا کے کھیل ہیں۔

شام کو جب سورج ڈوبتا ہے تو آسمان پر سُرخی دوڑ جاتی ہے اور لال لال، سنہری پیلے اور نارنجی رنگ بڑی بہار دکھاتے ہیں۔ اسی طرح صبح کو جب سورج نکلتا ہے تو مشرق میں آسمان سرخ ہو جاتا ہے۔ آسمان کی یہ رنگینی بھی ہوا کی وجہ سے ہے۔ یہ خوبصورت رنگ ہوا میں گرد کے چھوٹے چھوٹے ذرّوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی رات کو چاند کے گرد ہالا دکھائی دیتا ہے یا مینھ برسنے کے بعد آسمان پر رنگ برنگ کی خوبصورت دھنک دکھائی دیتی ہے۔ یہ سب ہوا اور اس کے ذرات کا کام ہے۔ اس کا حال تم آگے چل کر اپنی سائنس کی کتابوں میں پڑھو گے۔ یہاں اتنا اور یاد رکھو کہ ہوا میں یہ ذرّے نہ ہوتے تو آسمان نیلا نہ دکھائی دیتا بلکہ کالا نظر آتا۔

اور تارے دن کو بھی دکھائی دیتے۔ کیسا بھیانک سماں ہوتا جب کالے کالے آسمان میں سے دن کے وقت تارے ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتے۔ چاند کا بالکل یہی حال ہے۔ وہاں کا آسمان کالا ہے اور سورج کے ساتھ دن میں تارے بھی چمکتے رہتے ہیں۔

رات کے وقت تم نے آسمان پر تاروں کو ٹوٹتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا۔ یہ بھی ہمارے کرۂ ہوائی کی پیداوار ہیں۔ یہ تارے بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔ مگر یہ بڑی تیز رفتار سے آسمانوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ جب کبھی یہ ہمارے کرۂ ہوائی میں سے گزرتے ہیں تو ہوا کی رگڑ سے ان میں اتنی گرمی پیدا ہوتی ہے کہ بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور آسمان پر روشنی کی ایک لکیر بناتے ہوئے جل کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر ہوا نہ ہوتی تو یہ نظر ہی نہ آتے اور بندوق کی گولیوں کی طرح دن رات زمین پر برسا کرتے اور شاید کوئی آدمی زندہ نہ رہتا۔ پہلے زمانے میں جب سپاہی لڑائی کے میدان میں جاتے تو بدن پر لوہے کی زرہ بکتر پہن کر جاتے تھے۔ جس سے وہ دشمن کے تیروں کی بوچھار اور تلوار کے وار سے محفوظ رہتے تھے۔ ہماری زمین کے گرد یہ ہوائی کرّہ زرہ کا کام کرتا ہے۔ یہ نہ صرف گرمی یا سردی سے بچاتا ہے بلکہ ٹوٹنے والے تاروں کی مار سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔

جب تم بڑے ہوگے اور کالج میں جاؤ گے تو تمھیں معلوم ہوگا کہ ہوا کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ ہوا ہر چیز پر اپنا دباؤ ڈالتی ہے جسے کرۂ ہوائی کا دباؤ کہتے ہیں ہوا کے اس دباؤ کو کام میں لاکر ہم نے طرح طرح کی مشینیں بنائی ہیں جن سے دنیا کے بڑے بڑے مشکل کام بہت ہی آسانی سے ہو جاتے ہیں۔

ہماری زندگی کے لیے کھانا اور پانی ضروری ہیں ان میں کھانے سے زیادہ ضروری پانی ہے۔ اسی لیے زمین پر ایک حصہ خشکی ہے اور تین حصہ پانی ہے۔ مگر پانی سے بھی زیادہ ضروری چیز ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین پر ہر جگہ چاہے وہ خشکی ہو کہ تری ہوا ہی ہوا ہے۔ غریب آدمی کو ایک وقت کی روٹی نہ ملے تو پیاس بجھانے کو پانی ہر جگہ مل جاتا ہے لیکن جب پانی بھی نہ ملے جیسا بعض ریگستانوں میں ہوتا ہے تو سانس لینے کو ہوا اُسے ہر جگہ اور ہر وقت مل جاتی ہے۔ کھیتوں پر امیر اور دولت مند قبضہ کر سکتے ہیں۔ دریاؤں اور سمندروں پر ملکوں کی حکومت ہو سکتی ہے مگر ہوا پر کسی کا زور نہیں۔ یہ ہر غریب اور امیر کی یکساں خدمت کرتی ہے۔ یہی خدا کی وہ نعمت ہے جو سب کے لیے برابر برابر اتاری گئی ہے اور یہی وہ دولت ہے جو دنیا کے سارے انسانوں میں برابر برابر تقسیم ہوئی ہے۔

جناب کوثر اعظمی

کہنے کو ہم....

(۱)

ہم دنیا کی آنکھ کے تارے، ہم دھرتی کے لال ہیں
سُندر سُندر کومل کومل پھولوں کی ہم ڈال ہیں
علم و ہُنر کی دولت سے ہم بچے مالا مال ہیں
ہم نینوں کی جوت ہیں سب کے سینوں کے ارمان ہیں
کہنے کو ہم بھولے بھالے بالک ہیں نادان ہیں

(۲)

بھولی بھالی باتیں اپنی، بھولے بھالے کام ہیں
عبداللہ، کملیش، کنور سنگھ، ہنری اپنے نام ہیں
ہم قدرت کا دنیا والو! سوچو تو انعام ہیں
گھر گھر جس سے رونق ہے ہم وہ ننھے مہمان ہیں
کہنے کو ہم بھولے بھالے بالک ہیں نادان ہیں

(۳)

مل جل کر ہم پڑھنے جائیں مکتب میں اسکول میں
مل جل کر ہم باہم کھیلیں اس دھرتی کی دھول میں
کرنیں جیسے تاروں میں ہوں خوشبو جیسے پھول میں
ہم سے سیکھو ایکتا لوگو! ہم ایکتا کی جان ہیں
کہنے کو ہم بھولے بھالے بالک ہیں نادان ہیں

(۴)

کھینچا تانی مارا ماری سے ہم کوسوں دور ہیں
نفرت کے اندھیر نگر میں ہم الفت کا نور ہیں
ہر دل میں گھر کر لینے میں ماہر ہیں مشہور ہیں
ہم جیون کی آن ہیں لوگو ہم دھرتی کی شان ہیں
کہنے کو ہم بھولے بھالے بالک ہیں نادان ہیں

(۵)

اپنے کارن آج منش کا بیڑا ڈانوا ڈول ہے
ہم بچوں کی بات نرالی، بات ہے جو انمول ہے
میٹھے میٹھے شبد ہمارے من موہت ہر بول ہے
جس پر ناز کرے اک دنیا ہم ایسی سنتان ہیں
کہنے کو ہم بھولے بھالے بالک ہیں نادان ہیں

(۶)

سب سے پریم سبھی کی سیوا ہم بچوں کی ریت ہے
پریم چلن ہی سچ پوچھو تو اپنی جیون جیت ہے
اپنا نغمہ پیارا نغمہ کوثر کا یہ گیت ہے
بَیر کسی سے کیوں ہم رکھیں آخر کو انسان ہیں
کہنے کو ہم بھولے بھالے بالک ہیں نادان ہیں

جناب جمیل الدین احمد قریشی

کتاب کی کہانی

واہ بھئی۔ کتنی خوبصورت کتنی پیاری کتاب ہے آپ کے ہاتھ میں۔ لکھائی چھپائی کتنی اچھی ہے اور تصویریں ایک سے ایک رنگین، کئی کئی رنگوں کی۔

سچ مچ آپ بڑے خوش نصیب ہیں۔ اب سے ہزاروں برس پہلے کے بچوں کو یہ نعمت کہاں میسر تھی۔ وہ بے چارے تو کتاب کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ اس طرح کی کوئی چیز اس وقت موجود ہی نہ تھی۔ لکھنے کے لیے حرف تک تو ایجاد ہوئے نہ تھے۔

کہتے ہیں مصریوں نے سب سے پہلے حرف ایجاد کیے۔ یہ حرف کیا ہوتے تھے طرح طرح کی تصویریں ہوتی تھیں۔ اب

لکھیں کا ہے پر؟ آپ جانیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اس کے لیے انھوں نے ایک درخت کی چھال استعمال کی۔ دریائے نیل کے کنارے پائے پرس کا ایک پیڑ ہوتا تھا۔ یہ چھال اسی

کی ہوتی تھی۔ اس چھال کی لگ بھگ ایک فٹ چوڑی پٹیاں بنالی جاتی تھیں۔ ضرورت کے وقت انھیں آپس میں جوڑ بھی لیا جاتا تھا۔ یہ پٹیاں کہتے ہیں ۱۳۰ فٹ تک لمبی ہوتی تھیں اور ان پر سرکنڈے کے قلم سے قریب قریب لکھتے تھے۔ انھیں تھوڑا تھوڑا کھول کر پڑھتے۔

توجناب یوں سمجھیے کہ مصریوں نے کتابیں لکھنے کا دروازہ کھول دیا۔ انگریزی زبان میں کاغذ کو پیپر (Paper)

کہتے ہیں۔ یہ اسی پاپُرس کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

کہتے ہیں فنیقیوں نے یا بے بی لون والوں نے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا۔ یہ مٹی کی بڑی ٹکیاں، کیک یا آپ کے بسکٹ جیسی شکل بنا کر پکا لیتے تھے اور اس پر لکھتے تھے۔ انھوں نے لکھنے کا طریقہ بھی نیا ایجاد کیا۔ اس طریقے یا رسم الخط میں تصویریں نہیں ہوتی تھیں کچھ مقرّرہ نشان ہوتے تھے۔

پرانے زمانے میں روم کے بادشاہوں نے چھال کے علاوہ بھیڑ اور بچھڑے کی چھال کو لکھنے کے لیے موزوں سمجھا۔ چھال کے مقابلے میں اس پر لکھائی بھی اچھی ہوتی تھی اور پائیداری بھی زیادہ تھی۔ اس کھال کو ویلم (VELLUM) کہتے تھے۔ روم اور یونان کی ادبی کتابیں غالباً اسی طرح لکھی گئی تھیں۔

اس کے بعد کتاب کی ایک نئی قسم سامنے آئی۔ اسے کوڈیکس (CODEX) کہتے تھے۔ یہ ویلم کی تین چار شیٹوں کو جوڑنے سے بنی۔ اس طریقے کو گیدرنگ (GATHERING) کہتے تھے۔ اس طرح دھیرے دھیرے یہ کتاب کی ایسی شکل اختیار کرتی گئی جیسی ہزاروں سال بعد آج ہمارے آپ کے سامنے ہے۔

اور سنیے کتاب کی موجودہ شکل میں آنے سے پہلے لکھنے والے بھی بہت کم تھے۔ ایک شخص کی لکھائی کو دوسرے کے لیے پڑھنا آسان نہ ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک مزے دار قصہ سنیے۔ ایک راجہ صاحب نے ایک صاحب کو کوئی کتاب نقل کرنے کو دی۔ یہ بے چارے خیر سے لنگڑے تھے۔ انھوں نے معذرت کر دی۔ وجہ پوچھی گئی۔ ذرا سوچیے انھوں نے کیا وجہ بتائی ہوگی؟

کہنے لگے: سرکار لنگڑا ہوں!

راجہ کی طرح آپ بھی اچنبھے میں پڑ گئے ہوں گے۔ مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ سوچ رہے ہوں گے لکھائی میں اور لنگڑے پن میں کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ لیجیے انھی سے جواب سن لیجیے۔

سرکار میری لکھائی کچھ ایسی ہے کہ بس میں ہی اسے پڑھ سکتا ہوں۔ جو لکھتا ہوں اسے پڑھنے کے لیے میں بلایا جاتا ہوں۔ اب میں اس لنگڑی ٹانگ سے کہاں کہاں مارا مارا پھروں!

پھر ایک انقلاب اور آیا۔ بہت بڑا انقلاب۔ اس نے تو کتابوں کی دنیا ہی بدل دی۔ کہتے ہیں چینیوں نے کاغذ بنانے کا فن ایجاد کر لیا۔ بہت دنوں تک چینی اپنی اس ایجاد کو چھپاتے رہے۔ مگر کچھ سرپھرے عرب سوداگری کے سلسلے میں، اپنے مذہب کو پھیلانے کے جوش میں چین پہنچ گئے اور کسی نہ کسی طرح کاغذ بنانے کا ہنر جاننے والے کچھ چینی اپنے ساتھ لے آئے۔

عربوں نے اس صنعت یا ہنر کو کافی آگے بڑھایا —— لگ بھگ پانچ سو سال تک یہ صنعت مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی۔ اس وقت یورپ کے لوگ اس ہنر سے بالکل بے خبر تھے۔ عرب سے یہ فن مصر اور شمالی افریقہ ہوتا ہوا اسپین پہنچا۔ ۱۱۵۰ء میں یہاں کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ قایم ہوا۔ شروع شروع میں یورپ کے عیسائی پادریوں نے اس کی مخالفت کی مگر ان کی چلی نہیں۔ یہ صنعت برابر ترقی کرتی رہی۔ یورپ میں اس کے لیے مشینیں بن گئیں روزانہ لاکھوں ٹن کاغذ تیار ہونے لگا —— پھر کیا تھا روزانہ ہزاروں لاکھوں کتابیں، رسالے، اخبار بازار میں آنے لگے۔

کاغذ کی صنعت بڑھی تو لکھنے پڑھنے، تصنیف و تالیف کا کام بھی آگے بڑھا۔ عالموں میں اور پڑھے لکھے لوگوں میں کتابیں جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس طرح دھیرے دھیرے کتب خانے قائم ہونے لگے۔ طرابلس (شام) کے آل عمّاد نے اپنے

کتب خانے میں تیس لاکھ کتابیں جمع کی تھیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب نہ چھاپے خانے تھے نہ کتابیں اتنی آسانی سے مل پاتی تھیں اور ہاں بخارا کے بادشاہ نے سلجوقیوں کے وزیر صاحب بن عباد کو اپنے یہاں وزارت کے لیے بلوایا تو اس نے جواب دیا۔ میرا یہاں سے کہیں جانا مشکل ہے۔ کم سے کم چار سو اونٹ تو میری کتابوں کے لیے درکار ہوں گے۔

مسلمان ہندوستان آئے تو کاغذ کا ہنر یا کاغذ کی صنعت بھی اپنے ساتھ لائے۔ سب سے پہلے کشمیر میں اور پھر سیالکوٹ، لاہور، ملتان، دہلی، حیدرآباد یہاں تک کہ بنگال میں اس کے کارخانے قائم ہوگئے۔ اس زمانے کی لکھی ہوئی کتابیں یا مخطوطے اب بھی ہندوستان، برٹش میوزیم وغیرہ میں موجود ہیں۔

اور پھر چھاپنے کی مشینیں ایجاد ہوئیں۔ یہ اب سے کئی سو برس پہلے کی بات ہے۔ پھر ٹائپ ایجاد ہوا۔ اب تو کتابوں کا کام چل پڑا۔ ڈھیرے ڈھیرے کتابوں کی ریل پیل ہوگئی۔ ہمیں، آپ کو، سب کو آسانی سے پڑھنے کو ملنے لگیں۔ کیا امیر، کیا غریب سب کو ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

اب ذرا آپ پھر ہزاروں برس پہلے کی دنیا کی طرف لوٹ جائیے۔ اس وقت آپ کی عمر کے بچے کو یہ نعمت، یہ علم کی دولت یعنی کتاب کہاں نصیب تھی اور ہم اس وقت کتنے خوش نصیب ہیں۔ ہماری کتابوں کی الماری میں کیسی کیسی کتابیں رکھی ہیں۔ یہ جغرافیہ کی کتاب ہے۔ اس سے ہمیں دنیا کے ملکوں ملکوں کی جغرافیائی حالت معلوم ہوتی ہے۔ یہ تاریخ کی کتاب ہے۔ اس میں ملکوں ملکوں کے بادشاہوں کے لڑائی جھگڑوں کے، رہن سہن رسم و رواج کے حالات ہیں اس کتاب میں دنیا کے بڑے لوگوں کا حال ہے۔

یہ سفرنامہ ہے۔ یہ اچھے اچھے قصے کہانیوں کی کتاب ہے۔

غرض اس ایک الماری میں معلومات کا خزانہ ہے۔ ہم اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہماری معلومات بڑھتی ہیں، ہمارے اخلاق سدھرتے ہیں۔ ہم میں آگے بڑھنے کا، ترقی کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

ہمارے دیس میں چھپائی کی مشینیں انگریزوں کے ساتھ آئیں اور یہاں بھی کتابوں کی چھپائی کا کام چل پڑا۔ مگر چھپائی کے کام میں دیس کی دوسری زبانیں اُردو سے آگے بڑھ گئیں۔ اُردو میں شاید ہی کوئی کتاب دو ہزار سے زیادہ چھپتی ہو اور فوراً بک جاتی ہو۔ اس کی وجہ ایک تو اُردو جاننے والوں کی غریبی ہے، دوسرے شوق کی کمی ہے۔ دوسری زبانیں جاننے والے کتابوں اور رسالوں کو زندگی کی اہم ضرورت سمجھتے ہیں۔ ہم اسے ایک بوجھ سمجھتے ہیں۔ لیکن شکر ہے کہ آہستہ آہستہ یہ چیز کم ہو رہی ہے۔ بچوں اور بڑوں میں کتابوں کے مطالعے کا شوق برابر بڑھ رہا ہے۔ دیس کی آزاد سرکار جگہ جگہ کتب خانے قایم کر رہی ہے۔ اُردو جاننے والے ان سے فائدہ اٹھانے لگے ہیں۔ خود بھی کتابیں خریدنے کا شوق بڑھ رہا ہے۔

جناب سبطِ حسن بی اے، بی ایڈ۔

ڈاکٹر سیمیوئیل ہنی مین

(موجد ہومیوپیتھی)

آج سے لگ بھگ ۲۰۰ برس پہلے کی بات ہے جرمنی میں صوبہ سکسنی کے مسین نامی گاؤں میں ایک غریب آدمی کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس کا نام سیموئیل ہنی مین رکھا گیا۔ ہنی مین کے باپ برتنوں پر رنگ کرنے کا کام کرتے تھے اور تھوڑی بہت کھیتی باڑی بھی کرتے تھے۔ یہی ان کی روزی کا ذریعہ تھا۔

ہنی مین بچپن ہی سے بڑا ذہین اور ہوشیار تھا۔ اس کا باپ اسے اچھی اچھی باتیں سکھاتا رہتا تھا۔ جب ہنی مین کچھ بڑا ہوا تو باپ نے اسے گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کر دیا۔ ہنی مین پڑھنے لکھنے میں بڑا ہوشیار تھا۔ اپنے سبق فوراً ہی یاد کر لیتا تھا۔ اپنی جماعت میں ہمیشہ اپنے ساتھیوں سے آگے رہتا تھا۔ تمام استاد اسے محبت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اس کی مدد کرتے تھے۔

بدقسمتی سے تھوڑے ہی دنوں بعد اس کے باپ نے اس کو پڑھانے کا خیال چھوڑ دیا۔ بے چارہ غریب آدمی تھا۔ اپنے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے اسے ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ اس لیے وہ ہنی مین کو پڑھانے سے روکنا چاہتا تھا۔

مگر ہنی مین کے دل میں پڑھنے لکھنے کا شوق اتنا زیادہ تھا کہ وہ کسی طرح نہ مانتا تھا۔ چھپ چھپ کر پڑھتا رہتا تھا۔ راتوں کو اٹھ کر تنہائی میں پڑھتا۔ اتفاق سے اگر کبھی روشنی جلانے سے اس کے والد کی آنکھ کھل جاتی تو وہ بہت ناراض ہوتے اور پڑھنے کو منع کرتے۔ آخر تنگ آ کر ہنی مین نے ایک مٹی کی لالٹین بنائی اس کی روشنی بہت دور نہیں جاتی تھی۔ اب وہ رات کو اسی لالٹین کی روشنی میں چپکے چپکے پڑھا کرتا تھا۔

ایک بار اس کا باپ کھیت میں ہل چلا رہا تھا۔ ہنی مین کے اسکول کا ایک ماسٹر ہنی مین کے باپ سے ملنے اور اسے سمجھانے آیا۔ پر وہ تو ماسٹر کو دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گیا۔ بہت زور سے چلا اٹھا "تم ہی وہ استاد ہو جو میرے بیٹے کو بگاڑ رہے ہو۔ اور میرے کام کے لائق نہیں بننے دیتے"۔

ماسٹر نے اس کے باپ کو بہت سمجھایا۔ اسی درمیان ہنی مین کی ماں جوہانہ بھی وہیں آ گئی۔ اس نے گول فرز کر سمجھانے میں ماسٹر کی مدد

کی اس نے کہا "ہنی مین پڑھائی سے نہیں رک سکتا۔ وہ تمھارے ڈر سے رات کو چھپ چھپ کر پڑھتا ہے۔ اس نے تمھارے ڈر سے مٹی کی لالٹین بنائی کہ تم تیز روشنی کی وجہ سے رات کو جاگ نہ اُٹھو کیا تمھیں اس کے اس شوق پر رحم نہیں آتا۔" غرض ان سب باتوں کا اثر گول فرڈ پر اچھا ہوا اور وہ ہنی مین کو پڑھانے پر راضی ہو گیا۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ بارہ سال کی عمر میں ہنی مین نے اتنی علمی قابلیت حاصل کر لی کہ یونانی زبان کا استاد مقرر ہوا۔ پڑھائی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ سارے کالج میں اس کی قابلیت کا سکّہ بیٹھ چکا تھا۔ ۲۰ سال کی عمر میں فرانسیسی، جرمنی، یونانی اور بہت سی زبانوں میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹری کی سب سے بڑی ڈگری پاس کر کے بہت اچھا ڈاکٹر بنا اور جرمنی کے اندر بڑے بڑے عہدوں پر کام کرتا رہا۔ کچھ دنوں بعد نوکری چھوڑ کر گھر پر مطب کرنے لگا۔

ہنی مین کے زمانہ میں علاج کے مختلف طریقے رائج تھے۔ کہیں جونکیں لگائی جاتی تھیں اور جسم سے خون نکال کر علاج کرنے کا طریقہ تھا۔ کہیں یونانی طریقہ حکمت جاری تھا۔ جس میں کڑوی کسیلی دوائیں پیٹ بھر بھر کر پلائی جاتی تھیں۔ دست آور دواؤں کے ذریعہ دست لا کر مرض کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کڑوی اور کسیلی دوائیں ہی مرض کو شفا بخش سکتی ہیں۔ کہیں ایلوپیتھک طریقہ علاج سے چیر پھاڑ جاری تھی۔ سخت سے سخت کڑوی اور زہریلی دوائیں استعمال کرائی جاتی تھیں۔ جس سے نقصان کے بہت سے خطرات موجود تھے۔ اس کے باوجود لوگوں کو مکمل صحت نہیں ملتی تھی۔ مرض جڑ سے نہیں جاتا تھا مرض کے اندر ہمیشہ ہمیشہ پڑے رہتے تھے۔ ہنی مین اس پر برابر غور کرتا رہا کہ کس طرح علاج کیا جائے کہ لوگوں کو مکمل شفا ہو۔

اسی زمانہ میں ہنی مین کو ایک حادثہ پیش آیا۔ اتفاق سے اس کی اپنی لڑکی سخت بیمار ہو گئی۔ اس نے ہزار کوشش کی اور بہت علاج کیا۔ لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر لڑکی کی جان چلی گئی۔ اس کی موت نے ایلوپیتھک طریقہ علاج کا ایک مایوسی سے بھرا اور کمزور پہلو ہنی مین کے سامنے پیش کیا اس نے اسی روز سے قسم کھالی کہ وہ آئندہ ایسے نامکمل اور خطرناک طریقہ علاج سے کسی مریض کی جان کو خطرے میں نہ ڈالے گا۔

یہ خیال آتے ہی اس نے ڈاکٹری کا پیشہ چھوڑ دیا اور اب صرف کتابوں کا ترجمہ کر کے گزر بسر کرنے لگا۔ اب اسے ایلوپیتھک طریقۂ علاج سے سخت نفرت و بددلی پیدا ہو چکی تھی اور کسی دوسرے طریقہ علاج کی تلاش میں پڑ گیا تھا۔

اس نے اعلان کر دیا کہ یہ طریقہ علاج ناقص اور نامکمل ہے اور اس سے بہت سے مریضوں کو پوری پوری شفا نہیں ہوتی۔ اب وہ رات دن اسی سوچ میں رہنے لگا کہ قدرت نے ضرور کوئی نہ کوئی طریقہ اپنے بندوں کی مکمل شفا کا رکھا ہوگا۔ اسی طریقے کی کھوج میں لگا ہوا تھا۔

خدا کا کرنا۔ ایک دن ہنی مین ڈاکٹر کلن کی میٹریا میڈیکا یعنی دواؤں کی خاصیت جاننے والی کتاب کا

ترجمہ کر رہا تھا۔ ایک جگہ اس نے لکھا ہوا دیکھا کہ کونین
ملیریا بخار کی بہترین دوا ہے۔ فوراً ہنی مین کے دماغ
میں بہت سے سوال پیدا ہوئے ایسا کیوں ہے؟ کونین
سے بخار کیوں اتر جاتا ہے۔

بہت کوشش کی مگر جواب نہ مل سکا۔

آخر اس نے خود اپنے اوپر تجربہ کرنے کی
ٹھانی اور کونین کو کھا کر دیکھا۔ کونین کھانے کے بعد
اسے ملیریا بخار ہو گیا۔ اچھا ہونے کے بعد اس نے
پھر کھائی۔ غرض کئی بار صحت کی حالت میں کونین کھا
کھا کر اس کی خاصیت کا تجربہ کیا اور ہر بار ملیریا
بخار کا مقابلہ کرنا پڑا۔

اب اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جس
دوا کا استعمال تندرست انسان کے جسم میں جس طرح
کی بیماری پیدا کرتا ہے وہی دوا اسی طرح کی بیماریوں
کے لیے جو قدرتی طور پر پیدا ہو جائیں علاج ہوتی ہے۔
پھر کیا تھا۔ اس نے مختلف دواؤں کو خود کھا کھا کر
تجربہ شروع کیا۔ اس طرح بہت سی دواؤں کا تجربہ
کر کے ایک کتاب میٹریا میڈیکا (یعنی دواؤں کی خاصیت
والی کتاب) لکھی اور علاج کے ایک نئے طریقے کی
بنیاد رکھی۔ اس کا نام علاج بالمثل یعنی ہومیوپیتھک
کا علاج رکھا۔

یہ علاج آج بھی ہومیوپیتھک علاج کے نام
سے مشہور ہے اور تمام دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے۔
بچے خصوصیت کے ساتھ ان دواؤں کے دلدادہ ہیں۔
انھیں تو اس دوا میں میٹھی میٹھی گولیوں کا مزا آتا ہے
موقع پائیں تو ساری دوا ایک دم ہڑپ کر جائیں۔
وہ تو شکر ہے کہ یہ دوائیں نقصان نہیں کرتیں ورنہ
سخت پریشانیوں میں مبتلا ہونا پڑتا۔ یوں تو مشہور
ہے کہ ہومیوپیتھک دوائیں بچوں کے لیے زیادہ مفید
ہوتی ہیں۔ مگر سچائی یہ ہے کہ بچے اور بوڑھے سبھی ایک
ہی طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کی یہ چند خصوصیات
اس کو ہمیشہ ترقی کی راہ پر چلاتی رہیں گی۔ مثلاً

(۱) دوا اتنی کم مقدار میں استعمال کی جاتی ہے کہ
مریض ہنسی خوشی کھانے پینے کو تیار ہو جاتا ہے۔

(۲) دوائیں خوش ذائقہ ہوتی ہیں۔ بچے انھیں شوق
سے استعمال کرتے ہیں۔

(۳) دوائیں کم قیمت ہوتی ہیں غریب سے غریب
بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(۴) دوائیں بے ضرر ہوتی ہیں اگر غلط تشخیص
کے باعث معالج مرض کے خلاف دوا استعمال کرا دے
تو نقصان نہیں ہوتا

(۵) پرانے مرضوں کا بہتر اور مکمل علاج ہومیوپیتھک
میں ممکن ہے۔

(۶) وہ تمام بیماریاں جن میں ڈاکٹر لوگ آپریشن اور
چیر پھاڑ ضروری سمجھتے ہیں۔ ان بیماریوں کا علاج بنا
چیر پھاڑ اور بنا آپریشن کے محض کھانے کی دواؤں سے
کیا جاتا ہے۔

یہی سب باتیں تو ہیں کہ ہمارے دیس میں بھی
ہومیوپیتھک علاج کی مقبولیت دن پر دن بڑھ رہی ہے۔
اس علاج کے طریقے سکھانے کے لیے جگہ جگہ مدرسے
کھل رہے ہیں۔ اسکول کھل رہے ہیں۔ کالج کھل رہے
ہیں۔ اور اب تو دیس کی حکومت بھی اس سے دلچسپی
لینے لگی ہے۔ اس کی سرپرستی کرنے لگی ہے۔

جناب [illegible]

کاغذ کی کہانی

کہانی ہوتی ہے پریوں کی بھوتوں کی، ڈاکوؤں کی تو پھر یہ کاغذ کی کہانی کہاں سے آگئی ــ ہ لیکن پیامِ تعلیم والوں کی ضد ہے کہ نہیں بھئی کہانی ہو گی تو کاغذ کی ہو گی۔ ٹھیک ہے۔ آپ کہتے ہیں۔ تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔

میں لکھنے بیٹھ گیا۔ میز پر کاغذوں کا پلندا رکھ لیا لکھنا شروع کیا۔ قلم پہلے تو بھاگا۔ پھر اٹک اٹک کر چلنے لگا۔ ایک صفحہ خراب ہوا۔ دوسرا خراب ہوا۔ قلم کی رفتار وہی رہی یعنی کبھی قلم صاحب لکھتے چلے جا رہے ہیں، کبھی قلم صاحب دم لینے کو رک گئے۔ کبھی قلم صاحب لنگڑا لنگڑا کر چلنے لگے۔ کبھی ٹانگ پسار کر لیٹ گئے۔ کبھی حضورِ عالی نے آگے بڑھنے سے بالکل انکار کر دیا۔ ہڑتال کر دی۔

کافی وقت گذر گیا۔ غور جو کیا تو معلوم ہوا کہ ردی کی ٹوکری بھی خالی تھی۔ کاغذوں سے لبالب بھر چکی ہے اور میز پر آخری کاغذ دسترخوان کی طرح بچھا ہوا ہے۔ لیکن خالی دسترخوان کی طرح۔ میں نے سوچا کہ تھک گیا ہوں۔ ذرا باہر کھلی ہوا میں لمبی سانسیں لوں۔ تازی ہوا کھاؤں تو شاید دماغ میں بھی کچھ تازہ بات آئیں۔ اور بھئی ہوا بھی یہی۔

باہر نکل کر ٹھنڈی ہوا جو لگی۔ تو آنکھیں کھلیں۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک سجا سجایا پنڈال ہے۔ اور پاس گیا تو باوردی بینڈ باجے والے دکھائی دیئے۔ تھوڑی سی دیر میں ساری فضا گونج اٹھی۔
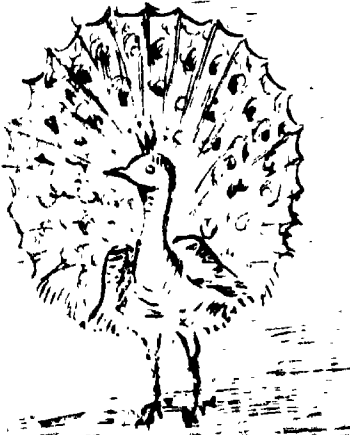
کسی کی شادی ہو رہی تھی۔ رنگ برنگے پھولوں سے پنڈال سجا ہوا تھا۔ پھولوں کو چھو کر دیکھا تو وہ کاغذ کے نکلے۔ ایک خوبصورت سا پیارا سا مور ناچ رہا تھا۔ پاس گیا تو وہ بھی کاغذ کا نکلا۔ اتنے میں لڑکی والے پان اور میوے کی تھالی لے کر میری طرف لپکے۔ غور کیا تو تھالی بھی کاغذ کی نکلی، پانوں کی چونگیاں بھی کاغذ کی تھیں۔ حد تو یہ کہ پان کھاتے وقت انگلیاں خراب ہو گئیں اور میں نے تھالی میں سے ایک منا سا

رومال اٹھاکر اس سے انگلیاں صاف کیں۔ کمال ہوگیا صاحب
رومال بھی کاغذ کا نکلا۔

پنڈال سے نکلتے وقت میں سوچنے لگا کہ ہم لوگ کاغذ کے بارے میں کبھی سوچتے نہیں ورنہ چیز ہے بڑے کمال کی۔ دیوار پہ پوسٹر تھے۔ لوگوں کے ہاتھوں میں اخبار تھے۔ خوانچے والے پڑیاں بنا رہے تھے۔ بڑی بڑی دکانوں سے لوگ کاغذ کے تھیلوں میں سامان لے کر نکل رہے تھے۔ پانی پینے کے گلاس، کھانے کی پیالیاں، سب کی سب کاغذ کی تھیں۔ سڑک پر سے ڈاکیا گزر رہا تھا۔ اس کا تھیلا خطوں سے بھرا ہوا تھا۔ جی چاہے تو کہہ لیجیے کہ کاغذوں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے آفس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس میں فائلوں کے انبار جھانک رہے تھے۔

سمندر پار کے دیشوں میں تو کاغذ کے کپڑے بھی بنتے ہیں۔ خوب مزا آتا ہوگا۔ نہ استری کی ضرورت نہ سوئی تاگے کی ضرورت۔ کہیں سے پھٹ گیا تو جھٹ گوندانی کھولی اور چپکا لیا۔ دھوبی کی مصیبت سے چھٹکارا الگ۔ کپڑے گندے ہوئے مزے سے انگیٹھی جلالی انھی کپڑوں کی۔

میں سوچنے لگا کہ کاغذ کا یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے۔ یہ کس کس روپ سے ہماری مدد کرتا ہے۔ خود آپ اس بات پر سوچیے۔ تھوڑا سا وقت بہت اچھا گذر جائے گا۔

آج سے ہزاروں سال پہلے ہوا یہ ہوگا کہ کوئی بادشاہ سلامت کسی لڑائی میں جب ہارنے لگے ہوں گے تو گھبرا کر اپنے افسر کو حکم دیا ہوگا: "تیر کی طرح بھاگتے ہوئے جاؤ اور وزیر سے کہو دشمنوں نے گھیر لیا ہے۔ دو ہزار آدمی اور دو سو گھوڑوں کی ابھی اسی وقت ضرورت ہے۔ جان کی امان چاہتے ہو تو پلک جھپکتے میں حاضر کرو۔"

بادشاہ کا افسر خاص بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوگا۔ تھکن میں آدمی بھولتا بھی تو زیادہ ہے۔ جب وہ واپس لوٹ کر آیا تو اس کے ساتھ دو سو گھوڑوں کی جگہ تو دو ہزار گھوڑے تھے اور دو ہزار آدمیوں کی جگہ دو سو آدمی تھے۔" یعنی بالکل الٹا ہوگیا تھا۔

تو اب ایسے ہی موقعے تو ہوتے ہیں جب سندیسے لکھ کر بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن جب کاغذ ہی نہ ہو تو آدمی لکھے کس چیز پر۔

شروع شروع میں آدمی نے پتھر پہ لکھا۔ پھر مٹی پہ لکھا۔ پھر درختوں کی چھال پر لکھا اور یہی چھال تھی جس نے ترقی کرتے کرتے کاغذ کا روپ دھار لیا۔

کوئی چار ہزار سال پہلے مصر کے رہنے والوں نے پے پی رس بنالیا تھا۔ مصری کہتے یہ تھے کہ ایک خاص قسم کے پودے کی جڑوں میں سے گودا نکالتے۔ ان کے باریک باریک قتلوں کو لائین میں لگا دیتے۔ پھر ان کو پانی سے بھگوتے۔ اس کے بعد ان کو چپٹا کر کے لپیٹ دیتے۔ اس کے کھردرے پن کو دور کرنے کے لیے انھوں نے یہ کیا کہ ہاتھی کے بڑے بڑے دانتوں سے اس پے پی رس کی گھسائی کی۔ اتنی گھسائی کی کہ ان پر ایک طرح کی پالش سی ہوگئی اور وہ چمک اٹھے۔

تو یہ تھی کوئی چار ہزار سال پہلے کی بات۔ چینیوں نے بھی کاغذ بہت پہلے بنا لیا تھا۔ لیکن عربوں نے کاغذ آج سے بارہ سو سال پہلے بنانا شروع کیا تھا۔ عربوں کے ساتھ ہوا یہ کہ ایک دفعہ سمرقند پر چینیوں نے حملہ بول دیا۔ بڑی زور دار لڑائی ہوئی۔ لیکن چینی ہار گئے اور ان کے ان گنت قیدی پکڑے گئے۔

ان قیدیوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو کاغذ بنانے کے ہنر سے جانکاری رکھتے تھے۔ بادشاہ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس نے فوراً ان قیدیوں سے کاغذ بنوانے کا کام لینا شروع کر دیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ سارے عرب ملکوں میں ...

عجیب غریب چیز کا رواج ہوگیا۔

بھارت میں کاغذ بنانے کا پہلا مِل کلکتہ میں کوئی ٩٠ سال پہلے لگا تھا۔ اس کا نام تھا (BALLY MILLS) بیلی ملز اور اب تو ہمارے یہاں کوئی پندرہ مِل یہ کام کر رہے ہیں اور سال میں آٹھ لاکھ ٹن کاغذ بنا لیتے ہیں۔ لیکن یہ جو کاغذ اخبار میں لگتا ہے۔ وہ ذرا دوسری طرح کا ہوتا ہے۔ اس کی قیمت بھی کم ہوتی ہے۔ اخباری کاغذ کا پہلا مِل ١٩٤٧ء میں بنا تھا۔ آج کل ہمارے یہاں اخباری کاغذ ہزاروں ٹن سالانہ بنتا ہے۔

کبھی کسی کاغذ بنانے والے کارخانے میں جا کر دیکھو یہ گھاس سے بنتا ہے۔ کپڑے کی کترنوں سے بنتا ہے۔ ردّی سے بنتا ہے۔ طرح طرح کی چھالوں سے بنتا ہے۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ ہر چیز سے بنایا جا سکتا ہے۔

کترنوں سے جو کاغذ بنتا ہے وہ بہت اچھے قسم کا ہوتا ہے۔ لوہے کے تاروں کے ایک بڑے سے پنجرے میں کترنوں کو بھر دیتے ہیں اور پھر یہ پنجرا گھومنا شروع کرتا ہے۔ گھومنے سے ہوتا یہ ہے کہ اس کی ساری گرد اور مٹی الگ ہو جاتی ہے۔ اب یہ کترنیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹی جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد ان کو بڑے بڑے بوائلروں میں ڈال کر اُبالا جاتا ہے اور جب رنگ اتر جاتا ہے تو ان کو ایک دفعہ پھر سے دھویا جاتا ہے تاکہ بالکل ہی صفائی کے بعد مرضی کے مطابق رنگ دیا جا سکے۔

اس آخری نہان کے بعد اُن کو ایک مشین میں ڈالا جاتا ہے۔ جس میں گھومتی ہوئی بڑی بڑی پلیٹیں لگی ہوئی ہیں اور ان پلیٹوں پر چاقو جڑے ہوتے ہیں۔ جب یہ پلیٹیں گھومتی ہیں تو اس میں لگے ہوئے چاقو کترنوں کا بھرتا بنا دیتے ہیں۔

کترنوں کے اس بھرتے کو جب دوبارہ اُبالا جاتا ہے۔ تو وہ پلپ کی صورت دھار لیتا ہے اور کاغذ اسی پلپ سے بنایا جاتا ہے۔ بڑی بڑی مشینیں اسی پلپ کو منٹوں میں کاغذ کی طرح طرح کی شکلیں دے دیتی ہیں۔

کبھی تم اپنی ممی کو پراٹھے بیلتے ہوئے غور سے دیکھو۔ تمھیں پتہ چلے گا کہ وہ لوئی کے پرت کے اوپر پرت رکھ کر بیلن چلا دیتی ہیں۔

لیکن اگر تازے تازے کاغذ کے شیٹ کو ایک کے اوپر ایک رکھ کر بیلن چلا دیا جائے تو کیا بن جائے گا۔ پراٹھا تو نہیں بنے گا۔ ہاں کارڈ بورڈ یا دفتی ضرور بن جائے گی۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ پراٹھے کو بیلن کافی ہے اور کاغذ کے شیٹوں کو دبانے کے لیے مشینوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

پراٹھے کی بات نکلی ہے تو ذرا یہ بھی سوچو کہ تمھاری ممی آگ کیسے جلاتی ہیں۔ پہلے کاغذ جلاتی ہوں گی اور پھر کاغذ کی آگ لکڑی یا کوئلہ کو پکڑ لیتی ہوگی۔ تو دیکھا تم نے کاغذ تمھارے باورچی خانے میں بھی پہنچ گیا۔

تمھاری الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی ہیں شیلف ڈیڈی کے فائلوں سے لدے ہوئے ہیں۔ دیوار پر کیلنڈر ہے۔ ڈائری ہے۔ کونے میں رکھا ہوا دفتی کا بکس ہے۔ میز پر لمبا سا سفید سفید بلاٹنگ پیپر بچھا ہوا ہے۔ دوات الٹی نہیں اور اس نے جنم جنم کے پیاسوں کی طرح ساری روشنائی پی لی۔

کاغذ کے اور کرشمے دیکھنے ہوں تو ممی کے پرس میں جھانک کر دیکھو۔ جانے کتنے نوٹ رکھے ہوں گے۔ یہ نوٹ بھی تو کاغذ کے بنے ہوئے ہیں۔

لیجیے صاحب یہ کیا شروع ہوگیا۔ تمھارے چھوٹے صاحب نے ریڈیو کھول دیا۔ روئے چلے جا رہے ہیں۔ سارا گھر خاموش کرانے پر لگ گیا۔ لیکن وہ کہاں مانتے ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے "بھیا مان جاؤ منوا مان جاؤ۔ راجہ مان جاؤ۔"

لیکن راجہ کہاں ماننے والے ہیں تم بھاگ کر الماری

کی طرف بڑھے۔ لپک کر ایک بونگا اٹھایا اور بجانے لگے۔ بہت سی گڑیاں نکال کر سامنے ڈھیر کر دیں۔ لیجیے صاحب آپ کے چھوٹے موٹے ننھے منے ٹینی وینی راجہ صاحب خاموش ہو گئے۔ آپ بھی خوش۔ گھر والے بھی خوش اور محلے والے بھی خوش کہ شور ذرا کم ہوا۔

لیکن بھئی تم ایک چیز تو دیکھنا بھول ہی گئے۔ یہ باجہ اور یہ گڑیاں بھی تو کاغذ ہی کی بنی ہوئی ہیں۔

یہی کاغذ ہے جو ہماری زندگی کے جانے کتنے بہت سے کام پورے کر دیتا ہے۔ سینکڑوں میل دور بسنے والوں تک لمبے لمبے پیغام لے جاتا ہے۔ کبھی آئسکریم پر لپٹ کر اور کبھی نانی کی اوڑھنی بن کر تمھارے پاس آتا ہے۔ کبھی پتنگ بن کر آسمان میں اڑتا ہے اور کبھی کاغذ کی ناؤ بن کر بہتے ہوئے پانی کو للکارتا ہے۔

جناب رؤف خیر

جب میں اسکول جانے لگتا ہوں

راستے یہ حسین نظارے
پیڑ ڈالی کو لہرانے لگتے ہیں
پھول سے مسکرانے لگتے ہیں
جب میں اسکول جانے لگتا ہوں

کوئی بندر نچا رہا ہے ادھر
کوئی کرتب دکھا رہا ہے ادھر
اپنا جادو بتا رہا ہے کوئی
قہقہے ہی لٹا رہا ہے کوئی

سیکلوں کا مظاہرہ ہے جہاں
ایک مجمع لگا ہوا ہے وہاں
سانپ کے کھیل بھی ہیں رستے میں
زندگی کے مزے ہیں سستے میں

یہ تماشے مظاہرے کرتب
میں سمجھتا ہوں انکا سب مطلب
مجھ کو دھوکا یہ دینا چاہتے ہیں
راہ میں روک لینا چاہتے ہیں
ان کے آگے کہیں میں جھکتا ہوں
روکنے سے کہیں میں رکتا ہوں

ان پہ بس مسکرانے لگتا ہوں
جب میں اسکول جانے لگتا ہوں

ناب سعادت نظیر

آرزو

یہی آرزو ہے دلوں میں نہاں — چمک جائے تقدیرِ ہندوستاں

نئی ہو زمیں اور نیا آسماں

نئی زندگی ہو، زمانہ نیا — ہو گلشن میں ہر آشیانہ نیا

نیا ساز ہو اور ترانہ نیا

نگاہوں میں امید کی ہو کرن — نکھر جائے تعلیم کا بانکپن

سنور جائے تہذیب کی انجمن

مصور ترے فن کی رعنائیاں — دکھائیں انوکھی وہ نقاشیاں

'اجنتا' کی تازہ ہوں فنکاریاں

تمدن محبت کی تصویر ہو — نئی زندگانی کی تعبیر ہو

فنونِ لطیفہ کی تفسیر ہو

کرامات جوہر کی ہوں نت نئی — منور ہو جس سے ہر اک زندگی

ہر اک سو ہو سائنس کی روشنی

سحر ہو کہ چھٹ جائیں تاریکیاں — کہیں نام کو ہوں نہ بے کاریاں

ٹپکتی ہوں چہروں سے رعنائیاں

چمن کھیت نہروں سے سیراب ہوں پھلیں پھولیں سرسبز و شاداب ہوں
کسانوں کے پورے حسیں خواب ہوں

مشینوں کی بجتی ہوں شہنائیاں ہوں صنعت کی ہر سمت گل کاریاں
تجارت کی ہوں گرم بازاریاں

نہ مظلوم ہوں اور نہ مجبور ہوں مگن کارخانوں میں مزدور ہوں
ترقی کی راہوں پہ جمہور ہوں

اب اپنا وہ جادو دکھائے عمل ہمارے مسائل کا مل جائے حل
نکل جائے نفرت کی رسی کا بل

نشیب و فراز ایسے ہموار ہوں چمن تو چمن دشت گلزار ہوں
جو بیکار ہوں وہ بھی برسرِ کار ہوں

جو ہیں شہر و دیہات میں شاد ہوں سماجی بکھیڑوں سے آزاد ہوں
جو برباد گھر ہیں وہ آباد ہوں

ہر اک اپنی قسمت کا کھائے پیے خوشی سے جیے اور جینے بھی دے
مرے تو مرے ارتقا کے لیے

بدل جائے یکسر خوشی سے الم! کسی کو نہ ہو رنج کوئی نہ غم!
گذاریں فراغت سے دن رات ہم

جناب تسنیم حنفی

اس نے اپنا وعدہ پورا کیا

بوڑھے سلطان نے شہزادے کی طرف دیکھتے
ے کہا: "بیٹے! آج تمھاری سترھویں سالگرہ ہے
ں سے پہلے ہر سالگرہ پر ہم تمھیں بہت خوبصورت
ے دیتے تھے۔ کھلونے اور رنگ برنگے کپڑے۔
ن اس بار ہم نے تمھارے لیے ایک عجیب سا تحفہ منگوایا
۔ وہ تحفہ ہے سچ مچ کا ایک جہاز۔ اس جہاز پر تجارت
قیمتی سامان بھرا ہوا ہے۔ اس وقت سمندر کے ساحل
تھا جہاز لگا ہوا ہے۔ تم اس پر ان جانی دنیاؤں کا
ر کرو۔ اپنی محنت اور عقل سے دولت کماؤ اور کامیاب
کر واپس آؤ۔ یہ تمھارا امتحان بھی ہوگا اور سبق بھی!"

شہزادے نے غور سے اپنے والد کی باتیں
یں۔ پھر ایک عزم کے ساتھ وہ اپنے والدین سے رخصت
ا اور سمندر کے ساحل کی طرف چل دیا۔ اس کا جہاز
ت بڑا اور شان دار تھا۔ شہزادے نے جہاز کے
ر کھول دیئے اور ان سمتوں کی طرف چل پڑا جو اس
ے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

سمندر کی لہروں سے کھیلتا ہوا، ہچکولے لیتا
ا، گونجتا اور گرجتا ہوا، تیز ہواؤں کے تھپیڑے
تا ہوا جہاز بڑی تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

اچانک شہزادے کے کانوں سے کچھ آوازیں ٹکرائیں،
کراہتی ہوئی، سسکیاں لیتی ہوئی، درد میں ڈوبی ہوئی،
شہزادے نے جہاز کی کھڑکی سے جھانکا۔ تھوڑی ہی
دُور پر ایک دوسرا جہاز دکھائی دیا جو دھیرے دھیرے
شہزادے کے جہاز کی طرف چلا آرہا تھا۔

جیسے ہی دوسرا جہاز قریب آیا، شہزادے
نے اس کے کپتان سے پوچھا: "کیوں صاحب! یہ
رونے چلانے کی آوازیں کیسی ہیں؟ کیا آپ کے جہاز
کے مسافر بیمار ہیں؟"

کپتان نے جواب دیا: "یہ سب کے سب قیدی
ہیں۔ ہم نے انھیں غلام بنا لیا ہے۔ ان سب کو دور دراز
کے کسی شہر میں لے جا کر فروخت کر دیں گے!"

شہزادے کو یہ سن کر ان قیدیوں پر بڑا ترس
آیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا: "آپ اپنا جہاز روک
دیجیے۔ میں آپ سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں!"

یہ سن کر کپتان بہت خوش ہوا۔ اس نے شہزادے
کے جہاز پر آکر جب طرح طرح کے قیمتی سامان دیکھے تو اس

کے منھ میں پانی بھر آیا ۔ شہزادے نے اُس سے سودے کی بات کی۔ اپنا جہاز سارے سامان کے ساتھ کپتان کو دے دیا اور بدلے میں اِن قیدیوں سمیت کپتان کا جہاز خود لے لیا ۔

جب شہزادہ دوسرے جہاز کا مالک بن گیا تو اس نے وہاں جاکر تمام قیدیوں سے محبت بھری باتیں کیں ۔ ان سب سے گھر کے راستے پوچھے ۔ سب نے بتا دیا لیکن ایک خوبصورت لڑکی اور اس کے ساتھ کی بوڑھی عورت کو اپنے وطن کا راستہ نہیں معلوم تھا ۔ بوڑھی عورت نے بس اتنا کہا ——— "یہ لڑکی ایک شہزادی ہے ۔ اس کا وطن بہت دور ہے اور کہانی بہت دردناک ، لیکن وطن کا راستہ نہ تو شہزادی کو معلوم ہے اور نہ مجھے ۔ میں شہزادی کی خادمہ ہوں !"

شہزادہ یہ سن کر کسی سوچ میں ڈوب گیا ۔ پھر اس نے تمام قیدیوں کو بتائے ہوئے راستوں سے جاکر گھر پہنچا دیا ۔ اب جہاز پر بس وہ رہ گیا تھا ، شہزادی تھی اور بوڑھی عورت ! شہزادی بہت کم باتیں کرتی تھی ۔ ہر وقت وہ اُداس رہتی ۔ شہزادے کو اس کا مزاج اور رنگ روپ بہت پسند آیا ۔ اس نے ایک دن ڈرتے ڈرتے اس سے کہا : "اگر تم پسند کرو تو ہم شادی کرلیں !"

شہزادی نے یہ تجویز منظور کرلی ——— اسی جہاز پر شہزادے اور شہزادی کی شادی ہوگئی ۔

اب شہزادے نے اپنے وطن کی طرف رخ کیا ۔ شہزادی کے ساتھ جب وہ اپنے محل میں پہنچا تو بوڑھا سلطان بہت حیران ہوا ۔ اس نے کہا ——— "یہ کیا ہے ؟"

شہزادے نے جواب دیا " ابا جان ! میں نے آپ کی دی ہوئی دولت کا بہت مناسب استعمال کیا ۔ اسی دولت کے سہارے میں نے بہت سے قیدیوں کو آزادی دلائی ۔ پھر آپ کی خدمت میں آپ کی بہو کو لے آیا ۔ کیا آپ خوش نہیں ہوئے ؟"

بوڑھے سلطان کو غصہ آگیا ۔ اس نے خفا ہو کر کہا : "تم بے وقوف ہو ۔ اتنی دولت مفت میں برباد کی"

شہزادے کو اپنے والد کی خفگی سے بہت دکھ ہوا ۔ کچھ دنوں بعد سلطان نے اسی طرح پھر ایک جہاز تیار کروایا ۔ اس پر قیمتی سامان لدوائے اور سمجھا بجھا کر شہزادے کو نئے سفر پر روانہ کردیا ۔ شہزادہ تنہا نکل پڑا ۔ کئی دن تک اس کا جہاز سمندر کی سطح پر آگے بڑھتا رہا ۔ پھر ایک روز کچھ ہی فاصلے پر ایک دوسرا جہاز نظر آیا ۔ اس جہاز پر بہت سے فوجی تھے اور انھوں نے عورتوں ، مردوں اور بچوں کو قید کر رکھا تھا ۔ شہزادہ ان سب کے غمزدہ چہرے دیکھ کر بہت متاثر ہوا ۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔ اس نے فوجیوں سے معاملہ طے کیا ۔ اپنی ساری دولت فوجیوں کو دے دی اور بدلے میں تمام قیدیوں کو آزاد کروا دیا ۔

اس بار پھر جب وہ خالی ہاتھ سلطان کے پاس پہنچا تو اس کے غصے کی حد نہ رہی ۔ اس نے شہزادی کی بوڑھی خادمہ کو گھر سے نکال دیا ۔ بعد میں لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر اس نے شہزادے کی غلطی معاف کردی اور تیسری بار اس کے لیے پھر ویسا ہی جہاز تیار کروایا ۔ شہزادے کو رخصت کرتے ہوئے اس نے کہا : " دیکھو ! یہ تمھارے لیے آخری موقع

ہے۔ اس بار میں نے جہاز پر تمہاری شہزادی کی ایک بڑی تصویر بھی لگوادی ہے۔ وہ تصویر تمھیں ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی کہ اگر اس بار پھر تم سے غلطی ہوئی تو تمھاری بیوی کو گھر سے نکال دیا جائے گا۔"

شہزادے نے سلطان کے حکم کے آگے سر جھکا دیا۔ اپنے جہاز پر پھر چل پڑا۔ چلتے چلتے اس کا جہاز ایک نئے ملک کے ساحل پر پہنچ گیا۔ شہزادے نے وہاں چند روز گزارنے کے ارادے سے اپنا جہاز روکا اس نے یہ ارادہ بھی کیا کہ یہیں اپنا سامان بیچنے کی کوشش کرے۔ جہاز کو ساحل پر دیکھ کر ایک اجنبی اس کی طرف آیا۔ اس نے پوچھا: "تم کون ہو؟"

"تاجر ہوں!" شہزادے نے جواب دیا۔

"ہزاروں طرح کے قیمتی سامان ہیں۔ جی چاہے تو جہاز پر آکر دیکھ لو!" شہزادے نے کہا۔ اجنبی جلدی سے جہاز پر آگیا۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ اتنے میں اس کی نگاہیں شہزادی کی تصویر پر اٹک گئیں۔ اس نے حیرت آمیز لہجے میں سوال کیا: "یہ کون ہے؟"

"میری بیوی!" شہزادہ دھیرے سے بولا۔

اجنبی نے کہا: "اس لڑکی کی تصویر ہمارے ملک کی شہزادی سے بہت ملتی ہے۔ کچھ دنوں پہلے شہزادی جنگل کی سیر کو گئی تھی۔ وہیں کچھ لٹیروں نے اسے گرفتار کرلیا۔ اب وہ لاپتہ ہے۔ تم میرے ساتھ بادشاہ کے محل تک چلو اور اسے اپنی کہانی سناؤ!"

شہزادہ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے سوچا، ہو نہ ہو یہی ملک اس کی بیوی کا وطن ہے۔ اس نے بادشاہ اور وزیر کے سامنے اپنی ساری کہانی سنا ڈالی۔ وہ تصویر بادشاہ کو دکھائی۔

بادشاہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔ جذباتی انداز میں بولا: "آج سے تم میری آدھی حکومت کے مالک ہو۔ تم میرے وزیر کے ساتھ اپنے وطن جاؤ۔ اپنے والدین اور میری بیٹی کے ساتھ واپس آؤ۔ پھر یہاں خوشی کا جشن منایا جائے گا!"

شہزادہ خوشی خوشی گھر پہنچا۔ بوڑھے سلطان کو پوری آپ بیتی سنائی۔ اس بار وہ بہت خوش ہوا۔ شہزادی بھی سارا قصہ سن کر کھل اٹھی۔ سب نے جلدی جلدی سفر کی تیاریاں شروع کردیں اور جہاز پر سوار ہوکر شہزادی کے ملک کی طرف چل پڑے۔

شہزادی کے ملک کا وزیر بہت لالچی تھا۔ اسے اس بات سے بہت جلن ہوئی کہ ایک اجنبی شہزادہ دور دراز کے ملک کا، اب اس کے آدھے ملک کا بادشاہ بن جائے گا۔ وزیر خود بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک رات جب وہ شہزادے کے ساتھ جہاز کے عرشے پر کھڑا تھا۔ اس نے شہزادے کو دھکا دے دیا۔ شہزادہ سنبھل نہیں سکا اور سمندر کی لہروں میں کھو گیا۔ اس نے بہت ہاتھ پیر چلائے، صدائیں دیں۔ لیکن اس کا جہاز دھیرے دھیرے اس سے دور ہوتا گیا۔ ایک لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے کر اس طرح اچھال دیا کہ شہزادہ ایک چٹان پر پہنچ گیا۔

اس چٹان پر اور کوئی بھی نہیں تھا۔ چاروں طرف ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اور سر پر کھلا ہوا آسمان کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے مچھلیاں پکڑ کر شہزادہ اپنا پیٹ بھرتا رہا۔ اسی طرح دو ہفتے گذر گئے۔ ایک دن اچانک اسے ایک کشتی دکھائی دی۔ شہزادہ اپنی پوری قوت سے چلایا۔ کشتی کے بوڑھے

ملاح نے اس کی آواز سن لی اور چپو چلاتا ہوا چٹان
کے پاس آ گیا۔

شہزادے نے اسے اپنی داستان سنائی۔
بوڑھا ملاح مدد کرنے پر تیار ہو گیا لیکن ایک شرط
بھی لگا دی: "تم جو کچھ بھی حاصل کرو گے، اس کا
آدھا مجھے دینے کا وعدہ کرو۔"

شہزادے نے شرط مان لی۔ ملاح نے اُسے
کشتی پر بٹھا لیا۔ چپو حرکت میں آ گئے۔ کشتی آگے بڑھتی
رہی، بڑھتی رہی اور ایک دن شہزادہ اپنی شہزادی
کے ملک تک پہنچ گیا۔ شہزادے کے کپڑے پھٹ چکے
تھے۔ چہرے پر تھکن چھائی ہوئی تھی۔ سب اسے دیکھ
کر بہت حیران ہوئے۔ خوش بھی ہوئے۔ پھر شہزادے
نے اپنی مصیبت کا پورا واقعہ سنایا اور آخیر میں کہا۔
"میں چاہتا ہوں کہ وزیر کو معاف کر دیا جائے۔ اسے
کوئی سزا نہ دی جائے۔"

بادشاہ کو لالچی وزیر پر غصہ تو بہت آیا۔ لیکن
شہزادے کی ضد کے آگے اس نے اُسے کوئی سزا نہیں
دی۔ محل میں خوشیاں منائی گئیں۔ ایک شان دار
دعوت کا انتظام کیا گیا۔ شہزادے کو آدھے ملک
کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ اتنے میں وہی بوڑھا ملاح
نظر آیا۔ اس نے شہزادے پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی
اور بڑے روکھے لہجے میں بولا: "اب اپنا وعدہ پورا
کرو۔ تم کو جو کچھ ملا ہے، اس کا آدھا مجھے ملنا چاہیے۔"

شہزادہ چاہتا تو بوڑھے ملاح کو ڈانٹ
ڈپٹ کر بھگا دیتا۔ لیکن اسے اپنے وعدے اور
ملاح کے احسان کا خیال تھا۔ اس نے بڑی خوشی
کے ساتھ ملاح کی بات سن لی۔ پھر اپنی سلطنت کا
نقشہ منگوایا اور کہا: "اس نقشے کو دیکھ لو اور جدھر
سے چاہو آدھا حصہ لے لو۔ پھر میں تمھیں خزانے میں لے
چلوں گا۔ اس کا بٹوارا بھی ہو جائے گا۔"

یہ سننا تھا کہ بوڑھے ملاح کے سفید بال
سنہرے ہو گئے۔ پھر اس کی شکل بدلنے لگی۔ پھر اس
کے جسم پر سفید ریشمی پوشاک لہرانے لگی اور وہ فرشتہ
بن گیا۔ اس نے شہزادے پر محبت بھری نظر ڈالی
اور سریلی آواز میں کہا: "شہزادے! جو دوسروں کی
مدد اور حفاظت کرتے ہیں خدا ان کی مدد اور حفاظت
کرتا ہے۔"

اتنا کہہ کر فرشتے نے ایک انگڑائی لی۔ اس
کے قدم زمین سے اٹھے۔ دیکھتے دیکھتے وہ ہواؤں میں
اڑنے لگا پھر آسمان کی نیلاہٹوں میں غائب ہو گیا۔

(انگریزی سے)

جناب محبوب حاتم

دو رباعیاں

یہ بات ہر اک بچے کو سمجھاتا ہے ٭ اُستاد کا ہر حکم بجا لاتا ہے
وہ قول جسے علم کا حاصل سمجھا ٭ اس قول کو ہر حال میں دہراتا ہے

مفلس کو کبھی سینے سے لگاؤ بچو ٭ جو کھاؤ غریبوں کو کھلاؤ بچو!
اٹھ جائے امیری و غریبی کا سوال ٭ ممکن ہو تو یوں جشن مناؤ بچو!

جناب منوہر پرشاد ، تنہر
بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ ایڈوکیٹ

آٹوگراف جمع کرنا

کسی بڑے آدمی کی کہی ہوئی بات ہے۔ بچہ پالنے ہی سے اپنے مشغلے چننے لگتا ہے۔ بچپن میں کچھ خاص نَاک اسے بھاتے ہیں، کچھ مخصوص کھلونے اسے پسند آنے لگتے ہیں۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کا شوق سنورنے لگتا ہے، اور پھر ماں باپ کی تربیت اس کے ان مشاغل کی رہنمائی کرتی ہے۔ عموماً بچے کم عمری سے جن مشغلوں کو اپنانے لگتے ہیں ان میں (MARCHES LABEL) دیا سلائی کے لیبل جمع کرنا، ٹکٹ اکٹھا کرنا شامل ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو انھیں گھر ہی پر بڑی آسانی سے میسر ہو جاتی ہیں۔

مگر بچہ جب اسکول کے ایسے درجوں میں جاتا ہے جہاں اس کا ذہن شعوری طور پر کام کرنے لگتا ہے، تو وہ ان مشغلوں کے علاوہ آٹوگراف جمع کرنے کا تعلیمی و تفریحی مشغلہ بھی اپنا لیتا ہے، اور یہ شوق جڑ پکڑ لیتا ہے۔ کالج کے تعلیمی دنوں میں اسے تقویت بھی ملتی ہے اور پھر زندگی بھر اس مشغلے کو جاری رکھتا ہے۔ اکثر یہ مشغلہ بڑھاپے تک ساتھ دیتا ہے۔

درحقیقت آٹوگراف جمع کرنے کا شوق ان چند گنے چنے تعلیمی و تفریحی مشغلوں میں سے ہے۔ جو عمر کے ساتھ پروان چڑھتا ہے۔

یوں تو مختلف ملکوں میں وہاں کے موسمی حالات اور روایات کے تحت بچوں کے مشغلے مختلف ہوتے ہیں۔ مگر عجیب اتفاق ہے کہ آٹوگراف جمع کرنے والے دنیا کے ہر گوشہ میں ملیں گے۔ چاہے وہ لوگ لاطینی بولتے ہوں، جرمنی یا چینی زبان میں بات کرتے ہوں مگر تفریحی مشغلوں میں آٹوگراف جمع کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔

اس مشغلے کی ابتدا کیسے ہوئی، یہ بتانا بڑا مشکل ہے۔ اور محققین کی تمام کوششیں اس سلسلے میں رائے گاں ثابت ہوئیں۔ مگر اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مشغلہ زمانہ قدیم سے ہی چلا آ رہا ہے اور اُس زمانے میں بھی انتہائی مقبول تھا۔ بڑے بڑے راجہ نواب اور بادشاہ تک اس تفریحی مشغلہ کے گرویدہ تھے۔

مصر کے فیرو بادشاہوں نے بھاری قیمتیں دے کر اپنے زمانے کے عالمی شہرت یافتہ مفکروں مورخوں اور سیاحوں کے دستخط جمع کیے تھے۔ جن میں یوریپی ڈس EURIPIDES اور سوفاکلیس SOPHOCLES جیسی ہستیاں شامل ہیں۔ یونانی بادشاہوں کے متعلق بھی ایسی ہی روایات ملتی ہیں۔ بادشاہ تو اس مشغلے میں اتنی دلچسپی لیتے تھے کہ ان کے

پاس چینی عالموں کے بھی آٹوگراف موجود تھے۔ ان میں سے اکثر برٹش میوزیم میں محفوظ بھی ہیں۔

آج کل کی طرح خوبصورت مجلد آٹوگراف بکس سب سے پہلے جرمنی میں تیار کی گئی تھیں اور جرمنی میں نفیس رنگا رنگ ورقوں کی یہ جلدیں فروخت بھی کی جاتی تھیں۔ انھیں ALBA AMICORUM کہتے تھے۔ برٹش میوزیم جہاں دنیا بھر کے اکثر نوادر اور مخطوطات جمع ہیں کئی آٹوگراف بکس پائی جاتی ہیں۔ ان میں ایک ایسی آٹوگراف بک بھی ہے جو ۱۵۵۴ء کی ہے۔

مشہور ہے کہ جرمنی کے طالب علم اور جامعہ کے اساتذہ نے اس تحریک سے ۱۶ ویں صدی میں دلچسپی لی اور اسے انتہائی مقبول مشغلہ بنا دیا۔ ابتدا میں جرمنی کے طالب علم اور اساتذہ اپنی اور اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے دستخط جمع کرتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ مشاہیر کے دستخط بھی ان آٹوگراف بکوں میں لیے جانے لگے اور پھر شاعروں، ادیبوں، مفکروں، کھلاڑیوں اور سیاستدانوں کو بھی ان میں جگہ ملنے لگی۔

جرمنی کی ان آٹوگراف بکس میں ایک آٹوگراف ایسی بھی ہے جس میں مشہور شاعر جان ملٹن کے دستخط ہیں جو یقینی طور پر کسی یونیورسٹی کے طالب علم یا پروفیسر نے ان سے حاصل کیے ہوں گے۔

مشاہیر کے دستخط جمع کرنے کا یہ تعلیمی و تفریحی مشغلہ دوسرے تمام مشاغل سے جداگانہ اور منفرد حیثیت رکھتا ہے کیونکہ آٹوگراف جمع کرنے والا مشاہیر سے ملتا ہے اور خود دستخط حاصل کرتا ہے۔ یعنی یوں سمجھیے کہ اگر آپ سیاست دانوں کے دستخط جمع کرتے ہیں تو ان کے جلسوں میں شریک ہونا پڑتا ہے تب کہیں دستخط حاصل کرنے میں کامیابی ہوتی ہے۔ یہی مرحلہ کسی مشہور مورخ، ادیب یا شاعر کی آٹوگراف کے حاصل کرنے کے لیے طے کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح کہا جاتا ہے کہ آپ نہ صرف ان بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب ہوتے ہیں بلکہ ان کے خیالات کو سمجھنے، پرکھنے اور جانچنے کا موقع بھی آپ کو ملتا ہے جس سے آپ میں بھی سوچنے اور سلجھی ہوئی رائیں قائم کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے یعنی یہ نہ صرف تفریحی مشغلہ ہے بلکہ تعلیمی بھی۔

کھلاڑیوں کے دستخط حاصل کرنا ٹیڑھی کھیر سمجھا جاتا ہے۔ ان کا کھیل تو آپ دیکھتے ہی ہیں۔ مگر ان کے آٹوگراف حاصل کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ کھیل ختم ہونے پر لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں اور کھلاڑیوں کے دستخط جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ ان میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے تو انگریزی کے آٹوگراف جمع کرنے کے مشغلے کو SPRING BOARD FOR PERSONAL ADVENTURE کہا گیا ہے۔

ڈاک کی سہولتوں نے اس مشغلے کو اور بھی بڑھاوا دیا ہے۔ دنیا کے لوگ ایک گوشے سے دوسرے گوشے کے رہنے والوں سے خط و کتابت کرکے وہاں کے مشاہیر کے دستخط منگا لیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آٹوگراف جمع کرنے والوں کی "قلمی دوستی" کے باعث اکثر آٹوگرافس کا تبادلہ بھی ہونے لگا ہے۔

اس طرح ہندوستان کے آٹوگراف جمع کرنے کے شوقینوں کے پاس روس، امریکہ، جرمنی وغیرہ کے عالموں، شاعروں اور موسیقاروں کے دستخط مل جاتے ہیں اور ان ملکوں میں ہندوستان کے سرکردہ اور مشہور لوگوں کے

دستخط موجود ہیں۔

یہی نہیں ڈاک کے ٹکٹوں کی طرح اب اکثر مغربی ملکوں میں مشہور لوگوں کے دستخط فروخت ہوتے ہیں اور امریکہ وغیرہ میں ایسی خرید و فروخت کے باعث اسے ایک بین الاقوامی تجارت سمجھا جانے لگا ہے۔

آٹوگراف کی قیمت دستخط کرنے والے کی شہرت پر منحصر ہوتی ہے۔ آٹوگراف کے ساتھ اس کی کچھ تحریر بھی شامل ہو تو قیمت میں اچھا خاصہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ مگر جب کسی کا آٹوگراف نایاب ہو تو اس کی قیمت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ امریکی آئین کو وجود میں آئے سو سال ہی ہوئے ہیں۔ مگر اس پر جن قانون سازوں کے دستخط ہیں اس کی مجموعی قیمت ۲۵ ہزار ڈالر لگائی گئی ہے اور ان میں ایک قانون ساز THOMAS LYNCH کے ایک دستخط کچھ عرصہ ہوا ۵ ہزار پونڈ میں فروخت ہو گئے ہیں۔ آج دنیا میں شیکسپیر، سر فرانسس ڈریک، رفائل، ٹامس مور اور ملٹن کے دستخطوں کی بڑی قیمت ہے۔

آج کل عکسی تصویروں کی اشاعت میں سہولتوں کی وجہ سے اکثر لوگ اپنی جمع کردہ آٹوگراف کتابی شکل میں شایع بھی کراتے ہیں اور یہ بازار میں فروخت بھی ہوتے ہیں۔ سر رابرٹ کاٹن نے بادشاہوں کے دستخط جمع کیے تھے جو برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں اور انگلینڈ کے J. G. NICHOLAS نے انگریز بادشاہوں اور امیروں کے عکسی آٹوگراف ۱۸۲۹ء میں شایع کرائے تھے۔

اس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر ۱۸۵۲ء میں J. C. SMITH نے ادبی شخصیتوں کی آٹوگرافس ان کی تحریر کے ساتھ منظر عام پر لایا تھا۔ انگلستان کے الفریڈ موریسن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بے انتہا دستخط جمع کیے تھے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے ان کی کاپیاں کیٹلاگ کی شکل میں شایع بھی کروائی تھیں۔

غرض آٹوگراف جمع کرنے کا مشغلہ تفریحی اور تعلیمی تو ہوتا ہی ہے مگر تاریخی اہمیت حاصل کرتا جاتا ہے۔

جناب محمد شفیع تمنا کلکتوی

نیا سال ۱۹۶۹ء

رحمت کی گھٹا چھائے ہر اک فرد ہو خوش حال
اللہ کرے سب کو مبارک ہو نیا سال
دل پیار سے بھر جائے نہ باقی ہو کوئی بیر
سمجھے نہ زمانے میں کسی کو بھی کوئی غیر
گونج اٹھے ہر اک دل میں محبت کا ترانہ
اے کاش! اسی روپ میں ڈھل جائے زمانہ
آجائیں سبھی ایک ہی مرکز پہ پلٹ کر
جب ہی تو کوئی کام ترقی کا ہو بہتر
انساں پہ نہ انسان کی "نفرت" کا ستم ہو
برباد نہ گاندھی کی "اہنسا" کا بھرم ہو
ذہنوں پہ نہ شیطاں کی بغاوت کے ہوں پہرے
رہ جائیں نہ سینوں میں عداوت کے اندھیرے

حسین حسان ندوی

کالو لو خرگوش

(افریقہ کی ایک لوک کہانی)

یہ اب سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ بہت بڑے علاقے پر اس کی بادشاہت تھی۔ ایک دن اس کے دل میں کیا آئی کہ علاقے کے سارے بوڑھے جانوروں کو ختم کر دینا چاہیے۔

یہ فیصلہ اس نے دو وجہوں سے کیا: ایک تو یہ کہ یہ بوڑھے جانور کوئی کام نہیں کر پاتے بڑھاپے کی وجہ سے معذور ہو گئے ہیں۔ دوسرے یہ نوجوان اور چھوٹی عمر کے جانوروں کی غذا میں سے بہت سا حصہ کھا جاتے ہیں۔

تو جناب ان شیر صاحب نے دھیرے دھیرے سارے جانور ختم کر دیے۔ بس ایک کالو لو خرگوش بچ رہا۔ یہ ان کی بات کو پہلے ہی تاڑ گیا تھا اور ایک پرانے پیڑ کی کھوکھ میں چھپ گیا تھا۔

تھوڑے ہی دنوں بعد یہ میاں شیر صاحب بہت تھکن محسوس کرنے لگے۔ ایک جگہ پڑ کے سو گئے۔ سوتے میں منہ کھلا رہ گیا۔ اتنے میں اُدھر سے ایک سانپ کا گذر ہوا۔ وہ بھی بہت تھکا ہوا تھا۔ اس

ی سر شیر کے کھلے ہوئے منھ پر گئی۔ وہ سمجھا کہ یہ زمین کا سوراخ ہے اور جھٹ سے اس میں داخل ہو گیا۔ شیر صاحب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ سانپ سے کہا منھ سے نکل جائے۔ سانپ کو شاید اس انوکھے سوراخ میں بہت آرام ملا۔ اس نے انکار کر دیا۔

اب تو شیر صاحب کو بڑی تکلیف ہوئی پریشانی ہوئی۔ انھوں نے اپنے درباریوں اپنی رعایا سے اس کا ذکر کیا اور لجاجت سے بولے: "کیا تم میری کچھ مدد نہیں کرو گے۔ میں تو اپنے کو بہت مجبور اور لاچار پا رہا ہوں۔"

یہ سن کر سبھی جانوروں نے ایک ساتھ یہ بات کہی: "عالی جاہ! ہم تو بالکل کچی عمر کے ہیں۔ نوجوان ہیں، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو اس تکلیف سے چھٹکارا دلانے کے لیے کیا تدبیر کریں۔ پرانے جانور آپ کی مدد کر سکتے تھے۔ مگر ان سب کو تو آپ نے ختم کر دیا۔"

اتفاق سے کالو خرگوش کا لڑکا وہاں موجود تھا۔ بولا: "عالی جاہ! ان پرانے جانوروں میں سے ایک زندہ بچ رہا ہے۔ لیکن اگر اس نے آپ کی مدد کی تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

شیر نے کہا: "اسے تو زندہ رہنے کی اجازت دی جائے گی اور اسے میں اپنی آدھی بادشاہت بخش دوں گا۔"

کالو کا بیٹا باپ کے پاس گیا اور شیر کی بات دہرائی۔ کالو اسی وقت جنگل میں سے ایک چوہا لایا۔ اس چوہے کو لے کر بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا:

"کیا آپ نے وعدہ کیا ہے کہ جو کوئی آپ کی مدد کرے گا آپ اسے زندہ رہنے کی اجازت دیں گے اور اسے اپنی آدھی سلطنت بخش دیں گے۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں مگر اس وعدے کو میرے سامنے دہرا دیجیے۔"

شیر نے جواب دیا: "اگر تم نے میری مدد کی تو سچے دل سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں زندہ رہنے کی اجازت دوں گا اور اپنی آدھی بادشاہت بخش دوں گا۔"

دوسرے اور جانور بھی وہاں موجود تھے سب نے شیر کے یہ بول سنے۔

اب کالو نے شیر سے کہا: "عالی جاہ آپ ذرا سو جائیں اور اپنا منھ کھلا رکھیں۔"

شیر سو گیا تو کالو نے چوہا اس کے منھ کے سامنے ڈال دیا۔ آپ جانیں چوہا تو سانپ کی سب سے مرغوب غذا ہے من بھاتا کھاجا ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہی پکڑنے کے لیے شیر کے منھ سے نکل آیا۔

شیر نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا۔ اپنی آدھی بادشاہت کالو کو بخش دی۔ یہ بھی کہا کہ اب آئندہ کسی پرانے جانور کو نہیں مارے گا۔ ان کی عقل اور تجربے سے سچ مچ بڑی مدد ملتی ہے۔

(دی فائنڈنگ آوٹ)

محترمہ شاکرہ ندیم ام۔ اے۔ علیگ

ہیلن کیلر

ہیلن کیلر کا انتقال پہلی جون ۱۹۶۸ء کو ہوا۔ وہ امریکہ کی رہنے والی تھیں۔ بے چاری خدا کی دی ہوئی بہت سی نعمتوں سے محروم تھیں۔ بچپن میں ایک خطرناک بیماری میں مبتلا ہوگئیں اس بیماری سے اچھی تو ہوگئیں مگر دیکھنے، سننے اور بولنے کی قوت سے محروم ہوگئیں۔

ان کی زندگی ایک عجیب و غریب داستان ہے۔ لگن کی محنت کی اور حوصلہ مندی کی۔ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر انسان کسی چیز کو حاصل کرنے کا سچا ارادہ کرلے تو کوئی طاقت اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی اور خدا بھی انھی کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی مدد کرتے ہیں۔

ہیلن کیلر جون ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئیں۔ بچپن میں وہ بہت پیاری شکل کی تھیں اور غیر معمولی طور پر ذہین اور تیز تھیں۔ انھوں نے چھ سات مہینے کی عمر سے "امی اور ابا" کہنا شروع کر دیا تھا۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں سخت بیمار ہوئیں صحت یاب تو ہوگئیں مگر آنکھوں کی روشنی ختم ہوگئی۔ کان بھی چوپٹ ہوگئے۔ ظاہر ہے جب بچہ کچھ سنے گا ہی نہیں تو بول بھی نہیں سکتا۔ اس طرح زبان بھی بے کار ہوگئی۔

اب اس ننھی ہیلن کے سامنے ایک طویل عمر تھی جس میں اندھیرا تھا سناٹا تھا اور تنہائی تھی۔ اور پھر اس دنیا میں جینا تھا پوری زندگی گزارنا تھی۔ جانوروں کی طرح نہیں بلکہ ایک ممتاز شہری بن کر اور عالمگیری شہرت حاصل کرکے۔ انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی تقدیر سے مطمئن ہوکر اپنے آپ کو آنے والے زمانے کے لیے تیار کرنے لگیں۔

خوش قسمتی سے ان کو شروع سے ایک اتالیق این سلیوان ANNE SULLIVAN مل گئیں انھوں نے بہت صبر اور سمجھ بوجھ کے ساتھ اندھی، بہری اور گونگی بچی کو پڑھایا۔ ان کا طریقہ تعلیم بہت صبر طلب مگر دیرپا تھا۔ وہ ہر لفظ کو ہیلن کی ہتھیلی پر لکھتی تھیں اور ساتھ ہی منہ سے اس لفظ کی آواز نکال کر ہیلن کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگاتی تھیں کہ فلاں لفظ اس طرح لکھا اور بولا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کوئی دلچسپ طریقہ نہیں تھا۔ سمجھ دار استانی نے شروع میں گھر کی مانوس چیزوں سے اور خاص طور سے ہیلن کے شوق کی چیزوں سے ابتدا کی۔ جیسے گڑیاں، کھلونے، میز، کرسی، چھتری، چمچہ، فراک، جوتے وغیرہ ہیلن نے بہت جلد یہ سب سیکھ لیا۔ ذرا آگے چل کر نابیناؤں کے خاص ابھرے ہوئے الفاظ پڑھنے شروع کیے۔ چھوٹی سی عمر سے ان ننھی بچی نے اپنی پڑھائی کی طرف خاص دھیان دیا۔ یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہیلن غیر معمولی طور پر ذہین تھیں۔ اچھے استاد کے ملنے سے انھوں نے بہت جلد

ترقی کرلی اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ انھوں نے انگریزی کے علاوہ فرانسیسی اور جرمن زبان میں بھی مہارت حاصل کرلی۔ ہوتے ہوتے ان میں اتنی قابلیت پیدا ہوگئی کہ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں ان میں سے کچھ اپنی زندگی کے بارے میں بھی تھیں —

انھوں نے کبھی اندھوں اور بہروں کو فراموش نہیں کیا۔ ان کی بہتری کے لیے کئی ادارے قائم کیے ان کی تعلیم کے لیے اسکول کھولے اور ہر قسم کی سہولتیں فراہم کیں۔ چندہ جمع کیا اور اس سلسلے میں چھ بار دنیا کا سفر کیا۔ وہ ہندوستان بھی آئی تھیں۔ ہمارے آپ کے چاچا نہرو اس وقت زندہ تھے۔ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ہمارے دیس میں ان کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔

انھیں قدرتی نظاروں سے بہت دل چسپی تھی۔ بارش، ہوا، پھولوں کی خوشبو اور صبح کے وقت پرندوں کا چہچہانا انھیں اسی طرح متاثر کرتا تھا جیسے ہمیں کرتا ہے۔ خود اپنے لباس وغیرہ کا بے حد خیال رہتا تھا۔ ہم رنگ کپڑے پہننا اور کس موسم میں کس طرح کے لباس پہننا چاہیئے اور کون سی خوشبو لگانا چاہیے ان سب باتوں کا انھیں برابر احساس رہتا تھا۔ نفاست اور سلیقہ ان کی ہر ادا سے ٹپکتا تھا۔

ذرا غور کیجیے کہ انھوں نے علم حاصل کیا۔ کتابیں لکھیں ادارے قائم کیے اسکول کھولے، دنیا کا سفر کیا، چندے جمع کیے۔ بہت معروف اور کامیاب زندگی گذاری۔ دنیا کے بڑے بڑے لیڈروں نے ان کو خطابات سے نوازا، لیکن تھیں اندھی، بہری اور گونگی۔ کیا ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ انھوں نے کس طرح یہ مقام حاصل کیا ہوگا۔ ان کی زندگی ایک مثال ہے لگن کی ہمت کی اور حوصلے کی۔

جناب ابو علقمہ

وقت کا اشارا

سفینہ ہے ڈگمگ، بلاخیز دھارا
مگر عزم و ہمت نہ چھوڑو خدارا
سلامت رہے زور بازو تمھارا
بڑھو سامنے منتظر ہے کنارا
عزیزو! یہی وقت کا ہے اشارا

نہ غم سے ڈرو منھ نہ محنت سے موڑو
تعلق کسی سے نہ نفرت سے توڑو
جو ٹوٹے ہیں دل وہ محبت سے جوڑو
کہ ہے بس یہی اک چلن سب سے پیارا
عزیزو! یہی وقت کا ہے اشارا

محبت کو اپنا چلن جو بنائے
سہے دکھ ہزاروں مگر مسکرائے
مصیبت میں غیروں کی جو کام آئے
وہی ہے زمانے کی آنکھوں کا تارا
عزیزو! یہی وقت کا ہے اشارا

مصائب کو ہرگز نہ خاطر میں لاؤ
پڑے سر جو ہنس ہنس کے سب جھیل جاؤ
قدم سمتِ منزل بڑھاؤ، بڑھاؤ
تمھیں بڑھ کے منزل نے ہے خود پکارا
عزیزو! یہی وقت کا ہے اشارا

(ریڈیائی ڈرامہ)

جناب سلیم تمنائی میسور

بھوت

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

زاہدہ:۔ کون ہے ؟

ریحانہ:۔ ہم ہیں حضور، محترمہ ریحانہ صاحبہ۔ اندر آجائیں؟

زاہدہ:۔ آپ اونٹ محترم کی طرح جس کی کوئی کل سیدھی نہیں، اپنے ہاتھ پاؤں اور گردن یا سر شریف خیمے یا کمرے کے اندر لے آئی ہیں۔ اب آپ اندر نہیں، باہر جا سکتی ہیں۔

ریحانہ:۔ ہاہاہا۔ ہم تو اندر ہی تشریف لا رہے ہیں۔ ہاں تو بی بنو، آج تو چھٹی ہے، کیا پروگرام ہے ؟

زاہدہ: بھائی جان سے کہانی سنیں گے، آپ کیا فرماتی ہیں ؟

ریحانہ:۔ نیکی اور پوچھ پوچھ ؟ ضرور سنیں گے سولہ آنے سنیں گے، سونٹے پیسے سنیں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ بھائی جان جیسے ہی آئیں۔ آپ کی وہ کی جائے، یعنی ......

زاہدہ:۔ وہ کیا ؟ خدا خیر کرے مرمت ؟

ریحانہ:۔ خوب ارسطو کا دماغ پایا ہے۔ میرا مطلب ہے۔ خالہ جان، کہ بھائی جان کی خوشامد کی جائے۔

زاہدہ:۔ مکھن پالش۔ یعنی وہی مکھن لگانے والی بات نا ؟ ٹھیک ہے، بھائی جان بھی کیا یاد کریں گے (قدموں کی آواز) ارے ! وہ شاید آرہے ہیں۔ توبہ! انور بھائی آپ ؟

انور:۔ یہ میاؤں میاؤں کیا کر رہی ہیں آپ یہاں ؟

ریحانہ:۔ دیکھیے انور بھائی۔ اب کے "میاؤں میاؤں" کہہ کر چھیڑا تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔

انور:۔ اچھا ! تو کیا کریں گی آپ ؟

ریحانہ:۔ ہم کیا کریں گے ؟ ابا امی اور بھائی جان کے سامنے جھوٹ موٹ رو کر آپ کو اتنا پٹوائیں گے اتنا .... (انور چٹکی لیتا ہے) اوئی میرے اللہ !

انور:۔ اوئی میرے اللہ مزا آئے گا نا ؟

ریحانہ:۔ امی ! انور بھائی نے ہمیں کاٹ کھایا ؟

امی کی آواز:۔ ارے کیا ہو رہا ہے ؟

انور:۔ کچھ نہیں امی، صرف چٹکی بھری تھی۔ وہ بھی پیار سے (ریحانہ کی جھوٹ موٹ کی آواز) اب چپ

بھی ہو جاؤ بابا۔ ورنہ سچ مچ پٹ جائیں گے ہم
عجیب دنیا ہے۔ ان چنچل لڑکیوں ہی کو بے قصور
سمجھا جاتا ہے۔
ریحانہ:۔ (ہنستے ہوئے) چپ رہ جاؤں انور بھائی۔
انور:۔ ہاں ہاں ہاں !
ریحانہ:۔ لیکن ایک شرط پر۔
انور:۔ شرط ؟
ریحانہ:۔ ہاں پہلے ہم سے معافی مانگیے۔ پھر بھائی جان
سے کہانی سنانے کی سفارش کیجیے۔
انور:۔ اوہ ہو چھوٹی بہن سے معافی مانگوں! البتّہ
کہانی کے لیے سفارش کر دوں گا۔
زاہدہ:۔ بھئی، اب صلح ہو جانی چاہیے ع
بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر
(قدموں کی آواز)
انور:۔ بھائی جان آگئے۔
جمیل:۔ (اندر داخل ہو کر) السلام علیکم۔
ریحانہ، زاہدہ، انور:۔ تسلیم بھائی جان تسلیم۔
ریحانہ:۔ اِدھر ہم نے یاد کیا، اُدھر آپ حاضر، توبہ!
آپ نے انگریزی پڑھاتے ہوئے کہا تھا کہ اِدھر
یاد کیا اُدھر شیطان حاضر، لیکن یہاں بھائی جان
حاضر ہیں۔ ہا ہا ہا ہا۔
زاہدہ:۔ اِدھر یاد کیا اُدھر نظر آئے۔ پھر تو عمر لمبی
شیطان کی اتنی لمبی ہو گئی۔ نانی اماں کا کہا
ٹھیک ہی ہے نا بھائی جان؟ لیکن یہ شیطان
کی آنت کتنے گز لمبی ہوتی ہے بھائی جان؟
جمیل:۔ آپ دونوں کافی شریر ہو گئی ہیں، لیکن یہ
بتائیے کہ آج ہمارے کمرے میں آپ سب کے

سب کیوں براجمان ہیں ؟
ریحانہ:۔ جی چاہا کہ چلو بھائی جان کے کمرے میں چل کر
بیٹھیں۔ بھائی جان بڑے پیارے ہیں، مٹھائی
اور پھل ہمیں ڈھونڈ کر اور بُلا کر کھلاتے ہیں۔
سوچا بھائی جان کو تکلیف نہ دینی چاہیے۔ بزرگوں
کی خدمت میں پہنچ کر یہ چیزیں کھانی چاہییں۔
جمیل:۔ خوب خوب! بڑی شریف اور فرماں بردار
بچیاں نظر آ رہی ہیں آپ سب۔
ریحانہ:۔ ہم ہمیشہ سے شریف ہیں بھائی جان! ہاں تو
زاہدہ ذرا بھائی جان کے جوتوں کے فیتے تو کھول دو۔
ہم کوٹ اتروا دیں، اُف! یہ کیا، بش شرٹ
پہن رکھا ہے اور جوتے بھی کبھی کے اتار دیے
ہیں۔ آپ ٹوپی تو اوڑھتے نہیں۔ ابا کی طرح
بال اڑ جائیں گے۔ تو پھر شاید پگڑی باندھ
لیں۔
زاہدہ:۔ سر میں تیل ڈال دیں بھائی جان ؟
جمیل:۔ اچھا اب بتاؤ کہ یہ غیر معمولی خدمت غیر معمولی نوازشوں
کی بارش آج ہم پر کیوں ہو رہی ہے؟ ہونھ!
ریحانہ:۔ ہم نے کل ہی کتاب میں پڑھا ہے کہ بزرگوں
کی خدمت کرنا بچوں کا فرض ہے۔
جمیل:۔ جیسے آج ہی فرض ہو گئی، کیوں؟ ہا ہا ہا ہا۔
(سرگوشی کے لہجے میں) آخر بات کیا ہے مُنّی؟
انور:۔ بات یہ ہے بھائی جان کہ یہ سب کہانی سننا
چاہتی ہیں۔
جمیل:۔ اوہ! تب ہی ہماری اتنی خدمت ہو رہی تھی۔
مگر ہم کہانی وہانی سنانے کے موڈ میں نہیں
ہیں۔ بہت تھک گئے ہیں۔

ریحانہ :- ذری چار پی لیجیے ۔ پھر تھکن چڑیا کی طرح "پھر" سے اڑ جائے گی ۔

جمیل :- بابا اس وقت معاف کرو ۔ تھکے ہوئے نہ ہوتے تو ضرور سناتے ۔

ریحانہ :- نہ بابا نہ ۔ ہم معاف کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں ۔

زاہدہ :- سنا دیجیے نا بھائی جان ۔

ریحانہ :- میرے پیارے بھائی جان ۔

انور :- بھائی جان سنا دیجیے نا ۔ پلیز !

جمیل :- آدمی شیطان سے نبٹ لے مگر آپ جیسے بچوں سے شیطان بھی عاجز آجاتا ہے ۔

ریحانہ :- پھر تو بسم اللہ ۔

جمیل :- (ہنسکر) شیطان کہیں کی ۔

زاہدہ :- بھائی جان بسم اللہ کیجیے نا ۔

جمیل :- بھئی ہم آج آپ کو طوطا مینا یا چوہے بلی کی کہانی نہیں سنائیں گے ۔ ایک سچی کہانی آپ شیطانوں کی خدمت میں پیش کی جائے گی ۔

ریحانہ :- الحمدللہ !

(سب ہنستے ہیں)

جمیل :- آپ سب سلیم بھائی جان کو جانتی ہوں گی ؟

زاہدہ :- آپ بھائی جان کے بھائی جان ؟

ریحانہ :- استادوں کے استاد ۔

(سب ہنستے ہیں)

جمیل :- ہاں ہاں جگت بھائی جان ۔ انھوں نے ایک دن آپ بیتی سنائی تھی ۔ کہانی بڑی دلچسپ ہے مگر ہے "بھوت" کی ۔

ریحانہ :- بھوت ماموں جان کی ؟ پھر تو مزا آئے گا ۔

جمیل :- ہاں تو سنو ۔

ریحانہ :- سنائیے بھائی جان ۔ میں ذرا آپ کے قریب ہو جاؤں ۔

جمیل :- ارے سب کے سب قریب ہو رہے ہیں ۔ ہا ہا ہا ہا ۔ ڈر گئے کیا ؟

ریحانہ :- تھوڑا تھوڑا ۔ مگر میں نے بھوت کو "بھوت ماموں جان" کہا ہے ۔ تاکہ راکشس کو بھی پیار آجائے ، ترس آجائے ، ہے نا بھائی جان ۔

جمیل :- (ہنس کر) اچھا بھائی اچھا ۔ اب سنو ۔ سلیم بھائی جان نے کہا کہ انھوں نے اپنے دوست خلیل خاں صاحب کے ساتھ سرنگاپٹم کا پروگرام بنایا ۔

ریحانہ :- بھائی جان یہ خلیل خاں وہی ہیں ۔ جنھوں نے فاختہ یا فاختائیں آڑائی تھیں ۔

جمیل :- نہیں ، ہا ہا ہا ہا ، ہرگز نہیں ۔

زاہدہ :- مکھیاں اڑائی ہوں گی اور ان کے دوست تیس مار خاں نے ماری ہوں گی ۔ فلائنگ شاٹ ۔

جمیل :- ہا ہا ہا ، خیر اب کہانی سنو ...... میں کہہ رہا تھا .... ہاں سیر کا پروگرام بنایا اور ریل کے ذریعے وہاں پہنچے ۔

ریحانہ :- چھک چھک کرتی کو کو سیٹی بجاتی ریل نا ، بھائی جان ؟

جمیل :- ہاں ہاں ۔ بیچ میں بولا نہ کرو منی ۔

ریحانہ :- اچھا بھائی جان فرمائیے کہ استادوں کے استاد یعنی بھائی جان کے بھائی نے کیا فرمایا ؟

جمیل :- فرمایا کہ مسجد اعلیٰ ، دریا دولت باغ اور ٹیپو سلطان کے مقبرے کی زیارت اور فاتحہ خوانی کے بعد اسکاٹ باغ پہنچے جہاں مسافروں کے

ٹھہرنے کا انتظام ہے۔ شام ہو رہی تھی۔ اور سورج ماموں نئی دنیا کی سیر کو جا رہے تھے۔

ریحانہ:۔ بھائی جان، نئی دنیا امریکہ ہی کو کہتے ہیں نا؟ بیچ میں بولنے کا قصور معاف ہو۔

جمیل:۔ (ہنس کر) ہاں ہاں۔ ہاں تو سورج ڈوبا اور سایے بڑھنے لگے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اماوس کی رات جو تھی، پُرشور دریا ڈاک بنگلے سے لگا بہتا تھا۔ کبھی کبھار اُلّو بھی اپنی ڈراونی آواز سے ہول پیدا کر دیتا۔

ریحانہ:۔ اب ضرور بھوت آئے گا بھائی جان۔

جمیل:۔ سنتی جاؤ۔ ہاں تو یہ لوگ کھا پی کر سو گئے۔

زاہدہ:۔ بھوت آگیا بھائی جان؟

جمیل:۔ رات آدھی گزر چکی تھی کہ ایک آواز آئی، قریب آتی گئی۔ کھڑکی کا پٹ یکایک ایک زور دار آواز کے ساتھ کھل کر اپنے آپ بند ہوگیا دو آنکھیں چمکیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں کو گھور رہی ہیں۔

ریحانہ:۔ بھائی جان ذرا میں آپ سے لگ کر بیٹھ جاؤں۔

زاہدہ:۔ ڈر گئی نا؟

ریحانہ:۔ حضور آپ مجھ سے کیوں لگی جا رہی ہیں۔

جمیل:۔ خیر سنو، چمکتی آنکھیں آہستہ آہستہ ان کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ اتنے میں "میاؤں" کی زوردار آواز سنائی دی جو اس وقت کسی خوف ناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی چیخ سے کم نہ تھی اور پھر اچانک ان کے دوست کی چیخ سنائی دی۔ سلیم بھائی جان نے گھبرا کر اپنے دوست کا بستر ٹٹولا اور انھیں غائب پاکر ایک زوردار چیخ ماری یا خود بخود نکل گئی۔ اس کے جواب میں ان کے دوست کی دوسری چیخ سنائی دی۔

زاہدہ:۔ کیا ان کے دوست کو وہ "میاؤں" اٹھا لے گئی؟

ریحانہ:۔ نہیں جی! وہ چوہے تھوڑی ہوں گے؟

انور:۔ وہ بلی کے روپ میں بھوت ہوگا۔ ہے نا بھائی جان؟

جمیل:۔ ہاں ہاں، سنتے جاؤ۔ سلیم بھائی جان کے دوست کی بستر سے غیر موجودگی، پھر ان کی ایک نہیں دو دو چیخوں نے انھیں پریشان کر دیا۔ رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اتنے میں دو چمکتی ہوئی آنکھیں ان کی جانب تیزی سے بڑھنے لگیں۔ آپ نے خیال کیا کہ دوست کا تو نوالہ بنا لیا، اب ان کی باری ہے۔ جھٹ سے لاحول ولاقوۃ پڑھنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ آنکھیں برابر ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اب انھوں نے جو زور زور جلدی جلدی اور بلند آواز سے لاحول پڑھنے کی کوشش کی تو جیسے حلق سوکھ کر چوڑی ہوگیا اور اس میں الفاظ اٹک کر رہ گئے۔ لیکن بڑی ہمت کے بعد" یا اللہ" کا نعرا لگانے کے بدلے "یا بھوت" کا نعرا مارا۔ میاں بھوت اب ناچنے لگے، ٹانڈوا ناچ۔

ریحانہ:۔ بھائی جان یہ ٹانڈوا ناچ کیا ہوا بھلا؟

جمیل:۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ یہ بربادی کا ناچ ہے۔ اور جسے شری شنکر نے ناچا تھا۔ بھئی بیچ بیچ میں ٹوکا نہ کرو۔۔۔۔۔۔ ہاں

تو میاں بھوت اوپر نیچے دائیں بائیں ناچنے
لگے۔ پھر ایک زوردار "میاؤں" کے ساتھ
جو چھلانگ لگائی تو ایک شعلے کے ساتھ پٹاخہ
یا توپ سی چھوٹی اور تیز تیز سوئیاں سی ہاتھوں
اور پیروں میں چبھ گئیں۔

ریحانہ:۔ جس طرح گلیور کو بالشتوں نے سوئی جیسے تیروں
سے مارا تھا۔ معاف کرنا بھائی جان۔ آگے کیا ہوا؟

جمیل:۔ آگے ؟ ان کے دوست کو تو لقمہ بنا لیا۔ اب
بھانجے کے سامنے پلیٹ میں سجا کر انھیں
پیش کیا جائے گا۔ ماموں جان جو ٹھہرے۔
اب بھائی جان نے فرمایا، کہ خدا کے لیے رحم
کرو ہم پر۔ کبھی تو اچھا کام کرو، نیکی کرو،
ورنہ جہنم میں جل کر کوئلہ ہو جاؤ گے۔

ریحانہ:۔ اس نے کوئی جواب دیا بھائی جان ؟

جمیل:۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ ماموں جان نے اور
نہ بھانجے پیارے نے۔ صرف دروازہ کھٹکھٹائے
گئے یا پیٹتے رہے، اور میاں بھوت ماموں کی
ظالم چمکتی ہوئی آنکھیں آواز کی طرف گھوم گئیں
جیسے وہ کہہ رہی ہوں، آؤ میرے پیارے بھانجے
ایک شکار ہم نے چھوڑ رکھا ہے۔ ہم نے ایک
کا لقمہ بنا لیا۔ بدہضمی کے ڈر سے ہم نے نہیں
کھایا دوسرے کو۔ پھر تمھارا بھی خیال تھا۔
آؤ اور ڈکارو۔

ریحانہ:۔ میری توبہ ! پھر کیا ہوا بھائی جان ؟

جمیل:۔ دروازہ دھڑام سے گرا نہیں "ایک زوردار
آواز کے ساتھ کھلا اور آپ نے فوراً
روتی آواز میں کہا، رحم اے بھوت کے بھانجے
رحم۔ خدا مہربان ہوگا عرش بریں پر۔ لیکن جواب
میں اس نے "ڈکار، ڈکار" کہا، یعنی میں تمھیں
کھا کر ڈکاروں گا۔

ریحانہ:۔ میرے اللہ! پھر کیا ہوا؟

جمیل:۔ بھانجے میاں، ماموں جان کی طرف بڑھے
شاید ماموں جان ان کا سلام قبول کر کے غائب
ہوگئے۔ شاید دعوت کا کوئی اور پروگرام بھی
ہوگا۔ بھانجے ہمارے بھائی جان کی طرف
بڑھے۔ کھٹ سے ان کے ہاتھ سے ایک شعلہ
نکلا اور یہ بے ہوش، اور جب ہوش آیا تو
کیا دیکھتے ہیں، شمع جل رہی ہے اور پہرہ دار
کھڑا انھیں جگا رہا ہے "سرکار، سرکار اٹھیے"
اب بھائی جان نے پوچھا تم کون ہو ؟
جواب ملا "میں ہوں سرکار پہرہ دار"
انھیں یقین نہ آ رہا تھا، پوچھا "سچ کہتے ہو بھائی"
اس پر وہ مسکرایا اور بولا "ہاں سرکار ہاں"
جب ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے تو ان کے عزیز
دوست کو کمرے کے ایک کونے میں بے خبر پڑا
پایا۔ جب انھیں جگایا گیا تو آنکھیں کھولے بغیر
ہی بولے "بھوت، خدا کے لیے اب مرنے کے
بعد تو نہ ستاؤ"

ریحانہ:۔ ہائے ہائے، جیسے بے چارے سچ مچ مر گئے تھے

جمیل:۔ بڑی مشکل سے انھیں جگایا تو بھائی جان کی طرف
دیکھ کر بولے "یار تم زندہ ہو ؟"
انھوں نے ہنس کر کہا "نہیں تو کیا میں تم سے
محشر میں ملنے آیا ہوں ؟"
پوچھا وہ بھوت چلا گیا ؟

اس کے جواب میں انھوں نے پہرہ دار کی صورت دیکھی۔ وہ مسکرا کر بولا "سرکار، یہاں بھوت وُوت کہاں سرکار۔"

دوست کو یقین نہ آیا، پوچھا "وہ میاؤں میاؤں"

وہ ہنسا اور بات کاٹ کر بولا: "سرکار وہ کالی بلّی تو میری ہے۔ وہ اکثر یہاں چوہے پکڑنے چلی آتی ہے۔ سرکار جب میں نے چیخوں کی آواز سنی تو کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا میں برابر "سرکار، سرکار" چلائے گیا۔ مگر آپ ہیں کہ کچھ کہے جا رہے ہیں اور دروازہ کھولنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ آخر مجھے اپنی بھرپور طاقت لگا کر کھولنا پڑا۔ چٹخنی ٹوٹ گئی۔

ریحانہ:۔ آپ کے بھائی نے پہرے دار کی "سرکار سرکار" کو "ڈکار ڈکار" سمجھ لیا۔

جمیل:۔ ہاں خوف میں یہی ہوتا ہے۔ ہاں تو پہرے دار نے آگے کہا کہ اس نے بلب جلانے کی کوشش کی تو روشنی غائب۔ دیا سلائی جلائی تو بھائی جان بے ہوش پڑے ہیں۔ اور ان کے قریب بلب کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ ایک آدھ اس کے بھی چبھ گیا۔ آخر اس نے شمع لا کر روشنی کی۔

ریحانہ:۔ تو وہ شعلہ کے ساتھ پٹاخہ یا توپ سی چھوٹی تھی۔ وہ بلب ہی پھٹا تھا نا؟ اور پہرے دار کی جلائی ہوئی دیا سلائی بھوت کے بھانجے وانجے کے ہاتھ سے نکلا ہوا شعلہ تھا۔ ہاہاہا۔

جمیل:۔ جی ہاں۔ اسی بلب کے نوک دار ٹکڑے انھیں چبھے تھے۔ اب ان کے دوست نے پوچھا کہ اگر وہ سچ مچ بلّی تھی تو ان کے پیچھے پر بھاگ کیوں نہیں گئی مُردار؟

پہرے دار بدستور مسکرا کر بولا: "سرکار معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ اندر چلی آئی تو ہوا سے کھڑکی کا پٹ بند ہو گیا اور آپ کی چیخوں سے گھبرا کر اِدھر اُدھر چھلانگیں لگانے لگی۔ اور اسی دوران بلب بھی چھلانگوں کی زد میں آ کر پھٹ گیا۔" یہ سن کر وہ دونوں ہنسنے لگے اور پہرے دار کے ہاتھ میں چپکے سے پچاس پیسے دے کر چلتا کیا وہ ان کی بہادری کی داستان باہر نہ سنائے۔

ریحانہ:۔ مگر آپ کے بہادر بھائی جان نے اپنے دوست کا بستر ٹٹولا تو غائب۔

جمیل:۔ غائب! میں نے بھی یہی سوال کیا تھا۔ بات یہ ہوئی جب "میاؤں" کی آواز آئی تو جگت بھائی جان اپنے بستر سے اٹھ بیٹھے تھے۔ ان کے دوست نے انھیں پہلے ٹٹولا اور غائب پایا۔ بے چارے نے بدحواس ہو کر "میاؤں" کی آواز کے ساتھ ایک زور دار چیخ ماری اور بستر چھوڑ دور جا کھڑے ہوئے۔ تاکہ بھوت انھیں دبوچ نہ لے۔ تمھیں میں نے پہلے ہی بتایا ہے کہ سلیم بھائی جان نے بھی بستر ٹٹولا تھا۔ بھلا وہ اپنے دوست کو کیسے پاتے۔

ریحانہ:۔ گویا دونوں نے ایک دوسرے کو بھوت کی داڑھ میں سمجھ رکھا تھا۔

جمیل:۔ جی ہاں۔

ریحانہ:۔ بھائی جان اگر خدانخواستہ سچ مچ بھوت

نکل آتا تو ؟

جمیل :۔ بھوت ! بھوت بھی کوئی ڈرنے کی چیز ہے ؟ بھوت نام کی سرے سے کوئی چیز ہی نہ ہو تو بھلا ڈر کیا ؟ شریر بچوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے نانی یا دادی اماں کی گھڑی ہوئی کہانیاں ہیں بس ۔

زاہدہ :۔ سچ ؟ ناحق میں اندھیرے میں اور اندھیرے سے ڈرا کرتی تھی ۔

جمیل :۔ بالکل سچ منی ۔ اب اندھیرے سے خوف نہ کھایا کرو ۔

ریحانہ :۔ تو بھائی جان اس دنیا میں بھوت نہیں ۔

جمیل :۔ بالکل نہیں ۔

ریحانہ نہیں بھائی جان ! دو چار تو ضرور ہوتے ہوں گے ۔

جمیل :۔ حضور آپ کا ڈر ہی بھوت ہے ۔ چڑیل ہے اور کیا کچھ نہیں ہے ۔ (ہنس کر) آپ دو چار اصرار کرتی ہیں تو میں مانے لیتا ہوں کہ آپ ہی دو چار بھوت بھتنیاں ہوں گی ۔ ہا ہا ہا ہا ۔

ریحانہ :۔ اگر ہم لوگ ہی بھوت بھتنیاں ہیں تو ...... خطا معاف ! ہمارے بھائی جان کیا ہوئے ۔

(سب کے ہنسنے کی آواز آتی ہے)

(آکاش وانی کی اجازت اور کچھ ترمیم و اضافے کے بعد)
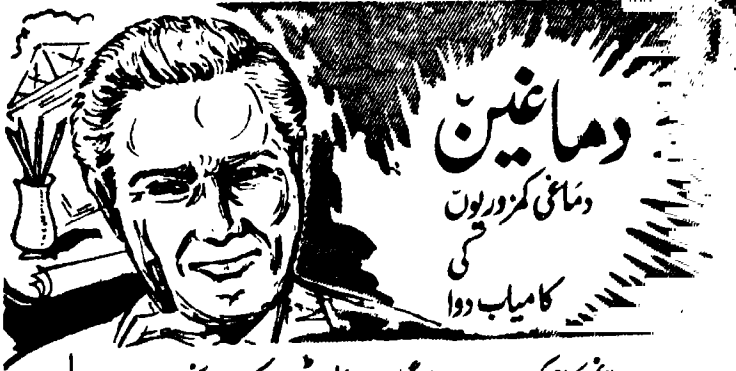
جناب کیف احمد صدیقی

نیا برس

ہزار عشرتیں لے کر نیا برس آیا
تمام نعمتیں لے کر نیا برس آیا

نئی امنگ، نئے حوصلے، نئی خوشیاں
نئی حیات، نئی آرزو، نئے ارماں
نئی مسرتیں لے کر نیا برس آیا
ہزار عشرتیں لے کر نیا برس آیا

کلی کلی میں مہک اک نئی امید کی ہے
کرن کرن میں تجلّی ہلالِ عید کی ہے
خدا کی رحمتیں لے کر نیا برس آیا
ہزار عشرتیں لے کر نیا برس آیا

نسیم جھومتی پھرتی ہے صحنِ گلشن میں
چمن کے پھول کِھلے ہیں ہر اک کے دامن میں
خوشی کی نکہتیں لے کر نیا برس آیا
ہزار عشرتیں لے کر نیا برس آیا

خدا کا شکر وطن میں کہیں فساد نہیں
جو پچھلے سال ہوا تھا کسی کو یاد نہیں
تمام راحتیں لے کر نیا برس آیا
ہزار عشرتیں لے کر نیا برس آیا

دلوں میں بغض و تعصب کا باب بند ہوا
فضا میں پرچمِ انسانیت بلند ہوا
جوان ہمتیں لے کر نیا برس آیا!
ہزار عشرتیں لے کر نیا برس آیا!

جناب مشہود مفتی

دنیا کی سب سے ننھی چڑیا

گوشت کا ایک ننھا سا ٹکڑا۔ کتنا ننھا ہے؟ جتنی ملکہ شہد کی مکھی۔ بس اس سے ذرا سا زیادہ سمجھ لیجیے تو جناب اتنے سے گوشت کے ٹکڑے کو رنگ برنگے پروں سے سجا کر اللہ میاں نے کیا یہ کہ اس میں جان ڈال دی اور وہ سوا انچ یا تین انچ کا ٹکڑا ننھی چڑیا بن کر پھر سے اُڑ گئی۔ مگر اڑ کر گئی کہاں؟

وہ گئی جناب مغربی دنیا کی طرف۔ شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے انڈیز پہاڑ کے دامن میں اور پھر وہاں سے پورے مغربی نصف کرہ میں پھیل گئی۔ دنیا کے چڑیوں کے ماہروں نے اسے ہمنگ برڈ HUMMING BIRD کہہ کر پکارا۔

اس چڑیا کی کچھ نہیں کچھ نہیں تو ... قسمیں ہیں ... کیوبا میں پائی جانے والی یہ چڑیا کل سوا انچ کی ہوتی ہے۔ البتہ امریکہ کی یہی چڑیا کوئی تین انچ کی ہوتی ہے۔ لیکن اسی سوا انچ اور تین انچ کے ڈھانچے میں قدرت نے قوت کا ایک خزانہ چھپا دیا ہے۔ ایک گھنٹے میں [illegible] میل کی رفتار سے اڑنے والی یہ ننھی چڑیا جب جھنڈ میں ایک مقام سے دوسرے دور دراز مقام کی طرف کوچ کرتی ہے تو کہیں قیام کیے بغیر چھ چھ سو میل کا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔ اس کی خوراک اس کے وزن سے دگنی ہوتی ہے۔ عام طور سے پھولوں کا رس ہی اس کی مخصوص غذا ہے۔ تیس سکنڈ میں یہ چڑیا ۶۰ پھولوں سے رس چوس لیتی ہے۔ کبھی پھولوں کا رس نہ ملا تو یہ ننھے بھنگوں اور کیڑوں ہی سے پیٹ بھر لیتی ہے۔

ہیرے جیسی چمکنے والی یہ چڑیا اپنے رنگ برنگے نازک پروں سے اور بھی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ یاقوتی رنگ کی گردن والی نر چڑیا کے پر زمرد کی طرح چمکتے ہیں۔ دُم اور بازو ہلکے ہلکے ارغوانی رنگ کے۔ یہ رنگ چڑیا کے حرکت کرنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ حیوانات کے ماہر آڈوبون AUDOBON نے اسی چڑیا کو قوس قزح کے چمکتے ہوئے ٹکڑے سے تشبیہ دی ہے۔ اڑنے میں یہ چڑیا اتنی تیز ہے کہ اس کے وجود کو مشکل سے محسوس کیا جاتا ہے بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجلی کی تیزی سے ایک دھبا سا سامنے سے گزر گیا۔

آپ کبھی اس کو زمین پر بیٹھا نہ پائیں گے۔ ہمیشہ فضا میں اڑتی رہتی ہے۔ اس کے پر شہد کی

کھی کی طرح حرکت میں رہتے ہیں، اور اتنی تیزی سے چلتے ہیں کہ آپ پروں کو دیکھ نہیں سکتے۔ یہ پر ایک سکنڈ میں ۷۸ بار حرکت کرتے ہیں۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے۔ روزانہ یہ چڑیا اڑنے میں جتنا فاصلہ طے کر لیتی ہے اگر وہ سیدھی اُڑتی چلی جائے تو ایک مہینے میں پوری دنیا کا چکر لگا سکتی ہے۔

اور سنیے یہ چڑیا پیچھے کو بھی اڑتی ہے پھول کے اندر داخل ہو کر بھی یہ اپنے پروں کے سہارے معلق رہ کر اپنا پیٹ بھرتی ہے اور پھر الٹے پروں پھول سے باہر آجاتی ہے۔

اکثر اس کو اڑتے ہوئے دیکھ کر کسی بڑے کیڑے کا گمان ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ مکڑی کے جالے میں بھی الجھ کر پھڑپھڑانے لگتی ہے۔

انڈے دینے کے زمانے میں چڑیاں عام طور پر چڑچڑی ہو جاتی ہیں۔ آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں۔ لیکن یہ چڑیا ہمیشہ لڑنے کے موڈ میں رہتی ہے۔ ہر وقت مارنے مرنے پر آمادہ رہتی ہے۔ بلا کی تیز نڈر اور ہمہ وقت چوکس نظر آتی ہے۔

ایک بات اور:۔ آپ کا دل دیا سلائی کی تیلی کے سر کی برابر ہے۔ مگر دل آپ کا ایک منٹ میں ۵۹۰ بار دھڑکتا ہے۔

ایک کسان کے پاس ایک لگ ہارن مرغا تھا۔ یہ بڑا غصیلا اور جنگ جو تھا۔ کسان اس سے پریشان تھا اور اس نتیجے پہنچا تھا کہ بغیر اس کو جان سے مارے مرغی خانے میں امن قائم نہیں ہو سکتا اسی زمانے میں مرغیوں کے فارم کے قریب ایک ناشپاتی کے درخت پر اس چڑیا نے گھونسلا بنانا

شروع کیا۔ مرغ نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اس ننھی چڑیا کو پریشان کرنا شروع کیا۔ چڑیا نے بھی فوراً لڑائی کا اعلان کر دیا۔ ظاہر تھا اتنے بڑے پرندے کے مقابلے میں یہ ننھی سی چڑیا کیا کر لیتی۔ لیکن وہ تیر کی طرح اس کی گردن اور سر پر جھپٹی اور

اپنی باریک چونچ سے اس تیزی سے حملہ کیا کہ میاں مرغ کے سر اور گردن دونوں سے خون ٹپکنے لگا۔ مرغ میاں بھاگ کھڑے ہوئے اور جب گھنٹوں کے بعد مرغی خانے سے باہر نکلے تو ان کی ساری اکڑ فوں ختم ہو چکی تھی۔

اس چڑیا کی ایک دوسری لڑائی ایک بڑے شاہین سے ہوئی تھی جو اس سے تقریباً دو ہزار گنا وزن رکھتا ہوگا۔ یہ چڑیا ایک ننھے سے بم کی طرح باز کے چاروں طرف گھومی اور پھر ایک دم اس کے سر پر جھپٹی۔ شاہین اوپر لپکا لیکن اتنے عرصہ میں یہ ننھی چڑیا اپنی چونچ سے اس کے سر پر ٹھونگ مار کر اوپر چلی گئی تھی اور دوسرا حملہ کرنے والی تھی۔ یہ جنگ چند ہی سکنڈ ہوئی تھی کہ باز نے چیخ ماری اور دہائی دیتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ ننھی چڑیا اپنی فتح سے مطمئن ہو کر پھر شاخ پر آ بیٹھی۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ دنیا کا یہ مشہور شکاری پرندہ اس چڑیا کو چھو بھی نہ سکا۔

جناب وقار خلیل

بچّے

بچّے، شوخ، سجیلے، چنچل
جنگل میں منگل سی ہل چل

ممتا کی آنکھوں کا کاجل
خوابوں کی وادی میں آنچل

گھر آنگن میں چاند ستارے
کیاری کیاری کونپل کونپل

اندھیارے میں جیسے جگنو
روشن روشن اکومل کومل

جیون کی سوکھی بگیا میں
ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہریاول

اگنی رُت میں پیار کی شبنم
تپتے صحراؤں میں چھاگل

کٹی پھٹی سوکھی دھرتی پر
جیسے ٹوٹ کے برسیں بادل

ہوں گے مستقبل کی دھڑکن
گو ہیں آج یہ چنچل چنچل

جناب ابرار محسن ایم۔اے۔بی ٹی

سبق

گاؤں کے سارے بچوں میں چنّو سب سے زیادہ شریر تھا۔ یوں تو بچے بھی شریر ہوا کرتے ہیں مگر چنّو کی حرکتیں تو حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔ گاؤں والوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا اس نے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی شرارت ضرور کرتا تھا اور شرارتیں بھی ایسی جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے۔ کھیتوں میں پہنچ کر تربوز خربوزے خوب کھاتا، دوستوں کو کھلاتا اور باقی توڑ پھوڑ کر پھینک دیتا، آم کے باغوں میں جا گھستا اور تباہی مچا دیتا۔ کچے پکے نہ جانے کتنے آم برباد کر دیتا۔ فصل کٹتی تو کھلیان میں چپکے سے آگ لگا دیتا۔ کتّوں اور گدھوں کی دُموں میں پٹاخے باندھ دیتا۔ جب بے زبان جانور پٹاخوں کی آواز سے گھبرا کر اِدھر اُدھر دوڑتے تو وہ خوشی سے تالیاں بجاتا۔ گاؤں میں اس سے کوئی بھی خوش نہ تھا۔

اس کے باپ زمیندار تھے اس لیے گاؤں والے بے بس تھے۔ خاموشی سے یہ ساری حرکتیں برداشت کرتے تھے۔ کسی معمولی کسان کا لڑکا ہوتا تب دوسری بات تھی۔ اب تک اس کی ایسی پٹائی ہو چکی ہوتی کہ ساری شرارتیں بھول جاتا۔ مگر بھلا زمیندار صاحب کے لڑکے سے کوئی کیا کہے!

وہ بڑوں کا ادب نہیں کرتا تھا۔ چھوٹے بچوں کو بلا وجہ ستاتا تھا اور اپنے ساتھیوں سے بھی بُری طرح پیش آتا جو لوگ اسے پیار سے سمجھاتے ان پر پتھر پھینکتا مدرسے میں بس تھوڑی دیر کے لیے جاتا تھا، وہ بھی کبھی کبھی۔ گھر سے مدرسے کے لیے نکلتا مگر سارا دن اِدھر اُدھر گھومتا رہتا۔ ماسٹر صاحب اگر کچھ کہتے تو منہ چڑا دیتا مدرسے میں بھی کبھی کسی کی دوات پھوڑ دیتا، قلم توڑ دیتا اور کتابیں پھاڑ دیتا۔

زمیندار صاحب بیٹے کی ان حرکتوں سے بے خبر نہ تھے۔ انھیں سب کچھ معلوم تھا۔ کوئی ان سے مارے ڈر کے شکایت نہ کرتا تھا پھر بھی گاؤں میں ہونے والی ہر بات کیسے چھپی رہ سکتی تھی!! انھیں بہت دُکھ تھا۔

چنّو بہت بگڑ چکا تھا۔ اور اسے بگاڑا تھا اُس کی ماں نے۔ اکلوتا لڑکا تھا۔ ماں نے کچھ ایسا لاڈ پیار کیا کہ وہ دو کوڑی کا ہو گیا۔ شروع ہی سے ضدی اور بدتمیز بن گیا تھا وہ۔ ذرا ذرا بات پر مچل جاتا۔ جو بات

منہ سے نکل جاتی پوری کرا کے ہی رہتا ۔ زمیندار صاحب اگر کبھی ڈانٹتے تو ماں بگڑ جاتیں ۔

جب وہ مدرسے جانے کے قابل ہوا اور زمیندار صاحب نے اسے مدرسے میں داخل کرانے کا ارادہ کیا تب بھی ماں ناراض ہوگئیں ۔

"ہائے ہائے ۔ میں نہ بھیجوں گی مدرسے ۔ اُسے نوکری تھوڑا ہی کرنی ہے ۔ اکلوتا لڑکا ہے ۔ ساری زندگی آرام سے کھائے گا ـــــ اور پھر ماسٹر نہ جانے کتنا مارے گا میرے لال کو ۔"

زمیندار صاحب نے بہت سمجھایا کہ تعلیم خالی نوکری کے لیے نہیں حاصل کی جاتی بلکہ علم کے بغیر انسان جانور رہتا ہے ۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ بات بھلا کہاں آتی !

آخر انھوں نے یقین دلایا کہ مدرسے میں چُنّو پر کوئی سختی نہ ہوگی ۔ ماسٹر بھی کچھ نہ کہے گا ۔ تب کہیں وہ راضی ہوئیں ۔ اسی لیے ماسٹر صاحب بھی زبان سے ایک لفظ نہ نکالتے ـــــ چُنّو بگڑتا ہی جا رہا تھا ۔
زمیندار صاحب کافی فکر مند رہتے تھے مگر اپنی بیوی سے ڈرتے بھی تھے ۔ وہ چاہتے تھے چُنّو ایک اچھا لڑکا بنے ۔ لوگ اس کی تعریف کریں اور وہ باپ کا نام اونچا کرے ۔ مگر ان کے چاہنے سے بھلا کیا ہوتا ۔ سب کچھ الٹا ہی ہو رہا تھا ۔ جن لوگوں کا نقصان چُنّو کی وجہ سے ہوتا اور زمیندار صاحب کو پتہ چل جاتا تو وہ اسے پورا کر دیا کرتے تھے ۔ یہ اور بھی غلط تھا چُنّو سوچتا تھا کہ باپ تو لوگوں کو کچھ دے ہی دیتے ہیں ، اس لیے جو جی چاہے کرو ۔

چُنّو کا بھی سچ پوچھو تو ایسا زیادہ قصور نہ تھا بچوں کو ماں باپ ہی بناتے بگاڑتے ہیں ۔ اصل میں تصور تھا ماں کے حد سے زیادہ لاڈ کا اور باپ کی نرم دلی اور کم زوری کا ۔

اور خرابیاں تو اس میں تھیں ہی مگر ایک بات بہت ہی زیادہ بری تھی ۔ وہ بے زبان جانوروں کے علاوہ ننھے منّے پرندوں کو بھی ستاتا تھا ۔ غلیل لے کر باغوں میں پہنچ جاتا اور بلا وجہ پرندوں کو زخمی کرتا یا مار ڈالتا ۔ ذرا بھی ترس نہ کھاتا ان پر ۔

جوں ہی کوئی رنگین چڑیا کسی ہری ٹہنی پر چہچہاتی نظر آتی ، غلیل سے غُلّہ نکلتا اور پل ہی بھر میں اس کے خوبصورت پَر خون میں ڈوبے ہوتے اور وہ زمین پر تڑپتی ہوتی ۔ چُنّو زور زور سے قہقہے لگاتا ۔ "کیسا عمدہ نشانہ ہے ۔" اس کے ساتھی کہتے اور وہ تعریف سن کر پھولا نہ سماتا ۔

اکثر درختوں پر چڑھ کر پرندوں کے گھونسلوں کو توڑ پھوڑ کر انڈے اٹھا لاتا ۔ پرندے اپنے گھروں کی بربادی پر شور مچاتے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا ۔

گاؤں کے پاس ہی ایک ندّی بہتی تھی ۔ جس کے کنارے اُگے ہوئے بے شمار درختوں کی شاخیں ندّی پر جھکی ہوئی تھیں ۔ ان شاخوں پر چڑیوں کے بہت سے گھونسلے تھے ۔ چُنّو کافی گھونسلے برباد کر چکا تھا ۔

ایک شام اس کا ایک ساتھی دوڑتا ہوا آیا اور اسے خوش خبری سنائی ۔

"ارے چُنّو ! ندّی کنارے ایک درخت پر "بیا" نے گھونسلا بنایا ہے ۔ بہت خوبصورت ہے بوتل کی طرح ۔ چل لے آئیں ۔"

"بیا کا گھونسلا !" چُنّو خوشی سے اچھل پڑا ۔

بیا کے گھونسلے تو وہ خاص طور سے توڑا کرتا تھا۔
"مگر۔ اب تو اندھیرا پھیل رہا ہے۔ کل صبح ہی چلیں گے" اس نے کہا" اور تمام گھونسلے توڑ لائیں گے۔ سنا ہے ندی کے پاس ہی جھاڑیوں میں مورنی نے بھی انڈے دیے ہیں۔"

اسی وقت اُدھر سے بوڑھے چا چا گذر رہے تھے۔ انھوں نے ساری بات سن لی تھی۔ چنّو سے بولے۔

"کیا ملے گا تجھے بے زبان پرندوں کے گھر اُجاڑ کر؟ بہت بُری بات ہے بیٹا۔"

"جاؤ۔ جاؤ، چا چا۔ اپنا کام کرو۔" چنّو نے بدتمیزی سے کہا۔ "مرضی ہے ہماری۔ جو چاہیں کریں، تم کون ہوتے ہو؟ جاؤ نہیں تو ایسا ڈھیلا ماروں گا کہ مزہ آجائے گا۔"

چا چا چپ چاپ چلے گئے۔

رات ہو چکی تھی۔ چنّو کھانا کھا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ وہ "بیا" کے گھونسلے ہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

اچانک شور ہونے لگا۔ لوگ بُری طرح چلانے لگے۔ ڈاکوؤں نے گاؤں پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ گھروں کو آگ لگانے لگے، گاؤں والوں کو قتل کرنے لگے، سامان لوٹنے لگے ——— چنّو گھبرا گیا ———

گاؤں والے بھاگ رہے تھے۔ عورتیں اور بچے چیخ رہے تھے۔ بندوقوں کے دھماکے گونج رہے تھے۔ چنّو گھر سے باہر نکل کر یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ اب کیا ہوگا؟" وہ کہہ رہا تھا، مگر کون اس کی آواز سنتا!

ڈاکو اس کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بڑی بھیانک شکلیں تھیں۔ ان کی ہاتھوں میں بندوقیں اور مشعلیں تھیں۔

"ٹھہرو۔ ٹھہرو۔" چنّو چیخ اُٹھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اُس نے دیکھا ڈاکو مشعل سے اس کے گھر کو آگ لگا رہے تھے۔

"مت جلاؤ۔ ہمارا گھر مت جلاؤ۔ یہ ظلم نہ کرو" وہ رو رو کر کہہ رہا تھا۔" ہم بے گھر ہو جائیں گے۔ رحم کرو۔"

"گولی مار دو اس لڑکے کو۔" کسی نے کہا۔ وہ ڈاکوؤں کا سردار معلوم ہوتا تھا۔" اس کا چہرہ بڑا خوں خوار تھا۔

"ہم نے کیا قصور کیا ہے؟ کیا بگاڑا ہے تمھارا ———؟" وہ کہہ رہا تھا۔ "مت جلاؤ۔"

"مرضی ہے ہماری۔" سردار نے قہقہہ لگا کر کہا۔" جو چاہیں کریں۔ تو کون ہوتا ہے؟"

اچانک چنّو کو وہ الفاظ یاد آگئے جو اُس نے چا چا سے کہے تھے۔ اب اسے احساس ہوا کہ کسی کا گھر اُجاڑنا کتنی بُری بات ہے۔ نہ جانے کتنے پرندوں کو بے گھر کر دیا تھا اس نے بلا وجہ۔ بغیر کسی قصور کے ——— آہ ———

"گولی مار دو۔" سردار نے گرج کر کہا۔

"نہیں۔ نہیں۔ مجھے مت مارو۔ گھر مت جلاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں اب۔"

اس کی آنکھ کھل گئی ——— اس کے باپ پاس کھڑے تھے۔

"کیا ہوا چنّو؟" انھوں نے پوچھا ———

"کیوں رو رہا ہے ؟"

وہ خواب تھا ـــــــ ایک ایسا خواب جس نے اُس کی زندگی بدل دی ـــــــ اُسی روز سے گاؤں والوں نے دیکھ لیا۔ چنو گاؤں کا سب سے زیادہ شریف لڑکا بن گیا، وہ اب کسی کو نہیں ستاتا ہے، بڑوں کا ادب کرتا ہے، مدرسے میں دل لگا کر پڑھتا ہے۔ خاص طور سے جانوروں اور پرندوں کا تو وہ بہت ہی خیال رکھتا ہے۔ اب وہ کبھی گھونسلوں کو ہاتھ نہیں لگاتا ـــــــ تمام گاؤں والے اس سے خوش ہیں اُس سے محبت کرتے ہیں۔ خواب نے اسے ایسا سبق سکھایا ہے جسے وہ زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔

بھلا آدمی

جناب ساحر بھوپالی

نہ کر جھوٹا وعدہ بھلے آدمی
دکھا بن کے سچا بھلے آدمی
کہا مان میرا بھلے آدمی
محبت سے رہنا بھلے آدمی
ہے اچھوں کا شیوہ بھلے آدمی

جہاں تک بنے علم حاصل تو کر
رکھ اپنی برائی پہ ہر دم نظر
ہر اک کی مصیبت سے رہ باخبر
بھلائی کا رکھ دھیان شام و سحر
بن اچھوں سے اچھا بھلے آدمی

محبت سے ہر اک کو اپنا بنا
شریفوں کے اطوار سب کو سکھا
نمونہ اگر تو بنا پیار کا
تو خدمت سے عظمت یہاں پائے گا
یہ گن یاد رکھنا بھلے آدمی

مصیبت کا تو اپنی چرچا نہ کر
ستم کا زمانے کے شکوہ نہ کر
کسی کو زمانے میں رسوا نہ کر
دکھے جس سے دل کام ایسا نہ کر
رہے دھیان اتنا بھلے آدمی

زمانے کی نیرنگیوں پر نہ جا
حقیقت سمجھ دیکھ دھوکا نہ کھا
یہاں پر ہے بدنام نامِ وفا
زمانے سے ہشیار رہنا ذرا
یہ تیرا نہ میرا بھلے آدمی

ہر اک شے کی تقدیر میں ہے فنا
زمانے میں ہے بس خدا کو بقا
وہ کر کام جس سے ہو راضی خدا
نہیں ہے یہاں دل لگانا روا
یہ دنیا ہے دنیا بھلے آدمی

کشمیر میں چندن

جناب قاضی محمد احمد لکچرر جامعہ کالج
جناب سید محمد راشد

جموں اور کشمیر ہمارے دیس کی ایک اہم ریاست ہے۔ اس کے تین طرف چین، افغانستان اور پاکستان ہے اور جنوب میں — ہندوستان کی ریاستیں ہماچل پردیش اور پنجاب ہیں۔

اس ریاست کا کل رقبہ ۲۲۲۸۰۰ مربع کلو میٹر ہے کل آبادی ۳۵۶۰۹۷۶ ہے۔ انتظامی سہولتوں کیلیے اور ریاستوں کی طرح ریاستِ جموں وکشمیر کو بھی چند ضلعوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ان کے نام اننت ناگ، بارہمولا، ڈوڈا، جموں، کٹھوا، لداخ، پونچھ، سرینگر اور اودھم پور ہیں۔ ان ضلعوں میں سب سے اہم سرینگر، جموں اور لداخ ہیں۔ سرینگر وادی میں ہے اور لداخ پہاڑ پر واقع ہے لیکن جموں ضلع کا کچھ حصہ پہاڑی اور کچھ میدانی ہے۔

اس ریاست کی سطح زمین کی بناوٹ تقریباً ساری کی ساری پہاڑی ہے۔ ریاستِ کشمیر میں ہمالیہ کا جو حصہ آتا ہے اسے مغربی ہمالیہ کہتے ہیں۔ مغربی ہمالیہ کے تین خاص سلسلے ہیں پہلا زنسکار، دوسرا پیرپنجال اور تیسرا شوالک۔ جموں سے اودھم پور تک شوالک کا سلسلہ ملتا ہے۔ اودھم پور سے وادی کے شمالی حصہ تک پیرپنجال اور پھر شمال میں زنسکار کا عظیم سلسلہ آتا ہے۔

ان پہاڑوں کے بیچ میں چھوٹی بڑی وادیاں ہیں۔ جن میں سب سے بڑی وادی کشمیر ہے۔ اس کے علاوہ وادی بانہال اور وادی چلنی ہیں۔ پہاڑوں اور وادیوں کے علاوہ کشمیر میں چھوٹے بڑے پٹھار بھی ہیں۔ جن میں سب سے بڑا لداخ کا پٹھار ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں میدانی علاقہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف ایک چھوٹا سا میدانی حصہ جموں کے جنوب میں ملتا ہے۔ یا پہاڑوں کی وادیوں میں ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں کافی تعداد میں بڑے بڑے دریا بھی ملتے ہیں۔ جن میں سندھ، چناب، جہلم، راوی اور کوسی

خاص ہیں۔

قدرتی نباتات کے سلسلے میں یہ ریاست بہت ہی خوش قسمت ہے یہاں چیڑ، دیو دار، چنار اور سفیدے کے جنگل بھی کافی تعداد میں ہیں۔ ریاست کی آمدنی ان جنگلات پر بہت حد تک منحصر ہے۔ دراصل یہ ریاست کا سبز سونا ہیں۔

اس ریاست میں۔۔۔۔قدرتی مناظر بہت زیادہ ہیں۔ انھی کی وجہ سے اس ریاست کو ہندوستان کا سوئٹزرلینڈ کہا جاتا ہے ہر سال ہزاروں ملکی اور غیر ملکی سیاح قدرتی مناظر کا لطف اٹھانے یہاں آتے ہیں۔

اس سال جامعہ کالج سے جغرافیہ کے طالب علموں نے کشمیر کی سیر و سیاحت کی۔ سفر کے تمام انتظامات مکمل ہوجانے کے بعد ہم لوگ ۹ ستمبر کی شام کو کشمیر میل سے پٹھانکوٹ کے لیے روانہ ہوگئے۔ دہلی اور پٹھانکوٹ کے راستے میں پانی پت، کرنال، انبالہ، لدھیانہ اور جالندھر خاص شہر پڑے۔

ساری رات سفر میں گذری اور ہم ۱۰ ستمبر کو ساڑھے گیارہ بجے پٹھانکوٹ پہنچے۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوکر ڈھائی بجے پٹھانکوٹ سے سرینگر کے لیے روانہ ہوئے۔ اب گویا ہمارا اصلی سفر شروع ہوگیا تھا۔ جو پٹھانکوٹ سے سرینگر تک بس کے ذریعہ تھا۔ ہم لوگ کافی دیر سے روانہ ہوئے تھے اس لیے جموں پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ رات جموں میں ہی گذارنی پڑی۔

جموں ریاست کشمیر کا ایک خاص شہر ہے یہ سردیوں سردیوں ریاست کا دارالخلافہ بھی ہوجاتا ہے۔ اس شہر کی کل آبادی ۱۰۳۰۰۰ ایک لاکھ تین ہزار ہے جموں کے علاقہ کے لوگوں کی مادری کی زبان ڈوگری ہے۔ خاص شہر میں زیادہ تر ہندو مذہب کے ماننے والے رہتے ہیں لیکن گاؤں میں زیادہ تر مسلمان گوجر رہتے ہیں جن کا خاص پیشہ گلہ بانی ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کی خاص غذا گیہوں اور چاول ہے۔

جموں شہر کے ٹورسٹ آفس میں رات بھر قیام کے بعد یکم اکتوبر کو صبح ساڑھے پانچ بجے ہم لوگ سرینگر کے لیے روانہ ہوگئے۔ کچھ دور پہنچنے کے بعد ہم شوالک کے پہاڑی سلسلے میں گھر گئے۔ پھر بھی ادھم پور تک ہمارا سفر کافی خوش گوار رہا۔

لیکن جب ہماری بس ادھم پور سے آگے کی طرف بڑھی تو راستہ خطرناک سے خطرناک ہوتا گیا۔ ۳ گھنٹے کی مسافت کے بعد ساڑھے آٹھ بجے ہماری بس چنینی پہنچی۔

جموں سے ہم لوگ کافی سویرے روانہ ہوتے تھے اور وہاں ناشتہ بھی نہ کرسکے تھے۔ اس لیے مسافروں نے چنینی پر ناشتہ کیا۔ ناشتہ سے فارغ ہوکر بس دوبارہ روانہ ہوئی اور اب ہماری بس سفر کے سب سے اونچے مقام پٹنی ٹاپ کی طرف جارہی تھی۔

پٹنی ٹاپ سطح سمندر سے ۰۰۰ ۸ فٹ سے بھی زیادہ اونچائی پر ہے۔ وہاں سے بس پھر آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی اور تین گھنٹے کے مستقل اتار چڑھاؤ کے بعد ساڑھے گیارہ بجے بٹوت پہنچی۔ بٹوت جموں اور سرینگر کے درمیان ایک چھوٹا سا شہر ہے یہ سطح سمندر سے ۵۱۱۶ فٹ کی بلندی پر ہے بٹوت سے ہماری بس دریائے چناب کے گارج کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگی۔

ہمارا اب تک کا سفر ویسے تو خطرناک تھا لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ آگے کا سفر اس سے زیادہ خطرناک ہے تو ہم لوگوں میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ بہرحال یہ سوچ کر دل کو تسلی دیتے رہے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے
کچھ دور چلنے کے بعد ہماری بس خونی نالے کے ساتھ ساتھ رینگنے لگی۔ خونی نالہ دریائے چناب کا معاون ہے۔ یہ دریائے چناب سے بھی زیادہ بھیانک ہے سڑک سے ۵۰۰ فٹ سے بھی زیادہ گہرائی میں بہتا ہے۔

ایک گھنٹے کے سب سے زیادہ خطرناک سفر کے بعد جب رام بن آیا تو سب نے شکر ادا کیا۔ رام بن سے بس رام سی ہوتی ہوئی بانیہال پہنچی۔

اب دوپہر ہوگئی تھی اس لیے سب نے طے کیا کہ کھانا کھا کر ہی آگے بڑھا جائے۔ کھانے سے فارغ ہوکر بس دوبارہ سرینگر کی طرف روانہ ہوئی اب وہ پھر اونچائی کی طرف جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد بس جواہر سرنگ میں داخل ہوئی ——
یہ سطح سمندر سے ۵۵۰۰ فٹ کی اونچائی پر ہے۔ اور دو میل لمبی ہے۔ ہندوستان کی یہ سب سے لمبی سرنگ ہے۔ اس کو ہندوستانی انجینیروں نے جرمن انجینیروں کی مدد سے تیار کیا تھا۔ اس سرنگ کے بن جانے کے بعد سے ۲۲ میل کا سفر صرف دو میل کا رہ گیا ہے۔ اس سرنگ میں ہماری بس سات منٹ تک چلتی رہی۔

سرنگ کو پار کرنے کے بعد ہم کشمیر کی خوب صورت وادی میں داخل ہوگئے۔ گویا پل صراط سے گذر کر جنت میں قدم رکھا —
دوران سفر یہ طے ہوچکا تھا کہ ہم ویری ناگ بھی جائیں گے۔ اس لیے بس سرینگر کے بجائے ویری ناگ کی طرف چل پڑی۔ ویری ناگ میں مغل بادشاہوں کے بنائے ہوئے چشمے اور باغات ہیں۔ یہ سطح سمندر سے ۶۱۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

ویری ناگ کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کے بعد بس دوبارہ روانہ ہوئی اور ہم قاضی کنڈ پہنچے۔ وہاں سحر جائے پینے کے بعد پھر روانہ ہوئے۔

اب تک کے سفر میں ہم لوگوں نے پہاڑی علاقہ میں خوب صورت چشمے، مخروطی جنگل اور حسین وادیاں دیکھی تھیں۔ وادی کشمیر میں داخل ہونے کے بعد یہ لطف تو جاتا رہا لیکن پرسکون سفر شروع ہوگیا۔

سڑک کے دونوں طرف اب ہم اونچے اونچے پہاڑوں اور اور گہری کھائیوں کی جگہ سیب، انار، اخروٹ اور آڑو کے باغ دیکھ رہے تھے۔ پام پور کے قریب زعفران کے کھیت بھی نظر آئے
پام پور سے سرینگر تک سڑک کے دونوں طرف چنار کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ ان کو دیکھنے سے ہمیں کشمیر کی حقیقی خوب صورتی کا اندازہ ہوا۔

تقریباً بارہ گھنٹے تک سفر کرنے کے بعد شام کو چھ بجے ہم سرینگر پہنچے۔ سرینگر میں ہمارے ٹھہرنے کا پہلے سے انتظام محترم استاذ جناب مونس رضا صاحب پرنسپل انجینیرنگ کالج نے کر دیا تھا۔ اس لیے ہم بس سے اتر کر سیدھے انجینیرنگ کالج، نسیم باغ چلے گئے۔
نسیم باغ شہنشاہ اکبر کی یاد دلاتا ہے۔ یہ اس نے کشمیر کو فتح کرنے کے بعد ۱۵۸۶ء عیسوی میں لگایا تھا۔ اُس وقت اس میں بارہ سَو چنار کے درخت تھے اُن میں سے اب بھی کافی موجود ہیں۔

خاص سرینگر شہر میں بھی کافی چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں اس لیے ہم نے دوسرے روز ڈل جھیل میں شکارے سے گھومنے کا پروگرام بنایا۔ اچھا آیئے قدرتی مناظر کے بارے میں لکھنے سے پہلے سرینگر کے بارے میں بھی کچھ بتائیں۔

سرینگر ریاست جموں کشمیر کا دارالخلافہ ہے اس کی کل آبادی ۲۹۵۰۰۰ دو لاکھ پچانویں ہزار ہے۔ یہ وادی کے بالکل وسط میں دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ اس شہر کو یورپ کے رہنے والے وینس کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ سرینگر کی سطح سمندر سے اونچائی ۵۲۱۴ فٹ ہے۔

شہر کے آس پاس لاتعداد سیب، اخروٹ، انار اور آڑو کے باغ ہیں۔ یہاں کے باشندے چاول اور سبزیوں کی کاشت کرتے ہیں۔ کافی لوگوں کی زندگی کا دار و مدار ڈل جھیل پر بھی ہے۔

سیاحی کے نقطۂ نظر سے یہ شہر بہت اہم ہے۔ جتنے بھی سیاح آتے ہیں اپنی رہائش کا انتظام اسی شہر میں کرتے ہیں۔ باہر سے آنے والوں کے ٹھہرنے کے لیے بڑے بڑے ہوٹل ہیں اور ڈل میں ہاؤس بوٹس بھی ملتی ہیں۔ یہ ایک مکان نما کشتی ہوتی ہے

کے بعد بنائے جاتے ہیں۔ جب کھیت تیار ہو جاتا ہے تو اس پر سبزیوں کی کاشت کی جاتی ہے۔ ان کھیتوں میں یہاں کے باشندے جھیل کی کیچڑ اور گھاس وغیرہ بطور کھاد استعمال کرتے ہیں۔

ڈل جھیل میں کافی سیاح شکارے کے ذریعہ سیر و تفریح کرتے ہیں۔ اس لیے کچھ لوگ کشتیوں میں پھلوں وغیرہ کی دوکانیں بھی لیے پھرتے ہیں۔ ہم نے بھی اس قسم کی کئی دوکانیں دیکھیں جن پر سیب وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔

اس کے اندر کئی کمرے ہوتے ہیں ان میں کھانے وغیرہ اور دوسری ضروریات کا بھی انتظام ہوتا ہے ان تمام چیزوں کے علاوہ شہر میں کئی بڑے بڑے مندر، خوب صورت مسجدیں اور مغل بادشاہوں کی یاد دلانے والے حسین باغ بھی ہیں۔ سرینگر شہر میں سب سے زیادہ دیکھنے کے قابل چیز ڈل جھیل اور اس کے کنارے باغات ہیں۔ اس لیے ہم نے اگلے روز کے لیے طے کیا کہ دن بھر شکارے کے ذریعے جھیل کی سیر کریں گے۔

دوسرے روز ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم لوگ نسیم باغ کے سامنے رنگین جھیل کے کنارے آ گئے۔ وہاں دو شکارے ہمارا پہلے سے انتظار کر رہے تھے۔

نہرو پارک جاتے ہوئے ہم نے تیرتے ہوئے کھیت بھی دیکھے۔ اس قسم کے کھیت جھیل میں تختے جما کر اس پر مٹی ڈالنے

یہ سب دیکھتے ہوئے ہم لوگ "جواہر پارک" پہنچے۔ تھوڑی دیر وہاں آرام کیا اور چشمۂ شاہی کی طرف چل پڑے۔ شاہی چشمہ ڈل سے تقریباً ایک میل دور پہاڑ کی ڈھال پر بنایا گیا ہے۔ اس کا پانی ہاضمہ کے لیے بہت اچھا بتایا جاتا ہے۔ یہاں ایک خوب صورت باغ ہے۔ اسے علی مردان خاں نے (جو مغل گورنر تھا) ۱۶۳۲ء میں بنوایا تھا۔ اس باغ سے ڈل جھیل کا نظارہ کافی اچھا لگتا ہے۔

شاہی چشمہ سے ہم لوگ نشاط باغ گئے۔ نشاط باغ کو ۱۶۳۳ء میں نورجہاں کے بھائی آصف خاں نے بنوایا تھا۔ یہ باغ بہت خوب صورت ہے۔ اس میں جگہ جگہ پانی کے فوارے ہیں۔ چنار کے خوب صورت درخت ہیں۔ چائے اور کھانے کے لیے ایک اچھا ریسٹورنٹ بھی ہے۔ چشمہ شاہی کی طرح نشاط باغ سے بھی ڈل کا نظارہ بہت اچھا لگتا ہے۔

نشاط باغ سے ہم لوگ شالامار باغ گئے اور باغوں کی طرح یہ بھی ڈل کے کنارے پر ہے ۔ یہ خوب صورت باغ ۱۶۱۶ء میں خود جہانگیر نے لگوایا تھا ۔ پہاڑ کے ڈھالوں کو کاٹ کر سیڑھیوں میں یہ باغ لگوایا گیا ہے۔ ویسے تو یہ بہت حسین ہے لیکن اگر حکومت چشمۂ شاہی اور نشاط باغ کی طرح اس پر بھی توجہ دے تو اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگ جائیں ۔

دوسرے روز ہمارا کوئی خاص پروگرام نہیں تھا اس لیے بہتر یہی سمجھا گیا کہ سرینگر کے شہر کو دیکھا جائے اور وہاں کے باشندوں کے رہن سہن کا جائزہ لیا جائے ۔

کشمیر کے لوگ بہت خوب صورت ہوتے ہیں ۔ ان کا رنگ کافی اجلا ہوتا ہے ۔ لباس بہت ڈھیلا ڈھالا پہنتے ہیں ۔ مرد زیادہ تر ٹوپیاں اوڑھتے ہیں ۔ عورتیں بھی اپنے سروں پر کوئی رنگین کپڑا رومال کے طور پر باندھے رہتی ہیں ۔ مرد، عورت دونوں جو ڈھیلا کرتہ پہنے رہتے ہیں اسے "فران" کہتے ہیں ۔ جاڑوں میں گرم فران استعمال کرتے ہیں ۔ جب سردی بڑھ جاتی ہے تو فران میں کانگڑی رکھتے ہیں ۔ کانگڑی ایک مٹی کا برتن ہوتا ہے ۔ جسے ٹوکری میں باندھ دیا جاتا ہے ۔ اس ٹوکری میں لکڑی کے کوئلے کی آگ ہوتی ہے ۔

یہاں کے رہنے والے چاول کافی مقدار میں بوتے ہیں ۔ مکئی اور گیہوں بھی اگاتے ہیں ۔ لیکن سال میں عموماً ایک ہی فصل ہوتی ہے ۔ اس لیے کہ سردی کا موسم زیادہ دنوں تک رہتا ہے ۔ چاول مکئی اور گیہوں کے علاوہ سبزیوں کی کاشت بھی کی جاتی ہے ۔ سبزیوں میں ٹماٹر، گوبھی، شلجم، مولی، پیاز، آلو، بینگن، پالک اور کرم کا ساگ خاص ہیں ۔ لیکن یہ تمام کاشت گرمیوں کے موسم میں ہوتی ہے ۔ سردیوں میں کوئی سبزی اگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اس لیے یہاں کے باشندے گرمیوں میں سبزیاں سکھا کر رکھ لیتے ہیں ۔ اور انھیں جاڑوں میں استعمال کرتے ہیں یہ لوگ چائے کے بہت عادی ہیں ۔ ایک مرتبہ کی بنائی ہوئی چائے کو کافی دیر تک گرم رکھنے کے لیے ایک خاص برتن رکھتے ہیں ۔ جسے سماور کہتے ہیں ۔

سَمَاوَر

ان کے مکان جھونپڑی نما ہوتے ہیں ۔ زیادہ تر لکڑی کے ہوتے ہیں ۔ تمام مکانوں کی چھتیں ڈھلواں ہوتی ہیں ۔ ان کی وجہ یہ ہے کہ سردیوں میں پڑنے والی برف ان پر جمع نہیں ہو پاتی اور پھسل کر نیچے جاتی ہے ۔ اس قسم کے مکانات کو مخروطی بھی کہہ سکتے ہیں ۔

سردی کے موسم میں بہت کم لوگ گھروں سے باہر نکلتے ہیں ۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ اس موسم میں بے کار نہیں بیٹھتے ۔ دست کاری کا کام کرتے ہیں ۔ مثلاً شال، کمبل، قالین اور دوسرے کپڑے بنانا اور اخروٹ کی لکڑی پر نقش کاری وغیرہ ۔

نومبر سے مارچ تک یہ لوگ یہی کام کرتے ہیں ۔ گرمیوں میں سیاح آتے ہیں تو اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو ان کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اس کے باوجود کشمیری عوام زیادہ تر غریب ہیں ۔ البتہ سرینگر شہر میں رہنے والے کافی حد تک اچھی حالت میں ہیں ۔

ہم لوگ سرینگر کے علاوہ پہلگام، گلمرگ، سونامرگ اور وُلر جھیل بھی گئے ۔ پہلگام سرینگر سے ۶۰ میل جنوب مشرق میں واقع ہے ۔ پہلگام جاتے وقت راستے میں ہم نے اونتی سوامی کا

ندر انت ناگ، کوکرناگ اور اچھابل میں مغل بادشاہوں کے بنائے ہوئے باغ اور چشمے دیکھے۔

انت ناگ کو اسلام آباد بھی کہتے ہیں۔ یہاں کئی چشمے ہیں جن میں گندھک کا چشمہ بھی شامل ہے۔ گندھک کی وجہ سے پانی گرم ہوتا ہے اس لیے سردیوں میں بھی اس میں نہاتے ہیں۔

کوکرناگ میں بھی ہم نے ایک خوب صورت چشمہ دیکھا۔ س کا پانی بہت زیادہ ہاضم ہے اور چشمہ شاہی سے بھی عمدہ سمجھا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ پہلگام کے راستہ میں ہم نے اچھابل بھی دیکھا چھابل میں بھی کئی خوب صورت چشمے ہیں۔ یہاں پر باغ بھی ہیں۔ یہ پہلگام کے راستے میں سب سے خوب صورت جگہ ہے

پہلگام کے قریب ہی ایک گاؤں مٹن بھی پڑا۔ اور جگہوں کی طرح اس میں بھی ایک خوب صورت چشمہ ہے۔ یہ ہندوؤں کا تیرتھ ستھان ہے۔ جہاں پر ہر سال دُور دُور سے یاتری آتے ہیں۔

ان تمام جگہوں کو دیکھنے کے بعد جب ہم لوگ پہلگام پہنچے تو وہاں بہت زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ ہم وہاں پر کچھ زیادہ تفریح نہ کر سکے۔ پھر بھی وہ ایک خوب صورت جگہ ہے۔ مئی، جون یں غیر ممالک کے لوگ کافی تعداد میں یہاں آتے ہیں۔ یہاں پر رہائش کا کافی اچھا انتظام ہے۔ ٹورسٹ ہوٹل کے علاوہ اور بھی کئی ہوٹل ں جہاں پر ٹھہرنے کے لیے کمرے ملتے ہیں۔

کچھ اونچائی پر چندن واڑی اور شکار گاہیں ہیں۔ جہاں سیاح کافی تعداد میں جاتے ہیں اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چندن واڑی سے ہی امر ناتھ کی گپھاؤں کے لیے راستہ جاتا ہے۔ یہ گپھائیں پہلگام سے ۲۰ میل کے فاصلے پر ہیں۔

گلمرگ سرینگر کے مغرب ـــــ میں ۲۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ٹن مرگ تک بس جاتی ہے۔ یہاں سے گلمرگ تک جانے کے لیے گھوڑوں کا انتظام ہے۔ ٹن مرگ سے گلمرگ تک کا راستہ کافی ڈھلواں ہے۔ تین میل کی سخت چڑھائی کے بعد ٹن مرگ سے ہم لوگ گلمرگ پہنچے۔

گلمرگ سطح سمندر سے تقریباً ۹۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے یہ بہت خوب صورت مقام ہے۔ بہت اچھے ہوٹل ہیں۔ یہاں پر فلم انڈسٹری والے بھی اکثر شوٹنگ کے لیے آتے رہتے ہیں۔

گلمرگ سے ہم لوگ گھوڑوں پر کھلن مرگ بھی گئے جو گلمرگ سے تین میل کے فاصلے پر تقریباً گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ گلمرگ سے کھلن مرگ تک کا راستہ کافی دشوار ہے۔ یہ جگہ کافی بلندی پر ہے۔ لیکن یہاں پر سیاحوں کی آسانی کے لیے ٹھہرنے کا بھی انتظام ہے جہاں چائے کافی وغیرہ ملتی ہے۔ کھلن مرگ سے تھوڑے ہی فاصلے سے گلیشیر شروع ہو جاتے ہیں۔ جہاں پر سال بھر برف جمی رہتی ہے۔ ہمارے سفر سے ایک دن پہلے بھی وہاں برف باری ہوئی تھی۔ ہم لوگ برف پر کافی دیر تک کھیلتے رہے۔

پہلگام اور گلمرگ کے علاوہ ہم سونا مرگ اور وُلر جھیل بھی گئے تھے۔ سونا مرگ سرینگر سے ۵۳ میل کے فاصلے پر شمال مشرق میں واقع ہے۔ یہ سطح سمندر سے تقریباً ۹۰۰۰ ہزار فٹ کی اونچائی پر ہے۔ یہ ایک ڈھکی ہوئی وادی ہے اس لیے یہاں پر گرمیوں میں بھی کافی ٹھنڈک رہتی ہے۔ یہاں سے گلیشیر صرف تین میل کے فاصلے پر ملتا ہے۔ گلیشیر تک پہنچنے کی چڑھائی بھی مشکل نہیں ہے۔ اس لیے بغیر گھوڑوں کی مدد کے ہم لوگ گلیشیر پر گئے اور بہت سے فوٹو لیے۔

وُلر جھیل کشمیر کی خوب صورت جھیلوں میں سے ایک ہے۔ کافی تعداد میں لوگ یہاں مچھلی کا شکار کھیلنے اور مرغابیاں پکڑنے جاتے ہیں۔ اس کا شمار ہندوستان کی بڑی جھیلوں میں ہوتا ہے۔ بابا شکرالدین کے مزار کے قریب سے یہ بہت خوب صورت معلوم ہوتی ہے دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے۔ دھیرے دھیرے اب اس جھیل کی وسعت کم ہوتی جا رہی ہے۔ سوکھے ہوئے حصے پر

باقی ص۱۰۶ پر

جناب سعادت صدیقی

دو روسی لوک کہانیاں

خیرات

میں سڑک پر گھوم رہا تھا۔ ایک بوڑھا سا، کمزور سا بھکاری میرے پاس آیا۔ آنکھیں لال، سوجی ہوئی اور آنسو بھری۔ ہونٹ نیلے، کپڑے گندے اور پھٹے ہوئے ـــــ مفلسی اور بھوک نے اس کا بڑا حال کر رکھا تھا۔

اس نے اپنا سوجا ہوا گندا ہاتھ میرے سامنے پھیلایا۔ درد بھری آواز میں اس نے مجھ سے کچھ بھیک چاہی۔

میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔۔ روپے پیسے کچھ نہیں تھے۔ گھڑی بھی نہیں، رومال بھی نہیں۔ میں گھر سے کچھ بھی لے کر نہیں چلا تھا۔ اب بھی وہ بھکاری ہاتھ پھیلائے انتظار کر رہا تھا اور اس کا پھیلا ہوا ہاتھ کمزوری کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔

میں گھبرا گیا۔ شرمندہ ہوا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور بولا: "بھائی خفا نہ ہونا۔ اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

پہلے تو وہ بھکاری لال لال آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا۔ پھر اس کے نیلے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے میری انگلیوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔

"اس سے کیا ہوا، بھائی! جو کچھ تم نے دیا ہے اس کے لیے بھی تمھارا شکرگزار ہوں۔ بھائی یہ بھی تو ایک خیرات ہی ہے۔"

پختہ ثبوت

فوج داری عدالت میں ایک خون کا مقدمہ چل رہا تھا۔ عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ آج گواہی کا دن تھا۔

جج نے عدالت کے کمرے میں قدم رکھا۔ لوگوں میں کانا پھوسی شروع ہو گئی اور پھر قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی۔

جج کرسی پر بیٹھ گیا، آنکھوں پر عینک لگائی، کوٹ کا کالر ٹھیک کیا اور پھر دھیرے سے کھنکار کر میز کے ایک کونے میں رکھی ہوئی فائل اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لی۔

عدالت میں پھر پھسپھساہٹ شروع ہوئی، پر جج کے نظر اٹھاتے ہی سناٹا چھا گیا۔ "گواہ پیش کیا جائے۔" جج نے حکم دیا۔

ایک کونے سے ایک دبلا پتلا آدمی کٹہرے کی طرف بڑھا۔ کٹہرے میں پہنچ کر جج کی تعظیم میں سر جھکایا اور ایک نظر پوری عدالت پر ڈال کر ملزم کی طرف دیکھا جو ضمانت پر چھوٹا ہوا تھا۔ اور اس مقدمہ کی طرف سے لاپرواہ نظر آ

گواہ کے سامنے بائبل رکھی گئی ۔ "تم جو کچھ بھی کہوگے، خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ سچ کہوگے ۔"

گواہ نے پوری عقیدت سے بائبل پر ہاتھ رکھا اور کہا ۔ "میں جو کچھ بھی کہوں گا خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ سچ ہی کہوں گا ۔"

اب مقدمہ باقاعدہ شروع ہوا۔ مخالف وکیل اپنی جگہ سے اٹھا، اور پھر گواہ کی طرف تیکھی نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "تمھارا نام ؟"

"مائیکل"

"مقتول کو اور اس شخص کو جس پر خون کا الزام لگایا گیا ہے، تم اچھی طرح جانتے ہو ؟" وکیل نے پوچھا۔

"جی ہاں" مائیکل نے جواب دیا۔

"کب سے ؟"

"مقتول میرا مالک تھا۔ میں پانچ سال سے ان کا سکریٹری تھا اور اس خونی کو ..."

"دیکھو مائیکل" مخالف وکیل نے 'خونی' لفظ پر اعتراض کیا "جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے اسے مجرم نہیں کہا جاسکتا۔ تم انھیں مسٹر جیمس کے نام سے پکار سکتے ہو۔ ہاں تم مسٹر جیمس کو کب سے جانتے ہو ؟"

"میں نے انھیں پہلی بار قتل کے دن ہی دیکھا تھا۔"

"اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا ؟"

"جی نہیں ۔"

"خون ہونے سے کتنے پہلے تم نے انھیں دیکھا تھا؟"

"میں نے انھیں خون کر کے بھاگتے دیکھا تھا۔"

"جب یہ بھاگ رہے تھے، تب ان کا چہرہ تمھاری طرف تھا ؟"

"جی، نہیں ۔"

"مطلب یہ کہ ان کی پیٹھ تمھاری طرف تھی" ؟

"جی ہاں ۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ کتنے منٹ تک تم نے ان کا چہرہ دیکھا ۔"

گواہ اکتا کر بولا ۔ "جی مجھے اس وقت گھڑی دیکھنے کا خیال نہیں آیا ۔"

"اوہ! ٹھیک ہے! تم نے انھیں بھاگتے ہوئے دیکھا، اور جب یہ بھاگ رہے تھے، تب ان کی پیٹھ تمھاری طرف تھی ؟"

"جی ہاں! یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں ۔"

تو پھر صرف ایک لمحہ کے دیکھے ہوئے چہرے کو تم اچھی طرح کیسے پہچان سکتے ہو ؟ تمھارے پہچاننے میں غلطی ہوسکتی ہے۔"

"نہیں!" گواہ نے اعتماد سے کہا۔ "جب یہ آدمی دوڑ کر سیڑھیاں اتر رہا تھا تب یہ لڑھک گیا تھا اور تب میں نے اسے اچھی طرح دیکھا ۔"

"تم نے تب ہی انھیں پکڑا کیوں نہیں لیا ؟"

"میں ضرور پکڑ لیتا۔ پر یہ بہت ہی پھرتیلا نکلا۔ جب تک میں اس تک پہنچ پاتا، اس سے پہلے ہی یہ اٹھا اور بھاگ نکلا ۔"

"نوٹ ڈاؤن می لارڈ۔" مخالف وکیل نے جج کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر گواہ کی طرف گھوم کر پوچھا۔ "کیا تمھیں پہلے سے مالک کے قتل ہو جانے کا اندیشہ تھا ؟"

"جی نہیں!"

"کیا تمھارے مالک کو شک تھا ؟"

"انھوں نے اس سلسلہ میں مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا ۔"

"تو پھر تم ایک دم وہاں کیسے پہنچ گئے ؟"

"میں برابر کے کمرے میں تھا۔ ریوالور کی آواز سن کر باہر نکلا تھا ۔"

"تو تم ریوالور کی آواز سن کر باہر نکلے تھے۔ تم نے مسٹر جیمس کو ریوالور چلاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا؟"

"نہیں!"

"اور نہ مسٹر جیمس کے ہاتھ میں ریوالور ہی تھا؟"

"جی ہاں!"

"بس!" وکیل نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"می لارڈ۔ اس گواہ نے مسٹر جیمس کے ہاتھ میں نہ تو ریوالور دیکھا نہ مقتول پر ریوالور چلاتے دیکھا۔ مطلب یہ کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ بس دھماکہ سنا۔ یہ کوئی پختہ ثبوت نہیں ہے۔"

گواہ چپ چاپ کٹہرے سے باہر نکلا پر وکیل اور جج کی طرف سے پیٹھ گھماتے ہی اچانک زور سے ہنس پڑا۔

جج اور وکیل دونوں اس کی اس بے ادبی پر غصہ ہو اٹھے۔ گواہ کو واپس بلا کر جج نے کہا "مسٹر اس طرح ہنس کر تم نے عدالت کی ہتک کی ہے۔"

"صاحب آپ نے مجھے ہنستے ہوئے دیکھا؟"

"نہیں! میں نے تمہاری ہنسی کی آواز سنی تھی۔" جج نے کہا۔

"صرف آواز ہی سنی ہے نا، صاحب! پر یہ تو کوئی پختہ ثبوت نہیں ہے!" گواہ نے جواب دیا اور مسکرانے لگا۔

عدالت دوسرے دن کے لیے برخاست ہو گئی۔

• انگریزی سے آزاد ترجمہ)

بقیہ کشمیر میں چند دن صت۱

اب چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ ڈلر جھیل جاتے وقت ہم لوگوں نے مانس بل جھیل بھی دیکھی تھی۔ یہ بھی کافی بڑی جھیل ہے۔

ہم لوگ لداخ نہیں گئے۔ لیکن اس کا بھی تھوڑا سا ذکر کرنا ضروری ہے۔ یہ ریاست جموں وکشمیر کا شمال مشرقی حصہ ہے تقریباً سارے کا سارا پٹھار ہے۔ سطح سمندر سے کافی اونچائی پر ہے۔ پہلے یہاں تک پہنچنے کے لیے گھوڑوں پر سفر کرتے تھے۔ تین چار ہفتے لگ جاتے تھے۔ لیکن اب ایک سڑک بن گئی ہے۔ جو خصوصاً فوج کے آنے جانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

لداخ میں سب سے زیادہ سردی پڑتی ہے۔ یہاں گرمیوں میں بھی گرم کپڑے کی ضرورت پڑتی ہے۔ زیادہ بلندی پر واقع ہونے کی وجہ اور سخت سردی کی وجہ سے آبادی بہت کم ہے۔ اس علاقے میں زیادہ تر بدھ مذہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ یہاں کافی تعداد میں بھیڑیں پالی جاتی ہیں جن کا اون بہت ملائم ہوتا ہے۔ یہ ہی یہاں کے لوگوں کا خاص پیشہ ہے۔ لداخ ضلع کا صدر مقام لیہ ہے۔

جی چاہتا تھا کہ ساری عمر اس حسین وادی کشمیر میں ہی گذار دی جائے مگر اب موسمِ خزاں کی تعطیلات ختم ہو چکی تھیں۔ طلبار کی پڑھائی کا نقصان ہو رہا تھا۔ لہٰذا ۱۱ اکتوبر کی صبح ۶½ دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور پٹھانکوٹ سے ہوتے ہوئے ۱۲ اکتوبر کی شام کو واپس جامعہ پہنچ گئے۔

محترمہ فوزانہ انصاری

امّی مہمان گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں صرف ہم دونوں تھے اور بھائی جان تھے۔ ہم اس نادر موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتے! دونوں امرود کے پیڑ پر چڑھے ہوئے پکے اور گدر امرود توڑ توڑ کر کھا رہے تھے بھائی جان اپنے کسی دوست سے باتیں کر رہے تھے اس لیے ان کا بھی ڈر نہیں تھا۔ کم سے کم کچھ دیر تو نہیں تھا۔ اچانک میری نظر ایک مکڑی پر پڑی جو امرود کے پیڑ کی دو نازک ڈالیوں کے درمیان بڑا ہی خوب صورت اور نازک جالا تن رہی تھی۔

"نغمی۔ نغمی ذرا دیکھنا ۔۔۔" میں نے نغمی کو اس طرف متوجہ کیا۔

ہم دونوں امرود کھانا تو بھول گئے مکڑی کو جالا بنتے دیکھنے لگے۔ اس کا جالا کچھ کچھ سائیکل کے پہیے سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن ویسا بھدّا نہیں۔ بلکہ بڑے ہی نازک لچکیلے تاروں سے بنایا جا رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھتے ہوئے نغمی سے پوچھا۔

"نغمی بھلا یہ تار کہاں سے آرہا ہے؟" نغمی اور جھک کر غور سے دیکھنے لگی اور بولی

"پتہ نہیں ۔۔۔ بس جہاں جہاں سے مکڑی گزر رہی ہے وہاں تار نظر آرہا ہے!"

"لیکن جب یہ مکڑی زمین پر چلتی ہے تو یہ تار نظر نہیں آتا۔" میں نے نغمی کو یاد دلایا۔ "ایک بار ہم نے ایک بڑی سی مکڑی دیکھی تھی جس کے پیٹ کے ساتھ ایک سفید سی چیز چپکی ہوئی تھی اور وہ کمرے کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ہم نے پہلے تو اسے خوب دوڑایا پھر مار ڈالا۔"

"ہاں ۔۔۔ لے لو۔ مکڑی کا جالا پورا بھی ہو گیا اور وہ جالے کے بیچ میں مزے میں بیٹھی ہے۔" نغمی بولی

"اچھا تو یہ اس کا گھر ہے۔" میں نے کہا۔ کیوں نہ ہم اس مکڑی کو پال لیں۔"

"ضرور پال لو۔" نغمی جل کر بولی۔ پہلے ہی تم نے گھر کو چڑیا گھر بنا رکھا ہے۔ یاد ہے امّی نے کیا کہا تھا۔"

اور مجھے یاد آگیا کہ امّی نے کہا تھا "ایک جانور تم نے اور پالا کہ میں نے تمھارے یہ خرگوش کبوتر وغیرہ ذبح کروا کر بریانی پکوائی۔"

لیکن نغمی! ہم اس مکڑی کو پنجرے میں تھوڑی رکھیں گے۔ اسے تو بس یہیں رہنے دیں گے۔ بس سمجھ لو کہ ہم نے اسے پالا ہے۔" میں نے کہا مجھے مکڑی کا جالا خوب صورت لگ رہا تھا۔ نغمی کچھ سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔

"اچھی بات ہے پھر تم اپنی اس مکڑی کو کچھ کھلاؤ نا۔ اس کا نام کیا رکھو گی۔؟" نغمی کو جانور پالنے سے زیادہ ان کے نام رکھنے کا شوق ہے۔

"تم بتاؤ ۔۔۔!" میں نے کہا

نام . . . . . " نغمی سوچتے ہوئے بولی " ٹی کی " رکھیں گے یہ ہے بھی تو چھوٹی سی نا ۔ یہ کیا کھاتی ہے ؟ کچھ نہیں کھاتی ؟

" کھاتی کیوں نہیں ؟" میں نے کہا " کھائے گی نہیں تو زندہ کیسے رہے گی ۔ مگر ۔ ۔ ۔ " میں سر کھجانے لگی ۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ مکڑی کیا کھاتی ہے ۔

" چلو بھائی جان سے پوچھ آئیں " میں نے کہا اور ہم دونوں دوڑے دوڑے بھائی جان کے پاس پہنچے ۔

" بھائی جان ! مکڑی کیا کھاتی ہے ؟ " میں نے پوچھا

بھائی جان غرّائے ۔ " نہ سلام نہ دعا ۔ ۔ ۔ " اور اب ہمیں نظر آیا بھائی جان کے وہ چہیتے دوست کمار بھائی بھی اس کمرے میں موجود تھے ہم نے نہایت ادب سے انھیں سلام کیا وہ مسکرائے اور بولے ۔

" یہ مکڑی کے ڈنر کی فکر کیوں ہو گئی ؟ "

" بات دراصل یہ ہے کمار بھائی ہماری غزل مکڑی پال رہی ہے " نغمی جلدی سے بولی اور بھائی جان اچھل پڑے ۔

" کیا کہا ـــ مکڑی پال رہی ہے " کمار بھائی ہنس پڑے " یار یہ غزل کسی دن بڑی سائنس دان بنے گی یا پھر چڑیا گھر کی منتظم " مجھے غصہ آگیا " اللہ کرے آپ بنیں چڑیا گھر کے منتظم " میں نے جل کے کہا ۔

" میرا تو ناک میں دم رہتا ہے ۔ یہ کیا کھاتا ہے ؟ وہ کہاں رہتا ہے ؟ میری سمجھ میں نہیں آتا اس کم بخت کو جانوروں سے اتنی محبت کیوں ہے ؟" بھائی جان بولے

" اچھا بھئی سنو " مکڑی ، مچھر ، مکھی ، مکوڑے ، چیونٹیاں وغیرہ کھاتی ہے " کمار بھائی مجھے رونے پر تیار دیکھ کر جلدی سے بولے اور ہم دونوں ہنستے ہوئے لوٹ آئے ۔ اب مچھر یا مکھی کی تلاش شروع ہوئی مکھی اور مچھر تو نہیں البتہ ایک مکوڑا مل گیا ۔ اب سوال یہ تھا کہ مکڑی کو اس کے گھر سے کیسے نکالا جائے اور اسے مکوڑا کس طرح کھلایا جائے مکڑی نکالتے وقت جالا ٹوٹ جانے کا جو خطرہ تھا ۔

" بھئی مکوڑا جالے پر چھوڑ دو ۔ تمھاری کی کی " خود ہی کھالے گی " نغمی اکتا کر بولی اور میں نے مکوڑا جالے پر چھوڑ دیا ۔

مکوڑا جالے میں پھنس گیا اور رہائی کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا ۔ جیسے ہی جالے میں حرکت ہوئی مکڑی تیر کی طرح مکوڑے کی طرف جھپٹی ۔ اس کے قریب رک کر کچھ سوچا پھر اسے اپنی اگلی ٹانگوں سے چھوا جس کے ساتھ ہی مکوڑے کی حرکت بند ہو گئی ۔ پھر مکڑی نے اسے جالے میں لپٹنا شروع کر دیا ۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں جالے کی صرف ایک گٹھڑی نظر آ رہی تھی ۔

" یہ تو توشہ باندھ رہی ہے ۔ شاید توشہ باندھ کر چلی جائے " نغمی اسے دیکھتے ہوئے بولی ۔ میرا دل دھک سے ہو گیا ۔ کیا واقعی " کی کی " چلی جائے گی ۔ مگر " کی کی " جالے کی پوٹلی بنانے کے بعد پھر جا کر جالے کے بیچ میں بیٹھ گئی ۔ میں نے نغمی کی طرف دیکھا " کیا مطلب ہوا ؟ " نغمی بولی " یہ تو نہیں کھا رہی "

ہم دونوں پھر بھائی جان کے پاس پہنچے ۔

" بھائی جان ! " کی کی " تو کھا نہیں رہی ہے ۔ اس نے تو مکوڑے کو جالے کی گٹھڑی میں باندھ دیا ہے " میں نے کہا ۔

" یہ " کی کی " کون محترمہ ہیں ؟ " کمار بھائی بولے ۔

" ضرور یہ بی مکڑی کا نام ہوگا " بھائی جان نے کہا ۔

" میں نے رکھا ہے " نغمی فخر سے بولی " ہے نا پیارا نام ؟ "

" بہت پیارا ہے " کمار بھائی بولے " بھئی اسے ابھی بھوک نہ ہوگی "

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔

" یہ دونوں تمھارا دماغ اس وقت تک چاٹتی رہیں گی جب تک انھیں اطمینان نہ ہو جائے کہ اب واقعی " کی کی " کی دیکھ بھال ٹھیک طور کی جا سکتی ہے " بھائی جان صوفے پر دراز ہو کر بولے ۔

" اچھا ! " کمار بھائی مسکرائے اور ہمارا حوصلہ بڑھا اور ہم دونوں کمار بھائی کے پاس بیٹھ گئے ورنہ بھائی جان تو دوستوں کی موجودگی میں پھٹکنے بھی نہیں دیتے ۔

"مکڑی کو جب بھوک نہیں ہوتی ہے تو یہ اپنے شکار کو کاٹ کر اپنے زہر سے بے ہوش کر دیتی ہے اور پھر اس کے چاروں طرف جالا بن کر محفوظ کر دیتی ہے تاکہ بھوک کے وقت دعوت اڑائے" کمار بھائی نے کہا۔

"تمھاری طرح ندیدی نہیں ہوتی کہ ایک ہی وقت میں سب کچھ ہڑپ کر جاتے اور پھر پیٹ کے درد سے تڑپے" بھائی جان بولے اور کمار بھائی ہنسنے لگے۔

"اچھا تو وہ جو ٹانگوں سے چھونے کے بعد کوڑا خاموش ہو گیا تھا اس کی وجہ یہی تھی" نغمی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"اور کمار بھائی وہ جالے کا تار آتا کہاں سے ہے؟" میں نے پوچھا

"بھئی تم نے مکڑی کو غور سے دیکھا ہے! اس کی آٹھ جوڑ دار ٹانگیں ہوتی ہیں ان ٹانگوں میں اور دھڑ میں بے شمار سوراخ ہوتے ہیں جن میں سے ایک لعاب (تھوک) رستا رہتا ہے اور مکڑی بڑی نفاست اور کاری گری کے ساتھ۔ اس لعاب سے مختلف موٹائی کے ریشمی لچکدار تار تیار کرتی ہے جس کے ذریعہ جالا بنتی ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے یہ تار مختلف موٹائی کے ہوتے ہیں" کمار بھائی نے کہا۔

"مکڑی جالے کے درمیان کیوں بیٹھتی ہے؟" میں نے پوچھا

"جب مکڑی جالا بن لیتی ہے تو جالے کے اندر اپنے لیے ٹیلی فون کا انتظام کرتی ہے۔ ۔ ۔ ۔" کمار بھائی بولے۔

"بڑی موڈرن ہوتی ہے" بھائی جان بیچ ہی میں بولے اور کمار بھائی مسکرا دیے۔

"اتنا سا تو جالا ہوتا ہے کیا اسے نظر نہیں آتا؟" نغمی نے پوچھا۔

"یہی بات ہے" کمار بھائی نے کہا۔ "مکڑی کی آٹھ جوڑ یعنی سولہ آنکھیں ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود اس بے چاری کو اس قدر کم نظر آتا ہے کہ مشکل سے اندھیرے اور روشنی میں تمیز کر سکتی ہے۔ ۔ ۔"

"چہ چہ۔ ۔ ۔ بھئی غزل تم اپنی "ممی کی" کو ایک عینک دلا دو" بھائی جان چڑاتے ہوئے بولے۔

"کیوں غریب کے پیچھے پڑے ہو آصف؟" کمار بھائی نے مجھے اپنے قریب کر لیا۔

"ہاں تو مکڑی کی نظر کمزور ہوتی ہے" کمار بھائی نے بیچ بچاؤ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "اس لیے جب یہ پورا جالا تیار کر لیتی ہے تو پھر اپنے جالے میں لیس دار چپکنے والے مادے کے قطرے سجاتی ہے۔ جیسے ہی کوئی بھڑ یا شہد کی مکھی جالے سے گزرتی ہے وہ ان قطروں کی وجہ سے چپک کر رہ جاتی ہے ٹیلی فون کے لیے مکڑی ایک لمبا تار پورے جالے میں پھیلا دیتی ہے جس کا آخری سرا مکڑی کے پیر سے چپکا رہتا ہے۔ جونہی شکار پھنستا ہے تار ہلتے ہیں اور مکڑی کو خبر ہو جاتی ہے"

"بھڑ، مکھی وغیرہ جالا توڑ کر بھاگ نہیں جاتے کیا؟" میں نے پوچھا

"ایسا ہو سکتا ہے" کمار بھائی نے کہا۔ "اسی لیے تو خدا نے مکڑی کو ڈنک اور ساتھ ہی صبر و استقلال اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ مکڑی اندھا دھند اپنے شکار پر نہیں ٹوٹ پڑتی بلکہ سوچتی ہے کہ شکار کو صرف بے ہوش کرنا چاہیے یا مار ڈالنا چاہیے یا پھر بہتر یہی ہے کہ اسے آزاد کر دیا جائے۔ مکھی اور مچھر کو یہ صرف بے ہوش کر دیتی ہے جبکہ شہد کی مکھی کو مار ڈالنا بہتر سمجھتی ہے اور بھڑ کو آزاد کر دینے میں اپنی خیریت سمجھتی ہے"

"بھڑ سے مکڑی کیوں ڈرتی ہے؟" نغمی نے پوچھا۔

"دراصل بھڑ اور مکڑی پیدائشی دشمن ہیں اگر بھڑ کے ہاتھ مکڑی لگ جائے تو اسے ڈنک مار کر نیم بے ہوش کر دیتی ہے اور لے جا کر اپنے بچوں کو کھلاتی ہے" کمار بھائی نے کہا۔

"زندہ ہی۔ ۔ ۔؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں اور بے چاری مکڑی کچھ نہیں کر سکتی" کمار بھائی نے کہا۔

"اچھا تو مکڑی سوچ بھی سکتی ہے؟" نغمی بولی۔

"ہاں ــ!" کمار بھائی نے کہا "ایک سائنس داں ہے ۔ ہی۔ وُوڈ" کا کہنا ہے کہ اس نے جنگل میں مکڑی کا ایک جالا دیکھا جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کنکر بھی لٹک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کنکر کا مقصد نہیں آیا اور اس نے کنکر نکال کر پھینک دیا۔ دوسرے دن دیکھا تو دو کنکر لٹک رہے تھے۔ وُوڈ نے وہ بھی اتار دیے۔ تیسرے دن وہاں تین

کنکر لٹک رہے تھے۔ اب وڈونے مکڑی کو زیادہ پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسے ویسے ہی چھوڑ دیا۔ بھلا بتاؤ تو مکڑی نے جالے میں کنکر کیوں لٹکا رکھے تھے؟"

"تاکہ ہوا کے زور سے جالا ٹوٹ نہ جائے!" میں نے کہا۔

"ٹھیک" کمار بھائی مسکرائے "اور جو جانور کنکر گر جانے کی صورت میں کنکروں کی تعداد میں اضافہ کر سکتا ہے وہ یقیناً سوچ سکتا ہے"

بھائی جان سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور بولے

"یار سچ کہہ رہے ہو یا گپ ہانک رہے ہو؟"

"سچ کہہ رہا ہوں آصف۔ اور میں نے حوالہ بھی تو دیا ہے!" کمار بھائی ہنسنے لگے۔ "ہے نا حیرت انگیز —!"

کمار بھائی وہ جو بعض مکڑیوں کے پیٹ کے ساتھ ایک سفید سی چیز چپکی رہتی ہے۔ کیا ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

بھی مکڑی سال میں صرف ایک بار انڈے دیتی ہے جنکی تعداد پانچ چھ ہزار ہوتی ہے۔ انڈوں کے چاروں طرف وہ ایک مضبوط ریشمی تھیلی بنتی ہے۔ "

"جالے کی طرح ؟" میں نے کمار بھائی کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"ہاں!" کمار بھائی نے کہا "اور اس تھیلی کی بنائی میں مکڑی کے جسم کا سارا ریشم ختم ہو جاتا ہے تھیلی بنانے کے بعد وہ اسے کسی اونچی جگہ لٹکا کر خود ایک تار کے سہارے نیچے اتر کر مر جاتی ہے"

نغمی تھوڑی دیر کچھ سوچتی رہی پھر بولی "اور مکڑی کے بچے؟"

"وہ تھیلی کے اندر انڈوں سے نکلتے ہیں۔ پہلے نکلنے والے بچے بعد میں نکلنے والے بچوں کو کھا جاتے ہیں۔ اس طرح آخر میں صرف طاقتور بچے رہ جاتے ہیں جو تھیلی توڑ کر باہر نکل آتے ہیں" کمار بھائی بولے۔

"مکڑی کے بچے ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں!" کمار بھائی بولے یہ تو مکڑیوں کی گھریلو قسم ہے جو انسان کے لیے بے ضرر ہوتی ہے اور اس کی زندگی کا دار و مدار صرف جالے پر ہوتا ہے۔ دوسری قسم کی مکڑیوں میں شکاری خونخوار زہریلی مکڑیاں شامل ہیں"

"جی —؟" میں اور نغمی ایک ساتھ بول اٹھے۔

"ہاں بھئی" کمار بھائی نے کہا "اب تک مکڑیوں کی ایک لاکھ قسمیں دریافت کی گئی ہیں جنھیں دو بڑی نسلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک تو زہریلی مکڑیاں دوسری جالا بننے والی بے ضرر مکڑیاں"

"تو کیا زہریلی مکڑیاں جالا نہیں بنتیں" میں نے پوچھا

"بنتی ہیں" کمار بھائی نے جواب دیا "لیکن ان کی زندگی کا دار و مدار اس پر نہیں ہوتا۔ یہ بلوں اور پتھروں کے نیچے اور درختوں پر رہ سکتی ہے۔ اور جالے کی مدد کے بغیر طاقت اور زہر کے بل پر شکار کرتی ہے"

"یہ کیا کھاتی ہیں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"یہ —" کمار بھائی مسکرائے "مکھی سے لے کر انسان تک کا گوشت بڑے شوق سے کھاتی ہے" ہم دونوں سہم گئے۔

"لیکن خدا کا شکر ادا کرو" کمار بھائی ہنسے "یہ مکڑیاں ہندوستان میں نہیں ہوتیں۔ بلکہ اٹلی، لاطینی امریکہ اور افریقہ ان کے گڑھ ہیں"

ہم دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"بھلا یہ کتنی بڑی ہوتی ہیں؟" نغمی نے پوچھا

"نو دس انچ کے قریب!" کمار بھائی نے جواب دیا۔

"کتنے دن زندہ رہتی ہے؟" نغمی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"بیس سے تیس سال تک جبکہ گھریلو مکڑیاں ایک سے پانچ سال تک زندہ رہتی ہیں۔ یہ مکڑیاں بچھو سے بھی زیادہ زہریلی اور خطرناک ہوتی ہیں" کمار بھائی نے کہا۔

"بڑوں کی عمر لمبی ہوتی ہے" بھائی جان مسکرائے

"ہاں یہ تو ہوتا ہے" کمار بھائی بھی مسکرانے لگے "ان میں سب سے زیادہ زہریلی اور خطرناک مکڑی ٹرن ٹولا TIRNTOLA

ہے۔ جو خاص طور سے اٹلی میں پائی جاتی ہے۔"

"ذرا پھر دہرانا۔" بھائی جان بولے۔

"ٹرن ٹولا" کمار بھائی مسکرائے۔ ہم دونوں نے یہ نام ایک بار دہرایا کہ یاد رہ جائے اور دوسروں پر اپنی معلومات کا رعب گانٹھنے میں کام آئے۔

اٹلی کے علاوہ لاطینی امریکہ میں بھی ٹرن ٹولا ہوتی ہے۔ لیکن یہ کم زہریلی ہوتی ہے یہ جس انسان کو کاٹ لیتی ہے وہ دیوانہ وار اچھلنے کودنے لگتا ہے اور اگر صحیح علاج نہ کیا جائے تو مر جاتا ہے۔" کمار بھائی نے کہا۔

"اور صحیح علاج؟" بھائی جان سیدھے ہوگئے۔ ڈاکٹر جو تھے۔

"بھئی اس کا علاج بھی عجیب ہے اور تمھارے بس کی بات نہیں ہے۔" کمار بھائی ہنسے۔ "وہ لوگ اس کا علاج موسیقی کے ذریعہ کرتے ہیں۔ علاج کرنے والوں کے پاس مکمل آرکسٹرا ہوتا ہے۔ مریض کو ایک کمرے میں بند کرکے علاج کرنے والا کسی مشہور رقص یا ناچ کی دُھن بجواتا ہے اور خود مریض کی حرکات کا جائزہ لیتا ہے۔ اگر یہ دُھن کے ساتھ ہم آہنگ ہوں تو خیر ورنہ دُھن بدل جاتی ہے یہاں تک کہ مریض کی اچھل کود موسیقی کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ اب مریض پاگلوں اور وحشیوں کی طرح اچھلنے کودنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا ہے اب یہ تھک کر گر جاتا ہے اور بے ہوش ہو جاتا ہے اس کو اسی طرح سونے دیا جاتا ہے۔ دیر تک سونے کے بعد جب وہ جاگتا ہے تو تندرست ہو جاتا ہے۔ زہر پسینے کے ساتھ نکل جاتا ہے۔"

"خوب۔۔۔۔ حیرت انگیز!!!" بھائی جان پھر صوفے پر دراز ہوگئے۔ ہم دونوں کی نظریں تو کمار بھائی پر جمی ہوئی تھیں۔

"یہ مکڑی زمین پر شکار کا پیچھا کرتی ہے اور شیر کی طرح ایک ہی چھلانگ میں اسے دبوچ کر ہضم کر لیتی ہے۔" کمار بھائی پھر بولے

"کیا یہ شیر کی طرح گوشت نوچ نوچ کر کھاتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بھئی۔" کمار بھائی بولے۔ "یہ پہلے تو اپنے شکار کو زہر کا ٹیکا لگا کر ختم کر دیتی ہے اور پھر اس کے چاروں طرف جالا بن کر محفوظ کر لیتی ہے۔ پہلے تو یہ جانور کا خون پی لیتی ہے اور ساتھ ہی زخم کی جگہ زہر کے ٹیکے لگاتی جاتی ہے۔ جس کے اثر سے دوسرے دن تک گوشت گل جاتا ہے۔ اس گوشت کو مکڑی چوس لیتی ہے۔"

"یہ مکڑی یہاں تو نہیں ہوتی نا؟" نغمی آہستہ سے بولی

"نہیں بھئی۔" کمار بھائی نے کہا۔ "یہاں ویسے ہی زہریلے کیڑے مکوڑوں اور جانوروں کی کیا کمی ہے۔ اور ہاں ایک چھلانگ لگانے والی مکڑی ہوتی ہے جو چھلانگ مار کر اپنے شکار پر گرتی ہے اور ڈس کر فوراً غائب ہو جاتی ہے۔ ایک بھیڑیا مکڑی ہوتی ہے یہ سب ٹرن ٹولا کی قسمیں ہیں۔"

"کمار بھائی پھر مکڑی کے زہر سے بچنے کے انجکشن نہیں بنائے جاتے؟ جیسے سانپ کے بنائے جاتے ہیں؟" میں نے پوچھا

"کیوں نہیں۔۔۔؟ بنائے جاتے ہیں اور یہ مکڑی کے زہر ہی سے تیار ہوتے ہیں۔ مختلف مکڑیوں کے زہر کی خاصیت مختلف ہوتی ہے۔" کمار بھائی بولے۔

"اور وہ افریقہ کی مکڑیاں؟" نغمی نے پوچھا

"وہ بھی اسی طرح زہریلی ہوتی ہیں۔ ایک افریقی قبیلہ مکڑیوں کی پوجا کرتا ہے۔ اس قبیلے کے ہر گھر میں یہ مکڑیاں پلی ہوتی ہیں۔ یہ کسی کو سزا دینا چاہتے ہیں تو اس پر یہ مکڑیاں چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر یہ مکڑیاں اس شخص کو نہیں ڈستیں تو وہ بے گناہ سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔" کمار بھائی نے کہا۔

باقی صفحہ ۱۱۲ پر

سمجھ دار سوداگر

جناب ل. م شاہد

اسرائیلی لوک کہانی

یہودیوں کے ایک گاؤں میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ ایک دن وہ کچھ سامان لینے شہر گیا۔ اس کے تھیلے میں پانچ سو روپے تھے۔ جب وہ شہر پہنچا تو سوچ میں پڑ گیا۔ اس شہر میں وہ بالکل اجنبی تھا۔ اتنے بہت سے روپے ساتھ لے کر گھومنا پھرنا سمجھ داری کی بات نہیں تھی۔ اس نے سوچا اتنے روپے لے کر اگر شہر میں گھومتا پھرے گا تو لٹ جانے کا خطرہ ہے۔ بہتر ہے کہ انھیں کہیں چھپا دیا جائے۔

یہ سوچ کر وہ ایک سنسان جگہ چلا گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ بالکل مطمئن ہو گیا تو اس نے ایک گڑھا کھود کر اس میں روپیوں کا تھیلا چھپا دیا۔ اسے پتہ نہ چلا کہ ایک شخص دور اپنے مکان کی کھڑکی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

جیسے ہی سوداگر وہاں سے رخصت ہوا ویسے ہی وہ شخص آیا اور زمین کھود کر تھیلا لے گیا۔

کئی دن گذر گئے سوداگر نے بہت سی چیزیں خرید لیں اور ان کی قیمت ادا کرنے کے لیے روپے لینے آیا۔ لیکن اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہاں تو تھیلا تھا ہی نہیں۔ بے چارہ سخت پریشان ہوا۔ اب اس شہر میں وہ بالکل اجنبی تھا۔ اس کی بات پر کون یقین کرے گا۔ کون مانے گا کہ اس نے زمین میں روپے دبائے تھے؟ اس کے پاس اس کا کوئی ثبوت بھی نہ تھا۔ وہ پولیس تھانہ میں رپورٹ بھی درج نہیں کروا سکتا تھا۔

اچانک اس کی نگاہ سامنے والے مکان کی طرف اٹھ گئی اس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ ممکن ہے مکان والے نے اسے روپے چھپاتے دیکھ لیا ہو اور جب وہ چلا گیا ہو تو اس نے روپے نکال لیے ہوں۔ اسے پورا یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو ایسا ہی ہوا ہے۔

اب وہ سوچنے لگا کہ آخر یہ روپے مکان والے سے کس طرح اگلوائے جائیں۔ سوچتے سوچتے ایک خیال اس کے ذہن میں آیا وہ اس مکان والے کے پاس گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا مکان والا باہر نکلا۔ سوداگر نے اس سے کہا "جناب سنا ہے کہ آپ بہت عقلمند آدمی ہیں۔ میں اس وقت بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ اس لیے مشورہ کرنے آیا ہوں"۔

یہ سن کر مکان والا بہت خوش ہوا۔

"کہیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میں ایک تاجر ہوں اور سامان خریدنے کو شہر آیا تھا

میں اپنے ہمراہ دو تھیلے لایا تھا۔ ایک میں ۵ سو روپے تھے دوسرے میں ۸ سو روپے۔ پانچ سو روپے والا تھیلا تو میں نے زمین میں دبا دیا تھا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ یہ ۸ سو روپوں والا تھیلا کہاں رکھوں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اسی جگہ چھپا دوں جہاں ۵ سو روپے دبائے گئے ہیں یا کسی کو سونپ دوں۔"

اس مکان والے کو پورا اطمینان ہوگیا کہ تاجر اب تک نہیں جانتا کہ ۵ سو روپوں والا تھیلا جگہ سے غائب کر دیا گیا ہے۔ آٹھ سو روپے حاصل کرنے کی خواہش اس کے دل میں جاگ اٹھی۔ اس نے تاجر سے کہا۔ "بہتر ہے کہ یہ روپے بھی اسی جگہ دبا دیجیے جہاں ۵ سو روپے دبائے گئے ہیں۔ کسی کو دے دینا ٹھیک نہیں —— زمانہ بڑا خراب ہے۔ مگر ذرا اندھیرا چھا جانے کے بعد روپے اس جگہ دبائیے گا۔"

"اچھی بات ہے جیسا آپ کہتے ہیں ویسا ہی کروں گا۔" یہ کہہ کر سوداگر چلا گیا۔

مکان کے مالک نے سوچا کہ اگر تاجر نے گڑھا کھودا اور اس میں اپنا تھیلا نہ پایا تو آٹھ سو روپے والا تھیلا وہ وہاں نہیں دبائے گا۔ اس نے اندھیرا ہونے سے پہلے ۵ سو روپوں والا تھیلا پھر اسی جگہ دبا دیا۔

چالاک تاجر ایک درخت کی اوٹ سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مکان والا جب چلا گیا تو وہ ۵ سو روپوں والا تھیلا نکال کر لے گیا۔

مکڑی کا بقایا

"اس قبیلے کا کیا نام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نام بھول گیا ہوں۔" کمار بھائی نے جواب دیا۔ "یہ افریقی نام کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ یاد ہی نہیں رہتے۔"

"اس قدر زہریلی مکڑیاں بھی پالی جاتی ہیں؟" نغمی نے پوچھا

"ہاں بھئی غزال کی طرح جانوروں کے شوقین پالتے ہیں۔ لیکن مکڑیاں اپنے مالک کو کبھی نقصان نہیں پہنچاتیں۔" کمار بھائی نے کہا

"لیکن اسے تو نظر نہیں آتا۔" میں نے کچھ بے اعتباری سے کہا۔

"ہاں لیکن وہ چھو کر دوست اور دشمن میں فرق محسوس کر لیتی ہے۔ اب دوڑ کر جاؤ اور دیکھو تمھاری "کی کی" کیا کر رہی ہے۔" کمار بھائی ہماری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے۔

"بیٹھی ہوگی چپکے سے ——" نغمی اٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں —— کم از کم اس سے تم دونوں نچلا بیٹھنا سیکھ لو۔" بھائی جان نے کہا اور کمار بھائی کا قہقہہ کمرے میں گونج گیا۔
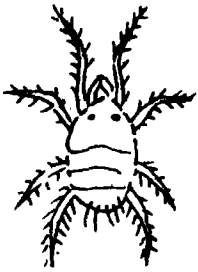
جناب خورشید احمد جاقی

طلباء سے خطاب

(۱)

علم و تہذیب کا وقار ہو تم!
درس گاہوں کی روشنی تم ہو
اک نئے دَور کی امانت ہو
لالہ و گل کی دل کشی تم ہو

(۲)

زندگی کی حسین راہوں میں
آپ اپنی مثال ہونا ہے
اور کس کو یہاں تمھارے سوا
رونقِ ماہ و سال ہونا ہے

(۳)

وقت جو عظمتوں کے خاکے میں
آرزوؤں کا رنگ بھرتا ہے
وقت اک پل جو رک نہیں سکتا
آج تم سے سوال کرتا ہے

(۴)
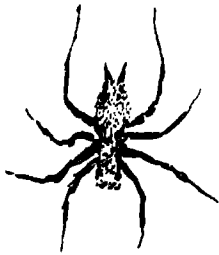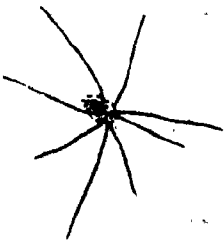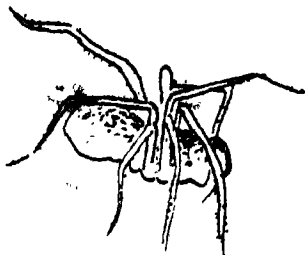
باغ کس کا ہے پھول کس کے ہیں
کون کس کو یہ بات سمجھائے
غیر ممکن کہ تیرگی میں کہیں
روشنی راستہ بھٹک جائے

(۵)

شور، ہڑتال اور ہنگامے
زہر ہیں جھومتی سحر کے لیے
زخم احساس بن نہ جائے کہیں
ایک لغزش بھی عمر بھر کے لیے

(۶)

وقت کا اور ہی تقاضہ ہے
علم کے اور ہی اشارے ہیں
صبح امید بن کے لہراؤ!
"جو یہاں ہیں وہ سب تمھارے ہیں"

بجلی کے کھیل

جناب خالد عرفان

دو مہینے پہلے دیوالی منائی گئی۔ روشنی کے اس تہوار میں کبھی صرف دیے یا چراغ جلائے جاتے تھے ان چراغوں میں تیل جلایا جاتا ـــــ لیکن آج کل عجیب بہار ہوتی ہے۔ بڑی بڑی عمارتوں پر بے شمار بجلی کے بے شمار ننھے ننھے بلب روشن کیے جاتے ہیں رنگین قطار در قطار، کتنا بھلا منظر ہوتا ہے۔

فرض کیجیے! بجلی نہ ہوتی؟ تو آپ ہی بتایئے کیا ہوتا۔ اتنی مدھیا روشنی میں کہانیوں کی مزے دار کتابیں پڑھی جاتیں نہ پیارے پیام تعلیم کا شاندار سالنامہ، نہ اپنا من پسند "بچوں کا پروگرام" ریڈیو پر سنا جا سکتا نہ سنیما گھر میں مزے دار فلم دیکھی جا سکتی، نہ گرمی کے موسم میں سردی کا سماں پیدا کیا جا سکتا، نہ سردی کے موسم میں کمروں کو گرم کیا جا سکتا۔ راتوں کو اشتہار کے یہ رنگین بورڈ چمکتے نہ بازاروں کی یہ سج دھج ہوتی۔ اسی لیے تو کسی نے بجلی کو الٰہ دین کے چراغ کا جن کہا ہے جو بٹن دباتے ہی آپ کے سب کام کر دیتا ہے۔

الٰہ دین کا چراغ رگڑتے ہی ایک جن حاضر ہو جاتا، ہاتھ جوڑے سر جھکائے۔ اور کہتا: "حکم سرکار" چلیے بات بن جاتی۔ آپ حکم دیتے اور پلک جھپکتے میں آپ کا کہا پورا ہو جاتا۔ لیکن اب آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ کون اور کیسا جن ہے جو تاروں میں چھپا بیٹھا ہے اور بٹن دباتے ہی راستہ دکھا دیتا ہے۔ پانی گرم کر دیتا ہے۔ گانے سنوا دیتا ہے۔ تصویریں دکھا دیتا ہے اور ایسا کونسا کام ہے جو وہ نہیں کر سکتا۔

ان رازوں کو جاننے کے لیے بہت ہی آسان اور سیدھے سادھے تجربے کیے جا سکتے ہیں۔

"بجلی" کے ساتھ ہی آپ کا ذہن ان تاروں کے سلسلے کی طرف چلا جاتا ہے جو آپ کے مکان، مدرسے، بازار ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ دور کیوں جایئے اپنے کمرے میں چھت سے ٹنگے بلب کی طرف دیکھیے اس سے دو تار لگے ہوئے ہیں۔ یہ دو ہی تار کیوں ہیں؟ تھوڑی دیر میں بتائے دیتا ہوں۔

لیکن آج کے تجربوں میں ہم ان تاروں سے بہنے والی بجلی سے کوئی مدد نہ لیں گے۔ بات یہ ہے کہ ان تاروں سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ ان میں بہنے والی بجلی یعنی ان میں چھپا ہوا دیو بڑا جھٹ خفا" (فوراً خفا ہونے والا) اور طاقت ور ہوتا ہے۔ ادھر آپ نے بے قاعدہ بات کی، بدسلیقگی برتی، اس کے تاروں کو چھوا۔ ادھر اس نے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ ایسا زوردار کہ آپ دور جا کر گرے، چکر سا آ گیا، بدن تھر تھرا گیا، کبھی تو یہ جھٹکا اتنا زوردار ہوتا ہے کہ آدمی مر بھی جاتا ہے ان تاروں سے دور ہی رہا جائے تو اچھا ہے۔ ان تاروں میں تو ہمیشہ بجلی چھپی ہوتی ہے۔

اس پر آپ یہ نہ کہہ دیں اگر ایسی ہی بات ہے تو یہ بٹن دبانے پر ہی بلب کیوں جلتا ہے؟ پنکھا کیوں چلتا ہے؟

بھی یہ جو دو تار ہوتے ہیں ان میں سے ایک تار میں جو برقی رو چھپی ہوتی ہے وہ دوڑنے کے لیے، بہنے کے لیے مچلتی رہتی ہے یہ منفی بجلی ہوتی ہے۔ دوسرے تار میں مثبت بجلی ہوتی ہے — جب ان دونوں تاروں کا سلسلہ ملایا جاتا ہے تب منفی بجلی دوسرے تار میں بھی دوڑ جاتی ہے اور بجلی کا چکر پورا ہو جاتا ہے اور اس چکر سے جو قوت حاصل ہوتی ہے اس سے کئی کام لیے جاتے ہیں۔ اب یہ جو سوئچ لگا ہوا ہے اسی کو دبا کر سلسلہ جوڑا جاتا ہے۔

آج میں جو تجربے بتانے جا رہا ہوں وہ آسان ہیں اور اسی قدر مزے دار بھی ہیں۔ اگر آپ نے ان کو صحیح طریقہ سے انجام دے لیا تو آپ جادوگر کہلانے لگیں۔ اس جادو کی مدد سے دوستوں کو بھی حیران کر سکتے ہیں۔ اس جادو کے ذریعہ آپ خود بھی بجلی پیدا کریں گے اور اس کی مدد سے اپنے دوست کے گال پر ہوا بھرا غبارہ چپکا سکیں گے۔ اور کاغذ کی پتلیوں کو برتن میں نچا سکیں گے۔

یوں یہ تجربے کسی دن بھی کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر فضا ٹھنڈی اور خشک ہو تو بہتر رہے گا۔ ورنہ گرم ہوا زیادہ مرطوب ہوتی ہے۔ یعنی اس میں پانی کے بخارات کافی مقدار میں ملے ہوتے ہیں۔ اور مرطوب ہوا اس بجلی کو تیزی کے ساتھ اپنے اندر کھینچ لیتی ہے۔ جو آپ تیار کرتے ہیں۔ اسی لیے کسی دن اگر آپ ان تجربوں میں ناکام ہو جائیں تو پشیمان ہونے کی ضرورت نہیں، سمجھ لیجیے، اس دن ہوا زیادہ مرطوب ہے اور موسم کی تبدیلی کا انتظار کیجیے۔

اچھا ان تجربوں کو کرنے سے پہلے میری ایک بات مان لیجیے۔ مان لیں گے نا! آپ نے ہاں تو کر دی لیکن جب بات سنیں گے تو فوراً کہہ اٹھیں گے، "نہیں، نہیں" بات بالکل سادہ ہے یہ جو بجلی ہوتی ہے وہ صرف تار میں نہیں چھپی ہوتی، اپنے ارد گرد کی ہر چیز میں پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آپ اور مجھ میں بھی۔ آپ میرا منہ کیا تکنے لگے۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ ہاں اس سے ہمیں نقصان نہیں پہنچتا یا جھٹکا نہیں لگتا۔ محض اس لیے کہ بجلی کا چکر پورا نہیں ہوتا جو جھٹکے کے لیے ضروری ہے بعض اشیا پر یا تو صرف منفی برقی قوت لگی ہوتی ہے یا صرف مثبت اور نہیں تو ان پر دونوں طرح کی قوتیں برابر مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ چکر جب ہی پورا ہوتا ہے کہ منفی ذرے مثبت تار سے بھی گذر جائیں۔

آیئے میں دعوی کو ثابت کر دوں۔ اس کے لیے صرف ایک پنسل اور کسی کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا چاہیے۔ اب یوں کیجیے کاغذ کو میز پر رکھ لیجیے اور پنسل کو کاغذ پر دائیں بائیں اس طرح پھیریئے گویا برش سے صاف کیا جا رہا ہے۔ اوہ، نہیں بھئی نوک کی طرف سے نہیں نہ ہی ربر لگے سرے سے۔ پنسل کو اوپر والے سرے سے پکڑ لیجیے اور پھر اس کو کاغذ پر اسی طرح پھیریے جس طرح شکل نمبر ۱ میں دکھایا گیا ہے۔ کچھ دیر پھیرتے رہیے پھر اس
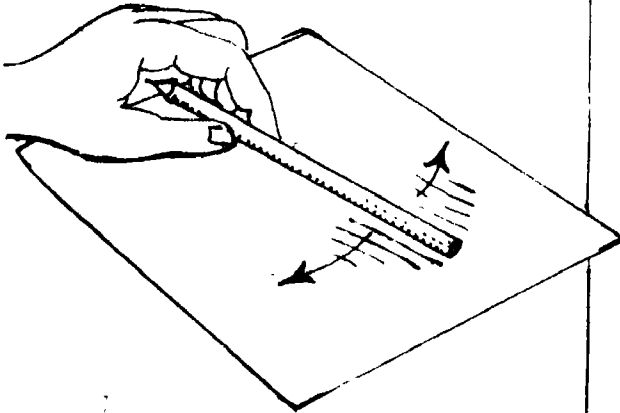
کاغذ کو دیوار سے لگائیے۔ وہ وہیں چپک کر رہ جائے گا۔ ہے نا اچنبھے کی بات۔

آخر یہ ہوا کیسے؟ کچھ نہیں آپ نے انجانے میں بجلی تیار کر دی۔ کاغذ برق زدہ ہو گیا اور اسی بجلی کی مدد سے وہ چپک گیا۔

اسی بات کو اور اچھی طرح سمجھنے کے لیے ایک غبارہ لیجیے:

اس میں ہوا بھر دیجیے اور اس کا منھ باندھ دیجیے اب ایک اونی کپڑا لے
کر اس سے غبارہ کو رگڑیے۔ اس طرح جیسے اسے پونچھا جا رہا ہے۔

لیکن جھٹکے کے ساتھ نہیں اونی کپڑے کا ٹکڑا نہ ملے تو اپنے بھیا کے
اونی سوٹ سے، اس کو گندہ کیے بغیر رگڑیے۔ کچھ دیر رگڑ چکنے کے بعد
اس غبارے کو دیوار سے لگائیے وہ وہیں چپک کر رہ جائے گا۔

ہوتا یہ ہے کہ رگڑ کے ذریعہ آپ کاغذ اور غبارہ میں بجلی
پیدا کر دیتے ہیں یہ بجلی کسی ایک طرح کی ہوتی ہے اور وہیں جمع
ہو جاتی ہے اس کو رکی ہوئی بجلی کہا جا سکتا ہے۔ ایسی بجلی دو چیزوں
کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔ خاص کر کسی اونی کپڑے یا ربر پر یا
شیشہ یا کاغذ کو ریشمی کپڑے سے رگڑنے سے بڑی آسانی سے
پیدا ہو جاتی ہے۔

چلیے۔ اب ایک اور مزیدار تجربہ کریں۔ اس تجربہ میں
پنگ پانگ کی گیند کو آپ جس طرح چاہیں گھما سکتے ہیں پہلے
ایک ربر کی کنگھی لے لیجیے پھر پنگ پانگ کی ایک گیند وہی چھوٹی

سی سفید انڈے جیسی۔ اب ایک اونی کپڑے کے ٹکڑے سے کنگھی
کو اچھی طرح رگڑیے۔ لیجیے کنگھی جادو کی بن گئی۔ اب گیند کو
میز پر رکھ دیجیے اور اس سے آگے آگے کنگھی لے جائیے۔ گیند
کنگھی کے پیچھے پیچھے دوڑتی لڑھکتی آئے گی۔
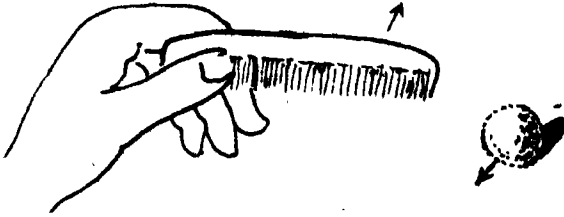
آپ نے نلکے سے پانی تو لیا ہوگا۔ اس کی دھار بھی دیکھی
ہوگی۔ وہ ہمیشہ سیدھی ہوتی ہے نا! اگر آپ نے اپنے دوست سے
کہا کہ جادو کی مدد سے آپ پانی کی دھار کو بھی ٹیڑھا کر سکتے
تو وہ یقین نہیں کریں گے اسی کنگھی کی مدد لے کر اور کچھ ہوشیاری
سے کام لے کر آپ ہر کسی کو اچنبھے میں ڈال سکتے ہیں۔ پہلے تو نلکے کو
اس قدر کھول دیجیے کہ پانی قطرہ قطرہ گرنے کی حد سے بڑھ کر ایک
بہت ہی باریک اور پتلی دھار بن کر مسلسل گرنے لگے۔ اپنی ربر کی کنگھی
کو اونی کپڑے کے ٹکڑے سے خوب رگڑ کر دھار کے قریب لے جائیے۔
اتنا قریب بھی نہیں کہ وہ دھار کو چھونے لگے۔ بس بالکل قریب
دیکھا آپ نے دھار درمیان سے ٹیڑھی ہو گئی ہے نا۔

جناب میں آپ کی سوالیہ نظروں کو بھانپ گیا ہوں۔ اس
کا سبب بھی بتائے دیتا ہوں۔ آپ تو جان ہی گئے ہیں کہ اونی کپڑے
سے کنگھی کو رگڑنے سے کنگھی میں بجلی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ منفی
ہوتی ہے گیند اور پانی کی دھار دونوں پر بجلی کے کسی قسم کے
ذرے نہیں ہوتے۔ یہ دونوں بے برقیائے ہوتے ہیں جب بھی
ایسی چیزوں کے قریب کوئی برقیائی چیز لائی جاتی ہے وہ اس کی
طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔

پانی اور گیند کی طرح ہم بھی بے برقیائے ہوتے ہیں۔ اس
کا پتہ ابھی چل جائے گا۔ ایک غبارہ لیجیے اس میں ہوا بھر کر کسی

اونی کپڑے سے خوب رگڑیے اور اپنے کسی دوست کے گال کے نزدیک لے جایئے۔ غبارہ گال سے چپک جائے گا ۔ اس کا مطلب یہی ہوا ناکہ گال پر تو کوئی بجلی تھی نہیں لیکن برقیایا ہوا غبارہ خود اس کی طرف بھاگ نکلا اور چپک کر رہ گیا۔

اب چلیے ایک قدم اور آگے بڑھیں کنگھی اور غبارے پر جو بجلی کے ذرے پائے جاتے ہیں وہ ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ ان کو جب کسی ایسی چیز کے قریب لایا جاتا ہے جس میں بجلی نہیں ہوتی تو دونوں کے درمیان کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ فرض کیجیے، دو ایسی چیزیں قریب لائی جائیں جن پر ایک ہی قسم کی بجلی ہو تو کیا ہوگا؟ اس کو جاننے کے لیے ایک آسان سا تجربہ کر لیجیے۔

تین غباروں میں ہوا بھر کر ڈور کی مدد سے علیحدہ علیحدہ لٹکا لیجیے اس طرح کہ ان کا گچھا سا بن جائے اور وہ ایک دوسرے سے لگے رہیں۔ اب ان کو باری باری کسی اونی کپڑے سے خوب رگڑ دیجیے۔ تینوں غبارے ایک دوسرے کے گرد ناچنے لگیں گے۔ خوب لطف رہے گا نا؟

بات معمولی ہے ان تینوں پر اس رگڑ سے ایک ہی قسم کی بجلی پیدا ہو گئی یعنی منفی۔ اور یہ منفی بجلی کے ذرے بڑے شریر ہوتے ہیں آپس میں کبھی مل کے نہیں بیٹھتے۔ ہمیشہ ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں۔ یہ بجلی کی دنیا کا اصول ہے کہ بجلی کے ایک ہی قسم کے ذروں کے درمیان کوئی کشش نہیں ہوتی۔ تو کیا ان ذروں کو آپس میں نہیں ملایا جا سکتا — ؟ نہیں ایسی کوئی بات نہیں، آخر انسان کی سوجھ بوجھ کے آگے بجلی کے ان حقیر ذروں کی کیا چلے گی۔ وہ ان دشمنوں کو بھی ملا کر رہے گا۔ بلکہ آپ خود بھی ملا سکتے ہیں۔

یوں کیجیے۔ اباجی سے کہہ کر کل کے اخبار کے درمیانی صفحات مانگ لیجیے۔ وہی جن کے دونوں ورق باہم ملے ہوتے ہیں۔ اپنی باجی کو جادو کا کمال دکھانے کا لالچ دے کر تھوڑی دیر کے لیے قینچی اور کوئی ریشمی کپڑا مانگ لیجیے۔ اپنے بستے سے رولر یا فٹا نکال لیجیے۔ اگر رولر نہ مل سکے تو کوئی ڈنڈا ہی لے لیجیے۔

اخبار کے دوہرے ورق کے اوپر کی جانب سے کوئی چار انچ چوڑی پٹی کاٹ لیجیے۔ اس پٹی کو میز پر پھیلا دیجیے۔ اور پھر اس پر آہستہ آہستہ ریشمی کپڑا پھیرتے رہیے۔ اس طرح کاغذ میں مثبت بجلی پیدا ہو جائے گی اور ریشمی کپڑے میں منفی۔ بجلی چھپی رہے گی۔ اب احتیاط سے کاغذ کی اس پٹی کو رولر یا ڈنڈے پر لٹکا لیجیے۔ اس طرح کہ دونوں سرے باہر کی طرف نکلے رہیں۔۔۔ اور جی ہاں، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کاغذ کے دونوں سرے قریب لگے رہتے۔ لیکن چونکہ دونوں میں مثبت بجلی دوڑ رہی ہوتی ہے وہ ایک دوسرے سے پرے ہٹے رہیں گے اور اوپر کی جانب اٹھے رہیں گے۔ اب ایک کام کیجیے آہستہ سے پٹی کے درمیان سے اپنا ہاتھ گزاریے۔ واہ بھئی غڑاپ سے دونوں سرے آپ کے ہاتھ کو ڈھانپ لیں گے۔ ہوا کیا؟ ان دونوں برقیاتے ہوئے سروں کے درمیان بے برقیایا ہوا ہاتھ داخل کیا گیا تو باہمی کشش کی وجہ سے دونوں سرے ایک ہی وقت میں آپ کے ہاتھ کی طرف کھنچے چلے آئے۔ اور آپ کا ہاتھ ڈھک گیا گویا اپنا ہاتھ دونوں کی جانب بڑھا کر آپ نے دونوں کو دوستی کے بندھن میں باندھ دیا۔ کتنا نیک کام کیا آپ نے۔!
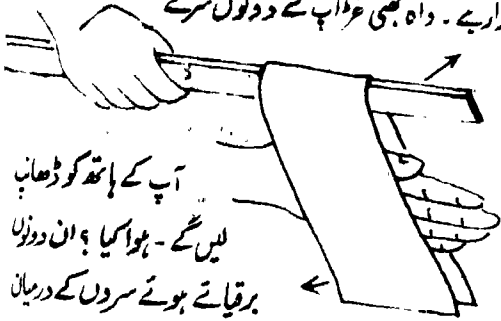
لیکن اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بجلی کی دنیا بڑی انوکھی ہوتی ہے۔ آپ نے مولانا حالیؔ کا یہ شعر تو پڑھا ہوگا:

بڑھاؤ نہ آپس میں الفت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

کچھ ایسی ہی بات یہاں بھی ہوتی ہے۔ کبھی کبھار برقی ذرے دوست بن کر اس قدر قریب ہو جاتے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے نفرت ہو جاتی ہے، بلا کی نفرت اور وہ دوستی کے رشتے کو ایک دم توڑ کر اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں۔

اس کیفیت کو دیکھنے کے لیے بھی ایک آسان سا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں بھی آپ کے پرانے ساتھی یعنی ربر کی کنگھی اور اونی کپڑا ہی کام آئیں گے۔ اس کے علاوہ ایک کارک کی ضرورت ہوگی۔ کارک کو ایک کھردری ریتی سے گھس لیجیے اور ان ذرات اور چھوٹے ٹکڑوں کو اکٹھا کر لیجیے۔ اب اس ڈھیر میں اونی کپڑے سے خوب رگڑی ہوئی کنگھی داخل کیجیے۔ اور اس کو آہستہ سے اوپر اٹھا لیجیے۔ بے شمار ذرات اور ٹکڑے کنگھی سے چپٹے رہیں گے۔ کنگھی کو اسی طرح پکڑے رہیے کچھ ہی دیر بعد یہ سارے ذرات اڑ اڑ کر کنگھی سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ جیسے وہ ایک دوسرے کے سائے سے بھی بھاگ رہے ہیں۔

آخر کیوں۔؟

ایسی نفرت کس بات پر؟

ہوا یہ تھا کہ جب یہ ذرات منفی بجلی والی کنگھی سے چپکے تھے تو ان میں کوئی بجلی نہیں رہی تھی۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد ان میں وہی منفی بجلی منتقل ہو گئی۔ اب وہ کیسے ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکتے تھے۔ فوراً جُدا ہو گئے، بھاگ کھڑے ہوئے۔

اور ہاں یہی ایک بات کا خیال رکھیے۔ کنگھی ربر کی ہو۔ اور صحیح سالم ہو یعنی اس کا کوئی دانت ٹوٹا ہوا نہ ہو۔ اس کو اونی کپڑے سے رگڑنے کے بعد جھٹکا جائے نہ گرایا جائے۔ ورنہ بجلی بھاگ جائے گی۔ ویسے اونی کپڑے کی بجائے خشک بالوں میں پھیر کر بھی کنگھی میں بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن میں نے اس کا ذکر یوں نہیں کیا کہ اگر بال زیادہ چکنے یا گیلے ہوں تو بجلی نہیں پیدا ہوتی۔

اس طرح آپ اچھی طرح جان گئے ہوں گے کہ ایک ہی قسم کے برقی ذروں کے درمیان دوستی نہیں ہوتی۔ وہ ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں۔ لیکن مخالف طاقت والے برقی ذروں کے درمیان گہری چھنتی ہے اور وہ ایک دوسرے کی طرف لپکتے ہیں۔ اسی اصول کو اپنا کر ایک کھلونا بنایا جا سکتا ہے۔ اس کی تیاری حالانکہ آسان ہے لیکن اپنی امی اور ابا کی مدد لینی ضروری ہے۔

امی سے کہہ کر ایک ایلومینیم ڈش ادھار مانگ لیجیے۔ یہی کوئی دو یا تین انچ گہری۔ اس کو ڈھکنے کے لیے ابا یا بھیا کو یقین دلا کر بغیر توڑے پھوڑے آپ لوٹا دیں گے، ایک اتنا ہی چوڑا اور لمبا شیشہ کا ٹکڑا مانگ لیجیے۔ جتنا کہ ڈش کا منھ۔

اب ٹشو پیپر TISSUE PAPER پر چار بچوں اور چار بچیوں کی شکل بنا کر کاٹ لیجیے۔ ان کی لمبائی کوئی انچ بھر ہو۔ یعنی اس قدر کہ وہ ڈش کی گہرائی میں آسکیں۔ پتلیوں کو قطار سے ڈش کے

اندر رکھ کر شیشے سے اس کو ڈھانپ [illegible] کی ناچتی پتلیاں تیار ہیں۔

اب صرف ایک اور چیز کی ضرورت ہے ایک چمڑے کے ٹکڑے کی۔ اس ٹکڑے سے شیشے کو اوپر سے آہستہ آہستہ رگڑیے۔ تھوڑے ہی وقفہ کے بعد آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ڈش کے اندر پتلے ناچ رہے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ شیشے پر چمڑے کی رگڑ سے منفی بجلی کے ذرات جمع ہو جاتے ہیں کاغذ کی پتلیاں جن پر کوئی برقی قوت نہیں ہوتی، ان کی مجموعی طاقت سے اوپر کی طرف کھنچی چلی جاتی ہے۔ شیشے سے جب وہ ٹکراتی ہے تو ان میں بھی منفی قوت منتقل ہو جاتی ہے اور وہ فوراً نیچے گر جاتی ہے۔ ڈش کی دھات سے لگ کر بجلی کھو جاتی ہے۔ اور وہ پھر سے اوپر کی طرف لپکتی ہیں۔ یہ ہے مزے کا ناچ۔
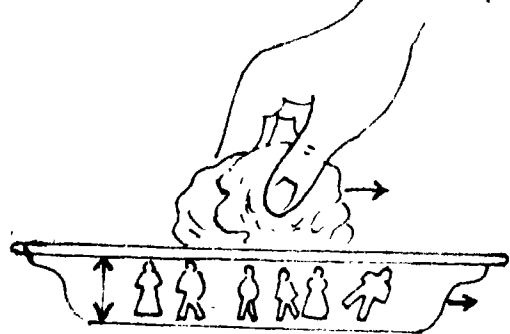
ایک بات اور ہے جب بھی برقی ذرے ایک سطح سے دوسری میں منتقل ہوتے ہیں۔ ان میں چمک بھی پیدا ہوتی ہے۔ خاص کر اس وقت جب دونوں طرف مخالف قوت پائی جاتی ہو۔ یہ چمک اکثر بہت ہلکی ہوتی ہے۔ آپ نے بادلوں کے درمیان بجلی چمکتی دیکھی ہوگی دراصل بادل کے ٹکڑوں پر بھی برقی ذرے جمع رہتے ہیں۔ کسی پر منفی اور کسی پر مثبت۔ جب کبھی مخالف بجلی والے بادل قریب آتے ہیں، منفی ذرے مثبت ذروں کی طرف کود جاتے ہیں اور بجلی کا چکر پورا ہو جاتا ہے۔ یہ ذرے اتنی زیادہ مقدار میں ہوتے ہیں اور ان کے ملنے سے اتنی قوت پیدا ہوتی ہے کہ چکا چوند کرنے والی چمک بھی پیدا ہوتی ہے اور زور دار گرج بھی۔

مخالف ذروں کے ملنے سے جو چمک پیدا ہوتی ہے۔ اس کو دیکھنے کے لیے بھی دو چار تجربے کیے جا سکتے ہیں۔ میں صرف ایک تجربہ بتاتا ہوں۔ کسی دن اگر آپ کو کسی دبیز اونی قالین پر چلنے کا موقع ملے تو پہلے پاؤں کو دھو لیجیے، انھیں خشک کر لیجیے اور پھر اس قالین پر چل کر اپنے پیروں کو اچھی طرح رگڑیے۔ اب آپ ہاتھ کی انگلی کو کسی دھات کی چیز کے قریب لے جائیے۔ اگر کمرے میں اندھیرا ہے یا ہلکی سی روشنی تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ہاتھ سے ایک چنگاری سی نکل کر دھات کی طرف لپکے گی۔ بجائے دھات کی طرف انگلی لے جانے کے اگر آپ نے اپنے دوست سے ہاتھ ملایا تو آپ کو ایک جھٹکا لگے گا۔

رگڑ سے اتنی بجلی بھی پیدا ہوتی ہے کہ جس سے روشنی پیدا کی جا سکے۔ اس کے لیے آپ کو اپنے ابا یا بھیا کو تیار کرنا ہوگا۔ ان سے کہیے گا کہ ذرا قریب والے کمرے میں چلے چلیں اور اپنے ساتھ ایک ٹیوب لائٹ لیتے چلیں ان سے یہ بھی کہہ دیجیے گا کہ وہ اپنا اونی سوٹ نہیں تو کم از کم اونی کوٹ ضرور پہن لیں۔ اب آپ اس کمرے کی بتی گل کر دیجیے اور ان سے کہیے کہ ٹیوب لائٹ کو مضبوطی سے اپنے دائیں ہاتھ میں تھام کر کوٹ کی بائیں آستین کے ساتھ ہلکا ہلکا لیکن تیزی کے ساتھ رگڑیں۔ چند ہی ثانیوں میں ٹیوب لائٹ چمکنے لگے گا۔ حالانکہ وہاں نہ تار ہوں گے نہ بجلی کا بٹن دبایا جائے گا نہ کچھ اور بس وہ آپ کے ابا کے ہاتھ میں ہوگا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، اس کا سبب تو آپ جانتے ہی ہیں میں نہیں بتاؤں گا۔ ویسے اگر آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے پوچھ لیجیے گا۔

جناب طاہر فرحی

"ننھّا گدھا"

میں نے اک روز کا
دیکھا ننھّا گدھا!

سر بڑا اس قدر
پتلی گردن مگر

لمبے لمبے سے پیر
نازکی تیری خیر

تھے نہ کچھ کام کے
بس وہ لرزا کیے

کچھ اچھل کود کی
اس نے کوشش بھی کی

عمر کم اس قدر
آئے کیا یہ ہنر!

نرم بھوری سی کھال
اور چمکتے سے بال

دیکھو گردن کو تم
خوبصورت سی دُم

رُخ پہ اک فکر سی
اور شک سے بری

چاہیے سوچنا
زندگی پر ذرا

اس تصور سے پھر
اچھلا وہ چونک کر

اُف نہ سنبھلا مگر
گر پڑا گھاس پر

ننھا مُنا گدھا
اس میں طاقت ہی کیا

دیکھتا میں رہا
اس کی معصوم ادا

اور دُعا میں نے کی
اس کو چاہیں سبھی
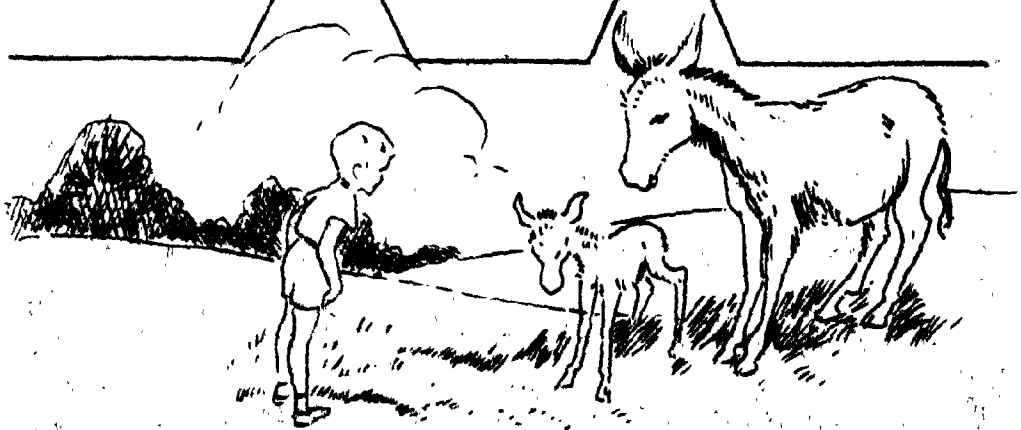
آپ کے ذوقِ سلیم کی تسکین کے لئے
بخشی جنتری سنہ ۱۹۶۹ء
پیش خدمت ہے!
خصوصیات:
★ مکمل آفسٹ کے ذریعہ انتہائی دیدہ زیب طباعت ★ پاکٹ سائز ۶۴ صفحات ★ ارزاں قیمت ★ بہترین مضامین، مثلاً ★ نعت شریف ★ پیشین گوئی ★ اسمائے تاریخی ★ شادی کی مبارک تاریخیں ★ ہجری، عیسوی، ہندی، بنگلہ شک سمت جنتری ★ فال نامہ ★ بالوں سے متعلق مضمون ★ سلام کے آداب ★ خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کا جائزہ ★ وغیرہ وغیرہ .... قیمت فی جلد دس پیسے ... فی سیکڑہ آٹھ روپے ... ایک ہزار پچاس روپے ...
دو سو سے کم کا آرڈر قبول نہیں کیا جائے گا
شائع کردہ: مینیجر بخشی جنتری ۳۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱
ایجنٹس: جنرل نیوز ایجنسی بلیماران دہلی۔ صفی اللہ بکسیلر مدنپورہ ممبئی ۸۔ ناز بک ڈپو ممبئی ۳۔ محمد سمیع بک سیلر طلاق محل کانپور۔ ایورسٹ کتاب گھر اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ کتاب منزل پٹنہ۔ بک کارنر مونگیر۔ بک کارنر پٹنہ۔ اپنا کتب خانہ پورنیہ بہار۔ فضل بک ڈپو کچہری روڈ گیا۔ محمد بدرالدین فاربس گنج پورنیہ۔ حسن برادرس کشن گنج پورنیہ۔ محمد ریاض الدین باری روڈ گیا۔ ظفر بکڈپو گوتم بدھ روڈ گیا۔ پرویز بک ہاؤس سبزی باغ پٹنہ ۴۔ نور محمد اینڈ سنس کمپنی باغ مظفرپور۔ کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴۔ قومی کتاب گھر نیو مارکیٹ کٹیہار۔ نفیس نیوز ایجنسی ساکچی بازار جمشیدپور۔ بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ ۴۔ محمد کریم بخش کمپنی باغ مظفرپور۔ اردو بک اسٹور سورج گنج مدھوبنی دربھنگہ۔ حاجی اجمل حسین بک سیلر سہسرام۔ جنتا کتاب گھر بازار کٹیہار۔ اسلامیہ بکڈپو تاتارپور بھاگلپور۔ اسٹوڈنٹ بک اسٹور بہادر گنج پورنیہ۔ بک کارنر چوک بازار مونگیر۔ تاج بکڈپو مین روڈ رانچی۔ ایم ایم کتابستان بیگوسرائے مونگیر۔ کمالیہ بکڈپو بھاگلپور۔ محمد ادریس عبدالمنان ارریہ کورٹ پورنیہ۔ دینی کتاب گھر گنگی بازار دربھنگہ۔ ایم شمس الدین صاحب گدری بازار دربھنگہ۔ مکتبہ اسلامی لہریا سرائے دربھنگہ۔ آزاد بک اسٹور سورج گنج مدھوبنی دربھنگہ۔ سلامت اللہ بک سیلر صدر بازار کشن گنج پورنیہ۔ علی حسن صاحب گنگی بازار دربھنگہ۔

جناب محمد امین

اتھوپیا کی سرزمین سے

میکلے میں مجھے ایک فرشتہ ملا

میکلے صوبہ تیگرے کا دارالخلافہ ہے۔ صوبے کا سب سے بڑا افسر یہاں گورنر جنرل کہلاتا ہے۔ میکلے گورنر جنرل کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ آج کل کے گورنر جنرل کا نام 'راس سیوم منگے شا' ہے۔ ان کی بیگم شہنشاہ ہائلے سلاسی اوّل کی پوتی شہزادی آئیدا دیستا ہیں۔ یہ لوگ بہت ہی شائستہ، مہذب اور مہمان نواز ہیں۔ ہندوستانی اساتذہ اور دوسرے غیر ملکی سیاحوں کی بہت عزت اور آؤ بھگت کرتے ہیں۔ گورنر جنرل بادشاہ یوہنیس[1] کے پرپوتے ہیں۔ یہ ان دنوں میکلے کو نئے طرز کا شہر بنانے کے لئے بڑی سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔

میکلے کی آبادی ۲۲ ہزار ہے۔ شہر میں بڑی چہل پہل رہتی ہے۔ یہ ایک ایسی وادی میں بسا ہوا ہے جو درختوں سے خالی ہے۔ شہر کے اندر یوکلپٹس کے درخت ضرور ہیں اور تجربے کے لیے ایک زراعتی فارم بھی ہے۔ مغرب میں دریائے تکازی (اباتارا) کا غار ہے، شمال اور مشرق میں پٹھار ہیں۔ دریائے ایلالا اور دریائے گیوا بھی قریب ہیں جو برساتی قسم کے نالے ہیں۔ جنوب میں پہاڑیاں ہیں اور نشیب و فراز بہت ہیں۔

یہاں کئی چھوٹی بڑی صنعتیں ترقی پر ہیں۔ ان میں سب سے مشہور تیگرے زراعتی صنعتی ترقی کی صنعت ہے جسے مختصراً ٹائیڈل (TAIDL) کہتے ہیں۔ یہ صنعت گجرات کے ایک سیٹھ نے قائم کی تھی۔ اصل میں یہ ایک کمپنی ہے جس میں حکومت اتھوپیا، گورنر جنرل اور میکلے کے چند مخصوص لوگوں نے اپنا سرمایہ لگا رکھا ہے۔ اس کمپنی کے ڈائرکٹر ہز ہائینس راس سیوم منگے شا ہیں۔ ان دنوں مسٹر پرشوتم ایک گجراتی سوداگر اسے چلا رہے ہیں۔ دو خاص فنی ماہر ہندوستانی ہیں باقی ساٹھ کے قریب دوسرے مزدور ہیں۔ منیجر اور محاسب بھی ہندوستانی تھے لیکن ان لوگوں کا معاہدہ ختم ہو گیا اور وہ ہندوستان واپس چلے گئے۔ یہ صنعت ٹین کے ڈبے، نوک کا تیل، صابن، پٹ سن کی بوریاں وغیرہ بناتی ہے۔ دوسری چھوٹی صنعتی فرمیں ہیں جو چھوٹے موٹے سامان تیار کرتی ہیں مثلاً سائسل[2] کے ریشوں کی چٹائیاں اور قالین، کپڑے پر تاریخی کیرکٹر کی پینٹنگ اور ڈنٹھل سے ڈلیاں ٹوکریاں اور خاص قسم کی محراب دار ٹوکریاں وغیرہ

علاوہ ان کے میکلے میں بے شمار قہوہ خانے اور بار ہیں۔ ان کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہے۔ شہر کے مغرب میں ایک طرف

---

[1] موجودہ شاہنشاہ ہائلے سلاسی اوّل سے پہلے مینک دوم اتھوپیا کے شہنشاہ تھے۔ ان سے پہلے بادشاہ یوہنیس کا دور دورہ تھا۔ اتھوپیا کی تاریخ کا ذکر آگے کی قسطوں میں کسی قدر تفصیل سے آئے گا۔

[2] سائسل ریشے والا ایک پودا ہے اس میں پتیاں زیادہ ہوتی ہیں تاکم۔ پتیاں نوکیلی اور لمبی ہوتی ہیں اور ان میں کناروں پر کانٹے ہوتے ہیں۔ اس کی پیداوار دنیا میں سب سے زیادہ تنزانیا میں ہے۔ اتھوپیا میں بھی یہ کافی ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں یوپی کے مغربی اضلاع میں یہ ہوتا ہے۔

ابراہا کیسل نام کا ایک خاص ہوٹل ہے۔ یہ ایک پہاڑی کی بلندی پر ہے۔ اس کی چھت سے کھڑے ہو کر شام کو اور رات میں میکلے شہر کو دیکھا جا سکتا ہے جو پہاڑ کے دامن میں بسا پریوں کا ایک شہر معلوم ہوتا ہے۔ اس ہوٹل میں بین الاقوامی سیاح آکر ٹھہرتے ہیں اور یہاں کھانے کا، قہوہ، شراب اور دوسری قسم کے ہلکے اور عمدہ شربتوں کا انتظام ہے۔

ان دنوں اس کی منیجر ایک ہندوستانی خاتون ہیں۔ ان کا نام مسز لال ہے جو بہت سلیقہ مند، مہذب اور ہوشیار ہیں۔ کئی زبانیں جانتی اور بولتی ہیں۔ اردو نہایت سلیس بولتی ہیں۔ جے پور کی رہنے والی ہیں۔ ان کا گھرانا مسلمانوں کے تہذیب و تمدن سے مانوس رہا ہے۔ ویسے تو وہ عیسائی ہیں لیکن گفتگو، لب ولہجہ، رہن سہن خالص عربوں اور مسلمانوں جیسا ہے۔ — قسم قسم کے کھانے، مرغ بریانی کی جب وہ باتیں کرتی ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی مغل خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ زبان میں شیرینی اور رس ہے اور بیسیوں قومیت اور ملک کے جو ٹورسٹ آتے ہیں مجال ہے کہ ان سے کوئی متاثر نہ ہو۔

کیسل ہوٹل میں سرکاری قسم کی دعوتیں، گورنر جنرل کے مہمانوں کا استقبال، غیر ملکی احباب کی تقریبیں بھی ہوتی ہیں۔ پچھلے سال ہم ہندوستانی لوگوں نے ۲۶ جنوری کو "یوم جمہوریہ" بھی وہیں منایا تھا اور اس موقع پر ہز ہائینس اور ہر ہائینس کے علاوہ افسران اور حکومت کے دوسرے شعبوں کے افسروں کو بلایا گیا تھا۔ جلسے کے بعد ڈنر کا انتظام تھا اور مرغ اور قورمہ کے ساتھ ہندوستانی کھانوں کا بھی انتظام تھا۔ علاوہ اٹالین اور انگریزی کھانوں کے ہندوستانی کھانے میں بھی اس ہوٹل کا یہاں کوئی جواب نہیں ہے۔ مرغ مسلم، نرگسی کوفتے، کباب، بریانی جس میں پستے بادام، اخروٹ، کشمش سبھی لوازمات، قورمہ شیرمال غرض مسز لال کی وجہ سے ہر قسم کا کھانا یہاں ملتا ہے۔

جب کبھی ہم لوگوں کا دل چاہتا ہے مسز لال کو ٹیلیفون کر کے پیشگی بتا دیتے ہیں کہ آج ڈنر کھائیں گے۔ اس کے بعد مسز لال جو میرے اور میرے دوستوں کے ذوق کو جانتی ہیں کباب، نرگسی کوفتے اور مرغ کم سے کم بارہ پندرہ قسم کے کھانے تیار کرا دیتی ہیں۔ ساتھ میں آئس کریم، پھل اور کیک پیسٹری کی بھی بھرمار رہتی ہے۔ جس شام کو میں یہاں کھانا کھاتا ہوں دوسرے دن ناشتہ اور دوپہر کا کھانا گول کر دیتا ہوں اور دن میں مولانا آزاد مرحوم کے انداز اور ذوق کی چائے پیتا ہوں۔

میکلے میں ایک سیکنڈری اسکول ہے جس کا نام آتسے یو ہینس کامپری ہنسب سیکنڈری اسکول ہے۔ اس میں پندرہ سو سے زیادہ لڑکیاں اور لڑکے پڑھتے ہیں۔ اسکول میں سولہ ہندوستانی استاد، آٹھ امریکن، دو فرانسیسی اور چالیس سے زیادہ اتھوپین استاد و استانیاں کام کرتی ہیں۔ ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ لیکن امہرک (مقامی زبان)، ریاضی اور انگریزی ضروری اور بنیادی مضامین ہیں۔ علاوہ ان کے فرانسیسی زبان بھی نویں دسویں اور گیارھویں گریڈ میں پڑھائی جاتی ہے۔ جغرافیہ تاریخ، فزکس کیمسٹری، بیالوجی، ڈومیسٹک سائنس، حرفہ، کامرس اور ٹکنیکل مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں۔

ہر مضمون خصوصاً جغرافیہ، تاریخ، سائنس اور انگریزی کے کلب بھی ہیں۔ ان میں جغرافیہ کلب سب سے نمایاں ہے اور اس کے مشاغل میں قرب و جوار کے ماحول کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنا، پہاڑ پر چڑھنا، دریا کی وادیوں اور زمین کو کاٹنے چھانٹنے والے عناصر کا جائزہ لینا، جغرافیائی فلم سلائیڈ میں دکھانا، جدید عنوانوں پر تقریریں کرانا، مٹی، چٹان، معدنیات، فاسل کے نمونے جمع کرنا، پیداوار، اجناس، پھول، درختوں کی پتیوں کو اکٹھا کرنا شامل ہے۔

پچھلے سال یعنی ۱۹۶۷ء میں اس کلب کی طرف سے کلب کے ممبران تعلیمی سیر کرنے کے لیے ڈیکامرے، نفاست،

ساوا، کرن اور اسمارا گئے تھے۔ یہ سیر بہت ہی کامیاب تھی۔ ممبروں نے قدرتی مظاہر کا مشاہدہ کیا اور سطح سمندر سے بلندی کے فرق کو سمجھنے کے لیے قدرتی نباتات اور جغرافیائی ماحول کے فرق کو سمجھا۔

۴ر دسمبر کو بس سے اترنے کے بعد میں اپنے سامان کے ساتھ ایک ہوٹل میں پہنچا۔ بس اسٹینڈ کے قریب اور آس پاس کئی ہوٹل تھے اس لیے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ جس ہوٹل میں میں پہنچا بظاہر ہوٹل اچھا تھا لیکن اندر جا کر دیکھا کہ غسل خانے صاف نہیں ہیں۔ سامان ایک کمرے میں رکھ کر میں نے دوسرے ہوٹل میں جگہ تلاش کی۔ پیاسا یعنی یہاں کے مخصوص بازار کے قریب ڈاکخانے کے پاس ایک ہوٹل میں دو بستروں کا ایک کشادہ کمرہ میں نے پسند کیا۔ پھر اسی وقت پہلے ہوٹل سے نئے ہوٹل میں منتقل ہو گیا۔

جگہ نئی تھی اور ماحول بالکل ہی جداگانہ۔ میں نے فوراً ہی کچھ ہندوستانی دوستوں کی تلاش شروع کی۔ بازار میں دو حضرات نظر آئے۔ میں نے ان سے مسٹر وشواناتھن کا پتہ پوچھا انھوں نے جواب دیا کہ اس وقت ہمیں فرصت نہیں تم کل ان سے مل لینا۔ اس جواب سے مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی لیکن مجھے کچھ تو تجسس، کچھ نئی جگہ، ماحول بالکل ہی نرالا، بھلا چین کہاں!

ڈاکٹر احسن نے عدیس ابابا میں مجھے بتایا تھا کہ میکلے میں اگر کوئی مددگار نہ ملے تو تم کسی طالب علم کو پکڑ لینا۔ اسے کچھ انعام دے دینا اور پھر تمھاری مرضی اور خواہش کے مطابق تم جو چاہوگے وہ تمھارا کام کر دے گا چنانچہ مجھے گبرے اگزیابیہر نام کا ایک لڑکا ملا۔ اس سے میں نے مسٹر وشواناتھن کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ میرے استاد ہیں اور چلیے میں آپ کو ان کے گھر لے چلتا ہوں۔

منٹوں میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ مسٹر وشواناتھن اور ان کے دوست مسٹر ٹوکس بہت تپاک سے ملے۔ پھر ایک اور صاحب مسٹر سوامی بھی وہیں آ گئے۔ ان لوگوں سے خوب باتیں رہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ لوگ بہت معقول قسم کے انسان ہیں اور ان میں کوئی بھید بھاؤ اور تنگ نظری نہیں ہے۔ مل کر جی خوش ہوا۔ کھانا کھا کر ۹ بجے شب میں میں ہوٹل واپس چلا آیا اور گرم گرم دودھ پی کر اپنے کمرے میں آرام سے لیٹ گیا۔

نئی جگہ تھی بھلا نیند کہاں۔ چنانچہ عدیس ابابا میں ٹورسٹ کے ادارے کے دیے ہوئے پمفلٹ اور کتابچے نکال کر پڑھتا رہا۔ ۱۲ بجے نیند آئی۔ صبح اٹھ کر عادت کے مطابق غسل کیا۔ چاہتا تھا کہ گرم پانی ملے۔ نہ ملا تو ٹھنڈے پانی کو ترجیح دی۔ بعد میں مسٹر وشواناتھن نے مجھے آگاہ کیا کہ یہاں ٹھنڈے پانی سے ہرگز نہ نہاؤ اور روزانہ نہانے کی عادت بھی چھوڑ دو۔ میکلے کی بلندی ۲۰۶۲ میٹر یعنی ساڑھے چھ ہزار فٹ ہے۔ راتیں سرد ہوتی ہیں۔ آکسیجن کی کمی ہے اور ہوا کی تہہ پتلی ہے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ ہفتے میں دو بار نہاؤ اور وہ بھی دوپہر میں جبکہ خوب دھوپ نکلی ہو ورنہ کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا ہو جاؤگے۔

غرض آٹھ بجے تک نہا دھو کر اور ناشتہ کر کے میں تیار ہو گیا۔

۵ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو صبح ہی صبح باہر نکلا۔ بازار سونا تھا۔ پیاسا پر چہل پہل بالکل نہیں تھی۔ میں اپنے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے سیدھے تیگرے کے تعلیمی دفتر پہنچا۔ وہاں نائب تعلیمی افسر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے استقبال کیا اور گفتگو کے دوران کئی بار خوش آمدید، خوش آمدید کے الفاظ دہرائے۔ مجھے محسوس ہوا کہ نہ صرف عدیس ابابا میں بلکہ میکلے میں بھی ایتھوپیا کی حکومت کے افسران کتنے شریف، مہذب اور میٹھی زبان کے لوگ ہیں۔ انھوں نے اسکول کے ڈائرکٹر کو ٹیلیفون کیا اور

مجھ سے کہا کہ اسکول جاکر آٹو ابے بے عسرت سے مل لیجیے۔

میں اپنا بریف کیس لے کر سیدھا اسکول پہنچا جو قریب ہی بڑی سڑک کے کنارے تھا معلوم ہوا کہ ڈائریکٹر رخصت پر ہیں اور ایڈ منسٹریٹر سے ملنا پڑے گا۔ ایڈ منسٹر نے بھی وہی خوش آمدید کے الفاظ دہرائے اور اپنے دفتر میں لیجاکر مجھ سے کہا کہ تشریف رکھیے میں جاکر ڈائریکٹر سے معلوم کرتا ہوں۔ ڈائرکٹر کا کواٹر اسکول کے احاطے میں تھا چنانچہ آٹو گبرائی یعنی ایڈ منسٹریٹر چند منٹ میں ڈائرکٹر سے مل کر آگئے۔ انھوں نے ٹائم ٹیبل بناکر دیا اور یہ کہا کہ آج شاید آپ تھکے ہوں گے، لمبے سفر آئے ہیں، ہوٹل میں جاکر آرام کیجیے اور کل سے اسکول آئیے۔ اس قدر عمدہ سلوک اور مہماں نوازی کا رویہ دیکھ کر جی خوش ہوا۔ ہفتے میں ۲۱ پیریڈ پڑھانے کا ٹائم ٹیبل دیکھ کر تو جی اور خوش ہوا۔

اس کے بعد میں اسٹاف روم میں گیا وہاں ہندوستانی استادوں سے ملاقات ہوئی جن میں علاوہ مسٹر شوانا تھن، لوکس کے مسٹر اور مسز شیلا آئیکٹ، مسٹر اور مسز گن متو، مسٹر سیم، مسٹر بھٹ، مسٹر بیسوال، مسٹر دنسل اور مسٹر اٹیلی قابل ذکر ہیں۔ ان میں سب نے اس بات پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا کہ چلو یہ اچھا ہوا کہ تمھارا تقرر میکلے میں ہوگیا۔ ورنہ اگر عدی گرا دیا عدوا میں ہوتا تو اچھا نہ رہتا اس لیے کہ دونوں جگہیں معمولی قسم کے مقامات ہیں اور وہاں بینکنگ کی سہولت نہیں ہے۔ منی آرڈر کرنے میں بھی دقت رہتی ہے۔

مسٹر وشوانا تھن نے مجھ کو آگاہ کیا کہ سب سے بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ اتھوپیا ہے اور چونکہ تیگرے کے صدر مقام میں تمھارا تقرر ہوا ہے اس لیے کچھ لوگ رشک کریں گے اور سامنے میٹھی باتیں لیکن پیٹھ پیچھے برائی کریں گے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ جب تک ناشتے اور کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تم قیام تو رکھو ہوٹل میں لیکن ناشتہ اور کھانا ہمارے ساتھ ہوگا۔ میں نے کہا کہ تکلف کی بات نہیں میں ہوٹل میں آرام سے ہوں اور آپ کے شاگرد گبرے کے ذریعہ میں نے ہوٹل کے منیجر سے گفتگو کرلی ہے۔ مگر وہ مانے نہیں اور برابر اصرار کرتے رہے۔ یہ بھی کہا کہ ہمارے پاس فالتو پلنگ اور بستر نہیں ورنہ تم ہمارے ساتھ ہی قیام کرتے تو اچھا رہتا۔

میں نے کہا کہ یہ کیا کم ہے کہ آپ مجھ کو کھانے اور ناشتے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ٹھہرنے کی بات چھوڑیے۔ میں ہوٹل میں آرام سے ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ کوئی تکلف نہیں، تم نئے نئے آئے ہو، یہاں کے ماحول سے واقف نہیں اور مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ آخر پردیس میں انسان کو اپنوں سے سہارا نہیں ملے گا تو وہ کہاں جائے گا۔

غرض سب سے مل ملاکر میں ہوٹل واپس آگیا۔ لنچ کے وقت مسٹر وشوانا تھن نے اپنا ہاؤس بوائے (ملازم لڑکا) بھیجا اور یہ کہلوایا کہ کھانے پر ہم تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ اس طرح چھ روز تک میں مسلسل صبح، دوپہر، شام ان کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔ ذرا بھی تکلف کرتا تو وہ اطمینان دلانے کے لیے یہی کہتے کہ ہمارے گھر کو تم اپنا گھر سمجھو اور جو جی چاہے فرمائش کرکے ملازمہ سے پکوا لیا کرو۔

دو روز کے بعد دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ روزانہ دوپہر یا شام کو کھانے کی دعوت! ایک دن مسٹر سیم کے گھر، دوسرے دن مسٹر گن متو کے، تیسرے دن مسٹر سوامی کے، چوتھے دن مسٹر آئیکٹ کے گھر ہم دعوتیں کھاتے رہے اور میں باری باری سب کو قریب سے دیکھتا اور پہچانتا رہا۔ ایک دن صبح سو کر اٹھا تو گلا بیٹھا ہوا تھا۔ آواز بند۔ اسکول میں پڑھانا مشکل تھا۔ دوستوں نے یہ حالت دیکھی تو ہر ایک نے ہمدردی کا اظہار کیا اور دوائیں بتائیں۔ مسٹر بھٹ نے اپنے گھر لے جاکر ہلدی

اور خالص گائے کے گھی میں بناکر کوئی مسالہ دیا۔

شام کو کھانا مسٹر آئیکٹ کے ساتھ تھا۔ ان کے گھر پہنچا تو انھوں نے کہا "امین صاحب! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟" میں نے کہا کیا بتاؤں، "نئی جگہ ہے" ابھی میں یہاں کے موسم، آب و ہوا اور ماحول کا عادی نہیں ہوا ہوں۔ شاید دو چار ہفتے میں نارمل ہو جاؤں گا۔ انھوں نے کہا کہ میرے پاس ایک دوا ہے، آپ اسے استعمال کیجیے گلا صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔ اور آواز کھل جائے گی۔ میں نے کہا بہت اچھا، لائیے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فنجان میں برانڈی لیے وہ چلے آ رہے ہیں۔ اسے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا، خدایا یہ کیا! میں ہچکچایا......

مسٹر آئیکٹ نے کہا کہ یہ ٹانک ہے، میکلے کے ماحول میں، رات کو سرد ہوا کے جھونکے میں اگر آپ اسے استعمال نہیں کریں گے تو خدا ہی خیر کرے۔ میں نے تامل کیا... انھوں نے اصرار کیا... آخر شش گلے کی تکلیف اور آواز بیٹھنے کی اذیت کو میں نے محسوس کیا تو ٹانک پی گیا۔ مقدار مختصر سی تھی لیکن اس میں گرمی بلا کی تھی۔ پھر میں نے کھانا کھایا، غرارہ کیا اور ہوٹل جانے کی تیاری کی۔ سڑک پر مسٹر وشواناتھن مل گئے اور انھوں نے پوچھا کیا حال ہے۔ میں نے کہا کہ مسٹر آئیکٹ نے آج مجھے ایک بہت ہی موثر دوا دی۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کے ماحول میں یہ ضروری ہے۔

چھ دن کی تگ و دو کے بعد مسٹر وشواناتھن کی کوششوں کی بدولت مجھے گھر مل گیا۔ مسٹر آئیکٹ نے ایک ملازمہ دلوا دی اس کے بعد رفتہ رفتہ میں نے ضرورت کا سامان خریدا اور میکلے میں سیٹ ہو گیا۔ میرا گلا بھی ٹھیک ہو گیا۔ مسٹر وشواناتھن نے ایک بنگالی ڈاکٹر سے بھی ملاقات کروا دی جو بعد میں میرے پڑوسی نکلے اور ان سے، ان کی بیگم اور دو بچوں سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔

میکلے میں ایک امریکن کتب خانہ بھی ہے۔ یہاں رسالے میگزین اور اخبار آتے ہیں اور کتابیں بھی افراط سے ہیں۔ مسٹر وشواناتھن نے مجھے اس کا راستہ دکھایا اور لائبریرین سے ملاقات کرا دی۔ میں پابندی سے لائبریری جانے لگا اور خلا کے متعلق جتنی کتابیں ملیں ان کو پڑھ ڈالا۔

ایک دن میرے شاگرد ڈاکٹر شیام سندر بھاٹیہ کا امریکہ سے خط آیا۔ انھوں نے مجھ کو للکارا کہ اِدھر اُدھر کی کتابیں پڑھ کر وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ اتھوپیا کے جغرافیہ، تاریخ، معاشیات اور سماجی حالات کے متعلق کتابیں پڑھو اور ان کا ریکارڈ رکھو۔ چنانچہ میں نے اپنے شغل کو ایک دم بدل دیا۔ اتھوپیا کے بارے میں مجھے کتابوں کی تلاش ہوئی۔ مسٹر وشواناتھن نے یہاں بھی میری مدد کی اور انھوں نے اپنے ذرائع سے ایک درجن کتابوں کا بندوبست کر دیا۔ ان کے پاس مدراس کے ہندو اخبار کا ہفتہ وار ایڈیشن بھی آتا ہے۔ اسے بھی میں نے ان سے لے کر پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ میرے ذوق و شوق کو دیکھ کر میری اور ہمت بڑھاتے رہے اور نئی نئی کتابیں فراہم کرتے رہے۔

اس شہر میں میں اجنبی تھا اس لیے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے پرکھ کر دیکھا لیکن جیسے جیسے میکلے میں دن گزرتا رہا میں نے ہر وقت مسٹر وشواناتھن کو مخلص، ہمدرد اور دوست پایا۔ کھانا ناشتہ ساتھ ہی نہیں، بلکہ خیالات، وسعت، معلومات، روشن خیالی، ذہنی اور دماغی لحاظ سے میں نے ان کو بہت اونچا پایا۔ ان سے باتیں کر کے مجھ کو تشفی ہوئی۔ کئی مسائل پر بحث بھی ہوئی اور اس بحث میں مسٹر آئیکٹ، مسٹر سوامی اور مسٹر لوکس نے بھی حصہ لیا۔ مسٹر وشواناتھن مسٹر آئیکٹ گوشت کھاتے ہیں اور ان کے نزدیک بڑا گوشت کھانا بھی کوئی گناہ نہیں۔ ان سب سے مل کر، ان کے ساتھ رہ کر، ان کی محفلوں میں شریک ہو کر جی خوش ہوا۔ یہ لوگ فرشتے نہیں تھے اور نہ ہیں لیکن مسٹر وشواناتھن فرشتہ خصلت ضرور ہیں۔ اس لیے میں یہی کہوں گا کہ:

میکلے میں مجھ کو ایک فرشتہ ملا۔

محترمہ سلمیٰ جاوید

تکرار

مچ گئی سبزی منڈی میں تب ہل چل اور طوفان
کڑوے نیم کریلا نے جب اپنی بگھاری شان
میں ہوں کریلا سب کا راجا
سب سبزی ہیں میری پرجا[1]
بیگن میرا اک نوکر ہے
میرا معمولی چاکر[2] ہے
بیگن جی تو سہہ نہ سکے یہ کھلا ہوا اپمان[3]
بات کریلے کی ہے جھوٹی
کھوپڑی اس کی تو ہے الٹی
نام ہے میرا بیگن جی
مجھ پر تو واری[4] ہیں سبھی
چاؤ[5] سے مجھ کو لے جاتے ہیں جھگڑا اور بہتان
پھر تو سب کو غصہ آیا
ہوگئے سب ہی گتھم گتھا!
سب کے بیچ میں کودا کدو
بولا تاؤ میں آکر آلو
میں ہوں لیڈر جان بوجھ کر بنتے ہو انجان
پرول اور تردئی آئے
مرچا جی نکلے جھلائے
بکتی ہوئی مولی نکلی
تب تو اور بھی بات بڑھی
میاں ٹماٹر ہنس ہنس بولے کیوں سب ہوتے ہو ہلکان[6]
تم تو سب بالکل ہو سگے
ایک پتا[7] اور ماتا[8] سے
کیوں آپس میں لڑتے ہو
آخر کیوں یہ جھگڑتے ہو
گلے ملو سب، کرو ہمیشہ ہر اک کا سمان[9]
مرچا، آلو اور کریلا!
گوبھی، بیگن، لوکی، ٹنڈا
جلدی جلدی سب دوڑے
اور آپس میں گلے ملے
ہاتھ اٹھا کر سب یوں بولے ہم منڈی کی شان

---

١ پرجا = رعایا
٢ چاکر = خدمت گار
٣ اپمان = بے عزتی
٤ واری = قربان
٥ چاؤ = پیار، محبت
٦ ہلکان = پریشان، محنت کش
٧ پتا = باپ
٨ ماتا = ماں
٩ سمان = عزت

جناب مولانا مقبول احمد سیوہاروی

مجاہدینِ آزادی

سیّد احمد شہیدؒ

(۲)

رائے بریلی سے چلے تو چار سو آدمیوں کا قافلہ ساتھ اور خرچ سب کا سید صاحب کے ذمہ تھا، مگر سید صاحب کے پاس روپیہ کتنا تھا؟ فقط ایک سو سات روپیہ!! رائے بریلی سے قدم نکالتے وقت سو روپیہ نائی بھنگی سقہ اور غریبوں کو بانٹ دیئے۔

"دسی" نام کی ندی کے پار جانا تھا کشتیوں سے پار اُتر کر ایک باغ میں ٹھہرے تو وہ سات روپیہ جو رہ گئے تھے انھیں بھی تقسیم کر دیا۔ پھر برہنہ سر ہوکر خدا تعالیٰ کی حضور میں عرض کی۔

اے کریم کارساز تو نے اتنی مخلوق
اس بندہ ذلیل کے سپرد کی ہے
اپنے کرم سے اس پوری جماعت کی
ضرورتوں کو پورا کرنا اور منزل تک
پہنچا دینا۔

پھر کیا ہوا؟ لوگ دور دور سے زیارت کے لیے آتے تھے۔ نذرانے پیش کرتے تھے۔ دعوتیں کرتے تھے، ذرا نمونہ کے لیے ایک دعوت کا حال سن لیجیے۔
یہ دعوت شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی ہے۔

جنھوں نے پورے قافلے کی دعوت کی تھی،

روزانہ دو ہزار آدمیوں کا کھانا تیار ہوتا تھا۔ قافلہ والوں کے لیے اور جو کوئی آجاتا وہ بھی کھا لیتا

قافلہ اور میر قافلہ سید صاحب رخصت ہونے لگے تو تین ہزار روپیہ کی قیمت کے ہتھیار۔ ایک بڑا خیمہ، بارہ چھوٹے خیمے پانچ ہزار روپیہ اور قافلہ کے ہر آدمی کے لیے ایک جوڑا کپڑا، ہر جوڑے کے ساتھ ایک روپیہ نقد، سید صاحب کے کنبے اور سید صاحب کے لیے عمدہ قسم کے جوڑے، اور پانچ سو روپیہ نقد۔

یہ فقط الہ آباد کے ایک صاحب کا نذرانہ تھا۔
اب کلکتہ کے دو نمونے بھی پڑھ لیجیے جہاں سے جہازوں سے سوار ہوکر سفر حج کرنا تھا۔

بنگال کے گھرانوں میں منشی امین الدین بڑے دولت مند تھے۔ انھوں نے سید صاحب کے کلکتہ آنے کی خبر سنی تھی تو ایک ایسی کوٹھی سید صاحب اور سید صاحب کے ساتھیوں کے لیے پہلے سے خرید لی تھی۔ جن میں تین تالاب تھے۔ ایک تالاب پینے کے پانی کا ایک کپڑے دھونے کا اور ایک غسل کرنے کے لیے۔

س سے اندازہ کیجیے کہ وہ کوٹھی کتنی بڑی ہوگی یہی نہیں کہ تالاب ہی تالاب ہوں۔

مردوں کے ٹھہرنے کے الگ کمرے، عورتوں کے رہنے کے لیے الگ کمرے، کوٹھی کیا تھی ایک قلعہ تھا۔

ایک باغ جس میں سنترے، کیلے، انار، آم، ناریل کے درخت کہ جس میوہ کو سید صاحب کے ساتھی چاہیں بے کھٹکے کھائیں کہ یہ فقط ان ہی کے لیے تیار کرایا گیا تھا۔ خود کھائیں یا جسے چاہیں کھلائیں۔

سید صاحب کلکتہ پہنچے تو ایک منزل آگے بڑھ کر سب سے پہلے منشی امین الدین نے سید صاحب سے ملاقات کی اور یہ عرض گذرانی کہ حضرت میں سب سے پہلے حاضر ہوا ہوں۔ قیام گاہیں تو بہت ہیں مگر میں نے حضرت ہی کی نیت سے ایک کوٹھی خریدی ہے جس میں ہر قسم کی راحت کا انتظام ہے۔ کلکتہ میں پانی کی خاص طور پر صاف اور میٹھے پانی کی دقت ہوتی ہے۔ کوٹھی میں تین تالاب ہیں۔ پینے کا پانی میٹھا۔ کپڑے دھونے کا پانی، غسل کرنے کا پانی، یہ سب حضرت کے لیے اور حضرت کے ساتھیوں کے لیے انتظام کیا ہے۔

میری غرض یہ ہے کہ بس اسی کوٹھی میں حضرت قیام فرمائیں۔ کھانے کا اہتمام جب تک کہ حضرت کا قیام کلکتہ میں رہے میری طرف سے ہوگا۔ کوئی دعوت کرے تو قبول کرنے نہ کرنے کا آپ کو اختیار ہے۔

سید صاحب نے یہ دعوت منظور فرمائی۔

کھانا اور قیام منشی امین الدین کی کوٹھی میں !!

اب ذرا کھانے کا حال بھی سن لیجیے، پورے قافلہ کے لیے کھانا آیا۔

قورمہ، باقر خانی، شیر مال، بکری کا پلاؤ، مچھلی کا پلاؤ، مربّے اچار اور کئی قسم کا میٹھا، ایک دن ایک وقت نہیں !! دونوں وقت ایسا ہی شان دار کھانا! جب تین دن تک ایسا ہی کھانا آتا رہا تو سید صاحب نے منشی امین الدین سے کہا۔

منشی جی !! بس ایک قسم کا کھانا بھیجیے۔

منشی جی نے بڑی عاجزی سے عرض کیا حضرت یہ خدمت ہی کیا ہے؟ کھانا ایسا ہی آتا رہے گا۔ میری خوشی یہی ہے۔

سید صاحب نے فرمایا۔

خدمت گذاری کی غرض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔

کوئی کام خدا تعالےٰ کی مرضی کے خلاف نہ ہونا چاہیے، جو بات کی جائے دکھاوے کے لیے نہ کی جائے نہ اس میں بیجا خرچ ہو، جسے اسراف کہتے ہیں۔

آپ کو جو کچھ مال دیا ہے وہ اللہ نے دیا ہے اس کا حساب دینا پڑے گا۔ کھانے کا مطلب پیٹ بھرنا ہے۔ بس ایک کھانا بھیجا کیجیے۔

اب ذرا باغ کی بہار دیکھ لیجیے۔

یہ تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ پورا قافلہ حج بیت اللہ کو جانے والا تھا۔ اللہ کی رضامندی کے لیے سمندر پار کا سفر کر رہا تھا۔ نہ انھیں کسی لالچ نے گھیرا تھا نہ کسی سے ان کی غرض اٹکی ہوئی تھی۔

سید صاحب نے قدم بڑھاتے وقت بتا دیا تھا کہ اب تمھارا ہر قدم اللہ کی راہ میں اٹھ رہا ہے۔ تم سب کا چلنا پھرنا، کھانا پینا، اللہ کی رضا کے لیے ہونا چاہیے۔ اور آپس میں سب کو ایسا رہنا چاہیے جیسا محبت کرنے والے بھائیوں کا گروہ ہوتا ہے۔ یہ

لوگ باغ میں جاتے، پکا ہوا کوئی پھل درخت کے نیچے
پڑا ہوتا تو اسے اٹھاتے، ایک ہوتا یا سو پھل ہوتے
کوئی چکھتا بھی نہ تھا۔ جوں کے توں سید صاحب کی
خدمت میں پیش کر دیتے اور پھر سید صاحب قافلہ والوں
کو حصہ برابر بانٹ دیتے۔

کلکتہ میں کم و بیش تین مہینہ قیام رہا کس کس
نے نذرانے پیش کیے اور کہاں کہاں دعوتیں ہوئیں
اس کے بتانے کا موقع نہیں ہے۔

ہاں ایک واقعہ اور سن لیجیے۔ جس سے یہ اندازہ
ہو جائے گا کہ جس زمانہ میں سید صاحب نے حج کا
سفر کیا ہے مسلمان نیک کاموں میں کیسی فراخ دلی
سے خرچ کرتے تھے۔ اور دینی کاموں سے انھیں
کتنی محبت تھی۔

شیخ امام بخش کی کوٹھی

کلکتہ کے تاجروں میں شیخ امام بخش بڑے
دولت مند تاجر تھے۔ سید صاحب کے مرید ہوئے
تو عرض کیا۔ حضرت ذرا میرے باغیچے میں تشریف
لے چلیے۔ باغیچے میں ایک شان دار کوٹھی تھی جس میں
سید صاحب کو لے گئے۔ کوٹھی کیا تھی نگار خانہ تھا
جھاڑ فانوس، اعلیٰ قسم کے فرش، غالیچے اور قالین
آئینے لگے ہوئے، جدھر نظر جاتی تھی، جی چاہتا تھا
کہ دیکھتے ہی رہیے، غرض کہ ایک سے بڑھ کر
ایک سامان تھا۔

شیخ امام بخش نے سید صاحب سے عرض
کی حضرت!! یہ کوٹھی بیگم نے بنوائی ہے اب
ان کی خوشی یہ ہے کہ حضرت اسے قبول فرمالیں۔

سید صاحب نے فرمایا۔ خدا تعالیٰ آپ کو
اور بیگم کو اس کا اجر عطا فرمائے گا۔ ہم نے آپ کی
نذر قبول کر لی۔ اب ہم اپنی طرف سے آپ کو دیتے ہیں۔
آپ کوٹھی میں رہیں، پھلیں پھولیں، ہم مسافر بھلا
کوٹھی کا کیا کریں گے۔

شیخ صاحب بولے، یہ کوٹھی آپ کی ہے
چاہے کسی کو کرایہ پر دے دیں یا اسے فروخت کر دیں
بیگم کی خوشی اسی میں ہے کہ یہ کوٹھی آپ ہی کے کام
آئے۔ رہیں یا کسی کو دیدیں۔

شیخ صاحب کے نوکر نے سید صاحب کے
ساتھیوں سے کہا۔ کوٹھی آپ کیوں چھوڑتے ہیں۔ پندرہ
سولہ ہزار میں بک جائے گی کرایہ پر دے دیں گے تو
سو روپیہ مہینہ سے کم پر نہ اٹھے گی۔

سید صاحب نے یہ بات سنی تو شیخ صاحب سے
فرمایا۔ ہم غریب مسافروں کو ہر دن نیا گھر اور نیا
سامان مل جاتا ہے۔ اصل چیز تو اخلاص اور نیت
ہے۔ نیت کا پھل خدا کے ہاں آپ کو جنت میں ملے گا۔
اور خدا چاہے گا تو اس سے بہتر کوٹھی ملے گی!!

سچ یہ ہے کہ جو اپنے تمام کام اللہ پر چھوڑ
دیتا ہے پھر اس کا کوئی کام رکتا نہیں ہے۔

کلکتہ میں ایک پیرزادہ بغداد سے آئے
تھے۔ ان کا نام بھی سید احمد تھا۔ انھوں نے جب سنا کہ
اتنا بڑا قافلہ ایک درویش حج کو لیے جا رہا ہے۔ تو
خود ملنے نہ آئے۔ ایک تحریر اس مضمون کی بھیج دی
کہ میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ سے
ملاقات ہو۔

سید صاحب پیرزادہ سے ملنے گئے تو باتوں

جناب فرحت قمر

اُڑن کھٹولے سے جیٹ جہاز تک

پرندوں کو ہوا میں اڑتے دیکھ کر ہمارا تمہارا بھی کا جی چاہتا ہے کہ ہوا میں اڑان کی جائے۔ اسی طرح کی خواہش پرانے زمانے کے لوگوں نے بھی کی ہوگی — آج تو ہم چاہیں تو اپنی یہ خواہش پوری کر سکتے ہیں — خود اڑ کے نہیں، ہوائی جہاز میں بیٹھ کر فضا کی بلندیوں میں تیر سکتے ہیں۔ لیکن پرانے زمانے کے انسان کی یہ خواہش محض خواہش ہی رہی۔

جب ہماری کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی تو ہم اس کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ اور اپنے جی سے کچھ فرضی باتیں گھڑ لیتے ہیں — اڑن کھٹولے، لکڑی کے اڑنے والے گھوڑے اور پریاں سب اسی اڑنے کی خواہش کی پیداوار تھیں۔ ورنہ دنیا میں نہ تو پریاں ہیں نہ اڑنے والے گھوڑے۔

قدیم یونان میں ایک شخص نے اولمپیا پہاڑ کی چوٹی سے کود کر اڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنے بازوؤں میں بڑے بڑے پنکھ لگا کر چھلانگ لگائی تھی اور اسی کوشش میں اپنی جان دینی پڑی تھی۔ سولھویں صدی میں لیونارڈو داونچی

L. DA VINCI نے جو ایک مصور بھی تھا اور سائنسداں بھی۔ بڑے بڑے ریشمی پنکھ اپنے ہاتھوں میں باندھنے کے بعد اونچائی سے چھلانگ لگائی تھی۔ وہ مرا تو نہیں تھا لیکن اس کا یہ خیال کہ انسان مصنوعی پر لگا کر اڑ سکتا ہے بس خیال ہی رہ گیا تھا۔ اس کو معلوم ہوگیا تھا کہ یہ پر لگا کر اڑنے والی بات بس ایک حماقت ہے۔ اس کے بعد کسی نے اس حماقت کو دہرانے کی کوشش نہیں کی۔

سولھویں صدی وہ زمانہ تھا۔ جب انسان بے کار کی باتیں چھوڑ کر سائنسی طریقہ پر سوچنے لگا تھا۔ اس زمانہ میں غو اور فکر کے بعد نئی نئی باتیں دریافت کی جا رہی تھیں۔ نئی نئی مشینیں ایجاد ہو رہی تھیں۔ اڑنے کے بارے میں بھی لوگوں نے کوئی ٹھیک طریقہ نکالنا چاہا۔

تم نے شادی بیاہ کے موقع پر دیکھا ہوگا کہ آتش با بانس کے ڈھانچہ پر کاغذ منڈھ کر ایک گنبد سا بناتے ہیں اور ک اس میں نیچے تیل میں بھیگے ہوئے کپڑے رکھ کر آگ لگا دیتے ہ آگ کے جلنے سے اس کاغذی ڈھانچہ میں گیس بھر جاتی ہے اور وہ اوپر اٹھنے لگتا ہے اور پھر اڑ کر جدھر کی ہوا ہو ادھ ہی چل دیتا ہے۔ جب تک آگ جلتی رہتی ہے اڑتا رہتا ہے۔

کی وجہ کیا ہے ؟ بات یہ ہے کہ گیس ہوا سے ہلکی ہوتی ہے۔
جو چیز بھی ہوا سے ہلکی ہوگی وہ اوپر کو اٹھے گی۔ تم ربر کے غبارلا
یس بھر کر کھیلنے کے لیے لیتے ہونا ؟ بس یہ گیس ہی ہے جو
ے یا اس ڈھانچہ کو اوپر اٹھا دیتی ہے۔

گیس کے اصول کو سمجھ کر لوگوں نے بڑے بڑے
رے بنائے اتنے بڑے کہ ان میں ایک ٹوکری لٹکا کر آرام
بیٹھ کر آدمی بھی ہوائی سیر کر لیتے تھے۔ اٹھارھویں اور
ریں صدی میں غباروں کا بننا ان میں اڑنے کا شوق،
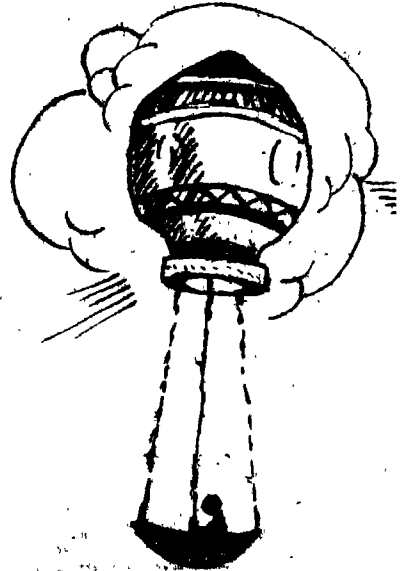
زں کے مقابلے یورپ میں زور و شور سے ہوتے رہے۔

۱۸۷۰ء میں جب پروشیا (جرمنی) نے فرانس کا محاصرہ کر لیا تو غباروں کے ذریعہ خطوط بھی بھیجے گئے۔

لیجے بیسویں صدی شروع ہو گئی۔ کئی سال گزر گئے۔ لیکن دنیا میں ایک بھی جہاز نہیں تھا۔ یہ بات کوئی پرانی نہیں — بس صرف پینسٹھ سال پہلے دنیا میں پہلا جہاز تیار ہوا۔ اور وہ بھی ایسا دیکھنے میں بھدا اور صرف بارہ سیکنڈ اڑنے کے بعد نیچے گر جانے والا۔ یہ ابتداء

تھی اس دور کی جو بڑی تیزی سے شروع ہوا۔ ساٹھ پینسٹھ سال کے مختصر سے عرصہ میں جتنی ترقی ہوائی جہازوں کے کام میں ہوئی ہے اتنی اور کسی میں نہیں ہوئی۔

اس صدی کے شروع میں دو بھائی رہتے تھے۔ ایک کا نام تھا ولبر رائٹ دوسرے کا آرویل رائٹ — ان کے باپ نے ان کو ایک ایسا کھلونا دیا جو ایک ربر کو بل دینے سے اوپر اٹھ جاتا تھا۔ اس میں ایک پرابلر PROPELLER لگا تھا۔ جو ربر کے بل اترنے سے چل پڑتا تھا۔ اسی کھلونے سے دونوں بھائیوں کو ایک اڑنے والی مشین بنانے کا شوق ہوا۔ کھلونے کی طرح ایک بڑا ماڈل بنایا لیکن وہ اڑ نہ سکا۔

پھر دونوں بھائیوں نے بڑی بڑی پتنگیں بنا کر ہوائی اڑان کے تجربے کئے۔ اس سلسلے میں آرویل اپنے شہر میں بہترین پتنگ ساز اور پتنگ باز مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد دونوں نے سائیکل اور موٹر کار کے پرزوں کو جوڑ توڑ کر پٹرول سے چلنے والا ایک انجن لگا کر اڑنے والی مشین تیار کر ہی لی گو اس سے پہلے کئی لوگوں نے اڑنے والی مشین بنانے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی کسی کو نہیں ہوئی تھی۔

غرض یہ فخر رائٹ بھائیوں کو حاصل ہوا کہ انھوں نے
۱۹۰۳ء میں دنیا میں پہلی بار ایک لوہے کی بڑی سی بھاری
مشین فضا میں بلند کرنے اور چلانے میں کامیابی حاصل کی
یورپ اور امریکہ میں ہوائی اڑان کے اعلان کو لوگوں
نے گپ سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اور جب واقعی امریکہ
میں رائٹ بھائیوں نے اڑان بھری تھی اور اس کی خبریں
اخباروں میں چھپی تھیں تو یورپ کے کئی اخباروں نے اپنے
نمائندے ہزاروں میل دور اس خبر کی تصدیق کے لیے امریکہ
بھیجے اور بہت سے لوگوں نے ہزاروں روپے کی شرطیں لگائیں
کہ اگر یہ خبر سچ ہوئی تو وہ یہ رقم ہار جائیں گے۔ مگر خبر سچ
نکلی اور یہ ہوائی جہازوں کی کہانی کی ابتدا تھی۔

اس اڑان کے بعد سب لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ہوا
میں اڑنے والی مشین ناممکن نہیں۔ یورپ اور امریکہ میں بہت
سے لوگوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۰۸ء میں دونوں
رائٹ برادرس یورپ آگئے۔ اور ہوائی جہاز بنانے کے کام
میں لگ گئے۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو ہوائی جہازوں
کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ ابھی تک جو جہاز بنے تھے ان
سے فوجی مشاہدے کا کام ہی لیا جاتا تھا۔ لیکن جب مختلف ملکوں
کی حکومتوں نے اس کام کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی
صرف پانچ سال کے عرصہ میں ہی ہوائی جہاز بنانے کا کام حیرت
انگیز طریقہ پر ترقی کر گیا۔ جنگ کے آخری سال میں (۱۹۱۸ء)
سپاہیوں کو لے جانے لانے، خوراک، ہتھیار اور ڈاک
لے جانے کے لیے جنگ میں حصہ لینے والے سبھی ملکوں نے ہوائی
جہاز استعمال کیے۔

جنگ ختم ہوئی تو ہوائی جہازوں کو سفر کے لیے استعمال کیا جانے لگا
پایا گیا۔ کچھ من چلوں نے ہوائی جہاز کو بھی اپنی مرضی
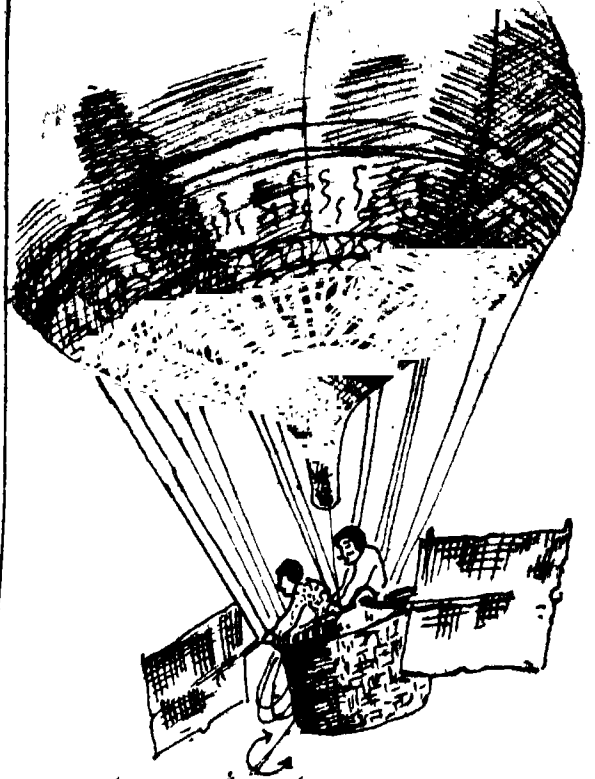
۱۸۹۶ء میں جرمنی کے ایک شخص نے ایک گلائیڈر بنا کر
اڑان کے تجربے میں جان ڈال دی تھی گلاسگو یونیورسٹی کے ایک
پروفیسر نے بھاپ سے چلنے والی ایک اڑن مشین بنانے کی
کوشش کی تھی۔ لیکن اڑن مشین بھلا بھاپ کی بھاری ٹنکی
اور بائلر کو کہاں کہاں اٹھائے پھرتی ـــــ ان حضرت کی جان
بھی ۱۸۹۹ء میں اسی سلسلے میں جا چکی تھی۔

اور ہمت کا مظاہرہ کرنے کا ذریعہ بنالیا ـــــ ۱۹۱۹ میں ایلکاک اور براؤن دو اشخاص نے بحر اٹلانٹک پار کر کے دنیا میں سنسنی پھیلا دی۔ ان دنوں جبکہ جہازوں کے گر پڑنے کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا اور معمولی طوفان بھی جہازوں کے لیے موت کا پیغام تھا۔ سمندر پر اڑان کرنا واقعی حیرت انگیز کام تھا۔ براؤن اور الکاک نیوفاؤنڈ لینڈ سے اڑ کر آئرلینڈ اترے تھے۔ اسی طرح برٹش چینل کو پار کرنے کے مقابلوں میں ۱۹۲۹ میں ایک فرانسیسی نے پہلی بار مقابلہ جیتا۔ ۱۹۲۷ء میں لنڈن برگ نامی امریکن نے اکیلے ہی اٹلانٹک کو پار کیا۔

اس وقت تک جہازوں میں موٹر کار کے انجن کچھ تبدیلیاں کر کے لگائے جاتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے جہازوں کی ضرورت بڑھتی جا رہی تھی۔ نئے نئے جہاز بنانے کی کوشش بھی جاری تھی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے" انگلینڈ کے فرینک وِٹھل نے ایک مضمون لکھا۔ جس میں اس نے گرم گیس سے جہاز کا پراپلر چلا کر جہاز کو اڑانے کا اصول سمجھایا۔ یہ جیٹ انجن کی ابتدا تھی۔ بہت سی ناکامیوں اور مشکلوں کے بعد ۱۹۳۷ میں ایک جیٹ انجن بنا ہی لیا گیا۔ لیکن ابھی اسے جہاز میں نہیں استعمال کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بادل منڈلا رہے تھے۔ انگلینڈ نے نئی قسم کے تیز رفتار جہازوں کی ضرورت کو محسوس کر کے وِٹھل کی بہت ہمت افزائی کی اور وِٹھل نے بھی دن رات ایک کر کے ۱۹۴۱ میں اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ پہلا ٹربوجیٹ ہوائی جہاز اڑا اور بڑی شان سے اڑا۔ وِٹھل کو نائٹ کا اعزاز اور ایک لاکھ پونڈ (تقریباً بیس لاکھ روپیہ) کا انعام ملا۔

آواز کی رفتار ۷۶۰ میل فی گھنٹہ ہے۔ اب جہاز بنانے والوں نے ایسا جہاز بنانے کی سوچی جو آواز سے بھی تیز اڑے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جیٹ جہاز اس رفتار سے اڑنے لگے تو پھٹ جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آواز کی رفتار سے تیز اڑنے والے جہاز بھی بنے۔ آج آواز سے دگنی آواز والے جہاز بھی بن چکے ہیں ـــــ لیکن ابھی صرف بمباری کے کام آ سکے ہیں۔ سواری کے نہیں ـــــ

ابھی تین چار ماہ قبل تم نے یہ خبر سنی ہوگی کہ پانچ سو مسافروں کو لے کر اڑنے والا ایک تیز رفتار جیٹ امریکہ نے بنا لیا ہے ـــــ وہ دن دور نہیں جب مسافروں کے جہاز بھی آٹھ نو سو مسافروں کو لے کر آواز سے کہیں تیز رفتار سے بحفاظت سفر کر سکیں گے۔

ایک زمانہ تھا کہ ہوا میں اڑنے کے لیے کوئی مشین بنانے کی بات مذاق سمجھی جاتی تھی اور آج وہ زمانہ ہے جب جہازوں کو بڑے سے بڑا اور زیادہ سے زیادہ آرام دہ، ساؤنڈ پروف، ایئرکنڈیشنڈ بنانے میں سائنس داں لگے ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں ۱۹۴۰ میں ہندوستان ایئر کرافٹ لمیٹڈ کے نام سے ہوائی جہاز بنانے کا کارخانہ بنگلور میں شروع کیا گیا۔ اٹھائیس سال کے عرصہ میں اس نے اتنی ترقی کر لی کہ اس میں ۲۴ ہزار آدمی کام کرنے لگے اور نئے نئے جہاز بنانے کے لیے الگ الگ سیکشن بنا دیے گئے۔ ۱۹۶۲ میں کانپور میں بھی لڑاکا جہاز (MIG) بنانے کا کام شروع ہو گیا۔ اس کے علاوہ ناسک میں بھی جہاز بنائے جانے لگے۔ ان تینوں مقامات کے جہاز سازی کے کام کو ملا کر ہندوستان ایروناٹک لمیٹڈ (HAL) کہا جاتا ہے جہازوں کے پرزے بنانے کا اور مرمت کا کام تو بہت سے مقامات

پر ہوتا ہے۔ بنگلور جہاز سازی کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ جہاں جنگ میں کام آنے والے بڑے جہاز HF-24 اور Kiran — HJT اور ہلکے جہاز نیٹ اور کینبرا بنتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہیلی کوپٹر بھی تیار ہوتے ہیں۔

مگ جہازوں کے بعد HF-24 بہت طاقتور جنگی جہاز ہے۔ اس کے پنکھوں کے نیچے ایک ایک ہزار پونڈ کے بموں کو لے جایا جا سکتا ہے۔ اس کی ناک میں ۳۰ ملی میٹر کی ایک توپ لگی ہوتی ہے جس سے دشمن پر گولے برسائے جاتے ہیں۔ نیٹ (GNAT) دوسرے جہاز ہیں جو ہلکے ہونے کے باوجود جنگ میں بڑی مستعدی اور تیزی سے کام کرتے ہیں۔

جہازوں کی تو بات ہی کیا ہے اب تو راکٹ بن چکے ہیں جو پچیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے فضائے بسیط یا خلا میں نکل جاتے ہیں۔ چاند تک پہنچ جاتے ہیں اور اب تو وہاں کا حال معلوم کر کے لوٹ بھی آتے ہیں۔

ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تھوڑے دنوں میں فوجی اور سفری دونوں قسم کے جہازوں میں حیرت انگیز ترقی ہوگی۔ دن بدن ہوائی سفر آرام دہ اور تیز تر ہوتا جائے گا اور دنیا کے فاصلے کم سے کم ہوتے جائیں گے۔ زمین کی طنابیں کھچ جائیں گی۔ اور دنیا بس ایک محلہ بن جائے گی۔

بقیہ مجاہدینِ آزادی

باتوں میں پیرزادہ صاحب نے کہا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے ساتھ سات آٹھ سو آدمیوں کا قافلہ حج کو جا رہا ہے۔ آخر ان کے کرایے کا کھانے کا پینے کا کیا انتظام ہے۔

سید صاحب نے مسکرا کر فرمایا: "آپ کو اس بات پر تو یقین ہوگا کہ اگر انگریزی حکومت چاہے تو سب کا انتظام منٹوں میں ہو سکتا ہے اور روپیہ کی ذرا بھی کمی نہیں ہو سکتی" اور جب انھوں نے "ہاں" کہا تو سید صاحب نے فرمایا میرا خدا جو دونوں جہان کا حاکم ہے اور جس کے سامنے انگریزی حکومت کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اپنے کرم و فضل سے سب کو منزل پر پہنچا دے گا۔ مجھے اس پر پورا یقین ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے خدا کے خزانے بے شمار ہیں۔

پھر دیکھ لیجیے کہ سات آٹھ سو آدمی سب ہی جہازوں میں سوار ہوئے مکہ معظمہ گئے۔

مدینہ منورہ پہنچے پھر واپس ہندوستان آئے اور جب تک ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے گھر نہ پہنچ گیا سید صاحب ہی کے ذمہ ان کے کرایہ کا کھانے پینے کا خرچ رہا۔ اور سید صاحب جب رائے بریلی پہنچے اور حساب لگایا تیس ہزار اکاون روپیہ خرچ میں آیا تھا۔ اور جو کچھ مصارف خیر مسجدوں کی تعمیر کنووں کے بنوانے کسی کی لڑکی کی شادی میں مدد دینے وغیرہ کے لیے رقم خرچ ہوئی تھی۔ دس ہزار اس کی میزان تھی۔ سامان کی خریداری الگ ہوئی۔

معہ سامان کی خریداری وغیرہ آخری میزان ایک لاکھ کی تھی اور جب بیت المال کا جائزہ لیا گیا تو دس ہزار کی رقم موجود تھی دو سال دس مہینے میں یہ سفر پورا ہوا۔

رحاب قیصر سہروسے (ڈیکوماسٹن آرٹس)

اس سے پہلے آپ نے "جانوروں میں شکار کے طریقے" پڑھا تھا۔ آج میں آپ کو "جانوروں میں حفاظت کے طریقے" بتاؤں گا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ایک "گھریلو چڑیا" کئی سو کیڑے پورے موسم میں اپنے بچوں کے لیے فراہم کرتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ پھر یہ کیڑے اپنی حفاظت کس طرح کرتے ہوں گے؟ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض کیڑے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے خاص ہتھیار رکھتے ہیں۔ اپنے دشمن سے یہ آنکھ مچولی بھی کھیلتے ہیں جو بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ آپ نے کبھی گھاس کے ٹڈے کو پکڑنے کی کوشش تو

کی ہوگی۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ وہ اچھلتا ہے اور پھر نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ اگر اس کا رنگ ہرے کے بجائے کوئی اور ہوتا تو آپ اسے بآسانی دیکھ سکتے تھے۔ یہ بھی قدرت کا ایک انتظام ہے۔ وہ اسی طرح اپنی مخلوق کی حفاظت کرتی ہے۔

جو تتلیاں پودوں کے پتوں سے ملتی جلتی ہیں ان پتہ تتلی LEAF BUTTERFLY سب سے حیرت ناک

ہوتی ہے۔ اس کے خوبصورت گلابی مایل اودے اور نارنجی بازو اسی وقت نظر آتے ہیں جب وہ اُڑتی ہے۔ بیٹھی رہے تو آپ اسے پتہ ہی سمجھیں گے۔

کیوں کہ بیٹھی ہوئی تتلی بھورے پتے کے مانند نظر آتی ہے۔

ان کیڑوں میں STICK INSECT بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا پتلا اور لانبا جسم بالکل بنا پتوں کی ٹہنی سے اس قدر ملتا جلتا ہوتا ہے کہ جب وہ یکایک حرکت میں آتا ہے تو ہم یہ خیال کرکے حیران رہ جاتے ہیں کہ پودے کا کوئی ایک حصہ حرکت کر رہا ہے۔ وہ اپنے پروں کو کچھ اس طرح سمیٹ لیتا ہے جیسے اس کے پر ہیں ہی نہیں۔
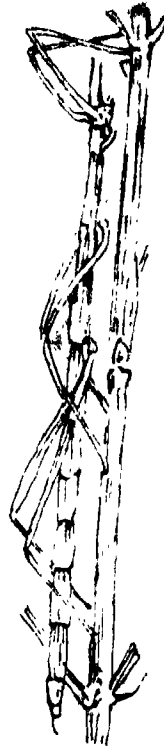
پتوں کے کیڑوں میں PREYING MANTIS بھی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ اس کے بازو اور پیر تعجب خیز طور پر پتوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اور یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ پتہ کون سا ہے اور کیڑا کون سا۔

آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ یہ آنکھ مچولی صرف کیڑوں میں ہوتی ہے اور بڑے جانور اس قسم کی آنکھ مچولی سے محروم ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ کیوں کہ بڑے بڑے جانور بھی اس قسم کی آنکھ مچولی سے محفوظ بھی رہتے ہیں اور شکار بھی کرتے ہیں۔ زیبرا اور زراف مغربی افریقہ

کے کھلے علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان دونوں کے رنگ اور گہری پٹیاں اور دھبے بالکل درختوں کا سایہ اور ان سے چھننے والی روشنی کی طرح ہوتے ہیں۔ خاص طور پر چاندنی راتوں میں درختوں کے اندر سے جو چاندنی چھنتی ہے اور جو سایہ پڑتا ہے یہ بالکل اسی سے مل جاتے ہیں۔ جس سے ان کی موجودگی کا پتہ چلنا مشکل ہوجاتا ہے اور یہی حال شیر کا بھی ہے۔ قطبی ریچھ اپنے برف کی طرح سفید

بالوں کی وجہ سے برفانی علاقوں میں مشکل ہی سے نمایاں ہوتے ہیں۔ بہت سرد ممالک میں پرندوں کے پر بھی سفید نکل آتے ہیں جس کی وجہ سے وہ برفیلے مقامات پر نمایاں نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ ان ممالک کے دوسرے جانوروں کے رنگ بھی موسم کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں ۔

دنیا کا سب سے اونچا جانور گردن کے لحاظ سے، زراف ہے جس کی شوخ نارنجی رنگ کی کھال پر کالے یا سیاہی مائل گول یا دھبے پڑے ہوتے ہیں۔ وہ درختوں میں ایسا مل جاتا ہے کہ باربردار (سامان اٹھانے والے)، تک جو وہیں کے رہنے والے ہوتے ہیں دھوکا کھا جاتے ہیں اور زراف کو دیکھ کر درخت اور درخت کو دیکھ کر زراف بتلانے لگتے ہیں۔ ذرا صحرائے عرب پر ایک نگاہ دوڑائیے تو جس چیز سے آپ دفعتاً متاثر ہوں گے وہ مخلوقات کے رنگ کی حیرت انگیز ہم طرحی (یکسانیت) ہوگی۔ صحرائی علاقے کے ساتھ نباتی حیوانی بلکہ انسانی مخلوقات تک غیر مستقل ریت کے زردی مائل باریک ذروں کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ جن سے آفتاب کی چمکتی ہوئی شعاع میں آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔ غزال عربی ہرن کی ایک قسم، جو صحرائی بگولوں کے ساتھ اڑتا پھرتا ہے، اس کی گہری زعفرانی جلد زمین کے رنگ سے اتنی ملتی جلتی ہے کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہی حال "صحرائی جہاز" یعنی اونٹ اور اس کے کلغی دار بھائی "شتر مرغ" کا ہے۔

جانوروں کے یہ مختلف رنگ نہ صرف ان کی کشش اور حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی حفاظت کا بھی پورا پورا انتظام کرتے ہیں۔

محترمہ مشیدہ پروین برنی متعلمہ ثانوی سوم

کیا آپ جانتے ہیں کہ...؟

دنیا میں سب سے زیادہ بارش چراپونجی (آسام) میں ہوتی ہے
دنیا کا سب سے اونچا ملک تبت ہے۔
دنیا کی سب سے لمبی دیوار دیوارِ چین ہے۔
دنیا کی سب سے گرم جگہ جیکب آباد ہے۔
دنیا میں سب سے زیادہ کھجور بصرہ (عراق) میں پیدا ہوتی ہے۔
دنیا کا سب سے پہلا خلائی مسافر یوری گگارن ہے۔
دنیا کی سب سے زیادہ سخت چیز ہیرا ہے۔
دنیا کی سب سے زیادہ بڑی مذہبی یونیورسٹی جامعۃ الازہر قاہرہ میں ہے۔
دنیا کا سب سے گہرا کنواں فرانس میں ہے جس کی گہرائی ساڑھے تین ہزار فٹ ۳۵۰۰ ہے۔
دنیا کا سب سے بڑا شہر ٹوکیو (جاپان) میں واقع ہے۔
دنیا کا سب سے بڑا گھنٹہ ماسکو میں ہے جس کا وزن ۲۰۰ ٹن ہے
دنیا کا سب سے بڑا سینما ہال نیویارک میں ہے جس میں چھ ہزار (۶۰۰۰) آدمی بیٹھ کر فلم دیکھ سکتے ہیں۔

جناب پروفیسر امانت - پونا

چوراہا

یہ چوراہا تو بچو آ کے دیکھو!
کنول دِل کا تمھارے کِھل اٹھے گا

یہاں پر چار ہی مِل راستے ہیں
گلے اک دوسرے سے مل رہے ہیں
چلی آتی ہیں چمکیلی سی کاریں
لٹاتی چار سو رنگیں بہاریں
بسیں بھی شور کرتی آ رہی ہیں
سبھی منزل کو اپنی جا رہی ہیں
چلے آتے ہیں اِکے، تانگے، رکشا
قیامت کا سا ہنگامہ ہے برپا
کہاں سے لوگ اِتنے آ رہے ہیں

اِدھر سے یہ کدھر کو جا رہے ہیں
کھڑا ہے بیچ میں اک آدمی جو
ٹرافک کا سپاہی ہے یہ بچو!
دکھا کر ہاتھ سب کو روکتا ہے
غلط چلنے پہ فوراً ٹوکتا ہے!
دکانوں پر لگی ہے بھیڑ کتنی!
کسی میلے سے ہرگز کم نہ ہوگی
ہے اب فٹ پاتھ پر بھی چلنا دشوار
وہاں پر پھیری والوں کی ہے بھرمار
یہ نظارہ امانت دل کو بھایا
یہاں مصروف ہے اپنا پرایا
یہ چوراہا تو بچو آ کے دیکھو
کنول دِل کا تمھارے کِھل اٹھے گا

جناب مناظر عاشق ہرگانوی

بندر اور شیر

(بہار کی ایک لوک کہانی)

ایک آدمی تھا۔ وہ جنگل میں لکڑیاں کاٹ کاٹ کر اور کبھی کبھی پتوں کی چھتری بنا کر گزر بسر کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک بندر بھی تھا۔ اسے وہ اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا۔

ایک دن وہ بندر کو لے کر جنگل میں لکڑی کاٹنے گیا۔ ابھی وہ لکڑی کاٹ رہا تھا کہ بندر نے ایک شیر کو آتے دیکھا اور اس سے چھپ جانے کو کہا اور خود کلہاڑی پکڑ کر لکڑی کاٹنے لگا۔ اتنے میں شیر آپہنچا۔ بندر کو لکڑی کاٹتے دیکھ کر اس نے ہنس کر کہا "ارے بندر میاں کیا تم سے بھی لکڑی کٹ جائے گی؟"

شیر کے لہجے میں حقارت تھی۔ بندر نے اسے محسوس کیا۔ اسے غصہ بھی بہت آیا۔ مگر شیر اس سے طاقتور تھا۔ اس نے شیر سے کہا "ذرا نزدیک آکر دیکھو مجھ سے لکڑی کٹتی ہے یا نہیں۔"

شیر بندر کے پاس گیا۔ بندر نے کلہاڑی اٹھا کر لکڑی پر تو ماری نہیں شیر کی پیٹھ پر رسید کر دی اور اچھل کر نزدیک کے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ شیر کو بہت غصہ آیا مگر وہ بندر کا کچھ نہ کر سکا۔ پھر بھی اس نے تہیہ کر لیا کہ کسی دن اس بندر سے بدلہ ضرور لے گا۔

ایک دن وہ آدمی پھر جنگل گیا اور پتیاں توڑ کر جمع کرنے لگا۔ اس کا ساتھی بندر ایک درخت پر چڑھ کر ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد آدمی پتوں سے چھتری بنانے لگا۔ ابھی وہ ایک ہی چھتری بنا پایا تھا کہ بندر درخت پر سے کود پڑا۔ اس نے پھر اسی شیر کو اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ اپنے مالک سے چھپ جانے کو کہا اور خود اس چھتری کے بیچوں بیچ ایک رسی باندھ اس کا ایک سرا درخت کی ڈال سے باندھ دیا اور اس کے نچلے سرے کو پکڑ کر خود اس پر لٹک گیا۔

اتنے میں شیر اسی جگہ آپہنچا۔ بندر کو اس طرح لٹکا دیکھ کر اسے بڑا تعجب ہوا۔ اس نے بندر سے پوچھا "بھائی یہ کیا کر رہے ہو؟"

بندر نے کہا "کیا تم کو معلوم نہیں کہ آج آسمان سے آگ برسے گی اور زمین جل جائے گی؟ میں نے اسی لیے آسمان اور زمین کے بیچ پناہ لی ہے۔ میں نے یہ چھتری بنائی ہے۔ اس سے آگ سے میری حفاظت ہوگی۔"

شیر گھبرا کر بولا "بھائی میں بالکل بے خبر ہوں مہربانی کر کے میرے لیے بھی ایک ایسی ہی چھتری بنا دو اور مجھے مرنے سے بچا لو۔"

بندر نے کہا "اچھی بات ہے میں اپنی یہ چھتری تمہیں دیے دیتا ہوں۔ اپنے لیے دوسری بنا لوں گا۔"

[illegible] اس چھتری کو باندھ کر رسی کا [illegible] سرا ایک درخت کی [illegible] ڈال سے باندھ [illegible]

اور نیچے کی طرف اس نے شیر سے لٹکنے کے لیے کہا۔ شیر کے لٹک جانے پر بندر نے رسی کو اس کے گلے میں خوب اچھی طرح لپیٹ کر مضبوطی سے باندھ دیا۔

پھر اس نے شیر کے نیچے زمین پر لکڑی جمع کر کے اس میں آگ لگا دی اور خود درخت پر چڑھ کر تماشہ دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر میں لکڑی سے آگ کی لپٹیں اٹھنے لگیں تو بندر درخت پر بیٹھا بیٹھا جھوٹ موٹ چلانے لگا "باپ رے باپ، اتنی گرمی! وہ دیکھو آگ برس رہی ہے۔ باپ رے! میرے کان پر آنچ لگ گئی! بچاؤ!"

بندر کی چیخ پکار سن کر شیر نے سمجھا کہ سچ مچ آگ برسنی شروع ہو گئی ہے۔ ویسے اسے بھی آنچ معلوم ہو رہی تھی مگر وہ چپ چاپ تھا کیوں کہ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ بندر سے اچھی حالت میں ضرور ہے۔

تھوڑی دیر بعد آگ اور تیزی سے دہکنے لگی۔ شیر کی قوتِ برداشت اب جواب دینے لگی تھی۔ دُم، پیر، بال سب جلنے لگے تھے۔ اس نے چلا کر کہا "بھائی بندر مجھے بچاؤ! میں مرا جا رہا ہوں!"

شیر کی آواز سن کر بندر اور زور زور سے چلانے لگا "باپ رے باپ! اتنی تکلیف، میری تو جان نکلی جا رہی ہے بچاؤ!"

اب آگ بہت ہی بھیانک شکل اختیار کر چکی تھی۔

کچھ دیر بعد رسی جس پر شیر لٹکا ہوا تھا، جل کر ٹوٹ گئی اور شیر آگ میں گر پڑا۔ اس کا سارا جسم جھلس گیا تھا اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو آگ سے نکالا۔

آگ سے نکل کر شیر ادھر ادھر بندر کو دیکھنے لگا۔ سامنے ہی ایک درخت کی ڈال پر بندر بیٹھا ہوا کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ شیر کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ بندر کے اس سلوک پر اسے بڑا تاؤ آیا۔ مگر وہ اس وقت بندر کا کر ہی کیا سکتا تھا۔

اسی غصے کے عالم میں شیر جنگل کے سبھی جانوروں کو اکٹھا کرنے لگا۔

اس درمیان چپکے سے وہ آدمی اور بندر جنگل سے نکل گئے۔

ادھر جنگل میں جانوروں کا ایک جلسہ ہوا۔ ایک بوڑھا شیر صدر ہوا۔ صدر نے پہلے شیر سے اظہارِ حال کے لیے کہا۔ جب شیر سارا حال سنا چکا تو اس نے بندروں سے دریافت حال کیا۔ مگر سبھی بندر بے خبر تھے۔ انھیں یہ تک معلوم نہیں تھا کہ ان کی برادری کے کس بدمعاش نے ایسی حرکت کی ہے اس لیے وہ سب خاموش رہے۔ ان کی خاموشی پر انھیں قصوروار ٹھہراتے ہوئے صدر نے کہا "چونکہ آپ کی برادری میں سے ہی ایک نے ایسا برا کام کیا ہے اس لیے آپ سبھوں کو صرف اتنی سزا دی جاتی ہے کہ ہر سال کے آنے اور جانے پر ہم ایک ایک بندر کھایا کریں گے۔ اس طرح آپ کو سبق ملتا رہے گا۔

سبھی بندر بہت پریشان ہوئے۔ نہ جانے کب کس کی باری آ جائے۔ اس لیے انھوں نے بہت التجا کی کہ انھیں معاف کر دیا جائے — مگر شیر نے ایک نہ سنی — پھر ان سبھوں نے کہا کہ سزا میں کچھ اور تخفیف کی جائے اور سال میں صرف ایک بار ایک بندر کو کھایا جائے

شیر نے اسے مان لیا اور تب سے سال میں ایک ہی بندر شیر کھایا کرتا ہے۔

جواب: دائرہ نمبر ۲ سب سے بڑا ہے اور نمبر ۱ سب سے چھوٹا

جناب محمد ابراہیم فکری

ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنا

ٹکٹ جمع کرنے کا شوق یا مشغلہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ سالہا سال سے دنیا کے لاکھوں شوقین، کیا بچے، کیا بڑے اس شغل کو اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ شغل معلومات بڑھانے کا بھی ایک اچھا ذریعہ ہے۔ اس میں بڑی کشش بھی ہے۔ ڈاک ٹکٹ کاغذ کے چھوٹے بڑے چوکور ٹکڑے سے ہوتے ہیں لیکن ان ٹکڑوں میں جادو کا سا اثر بھرا ہے کہ آدمی اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب میں ایک مرتبہ نئی دلی کے ڈاک خانے گیا۔ اتفاق سے اس دن ہندستان میں ایک لاکھواں ڈاکخانہ کھلنے کے سلسلے میں ایک نیا ٹکٹ جاری ہونے والا تھا۔

یہ نیا ڈاکخانہ بہار کے ایک گاؤں میں کھولا جا رہا تھا اور اس طرح ہمارے ڈاک خانوں کی تعداد ایک لاکھ کے نشانے تک جا پہنچی تھی۔

اس ٹکٹ کی قیمت ۲۰ پیسے تھی۔ میں نے بھی یہ ٹکٹ خریدا۔ اس پر ایک لیٹر بکس کی تصویر اور اس کے ساتھ ایک لاکھ کا ہندسہ لکھا ہوا تھا۔ ٹکٹ خریدنے کے بعد میں نے اس ٹکٹ سے متعلق ایک دو ورقی کتابچہ بھی خریدا کتابچے میں جاری ہونے والے ٹکٹ سے متعلق معلومات درج تھیں۔ ٹکٹ خریدنے والے ایک کے اوپر ایک ٹوٹے پڑتے تھے۔

ہمارے دیس کے پھیلاؤ اور آبادی کو دیکھتے ہوئے ایک لاکھ ڈاک خانے کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی بہت سے دیہات ڈاک خانے کی سہولت سے محروم ہیں۔ پھر بھی ان ڈاکخانوں کے ذریعے ہزاروں لاکھوں پارسل، منی آرڈر اور معلوم نہیں کتنے خط ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آتے جاتے رہتے ہیں۔

جب ڈاکخانے کی آسانی نہیں تھی تو لوگوں کے لیے کہیں خط بھیجنا بڑا مشکل تھا۔ بادشاہوں اور شہنشاہوں کے خط یا فرمان تو ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے ہرکاروں کے ذریعے آتے جاتے تھے۔ مگر ایک عام آدمی کے لیے خط کا بھیجنا بڑا مشکل تھا۔

ایک ہندوستان ہی نہیں باہر کے ملکوں کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ وہاں کے لوگوں کو بھی ڈاک کی آسانیاں حاصل نہ تھیں۔ کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے انگلستان میں کسی دوسری جگہ خط بھیجنے کا طریقہ یہ تھا کہ سرائے میں ڈاک کا ایک تھیلا رکھا

ہوتا تھا۔ لوگ اپنے خط سرائے کے ان ڈاکیوں کو دے دیتے تھے۔ جب سارے خط اس کے پاس اکٹھا ہو جاتے تو ایک ڈاکیہ ان خطوں کو لے جاتا۔ اور جن جن کے یہ خط ان کے گھر پر دے آتا۔ اس خدمت کے بدلے وہ ان سے کچھ معاوضہ بھی لیتا اور اسی سے اپنی روزی کماتا تھا۔

اس معاوضے کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ جو جی میں آیا وصول کیا اور اگر معاوضہ دینے میں کسی نے آناکانی کی تو خط دینے سے انکار کر دیا۔ یہ انتظام سرکاری انتظام تو تھا نہیں اس لیے لوگوں کو بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑتی تھیں۔

انگلستان کے پوسٹ ماسٹر رولینڈ ہل کو اس بات سے بڑی پریشانی تھی۔ وہ اس کی اصلاح اور درستی کے سلسلے میں بڑے فکر مند رہتے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں پوسٹ ماسٹر ہل ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے انھوں نے دیکھا کہ گھر میں کام کاج کرنے والی ماما کو ایک لفافہ ڈاکیہ نے دیا۔ اس نے اس لفافے کو ادھر ادھر چاروں طرف سے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر ڈاکیہ کو واپس کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں اس خط کے پہنچانے کا معاوضہ ادا نہیں کر سکتی۔ یہ میرے لیے بہت زیادہ ہے۔

پوسٹ ماسٹر نے پوچھا جب خط کو پہنچانے کی فیس ادا کرنا تمھارے لیے مشکل تھا تو اس کو ادھر ادھر سے الٹ پلٹ کر اتنی دیر تک دیکھنے کی تمھیں کیا ضرورت تھی؟

اس نے جواب دیا ”میں نے اور میرے خاندان کے لوگوں نے کچھ خفیہ نشان اور اشارے مقرر کر لیے ہیں یہ لفافے کے اوپر بنا دیے جاتے ہیں اور ہم سمجھ لیتے ہیں کہ خط کا کیا مضمون تھا۔ ہمیں اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ہم ڈاک کی فیس ادا کرنے سے بچ جاتے ہیں۔“

اب پوسٹ ماسٹر ہل کو بہت فکر ہوئی اور وہ اس خرابی کو دور کرنے کی ترکیب سوچنے لگے۔ انھوں نے اب کیا یہ کہ ڈاک فیس [illegible] یہ بھی طے کر دیا کہ ڈاک میں خط بھیجنے والا ہی [illegible]۔ ڈاکٹر ہل کی اس تجویز کو حکومت نے اور جنتا [illegible] پسند کیا۔

ڈاکٹر ہل نے ایک [illegible] کی جو لفافے پر چپکا دی جاتی تھی۔ یہ پہلا ڈاک ٹکٹ تھا جو ڈاکٹر ہل کی کوشش سے وجود میں آیا۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر ہل کی تجویز کو دوسرے ملکوں نے بھی اپنا لیا۔

ان دنوں ہندوستان انگریزی حکومت کے ماتحت تھا۔ انگریزوں نے انگلستان کی طرح یہاں بھی ڈاک کے طریقے کو رواج دیا۔ ہندوستان میں سب سے پہلا ڈاک ٹکٹ جو آدھ آنے کا نیلے رنگ کا تھا ۱۸۵۴ء میں جاری ہوا۔ اس ٹکٹ پر ملکہ کی تصویر بنی تھی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ بڑے داموں کے ٹکٹ جاری ہوئے جن پر انگلستان کے بادشاہوں کی تصویر بنی ہوتی تھی اور انگریزی میں انڈیا اور ٹکٹ کے دام لکھے ہوتے تھے۔

انگریزوں کے زمانے میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے بھی اپنے اپنے ڈاک ٹکٹ تھے جن پر ریاست کا نام اور ٹکٹ کی قیمت اردو یا ہندی میں چھپی ہوتی تھی۔

ہندوستان آزاد ہوا تو اس نے ڈاک کے ٹکٹوں کی طرف خاص طور سے دھیان دیا اور ۲۰ سال کے عرصہ میں ہندوستان کے محکمہ ڈاک نے تین سو سے بھی اوپر ڈاک ٹکٹ جاری کیے۔ یہ سارے ٹکٹ بہت اچھے اور

خوبصورت ہیں جو ہندوستان کی ترقی خوشحالی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتے ہیں۔

ٹکٹوں کا جمع کرنا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہم اپنے دیس میں جاری کیے گئے ٹکٹوں کو تو آسانی سے جمع کرسکتے ہیں۔ نئے جاری ہونے والے ٹکٹوں سے متعلق معلومات اور اعلان محکمۂ ڈاک اخباروں میں شایع کرتا رہتا ہے کہ کس قسم کا ٹکٹ کس تاریخ میں جاری ہونے والا ہے۔

نیا ٹکٹ جب جاری ہوتا ہے تو شروع میں یہ ہندوستان کے بڑے بڑے ڈاکخانوں میں بکتا ہے اور ٹکٹ خریدنے والوں کی ایک لمبی لائن لگی ہوتی ہے۔

ڈاک خانے والے اس موقعے پر نئے ڈاک ٹکٹ سے متعلق ایک دو ورقی معلوماتی کتابچہ بھی شایع کرتے ہیں اس کی قیمت دس پیسے ہوتی ہے۔ اس میں آپ کو نئے ٹکٹ سے متعلق سب معلومات ملیں گی کہ یہ ٹکٹ کیوں جاری ہوا وغیرہ وغیرہ۔ ہر ٹکٹ جمع کرنے والے کو یہ دو ورقی کتابچہ ضرور خریدنا چاہیے تاکہ اس ٹکٹ سے متعلق ضروری معلومات حاصل ہو سکے۔

اسی دن فسٹ ڈے کور (لفافہ) بھی ڈاکخانہ جاری کرتا ہے۔ اس کی قیمت بھی دس پیسے ہوتی ہے جس پر اس دن کی ڈاک کی مہر لگی ہوتی ہے۔

جن ڈاکخانوں میں یہ ٹکٹ بکتے ہیں وہاں ٹکٹ جمع کرنے کے شوقین لوگ بھی کافی تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں اور ٹکٹوں کا بازار سا لگ جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے بازار میں ٹکٹوں کی خرید و فروخت، ٹکٹوں کے بدلنے کا کاروبار بہت عمدہ طریقے سے ہوتا ہے۔

ٹکٹ جمع کرنا تو بڑا آسان ہے لیکن اس کو ٹھیک ڈھنگ سے رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ ٹکٹ رکھنے کے لیے بازار میں ہر طرح کے البم ملتے ہیں۔ آپ ان ٹکٹوں کو ان البموں پر بخوبی سجا سکتے ہیں۔ جب آپ اپنا ٹکٹ البم پر لگائیں تو اس بات کا دھیان رہے کہ آپ کے ہاتھ اور انگلیاں صاف ستھری ہوں نہیں تو آپ کا ٹکٹ گندہ ہو جائے گا۔ ٹکٹوں کو البم پر گوند سے نہ چپکائیے۔ چپکانے سے ٹکٹ خراب ہو جاتے ہیں اور ایک البم سے دوسرے البم پر چپکانا ہو تو پھٹ جاتے ہیں۔ اور آپ کی ٹکٹوں کی جمع کی ہوئی پونجی کا نقصان ہو جاتا ہے۔ ان ٹکٹوں کو فوٹو کارنر کے ذریعے البم پر لگائیے۔

اگر آپ کسی ڈاک ٹکٹ کو لفافے سے چھڑائیں تو اس بات کا دھیان رکھیں کہ ٹکٹ کے کنارے خراب نہ ہوں اور ٹکٹ کا رنگ نہ بگڑنے پائے۔

آپ ٹکٹ جمع کرنے کے سلسلے میں تھوڑا سا وقت اور کچھ معمولی سی رقم خرچ کر کے ٹکٹوں کا ایک بڑا خزانہ اکٹھا کر سکتے ہیں۔ اس درمیان میں کوئی کمیاب اور نایاب ٹکٹ آپ کے ہاتھ لگ جائے تو آپ کی قسمت بھی کھل سکتی ہے۔

ہندوستان میں جاری کیے گئے مہاتما گاندھی جی کے دس روپے والے ٹکٹ کی قیمت پانچ سو پاؤنڈ ہے!

اس ٹکٹ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انگریزی لفظ انڈین اور پوسٹیج کے درمیان میں ایک نقطہ آگیا ہے اور صرف اس نقطہ کی وجہ سے اس کی قیمت اس قدر بڑھ گئی ہے۔

ٹکٹ جمع کر کے آپ اگر چاہیں تو دولت بھی کما سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو ٹکٹوں سے متعلق

جناب خاور جبل پوری

دُلہن ناچتی ہے

ہر ملک قوم اور طبقے کے رسم و رواج ہوتے ہیں۔ ایک انگریز سیاح" ولیم فاکنر" نے اپنے سفرنامے میں سوڈانیوں کی شادی کا دل چسپ آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے جن سے وہاں کے رہن سہن تہذیب اور تمدن پر روشنی پڑتی ہے۔ آیئے فاکنر کی زبانی آپ کو یہ دل چسپ حال سنائیں۔

ولیم فاکنر لکھتا ہے ٹھیک اس وقت جب میں سوڈان کے ایک غیر مہذب علاقے میں پہنچا۔ نو بجے کا وقت تھا۔ جس خاص پروگرام کو دیکھنے کے لیے ہم لوگ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ گئے تھے وہ عنقریب شروع ہونے والا تھا۔ سات دن تک مسلسل جاری رہنے والی تقریب کا یہ خاص دن تھا اور اسی روز" رقص عروس" (دلہن کا ناچ) ہونے والا تھا۔

منڈپ کے دروازے پر دو نوجوان مہمانوں کی آؤ بھگت کے لیے موجود تھے۔ ان کے قریب ہو کر ہم آگے بڑھے اور جہاں سوڈانی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اُدھر سے ہوتے ہوئے ہم دوسری طرف نکل گئے۔

یہاں صفا چٹ میدان تھا۔ ہریالی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ نہ پیڑ نہ رنگ برنگے پھول نہ لہلہاتی ہوئی سبز گھاس۔ چاروں طرف ریت ہی ریت اور ریت کے ڈھیر پر بنائی ہوئی مٹی کی دیواریں۔ البتہ روشنی کا معقول انتظام تھا۔ اور جگمگاتی ہوئی روشنی میں صاف ستھرے لباس پہنے ہوئے عورتوں کا غول۔

کم و بیش تیس یا چالیس نوجوان عورتیں تھیں جو آپس میں بڑے پیار اور محبت سے باتیں کرتے کرتے اتنے زور سے قہقہہ لگاتی تھیں کہ ساری فضا گونج اٹھتی۔ ان کے آس پاس کچھ بوڑھی عورتیں بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ بچے اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔

اس تقریب میں کچھ نیگرو اور کچھ عرب شامل تھے ان کے کالے چمکیلے بال باریک جالیوں میں گندھے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان لوگوں نے گوٹے لچکے کی خوب صورت ٹوپیاں اپنے سروں پر لگا لی ہیں۔ نیگرو اور عربوں کے علاوہ دوسرے ملکوں کے بھی کچھ لوگ موجود تھے اس لیے وہاں طرح طرح کے لباس دیکھنے میں آئے اور مشرقی اور مغربی تہذیب کا یہ انوکھا سنگم بڑا پُر لطف معلوم ہوا۔ ایک کالی لڑکی نے جو ڈاکٹر تھی سنہری پوشاک پہن لی تھی۔ پیروں میں اونچی ایڑی کے جوتے تھے۔ پھدک پھدک کر چل رہی تھی۔ دوسری عورتیں ململ کے کالے برقعے اوڑھے تھیں۔

وہاں کے لوگوں نے ہماری شرکت پر خوشی کا اظہار کیا اور ہمارے بیٹھنے کے لیے فوراً ہی آرام کرسیاں بچھا دی گئیں۔

دوسرے مہمانوں نے ہم سے بڑی محبت کے ساتھ

انگریزی میں باتیں کیں اور وہاں کے رسم و رواج تفصیل کے ساتھ سمجھائے۔ اور ہمارے دل بہلانے میں کافی دلچسپی لی۔

کچھ عورتوں نے اپنے ہونٹ نیل سے گدوائے تھے اور زیادہ عورتوں کے گالوں پر ان کے قبیلے کے امتیازی نشان بنے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنی ناکوں میں چھلے (غالباً نتھ) پہن رکھے تھے۔ ایک چھوٹا نقارہ لگاتار بج رہا تھا اور ہماری دلچسپی کے لیے ایک لڑکی ناچ کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

اس نے اپنے جسم سے لپٹی ہوئی ململ کی چادر کھول کر علاحدہ کر دی اور ناچنے کے لیے مقرر کی ہوئی جگہ پر آگئی۔ وہ ایک خوبصورت فراک پہنے ہوئے تھی نقارہ تیزی سے بجنے لگا۔ ناچنے والی لڑکی نے اپنے پاؤں کو حرکت دی۔ دونوں پاؤں ملا کر جسم کو جھکا لیا اور ہاتھ پیٹھ کی طرف لے جا کر سر پیچھے موڑ کر ناچنا شروع کر دیا۔

نقارہ کی تیزی کے ساتھ ہی لڑکی کے ناچنے کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا ناچ اتنا دلچسپ اور دلکش تھا کہ ہم لوگوں نے بے اختیار زور سے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ اس نے ناچتے ناچتے اپنے کاندھوں کو جھٹکا دیا، یک طرف مڑ گئی اور اس کے لمبے بال کھل کر ہوا کے ساتھ ہرانے لگے۔ وہ جتنی تیزی سے ناچتی تھی بکھرے ہوئے بال اتنے ہی زیادہ لہراتے تھے یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ ہمارے سروں سے ٹکرا جاتے۔

چاروں طرف تالیوں اور خوشی کے نعروں کی آواز گونج اٹھی۔ پھر اس نے کھلے ہوئے بالوں کا جال بنا کر ایک جوان کے سر پر ڈال دیا۔ ہم لوگ اس کی ہنرمندی پر ہنسے بیں رہ گئے۔ جس شخص پر اس لڑکی نے بالوں کا جال پھینکا تھا اس نے کھڑے ہو کر ایک خاص طریقے سے ہاتھ ملا کر شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد لڑکی نے ہماری طرف رُخ کیا اور ہر ایک مہمان پر باری باری سے اسی طرح اپنے بالوں کا جال بنا کر ڈالتی رہی اور ہمیں بھی وہاں کے دستور کے مطابق شکریہ ادا کرنے کا وہی طریقہ اختیار کرنا پڑا۔

ناچتے ناچتے اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ لیکن وہ برابر اسی رفتار سے ناچتی رہی۔ اسی دوران ایک کمرے میں دُلہن کو ناچنے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کمرے سے ایک عجیب سی چیخ سنائی دیتی تھی۔ کئی عورتیں دُلہن کو گھیرے ہوئے تھیں اور شاید وہ اسی طرح چیخ کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

کم و بیش تین گھنٹے تک ناچ ہوتا رہا۔ سب کے بعد میں زیادہ مشہور ناچنے والی عورت نے اپنا کمال دکھایا۔ اس کا ناچ دلچسپ ہی نہیں حیرت انگیز بھی تھا۔ ہم سب بہت غور سے دیکھتے رہے۔

اسی وقت دولھا کی آمد کا اعلان کیا گیا۔ دولھا ایک لمبا سا تندرست نوجوان تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا اور مغربی لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے آتے ہی محفل میں اور زیادہ گرمی آگئی۔ کاغذ جلا جلا کر نقاروں کو گرم کیا جانے لگا تاکہ ان کی آواز زیادہ تیز ہو جائے۔ عورتیں بھی تیز رفتار سے گانے لگیں۔ جو عورتیں اونگھ رہی تھیں وہ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

آدھی رات سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ دولھا اور دُلہن کے سارے رشتے دار ایک دوسرے سے ملے ہوئے بیٹھے تھے۔ عورتوں نے برقعے اوڑھ لیے اور نقاب کے سوراخ سے دولھا کو دیکھنے لگیں۔ ناچنے کی جگہ ایک نئی سرخ رنگ کی چٹائی بچھا دی گئی تھی۔ دولھا [illegible]

نیچے جھکائے ہوئے شرماتا ہوا مجمع میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ اپنا لباس بدل کر سفید رنگ کا چوغہ پہنے ہوئے تھا۔ تھوڑے انتظار کے بعد دلہن بھی باہر لائی گئی۔ وہ سرخ اور سنہرے چارخانے کا ریشمی لباس پہنے ہوئے تھی عورتیں اسے لال چٹائی پر لے آئیں۔ اس چٹائی پر دولہا کو پہلے سے کھڑا کر دیا تھا۔ دولہا دلہن دونوں ایک دوسرے سے قریب اور آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ باقی لوگوں نے چاروں طرف سے انھیں گھیر لیا۔

دولہا نے آہستہ سے دلہن کا سرخ لبادہ اٹھایا اور دلہن نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرا چھپالیا۔ وہ سونے کے زیوروں سے آراستہ تھی اور اس کے گلے میں سونے کے سکوں کا ہار اور ماتھے پر ایسے ہی سکوں سے گندھا ہوا جھومر تھا۔ دونوں کانوں میں تین تین سونے کے بالے لٹک رہے تھے۔ گھٹنوں تک لٹکا ہوا سفید ساٹن کا فراک اور اس پر ایک لمبا سا سنہری ہار پڑا تھا۔ انگلیاں انگوٹھیوں اور ہاتھ کنگنوں سے بھرے تھے۔ وہ پاؤں میں بھی زیور پہنے ہوئے تھی۔ مجمع اتنا زیادہ تھا کہ دلہن کو اچھی طرح دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ مگر ان لوگوں نے ہمارے خیال سے ہمارے سامنے سے بھیڑ ہٹادی اور ہم نے اچھی طرح دلہن کو دیکھ لیا۔

دولہا نے اپنی دلہن کے منہ پر رکھے ہوئے ہاتھ ہٹا دیے۔ دلہن شرم سے اپنی نگاہیں نیچے کیے ہوئے تھی تھوڑی جھکی ہوئی تھی اور نیل سے گدے ہوئے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ دولہا نے ایک ہاتھ سے دلہن کے گلے میں پڑا ہوا ہار پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اسے اپنی باہوں میں کھینچ لیا اور پھر دولہا دلہن کا ناچ شروع ہو گیا۔

نقارہ زور زور سے بجنے لگا اور دلہن کے پاؤں تیزی کے ساتھ اٹھنے لگے۔ وہ اپنے سر اور بدن کو جھٹکا دے کر ناچنے لگی اور بڑی تیز رفتاری سے ناچتی ہوئی دولہا کے پاؤں پر گر پڑی۔ عورتوں کے مجمع سے خوشی کا ملا جلا نعرہ بلند ہوا جس میں ایک طرح کا طنز شامل تھا کیوں کہ دولہا کا دلہن کو نیچے گرنے سے سنبھال نہ سکنا اس کی شکست کھانے کی دلیل اور دلہن کی فتح تھی۔

دلہن خود ہی سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے پھر جوشیلا ناچ شروع کر دیا۔ اس مرتبہ اس نے چاروں طرف ناچتے ہوئے چکر لگایا اور دوبارہ دولہا کے پاؤں پر آکر گر گئی۔ پھر ویسا ہی طنزیہ نعرہ لگا اور زور زور سے تالیاں بجائی گئیں۔ یہ عمل گویا اس تقریب کا ڈراپ سین تھا۔ اس کے بعد ان کی شادی کی رسموں کی تیاریاں ہونے لگیں عورتوں نے گلے پھاڑ کر گانا شروع کر دیا اور آگے بڑھ کر دولہا دلہن کو گھیر کر مکان میں لے گئیں ساری رات نقارے بجتے رہے اور مرد باہر ناچ گا کر خوشیاں مناتے رہے۔

جناب رفیق شاستری ایم اے۔

پنچ تنتر کی کہانیاں

گھمنڈی کا سر نیچا:۔

کوّے شاہ کے خاص وزیر نے تب سانپ اور چیونٹیوں کی یہ کہانی سنائی:۔

ایک بل میں ایک بڑا سا کالا ناگ رہا کرتا تھا۔ وہ بہت گھمنڈ کرتا تھا۔ اسی لیے اس کا نام بھی گھمنڈی پڑ گیا تھا۔ ایک دن وہ اپنا بل چھوڑ کر ایک دوسرے بہت ہی تنگ بل میں گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک بار بل کی طرف منھ کر لیا تو پھر کر لیا۔ آخر گھمنڈی جو ٹھہرے واپس آنا شان کے خلاف۔ خیر کسی طرح وہ اندر گھس ہی گئے۔ مگر اس روز زبردستی سے گھسنے میں ان کے بدن پر جگہ جگہ خراشیں آگئیں اور خون نکلنے لگا۔ اس بل میں چیونٹیاں بھی رہا کرتی تھیں۔ خون کی بو جوان تک پہنچی تو ساری چیونٹیوں نے سانپ کو آگھیرا اور اس کے زخم بھرے جسم سے لپٹ کر اسے تنگ کرنے لگیں۔ سانپ نے ہزار پھنکاریں ماریں۔ مگر چیونٹیاں نہ ٹلیں۔ دو، چار دس چیونٹیوں پر سانپ نے ہاتھ بھی صاف کیا مگر اس سے کیا بنتا تھا۔ چیونٹیوں کا جھنڈ کا جھنڈ سانپ سے لپٹ گیا اور دم بھر میں سانپ کو بے دم کر کے رکھ دیا۔ سانپ کہاں تک چیونٹیاں مارتا۔ بے چارا خود جان سے گیا۔

جھوٹ موٹ کی لڑائی

یہ کہانی سنانے کے بعد خاص وزیر نے کوّے شاہ کو ہدایت کی کہ اگر دشمن تعداد میں زیادہ ہوں تو ان کو چھیڑنا ٹھیک نہیں ہوتا۔

کوے شاہ نے کہا۔ میں تو وہی کروں گا جو آپ کہیں گے۔

خاص وزیر بولے:۔ اچھا تو ٹھیک ہے میں خود مخبری کا کام کروں گا۔ مگر اس کے لیے ایک کام کرنا ہوگا۔ تم مجھ سے جھوٹ موٹ لڑو اور مجھے لہولہان کرنے کے بعد اسی پیڑ کے نیچے پھینک کر چلے جاؤ۔ میں تمھارے دشمن الّوؤں کو تمھارے خلاف ورغلا کر ان کا اعتماد حاصل کروں گا اور اس پیڑ پر انھیں بسا لوں گا۔ جب بھی موقع ملے گا میں ان سب کو تباہ اور برباد کر دوں گا۔ اس کے بعد تم پھر اس پیڑ پر سب کو لے کر آجانا۔

کوّے شاہ نے ایسا ہی کیا۔ تھوڑی دیر میں کوّے شاہ اور اس کے خاص وزیر کی لڑائی شروع ہو گئی۔ دوسرے کوّے جب اس کی مدد کو آئے تو کوّے شاہ نے سب کو منع کر دیا اور کہا میں اس سے اکیلے

ہی نپٹ لوں گا۔

اپنی چونچ سے خاص وزیر کو لہو لہان کرنے کے بعد کوّے شاہ اپنے عزیز و اقارب کو لے کر دور کسی پہاڑ پر چلا گیا۔

الّو شاہ کو اپنے ایک دوست سے کوّؤں کی اس لڑائی کی خبر ملی۔ الّو شاہ نے بھی رات کے اندھیرے میں اپنے سارے ساتھیوں کو جمع کر کے پیپل کے اس پیڑ پر دھاوا بول دیا۔ جہاں کوّے شاہ اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے سوچا بھاگتے ہوئے دشمن کو برباد کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ پیپل کے پیڑ کو گھیر کر اس نے اس پیڑ کے بیچ رہے سبھی کوّؤں کو مار ڈالا۔

ابھی الّو شاہ کی فوج بھاگتے ہوئے دشمن کا پیچھا کرنے کی بات سوچ ہی رہی تھی کوّوں کے خاص وزیر کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ الّو اس کوّے کو مارنے کے لیے دوڑے۔ تب خاص وزیر چلا اٹھا۔

ارے بھئی مجھے مارنا ہے تو جان سے مار لینا مگر مجھے مارنے سے پہلے میری ایک بات تو سن لو۔ میں کوّے شاہ کا خاص وزیر ہوں۔ کل ہی میری اور کوّے شاہ کی لڑائی ہوئی تھی۔ وہی مجھے مار کر یہاں پھینک گیا ہے۔ مجھے اپنے راجا کے پاس لے چلو مجھے ان کو بہت سی باتیں بتانی ہیں۔

اب الّوؤں نے یہ بات الّو شاہ تک پہنچائی۔

الّو شاہ یہ بات سنتے ہی خود کوّے کے پاس آیا اور اسے دیکھتے ہی بولا۔ تیرا یہ حال کس نے کیا؟

خاص وزیر بولا: حضور بات اتنی تھی کہ بدمعاش کوّے شاہ اپنی فوج لے کر آپ کی فوج کے اوپر چڑھائی کرنے والا تھا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر روکا کہ الّو شاہ بہت طاقتور ہے اور طاقتور سے الجھنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس سے تو صلح کر لو اور آرام سے رہو۔ مگر کوّے شاہ نے میری نہ مانی اور الٹے مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اب آپ ہی میرے مالک اور آقا ہیں۔ میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔ جب میرے زخم بھر جائیں گے تب میں آپ کے ساتھ جا کر کوّے شاہ

کوّے کی یہ بات سن کر الّو شاہ نے اپنے سبھی پرانے وزیروں سے صلاح کی۔ اس کے بھی پانچ وزیر تھے۔ سب سے پہلے اس نے گرم مزاج نام کے اپنے وزیر سے مشورہ کیا کہ پناہ میں آئے دشمن کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے؟ "گرم مزاج" نے کہا اسے فوراً جان سے مار ڈالنا چاہیے۔ دشمن جب کمزور ہو اس وقت اسے مارنا سب سے آسان ہوتا ہے۔ ورنہ طاقت حاصل کرنے کے بعد اس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے پھر ایک بات اور ہے۔ ایک بار کی ٹوٹی ہوئی محبت کبھی نہیں جڑ سکتی ہے۔

الّو شاہ نے پوچھا وہ کیسے۔

تب گرم مزاج نے برہمن اور سانپ کی یہ کہانی سنائی۔

اشرفی اگلنے والا سانپ:۔

کسی جگہ ہری دت نام کا برہمن رہا کرتا تھا۔ بے چارہ خیرات پر گزر بسر کیا کرتا تھا۔ جب لوگوں نے دان دینے میں کمی کر دی تو اس نے کچھ کھیتی باڑی شروع کر دی۔ مگر اس کی فصل کبھی بھی اچھی نہ ہوئی۔

گرمی کے ایک دن وہ ایک پیڑ کے سائے میں لیٹا ہوا تھا کہ اس کے پاس ہی ایک بل کے اوپر کالا ناگ

بیٹھا وہ پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ سانپ کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ یہی اس کے کھیت کا دیوتا ہے۔ میں نے اس کی پوجا کبھی نہیں کی اور شاید اسی لیے میری کھیتی ہر سال ماری جاتی ہے۔ یہ سوچ کر وہ کہیں سے تھوڑا سا دودھ مانگ لایا اور ایک پیالی میں سانپ کے سامنے رکھ کر ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "اے ہمارے دیوتا میرا یہ حقیر نذرانہ قبول کرو" اتنا کہہ کر وہ دودھ کی پیالی وہاں رکھ کر چلا آیا۔

اگلے دن سویرے جب وہ بل کے پاس گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ سانپ نے دودھ پی لیا ہے اور پیالی میں ایک سونے کی اشرفی پڑی ہے۔

اب اس نے اسے اپنا روزمرہ کا معمول بنا لیا۔ وہ دودھ سے بھری پیالی ناگ کے بل کے پاس رکھ دیتا اور اگلے دن اسے اس پیالی میں ایک سونے کی اشرفی مل جاتی۔

ایک بار برہمن دور کہیں پردیس جانے لگا۔ اس نے اپنے بیٹے سے سانپ کو دودھ پلانے کی تاکید کر دی۔ اس کا لڑکا بھی روزانہ سانپ کے بل کے پاس دودھ رکھ دیتا اور اگلے دن اسے اشرفی مل جاتی۔ اب اس کے دل میں لالچ سمایا۔ اس نے سوچا ہو نہ ہو اس بل میں سونے کی اشرفیوں کا کوئی خزانہ چھپا ہوا ہے۔ کیوں نہ سانپ کو مار کر سارا خزانہ لے لیا جائے۔

اگلے دن جب سانپ دودھ پینے آیا تو برہمن کے لڑکے نے اپنی لاٹھی سے سانپ کے اوپر بھرپور وار کیا۔ سانپ پھرتی سے بچ نکلا اور لڑکے کو ڈس لیا۔ لڑکے نے وہیں دم توڑ دیا۔

دوسرے دن جب ہری دت واپس آیا تو اس کے عزیز و اقارب نے لڑکے کی موت کا سارا حال کہا۔

برہمن نے کہا۔ لڑکے نے اپنے کیے کا پھل پایا۔ جو اپنی پناہ میں آئے ہوئے پر مہربانی نہیں دکھاتا اس کے بنے بنائے کام بگڑ جاتے ہیں، جیسے پدم جھیل میں ہنسوں کا بنا بنایا کام بگڑ گیا تھا۔

لوگوں نے پوچھا وہ کیسے؟

(یہ دلچسپ کہانی اگلے پرچے میں)

دلچسپ دھوکا

ذرا یہ تو بتلائیے کہ اندر والے کالے دائروں میں سب سے بڑا دائرہ کونسا ہے اور سب سے چھوٹا کونسا؟

جواب ص ۱۴۲ پر

BRUARY
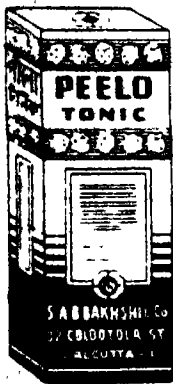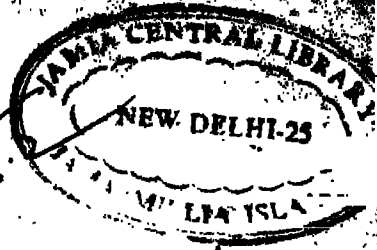
خلائی جہاز
چلانے والے
دو
ہوا باز

ولادی میر شاتلوف

بورس ولینوف

ایک خلائی جہاز
سے نکل کر
(خلا میں تیرنے کے بعد)
دوسرے
خلائی جہاز میں
داخل ہونے
والے

یفجینی خرونوف

الیکسی ایلیسیف

پیامِ تعلیم
جلد ۶
شمارہ ۲
فروری ۱۹۶۹ء
ایڈیٹر: محمد حسین حسّان ندوی
صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر
نئی دہلی ۲۵
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار
دہلی ۶
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنس بلڈنگ
بمبئی ۳
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ
قیمت
فی کاپی ۶۰ پیسے
سالانہ چندہ ۶ روپے

فہرست

بچّوں سے باتیں

بڑی خوشی کی بات ہے کہ سالنامہ آپ کو پسند آیا۔ ہماری دن رات کی محنت کا پھل مل گیا۔ ٹائٹل تو کیا چھوٹا کیا بڑا سبھی کو اچھا لگا۔

سالنامے کے بارے میں خط برابر آرہے ہیں۔ بچوں کے بھی بڑوں کے بھی۔ کچھ خط آپ اس پرچے میں بھی پڑھیے گا۔

ایک قریبی عزیز (حبیب حسّان سلمہ) کی شادی کے سلسلے میں پچھلے دنوں حیدرآباد جانا ہوا۔ بڑا لمبا سفر ہے لیکن ایک خیال سے ہمت بندھی: حیدرآباد میں پیام تعلیم کے بہت سے قدردان ہیں۔ ان میں سے بہت سے اس رسالے کی قلمی سرپرستی فرماتے ہیں۔ ان سب سے ملاقات کا موقع نصیب ہوگا۔ لیکن آپ جانیں ایک تو شادی برات کی گہما گہمی دوسرے دعوتوں کا چکر۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد چند حضرات سے ملاقات کا موقع نصیب ہوا۔

برادرم وقار خلیل صاحب (ادارہ ادبیات اردو) کو میرے آنے کی اطلاع ہو گئی تھی۔ ادارے کے کاموں سے فرصت پاتے ہی ملاقات کی زحمت فرمائی۔ ان کے ایک اور ساتھی محترم ترصیص الدین انصاری کی بدولت اکبرالدین صدیقی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔

جناب سعادت نظیر صاحب کو غالباً وقار صاحب نے اطلاع دے دی تھی، میری قیام گاہ پر تشریف لائے۔ بہت دیر تک پیام تعلیم کے بارے میں، بچوں کے ادب کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ آج کل آندھرا سرکار ان سے بچوں کے لیے کتابیں تیار کرا رہی ہے۔ سعادت نظیر صاحب کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ پیام تعلیم میں ان کی اچھی اچھی نظمیں چھپتی رہتی ہیں اور آپ انھیں بہت پسند کرتے ہیں۔

محترم غلام ربانی صاحب۔ برادرم غلام یزدانی صاحب۔ اظہر افسر صاحب۔ اقبال متین صاحب۔ مرزا شکور بیگ صاحب۔ رؤوف خیر صاحب۔ مسیح الدین صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ یہ سب آپ کے پیام تعلیم کے مضمون نگار ہیں۔ ہمیں ان سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہے شاید آئندہ کبھی موقع ملے۔ جناب احمد اللہ قادری صاحب کے ہاں بار بار ٹیلیفون کیا۔ انگیج تھا۔ بات نہ ہو سکی۔

محبّی وقار خلیل صاحب نے پانچ جنوری کو ادارہ ادبیات اردو دیکھنے کا موقع مرحمت فرمایا۔ وقار صاحب اور ترصیص الدین صاحب انصاری صاحب نے حیدرآباد کے چند اور بزرگوں اور اردو دوستوں کو بلا لیا تھا۔ بہت دلچسپ صحبت تھی۔ ان میں محترم ڈاکٹر ہاشم امیر علی (سابق ڈائرکٹر رورل انسٹی ٹیوٹ جامعہ) اور جناب آفتاب الدین صاحب کی شکلیں جانی پہچانی تھیں۔ ہمارے نئے مضمون نگار جناب منوہر پرشاد ماتھر صاحب سے بھی یہیں ملاقات ہوئی نثار احمد صاحب فاروقی دلّی یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں مگر ملاقات یہاں ہوئی۔

جناب حسینی شاہد ایڈیٹر ترقی اردو پرنسپل اردو کالج حیدرآباد سے تعارف کی سعادت نصیب ہوئی۔ دوسرے معزز حضرات میں یونیورسٹی کے پروفیسر بھی تھے شاعر بھی تھے۔ بہت افسوس ہے کہ ان سب کے نام یاد نہیں رہے۔

اس بے تکلف محفل میں بچوں کے ادب پر، بچوں کے ادب کی تاریخ پر، بچوں کے ادب کے سلسلے میں حیدرآبادی ادیبوں کی کوششوں پر، جو بچے مدرسے میں اردو نہیں پڑھ سکتے انھیں گھر پر اپنی مادری زبان پڑھانے کی نت نئی تجویزوں پر، اردو کی ترقی کے لیے طرح طرح کی کوششوں پر دیر تک بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔ محترم ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب، حسینی شاہد صاحب، وقار خلیل صاحب، نثار فاروقی صاحب، آفتاب الدین صاحب نے اس بات چیت میں زیادہ دلچسپی لی۔ ادارے کی طرف سے سب مہمانوں کی چائے سے تواضع کی گئی۔

یہ خوش گوار محفل ختم ہوئی تو وقار خلیل صاحب اور نصیر الدین صاحب کی نوازش سے ادارے کو دیکھنے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ اردو کے مشہور ادیب تھے۔ بہت دنوں تک عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر رہے۔ یہاں سے اسی عہدے پر کشمیر یونیورسٹی میں چلے گئے۔ وہیں دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا (۱۹۶۲ء)

مرحوم ڈاکٹر زور صاحب بہت حوصلہ مند اور باہمت بزرگ تھے۔ اردو زبان سے عشق تھا۔ دن رات اسی کی ترقی کی فکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ یہ ادارہ یعنی ادارۂ ادبیات اردو، ان کی اردو سے محبت اور ان کے بلند حوصلے کی بہترین مثال ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس ادارے کے ذریعے نوجوانوں میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ ان سے کتابیں لکھوائی جائیں۔ یہ کتابیں چھاپ کر ان کی ہمت بڑھائی جائے۔ دکن کے اردو ادب کی پرانی کتابوں پرانے دیوانوں کی تلاش اور کھوج کی جائے۔ دکنی تہذیب کی پرانی نشانیوں کی حفاظت کی جائے۔ یہ نشانیاں چاہے کتابوں کی شکل میں ہوں چاہے تصویروں کی شکل میں ہوں۔ چاہے پرانے ہتھیاروں، پرانے برتنوں، فرمانوں وغیرہ کی شکل میں ہوں۔

یہ مرحوم زور صاحب کی نیت کے خلوص کا نتیجہ ہے کہ ادارہ ان کے بعد بھی بڑی کامیابی سے چل رہا ہے اور مالی پریشانیوں کے باوجود ترقی کر رہا ہے۔ خوش قسمتی سے اُسے کارکن بھی ایسے مل گئے ہیں جو دُھن کے پکے ہیں۔ بڑی لگن سے کام کر رہے ہیں۔

اس ادارے کے بہت سے شعبے ہیں۔ ایک کتب خانہ ہے۔ اس میں ۲۵ ہزار چھپی ہوئی اور ۵ ہزار قلمی کتابیں ہیں۔ ایک میوزیم ہے جس میں پرانے زمانے کی بہت نادر، نایاب اور قیمتی چیزیں محفوظ ہیں۔ تصنیف و تالیف کا شعبہ ہے جو اب تک ۳۰۹ کتابیں چھاپ چکا ہے ان میں بچوں کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ بچوں کی ان کتابوں پر کسی اگلے پرچے میں تبصرہ کیا جائے گا۔ ایک شعبہ اردو امتحانوں کا ہے۔ سال میں دوبار اُردو دانی، اُردو زباں دانی، اُردو عالم، اُردو فاضل کے امتحان ہوتے ہیں۔ سب رس نام کا ایک اردو رسالہ ہے جو تیس سال سے پابندی سے شایع ہو رہا ہے۔ ایک دارالمطالعہ ہے اس میں دیس بدیس کے لگ بھگ دو سو اخبار اور رسالے آتے ہیں۔

ادارے کی ایک شاندار اور خوبصورت عمارت ہے جو آٹھ سال ہوئے سوا لاکھ کی لاگت سے تیار ہوئی اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اوپر لائبریری اور میوزیم وغیرہ ہیں۔ نیچے آڈیٹوریم ہے، دارالمطالعہ ہے، مہمان خانہ ہے۔ بہت سے اہل علم اور ریسرچ اسکالر یہاں آتے رہتے ہیں اور کتب خانے وغیرہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ہم ساڑھے گیارہ بجے سے ساڑھے چار بجے تک ادارے میں رہے اور بس سرسری نظر سے سب چیزیں دیکھ سکے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے پیام تعلیم کے بہت سے پرچے جو اب نایاب ہیں، وہاں محفوظ ہیں۔ ادارے کے کارکن تمام پرچوں کو جو ان کے یہاں آتے ہیں جلدیں بندھوا کر محفوظ کر لیتے ہیں۔ اُردو کے بہت سے نایاب رسالے اور اخبار وہاں دیکھنے کو ملے۔

ہم کوئی ساڑھے چار بجے وہاں سے رخصت ہوئے۔ ادارے کے کارکنوں کے خلوص اور اپنے کام سے لگن کا گہرا اثر لے کر رخصت ہوئے۔ ہمارے میزبان جناب اسرائیل خاں صاحب اور پیشکار صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ادارے کے کارکنوں سے ان کے پرانے تعلقات تھے اس وجہ سے اور بھی سہولت رہی۔

ہاں روزنامہ 'سیاست' کے ایک سب ایڈیٹر صاحب (نام یاد نہیں رہا) کی نوازش سے روزنامہ سیاست کے دفتر جانے کا موقع ملا۔ چیف ایڈیٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بڑے اخلاق سے ملے۔ روزنامہ سیاست یہاں بہت مقبول ہے۔ بہت کافی اشاعت ہے دفتر بھی بہت شاندار ہے۔ ٹیلی پرنٹر کا انتظام ہے۔ چیف ایڈیٹر صاحب ابھی امریکہ سے واپس آئے ہیں۔ بہت حوصلہ مند بزرگ ہیں۔ اپنے اخبار کی ترقی میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ پیام تعلیم کے سالنامے پر تبصرے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اسی دوران میں پیام تعلیم کی اشاعت بڑھانے کی کوشش دھیرے دھیرے ہوتی رہی۔ برادر محترم حکیم محمود الرحمٰن خاں صاحب پیام تعلیم کا ذکر سنتے ہی خریدار بن گئے۔ چندہ پیشگی مرحمت فرما دیا۔ حیدرآباد کے بہت کامیاب طبیب ہیں۔ بہت خوبیوں کے بزرگ ہیں ان کے اثر سے انشاء اللہ پیام تعلیم کی اشاعت بڑھانے میں مدد ملے گی۔

ہمارے میزبان جناب اسرائیل خاں صاحب کے قریبی عزیز جناب مطیع اللہ خاں صاحب خود خریدار بنے اور دس خریدار اور دینے کا وعدہ کیا۔ اسرائیل صاحب کے ایک مخلص دوست جناب افتخار صاحب نے ۲۵ خریدار دینے کا وعدہ فرمایا اسرائیل صاحب کے ایک اور دوست ہیں جناب شوکت صاحب بڑے مخلص بزرگ ہیں اور اردو زبان کے عاشق ہیں اور جناب "اُردو شریف" محلے میں "اُردو شریف" اسکول میں اُردو کے استاد ہیں۔ بہت با اثر آدمی ہیں۔ ان کی مدد سے اسرائیل صاحب انشاءاللہ چالیس پچاس خریدار اور فراہم کریں گے۔ ان سب کا شکریہ۔

وقت کے وقت معلوم ہوا کہ عادل جعفری صاحب کی نظم کاتب صاحب سے کھو گئی ہے۔ افسوس ہے۔ اس کی جگہ دوسری نظم شامل کی جا رہی ہے۔ یہ نظم اب اگلے پرچے میں چھپے گی۔ گنجایش کی کمی کی وجہ سے اور بھی اچھی اچھی دلچسپ چیزیں پرچے میں شامل نہ ہو سکیں۔ یہ بھی اگلے پرچوں میں پڑھیے گا۔

پیام تعلیم میں جناب فضل الرحمٰن صاحب (بمبئی) کا نام بار بار آتا ہے۔ انھیں پیام تعلیم سے دلی لگاؤ ہے۔ ہمیں اکثر فوٹو بھیجتے رہتے ہیں۔ ان کا ایک فوٹو سالنامے میں (دوسرے صفحہ پر) اور ایک اس پرچے میں شایع ہو رہا ہے۔ اس مرتبہ انھوں نے تین خریدار بھی مرحمت فرمائے ہیں۔ دلی شکریہ! ان کا بھی اور عزیز ساتھی شاہد صاحب کا بھی جن کی بدولت ایسے اچھے دوست نصیب ہوئے۔ تین خریدار عزیزی عبداللہ محمد یونس صاحب نے فراہم کیے۔ یہ ہمارے خریدار ہیں۔ ہمارے سب پیامی اپنے پرچے کے خریدار بڑھانے کی ایسی ہی کوشش کریں تو سچ مچ پرچے کو چار چاند لگ جائیں۔

جناب سیف سہرامی

سالِ نو کی کرن

کہہ رہی ہے یہی سالِ نو کی کرن — یہ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
اس کے سر پر ہمالہ کا تاجِ حسین — جس کا ثانی زمانے میں کوئی نہیں
اس کے قدموں میں ہے موجِ گنگ و جمن
یہ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

رشکِ جنت یہ کشمیر کی وادیاں — گنگا جمنا سی معصوم شہزادیاں
دیوتاؤں کا گھر دیویوں کا چمن
یہ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

اس میں چشتی[1] کے پیغام کی روشنی — گونجتی ہے یہاں کرشن کی بانسری
رام و سیتا کا گلشن ہے تلسی کا بن
یہ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

ہند و مسلم کی الفت کی پرچھائیاں — پیار کے رنگ میں ڈوبی شہنائیاں
مسجدوں کی اذاں مندروں کے بھجن
یہ ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

[1] حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری

جناب دینا ناتھ گردھر
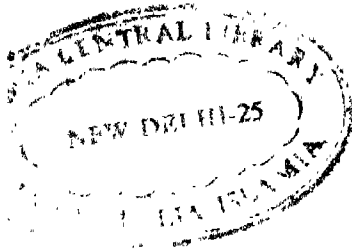
اخباروں کا بادشاہ

(لارڈ رائے تھامسن)

آپ پیام تعلیم بڑی چاہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اس میں دل چسپ کہانیاں۔ اچھی اچھی نظمیں۔ سچے واقعات معلوماتی مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں پیام تعلیم مہینے میں ایک بار چھپتا ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ کئی اخبار روزانہ نکلتے ہیں۔ شاید ایسا ہی کوئی اخبار آپ کے گھر میں آتا ہوگا اسی طرح کچھ اخبار ہفتے میں ایک بار یا دو ہفتے میں ایک بار نکلتے ہیں۔ روزآنہ چھپنے والے اخباروں میں دیس بدیس کی تازہ ترین خبریں اور واقعات ملتے ہیں۔ ہفتہ واری یا دو ہفتوں میں چھپنے والے اخباروں میں ہفتہ دو ہفتے کی خبروں کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے مضمون بھی ہوتے ہیں مگر مہینے میں ایک بار چھپنے والے اخبار (جنھیں اصل میں رسالہ کہتے ہیں) خبریں بہت کم کہانیاں نظمیں، مضمون زیادہ ہوتے ہیں۔

مختلف ملکوں میں کتنے اخبار چھپتے ہیں، کتنے رسالے نکلتے ہیں اور ان کی تعداد کیا ہے۔ اس کا انحصار وہاں کے لوگوں میں تعلیم پر ہے ہندوستان اور اس طرح کے دوسرے ملکوں میں جہاں اب تک تعلیم کا رواج بہت کم تھا اور بہت کم لوگ پڑھے لکھے تھے، اخبار اور رسالوں کی تعداد تو کم ہے ہی۔ ساتھ ہی یہ اخبار اور رسالے چھپتے بھی بہت کم تعداد میں ہیں۔۔ امریکہ انگلستان اور ایسے دوسرے ملکوں میں جہاں تعلیم عام ہے اور لوگ بہت زیادہ تعداد میں پڑھے لکھے ہیں۔ اخبار اور رسالے بہت بڑی تعداد میں نکلتے ہیں۔ ان میں بچوں کے اخبار اور رسالے بھی بے شمار ہوتے ہیں ہندوستان میں صرف چند اخبار ایسے ہیں جو روزانہ ایک لاکھ چھپتے ہیں۔ یہ اخبار بھی ایک جگہ سے نہیں بلکہ ایک ساتھ کئی شہروں سے نکلتے ہیں۔ یہاں ایک اخبار ایسا ہے جو ہندوستان کے آٹھ مختلف شہروں سے روزانہ نکلتا ہے۔ اور تب کہیں مل ملا کر ایک لاکھ چھپتا ہے۔ مگر امریکہ اور انگلستان میں شاید ہی کوئی اخبار یا رسالہ ہو جو ایک لاکھ سے کم چھپتا ہو۔ وہاں کئی اخبار اور رسالے پچاس پچاس لاکھ تک چھپتے ہیں اور پھر بھی ان کی مانگ پوری نہیں ہوتی۔ مشہور ماہواری رسالہ ریڈرز ڈائجسٹ دنیا کی تیرہ زبانوں میں چھپتا ہے اس کے ہر ماہ دو سو صفحے ہوتے ہیں اور باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ مقررہ تاریخ کو گاہکوں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ جانتے ہیں وہ ہر ماہ کتنا چھپتا ہے ؟ لگ بھگ تین کروڑ۔

آج کل امریکہ اور انگلستان کے زیادہ تر اخبار اور رسالوں پر تین خاندانوں کا قبضہ ہے۔ ان میں ایک لارڈ رائے تھامسن ہیں آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی

وہ اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں کم سے کم ایک سو اسی روزآنہ اخباروں کے مالک ہیں۔ اس کے علاوہ ۲۰۱ ماہانہ رسالے، سات بڑے کتابیں چھاپنے اور فروخت کرنے کے مرکز، گیارہ ریڈیو اسٹیشن اور انیس ٹیلی وژن کمپنیاں، چار مسافروں کو ایک ملک سے دوسرے ملک لے جانے والے دفتر اور ایک ہوائی جہاز چلانے والی کمپنی کے وہ مالک ہیں۔ اس وقت ان کی ذاتی جائداد کا اندازہ ایک سو اسی کروڑ روپے ہے۔ آیئے ہم آپ کو اخباری دنیا کے اس بادشاہ کی زندگی کا کچھ حال سنائیں۔

ان کا پورا نام رائے ہربرٹ تھامسن ہے۔ یہ کینڈا میں پیدا ہوئے تھے۔ لگ بھگ پچاس سال کی عمر تک انھوں نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا اس میں بری طرح ناکام رہے۔ اگر کوئی اور آدمی ہوتا تو پچاس سال کی عمر تک ناکام رہنے کے بعد حوصلہ چھوڑ بیٹھتا۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ہر ناکامی کے بعد ان کا حوصلہ اور بڑھا۔ سب سے پہلے انھوں نے ایک زراعتی فارم قائم کیا مگر دو ہی سال میں اس میں فیل ہوگئے اور اسے بیچ ڈالا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال تھی۔ چار سال بعد انھوں نے پرانی موٹر کاروں کا دھندا شروع کیا جس میں ان کا دیوالہ نکلنے کی نوبت آئی۔ یہ کام بھی بند کرنا پڑا اگلے دس سال انھوں نے کئی کام کیے۔ اپنے بھی پرایے بھی مگر ہر کام میں انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

۱۹۵۲ء میں وہ کینڈا کی پارلیمنٹ کے لیے امیدوار کھڑے ہوئے اور اس میں بھی ہار گئے

ہر ناکامی کے بعد وہ یہی کہا کرتے کہ میں ایک بہت بڑا امیر بننا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میری یہ خواہش پوری ہوگی۔ آج ان کی عمر ۷۵ سال کے لگ بھگ ہوگئی ہے۔ مگر اب بھی وہ خوش باش اور محنتی ہیں۔ وہ ہمیشہ موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے کم ترقی یافتہ اور پچھڑے ملکوں کے نوجوان اخبار نویسوں کو اخباری ٹریننگ دینے کے لیے پچاس لاکھ پونڈ یعنی لگ بھگ نو کروڑ روپے کی رقم سے ایک ٹرسٹ بنایا ہے۔

لندن کا اخبار ٹائمز دنیا کے مشہور ترین اخباروں میں گنا جاتا ہے۔ اتفاق سے اسے مسلسل کئی سال تک بھاری نقصان اٹھانا پڑا اندیشہ کیا جاتا تھا کہ اخبار کو بند کر دینا پڑے۔ لیکن لارڈ رایے تھامسن نے یہ کہہ کر اس اخبار کو خرید لیا کہ ایسے اچھے اخبار کو بند ہوتے دیکھنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں اسے انگلستان کا بہترین اخبار بنانا چاہوں گا۔ اور سچ مچ آج یہ اخبار سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور نفع بخش اخبار ہے۔ لارڈ تھامسن کو جب کسی کام میں اچھا منافع ہوتا ہے تو وہ اسے چھپاتے نہیں ہیں بلکہ خوش ہو کر اس کا اعلان کرتے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں انھیں سکاٹ لینڈ میں ٹیلی وژن چلانے کی اجازت ملی اور جلد ہی انھیں بھاری نفع ہونے لگا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ایسا سمجھئے کہ مجھے نوٹ چھاپنے کی کھلی اجازت مل گئی۔

۱۹۶۴ء میں انھیں خیال آیا کہ وہ انگلستان کے ہاؤس آف لارڈز میں بیٹھیں یعنی انگلستان کی ملکہ انھیں لارڈ کا خطاب عطا کریں۔ اس کے لیے وہ انگلستان کے وزیر اعظم سے ملے۔ وزیر اعظم نے

انھیں بتایا کہ وہ کسی کینیڈین شہری کو ہوس آف لارڈز میں آنے کی ملکہ سے سفارش نہیں کرسکتے۔ لارڈ تھامسن نے فوراً ہی انگلستان کے شہری بننے کی درخواست دے دی اور کچھ ہی مہینوں بعد ہاؤس آف لارڈز میں آگئے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ اتنا امیر کس ٹھاٹھ باٹھ سے رہتا ہوگا۔ پر بھئی وہ تو بہت کفایت شعار اور کم خرچ ہیں۔ وہ اپنے لیے سال بھر میں صرف ایک نیا سوٹ سلواتے ہیں اور وہ بھی اکثر سیل کے موقع پر جب کہ سلے سلائے کپڑوں کی قیمت لگ بھگ آدھی ہوجاتی ہے۔ جب ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں تو صرف ٹورسٹ کلاس (کم سے کم درجہ) میں جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ یہ بات یاد رکھتے ہیں کہ وہ ایک غریب خاندان کے فرد ہیں۔ ان کے باپ ایک حجام تھے۔ اور ماں ایک ہوٹل میں خدمت گار تھیں۔

وہ ابھی چودہ سال کے تھے کہ انھیں گھر کے اخراجات میں حصہ بٹانے کے لیے ایک کوئلہ کی دوکان پر کلرکی کی نوکری کرنی پڑی۔ ۱۹ سال کی عمر میں مچھلی پکڑنے کے سامان کی دوکان پر وہ سیل مین مقرر ہوئے۔ کچھ دوسری نوکریوں کے بعد وہ ۱۹۲۵ء میں ایک ریڈیو بنانے والے کے ہاں ملازم ہوئے۔ ان کا کام کینیڈا کے مختلف حصوں میں اس کمپنی کے ریڈیو کے لیے ایجنٹ مقرر کرنا اور ریڈیو کی فروخت کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ اس ملازمت میں انھیں یہ سوجھا کہ کینیڈا کے دور دراز علاقوں میں ایک ریڈیو اسٹیشن قائم کیا جائے۔ چنانچہ چار ہزار روپے سے ـــــ ایک ٹرانسمٹر خرید لیا اور اور ایک سینما والے کے اشتہارات مفت دینے کے بدلے اس کی بلڈنگ کا ایک حصہ حاصل کیا اور ۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو شمالی کینیڈا میں پہلا ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا۔ اس سے ایک طرف ریڈیو کی فروخت میں بھاری اضافہ ہوا دوسری طرف ریڈیو سٹیشن سے انھیں خاصی آمدنی ہونے لگی۔ اگلے دو سالوں میں انھوں نے دو اور ریڈیو سٹیشن قائم کیے۔

۱۹۳۴ء میں تھامسن نے پہلا اخبار خرید لیا۔ ایک ہفتہ وار اخبار "پریس" ان دنوں تھامسن اور ان کے ریڈیو اسٹیشن کے خلاف پروپگنڈا کر رہا تھا۔ تھامسن نے بات کرکے اس اخبار کو صرف چالیس ہزار روپے میں خرید لیا۔ دو ہزار روپے فوری طور پر نقد دیے اور باقی قسطوں میں دینا طے پایا۔ سارا پرانا عملہ رہنے دیا۔ انھوں نے اس اخبار کو پہلے ہفتے میں دوبار اور پھر روزانہ کردیا اخبار نے بہت جلد ترقی کی ۱۹۴۷ء میں تھامسن اپنا اخبار اور ریڈیو اسٹیشن اپنے تجربہ کار عملہ کے حوالے کرکے کینیڈا کی راجدھانی ٹورنٹو آگئے اور اگلے دس بارہ سال تک جہاں ممکن ہوسکا انھوں نے اخبار اور کتابیں چھاپنے اور بیچنے والے ادارے حاصل کیے۔ وہ ایک اخبار خریدتے اور اس کا اثاثہ گروی رکھ کر روپیہ حاصل کرتے جس سے دوسرا اخبار خرید لیتے۔ اس طرح ۱۹۵۲ء میں ان کے قبضے میں کینیڈا اور امریکہ کے بیس روزانہ اخبار آگئے۔ جہاں وہ اپنی ذات کے لیے نہایت کفایت شعاری برتتے ہیں وہاں وہ اپنے اخبار اور

ذاروں کو چلانے میں بے حد فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنے عملہ کے کام میں کوئی دخل نہیں دیتے۔ نہ اس اخبار کی اصل پالیسی پر اثر انداز ہوتے ہیں جو پالیسی ان کے پاس آنے سے پہلے اخبار نے اختیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ ان کے اخباروں میں مختلف سیاسی نظرے رکھنے والے گروہوں کے خیالات والے اخبار شامل ہیں۔

انگلستان میں پہلا اخبار جو تھامسن نے ۱۹۵۳ء میں خریدا وہ تھا سکاٹس مین۔ اب تھامسن نے انگلستان میں مستقل رہائش اختیار کر لی اور ان کے لڑکے نے امریکہ اور کنیڈا میں اپنے باپ کے کاروبار کو سنبھالا۔ اور اس میں ہر سال اضافہ کیا ۱۹۵۵ء میں تھامسن نے سکاٹ لینڈ میں ٹیلی وژن اسٹیشن قائم کیا اس پر کل سوا دو لاکھ پونڈ (لگ بھگ چالیس لاکھ روپے) خرچ آئے۔ دوسرے سال ہی اس میں انھیں ڈیڑھ لاکھ پونڈ منافع ہوا ۱۹۵۹ء میں انھوں نے لگ بھگ ایک درجن اخبار خرید لیے جس سے انگلستان کی اخباری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ ان میں سے جو اخبار صرف سنسنی خیز خبریں چھاپتے تھے تھامسن نے انھیں بند کر دیا اور باقی اخباروں کو ترقی دی اور ان کے نقصان کو نفع میں بدل دیا۔ اسی عرصہ میں انھوں نے کئی کتب خانے، رسالے بھی خریدے۔ امریکہ، اسٹریلیا اور افریقہ میں ٹیلی وژن اسٹیشن قائم کیے۔ انھوں نے کئی نئے اخبارات اور رسالے جاری کیے۔ تھامسن آج دنیا کے سب سے بڑے اخبارات کے مالک ہیں۔ صحیح طور پر وہ اخباروں کے بادشاہ ہیں۔ اور یہ سب ان کے پختہ ارادے، لگاتار محنت اور ہمت کا نتیجہ ہے★

م۔ ش

سات سوال؟

کہیے اوپر کا گورکھ دھندا کچھ سمجھ میں آیا؟

جی ہاں۔ یہ آپ کے ذہن اور نظر کا ایک امتحان ہے دلچسپ امتحان ـــ اس تصویر میں جیومیٹری کی تین شکلیں بنی ہیں۔ ایک دائرہ ایک مستطیل اور ایک مربع۔ ان کے اندر کچھ ہندسے لکھے ہوئے ہیں۔ اب آپ ذرا جلدی سے یہ تو بتائیے کہ:۔

۱۔ وہ کون سے نمبر ہیں جو مربع میں ہیں مستطیل اور دائرے میں نہیں؟
۲۔ وہ کون سے نمبر ہیں جو مستطیل میں ہیں۔ دائرے اور مربع میں نہیں؟
۳۔ وہ کون سے نمبر ہیں جو دائرے میں ہیں مستطیل اور مربع میں نہیں؟
۴۔ وہ کون سے نمبر ہیں جو مستطیل اور مربع میں ہیں مگر دائرے میں نہیں؟
۵۔ وہ کون سے نمبر ہیں جو مربع اور دائرے میں ہیں مگر مستطیل میں نہیں؟
۶۔ وہ کون سے نمبر ہیں جو مستطیل اور دائرے میں ہیں مگر مربع میں نہیں؟
۷۔ وہ کون سے نمبر ہیں جو دائرہ، مستطیل اور مربع تینوں میں ہیں؟

جواب ص۱۵ پر دیکھیے۔

جناب ابومسلم

آہ گاندھی

لیجیے گاندھی شہادی کے سلسلے میں ایک اور اچھی سی نظم پڑھیے۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ باپو جنوری کے مہینے میں گولیوں کا نشانہ بنے تھے

سُنا دنیا نے جب جاں سوز[1] تیرا سانحہ گاندھی
لگی سینے میں گولی اور کلیجہ جل اٹھا گاندھی

چھٹیں نبضیں ہوا شورِ فغاں ہر سو[2] بپا گاندھی
زمانہ تیرے غم میں بزم ماتم بن گیا گاندھی

کہاں پائیں گے "کوہِ نور" کوئی آپ سا گاندھی
یہ مانا ہے "جواہر" خیز خاک ایشیا گاندھی

نہ جانے کون سی محفل کا تھا روشن دیا گاندھی
کہ بجھ کر بھی زمانے میں اجالا کر گیا گاندھی

ہوا کب چاہنے والوں کی دنیا سے جدا گاندھی
نظر کی بزم سے اٹھ کر دلوں میں جا بسا گاندھی

نہ تنہا آب[3] و آتش[4] بلکہ مٹی اور ہوا کو بھی
ترے خاکی جسد[5] کا کچھ نہ کچھ حصہ ملا گاندھی

وفا نا آشنا دنیا کو جس شے[6] کی ضرورت تھی
بصد[7] احسان تو نے بخش دی روحِ وفا گاندھی

یہ سچ ہے اب وہ جسمِ ناتواں ہم میں نہیں باقی
مگر جو کام کرنا تھا بہت کچھ کر گیا گاندھی

خدا کا بندۂ صادق خدا ہوتا نہیں لیکن
یہ سچ ہے کشتیٔ مظلوم کا تھا ناخدا گاندھی

نہ پھولے کوئی ظالم اور نہ ہوں مظلوم افسردہ
خدا قادر ہے پیدا کر دے کوئی دوسرا گاندھی

ہمیشہ دوسروں ہی کی بھلائی میں بھلائی ہے
اسی رازِ حقیقت[8] کا تھا اک عقدہ[9] کشا گاندھی

سہارا بے کسوں کا اور مظلوموں کا حامی تھا۔
یہی تھا جرم تیرا بھی یہی تیری خطا گاندھی

[1] دل و جان کو جلانے والا [2] ہر طرف [3] پانی اور [4] آگ [5] جسم [6] جو وفا کو نہ جانتا ہو [7] چیز [8] سو احسانوں کے ساتھ [8] حقیقت کا بھید۔ [9] عقدہ یا گتھی کھولنے والا۔

لگایا ہے گلے دارو رسن کو ان بزرگوں نے　　کہ جن کا نقشِ پا تیرا دلیلِ راہ تھا گاندھی
تشدد کا نشانہ بن کے رکھی لاج اہنسا کی　　ضعیف اور ناتواں جانوں کا فدیہ ہو گیا گاندھی

زمیں کا رُخ بدل جاتا ہے سورج ڈوبتا کب ہے　　وہ دیکھو دوسری دنیا میں ہے جلوہ نما گاندھی
جو سورج ڈوب بھی جائے تو لازم کب اندھیرا ہے　　ضیا بخش "مہ و انجم" ترا پرتو ہوا گاندھی!
جو آنکھیں تاب لا سکتی نہ تھیں اس مہرِ تاباں کی　　ان آنکھوں کے لیے خود ایک پردہ بن گیا گاندھی
بھٹکتے تھے جو اک مدت سے گمراہی کی وادی میں　　انھیں بھی جاتے جاتے راستہ دکھلا گیا گاندھی
اسے اعجاز کہتے ہیں مسیحائی ہے نام اس کا　　فنا ہو کر بھی اک عالم کو زندہ کر گیا گاندھی
اٹھائی قید تو نے اور آزادی ہمیں بخشی　　نہیں ممکن ترے اس ایک احساں کا صلہ گاندھی
نشانہ گولیوں کا ہو ہدف تیرِ ملامت کا　　ترے جرمِ وفا کی یہ نہ تھی ہرگز سزا گاندھی
یہی شرطِ وفا ہے ہم بھی اس مقصد پہ مٹ جائیں　　وہ مقصد جس پہ تو نے اپنی جاں کر دی فدا گاندھی
دلِ مظلوم کی آہیں کبھی خالی نہیں جاتیں　　لہو معصوم کا ہے رنگ لاتا بے خطا گاندھی
وہ مقتل جس جگہ ٹپکے ہیں تیرے خون کے قطرے　　رواں ہوگا وہیں سے چشمۂ آبِ بقا گاندھی
نہ بھولے گا ترا ایثار، بے نفسی، خدا ترسی　　نہ بھولے گی ترے اخلاق کی کوئی ادا گاندھی
نہ بھولیں گے لپکتے، پھول برساتے ہوئے شعلے　　نہ بھولے گی وطن کی آگ میں جلتی چتا گاندھی

چمک اٹھے یہ خاکستر شرارِ زندگی بن کر
بس اتنی ہے امینؔ سوختہ جاں کی دعا گاندھی

پچھلے زمانے کی پھانسی　پیر کا نشان　جلوہ دکھانے والا　روشنی بخشنے والا　چاند اور ستارے　چمکنے والا سورج

محمد حسین حسان ندوی

آواز

(رومانیہ کی ایک لوک کہانی)

یہ بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک آدمی تھا جو ہمیشہ روپے پیسے کی سوچتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں دولت ہی سب کچھ تھی۔ خدا کا کرنا اس کے پاس بہت سی دولت جمع ہو گئی بہت زیادہ۔ بہت ہی زیادہ۔

پر اب اسے ایک اور فکر کھائے جا رہی تھی۔ ایک نہ ایک دن وہ مر جائے گا۔ اور یہ ساری دولت یونہی اپنے پیچھے چھوڑ جائے گا۔

اس کی سمجھ میں ایک بات آئی۔ وہ ایسے ملک کی تلاش میں چل پڑا جہاں کسی کو موت نہ آتی ہو۔ آخر اسے کامیابی ہوئی۔ ایسے ملک میں پہنچ گیا جہاں موت کا لفظ بھی کوئی نہ جانتا تھا۔

"لیکن اگر آپ کے ملک میں کوئی مرتا ورتا نہیں تو اس سارے علاقہ میں لوگوں کی بھیڑ لگ جائے گی۔ زمین پر تل دھرنے کو جگہ نہ ملے گی۔" اس نے اس ملک کے لوگوں سے کہا۔

"ایسا نہیں ہے۔" اسے جواب ملا۔ "وقتاً فوقتاً ہم میں سے کسی نا کسی کو ایک آواز آتی ہے۔ وہ اس آواز کے پیچھے چل پڑتا ہے اور پھر لوٹ کے نہیں آتا۔"

مالدار آدمی نے اپنے دل میں کہا "کتنی احمقانہ بات ہے بھلا خالی آواز کے پیچھے چل پڑنا یہ جانتے بوجھتے چل پڑنا کہ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آنا ہے۔ میں ایسی حماقت نہیں کروں گا۔"

تو بس وہ بیوی بچوں سمیت اس ملک میں آباد ہو گیا۔ اس نے اپنے بچوں کو خاص کر بیوی کو تنبیہ کی بلکہ حکم دیا کہ جب کبھی کوئی آواز سنیں ہرگز ہرگز ان کا پیچھا نہ کریں۔

سالہا سال بیت گئے۔ زندگی کے دن خوب عیش و آرام سے گزرتے رہے۔ پھر ایک رات کو ایک

کھانے کی میز کے گرد بیٹھا تھا۔ اچانک اس کی بیوی کرسی پر سے جیسے اچھل پڑی اور چیخنے لگی: "بہت اچھا بہت اچھا میں آرہی ہوں میں آرہی ہوں"

وہ چاروں طرف اپنا فر کا کوٹ دیکھنے لگی۔ اس رات سردی بہت زیادہ تھی۔

مالدار آدمی زور سے چلایا: "اگر تم مرنا نہیں چاہتی ہو تو تم جہاں بیٹھی ہو وہیں بیٹھی رہو۔ تمھیں یاد نہیں رہا کہ میں نے تم سے کیا کہا تھا؟

مگر آپ نے وہ آواز نہیں سنی جو مجھے بلا رہی ہے۔ میں تو بس یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ کون مجھے بلا رہا ہے۔ کس لیے بلا رہا ہے" بیوی نے کہا۔

مالدار آدمی نے خوب مضبوطی سے اسے پکڑ لیا کمرے کے سارے دروازے بند کروا دئے چٹخنیاں لگوا دیں۔

"آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی کروں گی" اس کی بیوی یہ صورتِ حال دیکھ کر بولی: "مگر مجھے کوٹ تو پہن لینے دیجیے اچانک بہت زیادہ ٹھنڈ لگنے لگی ہے"۔ مالدار آدمی نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ سمجھا آخر کار وہ ہوش میں آگئی ہے۔ ے پیچھے وہ اچانک دروازے کی طرف جھپٹی۔ دروازہ کھلا پایا۔ پلک جھپکتے میں اس میں سے نکل گئی۔ مالدار آدمی اس کے پیچھے بے تحاشہ دوڑ پڑا۔ اس کا کوٹ پکڑ لیا۔ مگر بیوی نے کوٹ کے بٹن کھول دیے۔ کوٹ اتر گیا مالدار آدمی کے ہاتھ میں آگیا اور رات کے اندھیرے میں چیختی ہوئی بھاگی چلی گئی "بہت اچھا میں آرہی ہوں میں آرہی ہوں"

مالدار آدمی بڑبڑاتا ہوا گھر کی طرف لوٹا۔ یہ اس کی اپنی غلطی تھی۔ میں نے اسے جتا دیا تھا کہ آواز کا پیچھا نہ کرنا چاہے کتنی ہی اونچی آواز ہو"۔

اس کے بعد کئی سال تک اطمینان سے گزر گئے کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوئی۔ ایک دن وہ نائی کی دکان میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ داڑھی منڈوانے کی تیاری کر رہا تھا۔ منھ پر صابن لگا ہوا تھا۔ نائی ریزر چلانا چاہتا تھا۔ اچانک وہ آگے کی طرف جھک گیا اور زور سے چیخا "میں نہیں آؤں گا میں نہیں آؤں گا" بے چارہ نائی حیران پریشان ایک دم ٹھٹک گیا اور مالدار آدمی پھر چیخا: "میں کبھی نہیں آؤں گا، ہرگز نہیں آؤں گا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔ دور ہو جاؤ"

تھوڑی دیر بعد وہ اور زور سے چلایا "میں ہرگز ہرگز نہیں آرہا ہوں۔ تم چلے جاؤ دفع ہو جاؤ۔ خلیفہ جی ذرا اپنا ریزر دینا۔ میں اسے سبق پڑھانا چاہتا ہوں۔ تاکہ لوگ ہمیشہ آئندہ اس مصیبت سے چھٹکارا پائیں"

یہ کہہ کر تیزی سے کرسی سے اٹھا جھپٹا مار کر ریزر نائی کے ہاتھ سے جھپٹا اور چیختا ہوا بھاگا۔ "ٹھہرو ٹھہرو میں ابھی تمھیں پکڑتا ہوں"

نائی میاں کو اپنے ریزر کی فکر ہوئی۔ اس کے پیچھے بھاگے۔ دونوں بہت تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ ایک آگے ایک پیچھے۔ دوڑتے دوڑتے شہر سے بہت دور نکل گئے۔ اچانک ایک کھائی آئی۔ مالدار آدمی سر کے بل نیچے گرا اور ——— ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل!

نائی کے جیسے کسی نے قدم تھام لیے فوراً رک گیا اپنے جی میں کہنے لگا۔ میں نے اپنا ریزر کھویا سو کھویا پر جان بچائی ...... نائی نے شہر میں جا کر بتایا کہ جو بھی اس آواز کا پیچھا کرتا ہے وہ یقیناً زمین کی اسی گہری کھائی یا سوراخ میں جا گرتا ہے۔

اب تو اس گہری کھائی یا سوراخ کو دیکھنے کے لیے سارا شہر امنڈ پڑا جس نے اتنی خلقت کو نگل لیا تھا۔

مگر وہاں تو کھائی وائی کچھ بھی نہیں تھی۔ ہموار زمین تھی۔ دور تک ——— بہت دور تک ہموار چلی گئی تھی۔

مگر اب اتنا ہوا کہ یہاں کے لوگ عام طریقے سے مرنے لگے جیسے اور ملکوں کے لوگ مرتے ہیں۔

(فائنڈنگ آوٹ)

نیچے کاغذ کے چوکور ٹکڑوں کی شکلیں بنی ہیں اور کچھ کٹے ہوئے پرزے بھی ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ جو ٹکڑے ہیں پہلے یہ بھی چوکور ہی تھے۔ ننھے میاں نے ان کو قینچی سے کاٹ دیا——— کیا آپ ان پرزوں کو اس طرح جوڑ سکتے ہیں کہ یہ پھر چوکور بن جائیں؟

جواب سات سوال۔ ۱۔ ۷۔ ۱۰   ۲۔ ۴۔ ۶
۲۔ ۳   ۴۔ ۹۔ ۵   ۵۔ کوئی نہیں
۶۔ ۳۔ ۸   ۷۔ ۱

محترمہ حامدہ خاتون

اصفہان کے لوگ

اصفہان سے ایک اور خط

یہ اصفہان کا ایک خط اور پڑھیے۔ یہ کچھ دنوں پہلے کا ہے۔ مگر بہت دل چسپ ہے۔ عزیزہ حامدہ خاتون نے اصفہان کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے ہمارے آپ کے لیے بہت سی نئی اور دل چسپ معلومات ہیں۔ ہم نے حامدہ صاحبہ سے درخواست کی ہے کہ اصفہان شہر کے دیہاتی علاقے اور ایران کے دوسرے شہروں کے حالات بھی لکھ کر بھیجیں اگر انھیں لکھنے کی فرصت مل سکی تو بہت دلچسپ چیز ہوگی۔

— ایڈیٹر

......پرسوں بٹیا کو باتیں کرنے کا دورہ ہوا تھا۔ ان کے ذہن میں جتنی یادیں تھیں وہ سب انھوں نے بیان کر ڈالیں...... دن بھر مجھ کو بور کرتی رہیں۔ .... بار بار کہتی تھیں کیا اچھا ہوتا اگر سلہٹ کے سارے لوگ یہاں آجاتے۔ کتنی اچھی جگہ ہے مگر یہی کمی ہے کہ اپنے لوگ نہیں ہیں۔ ان کی طبیعت کافی خراب ہے۔ یہاں کے پانی میں نمک بہت ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے دانے نکل آئے ہیں جیسے مچھر کے کاٹے کے ہوتے ہیں۔ ان میں سخت کھجلی ہوتی ہے اور کھجانے سے خون نکل کر پپڑی سی بن جاتی ہے۔

یہاں کے سب سے بڑے ڈاکٹر نفیسی کو دکھایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کچھ دنوں بعد جسم عادی ہو جائے گا تو یہ تکلیف جاتی رہے گی۔

ان کی پڑھائی کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ فارسی پہلے درجے کی اگر ختم کرلیں گی تو دوسرے درجے میں داخلہ ہو جائے گا۔ مگر انگریزی نہیں پڑھائی جائے گی۔ صرف فارسی اور فرانسیسی۔ انگریزی کے لیے شام کا ایک اسکول ہے۔ اس میں جائیں گی۔ دو گھنٹے کی چار سو روپے فیس ہے مگر بہرحال بھیجنا تو ہے۔ ابھی تو ایک معلمہ کی تلاش تھی جو گھر پر آکر انھیں پڑھائے۔ استانیاں گھر پڑھانے کا معاوضہ عموماً ڈھائی سو روپے ماہوار لیتی ہیں۔ مالک مکان خود استانی ہیں۔ بڑی محنت سے پڑھاتی ہیں مگر یہ ان سے اتنی بے تکلف ہو گئی ہیں کہ انھیں خاطر میں نہیں لاتیں۔

کل ایک دلہن دیکھی چار دن پہلے سے دلہن کا میک اپ[1] شروع ہوا۔ ایک صاحبہ بٹے ہوئے تاگے سے لڑکی کا منھ (چہرہ) رگڑ رہی تھیں۔ اس سے باریک روئیں ٹوٹ

[1] یہ نیا لفظ اردو میں داخل ہوا ہے یا ؤڈر اور لوشن وغیرہ چہرہ پر اس طرح لگاتے ہیں کہ بوڑھا آدمی جوان نظر آتا ہے۔

جاتے تھے ۔ کافی دیر تک یہ سلسلہ رہا پھر بھنویں
اکھاڑی گئیں اور نہ جانے کیا کیا ہوا۔

کل شادی تھی اس لیے باقاعدہ میک اَپ
ہوا ۔ پورے تین گھنٹے تو بال بننے میں لگے ۔۔۔۔ یہ سب
کچھ کرکے سر پر تاج لگایا گیا ۔ آنکھوں کا میک اَپ کیا۔

دلہن کا لباس سفید رنگ کا ہوتا ہے ۔ جوتے
اور دستانے تک سفید ۔ دلہن بالکل انگریز لڑکی معلوم
ہو رہی تھی ۔ خوبصورت تھی اس لیے بڑی اچھی لگ رہی
تھی ۔ مگر میں پوری شادی نہ دیکھ سکی ۔ سر میں شدید درد
تھا ۔ دلہن کی نانی نے خاص طور پر اپنے لڑکے کو بھیجا کہ
بلا کر لاؤ ۔ مگر میں نے معذرت کر دی درد سر کی حالت
میں رات بھر جاگنا مشکل کام تھا ۔

یہاں سب لوگ بے انتہا اچھے ہیں ۔ رتی بھر
یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میں کسی اجنبی جگہ ہوں ۔ خصوصاً میری
مالکہ مکان تو بہت اچھی ہیں ۔ رشید تو سارے دن دفتر میں
رہتے ہیں ۔ آٹھ بجے رات کو آتے ہیں ۔ مگر ان لوگوں کی
وجہ سے مجھے ذرا دقت نہیں ہوتی ۔ ایک دن تو رشید
صبح کے نکلے رات کے بارہ بجے تک غائب رہے ۔ ظاہر
ہے کہ میں کس قدر پریشان تھی۔

سب سے بڑی دقت تو زبان کی تھی ۔ یہ
لوگ مجھ سے زیادہ پریشان تھے ۔ آقا[1] سارے جاننے
والوں کے یہاں فون کرتے رہے ۔ جن جن کے گھر جاتے
تھے ان کے ہاں دوڑتے رہے ۔ آخر میں ڈرائیور کے گھر
جا رہے تھے کہ راستے پر رشید مل گئے ۔ معلوم ہوا
کہ ستر گاؤں کا سروے کرکے آرہے ہیں ۔

آقا کے گھر کی عورتیں برابر میرے پاس
بیٹھی رہیں باوجود میرے اصرار کے اپنے گھر
نہیں گئیں ۔ ایک اجنبی کے ساتھ اتنی ہمدردی اور
یگانگت کا برتاؤ ان کے اچھے ہونے کا ثبوت ہے ۔

تم کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ رشید سوائے فارسی
کے اور کسی زبان میں بات نہیں کرتے ۔ مجھے خود حیرت
ہے کہ انھوں نے اتنی جلدی فارسی کیسے سیکھ لی ۔ اس
کی وجہ سے ان سے بہت سے لوگوں سے تعلقات ہوگئے
ہیں ۔ شام کے وقت عموماً مصروفیت رہتی ہے ۔
کبھی کوئی آتا ہے اور کبھی مجھے جانا ہوتا ہے ۔ جمعے کو
تو سارا دن مصروفیت میں گذرتا ہے ۔ یہاں جب
کوئی پہلی بار آتا ہے تو کوئی تحفہ لے کر آتا ہے ۔ بٹیا
صاحبہ کا بڑا مزہ ہے ۔ تحفے میں پھول بھی لاتے ہیں
مگر پھول بھی جانتی ہو کتنے کے ہوتے ہیں ؟ کم از کم
دس پندرہ روپے کے ۔

اس جمعے کو جو لوگ آئے تھے وہ کم سے کم
ساٹھ روپے کا سامان لائے تھے ۔ ایک تو تصویر کا
فریم تھا ۔ جیسا ہندوستان میں کشمیری کام کا ہوتا ہے ۔
ویسا ہی کام یہاں بکثرت نظر آتا ہے ۔ فرق یہ ہے کہ
ہندوستان میں رنگوں کی جادوگری ہوتی ہے ۔ یہاں
چاندی، تانبے پیتل کے نقش و نگار کاٹ کر چسپاں کرتے
ہیں ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ نقش و نگار باریک باریک
ہوتے ہیں ۔ چنانچہ ایک فریم تھا کم سے کم ۲۵ روپے
کا ہوگا ۔ ایک چھوٹا چائے کا سٹ مع ناشتے کی پلیٹوں
کے اور ایک مٹھائی کا ڈبا ۔ بٹیا صاحبہ بہت خوش
ہوئیں ۔ لیکن اب میں جاؤں گی تو بدلہ تو مجھے بھی کرنا ہوگا ۔

بٹیا نے بہت سی لڑکیوں سے دوستی کر رکھی
ہے ۔ ان کو زبان کی وجہ سے جھجک ہوتی تھی مگر
وہ لڑکیاں انھیں زبردستی لے جاتی ہیں ۔

[1] ایک مزے کی بات ! لفظ لکھا تو جاتا ہے "آقا" مگر پڑھتے ہیں آغا بولتے وقت ق ، غ ۔ سے بدل جاتا ہے

ان کی ماؤں کو بٹیا کی تنہائی پر بڑا ترس آتا ہے ۔
بہرحال اب بے تکلف ہوگئی ہیں اور جانے لگی ہیں ۔

ان کے ساتھ جو کرسچین لڑکیاں آتی ہیں وہ
تو اتنی خوب صورت ہیں کہ کیا بتاؤں ۔ کہتے ہیں شاہ عباس
اپنے زمانے میں تین چار سو خاندان کوہ قاف سے لائے
تھے ۔ یہ لوگ انھی کی نسل سے ہیں ۔ کہانیوں میں کوہ قاف
کی پریوں کے بارے میں پڑھا تھا مگر اب تو انسانوں کی
شکل میں دیکھ لیا ۔

بٹیا صاحبہ فارسی سمجھنے لگی ہیں ۔ کچھ بولنے بھی
لگی ہیں ۔ یہاں کے لوگ ناچنے گانے کے بھی شوقین ہیں ۔
ایک دعوت میں کئی لوگ ناچنے لگے ۔ بٹیا صاحبہ کو بڑا مزہ
آرہا تھا ۔ خوب قہقہے لگا رہی تھیں ۔ ایک بچہ تھا جو بار
باران کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتا تھا ۔ کہتا تھا "سمن بیا برقص"
(سمن آؤ ناچیں) ان کا جی بھی چاہتا تھا مگر شرماتی تھیں ۔

ہندی فلموں سے ان لوگوں کو عشق ہے ۔ ہر گھر
میں ہندی ریکارڈ موجود ہیں ۔ ہر شخص راجندر کمار کے
متعلق سوال ضرور کرتا ہے ۔ ایک لڑکی ہے فاطمہ ۔ وہ تو
ہندوستان کی عاشق ہے ۔ جب وہ آتی ہے تو اس کی حالت
دیکھنے کی ہوتی ہے ۔ سمن کو اس کا بس نہیں چلتا کہ کیا کرے ۔
ہر ہر چیز پر ہر ہر بات پر اظہار پسندیدگی کرتی ہے ۔ اس
کی حرکتیں بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں ۔ اپنی ایک تصویر
ساری پہن کر کھنچوانے والی ہیں ۔ حسرت ہے کہ ان کے بال
بھی لمبے ہوتے تو چوٹی بنواتیں ۔ اصرار کر رہی ہیں کہ بٹیا
کے بال اب نہ کٹوانا تاکہ لمبی چوٹی بن سکے ۔

تنگ پاجامہ اور کرتا بٹیا پہنتی ہیں تو بہت پسند
کیا جاتا ہے ۔ کاجل بھی بہت پسند کیا جاتا ہے ہم
لوگ باہر نکلتے ہیں تو لباس کی وجہ سے سب
کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں ۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ
ہندوستان کی ان کے دل میں بڑی عزت ہے ۔ اب
تک ہم لوگوں کو جو لوگ ملے ہیں وہ تو بالکل اپنے لوگوں
کی طرح ملے ہیں ۔

ابھی تک میرا گھر سٹ (سامان سے لیس ؟)
نہیں ہوا ہے ۔ چار پانچ دن میں فرنیچر آجائے گا ۔۔۔
۔۔۔ ڈیڑھ ہزار میں ایک صوفہ سٹ ایک کھانے کی میز
چھ کرسیاں ہوں گی ۔ ہندوستان میں اتنے روپیوں میں
اعلیٰ درجے کا فرنیچر آسکتا تھا ۔۔۔۔ مگر یہاں کے لوگ
کبھی گرانی کی شکایت نہیں کرتے اصل میں یہاں تنخواہیں
بھی زیادہ ہیں ۔ یہاں کے لوگوں کا رہن سہن ہندوستان
کے مقابلے میں بہت اونچا ہے ۔۔۔۔۔۔ غور کرو ہندوستان
میں یونی ورسٹی لکچرر کی تنخواہ چار سو سے شروع ہوتی ہے ۔
یہاں معمولی ہائی اسکول پاس ساڑھے چار سو روپیہ
پاتی ہیں ۔

یہاں قریب قریب ہر عورت کام کرتی ہے ۔
ایک صاحبہ کو اُن کے میاں نے چھوڑ دیا ہے ۔ دو لڑکیاں
ہیں ۔ مگر یہ سلائی کر کے بہترین زندگی گذر رہی ہیں ۔
ایک تخت پوش کاڑھا تھا اس میں دس پھول تھے ۔
جھلر میں مشین سے کارڈنگ کی تھی ۔ اسّی روپے بنوائی
لی تھی ۔ بھلا ہندوستان میں کون سلوانے والا ہے ۔ اللہ اللہ
کیا کام تھا میں تو دیکھ کر دنگ رہ گئی ۔

ایک اور صاحبہ ہیں ۔ صرف چھٹا درجہ پاس
ہیں ۔ سلائی کا اسکول کھول رکھا ہے ۔ کڑھائی دیکھ کر
حیرت ہوتی ہے ۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اصل تصویر کون
سی ہے اور کڑھائی کون سی ۔ اسی طرح کاغذ کے
پھول بناتی ہیں ۔ میں تو ان لوگوں کا آرٹ

دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ایک لڑکی نے اپنے ہاتھ کی بنائی
ہوئی تصویریں دکھائیں۔ نقل اور اصل میں کوئی امتیاز
نہیں کر سکتا۔ اس نے کہا ہے کہ حسن کا عکس (فوٹو) دیجیے۔
میں ان کی تصویر بناؤں گی۔ غرض یہاں کی ساری عورتیں
کام کرتی ہیں۔ ہماری طرح نکمی نہیں ہیں۔
یہاں روٹی گھر میں نہیں پکتی باقی اور سب کھانا
گھر ہی میں پکتا ہے۔ ہمارے گھر میں ایک روٹی آتی ہے۔
جو ایک وقت کے کھانے سے بچ رہتی ہے اور ناشتہ
کے وقت بھی یہی کام آتی ہے، ڈبل روٹی کا یہاں رواج
نہیں ہے۔ طہران میں البتہ مل جاتی ہے۔
یہاں کے لوگوں کی غذا چیز (پنیر) دہی، مکھن،
کھیرا، انڈے اور پھل ہیں، ہاں گوشت بھی۔ شام کا کھانا
یہ لوگ کم کھاتے ہیں۔ عموماً پنیر روٹی اور ٹماٹر کھا لیتے
ہیں۔ بات یہ ہے کہ کھانے کا سلسلہ دن بھر جاری رہتا
ہے۔ ہر گھر میں کھیرا، انگور، سیب، ٹماٹر چھ چھ سات
سات سیر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں امرود جو سب سے سستا
پھل کبھی کبھار سیر آدھ سیر آجاتا ہے۔ یہاں تربوز خربوزہ
بھی ہر وقت استعمال ہوتا ہے۔
ہر جمعے کو حوض کا پانی بدلا جاتا ہے تو بٹیا اور
مالکِ مکان کا لڑکا خوب تیرتے ہیں۔ اس وقت بٹیا بہت
خوش ہوتی ہیں۔ مگر گھر کے لوگوں کی یاد بہت ستاتی ہے۔
اس وقت ان کی ٹیچر پڑھا رہی ہیں۔ بٹیا
بے چاری بڑی مشکل میں ہیں۔ ایک تو فارسی میں پڑھاتی
ہیں دوسرے ان کا لہجہ بہت مختلف ہے کہ کچھ پلّے نہیں
پڑتا۔ مثلاً دختر، پسر، کم ہمارے یہاں عام لفظ ہیں۔ مگر
یہ لوگ انھیں اسے۔ پھسر، دکھتر، کھم کہیں گے۔
لب و لہجہ کو چھوڑ کر اُردو اور فارسی کے الفاظ
میں کوئی فرق نہیں۔ ہاں فعل کا فرق ہے اور جس طرح ہم
لوگ ردولی دہقانی، بولی میں ایک ٹھو دو ٹھو بولتے
ہیں یہ لوگ بھی کہتے ہیں ایک تھو دو تھو۔
یہ خط کئی قسطوں میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے
تاریخ کا پتہ نہیں۔

تمہاری باجی و آپا جان

جناب مصطفیٰ رشید سیوہاروی

دیہاتی زندگی

آؤ سکھی ری گاؤں چلیں ہم — ریل کو چھوڑ کے پاؤں چلیں ہم
موٹی موٹی روٹی کھائیں — چھاچھ پئیں ندی میں نہائیں
گنگا میں اشنان کریں ہم — چاندی سونا دان کریں ہم
کیسا پاٹ ہے گنگا جی کا! — کیسا ٹھاٹ ہے گنگا جی کا
گھاس ہے کوسوں تک لہراتی — گنگا مائی گیت ہے گاتی
گئو ماتا یہ گھاس ہے چرتی — سارے برتن دودھ سے بھرتی
گئو ماتا اور گنگا مائی! — بھارت دونوں کا شیدائی
گاؤں میں ہے گنگا کی برکت — گنگا نہر بنی ہے رحمت

جب سے ہوئی ہیں نہریں جاری
بھاگی کھیتوں کی بیماری

گیہوں پر شادابی آئی — دھانوں میں سیلابی آئی
پنگھٹ پر اک شور مچا ہے — دائیں بائیں گھڑا دھرا ہے
ایک کہے میں پہلے بھروں گی — ایک کہے میں پہلے بھروں گی
ان کا نیاؤ کون کرے گا؟ — کس کا پہلے گھڑا بھرے گا
ایک اچھلتی کودتی آئی — آ کے گھڑے سے ٹھوکر کھائی

تڑ تڑ سب کے گھڑے جب ٹوٹے
مارے ایک کو ایک کھسوٹے

دیکھو کسان کی قسمت جاگی — ٹڈی اڑ کر کھیت سے بھاگی
خوشی سے شور مچاتا آیا — جانوروں کو اڑاتا آیا!

دیکھو گوپھن گھوم رہا ہے　　ہر اک بچہ جھوم رہا ہے!
شور ہے ہترے ہترے! ہر سو　　ہاہا ہی ہی ہوہو ہوہو

پگڑی باندھے مکھیا آیا　　سر پر ناج کی گٹھری لایا
ناج کو اپنے تول رہا ہے!　　حقہ گڑ گڑ بول رہا ہے
گاؤں والے خوشی مناتے　　باندھ کے گٹھری ہاٹ کو جاتے
سستی ان کے پاس نہیں ہے　　ان میں کوئی اداس نہیں ہے
ماتھے پر چندن کو لگائے　　کنویں پہ بیٹھا پنڈت گائے
ٹھنڈے جل کے پینے والو　　دال بھات پر جینے والو
کھا کر کھیت پہ جاؤ سویرے　　کیا ہی مزا ہے واہ ارے رے
جوار کی روٹی دال سے کھاؤ　　گڑ گھی جیسے مال سے کھاؤ
مچھلی ماس کا نام نہ لو تم
سدا کو پھولو اور پھلو تم

چھو رام چھو...
مسٹر شرنک ٹب میں گیتو....
اسے "سینفورائزڈ" کی مدد سے فوراً نکال پھینکئے

·SANFORIZED·
REGD TD MK

مسٹر شرنک کے ہاتھوں خود کو مجبور اور پشیمان نہ ہونے دیجئے. آپ کے کپڑے کبھی سکڑ کر تنگ نہ ہونگے اگر وہ ایسے سوتی یا سوت ملے ہوئے ہوں جن پر "سینفورائزڈ" کی چھاپ ہوتی ہے.

دنیا بھر میں مانا ہوا اور جانا پہچانا یہ ٹریڈ مارک جو ہندوستان میں تیار شدہ کپڑوں کی برآمد بڑھانے میں بہت اہم تعاون کرتا ہے۔ آپ کے کپڑے نہ سکڑنے کا قابل اعتماد ضامن ہے. اتنا ہی نہیں بلکہ "سینفورائزڈ" چھاپ والے کپڑوں کو سلائی سے پیشتر پانی میں بھگونے کی قطعی ضرورت نہیں. سوتی یا سوت ملا ہوا کپڑا خرید لینے سے پہلے اس کے ہر میٹر پر "سینفورائزڈ" کا نام دیکھ لیجئے.

رجسٹرڈ ٹریڈ مارک "سینفورائزڈ" کے مالکان کلوئٹ پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹیڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ) یو ایس اے میں تشکیل شدہ کا جاری کردہ. صرف اُن جانچ کئے ہوئے کپڑوں پر اس ٹریڈ مارک کو استعمال کیا جاتا ہے یا کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جو نہ سکڑنے کی کھری کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں۔

SAN 7002 UR

جناب خورشید شیدائی

لڑکپن میں

اُستاد اپنے شاگردوں کو چڑیوں کی کہانی سنا رہا تھا۔ اچانک ایک لڑکا جس کی عمر پانچ سال تھی کھڑا ہوا اور کہنے لگا "جناب کیا میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔؟"

"ہاں، کیوں نہیں ضرور" اُستاد نے جواب دیا۔

لڑکے نے کہا "آدمی چڑیوں کی طرح کیوں نہیں اڑ سکتا"؟

بغیر پروں کے اڑنا ناممکن ہے"! اُستاد نے جواب دیا۔

لیکن جناب! پتنگ کے پر نہیں ہوتے، پھر بھی وہ اڑتی ہے۔ - - - یہ سوال سن کر جماعت کا ہر لڑکا ہنسنے لگا۔

اُستاد بہت برہم ہوا۔ اس نے اسی وقت ایک خط اس کی ماں کے نام لکھا۔

آپ کا لڑکا بدتہذیب ہے وہ یہ نہیں جانتا کہ شاگرد کو استاد کے ساتھ کس طرح بات کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ بیوقوف بھی ہے اور نامعقول سوالات کر کے جماعت کا وقت برباد کرتا ہے۔ ہم اسے اپنے اسکول میں نہیں رکھ سکتے: اس لیے آپ مہربانی فرماکر آپ کل سے اسے اسکول نہ بھیجیں"

"یہ خط اپنی ماں کو دے دینا" استاد نے خط لڑکے کو دیتے ہوئے کہا

وہ لڑکا وہ خط لیے اپنے گھر واپس آیا اور اپنی ماں کو دے دیا۔ اس کی ماں نے خط کو پڑھا اور اس پر ناراض ہونے کے بجائے مسکراتے ہوئے کہنے لگی "ٹھیک ہے میرے بچے کل سے تم اسکول نہیں جاؤگے میں تم کو گھر پر ہی پڑھاؤں گی"

وہ لڑکا بہت خوش ہوا اور کہنے لگا "ہاں ماں یہ ٹھیک ہے میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گا۔ گھر پر ہی پڑھوں گا"

دوسرے دن اس لڑکے نے ایک چڑیا کو کیڑے کھاتے ہوئے دیکھا اور دل ہی دل میں بڑبڑایا۔۔۔ اوہ، ایک چڑیا اس لیے اڑ سکتی ہے کہ وہ کیڑے کھاتی ہے۔ اگر آدمی بھی کیڑے کھائے تو وہ بھی ایک چڑیا کی طرح اڑ سکتا ہے"

یہ سوچ کر لڑکے نے کچھ کیڑے مارے اس نے

اس کو میا اور اس سفوف کو پانی میں ملا دیا پھر وہ اپنی ماما کے پاس گیا اور کہنے لگا "کیا تم اسے پیو گی؟"

"یہ کیا ہے؟ ماما نے پوچھا۔

اگر تم اسے پیو گی تو ایک پرندے کی طرح اُڑنے کے لائق ہو جاؤ گی۔" اس نے جواب دیا۔

ماما نے بنا سوچے سمجھے اسے پی لیا اور چند منٹوں بعد قے کرنے لگی۔ جب اس کی ماں نے سارا واقعہ سنا تو آکر اپنے لڑکے پر برس پڑی۔ "تم بہت ہی شریر لڑکے ہو، تم ایک دن ہم سب کو مار ڈالو گے۔"

نہیں ماں! میں کسی کو مارنا نہیں چاہتا۔ میں سبھی کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔" لڑکے نے جواب میں کہا۔

"ایسا تجربہ دوسروں کے ساتھ آئندہ مت کرنا" یہ کہتی ہوئی اس کی ماں اسے کھینچ کر لے گئی اور پڑھانے لگی ——

چند دنوں بعد وہ لڑکا پالتو مرغیوں کی فارم (PAULTRY FARM) دیکھنے اپنی ماں کے ساتھ گیا اس نے ایک مرغی کو انڈے سیتے ہوئے دیکھ کر اپنی ماں سے پوچھا۔ "ماں مرغی کیا کر رہی ہے؟"

"انڈے سے رہی ہے اور پھر اس سے چوزے باہر آئیں گے۔" ماں نے کہا۔

دوسرے دن لڑکے نے ایک درجن انڈے خریدے اور انھیں گھر لایا۔ وہ انھیں سینا چاہتا تھا اس لیے ان پر بیٹھ گیا۔ جب وہ کھڑا ہوا تو اس نے دیکھا کہ سارے انڈے کچل کر برباد ہو چکے تھے لیکن پھر بھی چوزے باہر نہیں آئے تھے۔ بلکہ اس کا پائجامہ خراب ہو چکا تھا۔

اس دن وہ اپنی ماں سے خوب پٹا۔

وہ لڑکا جو بچپن میں ایسے تجربات کیا کرتا تھا بڑا ہو کر ایک بہت بڑا موجد بنا۔۔ "کیا تم اس کا نام جانتے ہو۔۔۔؟"

وہ مشہور موجد **تھومس الوا ایڈیسن** تھا (THOMAS ALVA EDISION)۔ اس نے برقی لیمپ، گراموفون، ووٹ ریکارڈر اور دوسری بہت ساری چیزیں ایجاد کیں۔ جو ہمارے لیے بہت فائدہ مند ہیں۔۔۔

ایڈیسن نے کبھی کہا تھا کہ وہ دنیا کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ اور یہ واقعی اس نے کر دکھایا۔
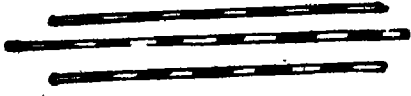
باپو نے کہا تھا

"ہندوستان ایک پرندہ ہے

ہندو اور مسلمان اس کے دو بازو ہیں

آج یہ دونوں بازو بے کار ہو گئے ہیں اور پرندہ اس قابل نہیں رہا کہ وہ آسمانوں میں اُڑ کر آزادی سے سانس لے سکے اور پاکیزہ اور صاف ہوا سے اپنی زندگی قائم رکھ سکے ——"

نوجیون۔ ۲ر نومبر ۱۹۲۴ء

جناب غلام حیدر

(دسمبر کے پیام تعلیم سے سلسلہ ملائیے)

کاغذی لباس پیسہ :-

اب تم کہو گے کہ آج پھر ہم کاغذ کے نوٹ کیوں لے لیتے ہیں اور پھر آج کل تو سکے بھی ایسے چلتے ہیں کہ اگر ان کی دھات کو بازار میں بیچنے جاؤ تو روپیہ کے سکے کے شاید پانچ پیسے بھی نہ مل سکیں۔ بس یہی بات میں تمھیں سمجھانے والا تھا۔ مگر اس بات کو سمجھنے سے پہلے اپنے گھر کے متعلق بھی تو میں تمھیں بتا دوں :-

توجناب میرا اصلی گھر تو خیر سے انسان کی جیب ہے۔ مگر آج کی دنیا میں انسان کی جیبوں کے علاوہ میں ایک اور بڑے گھر میں بھی رہتا ہوں۔ لوگ اسے بینک کہتے ہیں۔ بلکہ اب تو حکومت نے میرے جاری کرنے کا کام بھی ایک بینک کے ہی سپرد کر دیا ہے اور اب جب تم مجھ سے جان کاری پیدا کر ہی رہے ہو تو تھوڑا سا میرے اس گھر کے متعلق بھی جان لو۔

بینک کیا کام کرتا ہے :-

بینک کے دو بڑے کام ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں کہو کہ میرے گھر میں صرف دو کام ہوتے ہیں۔ (۱) لوگوں کو تاجروں کو یا کارخانوں وغیرہ کو روپیہ ادھار دینا/ اس پر تھوڑا سا سود لینا (۲) لوگوں کا روپیہ جمع رکھنا اُس کی حفاظت کرنا تاکہ جب انھیں ضرورت ہو تو وہ اپنا روپیہ لے سکیں۔ اس میں سے پہلا کام تو خیر مہاجن بھی کر لیتے ہیں۔ یعنی روپیہ ادھار دے دیتے ہیں۔ مگر جب سے لوگوں کا روپیہ رکھنے کا سوال پیدا ہوا اسی وقت سے بس سمجھ لو کہ ایسی دلچسپ باتیں پیدا ہوئیں کہ ان سے دنیا کی دولت میں ایک بڑی تبدیلی آگئی۔ آج کل تو روپیہ جمع کرنے پر بینک سے سود بھی ملتا ہے مگر پہلے ایسا نہیں تھا۔ بینک میں روپیہ جمع کرنے کی ایک فیس دینا پڑتی تھی۔ تاکہ بینک لوگوں کی دولت کی حفاظت کرتا رہے۔ اس تبدیلی کی وجہ بھی سمجھ لو۔

بینک تو خیر نہیں مگر بینک کا کام بہت پرانا ہے۔ عراق کے بابل شہر اور افریقہ کے ملک مصر کا

نام تو تم نے اس سے پہلے بھی سن لیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تقریباً دو ہزار سال پہلے وہاں کی عبادت گاہیں کچھ ایسا ہی کام کرتی تھیں جیسا آج بینک کرتے ہیں۔

وہاں سے نکلی ہوئی پتھر کی تختیوں پر لکھی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت گاہیں لوگوں کو سود پر غلہ اور سونا چاندی ادھار بھی دیتی تھیں اور لوگوں کی دولت کو اپنے پاس محفوظ بھی رکھتی تھیں۔

پھر تقریباً چھ سو سات سو قبل مسیح یونان کی عبادت گاہوں نے بھی وہ کام انجام دیا جو آج کے بینک انجام دیتے ہیں۔ مگر یونان کی پرانی تہذیب اور حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی یہ بینک بھی ختم ہو گئے۔

ان کا دوسرا دور یورپ میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تقریباً بارہ سو سال بعد یعنی اب سے کوئی سات آٹھ سو سال پہلے شروع ہوا۔ اکے پہلے ایک ایک آدمی نے اور پھر بعد میں کچھ لوگوں نے مل کر بینک کھولے۔ جن سے لوگوں کو قرض بھی دیا جاتا تھا اور اس کے بدلے میں سود لیا جاتا تھا اور لوگوں کا روپیہ جمع بھی کیا جاتا تھا۔

خیر مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ میری شکل کاغذ میں کیسے بدل گئی۔ تو سنو! بڑے بڑے تاجر جو ہزاروں بلکہ لاکھوں روپیہ کا بیوپار کرتے وہ اپنا روپیہ حفاظت کے خیال سے بینک میں رکھوا دیتے۔ بینک ان کی حفاظت کرتا، اور جمع کرانے والوں سے فیس لیتا۔ جب تاجر کو ضرورت ہوتی تو بینک جاکر اپنی ضرورت کے مطابق روپیہ نکلوا لیتا کچھ دن یوں ہی کام چلتا رہا۔ ہر روز بینک میں دس، بیس سے پچاس آدمی اپنا روپیہ نکلوانے آتے ہوں گے اور دس، بیس سو پچاس اپنا روپیہ جمع بھی کراجاتے ہوں گے۔

ایک بات اور۔ تاجر جب کہیں سامان خریدتے تو انھیں ہزاروں روپیہ لے جانے پڑتے ہیں، انھیں رکھنے اور گننے میں بڑی مشکل پڑتی ہو گی۔ اسی مشکل کی وجہ سے تو انھوں نے بینک میں روپیہ جمع کروایا تھا۔ بینک والوں اور تاجروں میں بعد میں یہ طے پایا کہ بینک ہزاروں روپیہ کے سکّے گن کر دینے کے بجائے ایک یا کئی کاغذوں پر مختلف قسم کی رقمیں لکھ کر تاجروں کو دے دیا کرے گا۔ فرض کرو کہ ایک کاغذ پر لکھا ہے کہ بینک وعدہ کرتا ہے کہ جیسے ہی کوئی شخص یہ کاغذ بینک میں لائے گا اسے فوراً پانچ ہزار روپیہ نقد دے دیئے جائیں گے۔ دوسرے کاغذ پر ایسا ہی وعدہ ایک ہزار روپیہ کے لیے لکھا ہے اور اسی طرح کے کئی کاغذ بینک نے تاجر کو دے دیے یا ان پر صرف رقم نہیں لکھی اور تاجر کے دستخط کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ تاجر نے سامان خریدا اور اس کاغذ پر دستخط کر دیئے رقم لکھی اور سامان بیچنے والے کو دے دیا۔ لیجیے صاحب وہ گننے اور بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرنے کے چکر سے بچا۔ جس نے سامان بیچا ہے اسے جب روپیہ کی ضرورت پیش آئی تو وہ بینک گیا، اور وہ نوٹ دے کر جتنی رقم اس پر لکھی ہے لے لی۔ یا اگر اس کا روپیہ بھی اسی بینک میں جمع ہے تو اس نے وہ روپیہ بھی وہیں جمع کرا دیا۔

اب کچھ کچھ تمھاری سمجھ میں آگیا ہوگا کہ کاغذ دھات کی جگہ کیسے آگیا۔ ایک طرف تو تاجروں نے دیکھا کہ یہ تو بڑی آسانی ہو گئی کہ بغیر روپیہ نکالے ہی روپیہ ادا ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف بڑے بڑے بینکوں کا اعتبار کرنے لگے۔

اب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ایک آدمی کو ایک بینک سے کوئی نوٹ دیا گیا۔ اس نے دوسرے کو دے دیا دوسرے نے جب تیسرے سے سامان خریدا تو اسے دے دیا۔ اسے بھی اس بینک پر اعتبار تھا —— اور کاغذ کا چکر چل پڑا —— بعد میں حکومت نے اپنے بینک کے ذریعے یہ کام شروع کر دیا۔ اب دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں بڑے بڑے نوٹ جاری کرنے کا کام انھی حکومت کے بینکوں کی ذمہ داری ہے۔ جیسے ہندوستان میں یہ کام رزرو بینک کرتا ہے۔

تو بھائی یہ تھی میری کہانی! تم نے دیکھا کہ میں کہاں سے چلا اور کون کون سے سفر اور منزلیں طے کرتا ہوا تمھارے ہاتھوں میں پہنچا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ تم نے مجھے اس وقت دیکھا جب میں صرف معمولی دھاتوں کا لباس پہنے ہوں۔ حالاں کہ کام اب بھی وہی دیتا ہوں جو پہلے دیتا تھا۔ مگر پہلے وقتوں کی شان ہی نرالی تھی۔ کبھی جگمگاتے سونے کے روپ میں مجھے دیکھتے، کبھی دمکتی چاندی میں۔ تم مجھے اس وقت دیکھتے جب کوئی نیا بادشاہ تخت پر بیٹھتے ہی اپنا پہلا ارمان مجھے نئے روپ میں ڈھال کر ہی نکالتا تھا۔ مگر مجھے ہی کیا پرانے وقت تو سبھی کو اچھے لگتے ہیں۔

میں اپنے ملک میں:-

میری عام دنیا کی کہانی تو ہوئی ختم۔ اب میں تمھیں یہ اور بتاؤں گا کہ میں نے خود اپنے ملک ہندوستان میں کون کون سی سیڑھیاں چڑھیں۔ کن کن راستوں پر چل کر، کن کن راجاؤں مہاراجاؤں بادشاہوں کو دیکھتا میں آزاد ہندوستان میں تمھارے ہاتھوں میں پہنچا۔

ہمیں معلوم ہے کہ اب سے کوئی چار یا پانچ ہزار برس پہلے دریائے سندھ کے کنارے کی تہذیب بہت ترقی پر تھی۔ موہنجوداڑو اور ہڑپا کے شہروں کی کھدائی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہاں دھاتوں کا استعمال موجود تھا۔ زیوروں اور برتنوں کے علاوہ اس کھدائی میں کچھ مہریں تو ملی ہیں مگر سکے نہیں ملے اور تم پہلے ہی دیکھ چکے ہو کہ دھات کے سکے تو حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کوئی آٹھ نو سو سال پہلے دنیا میں نظر آتے ہیں۔ اب بھائی یہ بات دوسری ہے کہ دنیا کے کسی اور ملک میں کہیں اس سے بھی پرانے سکے اور بھی دبے پڑے ہوں اور انسان کو ان کی خبر ہی نہ ہو۔

تاریخی اعتبار سے ہندوستان میں سونے کا "دولت" کے طور پر استعمال حضرت عیسیٰ سے کوئی آٹھ سو سال پہلے پتہ چلتا ہے۔ جہاں تک چاندی کا سوال ہے وہ شاید پرانے وقتوں میں ہمارے یہاں کچھ کم تھی اور پڑوسی ملکوں سے سونے کے بدلے میں منگائی جاتی تھی۔ دھاتوں کا استعمال خرید و فروخت میں ہندوستان میں شاید چھٹی یا ساتویں صدی قبل مسیح سے ہوا۔ اسی زمانے کے چاندی کے کچھ ٹکڑے جن پر کچھ ایسے نشان بنے ہوئے ہیں جن کو ابھی تک سمجھا نہیں جا سکا ہے ملے ہیں۔ ہندوستان میں شاید میری سب سے پہلی صورت یہی ہے۔

(باقی اگلے پرچے میں)

جناب عبدالمنان عمر بہرائچی

او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو!

(۱)

دنیا سے جہالت کے اندھیروں کو مٹاؤ
علم و ہنر و فضل کی مشعل کو جلاؤ
احسان سے پیمانِ محبت کو سجاؤ
او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو

(۲)

روٹھی ہوئی دنیا کو گلے بڑھ کے ملا دو
بھٹکے ہوئے انسان کو منزل کا پتا دو
خوابیدۂ غفلت میں جوان کو بھی جگا دو
او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو

(۳)

دشمن ہو کوئی اس سے بھی اخلاق سے پیش آؤ
بدخواہ کے دل کو بھی کبھی ٹھیس نہ پہنچاؤ
بے لطف جبھی غم کی گھٹاؤں میں بھی مسکاؤ
او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو

(۴)

تاریخ کے اوراق کی زینت ہے تمھیں سے
پھولوں کے تبسم میں لطافت ہے تمھیں سے
آنکھوں میں زمانے کی بصیرت ہے تمھیں سے
او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو

(۵)

قائم ہے تمھیں سے چمنِ ہند کی عظمت
اونچا ہوا نام اس کا تمھاری ہی بدولت
تم ہی کو ملی جواہر و گاندھی کی وراثت
او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو

(۶)

تم چاہو تو تقدیرِ اُمم آج سنور جائے
گلشن سے خزاں دور ہو مستانہ بہار آئے
ہر شخص فقط پریم و محبت ہی کے گن گائے
او دیش کی دھرتی پہ ابھرتے ہوئے تارو

امت کی جمع یعنی قوموں کی تقدیر

محترمہ سلمیٰ جاوید

دوستوں کا جھرمٹ

کردار:

بابو جی   راجن   راجن کے بہت سے دوست   مُسلم بابو جی کا ایک دوست

(بابو جی بیٹھک میں گدّی پر بیٹھے ہیں۔ گدّی پر سفید مگر ادھ میلی چادر بچھی ہے۔ پیچھے گاؤ تکیہ رکھا ہوا ہے اس پر جگہ جگہ تیل کے نشان ہیں۔ ان نشانوں پر گرد بیٹھ گئی ہے اور یہ دھبّے کچھ عجیب سے لگ رہے ہیں۔ پاس ہی دو تین 'بہیاں' رکھی ہوئی ہیں جن پر کھاروے کا خول چڑھا ہوا ہے۔ پاس ہی پھول کی دوات اور بالو دانی بھی رکھی ہے۔ ایک قلم بھی رکھا ہوا ہے جس کے نب پر مورچہ (زنگ) لگ رہا ہے اور جو بہت گھس چکی ہے۔ سامنے لکڑی کی تین کرسیاں ہیں جن کی پالش کب کی اتر چکی ہے۔ ایک طرف بہت ہی پرانی بینچ ہے۔ بابو جی کچھ بہی دیکھتے جا رہے ہیں اور پنسل سے جگہ جگہ نشان لگاتے جا رہے ہیں۔ اتنے میں بوٹوں کی کھٹ پٹ سنائی دیتی ہے۔ راجن داخل ہوتا ہے۔)

بابو جی : راجن! میں تم کو کئی دن سے اسی وقت تلاش کراتا ہوں مگر نندو جب بھی تمھیں اندر بُلانے گیا اس نے یہی آکر کہا کہ چھوٹے بابو گھر پر نہیں ہیں۔

راجن : بابو جی! ابھی ابھی میں جیسے ہی باہر سے آیا تو ماتا جی نے مجھ سے کہا کہ بابو جی تمھیں یاد کرتے ہیں۔

بابو جی : نہیں بیٹا۔ کوئی آج ہی تھوڑا میں نے تم کو بلوایا تھا بلکہ چار پانچ دن سے لگاتار اسی وقت تم کو بلانے کے لیے نندو کو بھیجتا رہا ہوں۔

راجن : بابو جی میں صبح بہت ہی سویرے اپنے ایک دوست کے یہاں چلا گیا تھا۔ میرا دوست ایک بڑے سرکاری افسر کا لڑکا ہے۔ اس سے میری بڑی گہری دوستی ہے۔ روزمرہ جب تک وہ مجھ سے مل نہیں لیتا ہے اس کو چین نہیں آتا۔

بابو جی : مگر یہ صرف آج ہی کی بات تو نہیں ہے اور دنوں میں بھی تو تم گھر پر نہیں تھے۔

راجن : بابو جی ویسے کل بھی میں اپنے ایک پریمی کے گھر چلا گیا تھا۔ وہ دوست ایک منسٹر کا لڑکا ہے۔ مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے اور اسی وجہ سے اس کے پتا جی بھی مجھ سے بہت پریم کرتے ہیں بابو جی اگر کوئی کام منسٹری جی سے لینا ہو تو بے کھٹکے کہیے گا۔ فوراً ہو جائے گا۔

لہ چھوٹی سی ڈبیا جس میں ریت یا بالو ہوتا ہے۔ روشنائی خشک کرنے کے لیے

بابوجی : ٹھیک ہے یہ بات تو راجن! مگر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمیشہ ہی اپنے کسی نہ کسی دوست کے یہاں چلے جاتے ہو

راجن : صحیح بات تو یہی ہے کہ میں روز ہی کسی نہ کسی دوست کے یہاں چلا جاتا ہوں. شہر کے جتنے بھی بڑے لوگوں کے لڑکے ہیں ان سبھوں سے میری دوستی ہے. تمام منسٹروں کے لڑکے میرے بڑے پریمی ہیں اس لیے مجھے روز ہی کسی نہ کسی دوست کے گھر جانا پڑتا ہے اور پھر بنا آئے گئے بابوجی! آخر پریم بھاؤ کیسے بنا رہ سکتا ہے۔

بابوجی : ٹھیک ہی ہے یہ بات تو —— لیکن راجن ایک بات یہ ہے کہ دوستوں کی نظر میں تم اسی وقت تک دوست رہ سکتے ہو جب تک کہ تمھاری اپنی گانٹھ میں مضبوطی ہے۔ اگر تمھاری اپنی گانٹھ کھل گئی اور اس میں جھنجی کوڑی نہ رہی تو ساری دوستی دھری رہ جائے گی۔

راجن : نہیں بابوجی، یہ بات نہیں ہے۔ میرے سارے دوستوں میں جو بھاؤ پریم ہے۔ وہ کسی لالچ یا نفع کے لیے نہیں ہے۔

بابوجی : ٹھیک ہی ہوگی یہ بات۔ مگر راجن دنیا میں دوستی کی ریت تو یہی ہے۔ میں تم کو اس بات سے منع تو نہیں کرتا کہ تم دوستوں سے ملو جلو نہیں، ان کے یہاں آؤ جاؤ نہیں لیکن یہ بات بھی سب سے زیادہ ضروری ہے کہ اپنی دکان کا خیال رکھو۔ اس میں جو تمھارے بیٹھنے کا وقت ہے اس کی پابندی کرو۔ دکان کو صرف نوکروں کے سہارے پر ڈال دینا اچھا نہیں ہے۔

راجن : بابوجی اصل بات تو یہ ہے کہ میرے سارے ہی دوست اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ اس پرانی، گلی سڑی دکان پر بیٹھنا مجھے زیب نہیں دیتا۔

بابوجی : ٹھیک تو ہے ضرور یہ بات۔ مگر راجن تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تم اس دکان پر بیٹھ کر محنت نہیں کروگے تو کیسے دال روٹی چلے گی۔ کیسے اتنے بڑے پریوار (کنبے) کا خرچہ چلے گا۔

راجن : میرے دوستوں میں سے ایک منسٹر کے لڑکے زور دے کر کہہ رہے ہیں کہ میں ان کے ساتھ مل کر امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کر لوں۔

بابوجی : وہ تو ٹھیک ہے راجن مگر اس کے لیے ایک تو بہت بڑی پونجی کی ضرورت ہے وہ کہاں سے آئے گی؟

راجن : میں بھی اسی بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اگر اپنی دکان بیچ دوں تو اس سے کچھ رقم مل جائے گی اور کچھ آپ کے پاس پہلے کا جمع ہوگا، کچھ ماتاجی کے زیورات ہوں گے۔ ان سب کو ملا کر یہ کام کچھ نہ کچھ حد تک ہو جائے گا۔

بابوجی : تو کیا اسی وجہ سے تم نے دکان پر بیٹھنا چھوڑ دیا ہے اور دن بھر دوستوں ہی کے ساتھ رہنے لگے ہو؟

راجن : بابوجی اصل میں بڑے کام کے لیے بڑی محنت کی ضرورت پڑتی ہے اسی وجہ سے مجھے بار بار دوستوں سے ملنا پڑتا ہے۔

بابوجی : مگر راجن تم یہ اچھی طرح سے جان لو کہ میرے پاس تو کچھ بھی بچا ہوا نہیں ہے۔ رہا تمھاری ماتاجی کے زیوروں کا معاملہ تو اس کے بارے میں یہ جان رکھو کہ اپنے مرنے سے پہلے تم کو وہ بیچنے کے لیے نہ دے سکیں گی۔

راجن : مگر بابو جی اتنے بڑے کام میں جس میں ہر طرح نفع ہی نفع ہے روپیہ لگ جانے سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پھر تھوڑے ہی دنوں میں میں ماتا جی کے ان زیوروں سے کہیں زیادہ رقم کے زیور بنوادوں گا اور بابو جی یہی نہیں بلکہ بہت ہی تھوڑے دنوں میں آپ اور ہم سب اپنی عالی شان سجی ہوئی کوٹھی میں رہیں گے اور اپنے پاس ایک بہت ہی اچھی کار ہوگی گھومنے پھرنے کے لیے۔

بابو جی : وہ تو ٹھیک ہے راجن! تم کو اس بات کا کیسے یقین ہے کہ تمھارے سبھی دوست اتنی جلدی تم کو اس درجے پر پہنچادیں گے۔

راجن : یہی تو بات ہے بابو جی۔ کسی کو بھی یقین نہیں آسکتا مگر اصلیت تو یہی ہے کہ میرے سارے دوست جہاں میرا پسینہ بہے اپنا خون بہادینے کو تیار رہتے ہیں۔

بابو جی : وہ تو ٹھیک ہی ہوگا۔ مگر راجن بابو اس زمانے میں زبان سے بات کہنے والے تو بہت نکلتے ہیں مگر جب ان کو پرکھا جاتا ہے تو وہ سبھی کورے نکلتے ہیں۔

راجن : نہیں بابو جی! اس دنیا میں ایک ہی سے لوگ تھوڑے ہی ہیں۔

بابو جی : امتحان بہت بڑی چیز ہے راجن — اس میں ہزاروں میں کوئی ایک ہی پورا اترتا ہے اور اُس ایک کے بارے میں بھی مجھے تو شُبہ ہی ہے۔ مجھے تو.....

راجن : بابو جی میں نے کہا نا کہ اب دنیا کافی آگے نکل چکی ہے۔ اب آدمی جو بات زبان سے نکالتا ہے اس کی لاج رکھنے کو وہ پہلے کے لوگوں سے بھی کہیں زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔

بابو جی : تو ٹھیک ہی ہے — ہاں تو یہ تبلاؤ کہ تمھارے کتنے ایسے دوست ہیں کہ کسی اہم موقع پر اور مشکل کام میں تمھاری کچھ مدد کرسکتے ہوں۔

راجن : بابو جی یوں تو ایسے دوستوں کی تعداد بہت زیادہ ہے پر میرے کم سے کم دس بارہ ایسے دوست ہیں جو کسی مشکل موقع پر میری مدد کریں گے اور میرے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھیں گے —

بابو جی : ہاں آج ایک ایسی ہی مصیبت مجھ پر آپڑی ہے راجن بابو — اور میری مصیبت گویا تمھاری مصیبت ہے

راجن : جلدی تبلایئے بابو جی! کیسا دکھ آپ پر پڑگیا ہے جس کی وجہ سے آپ اتنے دُکھی ہیں اور اس قدر پریشان ہیں۔

بابو جی : ٹھیک ہے یہ بات تو، اب راجن تم سے چھپانا کیا۔ آج مجھ سے ایک آدمی کی ہتیا ہوگئی (ایک آدمی کا قتل ہوگیا)

راجن : بابو — جی! آپ سے اور ہتیا! کیسے ہوئی؟ کیا ہوا؟ جلدی تبلایئے مجھے بابو جی۔ میرے دِل کی دھڑکن بند نہو جائے کہیں (رو پڑتا ہے)

بابو جی : بیٹا یہ رونے دھونے کا وقت نہیں ہے۔ اپنی جان بچانے کی فکر کرنا ایسے میں ضروری ہے۔

راجن : بابو جی قصہ کیا ہے آپ بھی تو تبلا نہیں رہے ہیں پوری پوری بات اور میرے دماغ کی حالت خراب ہوتی جارہی ہے۔

بابو جی : بیٹا راجن! بات یہ ہوئی کہ میرا اسامی "اوتار" جس کو تم جانتے ہو کتنا روپیہ اصل اور سود کا اس کے اوپر باقی ہے، آج جب اس کو بلوایا تو پہلے آیا نہیں۔ آنا کانی کرتا رہا۔ پھر جب زبردستی یہاں لایا

گیا تو مجھ سے لڑ بیٹھا۔ مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے اپنی لاٹھی اٹھا کر، آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس کے سر پر کس کر مار دی۔ تم جانو بوڑھا آدمی، فوراً گر پڑا اور گرتے ہی مر گیا۔ اس کا سر کاٹ کر سامنے جھولے میں رکھا ہوا ہے۔ اسی میں چھری بھی ہے۔ نند واس کی لاش لے کر گنگا جی میں ڈبونے گیا ہے۔ بس اب پولیس آنے ہی والی ہے۔ تم جس کے پاس کہو، جو تمہارا جگری دوست ہو، اسی کے پاس چلیں

راجن : بابوجی یہ تو بہت ہی بڑا ہوا۔

بابوجی : بیٹا غصہ میں مت ماری جاتی ہے۔ جو کام زندگی میں نہ ہونا تھا وہ آج مرتے وقت مجھ سے ہو گیا۔ مقدر میں جو لکھا ہوتا ہے وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ چلو تم اپنے کس دوست کے پاس کہتے تھے چلنے کے لیے؟

راجن : مگر پتاجی۔ اتنے وقت دوست اپنے گھروں میں کہاں ملیں گے۔ وہ تو صبح ملتے ہیں یا رات کو ملیں گے۔

بابوجی : تو — خیر کوئی بات نہیں۔ شام کو چلیں گے جب تک کے لیے ہم سب گھر میں بیٹھ رہیں گے۔

راجن : پتاجی — میرا تو دل بیٹھا جاتا ہے۔ اب کیا ہوگا

بابوجی : بیٹا اس طرح گھبرانے سے کام خراب ہو جائے گا اب تو دھیرج سے کام چلے گا اور جتن سے۔

(دن بھر کا تھکا ہارا سورج اب آرام کرنے پچھم کی طرف جا چکا ہے، شام ہو گئی۔ راجن اور بابوجی تیار ہو کر کلکٹر صاحب کے لڑکے کے پاس جا رہے ہیں۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں بابوجی کے ہاتھ میں ایک جھولا ہے جس میں کٹا ہوا سر اور خون میں ڈوبی ہوئی چھری ہے۔)

بابوجی : بیٹا راجن جس سے تمہاری دانت کاٹی دوستی ہو اسی کے یہاں چلو۔

راجن : پتاجی کلکٹر صاحب کا لڑکا میرا دلی دوست ہے اس سے کام بن جائے گا۔ اسی کے یہاں چلتے ہیں۔ بابوجی میرے دوست کا بنگلہ سامنے ہی ہے آپ میرے پیچھے پیچھے چلے آئیے

(راجن ایک بنگلے کے پاس پہنچ کر دروازے میں لگی ہوئی کال بیل کو دباتا ہے اور گھنٹی کی آواز سن کر ایک ملازم دروازے پر آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

راجن : کیا پرمود بابو ہیں؟ ان سے کہو کر راجن آیا ہے۔

(کچھ وقفہ)

پرمود : ہلو راجن، کیسے آج رات کو آئے، سب خیریت تو ہے نا؟

راجن : بھائی پرمود، تم سے کیا چھپاؤں۔ آج مجھ سے ایک آدمی کی ہتیا ہو گئی ہے۔ تمہارے پاس آیا ہوں کوئی راستہ بتلاؤ۔

پرمود : راجن بابو! میں بہت جلدی میں ہوں۔ اس وقت تم سے زیادہ بات نہیں کر سکتا کیوں کہ مجھے کلب پہنچنا ہے۔ اچھا پھر ملیں گے۔ گڈ نائٹ۔

(پرمود جلدی سے دروازہ اندر سے بند کر لیتا ہے)

راجن : بابوجی یہ میرا جگری دوست تھا اس سے تو کوئی کام نہیں نکل سکا۔ وہ کلب جانے کی تیاری میں ہے۔ اب میں ایک دوسرے دوست کے یہاں چل رہا ہوں وہ ایک منسٹر کا لڑکا ہے۔

(دونوں ایک بڑے سے بنگلے کے احاطے میں پہنچتے ہیں۔ گیٹ پر ایک سنتری پہرہ دے رہا ہے۔)

راجن : مجھے رامو بابو سے ملنا ہے۔ ایک پرچے پر اپنا نام لکھ کر سنتری کو دے دیتا ہے (کچھ وقفہ)

سنتری : رامو بابو کے کچھ دوست آئے ہوئے ہیں۔ وہ ان سے تاش کھیل رہے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ آپ کل ان سے دن میں ملاقات کریں۔

راجن : بابو جی! اس دوست سے بھینٹ نہیں ہو سکی۔ اس کے کچھ ملنے والے آئے ہوئے ہیں۔ ویسے اور بھی میرے بہت سے دوست ہیں چل کر ان سے مل لیتے ہیں۔

بابو جی : بات تو ٹھیک ہی ہے راجن! مگر ملنا تو اسی سے ٹھیک ہے جس سے بہت زیادہ دوستی ہو۔ میں نے تمھارے دو متروں (دوستوں) کا حال تو دیکھ ہی لیا ہے۔ ان دوستوں کے پاس لے چلو جو تمھارے پسینہ کی جگہ خون بہانے میں ہچکچائیں نہیں۔

راجن : بابو جی یہ میرے دونوں ہی بڑے اچھے دوست تھے۔ مگر اس وقت ان دونوں نے اپنی آنکھیں ایسی چرائی ہیں کہ اب میں آپ سے اپنی آنکھ نہیں ملا سکتا۔

بابو جی : ٹھیک تو ہے یہ بات پر راجن بابو کیا کوئی دوست اور بھی ایسا ہے جو باقی رہ گیا ہو اور اس سے ملنے کے بعد کوئی راستہ نکل سکتا ہو؟

راجن : بابو جی میرے قلب کی حرکت کہیں بند نہ ہو جائے یہ دوست، جنھوں نے ملنا بھی گوارا نہیں کیا، مجھ سے کس قدر الفت اور اپنایت کی باتیں کرتے تھے۔ اب تو مجھے کسی دوست سے کوئی امید نہیں ہے۔

بابو جی : تو گویا تمھارے دوست کاغذ کے نمائشی پھول تھے۔ ٹھیک ہی ہے راجن بابو۔ میرا تو کوئی دوست نہیں ہے ہاں ایک مسلمان میرا ملنے والا ہے کبھی کبھی اس سے بھینٹ ہو جاتی ہے۔ کہو تو اس سے چل کر مل لیں۔ شاید کوئی کام بن جائے۔ تھوڑا سا آگے ایک گلی میں اس کا مکان ہے چلو مل ہی لیں۔

(آگے ایک تپلی سی گلی میں ایک دروازے کے سامنے جا کر کنڈی کھٹکھٹاتے ہیں۔ ایک دبلا پتلا آدمی نکلتا ہے۔ لنگی باندھے ہوئے، چہرے پر چھوٹی سی داڑھی۔ "ارے بھائی گنپت تم کہاں کہہ کر گلے سے لپٹ جاتا ہے" اور یہ تمھارے ساتھ کون ہے؟"

بابو جی : (گنپت شاد) یہ میرا لڑکا راجن ہے مسلم بھائی۔

مسلم : اچھا میرا بھتیجا ہے راجن (اس کو گلے لگا لیتا ہے) بھائی کہاں سے آ رہے ہو؟ دونوں بہت پریشان سے لگتے ہو۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ بہت بھوکے معلوم ہوتے ہو۔ پہلے چل کر ہاتھ منہ دھو لو میں بازار سے مٹھائی لاتا ہوں کھا لو، تب بات چیت ہو۔

بابو جی : نہیں بھائی کھانے پینے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس وقت بہت پریشان ہیں۔ ایک ہتیا ہو گئی ہے مجھ سے۔ ایک آدمی کا خون کر دیا ہے میں نے۔ اس جھولے میں اس کا سر ہے اور چھری.....

مسلم : تو بھائی اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ پہلے ہاتھ منہ دھو لو۔ کچھ کھا پی لو۔

بابو جی : نہیں کھانے پینے کی بات ہی ابھی چھوڑو۔ مجھے کوئی راہ بتلاؤ کہ میں کیا کروں۔ میں اور میرا اکلوتا لڑکا راجن اور اس کی ماں تینوں تباہ ہو جائیں گے۔ کوئی راستہ بتلاؤ مجھے مسلم بھائی!

مسلم : بھائی صاحب اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے پہلے گھر میں اندر تو چلو

بابو جی : بھائی یہ بھی اندر ہی ہے۔ ہم دونوں بہت گھبرائے ہوئے

ہیں۔ کیا کریں۔

مُسلم : (بابوجی سے تھیلا لے لیتا ہے) گنپت بھائی! آپ چلیے ہاتھ منھ دھوئیے۔ کچھ کھائیے پیجیے اور جاکر آرام سے اپنے گھر سو جائیے۔ میں ابھی اس سر اور چھری کو لے کر تھانے جاتا ہوں اور اقرار کیے لیتا ہوں کہ اس آدمی کا خون میں نے کیا ہے۔

بابوجی : راجن بابو۔ دیکھا تم نے دوستی کا اصل روپ اسے کہتے ہیں دوستی اور اس کا نام ہے متر تا۔

راجن : بابوجی میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے لوگوں کو پہچانا نہیں۔ آپ کے متر صرف متر ہی نہیں بلکہ دیوتا ہیں۔

بابوجی : میرا ان سے تھوڑا سا میل جول ہے کوئی بہت زیادہ نہیں۔ لیکن دیکھو ان کی حالت!

مُسلم بھائی وہ جھولا مجھے دے دو۔ میں اپنی کی ہوئی ہتیا تمھارے سر نہیں تھوپ سکتا۔ میں دو پاپ ایک ساتھ نہیں کر سکتا۔

مُسلم : گنپت بھائی! ایسی بات کہہ کر ہمارے آپس کے میل جول کی توہین نہ کرو۔ یہ جان دوستی اور پریم سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہے۔

بابوجی : (گنپت) مُسلم بھائی جس طرح تم دوستی دوستی کا بکھان کر رہے ہو اور ایک معمولی ملنے جلنے والے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا رہے ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے تمھارے ساتھ آج تک کوئی پریم کا سلوک بھی نہیں کیا ہے نہ روز تم سے ملنے تمھارے گھر آیا۔ نہ تم نے کبھی مجھے دکان بیچنے کی صلاح دی، نہ تم نے میرے پیشے کو بُرا سمجھا۔ ہمارے اکلوتے بیٹے راجن کو دیکھیے۔ پورا شہر ان کا دوست ہے۔ ان کے دوست ان کی دکان داری کو بُرا سمجھتے ہیں۔ ان کو اونچے اونچے محل دکھاتے ہیں۔ جہاں ان کا پسینہ گرے وہاں وہ اپنا خون بہانے کو تیار ہیں۔ لیکن حال یہ ہے کہ جب جگری دوست نے ان سے سنا کہ انھوں نے ایک آدمی کی ہتیا کر دی ہے تو وہ دروازہ بند کر کے بیٹھ رہا۔ دوسرے نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اُن پر ان کو اتنا بھروسہ تھا کہ آج کل کی دوستی کو بڑا اونچا درجہ دے رہے تھے۔

ہے نا راجن بابو۔ یہی بات!

راجن : بابوجی! اب آپ مجھ کو زیادہ شرمندہ نہ کریں۔ دوستی اسی کا نام ہے جو مُسلم چاچا نے آپ سے کی۔

(بابوجی مُسلم کے ہاتھ سے تھیلا چھین لیتے ہیں اور اس میں سے بکری کا سر اور چھری نکالتے ہیں

دیکھو یہ ہے میری ہتیا اور میں ہوں ایسا ہتیارا)

(تینوں ہنستے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

مربع بنائیے

صفحہ ۱۵ پر آپ کاغذ کے ٹکڑوں سے مربعے بنا چکے ہیں کاغذ کے یہ ٹکڑے بھی ایک مربع سے کاٹے گئے ہیں۔ کیا آپ ان ٹکڑوں کو پھر اس طرح جوڑ سکتے ہیں کہ یہ بالکل چوکور شکل کا بن جائے؟ کوشش تو کیجیے۔

جواب ص۴۸ پر

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

میزمیر سمندر کے کنارے پر آباد ہے۔ شہر کا بڑا حصہ ویران ہے۔ میزمیر کے بادشاہ کا نام عمر بک ہے۔ قلعہ میں رہتا ہے۔ میرے آنے کی خبر ملی تو خانقاہ میں آکر مجھ سے ملا۔ شاہی کھانا بھیجا، ایک غلام جس کا نام لقومہ تھا میری خدمت کے لیے اور کمخواب کے دو تھان بطور تحفہ بھیجے۔

کمخواب بغداد، نیشاپور اور چین میں بنایا جاتا ہے۔ شاہی امام نے مجھے بتایا کہ بادشاہ کے پاس اس وقت بس یہی ایک غلام تھا جو آپ کو بخش دیا۔

یہاں کے بزرگوں میں شیخ عزیزالدین بن احمد رفاعی ہیں۔ بادشاہ ان کے ساتھ بہت سلوک کرتا ہے۔ عمر بک کے پاس جنگی کشتیاں ہیں۔ جن پر سوار ہوکر اکثر قسطنطنیہ والوں پر دھاوا کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ قسطنطنیہ والوں نے اپنے پوپ سے شکایت کی اور خوب لڑائی ہوئی۔

میزمیر سے مغنیشہ پہنچے جہاں کا بادشاہ صاروخان ہے۔ عید کی نماز ہم نے اسی بادشاہ کے ساتھ پڑھی۔

میرے رومی غلام نے عجیب چالاکی کی کہ میرا گھوڑا اور شہر کے دوسرے امیروں کے گھوڑوں کو پانی پلانے لے گیا اور بھاگ گیا۔ جلدی دوڑ دھوپ کی گئی تو گھوڑے مل گئے ورنہ بڑی دشواری ہوتی —

یہاں سے برغمہ گئے۔

برغمہ کہتے ہیں کہ افلاطون حکیم اسی برغمہ کا رہنے والا تھا۔ اور اب تک اس کا گھر افلاطون کے گھر کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کے بادشاہ کا نام بخشی خاں ہے۔ برغمہ سے بلی کسرے ہو کر برصی (بروصہ) پہنچے، یہاں کا بادشاہ دمورخاں اچھا آدمی نہیں ہے۔

بروصہ اچھا شہر ہے۔ شہر کے باہر پانی کی ایک نہر ہے۔ جس میں پانی خوب گرم بہتا ہے۔ نہر ایک حوض میں گرتی ہے۔ حوض پر زنانہ اور مردانہ حمام بنے ہیں۔ جس میں غسل کرنے سے بہت سی بیماریاں دور ہوجاتی ہیں۔ ایک خانقاہ بھی ہے جس میں تین دن تک مسافروں کو کھانا دیا جاتا ہے۔ یہ خانقاہ کسی ترکمان بادشاہ نے بنائی ہے۔ شہر میں ہم اخی شمس الدین کی خانقاہ میں ٹھہرے ہیں۔

اخی شمس الدین نے ہمارے اعزاز میں شہر والوں

کی بڑی دھوم کی دعوت کی مجدالدین قونوی نے تقریر
کی قاریوں نے کلام مجید کی تلاوت کی مجدالدین قونوی
بہت نیک آدمی ہیں۔ تین دن میں روزہ افطار کرتے
ہیں اور اپنی محنت کی کمائی کے سوا کسی کا کھانا نہیں
کھاتے۔

ان کی تقریر اتنی بااثر ہے کہ ایک دن مجلس
وعظ ہی میں ایک شخص چیخیں مارنے لگا اور بے ہوش
ہوگیا۔ گلاب اور کیوڑا چھڑکا مگر ہوش نہ آیا اور صبح
ہوتے دنیا سے رخصت ہوگیا۔

لوگوں نے بتایا مجدالدین قونوی کا نہ کوئی
گھر ہے نہ ان کے پاس کوئی سازوسامان ہے۔ رات کو
کسی وقت قبرستان میں سو جاتے ہیں عبداللہ مصری
سیاح سے بھی ملاقات ہوئی۔ بڑے سیاح ہیں۔ مگر
چین، لنکا، اندلس، سوڈان کی سیر نہیں کی اس لیے
سیاحت میں مجھے ان پر فوقیت ہے۔

بروصہ کا سلطان اختیارالدین اُرخان ہے۔
اس کی عملداری میں ایک سو قلعے ہیں۔ اپنے ملکوں کی
ہمیشہ دیکھ بھال رکھتا ہے اور دورے کرتا رہتا ہے
بروصہ کو اس کے باپ نے رومی عیسائیوں سے چھینا
ہے۔ یہاں سے نیزنک ہوتے ہوئے کرلہ پہنچے۔

کرلہ میں چار شہر پناہیں ہیں۔ دونوں کے
بیچ میں خندق ہے۔ جس میں پانی بھرا رہتا ہے لکڑی
کے پل سے گذر کر شہر میں جاتے ہیں۔ یہ ٹوٹواں
پل ہے جب چاہو اٹھالو۔ شہر میں باغ، زمینیں،
کھیت اور کنوئیں ہیں۔ ہر رنگ کے پھل پیدا
ہوتے ہیں۔

یہاں کا انگور جنھیں عذاری کہتے ہیں حد درجہ
میٹھا، بہت بڑا، صاف رنگ، باریک چھلکے کا ہوتا ہے
میں ایک بیج نکلتا ہے۔ یہاں میں سلطان علاءالدین یوکی
کا مہمان رہا۔ یہ کرلہ کے فاضل بزرگوں میں ہیں۔

علاءالدین صورت کے بھی اچھے ہیں اور سیرت
کے بھی اچھے ہیں۔ کرلہ میں مجھے چالیس دن ٹھہرنا پڑا
کیونکہ میرا گھوڑا بیمار ہوگیا تھا۔ یہاں سے چل کر ہم
ایک گاؤں میں ٹھہرے اس کا نام مکجا ہے۔

مکجا سے چلے تو ایک بڑا دردناک واقعہ پیش
آیا ہم سے آگے ایک ترک خاتون اور اس کا غلام
جا رہے تھے۔ سامنے ندی آئی جس کا نام سقری ہے۔
ترک خاتون نے گھوڑا ندی میں ڈال دیا۔ جوں ہی
گھوڑا منجدھار میں پہنچا خاتون گھوڑے سے گر پڑی
غلام نے بچانا چاہا تو وہ بھی ڈبکیاں کھانے لگا۔
تیراک لوگوں نے دیکھا تو ندی میں کود پڑے۔ خاتون
کو نکال لائے مگر غلام مرچکا تھا۔

یہاں سے ہم کاویہ پہنچے۔ خانقاہ میں پہنچ کر
بات کرنی چاہی تو ہماری بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی
کاویہ کے لوگوں نے اپنے شہر کے امام کو بلایا وہ کچھ بھی
نہ جانتا تھا لوگوں پر اپنا رعب جمانے کے لیے بولا۔

ایشاں کہنہ عربی می تواں د من
عربی نو میدانم۔

یہ لوگ پرانی عربی جانتے ہیں۔ نئی
عربی نہیں بول سکتے جسے میں جانتا ہوں

بے چارے سیدھے سادھے اس کی بات سچ سمجھ
گئے۔ مگر ہماری اس لیے خوب خاطر مدارات ہوئی کہ ہم
لوگ عربی جانتے ہیں جسے رسول اللہؐ بولتے تھے۔ امام بھی

کے یہ الفاظ ہم نے یاد کر لیے تھے جب ہم فارسی سمجھنے لگے تو معلوم ہوا کہ امام صاحب نے کس چالاکی سے اپنا بھرم قائم رکھا۔

کادیہ سے نجا پہنچے۔ بھائی چارہ کمیٹی کی خانقاہ ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک درویش دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے عربی میں پوچھا "کیا یہ اخی کی خانقاہ ہے" کہیں سے لفظ نعم سیکھ لیا تھا۔ بولا "نعم" (ہاں) مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ایک عربی جاننے والا مل گیا۔ جب اور کچھ پوچھا تو بے چارہ عربی سے کورا تھا۔

پھر ہم کینوگ گئے پوری بستی میں ایک گھر مسلمان کا تھا۔ باقی سب رومی عیسائی ہیں۔ کینوگ کا حکمراں سلطان ارخان ہے۔ ہم ایک غیر مسلم بڑھیا کے گھر ٹھہرے بڑھیا نے ہماری بڑی خاطر کی۔

کینوک میں زعفران کی پیداوار خوب ہوتی ہے۔ ہمارے پاس بھی بڑھیا زعفران لے کر آئی کہ ہم سوداگر ہیں۔ بھائی چارہ کمیٹی نے راستہ بتانے کے لیے ایک آدمی ساتھ کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ دوسرے شہر کو گئے تمام راستہ پر برف جما ہوا تھا۔ کچھ دور چل کر یہ آدمی بھاگ گیا اب ہمیں کچھ خبر نہ رہی کہ راستہ کدھر ہے سورج ڈوبنے لگا اور راستہ کا پتہ نہ چلا۔ ایسی کوئی جگہ بھی نہ تھی کہ رات گذر جاتی ڈر تھا کہ برف پڑنے لگی تو بچنا مشکل ہو جائے گا۔ میرا گھوڑا خوب مضبوط تھا اس لیے سوچا کہ آگے بڑھ کر بستی تک پہنچ جاؤں تو ساتھیوں کے لیے جگہ مل جائے گی۔ آخر میرا گھوڑا بستی تک پہنچ گیا۔ اس بستی میں قبروں پر لکڑی کے گھر بنے ہوئے ہیں دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ رہنے کے گھر ہیں۔

بستی کے ایک گھر کے دروازہ پر میرے کبھی کے جانے بوجھے درویش بیٹھے تھے میں نے اپنے ساتھیوں کی مصیبت سنائی تو یہ دوسرے درویشوں کو لے کر گئے اور میرے ساتھیوں کو لے کر آئے الحمدللہ

صبح ہوتے ہی مطرنی روانہ ہو گئے، مطرنی میں بھائی چارہ کمیٹی کی خانقاہ ہے مگر اس میں جانوروں کے باندھنے کی جگہ نہ تھی۔ سردی کی شدت کے سبب جانوروں کی بڑی مشکل تھی۔ اتفاق سے ایک حاجی سے ملاقات ہو گئی جو عربی جانتا تھا اس سے ذکر کیا کہنے لگا آپ نے دیکھا نہیں یہاں گھروں کے دروازے کتنے چھوٹے ہیں۔ بازار میں ایک چھتہ ہے وہ جگہ مناسب ہے

ہم نے اپنے گھوڑے چھتہ میں باندھ دیے اور ہمارا ایک آدمی رات بھر پہرا دیتا رہا۔ زبان نہ جاننے کا ایک لطیفہ یہ ہوا کہ ہمارا آدمی گھی لینے بازار گیا۔ جب اس نے گھی مانگا تو دکان دار نے گھی کی جگہ گھاس دے دی یہ حیران ہو کر رہ گیا۔ آخر گھی کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ" تو گھی ملا۔

جس حاجی سے ہماری ملاقات ہوئی تھی اس نے ہم سے کہا کہ یہاں سے قطونیہ چلیے میں نے اسے کپڑے اور روپے دیے تاکہ وہ ہمارے ساتھ چلے بعد میں پتہ چلا کہ یہ بڑا امیر ہے اور ساہوکارہ کرتا ہے۔

کمبخت اتنا کنجوس تھا کہ روٹی کے بچے ہوئے ٹکڑے بیچ کر پیسے اکٹھا کرتا اور سودا سلف کے لیے ہم دام دیتے تو اس میں کٹوتی کرتا۔ زبان نہ جاننے کے سبب اس کی بے ہودگیاں برداشت کرنی پڑیں مگر کب تک؟

اس لالچی آدمی کا باقی دلچسپ قصہ اگلے ماہ

جناب رضا چکدیوی

ماں کی تمنّا

اٹھ صبح کا اجالا دنیا پہ چھا رہا ہے
چڑیوں پہ چہچہانا دل کو لبھا رہا ہے

سورج نے اس جہاں کو پھر سے سجا دیا ہے
سوئے تھے جو گھروں میں ان کو جگا دیا ہے

اسکول جا رہے ہیں لڑکے دبائے بستہ
راہی تھے جتنے بھٹکے اب پا رہے ہیں رستہ

سستی سے میل رکھنا اچھا نہیں ہے بیٹا
اٹھ میرے لال تو بھی کیوں اب تلک ہے لیٹا

سب تیرے دوست ساتھی آگے کو چل رہے ہیں
رستے میں جو گرے تھے وہ بھی سنبھل رہے ہیں

یہ وقت قیمتی ہے کیوں اس کو کھو رہا ہے
کیوں مفت کاہلی میں لٹیا ڈبو رہا ہے

لکھنا ہے کام تیرا بڑھنا ہے کام تیرا
منزل ہے تیری آگے بڑھنا ہے کام تیرا

جلدی قدم اٹھا کر منزل کو اپنی پالے
گھبرا نہ جانا بیٹا پڑ جائیں لاکھ چھالے

طوفاں میں کود بھی پڑ مل جائے گا کنارہ
تیرے وطن کی ممتا دے گی تجھے سہارا

اتنا کمال پالے چڑھ جا تو آسماں پر
اے کاش چاند بن کر چمکے تو اس جہاں پر

ساری مصیبتوں کو رستے سے اب ہٹا دے
جنگ و جدل ہے ہر جا سب کو گلے لگا لے

انسانیت کو بڑھ کر سینے سے تو لگا لے
دیوی جو امن کی ہے اس کو دلہن بنا لے

بس فتح و کامرانی ہر دم تری بلائیں
ہو نام تیرا روشن دیتی ہوں میں دعائیں

جناب بدرالدین استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ

گلی ڈنڈا

(ایک دیہاتی عورت سردارن اپنے
آنگن میں بیٹھی آٹا گوندھ رہی ہے اچانک
باہر سے آکر ایک گلی گرتی ہے کونڈے کے
پاس گرتی ہے سردارن کو گلی دیکھ کر غصہ
آگیا۔ بڑبڑاتی ہوئی تیزی سے اٹھتی ہے)
"ئے ہے ناس جائے ان گلی کھیلنے والوں کا۔ ابھی
میرا سارا کا سارا آٹا مٹی میں مل جاتا"۔
(یہ کہتی ہوئی دیوار کی طرف لپکتی ہے)
سردارن :۔ "ئے او چھدو کی ماں اِدھر تو آ"۔
چھدو کی ماں :۔ "اری کیا ہے سردارن۔ آرہی ہوں"۔
سردارن :۔ "اری جلدی اِدھر تو آئے دیکھ اپنے بیٹے
کے کرتوت ابھی میرے آٹے کا بیڑا غرق کیا ہوتا
آٹے میں گلی گر جاتی تو کیا تو پیسے دے دیتی"۔
(چھدو کی ماں دیوار پر آکر کھڑی ہوتی ہے)
چھدو کی ماں :۔ "اری کیا ہوا سردارن. ذرا سی گلی
آکر گر گئی تو سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ بچے ہی
تو ہیں کیا ہوا جو گلی آگئی"۔
(اتنے میں چھدو کی ماں کی پڑوسن سہیلی آتی ہے)
سہیلی :۔ اری کیا ہوا چھدو کی ماں کیوں شور
مچا رہی ہے؟

سردارن :۔ "لو وہ اور آئی پڑوسن کی حمایت لینے ذرا
دیکھے گی بھی چھدو کی ماں کے چہیتے کے کرتوت
یا یوں ہی حمایت لینے آگئی"۔
لے دیکھ یہ گلی ابھی میرے آٹے کے قریب
آکے گری ہے۔ ابھی دو دن پہلے اس کے
لڑکے کی گلی سے میرا گھڑا ٹوٹا تھا۔ ارے
ذرا تم ہی انصاف کی کہو"۔
کیوں ری چھدو کی ماں کیا کہتی ہے آخر تو
نے سوچا کیا ہے۔ کبھی روکے گی بھی اپنے پوت
کو یا یوں ہی محلے والے پریشان ہوتے رہیں گے اگر
تجھ سے اپنا بیٹا نہیں رکتا تو لا ہمیں پکڑا دے۔ ہم
ایک دن میں اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیں گے"۔
چھدو کی ماں :۔ (تڑخ کر) اے ہٹ منہ سنبھال کر
بات کر بڑی آئی ہڈی پسلی ایک کرنے والی میں
تو تیرے گھر بھر کی ہڈی پسلی ایک کر دوں
گی تو ہے کس گھمنڈ میں"۔
سردارن :۔ اری تو تو کیا کرے گی۔ لا میں تیری زبان
ہی ابھی چٹیا سے باہر کھینچ لوں۔
(دوڑ کر چٹیا لاتی ہے)
(چھدو کی ماں کی پڑوسنیں اور سردارن کی پڑوسنیں

دونوں طرف سے بہت سی عورتیں جمع ہو جاتی
ہیں دونوں طرف سے خوب تو تو میں میں
ہونے لگتی ہے۔ اتنے میں محلے کے بزرگ
کالو دادا آتے ہیں)

"ارے بھئی یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم لوگوں نے
کہیں عورتیں بھی اس طرح زور زور سے لڑتی
ہیں۔ ارے بھئی مجھے بھی تو بتاؤ ہوا کیا؟"

(دونوں طرف کی عورتیں کالو دادا کو اپنا
مقدمہ سناتی ہیں۔ گاؤں کے سرپنچ حمید آبا
آجاتے ہیں۔)

حمید آبا:۔ ارے بھئی کیا ہوا لڑکیوں کیسا شور ہے؟
کیوں جی کالو دادا کیا معاملہ ہے۔ مجھے تو بتاؤ۔

کالو دادا:۔ اجی ہوا کیا یہ سب گلی ڈنڈے کا جھگڑا
ہے۔ نہ محلہ کے لڑکے گلی ڈنڈا گلیوں میں کھیلیں
نہ یہ آفت مچے۔

(حمید آبا سارا قصہ سن کر کہتے ہیں۔)

حمید آبا:۔ اچھا بھئی ساری عورتیں تو اپنے گھروں میں جائیں
میں ابھی یہ قصہ چکائے دیتا ہوں۔
سنو جی کالو دادا آج سے کوئی لڑکا گلیوں میں
گلی ڈنڈا نہیں کھیلے گا۔ جو کھیلے گا اسے سزا دی
جائے گی اور جرمانہ ہوگا۔ جس کو گلی ڈنڈا
کھیلنا ہو وہ آبادی سے باہر کھیتوں میں
جاکر کھیلے۔ اور میں تو یوں کہوں کہ وہ
شہر کے اسکولوں میں جو اچھے اچھے کھیل
کھیلے جاتے ہیں وہ یہاں گاؤں میں کیوں
نہ کھیلے جائیں۔"

کالو دادا:۔ "بھلا وہ کون سے کھیل ہیں سرپنچ جی؟"

حمید آبا:۔ اجی ابھی کل ہی تو میں شہر میں دیکھ کر آیا
ہوں ان کھیلوں کے نام ہیں۔ والی بال، فٹبال
بیڈمنٹن۔ اجی بڑے صاف ستھرے کھیل ہیں۔
نہ کپڑے گندے ہوں نہ ہاتھ منہ ٹوٹے۔ نہ
محلہ والوں کو شکایت ہو۔"
"بس جی کالو دادا اب میں گاؤں کے لوگوں
سے یہی کہوں گا کہ سب تھوڑے تھوڑے
پیسے جمع کرکے ایسے صاف ستھرے کھیلوں کا
انتظام کریں۔" آئے دن کا جھگڑا بھی ختم
ہو جائے گا اور اپنے لڑکے بھی کام سے لگے
رہیں گے۔"

(کالو دادا اور حمید آبا باتیں کرتے
ہوئے چلے جاتے ہیں۔ چھدو گلی ڈنڈا
ہاتھ میں لئے اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے۔
چھدو کی ماں غصہ میں بھری ایک طرف
بیٹھی ہے۔)

چھدو:۔ "لا اماں روٹی دے۔"

چھدو کی ماں:۔ (زور سے چیختی ہے) ہاں ہاں ضرور
دوں گی تجھے روٹی۔ تجھے تو پراٹھے کھلاؤں گی
کمبخت آج تیری وجہ سے سارے محلہ میں جھگڑا
ہوا تیری خاطر مجھے سب عورتوں کی بری بھلی
سننی پڑیں۔ لا آج تو تیرے ہی گلی ڈنڈے
سے تجھے ختم کر دوں گی۔"

(چھدو کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین کر مارنا
شروع کرتی ہے اور چھدو چیختا ہے۔
اری ماں اب نہیں کھیلوں گا۔ ہائے

(ہنستے ہیں محلہ کی عورتیں آواز سن کر آتی ہیں اور چھدو کو بچا لیتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں چھدو کے کئی دوست لڑکے دروازہ پر آتے ہیں - - - -)

لڑکے :۔ "ارے چھدو چل گلی ڈنڈا کھیلیں گے۔"

چھدو :۔ (باہر آتا ہے) نہیں بھئی میں اب گلی ڈنڈا نہیں کھیلوں گا۔ یارو آج بہت مار پڑی ہے بس اب تو کوئی اور اچھا کھیل کھیلیں گے۔

چھدو کے دوست :۔ اچھا بھئی تو پھر ہم بھی چھوڑتے ہیں آج سے گلی ڈنڈا۔ چلو یار چھدو ان گلی ڈنڈوں کو آگ لگا دو۔

(سب گلی ڈنڈوں کو جمع کر کے آگ لگا دیتے ہیں اور آگ کے چاروں طرف بیٹھ کر قوالی گاتے ہیں - - - -)

گلی ڈنڈا چھوڑ دو اس کا بُرا انجام ہے
سب پڑوسی لڑ پڑیں کیا خوب یہ انعام ہے

گلی ڈنڈے کی بدولت ہڈی ہڈی چور ہے
سارے کپڑے پھٹ گئے صورت بنی لنگور ہے
گلی ڈنڈا چھوڑ دو اس کا بُرا انجام ہے
گلی ڈنڈا کچھ نہیں اس کا نتیجہ جیل ہے !
سیدھمنٹی آکے دیکھو کیسا انوکھا کھیل ہے
گلی ڈنڈا چھوڑ دو اس کا بُرا انجام ہے
سب پڑوسی لڑ پڑیں کیا خوب یہ انعام ہے

جناب رفیق شاستری ایم اے

پنچ تنتر کی کہانیاں

سونے کے ہنس

ہری دت برہمن نے تب لوگوں کو ہنسوں کی یہ کہانی سنائی۔

کسی شہر میں راجہ کے تالاب میں سونے کے ہنس رہا کرتے تھے۔ راجہ کے سپاہی ہر وقت اس تالاب کی حفاظت پر تعینات رہا کرتے تھے۔ یہ ہنس ہر چھ مہینے میں ایک بار اپنے پر جھاڑا کرتے تھے۔ اس سے راجہ کو بہت سے سونے کے پر مل جاتے تھے۔

کچھ دن بعد وہاں ایک سونے کی دوسری چڑیا آگئی۔ ہنسوں نے اس سے کہا کہ تم اس تالاب میں مت رہا کرو۔ ہم لوگ ہر چھ مہینے میں ایک بار اپنے سونے کے پر راجہ کو دے کر اس تالاب میں رہتے ہیں۔ اس چڑیا نے ہنسوں کی بات ان سنی کر دی۔ دونوں میں کشمکش چلتی رہی۔

ایک دن وہ چڑیا راجہ کے پاس جاکر کہنے لگی۔ حضور یہ ہنس کہتے ہیں کہ یہ تالاب راجہ کا نہیں بلکہ خود ان کا ہے راجہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں نے ان سے منع کیا کہ راجہ کی شان میں یہ گستاخی ٹھیک نہیں مگر وہ نہ مانے۔

راجہ نے چڑیا کی بات کو سچ مان لیا اور تالاب کے سنہرے ہنسوں کو مارنے کا حکم دے دیا۔

جب ہنسوں نے سپاہیوں کو تیر کمان اور لاٹھیوں سے لیس اپنی طرف آتا ہوا دیکھا تو بھانپ گئے کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ اپنے بزرگ کی رائے سے وہ فوراً تالاب کو چھوڑ کر اڑ گئے۔

اپنے عزیز و اقارب کو یہ کہانی سنانے کے بعد ہری دت برہمن نے پھر اپنے کھیت کے ناگ دیوتا کی پوجا کی بات سوچی۔ دوسرے دن وہ پہلے کی طرح دودھ لے کر بل کے پاس پہنچ گیا اور گیان دھیان میں لگ گیا۔ سانپ بہت دیر بعد تھوڑا سا بل کے باہر نکل کر برہمن سے بولا

اے برہمن تو عقیدت سے نہیں بلکہ لالچ کی خاطر یہاں آیا ہے۔ اب ہمارا تمھارا ناتا نہیں ہو سکتا تیرے بیٹے نے جوانی کے جوش میں مجھ پر لاٹھی کا وار کیا۔ میں نے ڈس لیا۔ اب نہ تم ہی بیٹے کا غم بھول سکتے ہو نہ میں لاٹھی کے وار کا منظر بھلا سکتا ہوں۔

یہ کہہ کر وہ سانپ ایک بہت بڑا ہیرا اس جگہ چھوڑ کر اپنے بل میں واپس چلا گیا۔

نرم دل وزیر کی رائے :-

یہ کہانی سنانے کے بعد الوشاہ کے گرم مزاج وزیر نے کہا۔ اسی لیے میں کہتا تھا کہ ایک بار کی ٹوٹی ہوئی ہمت کی ڈور پھر نہیں جڑ سکتی۔

گرم مزاج وزیر سے مشورہ کرنے کے بعد الوشاہ نے اپنے دوسرے وزیر نرم دل سے صلاح لی کہ کوّے شاہ کے خاص وزیر کا کیا کیا جائے۔

نرم دل بولے :- مہاراج میری رائے میں تو اپنی پناہ میں آنے والے کی جان لینا پاپ ہے۔ پناہ لینے والے کی خاطر تواضع تو ہمیں اسی طرح کرنی چاہیے جس طرح کبوتروں نے اپنا گوشت دے کر شکاری کی جان کی حفاظت کی تھی۔"

الوشاہ نے پوچھا :- "وہ کیسے ؟

تب نرم دل نے کبوتر اور شکاری کی یہ کہانی سنائی۔

کبوتر کی قربانی :-

ایک دن ایک شکاری اپنا جال لیے جنگل میں گھوم رہا تھا۔ دن بھر اسے کوئی شکار نہیں ملا۔ شام ہوتے ہوتے ایک کبوتری اس کے جال میں پھنس گئی۔ اسے لے کر اپنے گھر کی طرف بڑھا ہی تھا کہ خوب موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بھیگتا اور سردی سے ٹھٹھرتا وہ شکاری کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی دور پر اسے ایک پیپل کا پیڑ دکھائی دیا۔ شکاری پیپل کے پیڑ کی کھول میں یہ کہہ کر گھس گیا کہ اس پیڑ میں جو بھی رہتا ہے میں اس کی پناہ میں آتا ہوں۔ اس وقت جو میری مدد کرے گا میں زندگی بھر اس کا احسان مانوں گا۔

اس کھول میں وہی کبوتری اپنے کبوتر کے ساتھ رہتی تھی جو اس شکاری کے جال میں پھنسی ہوئی تھی۔ کبوتر کھول میں تن تنہا کبوتری کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کبوتر کو اداس اور خاموش دیکھ کر وہ بولی "یہ ہماری قسمت کا چکر ہے جو میں شکاری کے جال میں پھنسی ہوئی ہوں۔ مگر تم میری فکر چھوڑ کر پہلے اپنی پناہ میں آنے والے اس شکاری مہمان کی خاطر تواضع کرو۔

کبوتری کی بات سن کر کبوتر شکاری سے بولا "شکاری تم فکر نہ کرو اس گھر کو بھی اپنا سمجھو بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں ؟"

شکاری بولا :- "بھائی مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے اسے دور کرنے کی کچھ تدبیر کرو۔"

کبوتر نے آس پاس سے لکڑیاں چن کر وہاں جمع کر دیں۔ اور کہیں سے ایک جلتی ہوئی لکڑی لاکر اس پر ڈال دی۔ بس لکڑیاں جلنے لگیں اور شکاری ہاتھ پاؤں سینکنے لگا۔

کبوتر کو اب مہمان کے کھانے کی فکر ہوئی۔ مگر اس کے گھونسلے میں ایک دانہ بھی نہ تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ اپنا ہی گوشت کھلا کر مہمان کا پیٹ بھر دوں یہ سوچ کر وہ آگ میں کود پڑا اور دیکھتے دیکھتے اس کا گوشت بھن کر رہ گیا۔

کبوتر کی یہ قربانی دیکھ کر شکاری کا دل پسیج اٹھا۔ اس نے اسی وقت کبوتری کو جال سے آزاد کر دیا۔ شکاری کے جال سے آزاد ہو کر کبوتری اپنے کبوتر کے غم میں رونے لگی اور خود بھی اسی

آگ میں جل گئی۔

اس دن شکاری نے چڑیوں کے شکار سے توبہ کر لی۔

نرم دل سے مشورہ کرنے کے بعد الّو شاہ نے اپنے رحم دل وزیر سے بھی مشورہ کیا۔ رحم دل نے بھی اسی طرح کی رائے دی۔

اس کے بعد الّو شاہ نے ٹیڑھ منّھے وزیر سے بھی سوال کیا۔

ٹیڑھ منّھے وزیر نے کہا: "حضور ہمیں اپنی پناہ میں آئے ہوئے دشمن کی جان نہیں لینی چاہیے۔ کئی بار دشمن بھی فائدے کے کام کر جاتے ہیں۔ اگر دشمن کے گروہ میں آکر آپس میں ہی دشمن ہو جائیں تو وہ ایک دوسرے کا خود ہی خاتمہ کر دیتے ہیں۔ جیسے ایک بار چور نے برہمن کی جان بچائی تھی اور راکشس نے چور کے ہاتھوں برہمن کے بیلوں کو چوری جانے سے بچایا تھا۔

الّو شاہ نے پوچھا: "وہ کیسے؟"

تب ٹیڑھ منّھے وزیر نے چور اور راکشس کی یہ کہانی سنائی۔

ایک گاؤں میں ایک برہمن رہتا تھا۔ بے چارہ بھیک مانگ کر اپنی گذر بسر کرتا تھا۔ ایک بار کسی مہاجن نے ترس کھا کر اسے بیلوں کی ایک جوڑی دے دی۔ برہمن نے ان بیلوں کو خوب کھلایا پلایا اور وہ خوب موٹے ہو گئے۔ ان بیلوں کو دیکھ کر ایک چور کے دل میں لالچ آیا۔ بیلوں کو چوری کرنے کے لیے جب وہ نکلا تو اسے راستے میں ایک بہت بھیانک آدمی ملا۔ اس کے دانت ہاتھی کے دانتوں کی طرح لمبے لمبے تھے۔ آنکھیں آگ کی طرح لال لال چنگاریاں اگلتی ہوئی۔ سوکھے لانبے بال اور خوب لمبی ناک۔

اسے دیکھ کر چور نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

اس بھیانک آدمی نے کہا: "میں راکشش ہوں تم بتاؤ تم کون ہو؟ اور کہاں جا رہے ہو؟"

چور نے بتایا "میں ایک چور ہوں، پاس والے برہمن کے گھر سے بیلوں کی جوڑی چرانے جا رہا ہوں۔"

راکشش بولا: "دوست پچھلے سات آٹھ دن سے میں نے بھی کچھ نہیں کھایا ہے۔ چلو آج اسی برہمن کو مار کر اپنی بھوک مٹاؤں۔ چلو ساتھ ساتھ چلیں۔

رات ہونے پر دونوں چھپ کر برہمن کے گھر میں گھس گئے۔ برہمن کے سو جانے کے بعد جب راکشش اسے کھانے کے لیے بڑھنے لگا تو چور نے کہا: "دوست پہلے میں بیلوں کی جوڑی چرا لوں تب تم اپنا کام کرنا۔

راکشش بولا "نہیں کہیں بیل چراتے وقت کوئی کھٹکا ہو گیا تو برہمن جاگ جائے گا اور میرا سارا کیا کرایا مٹی ہو جائے گا۔"

چور بولا: "اور اگر کہیں قتل کئے جانے سے پہلے برہمن جاگ گیا تو میرا کام رہ جائے گا اس لیے پہلے مجھے اپنا کام کر لینے دو۔" دونوں میں اسی بات پر تکرار چل رہی تھی کہ برہمن جاگ گیا۔ برہمن کو جاگتا دیکھ کر راکشش بولا برہمن دیکھو یہ چور تمھارے بیل چوری کرنے آیا تھا میں نے تمھیں جگا دیا۔" چور بولا: "نہیں برہمن یہ راکشش تمھاری جان لینے آیا تھا میں نے تمھیں جگا دیا۔" برہمن اب ہوشیار ہو گیا وہ لاٹھی لے کر بیلوں کی حفاظت کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر راکشش اور چور دونوں بھاگ گئے۔"

جناب عالیجاہ الہیٰ خاں امروہوی

حساب کا جادو

سبق پڑھانے کے بعد ماسٹر صاحب کبھی کبھی سوال بھی کرتے ہوں گے۔ کبھی کبھی سوالوں سے تمھیں الجھن بھی ہوتی ہوگی۔ آؤ آج ہم تمھیں کچھ ایسے دلچسپ سوالات بتائیں کہ تم ان سوالات سے گھبرانے کے بجائے انھیں پسند کرو اور واقعی یہ سوالات ہیں بھی بڑے دلچسپ سوال کیا ہیں جادو کی پڑیا ہیں سوال دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بڑا مشکل ہے لیکن اگر ہم اسے حل کرنے کی ترکیب بتلا دیں تو تم خوشی سے اچھل پڑو اور کہو "ارے یہ تو بہت آسان ہے"! اچھا اب سوالات اور ان کے حل کرنے کے طریقے دیکھو۔

۱ اگر تمھارا کوئی دوست پوچھے بتلاؤ میری عمر کتنے سال ہے اور میری جیب میں کتنے پیسے ہیں؟ سوال تو کچھ ٹیڑھا معلوم ہوتا ہے لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں اس دوست سے کہو "دیکھو بھئی میں تمھارے سوال کا جواب تو دے سکتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ جیسا عمل کرنے کو میں کہوں ویسا ویسا کرو"۔ جب وہ راضی ہو جائے تب اس سے کہو کہ جتنی تمھاری عمر ہے (عمر سالوں میں ہونی چاہیے) اسے دو سے ضرب دے دو اب اس حاصل ضرب میں پانچ جوڑ کر انھیں پچاس سے ضرب دو اور جتنے پیسے تمھاری جیب میں ہیں ان کی تعداد کو اس میں جمع کر لو۔ اس میں سے تین سو پینسٹھ گھٹا کر نتیجہ ظاہر کرو۔ مثلاً تمھارے دوست کی عمر اٹھارہ سال ہے اور اس کی جیب میں بیس پیسے ہیں تو وہ اس طرح حساب لگائے گا۔

۱۸ × ۲ = ۳۶ + ۵ = ۴۱ + ۵۰

= ۲۰ = ۲۰۷۰ - ۳۶۵

= ۱۷۰۵

تمھارا دوست جب نتیجہ ظاہر کرے تو تم چپکے سے اس میں سے ایک سو پندرہ جوڑ دو

۱۷۰۵+۱۱۵=۱۸۲۰

اس طرح جو اعداد آئیں اس میں پہلے دو ہندسے (۱۸) عمر کے اور بعد کے دو ہندسے (۲۰) پیسے ہوں گے۔ کیوں ہے نا دلچسپ کھیل۔ لیکن ایک بات تم اپنے دوست سے پہلے ہی بتلا دینا کہ پیسے سَو سے کم ہونے چاہئیں اگر تمھارے دوست کے پاس پیسے کے بجائے روپیہ ہوں تو وہ بھی سو سے کم ہونے چاہئیں۔ اس صورت میں اسے بتلانا پڑے گا کہ اس کے پاس روپیہ ہیں یا پیسے۔

۲ اب دوسرا دلچسپ حسابی کھیل سیکھو۔ اپنے کسی دوست سے کہو کہ تم ایک رقم اپنے دل میں سوچ کر اسے میرے کہنے کے مطابق خرچ کرو تو میں بتلا سکتا ہوں کہ تمھارے پاس کتنے پیسے باقی بچے ہیں۔ تمھارا دوست کچھ حیران ہوگا اور کہے گا چلو میں نے کچھ روپیہ سوچ لیے تب تم اس سے نیچے لکھی ترکیب

پر عمل کرنے کو کہو۔ یعنی اپنے دوست سے کہو کہ اپنی سوچی
ہوئی رقم کو دوگنا کر لو اور پھر تم اپنی طرف سے کچھ رقم بتلا کر
اسے بھی اس دوگنی رقم میں جوڑنے کو کہو۔ اس کے بعد کل رقم
کا آدھا کرنے کو کہو۔ اس کے بعد کہو کہ جو رقم اس نے سوچی
تھی وہ اس رقم میں سے گھٹا دے۔ اب جو رقم تم نے اسے اپنی
طرف سے جوڑنے کو دی تھی، اس کا آدھا تمھارے دوست
کے پاس باقی بچے گا جسے تم آسانی سے بتلا سکتے ہو جتنے
بھی روپیہ تم اپنی طرف سے اپنے دوست کو جوڑنے کے لیے
دو گے اس کا آدھا ہی ہمیشہ اس کے پاس باقی بچے گا۔
مثلاً تمھارے دوست نے پندرہ روپیہ سوچے اس کا دوگنا
کرنے پر تیس ہوئے فرض کرو تم نے دس روپیہ اپنی طرف
سے جوڑنے کے لیے دیئے تب وہ چالیس ہو گئے۔ اس کا
آدھا بیس ہوا۔ سوچے ہوئے پندرہ روپیہ نکالنے پر پانچ
بچے جو دس کا آدھا ہے اور جسے تم با آسانی بتلا سکتے ہو۔

نمبر۳ اب یہ تیسرا مزیدار کھیل بھی پڑھو۔ تم اپنے دوست
کو یہ کہہ کر حیرت زدہ کر سکتے ہو کہ میں بتلا سکتا ہوں کہ تمھاری
جیب میں کتنے پیسے ہیں۔

اس کی ترکیب بھی بہت آسان ہے تم اپنے
دوست سے کہو کہ "تمھاری جیب میں جتنے روپیہ ہیں اتنے
ہی کسی اور دوست کی طرف سے جمع کر لو۔ اس کے بعد حاصل
جمع کو چھ سے ضرب کرو۔ اس طرح حاصل ہونے والی رقم اپنے
دوست سے ظاہر کرنے کو کہو۔ جتنا وہ بتلائے اسے چپکے سے
بارہ سے تقسیم کر دو۔ جو جواب آئے وہ، وہ رقم ہوگی جو تمھارے
دوست کی جیب میں ہے۔

نمبر۴ اگر تمہارا دوست یا کوئی اور شخص تم سے پوچھے
کہ بتلاؤ میرے یا فلاں آدمی کے کتنے لڑکے اور
لڑکیاں ہیں؟ (شرط یہ ہے کہ ان کی تعداد
سوال پوچھنے والے کو معلوم ہونی چاہیے) تم اس سے کہہ
سکتے ہو کہ یہ کون سی بڑی بات ہے میں ابھی بتلاتا ہوں۔
اس سے کہو کہ وہ لڑکوں کی تعداد کو دوگنا کرکے پانچ سے
ضرب کر دے اس حاصل ضرب میں لڑکیوں کی تعداد جمع کر لے۔
اس طرح جو تعداد آئے اسے ظاہر کر دے۔ اس طرح تمھارا دوست
جو تعداد بتلائے۔ اس میں اکائی کا ہندسہ لڑکیوں کی اور
دہائی کا ہندسہ لڑکوں کی تعداد بتلائے گا۔ مثلاً اگر وہ ۹۶
بتلائے تو تم با آسانی بتلا سکتے ہو کہ لڑکیاں چھ تھیں۔

نمبر۵ اور بھی یہ پانچواں کھیل اور کھیلوں سے مشکل تو ہے
لیکن دلچسپ بھی بہت ہے۔ اچھا تو سنو تم کسی کو ایک
کتاب دے کر کہو کہ وہ اس کتاب کا کوئی صفحہ سوچ لے پھر
اس صفحہ کی کوئی سطر اور اس سطر کا کوئی لفظ سوچ لے جب
وہ کہے کہ "ہاں میں نے سوچ لیا" تو اس سے کہو "کہ میں
بتلا سکتا ہوں کہ تم نے کون سا صفحہ کون سی سطر اور کون سا
لفظ سوچا ہے؟" وہ فوراً کہے گا "تو بتلاؤ تو بھلا ہم بھی
دیکھیں کہ تم کیسے حساب مارخاں ہو"۔ تب تم اپنی حساب
دانی کا رعب گانٹھنے کے لیے اس سے کہو کہ جو صفحہ اس نے
سوچا ہے۔ اس کو دس گنا کر دے۔ اس کے بعد جو جواب
آئے اس میں پچیس جمع کر دے۔ اس کے بعد جو سطر سوچی ہو
اس کے عدد کو بھی پہلے کی طرح جوڑ لے۔ اب اس حاصل جمع
کو پھر دس گنا کر دے۔ پھر جو لفظ سوچا تھا۔ اس کے نمبر کو
بھی اپنے جواب میں جوڑ دیجیے۔ اس کے بعد اس سے
کل جوڑ کو ظاہر کرنے کو کہو۔ جو جواب وہ بتلائے تم اپنے
دل میں اس میں سے دو سو پچاس گھٹا دو۔ گھٹانے کے بعد جو
جواب آئے اس میں اکائی کا ہندسہ اس کے سوچے ہوئے
لفظ کا نمبر دہائی کا ہندسہ سطر کا نمبر باقی بچے ہندسے
صفحہ کے نمبر ہوں گے۔ ایک بات پہلے ہی ظاہر

کردینا کہ صفحہ، لفظ یا سطر کا نمبر ۹ سے زیادہ نہ ہو۔ اس کھیل کی مثال بھی آسانی کے لیے یہاں دی جارہی ہے۔

مان لو تمھارے دوست نے صفحہ نمبر ۵ کے سطر نمبر ۵ کا لفظ نمبر ۵ سوچا تو وہ اس طرح عمل کرے گا

۵×۱۰=۵۰+۲۵=۷۵+۵=۸۰×۱۰=۸۰۰

+۵=۸۰۵

آخر میں تمھارا دوست آٹھ سو پانچ ظاہر کرے گا تم اس میں سے ڈھائی سو گھٹاؤ گے۔ ۸۰۵-۲۵۰ =۲۵۵

تب ۵۵۵ آئے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صفحہ سطر اور لفظ ہر ایک کا نمبر ۵ ہوگا۔

نمبر ۶ آخر میں تمھیں حساب کا ایک جادوئی خاکہ بھی بتلادیں۔ خاکہ نیچے بنا ہے۔ جس میں ۵ کھڑی اور ۶ پڑی قطاریں ہیں۔

۶۹	۳۴۵	۱۸۶	۸۷۲	۷۵۳
۳۶۶	۶۴۲	۵۸۶	۲۷۸	۵۵۸
۱۶۸	۲۴۶	۸۷	۵۷۵	۶۵۷
۷۶۲	۱۴۷	۲۸۵	۳۷۷	۹۵۴
۴۶۳	۵۴۳	۴۸۳	۱۷۹	۸۵۵
۵۶۴	۴۸	۳۸۴	۶۷۴	۴۵۹

اپنے دوست سے کہو کہ اوپر کے خاکہ میں بنی ہر قطار (خاکے کی پانچ کھڑی قطاروں میں سے) ایک ایک خانے کے کل ہندسے چن لے اور انھیں جمع کرے۔ اس کھیل کی جادوئی خاصیت یہ ہے کہ جب تک وہ حضرت جوڑنے کے لیے ہندسے کاغذ پر لکھیں گے تم انھیں جواب بھی بتلادو گے۔ آؤ ہم تمھیں بتلائیں کہ یہ کیسے ممکن ہے۔

مان لو تمھارے دوست نے پہلی قطار سے ۳۶۶ دوسری سے ۱۴۷ تیسری سے ۳۸۴

چوتھی سے ۷۸۲ اور پانچویں سے ۵۵ چنا اور انھیں جوڑنے لگا۔ ظاہر ہے اتنی لمبی چوڑی جمع میں کچھ وقت تو لگے گا ہی لیکن تمھیں صرف اتنا کرنا ہے کہ چنی ہوئی ہر گنتی کے آخری ہندسے کو جوڑ لو۔ اب انھیں پچاس میں سے گھٹا دو۔ گھٹے ہوئے ہندسوں کو پہلے اور گھٹائے ہوئے ہندسوں کو بعد میں لکھو۔ اس طرح جو تعداد آئے وہی کل جمع ہوگی یعنی

۶+۷+۴+۲+۵

۵۰ - ۲۴ = ۲۶

اب حسب قاعدہ ۲۶ کو پہلے اور ۲۴ کو بعد میں رکھنے پر ۲۶۲۴ ہوتا ہے۔ یہی کل ہندسوں کا جوڑ ہوگا۔ کہو ہے نا دلچسپ چیز، ان کھیلوں کے ذریعے حساب میں کمزور پیامی بھی اپنی حساب دانی کا رعب گانٹھ سکتے ہیں۔

ایک فلسفی صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے کہ ان کی بیوی اخبار لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔
"کچھ سنا آپ نے، اس اخبار میں آپ کی موت کی خبر چھپی ہے!"
"اچھا" فلسفی صاحب نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر کہا
"میری طرف سے تعزیت کا پیغام بھیج دو!"

جواب پر لعم بنا ہے

ایک دوسرا کیڑا اسکیل ہے جس کی وجہ سے جگہ جگہ ...ان بن جاتے ہیں۔ اس کو ختم کرنے کے لیے تمباکو کا گھول کے پانی میں ملا کر لگا دینا چاہیے۔ ایک ...کیڑا ہے جو کھٹمل کی طرح کا ہوتا ہے۔ یہ ...لے نچلے حصہ پر چپکا رہتا ہے۔ یہ کیڑا اسفید ...طرح کا ہوتا ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے ...دن والے برش سے خوب رگڑ کر لگایا جائے

جناب اظہار الحق

گلاب

(پیام تعلیم دسمبر ۶۸ء سے سلسلہ ملایئے)

سنچائی اور گوڑائی

گلاب کو کافی پانی دینے کی ضرورت ہے۔ کیاریوں کو اوپر تک بھر دیا جائے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر وقت پانی کھڑا رہے بلکہ جب بھی پانی دیا جائے خوب اچھی طرح بھر دینا چاہیے اور پانی دینے کی جب ضرورت ہو اسی وقت دیا جائے۔ پھول کے موسم میں خوب پانی دیتے رہنا چاہیے۔ عام موسمی حالات میں ہفتہ میں ایک مرتبہ پانی دینا کافی ہوگا۔

ہر سنچائی کے بعد جب مٹی کچھ خشک ہو جائے تو اس کو بھربھرا کر دینا چاہیے۔ زمین کی گوڑائی یا مٹی کا بھربھرا کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا پانی دینا۔ لیکن اتنی گیلی زمین کو ہرگز نہ گوڑا جائے کہ اس میں چپک موجود ہو اور بڑے بڑے ڈھیلے بن جائیں۔ اتنی بھربھری بھی نہ کی جائے کہ پاؤڈر بن جائے۔ یعنی گوڑنے کے بعد مٹی دانے دار ہو جائے۔ گوڑائی کے بہت فائدے ہیں:۔

دو سے ظاہر کرتے ہو۔ جتنا وہ بتلائے اسے چپکے سے ... کہ اندر ہوا
بارہ سے تقسیم کردو۔ جو جواب آئے وہ، وہ رقم ہو گی جو تمہارے ... کی
دوست کی جیب میں ہے۔ ... لیے کھاد
نمبر ۳ اگر تمہارا دوست یا کوئی اور شخص تم سے پوچھے ... خودرو پودے
نہ بتلاؤ میرے ما فلاں آدمی کے کتنے لڑکے اور ... نقصان پہنچانے
لڑکیاں ہیں؟ شرط یہ ہے کہ ان کی تعداد ... ۔ یاد رکھیے اگر گوڑائی
... لگانے کا خیال

ہی بے کار ہے۔ سردی اور بہار کے موسموں میں کم از کم ہر پندرھویں دن گوڑائی ضرور کرنی چاہیے۔

دوسری اہم بات زمین کو نائٹروجن بہم پہنچانا ہے جو ہر پودے کے لیے بہت ضروری ہے۔ نائٹروجن والے زمین کے اندر جو جراثیم ہوتے ہیں وہ بغیر تین چیزوں کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ تین چیزیں ہوا گرمی اور پانی ہیں جو ہر جاندار کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ ہوا اور سورج کی گرمی دونوں زمین کی گوڑائی سے ہی زمین میں پہنچ سکتی ہیں۔ گوڑائی اتنی گہری نہیں کرنی چاہیے کہ پودوں کی نازک جڑیں کٹ جائیں۔

گرمیوں میں بہت گرم اور خشک ہوائیں چلتی ہیں خاص طور سے ہندوستان کے شمالی میدانی علاقوں میں گرمی کافی ہوتی ہے۔ اس لیے گلاب کو پابندی کے ساتھ کافی مقدار میں پانی ملنا چاہیے۔ کیوں کہ اگر زمین زیادہ گرم ہوگی تو جو شاخیں زمین سے لگ رہی ہیں وہ سوکھ جائیں گی۔ اس زمانے میں کسی قسم کی کھاد بھی نہیں ڈالنا چاہیے۔

برسات میں گلاب میں پانی بھرا نہ رہنا چاہیے۔ پانی کے نکاس کا انتظام ضروری ہے۔ اس زمانے میں خودرو پودے اور گھاس بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کو اکھاڑتے رہیے اس دوران میں گوڑائی وغیرہ بالکل نہ کیجیے۔

گلاب کی کاشت اگر کامیابی کے ساتھ کرنی ہے تو یاد رکھیے کہ وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق پودوں کی کٹائی چھنٹائی بہت ضروری ہے۔ جوں ہی پھول کی پتیاں گرنے لگیں پھول کی شاخ کو پھول کے کچھ نیچے سے کاٹ دیجیے۔ کاٹنے کا کام گتیا (سکٹیر) یا تیز چاقو سے کرنا چاہیے۔ کچھ شاخیں پرانی ہو کر پھول دینا بند کر دیتی ہیں۔ ایسی شاخوں کو بھی نکالتے رہیے۔

ایک اہم اور ضروری بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ جو پودے چشمہ چڑھا کر یا قلم باندھ کر تیار کیے گئے ہیں اُن میں دیسی گلاب کی شاخیں نیچے سے نکل آتی ہیں۔ ان کو نکالتے رہنا ضروری ہے ورنہ اصل پودے مرجائیں گے۔ یعنی چشمہ وغیرہ سے جو شاخ یا شاخیں نکلتی ہیں وہ تو سوکھ جائیں گی اور دیسی گلاب بہت تیزی سے آگے بڑھ جائے گا۔ اور جب پھول نہیں آئیں گے تو آپ پودے سپلائی کرنے والے کو بُرا بھلا کہیں گے کہ خراب پودے دے دیے۔ حالاں کہ خرابی آپ کے تساہل اور لاپرواہی سے ہوئی ہے۔

ایک بات اور یاد رکھیے کہ کتابی جانکاری اسی وقت کارآمد ہو سکتی ہے جبکہ اس کے ساتھ عمل بھی ہو اور خود تجربہ ہو۔ بہت سی باتیں کتابوں میں نہیں ہوتیں بلکہ خود تجربہ سے حاصل ہوتی ہیں۔

نقصان پہنچانے والے کیڑے، بیماریاں اور ان کا علاج

گلاب کے پودے لگاتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ پودا تندرست ہو۔ اگر پودا تندرست نہیں ہے یا بیمار پودے سے تیار کیا گیا ہے تو وہ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ ایسے پودے کو بالکل نہ لگانا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ کیڑوں اور بیماری کی روک تھام شروع میں ہی کرلی جائے تو بڑھنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔

جہاں تک کیڑوں کا تعلق ہے یہ کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً پتّی کو کھانے والے جو پتیوں پر رینگتے ہیں، سبز رنگ کی مکھی، دیمک وغیرہ۔ اور بیماریوں میں فنگس، ملڈیو، روز رسٹ اور بلیک اسپاٹ خاص ہیں۔

چھنٹائی کے بعد جب نئی کونپلیں نکلتی ہیں تو ان کا اوپر کا حصہ کھایا ہوا تو نظر آتا ہے لیکن کھانے والا کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر اس دشمن کا خاتمہ نہیں ہوا تو آپ کبھی پھول حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ ایک رینگنے والا کیڑا (کیٹر پلر) ہے۔ جو تقریباً ایک انچ لمبا ہوتا ہے۔ رات کے وقت نکلتا ہے اور اوپر کی کونپل کو کھا جاتا ہے۔ دن میں دو پتیوں کو چپکا کر ان کے بیچ میں آرام کرتا ہے۔ جوں ہی آپ نے پتیاں کھولیں وہ پھدک کر زمین میں گر گیا اور غائب! اس لیے پہلے ہی پتیوں کو دبا دیجیے تاکہ وہ حضرت وہیں چپک کر رہ جائیں۔ اگر کیاریاں زیادہ ہیں اور کافی تعداد میں پودے ہیں تو یہ کام مشکل ہو جائے گا اس لیے ایسی حالت میں پتیوں پر زہریلے چھڑکاؤ کرنے سے ان کیڑوں کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ زہریلی چیزیں رقیق یا سفوف (پاوڈر) کی شکل میں مل جاتی ہیں۔ مثلاً ڈی۔ڈی ٹی گیمکسین، گیسرول، پائی روکلیڈ، اینڈرین وغیرہ۔ یہ چیزیں ان کیڑوں کو بھی مار دیتی ہیں جو دن میں بھی پتیاں وغیرہ کھا جاتے ہیں۔

ایک دوسرا کیڑا اسکیل ہے جس کی وجہ سے جگہ جگہ نشان بن جاتے ہیں۔ اس کو ختم کرنے کے لیے تماکو کا گھول صابن کے پانی میں ملا کر لگا دینا چاہیے۔ ایک

ایک اور کیڑا ہے جو کھٹمل کی طرح کا ہوتا ہے۔ یہ تنے پر اور پتے کے نچلے حصہ پر چپکا رہتا ہے۔ یہ کیڑا سفید رنگ کا اون کی طرح کا ہوتا ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے اسپرٹ دانتوں والے برش سے خوب رگڑ کر لگایا جائے

ہرے رنگ کی مکھیاں برسات کے آخر میں پیدا ہوتی ہیں جو بہت چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں۔ یہ کلیوں کو کھا جاتی ہیں۔ ان کو مارنے کے لیے تمباکو کا گھول یا پاوڈر استعمال کرتے ہیں۔

کچھ مختلف قسم کے چھوٹے بڑے ٹڈے ہوتے ہیں جو پتیوں، کونپلوں اور کلیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ زیادہ تر ہرے رنگ کے ہوتے ہیں۔ یہ کیڑے ہاتھ سے نہیں پکڑے جاسکتے اس لیے پتیوں وغیرہ پر زہریلی چیزیں چھڑک دی جائیں تاکہ یہ ان پتیوں کو کھاتے ہی مر جائیں۔

ایک کیڑا "روز سلگ درم" بھی پتی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اسے بھی بہت آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ سگار اور سگریٹ پینے کے بعد جو ٹکڑے پھینک دیے جاتے ہیں ان کو پانی میں ابال کر عرق نکال لیجیے۔ اور اس عرق کو پتیوں پر چھڑک دیجیے۔ یہ عرق ہری مکھی کو ختم کرنے کے لیے بھی مفید ہے۔ دوسرا گھول یہ ہے:۔ ایک آونس ملائم صابن کو ۵ گیلن پانی میں ابال کر آدھا آونس نکوٹین ملا دیجیے۔ یہ گھول بہت جلد اثر کرتا ہے جو کیٹر پلر وغیرہ کو بھی ختم کر دیتا ہے۔

Cockchafer اور Rose Beetle کبھی کبھی بہت نقصان پہنچاتے ہیں۔ خود پتیوں کو اور ان کے بچے زمین میں جڑوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کو ختم کرنے کے لیے نیفتھلین پاوڈر دو یا تین آونس فی مربع گز کے حساب سے زمین پر چھڑک دیا جائے اور پھر گوڑائی کر دی جائے۔

سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا کیڑا دیمک ہے۔ یہ خاص طور سے نئے لگائے ہوئے پودوں کو کھا جاتی ہے اس کی روک تھام کے لیے مٹی میں زہریلا پاوڈر ملا دیتے ہیں مثلاً ڈی.ڈی.ٹی، اینڈرین، بی، ایچ.سی، گیمکسین وغیرہ یہ چیزیں کسی حد تک جڑوں کو بھی نقصان پہنچاتی ہیں اس لیے بہت اچھا نسخہ یہ ہے: جب کھاد ڈالی جاتی ہے تو اس کو چھلنی میں چھانا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک پونڈ گندھک کے پاوڈر کو ۲۵ پونڈ کھاد کے پاوڈر میں ملا کر مٹی میں ملا دیا جائے دیمک سے بچاؤ کے لیے زمین کی گوڑائی پابندی سے کرتے رہنا چاہیے۔

بیماریاں فنگس کی بیماری زیادہ اہم نہیں ہے بلکہ ملڈیو، روز رسٹ اور بلیک اسپاٹ اہم ہیں۔ یہ بیماریاں عام طور سے کھاد کی زیادتی، درجۂ حرارت میں ایک دم تبدیلی اور لاپروائی سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

ملڈیو کی بیماری پتیوں اور تنوں پر ظاہر ہوتی ہے جو سفید یا بھورے دھبوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ بعد میں ان دھبوں پر پاوڈر سا جم جاتا ہے۔ اگر فوری طور پر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو یہ بیماری اور پودوں میں بھی لگ جاتی ہے۔ اس بیماری کے علاج کے لیے بورڈو مکسچر (Bordeaux Mixture) تیار کر کے چھڑک دینا چاہیے۔ نسخہ بورڈو مکسچر: ایک پونڈ نیلا توتیا۔ ایک پونڈ چونا۔ دس گیلن پانی۔ دونوں چیزوں کو الگ الگ گھول کر پھر پانی میں ملایا جائے۔

بلیک اسپاٹ کی وجہ سے پتوں پر سیاہ براؤن رنگ کے دھبے ہو جاتے ہیں۔ پتیاں پیلی ہو کر گرنے لگتی ہیں۔ اگر فوری توجہ نہ کی گئی تو یہ بیماری تنے میں بھی پہنچ جاتی ہے اور پھر پورا پودا ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ پہلے تو ان پتیوں کو جن پر اس مرض کا اثر ہوا ہے فوراً جلا دینا چاہیے۔ پھر پتیوں پر نیلا توتیا یا پھول گندھک کا گھول چھڑکنا چاہیے۔

روز رسٹ کی وجہ سے پتیوں پر گہرے پیلے رنگ کے دھبے دکھائی دیتے ہیں جس کی وجہ سے پودوں کی بڑھوار رک جاتی ہے۔ اس کی روک تھام کے لیے نیلا توتیا کا ہلکا گھول یا پھول گندھک کا گھول پتیوں پر چھڑکا جائے۔

کبھی کبھی فنگس کی بیماری جڑوں میں لگ جاتی ہے جس سے پودے کمزور دکھائی دینے لگتے ہیں۔ مالک یہ سمجھتا ہے کہ زمین کمزور ہے چنانچہ اور کھاد دے دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھاد کی زیادتی سے فنگس کو اور بڑھنے کا موقع ملتا ہے اور پودا ختم۔

(نوٹ) نیلا توتیا چونکہ تیز چیز ہے اس کا بہت ہلکا گھول استعمال کرنا چاہیے۔

بس کے انتظار میں

جہاں عورتیں ہوتی ہیں وہاں جھگڑا ہوتا ہے۔ پر آج یہ کہنا زیادہ ٹھیک ہوگا کہ جہاں بسیں ہوں گی وہاں جھگڑا ہوتا ہے۔

کالج کی طالبہ ہونے کے ناطے مجھے روز ہی بس میں سفر کرنا پڑتا ہے اور روز ہی میں یہ طے کرتی ہوں کہ کل سے بس کا بائیکاٹ۔ پر جب صبح ہوتی ہے تو بٹوے کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ بس کے بنا کسی طرح گزارا بھی تو نہیں چل سکتا۔

میں بس اسٹینڈ پر پہنچتی ہوں۔ پندرہ بیس آدمیوں کی ایک لائن آگے کھڑی ہوتی ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ کبھی سامنے دیکھتی ہوں، کبھی گھڑی کو۔ پھر ان لوگوں کو دیکھتی ہو جو لائن میں آگے کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھے بڑی جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔ کالج میں پیریڈ مس ہو جانے کا ڈر علیحدہ رہتا ہے۔ میں سامنے کی طرف بس کا انتظار کرتے کرتے جب تھک جاتی ہوں تو پیچھے کی طرف دیکھ کر مجھے کچھ چین ملتا ہے کیوں کہ تب تک میرے پیچھے بھی پندرہ، بیس کی لائن بن چکی ہوتی ہے۔

اتنے میں دیکھتی ہوں کہ بس آ رہی ہے۔ لائن میں کھڑے سب لوگ بس پر چڑھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن، بس سب کے آگے سے بنا رکے چل دیتی ہے میری جھنجلاہٹ بڑھ جاتی ہے پیر دکھنے لگتے ہیں۔ معلوم نہیں اگلی بس کب آتی ہے۔

اتنے میں میری نظر لائن میں کھڑی دو پنجابی عورتوں پر پڑتی ہے۔ یہ دونوں جب سے آئی ہیں ایک منٹ کے لیے بھی خاموش نہیں ہوئیں۔ ان کے لیے بس کا انتظار کوئی بورڈم (اکتا دینے والی بات) نہیں۔ مگر میری اکتاہٹ اور گہری ہو جاتی ہے "آگئی۔ آگئی" کی آواز میرا دھیان اپنی اور (طرف) کھینچ لیتی ہے۔ پھر سے سب لوگ بس پہ چڑھنے

کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔ بس کچھ آگے جا کر رکتی ہے۔ لائن لوٹ جاتی ہے۔ سب لوگ بس کی طرف بھاگنے لگتے ہیں۔ دھکے دے کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں لڑکے آگے آجاتے ہیں۔ موٹا آدمی جو لائن میں سب سے آگے کھڑا تھا پیچھے رہ جاتا ہے۔ دونوں پنجابی عورتیں بھیڑ میں دب جاتی ہیں۔ لیکن بس پر چڑھنے کی آشا (امید) نہیں چھوڑتیں۔ کنڈکٹر دیالو ہے۔ بھیڑ میں سے پکارتا ہے۔" دیکھیے پہلے 'لیڈیز' (عورتوں) کو آنے دیجیے" یہ سن کر ایک عورت پکارتی ہے۔

"اجی لیڈیز نوں مارو گولی۔ پہلاں سانوں چڑھنے دو!" یکایک ہنسی کا فوارا چھوٹ پڑتا ہے۔ بس دھیرے دھیرے کھسکنے لگتی ہے اور پھر رفتار پکڑ لیتی ہے۔ پھر لائن بن جاتی ہے۔ میں بھی لائن میں کھڑی ہو جاتی ہوں میں جمائی لیتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ دہلی کی بسوں میں سفر کرنے کے لیے پہلے تو بلوان (طاقتور) ہونا چاہیے اور پھر دوڑنے میں تیز۔

رادھا
بیسک دوسرا سال جامعہ

ماسٹر صاحب پریشان کیوں؟

کبھی کبھی ہم پریشان سے ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ اس پریشانی کی وجہ کیا ہے۔ آج ایسا ہی واقعہ ہماری کلاس میں ہوا۔

آج صبح اُردو کا گھنٹا تھا۔ پڑھائی کا دن تھا۔ ماسٹر صاحب کے کہنے پر پڑھائی شروع ہوئی سب سے پہلے دینا نے پڑھنا شروع کیا۔ وہ پڑھتی گئی مگر ماسٹر صاحب نہ جانے کس دھیان میں بیٹھے تھے کہ انھیں پتہ ہی نہ لگا کہ دینا نے کتنا پڑھ لیا جب لڑکیوں نے بتایا تو انھیں دھیان آیا اور دوسری لڑکی کو پڑھنے کے لیے کہا۔ ہمارے پوچھنے پر کہنے لگے۔ میں کچھ سوچ رہا تھا۔ ہمیں لگا کہ آج ماسٹر صاحب کچھ پریشان ہیں۔ مگر وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر لگا کہ ماسٹر صاحب دھیان سے نہیں سن رہے۔ سوچا کیا وجہ ہو سکتی ہے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

اچانک بیٹھے بیٹھے ماسٹر صاحب بولے" ارے میں تو عینک لگانا ہی بھول گیا۔ سوچ رہا تھا کہ آج کم کیوں دکھائی دے رہا ہے!" ہم سب ہنسنے لگے۔ بات سمجھ میں آگئی کہ ماسٹر صاحب پریشان کیوں تھے؟

پربھا
ڈپلوما دوسرا سال جامعہ

بچوں کی کوششیں

زبان ـــــ سب سے اچھی ـــــ سب سے بری

ایک دن ایک بادشاہ نے اپنے باورچی سے ایک ایسی چیز پکانے کا حکم دیا جو دنیا میں سب سے اچھی چیز ہو۔ باورچی نے بکری کی زبان پکائی اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔

بادشاہ نے کھانے کے بعد پوچھا۔ یہ کونسی چیز تھی؟

باورچی نے جواب دیا: "بکری کی زبان!"

دوسرے روز بادشاہ نے اسی باورچی کو حکم دیا کہ آج وہ چیز پکاؤ جو دنیا میں سب سے بری ہو۔

باورچی نے پھر بکری کی زبان پکائی اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔

بادشاہ نے کھانے کے بعد سوال کیا۔ یہ کونسی چیز تھی؟

باورچی نے جواب دیا۔ "بکری کی زبان!

باورچی کے اس جواب سے بادشاہ کو بڑا تعجب ہوا۔ پوچھا! جواب کا مطلب سمجھاؤ"؟

باورچی نے کہا:۔ "بادشاہ سلامت! زبان ایسی چیز ہے جو عزت بھی بخشتی ہے اور بے عزت بھی کرتی ہے۔ اگر کوئی اپنی زبان سے اچھی اچھی اور پیار وخلوص کی بات کہہ کر دوسرے کے دلوں کو رام کرتا ہے تو لوگ اس کی عزت کرتے ہیں اور اس کا شمار بڑے لوگوں میں ہوتا ہے اور اگر کوئی اپنی زبان سے بری اور کڑوی کسیلی بات نکال کر دوسرے کے دلوں کو ٹھیس پہنچاتا ہے تو اس کی بے عزتی ہوتی ہے اور اس کا شمار برے لوگوں میں ہوتا ہے"

بادشاہ کو یہ جواب سن کر بہت خوشی ہوئی اور اسے انعام واکرام دے کر مالا مال کر دیا۔

(فارسی سے)

اقبال نعیمی

لطیفے

حشمت:۔ "امی میں آج دوڑنے میں اوّل آیا ہوں"

امی:۔ "شاباش! بیٹا کتنے لڑکوں نے دوڑنے میں حصہ لیا"

حشمت:۔ "صرف میں نے۔"

والد:۔ (لڑکے سے) بیٹا تم اپنی شادی میں کس کس کو بلاؤگے؟

لڑکا:۔ ابا میں سب کو بلاؤں گا مگر آپ کو نہیں"

والد:۔ "کیوں؟"

لڑکا:۔ "کیا آپ نے مجھے اپنی شادی میں بلایا تھا"؟

عشرت اعظم خاں روہتاسی

بے وقوف کی موٹر

یہ ان دنوں کی بات ہے جب موٹر نئی نئی چلی تھی۔ ایک دفعہ ایک موٹر چلتے چلتے اچانک رک گئی۔ اس موٹر میں ایک بے وقوف آدمی بیٹھا تھا۔ یہ موٹر اسی کی تھی اس لئے ڈرائیور

سے ڈانٹ کر پوچھا: "موٹر کیوں رک گئی؟"
ڈرائیور نے کہا "سامنے درخت ہے!"
"سامنے درخت کیوں ہے؟"
ڈرائیور نے کہا: "حضور میں موٹر دوسری گاڑی سے بچا کرلے جا رہا تھا۔ سامنے درخت تھا۔"
مالک نے کہا: "درخت کیوں کھڑے ہیں اور تم بھی بالکل ناکارہ ہو۔ آخر یوں یوں کیوں نہیں بجا آخر پوں پوں کس لیے ہے"، اب بھلا بتائیے درخت تو اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں۔ وہ ڈرائیور پر بہت غصہ ہو رہا تھا پر وہ بےچارہ چپ تھا اپنے مالک کی بےوقوفی پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔

آزاد نیازی رہتاسوی اکبرپور

بادشاہ کا انصاف

بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک مرتبہ سلطان ملک شاہ سلجوقی ایک روز دریا کے کنارے شکار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر آرام کے لیے جنگل میں چلے آئے۔ بادشاہ کے خدمت گاروں میں ایک غلام جو بادشاہ کا خاص غلام تھا ایک گاؤں میں آیا۔ دیکھا کہ ایک گائے ندی کے کنارے چر رہی ہے حکم دیا کہ اس کو ذبح کردو اور اس کے کباب بناؤ۔ وہ گائے ایک بوڑھی بیوہ عورت کی تھی۔ وہ اپنے چار بچوں کی پرورش اسی کا دودھ بیچ کر کرتی تھی۔ جب بڑھیا کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو وہ ایک پل پر جو بادشاہ کی گزرگاہ تھی آکر انتظار کرنے لگی بادشاہ کی سواری آگئی تو وہ اٹھی اور بادشاہ کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ اس غلام نے جس نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ کوڑا کھینچ لیا اور چاہا کہ اس بڑھیا کو مارے اور بات نہ کرنے دے، بادشاہ نے کہا چھوڑو کوئی مظلوم اور مصیبت زدہ معلوم ہوتی ہے۔ دیکھو اس پر کیا ظلم ہوا ہے اور اس کا انصاف کس کے ہاتھ پر ہے۔ پھر اس بوڑھی عورت کی طرف رخ کیا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ بوڑھی عورت نے زبان کھولی اور کہا "اے بادشاہ اگر اس پل پر عدل و انصاف نہ کروگے تو خدائے عزوجلال کی قسم میں پل صراط پر تمھاری ناانصافی معاف نہ کروں گی۔ اچھی طرح سوچ لو کہ ان دو پلوں میں تم کس پل کو چنتے ہو بادشاہ بوڑھی کی بات کے خوف سے نیچے اتر گیا اور کہا۔ اے میری ماں! میں ہرگز اس پل سے گزرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہوں۔ کس نے تم پر ظلم کیا ہے؟ کیفیت بیان کرو تاکہ تمھارا بدلہ اس سے لوں۔ اس نے کہا اے بادشاہ یہی وہ غلام ہے جس نے تمھارے سامنے مجھ پر سزا کا کوڑا کھینچا تھا۔ میرے عیش کے چشمہ کو گدلا کردیا ہے اور وہ گائے ذبح کردی جس کا دودھ میرے یتیم بچوں کی زندگی کا سہارا تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ غلام کو سزا دی جائے اور ایک گائے کے بدلے میں اس عورت کو ستر گائیں دی جائیں۔

چند دنوں کے بعد بادشاہ مر چکا تھا اور بڑھیا زندہ تھی آدھی رات کے وقت بادشاہ کی قبر کے پاس گئی۔ اور قبلہ کی طرف منہ کرکے دعا کی اور کہا الٰہی تیرا یہ بندہ جو اس مٹی میں دفن ہے جب میں ناچار تھی تو اس نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ اب وہ لاچار ہے تو اپنی مہربانی سے اس کی دست گیری کر۔

کسی عابد نے بادشاہ کو خواب میں دیکھا پوچھا اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیسا سلوک کیا؟ جواب دیا کہ اگر بوڑھی عورت کی دعا میری دادرسی نہ کرتی تو عاقبت کی سزا سے چھٹکارا نہ ملتا بڑھیا کی دعا کی برکت سے رحمت کا دروازہ کھول دیا گیا۔

(فارسی سے) عشرت سلطانہ صدیقی

قلمی دوستی

نام :- توصیف الدین خاں عمر ۱۳ سال
مشغلہ :- رسالے پڑھنا، فوٹو جمع کرنا، نیک لوگوں کی کہانیاں سننا، بھائی بہنوں سے محبت کرنا، نماز پڑھنا، پتنگ اڑانا۔
پتہ :- معرفت ولایت اللہ خاں پٹھان۔ محلہ کھرکی پورہ
ڈاک خانہ بارسی ٹاکلی बार्सीटाकली
ضلع اکولہ مہاراشٹر

نام :- جمیلہ خانم عمر ۱۳ سال
مشغلے :- پیام تعلیم اور دوسرے ادبی رسالے اور کتابیں پڑھنا، ملکی اور غیر ملکی بہنوں سے دوستی کرنا وغیرہ وغیرہ
پتہ :- 6/H شمس الہدیٰ روڈ کلکتہ ۱۷

نام :- قرار احمد آزاد عمر ۱۵ سال
مشغلے :- پیام تعلیم اور بچوں کے دوسرے پرچے پڑھنا، ٹکٹ جمع کرنا، بھائی پیامیوں کے خطوں جواب دینا، شعر و شاعری

نام :- خورشید عالم بیکل عمر ۱۴ سال۔
مشغلے :- پیام تعلیم و اردو کومک پڑھنا، قلمی دوستی کرنا

نام :- ظہیر فراق رہتاسوی عمر ۱۴ سال
مشغلے :- بچوں کے نئے نئے پرچے منگوانا، کورس کی کتابیں پڑھنا، خطوں کے جواب دینا۔

نام :- نوشاد احمد نوشاد عمر ۱۴ سال
مشغلے :- کلیاں، پیام تعلیم پڑھنا۔ فٹ بال و کرکٹ کھیلنا۔

نام :- عشرت اعظم سرور عمر ۱۴ سال
مشغلے :- اردو کی خدمت کرنا، فٹبال کھیلنا

نام :- متین احمد انہونوی عمر ۱۴ سال
مشغلے :- پیام تعلیم، کلیاں، نور و کومک پڑھنا۔ افسانہ لکھنا، شعر و شاعری کرنا، موٹر سائیکل چلانا کرکٹ و کیرم کھیلنا۔
ان سب کا پتہ :- قرار احمد خان آزاد دیؔ پرنا اردو اسٹوڈینٹ فیڈریشن۔ محلہ دکھنواری اکبرپور ڈاک خانہ رہتاس۔ ضلع شاہ آباد بہار

نام :- سید محمود علی عمر ۱۴ سال
مشغلہ :- قلمی دوستی، رسالے پڑھنا۔
پتہ :- سید محمود علی سید منزل اسلم روڈ رنچھوڑ لائن۔ کراچی مغربی پاکستان

چندہ ہمیشہ منی آرڈر سے بھیجیے

سالنامہ ملا

میرے محترم بزرگ تسلیم

سالنامہ دیکھا۔ سرورق اگر "سادگی و پرکاری" کا مظہر ہے تو اندر کے صفحات "بے خودی و ہشیاری" کا۔ 'ہشیاری' آپ کی اور 'بے خودی' کاتب صاحب (غالباً صاحبان چونکہ ٹکنی کلر کتابت اسی کی غماض ہے) کی۔ جی ہاں جہاں ٹائٹل بہت سادہ و پرکار ہے اور اندر کے صفحات رنگا رنگ معلوماتی مضامین، دل چسپ کہانیوں، کامیاب ڈراموں اور بہت پیاری نظموں کا مجموعہ ہیں، ایک ایسا گلستاں ہے جس کی زینت 'گلہائے رنگارنگ سے ہے وہاں کاتب صاحبان نے اپنی 'بے خودی' کا مظاہرہ بڑی فراخدلی سے کیا ہے۔ بہرحال انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے ہوئے میں محض کاتب صاحب کو قصوروار نہ ٹھہراتے ہوئے پروف ریڈر صاحب کو بھی اس کا ذمّہ دار قرار دوں گا۔

معلوماتی مضامین کی اس بار کثرت ہے۔ ان میں سے چند تو بہت دل چسپ ہیں جیسے محترمہ فرزانہ انصاری کا مضمون 'مکڑیاں'، مشہود مفتی صاحب کا 'سب سے ننھی چڑیا' اور جناب خالد عرفان کا 'بجلی کے کھیل'۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ بچے مضامین کی بہ نسبت کہانیاں زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ یہ ان کا مزاج بن چکا ہے یا بنایا جا چکا ہے اس لیے وہ شاید اس پر ناک بھوں چڑھائیں۔ لیکن میں آپ کی اور ادارہ پیام تعلیم کی ہمت کی داد دوں گا کہ آپ ان کا مزاج بدلنے کی سعی کر رہے ہیں اور انھیں دنیا بھر کی معلومات کے بکھرے خزانے سے چند موتی و جواہر چن کر بڑے پرکشش انداز میں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ بچوں کے ادب کا جب تذکرہ ہوگا تو آپ کی کو تذکرہ نگار کبھی نظرانداز نہ کر سکے گا۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اس کا تذکرہ ہرگز ہرگز مکمل نہ کہا جائے گا۔ یہ محض تعریف نہیں آپ کی خدمات کا بہت ادنیٰ سا اعتراف ہے۔ اعترافِ حقیقت۔

مجھے اس بار لطیفے حالانکہ وہ صرف تین ہیں بہت پسند آئے کیوں کہ تینوں میرے لیے نئے ہیں۔ آج کل تو جس رسالے میں لطائف دیکھیے ان میں کثرت ان لطائف کی ہوتی ہے جو سینکڑوں بار دہرائے جا چکے ہیں اور اب جن کو پڑھ کر ہنسی کے بجائے لطیفہ نگار اور رسالے کے مدیر کی عقل و دانش کا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

نظم تو شاید اس سالنامے میں کوئی ایسی نہیں ہے جسے کوئی ناپسندیدہ کہہ سکے۔ خاص کر نئے سال پر نظمیں خوب ہیں۔ مجھے جو نظمیں خصوصی طور پر پسند آئیں ان میں نیّر صاحب کی نظم، رشید الوحیدی صاحب کی نظم، اشعر صاحب کی نظم 'تین سوال' مختار صاحب کی نظم 'بہادر ہوں میں'، کیف صاحب کی 'نیا برس'، ساغر صاحب کی 'فقیر کی صدا'، اور حاتمی صاحب کی 'طلبا سے خطاب' ہیں۔ شریر غزل بھی خوب ہے۔

ڈرامے دونوں بہت خوب ہیں خصوصاً اظہر صاحب کا چھوٹا سا ڈرامہ بہت عمدہ ہے۔ کہانیوں میں آپ کی کہانی "کالولو خرگوش" اور مناظر عاشق صاحب کی "بندر اور شیر" بہت دلچسپ ہیں۔ "کالولو" تو اپنے عجیب نام کی وجہ سے ہر وقت میری چھوٹی بہنوں کی زبان پر رہتا ہے۔ اور سفرنامہ "اتھوپیا کی سرزمین سے" تو دلچسپ ہے ہی

خلیق انجم اشرفی

...... آج ہی رجسٹری سے پیام تعلیم کا سالنامہ موصول ہوا ہے۔ حالانکہ ایک ہفتہ تاخیر سے ملا لیکن سالنامہ پڑھنے کے بعد ساری

کلفت اور انتظار کی تکلیف دور ہوگئی۔ اچھے اچھے مضامین دلچسپ کہانیاں اور شاعروں اور ادیبوں کی تصویریں دیکھ کر بڑی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ سرورق اور پشت پر چھپی تصویریں بہت ہی دلچسپ اور دیدہ زیب ہیں۔

محمد ابراہیم صدیقی

نسیم نواز مکرم و محترم عالیجناب سید صاحب۔ سلام و نیاز

آپ کا ارسال کردہ "سالنامہ" یعنی جنوری ۶۹ء کا پیام تعلیم نظر نواز ہوا۔ اتنے ضخیم، اتنے پاکیزہ، اتنے صالح ادب کا نمائندہ سالنامہ آپ کو مبارک ہو۔ نہ صرف بچے بلکہ بالغان کے لیے بھی اس میں معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے بہت سی باتیں شایع ہوئی ہیں۔ مجھے پیام تعلیم کا ہر شمارہ بہت پسند آتا ہے۔ ہندوستان میں شاید ہی بچوں کی تفریح اور ان کی اعلیٰ تربیت و تعلیم کا صحیح ادب پیش کرنے والا جریدہ ہو۔ پیام تعلیم کا ہر مضمون، ہر نظم، ہر فیچر اور ہر لطیفہ قابلِ مطالعہ اور لائق تعریف ہوتا ہے۔

پیام تعلیم کے سالنامے کی اشاعت پر ایک بار پھر مبارکباد قبول فرمائیں

نسیم شاہجہانپوری

...... خاص نمبر نظر سے گزرا۔ خاص نمبر کیا ہے چاند ستاروں کا ملاپ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے آسمان کو زمین پر اتار دیا ہے۔ سبھی مضامین اپنی اپنی جگہ دلکش و سحرانگیز ہیں ۔ آپ کو مبارکباد دیے بنا خاموش نہیں رہوں گا۔

ضیاء جعفر میسور

پیام تعلیم کا سالنامہ آج ہی ڈاک سے ملا۔ دیکھتے دیکھتے ہی میرے حواس گم ہوگئے۔ خدا جانتا ہے کہ میں کہاں ہوں!

ٹائٹل دیکھتے ہی میرا دل خوشی سے تڑپ اٹھا اور ہر ہر ورق پر بنارس کی صبح اور لکھنؤ کی شام انگڑائیاں لیتی ہوئی نظر آئی۔ آپ کی تعریف کرنا کیا ہے گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ خاص کر "نیا سال مبارک" "حسین کرنو" اور "بھارت درشن" نظم کے حصے میں بہت پسند آئیں۔ کہانیاں تو سبھی کی سبھی قابلِ تعریف ہیں پیام تعلیم کے سالنامے میں جن حضرات نے حصہ لیا ان کو میرا درجہ بدرجہ سلام۔

آزاد نیازی رہتاسوی

پیام تعلیم کا سالنامہ سابق روایات کے مطابق پوری آب و تاب اور معنوی و صوری حسن و خوبی کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ سرورق سادگی میں بھی دلکشی و پرکاری کا نمونہ پیش کر رہا ہے۔ آرٹ کی اس جدت طرازی پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ ہر مضمون اپنی جگہ مفید، معلوماتی اور سبق آموز ہے۔ عصرِ حاضر کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب میں آپ نے اس سالنامے کے ذریعہ خوشگوار اضافہ کر دیا ہے۔ منظومات بھی بلند پایہ اور معیاری ہیں اور موزوں عنوانات پر ہیں۔ غرض سالنامے کی کوئی تخلیق غیر معیاری اور غیر ضروری نہیں۔ جناب یوسف ناظم صاحب کے مشورے سے مجھے اتفاق ہے ـــــ بھارت درشن اچھی فکر ہے۔ ادارہ نے بڑی محنت تگ و دو اور عرق ریزی کے بعد بحر علم و ادب سے یہ "درخشاں موتی" تلاش کرکے سالنامے کی زیب و زینت میں اضافہ کیا ہے۔ پیام تعلیم کا یہ سالنامہ علمی، ادبی، معلوماتی اور تفریحی تخلیقات کا ایک قابلِ قدر مخزن ہے۔ امید ہے کہ سال رواں کا یہ بیش قیمت ادبی تحفہ ہر لائبریری کی زینت بن کر تشنگان علم و ادب کی پیاس بجھائے گا۔

زیادہ مبارکباد

مہر درولوی۔

محترم بھائی سلام و نیاز

سالِ نو کا حسین و جمیل تحفہ سالنامہ نظر نواز ہوا شکریہ۔ اب کے پرچہ ایک ہفتہ دیر سے پہنچا ہے اور یہ ایک ہفتہ میرے لیے بڑی پریشانیوں میں گزرا۔ بس روز ڈاک کا وقت گزر جانے کے بعد سے بچوں کے سوالات شروع ہو جاتے "آپ نے رجسٹری کے ٹکٹ بھیجے تھے؟" "آپ نے اپنی نظم بھیجی تھی؟" "ضرور ڈاک میں گم ہو گیا ہوگا۔ آپ حسین صاحب کو خط لکھ کر پوچھیے تو سہی۔" میں تو ان کو جواب دیتے دیتے تھک سا جاتا تھا۔ اور پھر اپنی بھی ان سے الگ کب تھی۔ بہر حال سالنامہ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ مبارک باد قبول فرمائیے۔ ہاں کاتب صاحب کی انگلیوں کی تکلیف کا اثر کتابت پر بھی پڑا ہے۔ خود میری نظم کے آخری بند کا چوتھا مصرعہ "محبتوں کا جہاں بسائیں" اس طرح چھپا ہے "محبتوں کے جہاں بسائیں"۔ اسی ہفتے اپنے ایک عزیز کے نام سالانہ رقم مع رجسٹری فیس کے بھجوائی ہے۔ امید ہے موصول ہو چکی ہوگی۔ ولی صاحب سے میرا سلام کہیے۔ خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔

سیفؔ سہسرامی

بزرگوارم۔ تسلیم

عین عالم انتظار میں سالنامہ نظر نواز ہوا۔ بقول شاعر

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا این جاست

سالنامہ کی کون سی چیز قابلِ دید نہیں اور قابلِ ذکر نہیں۔ سب سے پہلی نظر تو اس کے ٹائٹل میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ پھر اس کے اندر اتنے زیادہ اور سب چوٹی کے لکھنے والے۔ سالنامہ ابھی تو چھوٹے بھائی بہنوں کی دست بُرد میں ہے پھر بزرگوں کے ہاتھ آئے گا۔ میں پورا پڑھ کر تب اپنی خدمت میں اپنی ناچیز رائے لکھوں گی۔

سلمیٰ جاوید

محترم جناب ایڈیٹر صاحب پیام تعلیم

خلوص و محبت

واقعی پیام تعلیم کا سالنامہ بالکل ویسا ہی پایا جیسا کہ کچھ دن پہلے خواب میں دیکھا تھا۔ پیام تعلیم کے تمام مضمون نگاروں کو مبارک باد

بدر وفا سہسرامی

قابلِ صد احترام بھائی حسین صاحب مدظلہ العالی

آج کی ڈاک سے سالنامہ پیام تعلیم موصول ہوا۔ یہ سالنامہ صرف حسن و دلکشی کا ہی حامل نہیں بلکہ یہ رنگ برنگے معلوماتی اور کار آمد مضامین کا معجون مرکب ہے جو بچوں کی ذہنی ارتقاء کے لیے بہت ہی مفید ہے۔ خدا اس معجونِ مرکب کو اثر آفریں اور اس کے بنانے والے ڈاکٹروں کو خوب سے خوب تر اور خوب ترین کا صلاحیتی بنائے تاکہ ہم لوگ ہمیشہ ایسی قیمتی چیزوں سے فائدہ اٹھائیں۔ آمین

شمیم ہاشمی

محترمی سلام مسنون

سالِ نو مبارکباد۔ خدا کرے آپ حضرات بعافیت ہوں۔ سالنامہ آج صبح کی ڈاک سے دستیاب ہوا۔ حسب امید شاندار رہا۔ آپ حضرات نے جن پریشانیوں کے باوصف اسے یہ رنگ و روپ بخشا ہے ان کے پیش نظر بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سوائے تھوڑی سی تاخیر ہو جانے کے اور کوئی بات مایوس کن نہیں ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ بہت سے مختلف موضوعات پر کم و بیش یکساں معیار کے اتنے اچھے مضامین اور نظمیں فراہم کرنے میں آپ کیسے کامیاب ہوتے ہیں۔ میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

عادل جعفری

جناب دینا ناتھ گردھر

ادھر اُدھر سے

چاند کی سیر

پیامیوں نے سال ۶۸ء میں امریکہ کے اس راکٹ کا حال پڑھا ہوگا جو چاند کے گرد چکر لگانے کے بعد کامیابی کے ساتھ زمین پر اُتر آیا اور اس طرح انسان پہلی بار چاند کے نزدیک پہنچ سکا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ چاند پر پہونچنے کا انسان کا بہت پرانا خواب اب پورا ہونے والا ہے۔

اس راکٹ کے کامیابی سے واپس آنے کے بعد حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ امریکہ نے ان تینوں جاں بازوں کے ناموں کا اعلان کر دیا ہے جو اگلے چار چھ مہینوں میں چاند پر اتریں گے۔ یہ تینوں پہلے بھی راکٹ میں زمین کے گرد اُڑان کر چکے ہیں۔ اب انھیں چاند پر اترنے اور واپس زمین پر آنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے اور ان کے راکٹ کی ہر طرح دیکھ بھال کی جا رہی ہے۔

حال ہی میں روس نے ۱۴ جنوری کو ایک آدمی کو راکٹ میں بھیجا جو زمین کے گرد سو میل سے ڈیڑھ سو میل کی دوری پر اُڑان کرنے لگا۔ دوسرے ہی دن ایک اور راکٹ میں تین اور آدمیوں کو بھیجا گیا۔ وہ بھی اسی طرح زمین کے گرد اُڑان کرتے رہے۔ ۱۶ جنوری کو پروگرام کے مطابق ایک دوسرے کے بہت نزدیک آگئے اور پھر ایک دوسرے سے جڑ گئے۔ یہ حالت ساڑھے چار گھنٹے تک رہی۔ اسی دوران دوسرے راکٹ کے دو ہوا باز اپنے راکٹ سے نکل کر ایک گھنٹے سے زیادہ ہوا میں تیرتے رہے اور پھر اپنے راکٹ کی بجائے پہلے راکٹ میں داخل ہو گئے۔ اس طرح پہلے راکٹ میں ایک کی جگہ تین اور دوسرے راکٹ میں تین کی جگہ ایک ہوا باز بیٹھ گئے۔ پھر دونوں راکٹ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور علیحدہ علیحدہ اُڑان کرنے لگے۔ اس لحاظ سے راکٹ کے دور میں روس نے دو نئے کارہائے نمایاں کیے ہیں یعنی دو اڑتے ہوئے راکٹوں کو ایک ساتھ ملانا اور ایک راکٹ کے ہوا بازوں کا دوسرے راکٹ میں اڑان کے دوران داخل ہونا۔ روس نے یہ تجربہ اس لیے کیا ہے کہ چاند پر جانے والے راکٹ اور ہوا بازوں کے لیے راستے میں اترنے چڑھنے کے لیے پلیٹ فارم تیار کیے جا سکیں اور ہوا بازوں کو مشکل سے دوچار ہونے سے بچایا جا سکے۔ یہ دونوں روسی راکٹ اور ان کے ہوا باز بخیریت زمین پر واپس آگئے۔

شاید آپ کو یہ جان کر بھی تعجب ہوگا کہ پچھلے دنوں روس

نے ایک راکٹ ایک دور دراز سیارہ زُہرہ کی طرف چھوڑا تھا۔ یہ سیارہ زمین سے لگ بھگ ڈھائی کروڑ میل دور ہے۔ راکٹ وہاں ساڑھے چار مہینے میں (مئی میں) پہنچے گا اور وہاں سے اس سیارے کے فوٹو بھیجے گا۔ جن سے وہاں کی کیفیت معلوم ہوگی۔ اس سے پہلے بھی روس نے اسی سیارے پر راکٹ بھیجا تھا جس نے کچھ دن وہاں سے فوٹو بھیجنے کے بعد کام بند کر دیا تھا۔

پیامِ تعلیم کے کسی پچھلے شمارے میں دنیا کے بہترین کرکٹ کھلاڑی گارفیلڈ سوبرس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ اس نے انگلستان میں کھیلتے ہوئے ایک ہی اوور کے چھ بالوں پر چھکے لگائے تھے۔ حال ہی میں ہمارے دیس میں جے پور میں ایک طالب علم پرتھا سارتھی نے اپنے کالج کی طرف سے کھیلتے ہوئے ایک ہی اوور کے چھ بال پر چھ چھکے لگائے۔ اس نے بھرت پور میں ایک اور میچ کھیلتے ہوئے ۲۵۵ رن بنائے جن میں ۲۴ چوکے اور ۲۰ چھکے تھے۔

ہندوستانی اسکولوں کے طالب علموں کی ایک کرکٹ ٹیم حال ہی میں آسٹریلیا اور سنگاپور کا دورہ کر کے واپس آئی ہے۔ اس ٹیم نے آسٹریلیا میں چھوٹے بڑے ۱۹ میچ کھیلے جن میں ۱۱ جیتے، ۴ برابر رہے اور چار ہارے۔ سنگاپور میں بارش کی وجہ سے صرف ایک میچ ہو سکا جو ہماری ٹیم نے ۹ وکٹ سے جیت لیا۔ آسٹریلیا میں ایک میچ میں مہندر امرناتھ نے صرف ۴۸ رن دے کر ۶ کھلاڑی آؤٹ کیے۔ اور اسی میچ میں دو گھنٹوں میں اکیلے انھوں نے ۹۹ رن بنائے جن میں ۱۳ چوکے اور ایک چھکا شامل تھا۔ مہندر امرناتھ کرکٹ کے مشہور کھلاڑی اور ہندوستانی ٹیم کے کپتان لالہ امرناتھ کے لڑکے ہیں۔

حال ہی میں دلّی میں ہندوستان کی مشہور ترین فٹ بال ٹورنامنٹ، ڈیورنڈ ٹورنامنٹ ختم ہوئی ہے۔ اس سال اس میں ہندوستان کے علاوہ کچھ غیر ملکی ٹیمیں بھی شامل ہوئیں۔ یہ ٹورنامنٹ جالندھر کی بارڈر سیکورٹی فورس کی ٹیم نے جیتا۔ یہ ٹیم اس سال پہلی بار ٹورنامنٹ میں شامل ہوئی تھی اور اس نے ہندستان کی سب سے بڑی دونوں ٹیموں یعنی موہن بگان اور ایسٹ بنگال کو ہرایا ہے۔

امریکہ کے صدر کو اب تک ایک لاکھ ڈالر یعنی ساڑھے سات لاکھ روپے سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ تمام اخراجات اس کے علاوہ ہیں اب ۲۰ جنوری سے امریکہ کے نئے صدر مسٹر رچرڈ نکسن کی تنخواہ دگنی کر دی گئی ہے یعنی انھیں تمام اخراجات کے علاوہ پندرہ لاکھ روپے سالانہ ملا کریں گے۔

پچھلے دنوں جرمنی کے سب سے بڑے چڑیا گھر کے ڈائرکٹر ہندوستان کے چڑیا گھر دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ وہ دہلی کے چڑیا گھر کے سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ چڑیا گھر کی سیر کر رہے تھے اچانک وہ شیروں کے کٹہرے میں گھس گئے اور دس منٹ تک ایک شیر کے ساتھ کھیلتے رہے۔ ایک شیر نے تو ان کی گردن پر اپنے اگلے پنجے رکھ دیے۔ وہ تو خوشی خوشی واپس آ گئے لیکن دیکھنے والوں کے ہوش اوپر نیچے ہو رہے تھے۔

جرمنی کے شہر فرنکفرٹ میں ہر سال دنیا بھر کے ملکوں کی کتابوں کی نمائش ہوتی ہے۔ اسی طرح کی ایک نمائش کچھ تین چار سال میں ہمارے دیس میں انتظام کیا جا رہا ہے۔ یہ نمائش نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے لگائی جائے گی۔ ہندوستانی کتب فروشوں اور کتابیں چھاپنے والوں کو دوسرے ملکوں کی مشہور اور درسی کتابیں یہاں چھاپنے کے لیے معاہدہ کرنے کی سہولتیں دی جائیں گی۔

ان دنوں لنکا کے دار الخلافہ کولمبو میں ہندوستانی مصنوعات کی ایک شاندار نمایش ہو رہی ہے۔ اس میں ہندوستان کی بنی ہوئی روز مرہ کی ضروریات کی گھریلو چیزوں سے لے کر بھاری مشینیں تک دکھائی جا رہی ہیں۔ نمایش کا افتتاح لنکا کے وزیر اعظم شری سینا نائک نے ۲۵ جنوری کو کیا تھا۔

تبصرہ

غالب کی کہانی

از جناب محمد شفیع الدین صاحب نیر
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۲۸ صفحات
لکھائی چھپائی بہت اچھی، کاغذ سفید چکنا
قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ: نیر کتاب گھر۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

'غالب کی کہانی' بڑے انتظار کے بعد آخر شایع ہو گئی۔ یہ ہمارے لیے، آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے، بہت بڑی خوش خبری۔

مرزا غالب کی زندگی پر کچھ لکھنا، اس طرح لکھنا کہ ان کی زندگی کے تمام پہلو اجاگر ہو سامنے آجائیں بہت مشکل کام ہے آپ مبالغہ نہ سمجھیں بڑے بڑے لکھنے والوں کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ پھر بچوں کے لئے لکھنا! پر کیا کیا جائے ذاکر صاحب قبلہ (صدر جمہوریہ ہند) کی خواہش تھی کہ بچوں سے بھی مرزا غالب کی جان پہچان کرائی جائے۔ ذاکر صاحب کی پرکھ اور مردم شناسی کی داد دیجیے کہ نظر انتخاب بچوں کے ادیب مولانا شفیع الدین نیر جیسے ماہر فن پر پڑی اور نیر صاحب نے بھی پورے پانچ سال محنت کی، ریاض کیا تب یہ شاہکار ہمارے آپ کے سامنے آیا۔

محترم نیر صاحب نے ۱۲۶ صفحوں کی اس مختصر سی کتاب میں مرزا غالب کے بچپن سے لے کر آخر عمر تک کے حالات بڑی ہنر مندی، بڑی خوش اسلوبی سے سمو دیے ہیں پھر ان کی شاعری کا بھی ذکر ہے، ان کی نثر نگاری کا بھی حال ہے۔ شاعری میں مرزا نے جو نت نیا اور اچھوتا انداز اختیار کیا اس کی طرف بھی اشارہ ہے۔

کتاب کی زبان اتنی سادہ، ایسی نکھری ستھری، اور انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد کیا مجال جو ختم کیے بغیر آپ اسے ہاتھ سے رکھ دیں۔

کتاب کی ایک خوبی اور ہے۔ بہت بڑی خوبی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ کتاب بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ لیکن کتاب کے سرورق سے بچوں کا لفظ نکال دیا جائے اور پھر بڑے پڑھیں تو وہ بھی اسے اتنے ہی شوق اتنی ہی دلچسپی سے پڑھیں گے۔ انھیں ذرا بھی یہ محسوس نہ ہوگا کہ یہ بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔

نیر صاحب نے کتاب کی ظاہری خوش نمائی پر بھی پوری توجہ کی ہے۔ کیا لکھائی، کیا چھپائی اور کیا کاغذ۔ سبھی غیر معمولی۔ ٹائیٹل دو رنگا نہایت خوبصورت —— ہم محترم نیر صاحب کی خدمت میں اس کامیاب کوشش پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اطہار الحق

باغ بانی

فروری میں کیا کرنا ہے ـ!

باغیچہ کے کام کی تفصیل ۔

لان :۔ لان سے متعلق جو کام ہو رہا ہے اس کے علاوہ اور کوئی خاص کام نہیں۔ یعنی خودرو پودوں کو نکالتے رہنا چاہیے اور اگر ضرورت ہو تو امونیم سلفیٹ کھاد پانی میں گھول کر دیا جائے (آدھا پونڈ میں چار گیلن پانی ملا کر)

موسمی پھول :۔ سردیوں کی پھلواری میں اس وقت خوب پھول آرہے ہیں۔ کیاریوں کی گوڑائی کی جائے اور پانی دیا جائے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں کو علیحدہ کرتے رہیے اور اچھے اور پسندیدہ پھولوں کو بیج کے لیے چھوڑتے رہنا چاہیے۔ گرمیوں کی پھلواری کے بیج بونا شروع کر دیے جائیں۔

گلاب : مرجھائے ہوئے پھولوں کو توڑنا۔ جن پودوں پر کلیاں آرہی ہوں انھیں ہلکا رقیق (پانی میں گھلا ہوا) کھاد دینا۔ اگر کیڑے یا بیماری ہو تو دوا چھڑکنا

گل تسبیح :۔ کیاریاں ٹھیک کرکے کھاد دیا جائے۔ جن پتیوں اور پھولوں پر پالے کا اثر ہو گیا ہے ان کو نکالنا۔

آرائش کی جھاڑیاں : نکائی، گوڑائی اور پانی دینا کیلیڈیم کے پودوں کو گملوں میں لگانا۔

پھل : لیچی، آم اور لوکاٹ پر پھول آرہے ہیں۔ ان کو پھل بننے کے بعد پانی دینا۔ اس مہینے میں آم لیچی، امرود، سنترہ اور لیمو کے پودے لگائے جا سکتے ہیں۔ ترشاوہ کے بیجو پودوں کو بدلنا ان پر چشمہ چڑھانا۔ آم کے پودوں پر بھی قلم چڑھائی جا سکتی ہے۔ تھالوں کی گوڑائی اور پانی دینا

ترکاریاں : گرمیوں کی سبزیوں کے بیج بونا، کدو، لوکی، ٹنڈا، پرول، بینگن وغیرہ بونا۔ دیر سے ہونے والی پھول گوبھی بونا۔ سلاد بھی بویا جا سکتا ہے۔
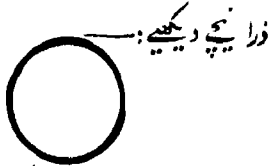
ذرا نیچے دیکھیے :—

○

ایک گول دائرہ سا بنا ہے۔ اس گول دائرے میں ایک سرخ نشان ہے۔ اس سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت اس مہینے ختم ہو رہی ہے۔

پیام تعلیم آپ کے پاس کافی عرصے سے آ رہا ہے اور آپ اس کو پسند کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ نہ صرف اس کے خریدار رہیں گے بلکہ پیامی برادری کو اور آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے، پیام تعلیم کے زیادہ سے زیادہ خریدار بنائیں گے۔

اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر بھیج دیجیے۔ اور ہاں منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے۔ آپ کا خریداری نمبر ہے

"منیجر"

ذرا بتائیے تو...

جواہرات کی ایک دکان میں ڈاکہ پڑا۔ فرض کیجیے کہ آپ وہ اکیلے شخص ہیں جس نے ڈاکہ کی اس واردات کو آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آپ کو گواہی کے لیے عدالت میں بلایا گیا۔ کیا آپ وکیل کی جرح کے جوابات دے سکتے ہیں؟ اس تصویر کو بغور دیکھیے۔ تصویر کی کوئی چیز بھی آپ کی نظر سے چھوٹنے نہ پائے اور اب صفحہ الٹیے اور سوالات کے جواب دیجیے۔

سوالات

۱- ڈاکہ کس وقت پڑا؟
۲- ڈاکہ کس تاریخ کو پڑا؟
۳- دکان کہاں واقع تھی؟
۴- دکان کس چیز کی تھی؟
۵- دکان کے مالک کا کیا نام تھا؟
۶- کیا اس وقت دن تھا یا رات؟
۷- دکان کا مالک کس رنگ کا سوٹ پہنے تھا؟
۸- وہ کس قسم کے جوتے پہنے تھا؟
۹- وہ ہیٹ پہنے تھا یا ٹوپی؟
۱۰- کیا تصویر میں کوئی جھنڈا تھا؟
۱۱- دکان میں اس وقت کتنے آدمی تھے؟
۱۲- کیا دکان میں کوئی تجوری تھی؟
۱۳- کیا تجوری کھلی ہوئی تھی؟
۱۴- تجوری کس رنگ کی تھی؟
۱۵- کیا دکان کا مالک چشمہ پہنے تھا؟
۱۶- کیا مالک دکان کی کوئی انگلی کٹی ہوئی تھی؟ اگر تھی تو کون سی اور کس ہاتھ کی؟
۱۷- کیا شوکیس لوٹا ہوا تھا؟
۱۸- کیا تصویر میں کوئی گاڑی تھی؟
۱۹- اس گاڑی میں کتنے آدمی تھے؟
۲۰- کیا تصویر میں کوئی سپاہی بھی تھا؟
۲۱- دکان کے فرش پر کیا تھا؟
۲۲- دکان کے سامنے کیا کوئی دفتر تھا؟
۲۳- دفتر کا کیا نام تھا؟
۲۴- کیا دکان کا بیمہ ہو چکا تھا؟
۲۵- اس بیمہ کمپنی کا کیا نام تھا؟
۲۶- کیا دکان کا مالک ٹائی باندھے تھا؟
۲۷- ٹائی کا ڈیزائن کیا تھا سادہ یا دھاری دار؟
۲۸- ٹائی زمین پر پڑی تھی یا شوکیس پر؟
۲۹- وہ آدمی جو کاؤنٹر کے آخر میں کھڑا تھا ٹوپی پہنے تھا یا ہیٹ؟
۳۰- اس کے ہاتھ میں کیا تھا؟
۳۱- اس کا سوٹ ہلکے رنگ کا تھا یا گہرے رنگ کا؟
۳۲- کیا مالک دوکان کی داڑھی تھی؟

بھلا بتائیے تو آپ نے کتنے سوالوں کے جوابات صحیح دیے؟

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. No. D. 1457

FEBRUARY 1969

Pa Taleem

NEW DELHI-25.

قاعدہ

یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ

یہ قاعدہ مکتبہ جامعہ نے تعلیمی اصولوں کے پیشِ نظر نئی ترتیب کے ساتھ نئے سرے سے مرتب کیا ہے۔ غیر ضروری چیزیں کم کی گئی ہیں سبقوں اور مشقوں میں مُفید اضافے کیے گئے ہیں۔

ہر سبق کے شروع میں پڑھانے والوں کے لیے آسان اور مختصر ہدایتیں دی گئی ہیں جن کی مدد سے معمولی اُردو جاننے والے والدین بھی اپنے بچّوں کو آسانی کے ساتھ بہت کم مدّت میں قرآن مجید پڑھا سکتے ہیں۔

اِن خوبیوں کی وجہ سے اِس قاعدے کی افادیت بازار میں مِلنے والے عام قاعدوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

سفید گلیز کاغذ .... آفسٹ کی چھپائی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

سالانہ چندہ
۶ روپے

یت فی پرچہ
۰ پیسے

فہرست

یہ پرچہ جس وقت آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا آپ عید کی خوشیاں منا رہے ہوں گے۔ ہماری طرف سے اور اپنے پیامِ تعلیم کی طرف سے مبارکباد قبول کیجیے۔ ایسی عیدیں ہزار دیکھو تم۔

سالنامے کے بارے میں خطوں کا تانتا بندھا ہوا ہے آپ لوگوں نے امید سے زیادہ پرچے کا خیر مقدم کیا ہے۔ جی بھر کے تعریف کی ہے، دل کی گہرائیوں سے کی ہے سب سے بڑی بات یہ کہ سالنامے کو پڑھ کر کی ہے۔ گویا خوب سوچ سمجھ کر کی ہے۔ اسی لیے ہمیں بھی سچی خوشی نصیب ہوئی ہے۔ پیامِ تعلیم کو ترقی دینے کا نیا حوصلہ، اُسے آگے بڑھانے کی نئی امنگ اور ولولہ پیدا ہوا ہے۔

تو یہ تصویر کا ایک پہلو بہت ہی روشن بہت ہی اجاگر ہے مگر ایک پہلو اور بھی ہے۔ یہ اتنا روشن، اتنا اجاگر نہیں ہے۔ اور یہ ہے اس کا مالی پہلو۔ باوجود انتہائی کوشش کے آمدنی اور خرچ کے ڈانڈے نہیں مل رہے ہیں۔ یہ بڑی پریشانی کی بات ہے — کبھی کبھی تو یہ پریشانی دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ اس طرح چھا جاتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آگے چل کر کیا ہوگا۔ پیامِ تعلیم پر کیا بیتے گی؟ اُسے خون پسینہ ایک کرکے چلانے والوں پر کیا بیتے گی۔

ہم نے اپنے عزیز پیامیوں کو بار بار اس طرف توجہ دلائی ہے۔ مگر انھیں اس طرف دھیان دینے کا موقع نہیں ملا۔ اپنے بزرگوں اور ساتھیوں سے ہمیں زیادہ شکایت نہیں ہے انھوں نے بس بھر ہمارا ہاتھ بٹایا ہے۔ جیسے بھی بن پڑا ہے ہماری مدد فرمائی ہے۔ مگر پیامیوں میں سوائے عزیزی عبداللہ محمد یونس کے اور عزیزی محمد امین کے، یا چند اور گنے چنے پیامیوں کے بہت کم نے مدد کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ ان دو عزیزوں نے اور بھی خریدار دینے کا وعدہ کیا ہے۔ خدا انھیں خوش رکھے ان کے علم میں ترقی دے، اور دوسرے پیامیوں کو ان کے قدم بہ قدم چلنے کا جوش پیدا ہو۔

اس وقت ہمیں صرف ایک ہزار خریدار اور مل جائیں تو ہماری پریشانیوں میں بڑی حد تک کمی ہو جائے پیامِ تعلیم کو اور اچھی حالت میں چلانے کا موقع مل جائے اور اس سے بھی اہم بات یہ کہ اس کی پائیداری کا یقین ہو جائے۔

اگر آپ سچے دل سے ارادہ کرلیں تو ایک ہزار خریدار بنانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہم آپ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مثلاً آپ نے ایک، دو یا تین خریدار مرحمت فرمائے تو آپ کا نام پیام تعلیم میں شایع کردیا جائے گا۔ پانچ یا اس سے زیادہ خریداروں پر پیام تعلیم آپ کے نام سال بھر کے لئے مُفت جاری کردیا جائے گا! امید ہے کہ آپ ہماری بات پر کان دھریں گے — ہمیں آپ کی کوششوں کے نتیجے کا انتظار رہے گا۔

ہمارے بہت بڑے شاعر مرزا غالب مرحوم ۱۸۶۹ء کو اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ اسی لیے ان کی سو سالہ برسی بڑے اہتمام بہت دھوم دھام سے منائی جارہی ہے۔ ہندوستان ہی میں نہیں دنیا کے چھوٹے بڑے اور بہت سے ملکوں میں بھی۔ ہندوستان میں خاص طور سے دلّی ان سرگرمیوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ جلسے ہورہے ہیں، سمنار ہورہے ہیں، مشاعرے ہو رہے ہیں، اخباروں اور رسالوں کے خاص نمبر نکالے جارہے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے بھی غالب نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس ارادے پر ہم اب بھی قائم ہیں مضمون بھی جمع کررہے ہیں۔ مگر بھئی، غالب پر بچوں کے لیے کچھ لکھنا، بچوں کی سمجھ کے مطابق لکھنا، انھی کی زبان میں لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ پھر بھی ہم کوشش کررہے ہیں —!
محترم مالک رام صاحب، عبداللہ ولی بخش قادری صاحب اور کچھ اور سمجھ دار لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نمبر بہت اطمینان سے نکالا جائے۔ وقتی جوش و خروش کے ختم ہونے کے بعد نکالا جائے۔ یہ رائے ہمیں پسند آئی۔ دُعا کیجیے کہ ہمارا یہ نمبر بھی 'ذاکر نمبر' کی طرح کامیاب ہو۔ لوگ 'ذاکر نمبر' کو ایک تاریخی دستاویز کہتے ہیں۔

تاہم اس تقریب میں بنا شریک ہوئے بھی نہیں رہا جاتا۔ اسی لیے ہم عبداللہ ولی بخش قادری صاحب کا ایک بہت ہی اچھا مضمون شایع کررہے ہیں اور ایک نظم بھی۔ یہ مضمون آپ کو بہت اچھا لگے گا۔

اس پرچے میں اقبال متین صاحب کی دل چسپ کہانی کے علاوہ مرزا شکور بیگ کی مزاحیہ کہانی پڑھیے۔ یہ دونوں ہمیں بہت بعد میں ملیں۔ مرزا صاحب کی کہانی کا دوسرا حصّہ بھی ہمیں مل گیا ہے۔ اپریل میں چھپے گا۔ بہت ہی دل چسپ ہے۔

آؤ
(ننھے پیامیوں کے لیے)
آؤ، پاشا، تاج، متینہ
راجو، اوشا اور مبینہ!
تم بھی چھوٹے، ہم بھی چھوٹے
تم نہیں جھوٹے، ہم نہیں جھوٹے
تم بھی سچے، ہم بھی سچے!
ایک ہیں ہم سب اچھے بچے
ہم سب ہیں دنیا کے پیارے
ماں کی باپ کی آنکھ کے تارے
پڑھ لکھ کر ہم نام کمائیں
کام سے اپنا جی نہ چُرائیں
وقت ملے تو ناچیں گائیں
کھیلیں کودیں، دھوم مچائیں

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالبؔ کو نہ جانے

اب سے تیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ جب بھی کوئی چھپا ہوا دعوت نامہ آتا اُسے جمع کر لیتا۔ کئی کارڈ مجھے ایسے ملے جن کے شروع میں یہ شعر لکھا تھا:

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے

میں یہ سمجھا کہ خط یا دعوت نامے کو شروع کرنے کا اچھا ڈھنگ یہی ہے۔ ایک دن جب ماسٹر صاحب نے درجے میں پوچھا کہ خط کس طرح شروع کرتے ہیں تو میں نے فوراً ہاتھ اٹھایا اور اجازت پاتے ہی بڑے اطمینان سے وہ شعر پڑھ دیا ــــــ ماسٹر صاحب ہنسنے لگے۔ پھر انھوں نے بتایا کہ یہ ایک شعر ہے۔ غالبؔ کا شعر۔ اور بھی شاید کچھ کہا ہو مگر اب مجھے اتنا ہی یاد آرہا ہے۔ اس سے پہلے مجھے خیال نہیں آتا کہ غالبؔ کا نام سنا ہو۔ پھر ایک دن کیا ہوا! میں نے اپنے بڑے بھائی کے ایک دوست کو یہ شعر گنگناتے ہوئے سنا:

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

سنتے ہی میں نے ایک نعرہ لگایا "غالبؔ"۔ ان دونوں نے میری طرف دیکھا اور مسکرانے لگے۔ پھر میرے بڑے بھائی بولے کہ بھئی تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ شعر غالبؔ کا

ہے۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ غالباً بس اتنا کہہ پایا کہ شعر غالب کا ہوتا ہے۔ یہ بات آج تک مجھے اس لیے یاد ہے کہ میرے بھائی کے وہ دوست جب آتے مجھ سے یہ ضرور کہا کرتے کہ 'ہاں بھئی' شعر غالبؔ کا ہوتا ہے'۔ میں بڑا ہو گیا لیکن میرے بچپن کی یہ بات وہ ہمیشہ دہراتے رہے۔

کچھ اس طرح غالبؔ کا نام میرے کان میں پڑا۔ اُس وقت گیت، گانے، غزلیں، نظمیں، موقعے موقعے پر ہی سُننے کو ملتی تھیں۔ اب تو ریڈیو کی برکت سے ہر وقت گھر بیٹھے یہ لطف میسر ہے۔ چھوٹے درجے کی کتابوں میں بھی غالبؔ کی زندگی کے بارے میں مضمون مل جاتے ہیں۔ بچّوں کے رسالوں کی تعداد برابر بڑھتی رہی ہے۔ اُن میں بھی نام آتا ہی رہتا ہے۔ پیام تعلیم پڑھنے والے بچے تو یقیناً غالبؔ کے نام سے واقف ہوں گے۔ اُردو جاننے والا شاید ہی کوئی ایسا ہو جو آج انھیں نہ جانتا ہو۔ اس وقت تو یوں بھی اردو والوں میں غالبؔ کے نام کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ اخبارات میں ان کا ذکر، رسالوں میں اُن پر مضامین، مجموعہ غالبؔ

کلام کے ترجمے، کتابیں ان کے حالات پر، عمارتیں اور انجمنیں ان کی یاد میں قائم، سرکاری ٹکٹ ان کے نام کا جاری۔ اور بھی بہت کچھ۔ کسی بڑے آدمی، دوسروں کے دل میں اپنی جگہ پیدا کرنے والے آدمی، کی یادگار منانے کے لیے جو بھی ہونا چاہیے وہی کیا جا رہا ہے۔ ایک زبان کے بولنے والے اپنے ایک شاعر کو نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ دیس بدیس کے اور بھی بہت سے لوگ شریک ہیں جنھیں اردو زبان سے کسی قسم کا کوئی لگاؤ ہے۔ وہ لوگ غالبؔ کے کلام کا ترجمہ اپنی اپنی زبانوں میں پیش کر رہے ہیں، غالبؔ کے بارے میں اپنے دیس کے لوگوں کو باتیں بتا رہے ہیں۔ اُن کے گُن گا رہے ہیں۔ ہم سب کے لیے ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ غالبؔ کی سو سالہ برسی کی تاریخ ہے۔ غالبؔ سے پہلے اور ان کے بعد اردو کو بہت سے اچھے اچھے شاعر ملے جنھوں نے اپنے کلام سے اُسے مالا مال کیا ہے۔ اس وقت بھی اچھے شاعر موجود ہیں۔ لیکن جو ہر دل عزیزی غالبؔ کو نصیب ہوئی اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ غالبؔ اپنے زمانے میں مشہور تھے لیکن سو سال بعد اور زیادہ مشہور ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کی شاعری، ہر ایک کو اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ ان کے شعر، خاص طور پر وہ شعر جو سادگی سے ادا ہوئے ہیں، لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ بات بات میں ان کا شعر پڑھ دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی شعروں میں سے چند سنیے:

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں   ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ   مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

نہ سنو گر برا کہے کوئی   نہ کہو گر برا کہے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی   بخش دو گر خطا کرے کوئی

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

غالبؔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے ان شعروں میں سے کوئی نہ کوئی پہلے نہ سن رکھا ہو، یا کوئی اور غالبؔ کا شعر نہ جانتا ہو۔ کسی دوسرے شاعر کے بارے میں یہ کہنا دشوار ہے۔

غالبؔ کی شاعری نے تو لوگوں کے دلوں کو جیتا ہی ہے، ان کے خطوں نے بھی کچھ کم اپنا سکہ نہیں جمایا۔ اب تو سیدھے سادھے انداز میں خط لکھنے کا چلن ہے۔ جیسے بولتے ہیں قریب قریب اُسی طرح لکھتے ہیں۔ لیکن غالب کے زمانے میں لمبے چوڑے القاب و آداب کے ساتھ خط شروع ہوتا تھا۔ اس کی عبارت میں بھی بڑا مصنوعی پن رہتا تھا۔ سارا ڈھنگ ہی بناوٹی تھا۔ غالبؔ نے اس طریقے کو بدلا اور اس طرح خط لکھنا شروع کیا جیسے کوئی بے تکلفی کے ساتھ باتیں کر رہا ہو۔ اب جیسا کچھ خط ہم آپ لکھتے ہیں اس کا سہرا غالبؔ ہی کے سر ہے۔ اب بھی ان کے خط نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن میں ایک خوبی اور ملتی ہے وہ ہے شوخی۔ وہ بڑے خوش مزاج انسان تھے۔ اس طرح بات کہتے کہ سننے والا پھڑک اٹھتا۔ ان کے خطوں سے ان کی طبیعت کی تیزی اور مزے داری دونوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کے آخر میں خط لکھا جس کا جواب انھیں جنوری کے پہلے ہفتے میں ملا۔ اس کے جواب میں

ان کو یوں لکھا،

"دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں ۱۸۵۸ء کے
خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ کہ
جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے
ہی دن جواب لکھا ہے۔"

جس شخص کے خطوط ایسے ہوتے تھے، اس کی باتوں سے اگر لطیفے نہ بنتے تو تعجب ہوتا۔ وہ تو بات میں بات پیدا کر دینے والے آدمی تھے۔ معمولی سا واقعہ ہوتا مگر ان کے مُنہ سے چٹکلا بن کر نکلتا۔ جو سُنتا لوٹ جاتا۔ خود یاد رکھتا، دوسروں کو سناتا، ان کے لطیفے آج تک برابر دُہرائے جاتے ہیں اور ان سے محفل کو گرمانے کا کام خوب خوب لیا جاتا ہے۔ اچھا دو لطیفے آپ بھی سنیے۔

* ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟" عرض کیا "پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔"

* غالب کو آم بے حد پسند تھے لیکن ان کے ایک دوست حکیم رضی الدین خاں کو آم قطعی نہ بھاتا تھا۔ ایک دن وہ اپنے گھر پر حکیم صاحب کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے اسی وقت ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے اُدھر سے گزرا۔ ان کے سامنے گلی میں آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سُونگھ کر چھوڑ دیا۔ حکیم صاحب نے کہا۔ "دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔" غالب نے کہا "بے شک گدھا نہیں کھاتا۔"

ایسے بہتیرے لطیفے ان کے خطوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اونچ نیچ دونوں دیکھی۔ کبھی آرام سے گزری اور کبھی تکلیف سے لیکن ان کے مزاج میں مروّت اور شوخی مرتے دم تک قایم رہی۔ ان کی قدر کرنے والے بھی ہمیشہ موجود رہے۔ ان کی باتیں سب کے دل میں گھر کرتی تھیں کیوں کہ ان سے دل بھی خوش ہوتا تھا اور روشنی بھی ملتی تھی۔

غالب، ۲۷ دسمبر ۱۷۹۶ء کو آگرے میں پیدا ہوئے تیرہ سال کی عمر میں دہلی کے ایک عزّت دار گھرانے میں ان کی شادی ہوئی پھر وہ دِلّی والے ہی ہو کر رہ گئے۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ بڑے ہوئے تو عمدہ عمدہ شعر کہنے لگے ہر جگہ عزّت ہونے لگی۔ لال قلعے تک پہنچ ہوئی۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد بنے۔ وظیفہ ملا خطاب پائے۔ بہت سے قدر کرنے والے دوست اور شاگرد ملے۔ اُن کے شعر لوگ دہلی سے باہر سوغات کے طور پر لے جانے لگے۔ پھر وہ دن آ پہنچا جو ہر جاندار کے لیے لازمی ہے تہتّر برس چار مہینے کی عمر میں اس دنیا سے چل بسے اور یہیں دہلی میں حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کے باہر جنوب مشرق کی طرف دفن ہوئے۔

اگرچہ غالب کی مقبولیت ان کی اُردو غزل کی وجہ سے ہے لیکن ان کے قصیدے بھی مشہور ہیں۔ اُن کی فارسی نثر اور شاعری بھی ایک حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کے خطوط اپنی آپ مثال ہیں۔ اُن کے لطیفے بھی کچھ کم نہیں۔ ان کی ذات میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک نہ صرف ان کا نام زندہ ہے بلکہ اور روشن ہوتا جا رہا ہے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا! خود انھوں نے کہا تھا اور سب سے زیادہ انھیں کو زیب بھی دیتا ہے۔

جناب رشید الوحیدی

اتحاد

۸ر فروری کو شام کے وقت جامعہ ملیہ کے پاس ہی ایک طرف آگ لگ گئی تھی۔ میں خود بھی وہیں موجود تھا، مگر میرا دماغ یہ سب باتیں سوچ رہا تھا جو بچوں کے لیے اور بچوں کے ذریعہ بڑوں کے لیے غور کرنے کی ہیں۔

کل شام چھ بجے تھے کہ اک شور سا ہوا
میں بھی اٹھا کہ دیکھوں ذرا ماجرا ہے کیا

باہر نکل کے دیکھا تو عالم عجیب تھا
ہر سمت آگ گویا جہنم قریب تھا

کچھ لوگ جب جگہ نہ انھیں کوئی مل سکی
رہنے لگے تھے ڈال کے اک سمت جھونپڑی

شعلہ اُڑا تو اس میں کہیں آگ لگ گئی
اس دن ہوا بھی تیز تھی ہر سو بھڑک گئی

گھبرا رہے تھے لوگ پریشان حال تھے
سامان گھر کا پھینک رہے تھے نکال کے

بھگدڑ مچی ہوئی تھی عجب اضطراب تھا
گھر جل رہا تھا جس کا مقدر خراب تھا

احمد علی تھا کوئی، کوئی بابو رام تھا
اس وقت سب کو آگ بجھانے سے کام تھا

میں ایک سمت سوچ رہا تھا کھڑا ہوا
یہ ہے وہ آگ جس نے دلوں کو ملا دیا

اس وقت سب کے دل پہ فقط ایک گھاؤ تھا
آپس میں کوئی فرق نہ کچھ بھید بھاؤ تھا

ایسا پڑا تھا وقت کسی کو نہ تھی مجال
لائے زباں پہ ہندو مسلمان کا سوال

یوں ہی اگر دلوں سے برائی نکال دے
ہر قوم مل کے ہند سے آفت کو ٹال دے

جناب مرزا شکور بیگ

چچا ابّا نے روزہ رکھّا

انوری کی بسم اللہ میں شریک ہونے امّی مجھے اور میری بہن سلطانہ کو ساتھ لے کر چچا ابا کے گھر پہنچ گئیں۔ ابّا کو رخصت نہ مل سکی۔ ہمارے ساتھ نہ آسکے۔ بسم اللہ کے دن پہنچنے کا وعدہ کیا۔

"تمہارے یہاں کس کس کا روزہ ہے؟ روزے کیسے کٹ رہے ہیں؟" باتیں ہو رہی تھیں کہ چچا ابا نے کمرے سے آواز دی: "ممتاز! او ممتاز!"

"جی۔ آئی۔" ان کی لڑکی نے جواب دیا۔

"بٹیا گیتو سے کہنا کہ حقّہ بھر لائے۔" یہ سُن کر میں نے پوچھا "چچی امّاں کیا ابا کا روزہ نہیں ہے؟"

"میاں ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"تو ان کے کے روزے ہوئے؟"

"ایک نہیں ہوا—" چچی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میری بہن سلطانہ بلا کی شریر تھی وہ باتوں کو غور سے سُن رہی تھی۔ اس نے پوچھا "ایک نہیں ہوا یا ایک بھی نہیں ہوا؟"

چچی نے کہا "ایک چھوڑ آدھا بھی نہیں ہوا۔"

نہ معلوم چچا ابا کا پہلے سے ارادہ تھا یا یہ باتیں سُن کر انھوں نے ہمت کی۔ اندر سے آواز دی "سُنتی ہو۔"

"جی کہیے کیا کہتے ہیں؟"

"بھئی کل تو ہم بھی روزہ رکھیں گے۔"

"ارادہ تو نیک ہے مگر پہلے اپنے مزاج کی حالت پر غور کر لیجیے۔"

"اجی مزاج وزاج سب اچھا ہے۔ ہزار طبیعت خراب سہی کل کا دن مبارک دن ہے۔ ستائیس تاریخ ہے الوداع بھی ہے۔ ایک روزہ تو رکھ لینے دو۔"

"میں منع کب کرتی ہوں۔ رکھیے اور شوق سے رکھیے۔"

پھر دبی زبان میں امّی سے کہا "اب تم روزے میں ان کی حالت دیکھنا۔ اللہ ہی ہے جو کل کا دن خیر و خوبی سے گزر جائے۔"

رات کو جب ہم سب سونے چلے تو امّی نے کہا "کل تم لوگ چچا ابا کے پاس نہ جانا۔ روزے میں انھیں غصّہ بہت آتا ہے۔" سلطانہ نے لقمہ دیا "واہ واکل تو چچا ابا نے "فونو گراف" بجانے کو کہا ہے۔ میں تو ضرور جاؤں گی۔"

امّی نے کہا "تمہاری شامت آئے تو تم جانا تمہارے بھائی بہن نہیں جائیں گے۔"

چار بجے سحری کے لیے سب اٹھ بیٹھے۔ چچا ابا نے بھی سحری کھائی، پان کھایا اور پھر حقّہ پیتے رہے۔ توپ چل گئی تو جلدی جلدی کلیاں کر کے روزے کی نیت کر لی فجر کی نماز تک وظیفہ پڑھتے رہے اور نماز سے فارغ ہو کر اپنے بستر پر لیٹ گئے۔

ابھی کچھ غنودگی تھی کہ شامت کا مارا ایک فق

دروازے پر آیا اور اپنی بھونڈی آواز میں رٹا ہوا سوال شروع کردیا
"ہزاروں میں کوئی ایک سخی مرد ہے ۔ اسی پر خدا کا
بہت پیار ہے ۔ جدھر جائے گا تو اُدھر ہے فتح ۔" ابھی
وہ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ چچا ابا غصّہ میں منہ پھلائے اٹھ
کھڑے ہوئے ۔ چاروں طرف نظر ڈالی ، کونے میں مگدر کی جوڑی
دھری تھی ۔ ایک مگدر ہاتھ میں اٹھالیا ۔ ننگے پاؤں ، ننگے سر
جلدی جلدی قدم اٹھاتے دروازے پر پہنچ گئے ۔ کنڈی کھلنے
کی آواز پر فقیر نے تو سمجھا کہ نیک شگون ہوا ، مگر دروازہ کھلتے
ہی وہ بے چارہ ہکا بکا رہ گیا ۔ اُسے دیکھتے ہی مگدر اُٹھا کر
چچا ابا نے کہا "نکل یہاں سے فوراً نکل ملعون کے بچے ، تجھے
روزہ داروں کی نیند کا بھی کچھ خیال ہے ؟ اگر ایک لفظ منہ سے
نکالا تو تیرا منہ کچل دوں گا ۔"

● صبح کے سہانے سنّاٹے میں چچا ابا کی گرجدار آواز
نے صورِ اسرافیل کا کام کیا ۔ ہمارے گھر والے تو پہلے ہی ہوشیار
بیٹھے تھے آس پاس کے گھروں والے بھی بیدار ہوگئے ۔ اب چچا ابا
سے یہ کہہ کر کون مفت کی لڑائی مول لیتا کہ حضرت فقیر نے تو
آپ کی نیند خراب کی مگر آپ نے چیخ چیخ کر سارے محلے کو جگا
دیا ۔ بچاروں نے فقیر کو چلتا کیا ۔ چچا ابا کو سمجھا بجھا کر گھر میں
بھیج دیا ۔ غصّہ سے چچا ابا کا چہرہ لال ہوگیا تھا ۔ تھر تھر کانپ
رہے تھے ۔ سمجھاتے سے ، منانے سے چچا ابا مگدر ہاتھ میں لیے
گھر ہی چلے آئے ۔ اندر سب ہوشیار تھے مگر کسی کی مجال نہ تھی
کہ ان سے کچھ بولے ۔ جب وہ لیٹ گئے تو امی نے چچی اماں
سے پوچھا " کیا ہوا ، بھیا آخر کیوں خفا ہوئے ہیں ؟"
چچی نے سوکھے منہ سے جواب دیا "ہوتا کیا ، ابھی تو
روزہ شروع ہوا ہے ۔"

اس ہنگامے کے بعد سب اپنے اپنے بستروں پر لیٹ
گئے ۔ نو بج چکے تھے ، چچا ابا ابھی سو رہے تھے ۔ سوائے ان کے
چھوٹے بڑے سب ہوشیار تھے مگر پورے گھر میں سناٹا تھا ۔
باتیں کیا تھیں گویا کانا پھوسی ہو رہی تھی ۔ جدھر چچا ابا سو رہے
تھے اُدھر سے گزرنا منع تھا ۔ کوئی ضرورتاً اُدھر سے گزرتا بھی
تو بے پاؤں ، چوروں کی طرح تاکہ وہ بیدار نہ ہوجائیں کیونکہ
سب سمجھتے تھے کہ جو وقت سوتے میں کٹ جائے وہی غنیمت ہے ۔
دس بجے کے قریب چچا ابا بیدار ہوئے ۔ منہ ہاتھ دھوکر
اس دالان کی طرف آئے جہاں امی بیٹھی چچی اماں سے باتیں
کر رہی تھیں ۔ چچا ابا کو دیکھتے ہی سلطانہ نے کہا "چچا ابا فونوگراف
نہیں بجاتے ؟" چچا ابا نے کہا " بجائیں گے ، بجائیں گے ۔" امی
اُسے روکتی رہیں مگر سلطانہ نے کہہ دیا " پھر کب بجائیں گے ،
ابھی بجائیے نا !" یہ سن کر چچا ابا کی تیوری میں بل پڑ گئے اور
تیز لہجے میں کہا "تم تو اُلّن[1] ہو ۔ یہ کوئی گراموفون بجانے کا وقت
ہے ؟" یہ کہہ کر چچا ابا کرسی پر دراز ہوگئے ..... اور پھر امی سے
کہا ، "کل تو ایسی گڑبڑ تھی کہ ہم پوچھنا بھول گئے ۔ چھوٹے میاں
آخر کیوں نہیں آئے ؟"
" جی انھیں مستقر[2] چھوڑنے کی اجازت نہیں ملی ۔ انھوں
نے آپ کے نام ایک خط لکھا ہے ۔"
" تو پھر وہ کہاں ہے ۔ میں آج بھی نہ پوچھتا تو شاید
تم نہ دیتیں ۔"
" جی نہیں مجھے یاد تھا اسی مارے اس بکس سے نکال
کر پاندان میں رکھ لیا تھا ۔" یہ کہہ کر امی نے ایک لفافہ چچا ابا کے

---

[1] الو کا مونث یعنی بے وقوف ہو ۔ [2] جگہ

ہاتھ میں دے دیا۔ چچا ابا اُسے پڑھنے لگے اور ہم ان کے چہرے کو تک رہے تھے۔ ابھی پورا مضمون ختم نہیں ہوا تھا کہ غصہ کا پارہ چڑھ گیا اور اپنی بیوی سے کہا:

"سنتی ہو اس نے لکھا ہے کہ اجازت نہ مل سکی، نہیں آسکتا۔ لعنت ہے ایسی نوکری پر اور ایسی نوکری کرنے والے پر۔"

"یہ تو کوئی بگڑنے کی بات نہیں۔ سرکاری معاملہ ہے اجازت نہیں ملی تو کیسے آتے۔" چچی نے جواب دیا۔

"تم خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔ بس ایک لفظ سُن لیا ہے سرکاری معاملہ، سرکاری معاملہ، ہر بات میں سرکاری معاملہ۔ ہم بھی آخر سرکاری ملازم تھے، کسی بنیے کے نوکر نہ تھے۔"

"ان باتوں کا تو جواب نہیں مگر اللہ رکھے بنّن کی شادی میں تم اسی مارے شریک نہیں ہوئے کہ دورہ کرنے کا زمانہ تھا۔"

"خیر بھئی ہوگا، اب خاموش ہو جاؤ۔ مجھے حجّت پسند نہیں۔"

"حجت میں کب کرتی ہوں۔ میں نے تو ایک بات یاد دلائی۔"

"بے شک حجّت کرنے والا تو میں ہوں۔ تمھیں تو میری ہر بات زہر معلوم ہوتی ہے۔"

"اچھا توبہ کی، کان پکڑے۔ آئندہ تمھارے کسی معاملہ میں دخل نہ دوں گی۔۔۔۔ ارے اس گھر میں تو زبان ہلانا مشکل ہے۔"

"جب یہ گھر بُرا ہے تو تم اُسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟"

یہ سُن کر چچی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "اسی مصیبت کے ڈر سے تو میں کہتی تھی کہ روزہ نہ رکھو۔"

"خاموش ہو جاؤ۔ خبردار جو آئندہ تم نے میرے روزے کا نام لیا۔ میں ایسی باتیں سُننے کا روادار نہیں۔ اب اگر میں بھی کچھ کہہ بیٹھوں گا تو ناحق میرے روزے کا نام بدنام ہوگا تم شاید رو کر مجھے ڈرانا چاہتی ہو۔ میں نے تم سے بات ہی کب کی تھی۔ میں تو ان سے پوچھ رہا تھا کہ چھوٹے میاں کیوں نہیں آئے۔ واہ بھئی واہ بھائی ملے تو ایسے کہ جب بلاؤ تو نہیں آسکتے، سرکاری معاملہ ہے اور بیوی ملیں تو ایسی ہر معاملے میں حجّت اور ہر بات پہ رونا۔"

نہ معلوم ان باتوں کا سلسلہ کب تک چلتا، وہ تو امّی نے ہوشیاری کی جو یہ کہہ دیا کہ بھائی صاحب انور کی بسم اللہ میں ضرور شریک ہوں گے۔

چچا ابا نے امّی کو غور سے دیکھا اور کہا: "تم ہی نے تو کہا تھا کہ اجازت نہیں ملی۔ اور یہی اس میں لکھا بھی ہے۔"

امّی نے جواب دیا: "جی ہاں اجازت نہیں ملی اسی لیے ہمارے ساتھ نہیں آسکے۔ مگر ایک دن کے لیے تو وہ کسی نہ کسی طرح ضرور آئیں گے۔"

"لاحول ولا قوۃ" چچا ابا نے کہا۔ "تم نے پہلے ہی یہ کیوں نہ بتایا۔ خواہ مخواہ بے چاری کو روزے میں رونا پڑا۔" اور پھر مُسکراتے ہوئے چچی سے کہا:

"سنتی ہو۔ ہم نے تم سے بے کار حجت کی چھوٹے میاں تو آ رہے ہیں۔۔۔۔"

(آگے کی کہانی اگلے پرچے میں پڑھیے — بہت دل چسپ ہے)

جناب ایم این خاں اردوی

بہت سے پیامیوں کو نظموں اور گانوں وغیرہ سے تو ضرور دلچسپی ہوگی۔ یہ سن کر شاید آپ کو تعجب ہو کہ چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑے بھی گانے میں ماہر ہوتے ہیں اور اپنی زبان میں گا کر خوب خوش ہوتے ہیں۔ لگ بھگ پچاس سال پہلے یہ عام خیال تھا کہ زیادہ تر کیڑے مکوڑے گونگے بہرے ہوتے ہیں۔ لیکن ان پچاس سالوں میں انسان نے سائنس کے میدان میں بہت ترقی کرلی ہے۔ اب ایسے آلے ایجاد ہو گئے ہیں جن کی مدد سے ہلکی سے ہلکی آواز بھی بڑی آسانی سے سن سکتے ہیں۔

ان آلوں کی مدد سے کیڑے مکوڑوں کی عادتوں کا، ان کے کام کرنے کے طریقوں کا حال معلوم ہوا اور پتہ چلا کہ ننھے منّے جاندار اپنے روزانہ کے کاموں کے وقت بڑی سریلی آوازیں پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھیوں اور

مچھروں کو لیجیے۔ یہ جب اڑتے ہیں تو عجیب سا گیت گونج اٹھتا ہے۔ ہم تو اسے بھنبھناہٹ ہی سمجھتے ہیں لیکن ایک شہد کی مکھی سے دوسری شہد کی مکھی اور ایک مچھر سے دوسرے مچھر کے گیت نہیں چھپتے۔ یہ دونوں ان سریلے اشاروں کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔

دیمک کو اور گبریلا کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں

وہی جو لکڑی کی چیزوں کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ دیمک اور گبریلا دونوں جب لکڑی میں گھسنے کے لیے باریک باریک سرنگیں بناتے ہیں تو ان کے سر اور لکڑی کے ٹکرانے سے ایک گونج سی پیدا ہوتی ہے۔

بہت سے کیڑوں کے خاندان میں ہر کام کے لیے کچھ کیڑے مخصوص ہوتے ہیں جیسے کھیتی باڑی کے لیے "کسان کیڑے" اور حفاظت کے لیے "سپاہی کیڑے"۔ خطرے کے وقت سپاہی کیڑے ایک دوسرے کے سر سے سر ٹکرا کر ایک تیز آواز پیدا کرتے ہیں جسے سن کر ان کا گروہ ہوشیار ہو جاتا ہے۔

کچھ کیڑوں میں آواز پیدا کرنے کے لیے خاص اوزار ہوتے ہیں۔ یہ اوزار عام طور پر تین طرح کے ہوتے ہیں۔

۱. ایسے اوزار جن میں جسم کا کوئی حصہ دوسرے حصے
سے رگڑ کر جھنجھناہٹ پیدا کرتا ہے۔ اس طرح کے اوزار
جھینگر اور گبریلے میں پائے جاتے ہیں۔ جسم کا ایک سخت حصہ
باہر نکلا رہتا ہے۔ یہ حصہ ایک دوسری کھردری سطح پر رگڑ
کھاتا ہے۔ یوں سمجھیے جیسے کنگھے کے دانتوں کو کسی کھردری
چیز پر رگڑا جائے۔

ٹڈے اپنے جبڑے اور تتلیاں اپنے پر ایک دوسرے
پر رگڑتے ہیں جس سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہی ان کا گیت
ہے۔

کچھ کیڑوں (جیسے جھینگر) کے پروں پر ایک سخت
ابھار ہوتا ہے اسے 'کھرچنی' بھی کہتے ہیں۔ انھی پروں پر ایک
آری نما نس بھی ہوتی ہے۔ کیڑا ان پروں کو اپنے سر پر اٹھا
کر آگے اور پیچھے گھماتا ہے۔ اس طرح ایک پر کا ابھار دوسرے
پر کی آری نما یا دانتے دار نس سے رگڑ کھاتا ہے۔ اس سے
چوں۔۔۔ چوں۔۔۔ کی آواز پیدا ہوتی ہے

۲. دوسرے طرح کے اوزاروں میں جسم کے پٹھوں میں
کھنچ جانے سے ایک جھلی میں لرزش یا ارتعاش پیدا ہوتا ہے جس
کے نتیجے میں آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس طرح کے اوزاروں سے
بھنبھناہٹ اور چٹ پٹ کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں کچھ کیڑوں
میں جھلی جلدی جلدی اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے اور آواز لگاتار
نکلتی رہتی ہے۔ اس طرح کے اوزار زیادہ تر نر کیڑوں میں
پائے جاتے ہیں۔

۳. کیڑوں میں تیسری طرح کے اوزاروں سے ہوا سے
بجنے والے باجوں کی سی آواز نکلتی ہے۔ اس طرح کے اوزار
کچھ شہد کی مکھیوں اور پتنگوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے
کہ کیڑے اپنے جسم میں بنے کسی سوراخ سے ہوا بڑی تیزی سے
گزارتے ہیں جس سے آواز پیدا ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان آوازوں سے کیڑوں
کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ دراصل کیڑوں میں آوازیں تین کاموں
کے لیے پیدا کی جاتی ہیں۔

۱. دشمن سے حفاظت کے لیے
۲. شکار کے لئے
۳. شادی بیاہ کے لیے۔

کچھ گبریلوں اور تتلیوں میں آپس میں چھو جانے
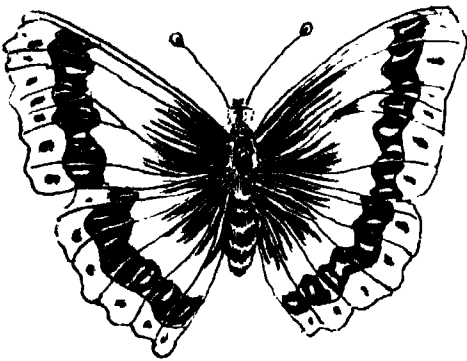
سے ایک خاص طرح کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز
دشمن سے اپنی حفاظت کے لیے پیدا کی جاتی ہے۔ ایک خاص
قسم کی تتلی ہوتی ہے اسے "مورپنکھی تتلی" کہتے ہیں کیوں کہ
اس کے پروں پر بڑے ہی خوبصورت آنکھوں کے نشان ہوتے
ہیں۔ چوہا اس تتلی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس سے حفاظت

۱ غراہٹ

کے لیے یہ بڑا انوکھا اور عجیب وغریب طریقہ اپناتی ہے۔ جیسے

ہی اس کا جسم چوہے کے جسم سے ٹکراتا ہے، یہ اپنے پروں میں تیز سنسناہٹ کی آواز پیدا کرتی ہے اور اپنے پروں پر بنی ہوئی آنکھ کی شکلوں کو فوراً چوہے کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ اس سے چوہا ڈر جاتا ہے اور اس کی جان بچ جاتی ہے۔

بہت سے کیڑے مکوڑے دشمن کی موجودگی سے اپنے گروہ کو خبردار کرنے کے لیے آوازیں پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً دیمک کے سپاہی مصیبت کے وقت ڈھول کی سی آواز پیدا کرتے ہیں۔ اس آواز سے سارا خاندان ہوشیار ہو جاتا ہے اور اس جگہ کو فوراً چھوڑ دیتا ہے۔

کئی پتنگوں اور تتلیوں کے چھوٹے بچے بھی جنھیں پیوپا (PUPA) کہتے ہیں اسی طرح کی آوازیں نکالتے ہیں۔ کسی چیز سے چھو جانے پر ان کے جسم کے پٹھے بڑی تیزی سے سکڑتے ہیں۔ اس طرح سکڑنے سے ایک خاص طرح کی لہریں پیدا ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ان کے اعضا آپس میں رگڑ کھانے لگتے ہیں اور جھن جھن کی آواز پیدا ہوتی ہے جو پیوپا کی حفاظت میں بڑی مدد کرتی ہے۔

آواز پیدا کرنے والے کیڑے مکوڑوں میں، 'تھیڈ ہیڈ ہوکس'، نامی موتھ بڑا بہادر ہوتا ہے۔ یہ سیٹی کی سی آواز نکالتا ہے۔ یہ آواز شہد کی رانی مکھی کی آواز سے ملتی جلتی ہے اس موتھ کی آواز کو سن کر زرد دار پہرے دار مکھیاں رانی کی آواز سمجھ کر دھوکا کھا جاتی ہیں اور یہ آسانی سے چھتے میں گھس کر شہد چرا لاتا ہے۔

کیڑوں کے گیت ان کی شادیوں میں بھی بڑی مدد کرتے ہیں۔ سائنسداں "روتھ" نے "ایڈیز ایجپٹائی" نامی مچھر کا مطالعہ کیا۔ یہ مچھر پیلا بخار پھیلاتا ہے۔ روتھ نے دیکھا کہ نر مچھر کی سونڈ پر بہت باریک گھماؤ دار رواں سا ہوتا ہے جو مادہ کی سونڈ پر نہیں پایا جاتا۔ جب مادہ بھنبھناتی ہوئی نر کے نزدیک آتی ہے تو نر کی سونڈ والا رواں کانپنے لگتا ہے جس سے نر کے جسم میں عجیب سی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ مادہ کے ساتھ ناچنے لگتا ہے۔

سائنسداں رگین کو اپنے تجربوں کے دوران پتہ چلا کہ نر جھینگر اپنی آواز سے تیس میٹر دور تک کی مادائوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ نر کے راگ الاپتے ہی مادہ پاس آ جاتی ہے۔ مادہ کے پاس آتے ہی راگ بدل جاتا ہے جسے سن کر مادہ خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ جاتی ہے اور پھر دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔

کیڑے مکوڑوں کے ماہر جرمن سائنسداں فیور نے خاص طور پر ٹڈوں کی آواز کا مطالعہ کیا۔ انھیں پتہ چلا کہ ٹڈے تقریباً ایک درجن راگ الاپ سکتے ہیں۔ عام الاپ، بہادری کا الاپ، رنج کا الاپ اور شادی بیاہ کا الاپ وغیرہ۔

تو اس طرح یہ کیڑے مکوڑے مختلف موقعوں پہ طرح طرح کے راگ الاپ کر اپنے کاموں کو آسان بنا لیتے ہیں۔ کتنے عقلمند ہیں یہ کیڑے مکوڑے بھی!

تندرستی

جناب اطہر عزیز

تندرستی ہو تو ہر کام میں جی لگتا ہے
کام کے بعد پھر آرام میں جی لگتا ہے
کوئی بھی عضو ہو بیمار تو پھر سب بیمار
ہاتھ بیمار، بدن، آنکھ، زباں، لب بیمار
تندرستی نہ ہو جب لطف ہی کیا کھانے میں
دل ہی روتا ہو تو کیا آئے مزا گانے میں
اس کا احسان ہے جو کھل کے ہم ہنس پاتے ہیں
ورنہ کتنے تو ہنسی کو بھی ترس جاتے ہیں
تندرستی ہی تو لاتی ہے بہاریں دل میں
اور برساتی ہے خوشیوں کی پھواریں دل میں
درد کیا چیز ہے غمخوار کے دل سے پوچھو
کیا ہے صحت کسی بیمار کے دل سے پوچھو
وہی خوش بخت ہے حاصل ہو جسے یہ نعمت
گھر تو گھر اس کے لیے سارا جہاں ہے جنت

جناب اقبال متین

کرن سے اجالے تک

(اقبال متین صاحب نے یہ مضمون سالنامے کے لیے بھیجا تھا۔ دیر میں ملا۔ اب اس پرچے میں شائع ہو رہا ہے)

نوید میاں آج وقت سے پہلے ہی آنکھیں مل کر اُٹھ بیٹھے تھے۔ ابھی سارا گھر سو رہا تھا۔ نوید میاں کی امّی بس اب اٹھنے ہی والی تھیں۔ انھیں اپنی امّی پر پیار آیا۔ "ہمیں آرام پہنچانے کے لیے وہ کتنا سارا کام کرتی ہیں۔"

آج نوید میاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کر رہے تھے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اپنی امّی کے اٹھنے سے پہلے ہی دو ایک ایسے کاموں سے نبٹ لیں کہ ان کا بوجھ ذرا ہلکا ہو۔ پھر ٹھیک آٹھ بجے ان کے دوست آجائیں گے۔

وقت کے خیال کے ساتھ ہی نوید میاں کے ذہن میں ان کی اپنی رسٹ واچ بھی اُبھر آئی جو کچھ ہی دن پہلے اُن کی بڑی مامی نے انھیں تحفے میں دی تھی۔ میز کی دراز کھول کر جھٹ سے انھوں نے گھڑی نکالی، وقت دیکھا اور کلائی پر باندھ لی۔ انھیں اپنے ابا کی کہی ہوئی بات یاد آئی کہ وقت سب سے اچھا دوست بھی ہے اور سب سے بدتر دشمن بھی اگر اس کی قدر نہ کی جائے۔

نوید میاں چونکے۔ انھوں نے گھڑی پھر دیکھی اور کام پر جٹ گئے۔ اپنی کتابیں قرینے سے رکھیں۔ لگے ہاتھوں اپنی ڈیڈی کی میز بھی جھاڑ پونچھ کر صاف کی اور کتابیں جما دیں۔ پھر انھوں نے سوچا چلو گھر بھی صاف کیے دیتے ہیں۔ [illegible]

آج نوید میاں کے ذہن میں ایک صورت بار بار اُبھر رہی تھی۔ ہنستا ہوا چہرہ، کھلے ہوئے گلاب کی طرح — نوید میاں سوچ رہے تھے کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ جب میں اخبار اٹھاؤں گا تو کتنی ہی سرخیاں میری نظر سے گزریں گی ——

پنڈت جی نے رام لیلا میدان میں ننھوں سے باتیں کیں — نہرو چاچا بچوں کے جھرمٹ میں بہت خوش اور صحت مند نظر آرہے تھے — نہرو نے اپنا جنم دن مصروف گزارا۔ پنڈت جی نے آج بھی آرام نہیں کیا۔ کام — کام — کام — لیکن اخباروں میں ایسی کوئی سرخی نہیں ہوگی — انھوں نے بڑھ کر میز پر سے نہرو چاچا کی تصویر اٹھالی جو اسٹیل کے چمکدار فریم میں مسکرا رہی تھی اور سرخ گلاب جس کے سینے پر امن کا نشان بنا جگمگا رہا تھا — انھوں نے تصویر کو صاف کر کے میز پر سجا دیا تو وہ بار بار پلکیں جھپکا رہے تھے جیسے اپنی آنکھوں کی نمی کو اپنے ہی سے چھپا رہے ہوں۔

نہرو چاچا — انھوں نے دل ہی دل میں کہا — میں رو نہیں رہا ہوں۔ بس یوں ہی اُداس ہو گیا تھا۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں بہت محنت کروں گا۔ اچھے اچھے کام کروں گا — آپ بالکل فکر نہ کریں — ہم کتنے ہی بچے آپ کے بتلائے ہوئے راستے پر چلنے کے لیے اسکولوں اور کالجوں میں اپنے ملک کی خدمت کرنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں [illegible]

کمرے کو صاف ستھرا کیا ہی تھا کہ امی اٹھ بیٹھیں اور
پھر دیدی بھی اٹھ گئیں۔

نوید میاں کو اس قدر مصروف دیکھا تو دیدی نے
چھیڑا — "آج سورج شاید مغرب سے نکلے گا۔"

"کیوں بھئی —" نوید میاں نے جب دیکھا کہ دیدی اُن
کی تعریف کرنے کی بجائے طنز کر رہی ہیں تو ذرا سا بُرا مانتے
ہوئے کہا — پھر انھیں خیال آیا کہ آج کے دن دل میں کوئی رنجش
نہیں لانی چاہیے تو انھوں نے کچھ سوچ کر اونچی آواز میں گنگنانا
شروع کیا۔

تیری دھرتی میں لہو اور پسینہ دے کر
اے وطن تیری محبت کا چمن سینچیں گے
ہم جیالے ہیں ترے نام کے متوالے ہیں
تیرے نغموں ہی سے ہم کشتِ سخن سینچیں گے

"بھئی واہ — واقعی کیا پیاری آواز پائی ہے۔"

"آداب عرض ہے۔"

"کیا بات ہے بھئی آج جو اس قدر صبح صبح اپنے اور
دوسروں کے سب ہی کے کام کر رہے ہو؟"

"کمال کر دیا دیدی — آج نہرو چاچا کی سالگرہ ہے
اور دیدی یہ سالگرہ میرے نزدیک ان کی چوہتر سالگرہوں سے
زیادہ اہم ہے۔ اس لیے کہ اب وہ ایک "یاد" بن گئے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ نہرو چاچا تو اب ایک آدرش بن گئے
— ایک اسپرٹ، ایک جذبہ۔"

"اور میں آج کا یہ دن محبت کے اسی جذبے سے
منانا چاہتا ہوں، دیدی۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ ذرا مجھے بھی تو بتاؤ کہ تم کیا
کرنا چاہتے ہو؟"

"بات یہ ہے دیدی کہ ہمارے اسکول کی کرکٹ ٹیم ہے نا
اس کے کپتان سی۔ ڈی۔ کمل سے ہماری ٹیم کی کچھ ان بن ہو گئی ہے۔
دو چار کھلاڑی تو بہت خفا ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ رنجش دور ہو جائے۔"

"ارے کمل — وہی نا جو تمھارے ساتھ کئی بار گھر آ چکا ہے۔"

"ہاں، بالکل وہی۔"

"وہ تو بڑا ملنسار اور پیارا سا لڑکا ہے — اچھا تو پھر
تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں اپنی دیدی سے کہنا چاہتا ہوں کہ انھیں گلے ملانے
کی میں نے جو اسکیم بنائی ہے اس میں میرا ہاتھ بٹائیں۔"

"ضرور بٹاؤں گی — یقیناً تم نے آج کے دن کے لیے
ایک اچھا کام چنا ہے — لیکن مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"وہ تو میں وقت پر آپ کو بتلا دوں گا۔"

"اچھا تو یہ بتلاؤ کہ تمھارے دوست کب آ رہے ہیں —
شام کو بلوا لیا ہوتا۔"

"محبت اور دوستی کا پیام پہنچانے میں صبح اور شام کا
فرق نہیں کرنا چاہیے دیدی۔ آج کا دن میں چاہتا ہوں کہ اسی
جذبے سے شروع ہو — وہ لوگ بس آتے ہی ہوں گے۔"

"کیا بہت سارے بچے ہیں۔ اس کمرے میں ہم سب
اکٹھے ہو سکیں گے؟"

"دیکھیے دیدی — گن لیجیے نا — پونم شاہ، سید عرفان
پردیپ راج، ابرار حسن، سی۔ ڈی۔ کمل، آپ کا نوید اور آپ۔"

کچھ ہی دیر بعد کمرہ مہمانوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔
نوید میاں نے چاروں ساتھیوں سے کہہ رکھا تھا کہ
کمل کے خلاف ضابطے میں رہ کر کیا کیا جا سکتا ہے۔ اسی بات کو

آج کی بیٹھک میں ملنا تھا۔ لیکن سبھوں نے یہاں پہنچ کر جب دیکھا کہ
خود کمل بھی موجود ہے تو انھیں اچنبھا ہوا۔ پھر ان کی نظریں پھول کے
ہار پر پڑیں جو میز پر دھرا تھا ۔۔ وہ اور حیرت زدہ ہوئے ۔۔۔ اتنے
میں نوید میاں نے اٹھ کر دوستوں سے کہا:
"میری دیدی شہناز آپ سے کچھ کہیں گی۔"
سب اپنی جگہ پر خاموش بیٹھ گئے۔
دیدی اٹھیں اور یوں مخاطب ہوئیں۔
"میرے ننھے اور پیارے بھائیو!
مجھے نوید میاں نے بتایا تھا کہ آپ لوگوں میں کچھ ٹھن گئی
ہے لیکن آج کے دن کی اہمیت کو جان کر آپ لوگوں نے پھر ایک
دوسرے سے گلے مل لینے کا جو فیصلہ کیا ہے اس کے لیے میں مبارکباد
پیش کرتی ہوں۔ آپ کو اپنی دوستی کا پیام اپنے اسکول سے دوسرے
اسکول تک، پھر دوسری یونیورسٹی تک، پھر دوسرے شہر تک، پھر
دوسرے ملک تک، پھر دنیا بھر تک پہنچانا ہے اور یہی پیام چاچا نہرو
کا پیام ہے۔ کمل میاں نے اور آپ سبھوں نے دوستی کے لیے آج
کا دن چنا ہے جو ہر طرح قابلِ تعریف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس
دوستی کی بنیادیں آپ کے دلوں میں بہت گہری اور مضبوط ہوں گی۔
آج آپ کے نہرو چاچا کی سالگرہ ہے کیونکہ آج اُن کا
جنم دن ہے۔ آج سے ۸۰ سال پہلے ہمارے ملک میں جو کرن پھوٹی
تھی وہ سارے وطن میں اجالا بن کر پھیل گئی ہے۔ نہرو چاچا آج
ہم میں نہیں ہیں لیکن وہ اجالا ہم میں ضرور ہے جو ہمارے وطن کے
بچے کھچے اندھیروں کو دور کرنے میں مدد دے گا۔
میرے پیارو ۔۔ تمھارے نہرو چاچا نے ملک ملک کو
محبت کا پیام دیا ہے اور آج تم اپنے ہی چھوٹے سے اسکول میں
اپنے ہی ساتھیوں سے الجھ رہے ہو۔ میں نوید میاں کے اس جذبے
کو سراہوں گی کہ وہ تم لوگوں کو ملانے میں بڑے بے کل رہے ہیں۔ اور
آج کا دن انھوں نے اس اچھے کام کے لیے چنا ہے۔"
"اب میں تم لوگوں سے خواہش کروں گی کہ ایک دوسرے
کے لیے محبت کا ہاتھ بڑھاؤ۔"
دیدی اس کے بعد اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔
سب بچوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر وہ اپنی اپنی
جگہ سے اٹھے اور پھر ان میں کوئی دوری نہیں رہی۔ کوئی بھید بھاؤ
نہیں رہا۔
نوید میاں نے تجویز رکھی ۔۔ ہم سب دیدی سے خواہش
کرتے ہیں کہ وہ سرخ گلاب کا یہ چھوٹا سا ہار نہرو چاچا کی
بھینٹ کریں۔
دیدی بڑھیں اور انھوں نے نہرو چاچا کی تصویر کو
گلاب کا ہار عقیدت سے پہنایا جو چوکھٹے میں مسکرا رہی تھی اور جس کے
سینے پر پہلے ہی سے سرخ گلاب جگمگا رہا تھا۔
سارے ماحول پر جو خاموشی پھیل گئی تھی اس کو
توڑتے ہوئے دیدی نے کہا کہ آؤ محفل برخاست ہونے سے پہلے
ہم سب نہرو چاچا کے سامنے عہد کریں ۔۔
انھوں نے پیار بھری نگاہوں سے نوید میاں کو دیکھا
۔ ذرا وہ گیت گانا تو جو تم صبح کو گنگنا رہے تھے۔ ہم سب تمھاری
آواز میں آواز ملاتے ہیں۔

تیری دھرتی میں لہو اور پسینہ دے کر
اے وطن تیری محبت کا چمن سینچیں گے
ہم چیالے ہیں ترے نام کے متوالے ہیں
تیرے نغموں ہی سے ہم کشتِ سخن سینچیں گے

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد)

جناب بدر الدین استاذ مدرسہ ابتدائی۔

نئے سال کی نئی کہانی

نئے سال کی نئی کہانی تم کو آج سنانی ہے
پیارے بچو پڑھ لکھ کر اک دنیا نئی بسانی ہے
دنیا نئی بسانی ہے۔

نئے سال کی نئی امنگیں نئے ترانے گائیں گی
اے جگ کے اجیارے بچو تم کو گیت سنائیں گی
کام کرو اور بڑھتے جاؤ ریت یہی انسانی ہے
دنیا نئی بسانی ہے

سپھل ہوئے ہیں جو بالک[1] وہ میری آنکھ کے تارے ہیں
محنت کرنے والے بچے سب کے راج دلارے ہیں
شوق سے پڑھنے والوں کی بھی ہمت آج بڑھانی ہے
دنیا نئی بسانی ہے

جو بچے ناکام ہوئے ہیں، رونا دھونا چھوڑیں
محنت، ہمت کو اپنا کر کام سے رشتہ جوڑیں
اُٹھ جاؤ اور کمر کسو اب بگڑی بات بنانی ہے
دنیا نئی بسانی ہے

پڑھ لکھ کر گیانک[2] بن کر تم کو چاند میں جانا ہے
نئی نرالی راہ پہ چل کر سب کو مارگ[3] دکھانا ہے
کہہ دو اب تو چاند کی دنیا میں جانے کی ٹھانی ہے
دنیا نئی بسانی ہے

سچائی کی راہ پہ چلنا سب کی سیوا کرنا ہے
دین و وطن کا خادم بن کر فرض یہ پورا کرنا ہے
جگ میں کچھ کرکے دکھلا دو جان تو آخر جانی ہے
دنیا نئی بسانی ہے

[1] کامیاب بچے ۔ [2] سائنسداں ۔ [3] راستہ ۔ [4] خدمت

جناب محمد [illegible]

"ایتھوپیا کی سرزمین سے"

ہندوستانی سفیر میکلے میں

بچوں سے دوستی:- چھ دن ہوٹل میں ٹھہرنے کے بعد میں نے ایک مکان کرایے پر لے لیا۔ اس کا احاطہ بڑا تھا اور اس احاطے کے اندر الگ الگ تین مکان تھے۔ ایک میں ڈاکٹر احسان ٹوڈروف رہتے تھے بیوی بچے رہتے تھے دوسرا میں نے لیا تھا اور تیسرا جان چند داس کے پاس تھا۔ جلد ہی ہم تینوں ایک دوسرے سے گھل مل گئے اور ایک دوسرے کے گھر آنے جانے لگے۔

بچوں سے مجھے انس اور پیار ہمیشہ سے ہے اس لیے ڈاکٹر ٹوڈروف کی بچی کرسٹی اور جان سی۔ داس کے بچے روہت سے میری دوستی ہوگئی۔ یہ دونوں اکثر میرے گھر آتے۔ میں ان کو حلوہ، پنیر، کھجور، ٹافی اور انڈے وغیرہ کھلاتا، ان سے باتیں کرتا ان کو کہانیاں سناتا، جانوروں کی بولیاں سکھاتا اور کسرت کرنے کے طریقے بتاتا۔

ایک طرف احاطے میں انگور کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں، دوسری طرف بگن ویلیا کے پھول کھلے تھے اور تیسری طرف گلاب کے پھولوں کی دو قطاریں تھیں۔ فرش پر گھاس کا بالکل جیسے زمرد کا فرش بچھا ہوا تھا۔ ایسے ماحول میں میں چھٹیوں کے دن کرسٹی اور روہت سے خوب کھیلتا۔ ان کے ساتھ جھولا جھولتا اور ان کو اپنے بچوں افسر، رعنا اور پرویز کے بارے میں اور جامعہ کے بچوں کے بارے میں قصے سناتا۔

ڈاکٹر ٹوڈروف اور ان کی بیگم برج کھیلنا خوب جانتے تھے۔ ان کے ساتھ سنیچر اور اتوار کی شام کو میں کبھی کبھی برج کھیلتا۔ ہماری پارٹی میں موسیو جارج (فرانسیسی استاد) ڈاکٹر ون (چینی ڈاکٹر) بھی شریک رہتے۔

ایک دن کرسمس اور نئے سال کی دعوت ہوئی۔ اس دن میں نے دیکھا کہ مسز ٹوڈروف کو یورپ کے کیسے کیسے عمدہ کھانے پکانے آتے ہیں۔ کیک اور پیسٹری بنانے میں تو ان کا جواب نہیں۔ اس دن ان کے یہاں اور بھی کئی مہمان تھے۔ ان میں ایک مسٹر اور مسز کرومی تھیں۔ مسٹر کرومی آئرش اور مسز کرومی آسٹریلین تھیں۔ یہ لوگ مشنری تھے اور دعوت کے دوران میں ان لوگوں سے آئرلینڈ اور آسٹریلیا کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ ان کے تین بچے تھے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی ان سے بھی میری جان پہچان اور ملاقات رہی۔

بعد میں پھر ایک دن مسز کرومی کے گھر دعوت ہوئی اور اس دن ان کے بچوں سے میری دوستی ہوگئی۔ انھوں نے درجنوں کھلونے لاکر مجھے دکھائے اور میں نے ان سے شنکرس ویکلی کی پینٹنگ، ڈرائنگ اور کہانیاں لکھنے کے مقابلوں کا ذکر کیا۔ پیام تعلیم میں بچے جو کہانیاں لکھتے ہیں ان کا ذکر کیا۔ انھوں نے مجھے کیرال اور ہم (CAROL and HYMN) یعنی انجیل سے گانے گانے کے طریقے بتائے۔

چھٹیوں کے دن بلا کسی امتیاز کے باری باری میں
ہندوستانی احباب کے گھر بھی جاتا۔ ہر ایک سے ملتا، بچوں
سے دوستی کرتا اور گھل مل کے ان کے ساتھ ایک ہو جاتا۔
رفتہ رفتہ میری ملاقات اور تعلقات سب سے ہو گئے اور
میں جہاں بھی جاتا کیا مرد، کیا عورتیں، میری خاطر مدارات
کرتے۔ شروع میں جی کچھ گھبراتا تھا۔ جامعہ کا ماحول، دوستوں
کی محفلیں، بیوی اور بچے بہت یاد آتے تھے۔ لیکن ایک لمحہ میں
بے کار نہ بیٹھتا کسی نہ کسی مشغلے میں حصہ لیتا، بچوں سے کھیلتا
اور کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا اور یوں دھیرے دھیرے یہاں کے
ماحول سے مانوس ہو گیا۔

اپنے اسکول میں

اسکول میں ڈسپلن اور ماحول اچھا تھا۔ لب ولہجہ
خوش گوار، فضا پڑھنے پڑھانے کی۔ ہمارے جامعہ کے اسکول
کی طرح یہاں بھی تعلیم مخلوط تھی یعنی لڑکے لڑکیاں دونوں
اکٹھے پڑھتے تھے۔ ان کی کل تعداد بارہ سو سے زیادہ تھی اور
ہر کلاس میں پانچ پانچ، چھ چھ سکشن تھے۔ صبح کو اسکول
پونے نو سے شروع ہوتا، گیارہ بجے چائے پینے کے لیے
بیس منٹ کا وقفہ ہوتا۔ اس کے بعد ایک بجے سے پونے تین
بجے تک لنچ کا وقفہ ہوتا، پھر پانچ بجے شام کو چھٹی ہوتی۔
ساڑھے آٹھ بجے صبح روزانہ مارننگ اسمبلی ہوتی۔ اسکول کے
احاطے میں ایک مخصوص جگہ سارے طالب علم جمع ہوتے۔ دو
تین منٹ عبادت ہوتی اس کے بعد اعلانات یا ڈائرکٹر کو
کوئی بات کہنی ہوتی تو وہ سب سے مخاطب ہو کر یہیں کہہ دیتا۔
مارننگ اسمبلی میں سب استادوں کا آنا ضروری تھا۔

ہر کلاس اور سکشن کے لڑکے لڑکیاں اپنی اپنی لائن میں کھڑے
رہتے اور ان کے مانیٹر آگے آگے ہوتے۔ مارننگ اسمبلی ختم ہونے
کے بعد قطاروں میں طلبا اپنی اپنی کلاسوں میں جاتے اور
کلاس کے سامنے لائن بنا کر کھڑے ہو جاتے۔ مانیٹر کلاس روم
کو دیکھتا کہ میز اور کرسیاں ترتیب سے رکھی ہیں یا نہیں؟
صفائی ٹھیک سے ہوئی ہے یا نہیں؟ ہر روز تین یا چار لڑکے
اور لڑکیاں کلاس روم کو صاف کرتے۔ کھڑکیوں کے شیشوں
اور دروازوں کو چمکائے رکھتے۔ کوئی تساہل کرتا یا اپنی ڈیوٹی
ٹھیک سے انجام نہ دیتا تو اس لڑکے یا لڑکی کو ایک دن کے لیے
اسکول سے نکال دیا جاتا یا کوئی اور سزا دی جاتی۔

غرض جب مانیٹر اشارہ کرتا تو لڑکیاں اور لڑکے
اندر داخل ہوتے۔ سیٹیں رول نمبر کے حساب سے پہلے ہی
مقرر رہتیں چنانچہ ہر ایک اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ جاتا۔ اسکول
میں ہوم روم اور یونٹ کا دستور ہے اور جیسے ہی کلاسوں میں
لڑکے بیٹھ جاتے ہوم روم ماسٹر آکے حاضری لیتا۔ اس کے بعد
پڑھائی شروع ہو جاتی

کوئی لڑکی یا لڑکا بغیر اجازت کے اسکول سے
غیر حاضر نہیں رہ سکتا۔ وقت سے آنا بھی ضروری تھا ورنہ
مختلف مدارج کی سزائیں تھیں۔ ہوم روم ماسٹر کے حاضری
لیتے وقت یونٹ لیڈر آکر جائزہ لیتا کہ کل کوئی کسی گھنٹے
سے بھاگ تو نہیں گیا تھا یا بغیر اجازت کوئی غیر حاضر تو نہیں
تھا۔ اگر کوئی ایسی واردات ہوتی تو یونٹ لیڈر اُسے سزا دیتا
یا دن بھر کے لیے اسکول سے نکال دیتا۔ اگر کوئی جرم سنگین
ہوتا تو ڈائرکٹر باز پرس کرتا اور بعض حالات میں بیت بھی
لگاتا۔ اسکول میں طلباء کی کونسل بھی ہے جو طلباء کے لیے

مختلف مشغلے اور پروگرام پیش کرتی ہے اور ڈائرکٹر کا بانٹتا ہے۔

دوسرے مشغلے

اسکول میں میرے گھنٹے نسبتاً کم تھے۔ یعنی ہفتے میں محض اکیس۔ وہ بھی ملکی جغرافیہ پڑھانے کی بات تھی اس لیے اخبار، رسالے اور کتابیں پڑھنے کا موقع خوب تھا۔ میں نے اپنی معلومات بڑھانے کے لیے اسکول کے کتب خانے کو کھنگالنا شروع کیا۔ اول اول میں نے جغرافیہ کی کتابوں پر توجہ کی جو زیادہ تر انگریز مصنفین کی لکھی ہوئی تھیں اور اسکول کے معیار کی تھیں۔ انھیں میں نے جلد ہی پڑھ ڈالا۔

کالج اور یونیورسٹی کے معیار کی کوئی کتاب نہیں تھی اور میری نظروں میں چوں کہ علی گڑھ، جامعہ اور دہلی کی ایک سے ایک عمدہ اور بلند معیار کی کتابیں تھیں اس لیے جغرافیہ کی کتابیں مجھ کو پرانی اور گھسی پٹی لگیں۔ رفتہ رفتہ میرا میلان تاریخ کی کتابوں کی طرف ہونے لگا۔

اسی دوران میرے شاگرد ڈاکٹر شیام سندر بھاٹیہ نے مجھ کو امریکہ سے لکھا کہ اِدھر اُدھر کی کتابیں پڑھ کر وقت ضائع نہ کرو۔ ایک خاص ترتیب اور سلیقے سے پڑھو اور بہتر یہ ہے کہ تم ایتھوپیا اور افریقہ کے بارے میں ان کے مختلف پہلوؤں پر پڑھ کر مواد جمع کرو۔

چنانچہ میری دلچسپی تہذیب و تمدن، تاریخ اور سماجی حالات سے ہوگئی۔ میں نے ایتھوپیا کے متعلق ڈھونڈ ڈھونڈ کر کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ جغرافیہ کے مقابلے میں تاریخ، تہذیب و تمدن اور سماجی حالات کے متعلق کتابیں کافی ہیں لیکن ... ایک مشکل ... کتابیں فرانسیسی، انگریزی لیکن

مختلف غیر ملکی ماہرین نے بیسیوں پہلوؤں پر تفصیل سے لکھا ہے۔

ایتھوپیا اور افریقہ میں بہت سے سیاح اور سفارتی آتے رہتے ہیں۔ ان کے تاثرات قابلِ ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں جیمس بروس کی کتاب "نیلے نیل کا منبع معلوم کرنے کے سلسلے میں سفر کے حالات" بہت مشہور ہے۔ (ان کتابوں کا ذکر اور ان کے بعض کے مختصر اقتباس آگے کی قسطوں میں آئیں گے)

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ میکلے کی بلندی ساڑھے چھ ہزار فٹ سے زیادہ ہے اس لیے یہاں راتیں سرد ہوتی ہیں۔ شروع میں یہاں آتے ہی میرا گلا خراب ہو گیا تھا اپنے پڑوسی ڈاکٹر ٹوڈروف سے احتیاطاً میں نے اپنا گلا خراب ہونے کا ذکر کر دیا۔ انھوں نے تجویز کی کہ میڈیسنل برانڈی رات میں تھوڑی سی پابندی کے ساتھ ایک مہینے تک استعمال کر لو تو تمھارے جسم میں کافی طاقت آجائے گی، ماحول کے بھی عادی ہو جاؤ گے اور آئے دن کی چھوٹی موٹی شکایتوں سے بچے رہو گے۔

چنانچہ میں نے "دوا والی برانڈی" ایک چمچہ رات میں استعمال کرنی شروع کر دی۔ فائدہ بہت ہوا اور چند ہی دنوں میں سُرخ و سفید ہو گیا۔ مگر خارش ہو گئی۔ ایک دن صبح جو سو کر اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بانہوں میں اور ٹانگوں میں کچھ کچھ دانے سے ہیں۔ گرم پانی سے نہایا اور ڈیٹال ڈال کر پانی کو جراثیم سے پاک کر لیا۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود رات کو جسم میں کھجلی سی محسوس ہوئی۔ بات ضبط سے باہر تھی میں نے فوراً ڈاکٹر ٹوڈروف سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ تمھارے جسم میں وٹامن کی کمی ہے اور کل شام کو تم ...

تمھیں انجکشن لگاکر ٹھیک کردوں گا۔ یوں تو میں معمولی قسم کی
شکایتوں سے ڈرتا نہیں لیکن سطح سمندر سے بلندی، آکسیجن کی
کمی نئے ماحول کے نشیب و فراز سے ناواقفیت۔ غرض میں ذرا
ڈرا ہوا تھا۔

ڈاکٹر چونکہ پڑوسی تھا وہ بھی صوفیہ کا بلغارین لائق
اور مخلص اس لیے اس کی بات ٹال بھی نہیں سکتا تھا۔ ہر روز
شام کو میں اسپتال جانے لگا اور اس طرح میں نے آٹھ انجکشن
لیے۔ خارش میں کمی ہوئی لیکن مکمل افاقہ نہیں ہوا انجکشن دینے
کے بجائے اب ڈاکٹر نے کہا کہ تم پرہیز کرو یعنی اپنی غذا پر کنٹرول
رکھو۔ اور پھر ان کے بتائے ہوئے نسخے کے مطابق میں نے اپنی
خوراک اور غذا بدل دی دو ہفتے تک کنٹرول رکھا۔

اسی زمانے میں سلویا پنک ہرسٹ کی لکھی ہوئی ایتھوپیا
کی تہذیب و تمدن کی تاریخ پر میں نے ایک کتاب پڑھی تو اس
میں ایک جگہ ذکر تھا کہ عہدِ وسطیٰ میں ایک بادشاہ کو خارش کی
شکایت ہوگئی تھی اور ایک فرانسیسی ڈاکٹر نے ان کا علاج
خوراک کو کنٹرول کرکے کیا تھا۔ اس سے مجھے تقویت ہوئی اور
باوجود تھوڑی سی تکلیف کے پرہیز والے تجربے کو میں جھیلتا رہا۔
لیکن خارش نے پیچھا نہیں چھوڑا۔

اب میں نے ڈاکٹر لال کو پکڑا۔ انھوں نے کہا کہ کوئی چیز
تمھارے لیے مضر ثابت ہو رہی ہے اس کا پتہ لگاؤ اور اس سے
بچو۔ میں نے ان کو ڈاکٹر لوڈروف کے علاج اور پرہیز وغیرہ
کے قصے بتائے۔ پھر انھوں نے میرا معائنہ کیا، خون، پیشاب،
پاخانہ سب کی مکمل جانچ کی۔ ہر چیز نارمل تھی۔ وہ بھی حیران
کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ انھوں نے پھر گولیاں دیں اور انھیں مسلسل
[illegible] ان کا استعمال جاری رہا خارش
کم رہی اس کے بعد پھر وہی شکایت۔

مسز لال نے کہا تمھارے گھر کے اندر کوئی چیز ہے وہ
مضر ثابت ہو رہی ہے۔ اپنی نوکرانی پر نظر رکھو وہ گندگی سے
تو کام نہیں کرتی یا پھول پیڑ پودوں کو بھی پرکھو۔ کمروں میں
دھوپ آنے دو۔

غرض ہزار جتن کیے لیکن خارش نے چین نہ لینے دیا۔
ڈاکٹر لوڈروف نے پھر نئی دوائیں دیں اور ان کے استعمال سے
افاقہ ہوا۔ بعد میں مَیں نے گھر بدل دیا۔ اس کے بعد خارش
بالکل ختم ہوگئی۔

میکلے میں ہندوستانی سفیر

ایک دن صبح ہی صبح محل سے خبر آئی کہ آج شام کو
ہندوستانی سفیر ہز اکسیلنسی کنہیالال تھا آ رہے ہیں ان کا استقبال
ہے اور اس موقع پر سارے ہندوستانی استاد ڈنر پر مدعو بلائے
گئے ہیں۔ مہمانوں کی فہرست میں استادوں کے علاوہ مائیڈل
کے شاہ عبدالکریم، مسٹر داس اور پربھو داس جی کے نام بھی تھے
کچھ احباب نے کہا کہ موقع اچھا ہے۔ ہم لوگوں میں سے کسی کو
چاہیے کہ سفیر کی توجہ اس بات کی طرف دلائیں کہ ایتھوپیا میں
ہمارے ملک کے متعلق جان کاری بہت کم ہے اور پراپگنڈے
کے لیے یہاں لٹریچر اور تعلیمی فلمیں آنی چاہئیں۔ ایک دوست
نے کہا کہ ایسی محفل میں اس قسم کی بات نہیں کہی جاتی۔ کھانے کا
مزا کرکرا نہیں کرنا چاہیے۔ پھر یہ کہ سفیر گورنر جنرل کے مہمان ہیں
ہوسکتا ہے کہ سرکاری پیمانے پر ان کو کچھ ضروری باتیں کہنی ہو
غرض ٹھیک ۷ بجے ہم لوگ گورنر جنرل کے محل پر
پہنچ گئے۔ میں مسٹر اور مسز گن متھو کی گاڑی میں

پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ ہز ہائی نس خود بنفس نفیس موجود ہیں اور ہر
ایک کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ ہم میں سے بعض احباب مغربی
تہذیب اور طور طریقے سے پوری طرح واقف نہیں تھے چنانچہ
کچھ بھدے اور بھونڈے انداز میں بچوں کو لے کر داخل ہوئے
میں نے، مسٹر اور مسز گن متولے، ہز ہائی نس رااس منگے شا، کی
توجہ ان کے پاکٹ ڈاگ (چھوٹے کتے) کی طرف کر دی جو مس
مسز گن متو کی بچی کی گود میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ اس سے کھیل
رہی تھی۔

چند منٹ کے بعد مسٹر مہتا مع اپنی پارٹی کے آ گئے
ہز ہائی نس نے ہز ایکسیلنسی کہہ کر نہایت شرافت سے ان کا خیر مقدم
کیا۔ ایک دوسرے سے تعارف ہوا اور اسی لمحے ڈائننگ روم میں
اپنی اپنی پلیٹیں لے کر یکے بعد دیگرے ہم لوگ جانے لگے۔ میں
اپنی پسند کے مطابق چنندہ کھانے لے کر بیچ کی میز کے پاس
بیٹھ گیا۔ بعد میں مہتا صاحب اور ہز ہائی نس بھی وہیں آ گئے۔
اب ہمیں اٹھنے اور کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر ڈش (کھانا)
فرمائش کے مطابق آ جاتی تھی۔ انواع و اقسام کے کھانے تھے
اور کمال تو یہ کہ سردی کے زمانے میں برف کے کیوبس (ڈلے) بھی تھے۔

جامعہ ملیہ اور ذاکر صاحب

مہتا صاحب میری طرف مخاطب ہوئے۔ نام پوچھا اور
یہ کہ ہندوستان کے کس حصے سے آیا ہوں۔ میں نے اپنا تعارف
کراتے ہوئے ان سے عرض کیا کہ میں جامعہ ملیہ سے آیا ہوں اور
یہ کہا کہ غالباً آپ اس ادارے کو جانتے ہوں گے۔ موصوف
نے کہا کہ بھلا کون پڑھا لکھا آدمی ہے جو جامعہ کو نہیں جانتا
اور ... ذاکر حسین صاحب سابق صدر جمہوریہ
اور جامعہ لازم و ملزوم ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا ان کی زبان سے جب میں نے ذکر سنا
تو میں نے انہیں بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کی مجھ سے خط و کتابت بھی ہے
انہیں فاسل، چٹانوں اور معدنیات کے نمونے جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔
پھر مہتا صاحب نے بتایا کہ ذاکر صاحب سے نیاز مجھے اس وقت
حاصل ہوا جب وہ نائب صدر تھے اور لندن سے لوٹتے وقت انقرا
کے ہوائی اڈے سے گزرے تھے۔ اس موقع پر میں ترکی میں سفیر تھا
اور ان کا استقبال کرنے کا مجھ کو فخر حاصل ہوا تھا۔

مہتا صاحب نے برجستہ پوچھا کہ تمہارا کیا مشغلہ ہے ایتھوپیا
میں؟ میں نے کہا یوں تو میرا مضمون جغرافیہ ہے لیکن اقتصادی،
سماجی، تاریخی اور سیاسی مسائل سے بھی دلچسپی ہے۔ ایتھوپیا
اور افریقہ کے متعلق میں نے بہت ساری کتابیں پڑھ ڈالی ہیں اور
ابھی مزید پڑھنے کا ارادہ ہے۔ مہتا صاحب نے جواب میں
فرمایا کہ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تمہارا پیشہ پڑھنا اور پڑھانا ہے
میرا مطلب ہے کہ اس سے ہٹ کر بھی تمہارا کوئی خاص مشغلہ
ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ میں نقطے پر نہیں آ رہا ہوں تو انہوں
نے خود یہ شعر پڑھ دیا ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بیچ بیچ میں وہ ہز ہائی نس سے اور پربھو داس جی
سے بھی باتیں کرتے جا رہے تھے۔ ڈنر ختم ہونے کے بعد گیارہ
بجے مہتا صاحب نے ہز ہائی نس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا
کہ مجھے اور حکومت ہند کو اس بات سے بڑی خوشی ہے کہ
ہمارے استاد ایتھوپیا میں محنت اور شوق سے کام کر رہے ہیں
اور ہز ہائی نس بھی ان کے کام سے بے حد خوش ہیں۔ مجھے

اپنے سپے کہ آئندہ اور بہت کام کرکے ایسے نمونے کی چھاپ چھوڑ جائیں گے کہ آنے والی نسلیں ہماری کوششوں کو سراہیں گی اور ایتھوپیا اور ہندوستان کے تعلقات مزید خوشگوار اور پائیدار ہوتے چلے جائیں گے۔

ان کی تقریر کا لب ولہجہ باوقار اور معیاری تھا۔ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ ہمارے سفیر کا حسن بیان الندز گفتگو طور طریقہ نمونے کا تھا سب نے تالیاں بجائیں اور ایتھوپیا اور ہندوستان کی دوستی اور تعلقات کو مضبوط کرنے کے لیے جام پیا رخصت ہوتے وقت ہتا صاحب نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کو خط لکھنا تو اس بات کا ذکر کر دینا کہ میں میکلے آیا تھا اور میری طرف سے ان کو بہت بہت احترام وآداب۔ بعد میں میں نے ڈاکٹر صاحب کو ہندوستانی سفیر مسٹر ہتا کی میکلے میں آمد کے متعلق اپنے تاثرات لکھ کر بھیجے۔

(باقی آئندہ)

جناب شمس الدین استاد اسلامیہ اسکول جبل پور

بھارت دیش ہمارا

بھارت دیش ہمارا
سب دیشوں سے نیارا
ہم ہیں اس کے غنچے! یہ ہے باغ ہمارا
ہم ہیں اس کے موتی یہ ہے سیپ ہمارا
ہم ہیں اس کی جیوتی یہ ہے دیپ ہمارا
بھارت دیش ہمارا
سب دیشوں سے نیارا
امن واماں کے نغمے گلی گلی میں گاؤ
ہندو، سکھ، مسلماں سب کو گلے لگاؤ
روشن ہوگا اک دن جگ میں نام ہمارا
بھارت دیش ہمارا
سب دیشوں سے نیارا

دیپ جلاؤ گھر گھر خوشیوں کے آشا کے
ختم کرو سب جھگڑے صوبے کے بھاشا کے
بٹ جائے گا ورنہ سارا دیش ہمارا
بھارت دیش ہمارا
سب دیشوں سے نیارا
قرض ہو یا مہنگائی بھوک ہو یا بیکاری
دور کرو ان سب کو لاؤ اب خوش حالی
آج کے دن تو سوچو کیا ہے فرض ہمارا
بھارت دیش ہمارا
سب دیشوں سے نیارا

جناب کنیز عفت

دادی اماں کی رزائی

کردار

۱۔ دادی اماں :۔ ایک بوڑھی خاتون۔ بال برف کی طرح سفید۔ چہرے پر جھریاں۔ دانت ایک بھی نہیں۔ رخسار پچکے ہوئے۔ عمر ساٹھ، ستر کے درمیان۔

۲۔ رشیدہ :۔ دادی اماں کی بہو۔ عمر بیس پچیس کے درمیان۔

۳۔ اشفاق صاحب :۔ رشیدہ کے شوہر۔ عمر تیس سال کے قریب۔

۴۔ راشد۔ رشیدہ کا بیٹا۔ عمر ۴ سال کے قریب۔

سین

(اتوار کا دن دوپہر کا وقت۔ دادی اماں دوپہر کے کھانے کے بعد اپنا پاندان لیے قالین پر براجمان ہیں اور ہاون کُنی میں پان کوٹ رہی ہیں۔ راشد داخل ہوتا ہے اُس کے ہاتھ میں ایک میلی کچیلی رزائی ہے جس کا استر رنگ برنگے کپڑوں کو سی کر بنایا گیا ہے۔ رزائی میں بے شمار چھید ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں لاپروائی سے ڈال دی گئی تھی)

راشد :۔ "دادی ماں! دادی ماں!! دیکھیے میں آپ کے لیے کیا لایا ہوں۔"

دادی ماں :۔ (راشد کی طرف کوئی توجہ دیے بغیر پان کوٹتے ہوئے) "کیا لائے ہو بیٹا؟"

راشد :۔ "دادی اماں آپ دیکھیے تو سہی!" (دادی اماں کے قریب آ کر رزائی دکھاتا ہے۔ دادی اماں رزائی دیکھ کر چونک پڑتی ہیں۔)

دادی ماں :۔ (جھٹ راشد سے رزائی چھین لیتی ہیں) "میری رزائی ہائے میری پیاری رزائی۔ یہ تجھے کہاں ملی بیٹا؟"

راشد :۔ "سامان کے کمرے میں کسی نے پھینک دی تھی۔ وہیں سے اُٹھا لایا ہوں۔"

(دادی ماں رزائی کو سینے سے لگا لیتی ہیں اور اس پر اس طرح ہاتھ پھیرنے لگتی ہیں جیسے کوئی اپنے پالتو جانور کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ ان کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے آنسو نکل کر رزائی پر گرنے لگتے ہیں۔)

راشد :۔ "ارے! دادی اماں آپ رو رہی ہیں۔ کیا آپ کو یہ رزائی بہت پیاری ہے؟"

دادی ماں :۔ "ہاں بیٹا" (ہچکیاں لیتے ہوئے) "اس رزائی پر تو میری زندگی کی کہانی لکھی ہوئی ہے بیٹا۔ یہ دیکھو یہ سرخ کپڑا دیکھ رہے ہو نا (ایک سرخ کپڑے پر ہاتھ رکھ کر) یہ میرے شادی کے جوڑے میں سے بچا تھا۔ یہ نیلا کپڑا تمھارے دادا کشمیر سے لائے تھے۔ یہ دھاریوں والا کپڑا اُن کی قمیص سے بچا تھا۔ اور یہ ... یہ ..." (وہ ایک خوبصورت سے نارنجی کپڑے پر انگلی رکھ کر یک زار و قطار رونے لگتی ہیں) "یہ

بچی کے فراک سے بچا تھا۔ پر ہائے وہ اس منحوس فراک کو پہن بھی نہ سکی کہ موت نے اُسے آدبوچا۔۔۔۔
تمھیں کیا کیا بتاؤں بیٹا۔ بس یہ سمجھ لو کہ اس رزائی کے ہر کپڑے پر میری زندگی کی کہانی لکھی ہے۔" (وہ خاموش ہو کر سسکیاں لینے لگتی ہیں اور راشد سہما ہوا ان کو گھورنے لگتا ہے۔)

رشیدہ داخل ہوتی ہے۔ دادی ماں کے ہاتھ میں رزائی کو دیکھتی ہے اور پھر ان کے سُتے ہوئے چہرے کو دیکھتی ہے۔)

رشیدہ :۔ "پھر وہی موئی رزائی۔۔۔ امی آپ سے کتنی بار کہا کہ اس منحوس رزائی کو کہیں پھینک دیں۔" (دادی اماں کے ہاتھ سے جھٹ کر رزائی چھین لیتی ہے اور بڑبڑاتی ہے۔)
"خواہ مخواہ آپ پچھلی باتیں سوچتی رہتی ہیں اور اپنی صحت برباد کرتی ہیں۔ اب اس موئی رزائی کو ایسی جگہ پھینکوں گی کہ کبھی آپ کے ہاتھ نہ لگے۔"

دادی ماں :۔ (چیخ کر) "نہیں، نہیں، دلہن خدا کے لیے ایسا غضب نہ کرو۔ یہی تو ایک نشانی بچی ہے اور اسی کے سہارے تو جی رہی ہوں میں۔"
(رشیدہ ایک نہیں سنتی اور پیر پٹکتے ہوئے نکل جاتی ہے۔)

دادی ماں :۔ "ہائے ہائے میری رزائی میری رزائی۔۔۔!"
(رونے لگتی ہیں۔)

(اشفاق داخل ہوتے ہیں۔)

اشفاق :۔ "ارے امی آپ رو رہی ہیں؟"
(رشیدہ داخل ہوتے ہوئے۔)

رشیدہ :۔ "پھر وہی موئی رزائی۔۔۔۔"

اشفاق :۔ "اوہ۔ اچھا۔۔۔۔" (تھوڑی دیر بعد) "امی میں تمھیں ایک خوش خبری سنانے والا تھا لیکن بھول گیا۔"
(دادی اماں اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی ہیں۔ لیکن اب ان کی سسکیاں دھیمی ہوتی جاتی ہیں۔)

اشفاق :۔ (سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) "ہم مقدمہ جیت گئے ہیں۔ ہمیں مرحوم ابا جان کی جائداد مل جائے گی۔"

دادی ماں :۔ (رونا ختم کر کے ایک دم خوشی سے اچھل پڑتی ہیں۔)
"جائداد مل جائے گی! کب ملے گی بیٹا!" (آسمان کی طرف دیکھ کر ہاتھ پھیلاتی ہیں) "خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

اشفاق :۔ "جائداد تو مل جائے گی امی لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ وہ کاغذات مجھے دے دیں جو ابا جان مرحوم نے آپ کو دیے تھے۔"

دادی ماں :۔ (ذہن پر زور دیتے ہوئے) "وہ موئے کاغذات نہ جانے میں نے کہاں رکھ دیے تھے۔"

اشفاق :۔ "سوچ کر بتایئے امی کہ آپ نے وہ کاغذات کہاں رکھے تھے ورنہ جائداد کا ایک حبّہ بھی نہ ملے گا۔"

دادی ماں :۔ (خیالات میں غرق ہو کر بڑبڑاتی ہیں) "وہ کاغذات۔۔۔۔ وہ کاغذات۔۔۔"

اشفاق :۔ "ہاں ہاں امی یاد کیجیے کہ آپ نے وہ کاغذات کہاں رکھے تھے؟
"یوں نہیں، ٹھہریے پہلے یہ یاد کیجیے کہ انھوں نے جس وقت آپ کو کاغذات دیئے تھے آپ کیا کر رہی تھیں؟"

دادی اماں :۔ "ارے اُس وقت تو میں رزائی سی رہی تھی۔"

رشیدہ :۔ (بُرا سا منہ بنا کر) "لاحول ولاقوۃ، پھر وہی منحوس رزائی بیچ میں آ گو دی۔"

اشفاق :۔ (رشیدہ کی بڑبڑاہٹ پر دھیان دیے بغیر) "وہی کاغذ

شریر بچہ

(دلچسپ کھلونا)

عام طور سے لوگ کہا کرتے ہیں، اگر بچے ہی شرارت نہ کریں گے تو اور کون کرے گا! لیکن بھئی شرارت ایسی ہونی چاہیے جس سے دوسرے تنگ نہ آجائیں۔ آئیے آج ہم آپ کی دوستی ایک شریر بچے سے کرادیں۔ یہ آپ کو بھی ہنسائے گا اور آپ کے دوستوں کو بھی۔ یہ نہ سمجھیے گا کہ وہ بچہ کہیں دور رہتا ہے اور ہم آپ کو اس کا پتہ بتا کر اس سے قلمی دوستی کا مشورہ دیں گے۔ اسے تو بھئی آپ خود ہی بنا کر ہمیشہ اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ اس کا بنانا بہت ہی آسان ہے بس ذرا جلدی سے دو چیزوں کا انتظام کر لیجیے۔

۱۔ سگریٹ کے پیکٹ کی پنّی

۲۔ سائیکل کے بیرنگ میں استعمال ہونے والی لوہے کی چھوٹی گولی۔

سگریٹ کی پنّی تو آسانی سے مفت ہی مل جائے گی اب رہی لوہے کی گولی تو وہ سائیکل مرمت کرنے والے کی دوکان سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اگر آسانی سے مل جائے تو بندوق کے چھرّے سے بھی کام چل سکتا ہے۔ دھیان رہے کہ گولی زیادہ بڑی نہ ہونی چاہیے۔

ہاں تو سگریٹ کی صاف سی پنّی لے کر اس کے دو ٹکڑے کر لیجیے۔ اس کے بعد اس کے پیچھے لگا ہوا باریک سفید کاغذ الگ کر دیجیے۔ اب قلم ... میں یا کسی پتلی نلکی پر پنّی کو لپیٹ کے ایک نلکی سی بنا لیجیے۔ نلکی اتنی چوڑی ہونی چاہیے کہ لوہے کی گولی اس میں آسانی سے آجا سکے۔ اب اس کا ایک سرا اس صفائی سے موڑ دیجیے کہ نلکی پچکے بنا ہی سرا بند ہو جائے۔ اس کے بعد اس میں لوہے کی گولی ڈال کر دوسرا سرا بھی احتیاط سے بند کر دیجیے۔ بس شریر بچہ تیار ہے۔ اسے اچھی طرح ہلا کر دیکھ لیجیے کہ گولی اس کے اندر آسانی سے چلتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے یا نہیں۔

اب اس شریر بچے کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر ذرا سی حرکت دیجیے تو وہ اچھلنے کودنے لگے گا۔ اپنی سلیٹ یا تختی کو ذرا ترچھا کر کے شریر بچے کو سر کے بل اس پر ڈال دیجیے — وہ قلابازیاں کھانے لگے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی مرضی کے مطابق اس سے طرح طرح کے کرتب کروا سکتے ہیں۔ اور ہاں شریر بچے کی لمبائی ایک انچ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے ورنہ وہ بڑا ہو جائے گا۔ آپ جانیں بڑے لوگ شرارتیں ذرا کم ہی کرتے ہیں۔

جناب کیف احمد صدیقی

مرزا غالب

مادرِ ہند کے فنکار تھے مرزا غالب
اپنے فن میں بڑے ہشیار تھے مرزا غالب

اکبر آباد میں پیدا ہوئے دہلی میں رہے
عہدِ طفلی ہی سے دنیا کے بڑے ظلم سہے
کیوں نہ ہر اہلِ سخن[۱] آپ کو استاد کہے
سارے شعرا کے علم[۲] دار تھے مرزا غالب
مادرِ ہند کے فن کار تھے مرزا غالب

آپ کا نام اسد اللہ تھا نوشاہ لقب
مرزا غالب سے ہوئے بعد میں معروف[۳] ادب
آج بھی پڑھ کے کلام آپ کا حیرت میں ہیں سب
زلفِ اردو میں گرفتار تھے مرزا غالب
مادرِ ہند کے فن کار تھے مرزا غالب

تنگ دستی میں بھی چھوڑا نہ وفا کا دامن
مفلسی میں بھی نہ اپنائے خوشامد کے چلن
اپنی خدمات سے شاداب کیا باغِ سخن
فطرتاً شاعرِ خوددار تھے مرزا غالب
مادرِ ہند کے فن کار تھے مرزا غالب

آپ پر فارسی شعرا کا بھی تھا خوب اثر
مسئلہ خدمتِ اردو کا بھی تھا پیشِ نظر
اپنے اشعار کی عظمت سے بھی واقف تھے مگر
میر صاحب[۴] کے طرف دار تھے مرزا غالب
مادرِ ہند کے فن کار تھے مرزا غالب

خط نویسی[۵] کا دیا ایک انوکھا انداز
گونج اٹھی بزمِ ادب میں یہ نرالی آواز
آپ میدانِ سخن[۶] میں بھی تھے سب سے ممتاز
اور مانے ہوئے نثار[۷] تھے مرزا غالب
مادرِ ہند کے فن کار تھے مرزا غالب

بے نیازِ غم و آلام ہر اک فکر سے دور
جو مصیبت میں بھی رہتے تھے ہمیشہ مسرور
آج بھی جن کے لطیفے ہیں جہاں میں مشہور
مسکراتے ہوئے کردار تھے مرزا غالب
مادرِ ہند کے فن کار تھے مرزا غالب

۱ یعنی شاعر ۲ علم اٹھانے والا یعنی سپہ سالار۔ ۳ یعنی ادب کی دنیا میں غالب کے نام سے مشہور و معروف ہوئے۔
۴ یعنی میر تقی میر ۵ خط لکھنے کا۔ ۶ شاعری کے میدان میں۔ ۷ نثر لکھنے والے۔

جناب قدیر جاوید بیگ

انصاف ایسے ہوتا ہے

بڑی سرد رات تھی۔ رات کا گہرا سناٹا تیز ہوا کے زور سے بار بار ٹوٹ رہا تھا اور پتّوں کے آپس میں ٹکرانے کی آواز سے سوئے ہوئے کتّے بھونک اٹھتے۔ کتّوں کے بھونکنے سے لحافوں میں دبکے بچّے ڈر کر ماؤں سے چمٹ جاتے۔ وقت یوں ہی کٹ رہا تھا کہ اچانک کلّو کے ٹوٹے دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی۔

"کھٹ۔۔کھٹ۔۔۔کھٹ۔۔ کھٹ۔۔۔!"

کلّو نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور زور سے چیخا

"کون ہے بھائی؟"

"ارے کلّو میں ہوں نذیر!"

"کون نذیر؟" کہتا ہوا کلّو اپنا پھٹا پرانا لحاف لپیٹتا ہوا دروازہ پر آیا۔

"داروغہ جی والا نذیر۔۔"

"اچھا۔ اچھا۔ تم ہو نذیر بھائی" اس نے کنڈی کھولی۔

"کیا حکم ہے؟"

"جلدی سے تانگہ تیار کرو۔ داروغہ جی کو اسٹیشن جانا ہے"

"پر ابھی تو۔۔۔"

"یہ بحث کا وقت نہیں ہے جلدی کرو" نذیر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

اور وہ زر خرید غلام کی طرح تانگہ تیار کرکے داروغہ جی کی حویلی کی طرف سردی سے ٹھٹھرتا چل پڑا۔

اس نے دیکھا تھانے میں ہر کمرہ روشن تھا۔ ہر طرف چہل پہل تھی جیسے کوئی جشن ہو۔ پاس کے اسٹیشن سے گزرتے ہوئے وزیر ڈاک کی حفاظت کے سلسلے میں داروغہ جی کو اسٹیشن جانا تھا تانگہ آیا تو داروغہ جی بڑے کرّو فر کے ساتھ قیمتی السٹر پہنے تھانے سے آئے۔ کلّو نے بڑے ادب سے سلام کیا جس کے جواب میں انھوں نے بس گردن کو ہلانا کافی سمجھا۔ ان کے بیٹھتے ہی تانگہ چل پڑا۔

"تیز چلاؤ! داروغہ جی نے رسٹ واچ دیکھ کر حاکمانہ انداز میں کہا۔

"سرکار بڑی سردی ہے" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"کیسی سردی!" داروغہ جی غریب پر اُبل پڑے "اگر زیادہ چیں چپڑ کی تو سمجھ لو کھال اتار لوں گا۔۔۔!" اور انھوں نے بغل میں دبا ہوا ڈنڈا ہاتھ میں لے لیا۔ کلّو نے سہم کر تانگے کی رفتار تیز کر دی ہوا اس کے جسم کو اور زیادہ چھیدنے لگی پھر بھی وہ اسی رفتار سے چلتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے میں قصبہ کا اسٹیشن آیا۔ تانگہ ٹھیک سے رکا بھی نہ تھا کہ داروغہ جی کود پڑے اور اس سے کچھ کہے بغیر آگے

پھر دیے بغیر تیزی سے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ وہ ششدر سا کھڑا رہ گیا۔
پندرہ منٹ گزر گئے اور اب بھی وہ نہ پلٹے تو مجبوراً بے چارہ
پلیٹ فارم پر پہنچا۔ اتفاق سے داروغہ جی اُسے ایک کونے میں سگریٹ
سلگاتے مل گئے۔

"سرکار!" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے انھیں اپنی طرف
متوجہ کیا۔ "کیا میں جاؤں؟"

"اور نہیں تو کیا میرے سر پر بیٹھے گا؟" سگریٹ کا کش لیتے
ہوئے انھوں نے اُسے لتاڑ بتائی "دفان ہو یہاں سے!"

"پر میری مزدوری" اس نے ہاتھ جوڑے جوڑے کہا۔

"مزدوری!" وہ غرّائے۔ "کیسی مزدوری؟"

"گھر سے یہاں تک آپ کو لانے کی سرکار" اس نے ہمت
کرکے کہا۔ پر یہ کیا؟ داروغہ جی کا ہاتھ تیزی سے ڈنڈے پر گیا اور
دیکھتے ہی دیکھتے پے در پے کئی ڈنڈے اس کی پیٹھ پر پڑ گئے۔

چوٹ اور وہ بھی سردی کی۔ وہ بلبلا اٹھا اور بری طرح
کراہنے لگا۔

"اور مانگ مزدوری۔" یہ ایک کانسٹبل کی آواز تھی جو
اُسے پٹتا دیکھ کر قریب آگیا تھا۔

"تم لوگوں کا علاج ہی یہ ہے۔"

"کیا اپنا حق مانگنا۔۔۔۔" اس کا جملہ ادھورا ہی تھا کہ
داروغہ جی کا ایک ڈنڈا اتنی زور سے سر پر پڑا کہ خون بہنے لگا اور
سر پھٹ گیا۔

"ہائے مار ڈالا۔۔۔۔ مار ڈالا۔" وہ چیخ اٹھا لیکن اس
کی چیخ انجن کی سیٹی اور ریل کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ میں ڈوب
گئی۔ داروغہ جی تیزی سے سگریٹ پھینک "اٹن شن" ہو گئے۔ چند
لمحوں بعد ٹرین پلیٹ فارم پر آگئی۔ چھوٹا سا قصبہ تھا۔ سواریاں بہت
کم اتریں چڑھیں اس لیے شور وغل بھی واجبی سا ہوا۔ کلّو ایک طرف
پڑا اب بھی کراہ رہا تھا کہ اچانک ایک اُجلے پوش بابو اس کے قریب آئے۔

"کیوں بھائی تمھیں کیا تکلیف ہے؟" انھوں نے اس
کے سر سے خون بہتے دیکھ کر پوچھا "یہ خون کیوں بہہ رہا ہے؟"

"داروغہ جی نے ڈنڈے مارے ہیں۔ یہ دیکھیے۔۔۔ یہ"

"اچھا" بابو نے بڑی ہمدردی سے کہا "میرے ساتھ آؤ۔"

کلّو کراہتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ چند لمحوں بعد
وہ ٹرین کے ایک خوبصورت کمپارٹمنٹ کے سامنے، ایک شریف صورت
انسان کے سامنے کھڑا تھا۔

"تمھیں کس نے مارا؟" اس شریف انسان نے پوچھا

"انھوں نے" اس نے برابر کھڑے ہوئے داروغہ جی کی
طرف اشارہ کرکے جواب دیا۔

"مارنے کی وجہ؟" دوسرا سوال تھا۔

"میں نے ان سے مزدوری مانگی تھی اور۔۔۔"

"یہی بات تھی؟" انھوں نے داروغہ جی سے پوچھا اور
سب نے دیکھا کہ داروغہ جی کی نظریں آپ سے آپ جھک گئی
تھیں۔ اور وہ شریف صورت انسان انھیں خونخوار نظروں سے
دیکھ رہے تھے۔

"آپ علاقے کا انتظام ٹھیک رکھنے اور قانون کی حفاظت
کے لیے سرکار کی طرف سے رکھے گئے ہیں یا ظلم وستم کرنے۔۔۔
آپ جیسا جابر انسان ہرگز اس لائق نہیں کہ سرکاری نوکری اسے
دی جائے۔۔۔"

بس ان کا اتنا کہنا تھا کہ سیکریٹری نے داروغہ جی کی بات
تمام باتیں نوٹ کرلیں۔ داروغہ جی کو کلّو سے سب کے سامنے
باقاعدہ معافی مانگنا پڑی، اور مزدوری علیحدہ ادا

اور ڈاکٹری سے تنہا پیسے ہاتھ دھو بیٹھے کہ سرکاری ملازمت کو ترس گئے۔

۔اب یہ بات تو بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ بابو اس شریف صورت انسان کے سکریٹری تھے اور انھی نے کلو کے کراہنے کی آواز سن کر سکریٹری کو پتہ لگانے بھیجا تھا اور سکریٹری نے کلو کو کراہتا دیکھ کر ان کے سامنے پیش کیا۔

اور ہاں یہ بات بھی تو بتانا رہ گئی کہ وہ شریف صورت انسان آخر کون تھے؟ وہ غریبوں کے ہمدرد اور انصاف پسند رہنما رفیع احمد قدوائی مرحوم تھے۔

بقیہ "دادی اماں کی رزائی"

امی اب یاد کیجیے کہ آپ نے ان سے کاغذات لے کر کہاں رکھے تھے؟"

(دادی اماں بڑی دیر تک غور و فکر کرتی رہتی ہیں پھر اچانک چیخ کر)

دادی ماں :۔ "ارے یاد آیا۔ میں نے کاغذات رزائی کے استر میں سی دیے تھے تاکہ دوسروں کی نظر سے بچے رہیں۔"

اشفاق :۔ (خوشی سے اچھل کر) "وہ مارا!" (رشیدہ کی طرف مڑ کر) "رشو تم نے رزائی کہاں رکھی؟"

رشیدہ :۔ (پریشان ہو کر) میں نے تو غصہ میں آکر رزائی آتش دان میں۔۔"

اشفاق :۔ (چیخ کر) "ارے یہ کیا غضب کر دیا!"

(پھر وہ اچھل کر بھاگتے ہیں۔ رشیدہ بھی بدحواسی کے عالم میں ان کے پیچھے دوڑتی ہے)

دادی ماں :۔ (دہاڑیں مار کر روتے ہوئے) "ہائے میری رزائی۔۔۔ ہائے میری جائداد۔۔۔!"

(پردہ گرتا ہے!)

[illegible]

خواب کی تعبیر

(عبداللہ گرلز کالج کے جلسے میں عزیزی ریاض بنی نے پڑھ کر سنائی)

گوہرِ لاجواب میں ہم لوگ ۔۔۔ قوم کی آب و تاب میں ہم لوگ
رفتہ رفتہ[1] ہیں ابھرنا ہے ۔۔۔ صبح کے آفتاب[2] میں ہم لوگ
جس کی پاپا[3] نے آبیاری[4] کی ۔۔۔ اس چمن کے گلاب میں ہم لوگ
جس کی تعبیر گرلز کالج ہے ۔۔۔ آلا بی[5] کا وہ خواب میں ہم لوگ
مسکرائیں نہ کیوں مسز حیدر[6] ۔۔۔ ان کے دل کی کتاب میں ہم لوگ
رنگ و نکہت[7] جہاں کو بخشیں گے ۔۔۔ فصلِ گل[8] کا شباب میں ہم لوگ

علم کے آئینے میں دیکھا ہے
آپ اپنا جواب میں ہم لوگ

---

[1] دھیرے دھیرے
[2] سورج
[3] محترم شیخ محمد عبداللہ مرحوم۔ علی گڑھ عورتوں کا کالج یا عبداللہ گرلز کالج مرحوم نے قائم کیا۔
[4] سینچنا۔ پانی دینا۔
[5] محترم شیخ عبداللہ کی نیک بخت بی بی
[6] شیخ عبداللہ کی لڑکی (ممتاز عبداللہ)
[7] خوشبو [8] پھولوں کی فصل

جناب شکیل جاوید
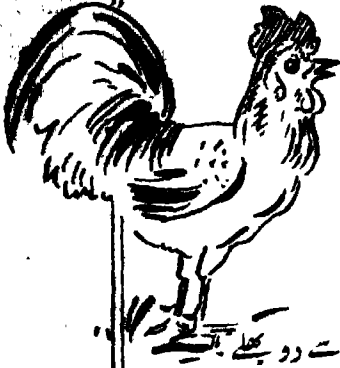
خالہ کا حج

(ایک عربی لوک کہانی ڈرامے کی شکل میں)

(کسی گاؤں میں ایک رنگریز رہتا تھا۔ وہ اپنے کام میں دور دور مشہور تھا۔ اس کے پاس کام کی بھرمار رہتی تھی۔ ہر وقت طرح طرح کے رنگ کی نادیں لبالب بھری رہتی تھیں۔ ایک دن اس رنگریز کی پالتو بلی چوہے کا شکار کرتی ہوئی خود ہی شکار ہو گئی۔ یعنی وہ لال رنگ سے بھری ناند میں جا پڑی اور لگی ڈبکیاں کھانے۔ جوں توں کر کے بمشکل ناند سے باہر نکلی۔ بلی کا رنگ ایک دم سفید تھا پر اب وہ لال رنگ کی ہو گئی تھی۔ سردی کا موسم تھا۔ بلی کپکپانے لگی۔ آخر کار وہ گھر سے باہر کوڑے کے نزدیک دھوپ میں بیٹھ گئی۔)

پہلا منظر

(گاؤں میں ایک کچا مکان۔ اس کے آگے کوڑے کا ڈلاؤ۔ دھوپ میں بلی بیٹھی ہوئی ہے۔ گاؤں کا ایک سفید مرغا دانہ چگتے چگتے اُدھر آنکلتا ہے۔ وہ بلی کو اس طرح خاموش رنگ بدلے بیٹھا دیکھ کر چونکتا ہے اور بلی کے پاس آکر کہتا ہے۔)

مرغا:- "خالہ بلی کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

بلی:- "ہاں بھیا۔ اب میں نے بُرے کاموں سے توبہ کر لی ہے اور میں حج کو جا رہی ہوں۔ میری غلطی معاف کر دینا۔"

مرغا:- "بڑا نیک خیال ہے۔ کیا تم اس نیک ارادے میں مجھے بھی شریک کر سکتی ہو؟"

بلی:- "نیکی اور پوچھ پوچھ — بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ایک سے دو بھلے۔"

(اچانک کوڑے میں چھپا ہوا چوہا باہر نکلا جو دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔)

چوہا:- (دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر) "خالہ سلام۔ کہاں کے ارادے ہیں۔ خیریت تو ہے؟"

بلی:- "جیتے رہو بھانجے۔ اب میں نے گناہوں سے توبہ کر لی ہے۔ کل تک تم میرے دشمن تھے لیکن آج سے دوست ہو۔ میاں مرغے اور تمھاری خالہ دونوں حج مبارک کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اللہ میاں سے ہمارے حق میں دعائے خیر کرنا۔"

چوہا:- "خالہ بلی اگر میاں مرغے کی اور تمھاری اجازت ہو تو میں بھی تمھارے اس نیک ارادے میں تمھارا ساتھ دے سکتا ہوں؟"

مرغا "ارے یار! بھلا ہم تمھیں منع کر کے کیوں گناہگار کہلائیں۔ چلو۔ نیک کام میں دیر نہ کرنی چاہیے۔"

(چوہا بے دھڑک مرغے اور بلی کے پاس آگیا۔ ابھی وہ سفر کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ گاؤں کا بہادر کتا موتی اُدھر آنکلا۔ جب اس نے بلی کے پاس چوہے اور مرغے کو دیکھا تو بڑا حیران اور پریشان ہوا۔ نزدیک آکر بولا: "کہو دوستو اور دشمنو کہاں کے ارادے ہیں؟")

بلی:- "موتی بھیا۔ آتی جاتی دنیا ہے۔ اب میں نے گناہوں سے

تو بہ کرلی ہے اور حج کا ارادہ ہے۔ میاں مُرغے اور
چوہے بھانجے بھی میرے ساتھ چل رہے ہیں۔"

کتا :۔ "کیا میں بھی تمھارے ساتھ تھوڑی بہت نیکی کما سکتا ہوں؟"

بلی :۔ "ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ کیا ہی اچھا ہوگا جب ہم سب ایک
ساتھ چلیں گے۔ خدا ہمیں کامیابی دے۔"

(مُرغے نے اپنی سریلی آواز میں آذان دی اور یہ قافلہ گاؤں سے چل پڑا
راستے میں ندی پڑتی تھی۔ یہ قافلہ ندی پر آکر ٹھہر گیا۔

دوسرا منظر

(گاؤں کے پاس ہی ایک ندی بہتی تھی۔ ندی کو پار کرنے کے لیے
کشتی کا استعمال ہوتا تھا۔ ان چاروں نے ندی کے پاس پہنچ کر چاروں طرف
دیکھا تو کشتی تو موجود تھی لیکن ملّاح کا پتہ نہیں تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ کشتی
کس طرح چلے کہ چاروں پار ہو سکیں۔)

کتا :۔ "ارے بھئی کس بات کی پریشانی ہے۔ کشتی میں کھینچ
لاتا ہوں۔ ہوا کا رُخ موافق ہے۔ ہم بغیر ملّاح کے
کشتی کے ذریعہ کنارے پر پہنچ جائیں گے۔"

کتے کی بات معقول تھی۔ بلی نے کشتی کا رسّہ کھولا، کُتّے نے
کشتی کو دھکیلا اور کشتی ہوا کے رخ پر تیرنے لگی۔

(چاروں دوست کشتی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بلی کے سامنے ہی
چوہا بیٹھا ہوا ہے۔ مُرغا اور کتا نزدیک بیٹھے ہیں اور بلی آنکھیں موندے
ہوئے کنکھیوں سے چوہے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ پیٹ میں چوہے
قلابازیاں کھا رہے ہیں۔)

بلی :۔ "کیوں رے چوہے! تو مجھے گھور کے کیوں دیکھ رہا ہے؟"

چوہا :۔ "واہ خالہ تم بھی بے پر کی اُڑاتی ہو۔ بھلا بھانجہ
کبھی خالہ کو گھور کر دیکھ سکتا ہے؟"

بات ختم ہوگئی۔ کشتی آگے بڑھتی رہی۔ سفر کٹتا رہا۔ دن
چڑھتا رہا اور بلی کو بھوک لگتی رہی۔ بلی نے پھر بات چلائی اور چوہے پر
نظر دوڑائی جو اپنے دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر ندی کی لہریں دیکھنے کی
کوشش کر رہا تھا۔

بلی :۔ "کیوں رے چوہے تو خاموش نہیں بیٹھے گا! گرد اُڑائے
جا رہا ہے!"

چوہا :۔ "اری خالہ۔ کیوں جھوٹ بولتی ہو۔ پانی میں
اور گرد۔"

(بات پھر بھی نہ بنی۔ بھوک پھر بھی نہ مٹی۔ اور کنارہ آگیا۔
دن چڑھا اور اُترنے بھی لگا۔)

(کنارے پر کشتی کے لگتے ہی پہلے چوہا۔ پھر بلی اور کتا اُتر آئے
مُرغے نے ایک ہی اُڑان میں خشکی کا کنارہ پالیا۔ اب چاروں نے مشورہ کیا
اور یہ طے پایا کہ کھانے پینے کا بندوبست ہونا چاہیے اور رات کو قیام
بھی یہیں ہونا چاہیے۔)

تیسرا منظر

(کنارے کے پاس ہی ایک خالی جھونپڑی تھی۔ وہ چاروں
اس میں آ بیٹھے۔ کتے نے کہا بستی میں سے کھانے پینے کا انتظام کرتا ہوں
تم سب لوگ ہوشیار رہنا۔ شام کا دھندلکا بڑھ گیا تھا۔ کتا وہاں سے
چل پڑا۔ اب وہاں بلی مُرغا اور چوہا۔ تینوں موجود تھے۔ چوہے کو بلی
کی طرف سے خطرہ لاحق تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنا بل تیار کرنا شروع
کر دیا۔ بلی صبح سے بھوکی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ اُدھر بلی بھوک سے بیتاب
چوہے پر تہمت رکھ کر اُسے کھانا چاہتی تھی لیکن چوہا پہلے سے ہی بلی کی
نظر دیکھ چکا تھا۔ جب اس نے اپنا بل تیار کر لیا تو بلی سے مخاطب ہوا)

چوہا :۔ "خالہ بلی کیا بات ہے خاموش کیوں گم صم رہو۔"

بلّی :۔ "خالی بیٹھے بیٹھے کیا خدا کے نام سے بھی گئی۔ تیری
کیا ہے تو تو ہمیشہ کھُسر پُسر میں ہی لگا رہتا ہے۔"

مرغا۔ "خالہ بی، شام کی نماز کا وقت تو ہو گیا ہے۔ کہو تو
اذان دے دوں؟"

بلّی :۔ "لیکن میاں موتی تو گاؤں گئے ہوئے ہیں۔"

مرغا۔ "تو کیا ہوا، خالہ بی تو موجود ہیں۔"

چوہا۔ "مگر خالہ بی کو تو اس وقت بڑے زور کی بھوک لگ
رہی ہے۔ خالی پیٹ کچھ نہیں ہوا کرتا۔"

بلّی :۔ "کیوں رے چوہے تو بڑا شریر ہو گیا ہے۔ اپنی زبان
بند نہیں کرے گا؟"

چوہا :۔ "لو خالہ بی، تم تو ناراض ہو گئیں۔ میں نے تو سچی بات
کہی ہے۔"

مرغا۔ "اور سچی بات کڑوی ہوتی ہے۔"

بلّی :۔ "میاں مرغے تم بھی اسی کی کہہ رہے ہو۔"

مرغا۔ "واہ خالہ واہ! تم بھی کمال کرتی ہو۔ خدا لگتی بُری
لگتی ہے تمھیں؟"

چوہا۔ "اماں یار چپ بھی رہو کیوں خالہ کی عبادت میں خلل
ڈال رہے ہو۔"

بلّی :۔ "کیوں چوہے، تو نے پھر طنز کیا۔ کیا تو مجھ سے
واقف نہیں ہے۔"

مرغا۔ "بیکار یار تم بھی خالہ کو غصّہ دلا رہے ہو۔ کیا تم نہیں
جانتے ہو خالہ ہماری تو ہماری شیر کی بھی خالہ ہے۔"

چوہا۔ "خالہ شیر ہی کی خالہ ہے لیکن ہم اس کے خالو ہیں۔"

واتنا کہنا تھا کہ بلّی نے چوہے پر جھپٹا مارا۔ لیکن چوہا پہلے ہی ہوشیار تھا۔ وہ فوراً بل میں
چلا گیا۔ اور مرغا اڑ کر اوپر بیٹھ گیا۔ اتنے میں میاں موتی بھی آ گئے تھے انھوں نے بلّی کا
کرشمہ دیکھ لیا تھا۔ آتے ہی لپک کر بلّی کی گردن پکڑ جھٹکا دے کر مار ڈالا اور یہاں سے

نتیجہ: ایمانداری کی جانچ

یہ کھیل نفسیات کے ماہرین نے ہزاروں لوگوں سے کھلوایا ہے لیکن آج تک کوئی شخص بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکا، لہٰذا اگر آپ چار باریوں میں کسی مرتبہ بھی نشان لگانے میں کامیاب ہو گئے تو اس کے معنی ہیں کہ آپ نے کچھ گڑبڑ کی ہے۔ اور اگر آپ کسی بار بھی نشان لگانے میں کامیاب نہیں ہوئے تو آپ کامیاب ہیں۔ یعنی —— "پکے ایماندار ہیں۔"

سالنامے کے کشمیر والے مضمون میں چند غلطیاں رہ گئی ہیں، از راہِ نوازش انھیں درست کر لیجیے۔

غلط لفظ	صحیح	صفحہ
کوسی	توی	۹۸
یہ سطح سمندر سے ۵۵۰۰	تقریباً پونے سات ہزار فٹ	۱۰۰
لیسہ	لیہہ	۱۰۶

سید محمد راشد بی اے فائنل جامعہ کالج

اس دائرے میں اگر سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے سے آپ کی خریداری کی مدت ختم ہو رہی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ نہ صرف خریدار بنے رہیں گے بلکہ پیام تعلیم کے اور خریدار بھی بنائیں گے۔

اس لیے آپ ۲۵ مارچ سے پہلے پہلے پیام تعلیم کا سالانہ چندہ ۶ روپے منیجر صاحب کو منی آرڈر کر دیجیے تاکہ سال بھر تک پیام تعلیم آپ کے نام آتا رہے۔

آپ کا خیر خواہ

اچھا خاصا اسکرٹ مسٹر شرنک کی بدولت سکڑ کر چھوٹا سا ہو گیا... "سینفورائزڈ" کو ساتھ لیجئے اور اسے گھر سے باہر نکالئے!

·SANFORIZED·
REGD TD MK

مسٹر شرنک کے ہاتھوں خود کو مجبور اور پشیمان نہ ہونے دیجئے۔ آپ کے کپڑے کبھی سکڑ کر تنگ نہ ہوں گے اگر وہ ایسے سوتی یا سوت ملے ہوئے کپڑوں سے بنے ہوئے ہوں جن پر "سینفورائزڈ" کی چھاپ ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں مانا ہوا اور جانا پہچانا یہ ٹریڈ مارک۔ جو ہندوستان میں تیار شدہ کپڑوں کی برآمد بڑھانے میں بہت اہم تعاون کرتا ہے۔ آپ کے کپڑے نہ سکڑنے کا قابل اعتماد ضامن ہے اتنا ہی نہیں بلکہ "سینفورائزڈ" چھاپ والے کپڑوں کو سلائی سے پیشتر پانی میں بھگونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ سوتی یا سوت ملا ہوا کپڑا خریدنے سے پہلے اس کے ہر میٹر پر "سینفورائزڈ" کا نام دیکھ لیجئے۔

رجسٹرڈ ٹریڈ مارک سینفورائزڈ کے مالکان کلوئٹ پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹیڈ محدود ذمہ داری کے ساتھ یو ایس اے میں تشکیل شدہ کا جاری کردہ صرف ان جانچ کئے ہوئے کپڑوں پر اس ٹریڈ مارک کا استعمال کیا جاتا ہے جن کے لئے اجازت دی جاتی ہے جو نہ سکڑنے کی کڑی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔

SAN 7007 UR.

جناب مناظر عاشق ہرگانوی

شیر — چند یادیں

(تقریباً سوا سو برس پہلے کیپٹن فارسائتھ نے مدھیہ پردیش کے جنگلوں کا دورہ کرکے آنکھوں دیکھی باتیں "دی ہائی لینڈس آف سنٹرل انڈیا" نام کی کتاب میں بیان کی تھیں۔ اسی کتاب سے شیر کے شکار سے متعلق چند دلچسپ واقعات آپ کے لیے انتخاب کیے ہیں ——— مناظر عاشق)

شیر کی نقل و حرکت کا پتہ لگانے کے لیے صبح سویرے کا وقت بہتر رہتا ہے۔ اس وقت موسم بھی اچھا ہوتا ہے اور رات کے سارے نقش قدم بھی تازہ رہتے ہیں۔ پھر دوسرے جنگلی جانور بھی اس وقت چلنے پھرنے لگتے ہیں جن کی مدد سے شیر کی نقل و حرکت کا پتہ لگتا ہے۔ صبح آٹھ نو بجے تک تو بندر، مور، سانبھر اور چیتل کی طرح طرح کی آوازوں سے بھی شیر کی نقل و حرکت کے بارے میں پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

بندر بھی شکاریوں کے لیے بڑے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں کہتے ہیں شیرنی بندروں اور موروں کے ذریعہ ہی اپنے بچوں کو شکار کرنا سکھاتی ہے اور یہ دونوں بھی شیر سے بہت زیادہ ہوشیار اور خبردار رہتے ہیں

ایک بار میں بتیول کے جنگلوں میں شیر کے پنجے کے نشان کی مدد سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ یکایک ڈھلان شروع ہو گئی۔ میں چند قدم اور چلا ہوتا تو بالکل نچلی گھاٹی میں پہنچ جاتا۔ اسی درمیان بندروں کی چیخ سنائی دینے لگی۔ میں نے نظر دوڑائی تو نظر پر ایک موٹے تازے شیر کا سر اور پنجے دکھائی دیے۔

اسی لمحہ نیچے سے ایک دوسرے شیر نے خوفناک آواز نکالی اور نیچے کی طرف چلا گیا۔

میں نے اپنا ہاتھی ساتھ لیا اور دونوں کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک شیر نظر آیا۔ میں نے ہودے سے نشانہ لیا اور تین آونس کی گولی اس کے سر پر داغ دی۔ اتنا آسان شکار مجھے اپنی زندگی میں کبھی نہیں ملا۔ شیر کی طرف سے جب کوئی آواز نہیں آئی تو میں نے نزدیک جاکر دیکھا۔ شیر مر چکا تھا۔

پھر میں دوسرے شیر کی تلاش میں چل پڑا جو یقیناً مورن ندی کی سمت جامن کی جھاڑیوں میں کھو گیا تھا۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد اسے بھی کھوج نکالا۔ اپنے اگلے پنجوں پر سر ٹکائے وہ شیطان کی طرح بیٹھا تھا۔ گولی کھاکر وہ بڑے زور سے گرجا۔

میرا ہاتھی اگرچہ نیا تھا لیکن اس نے بڑی بہادری اور استقلال کا ثبوت دیا۔ زخمی شیر ٹکٹک اس کے اگلے پیروں کے بیچ پڑا ہوا تھا۔ لیکن ہاتھی گھبرایا نہیں [illegible]

ضرور گیا۔
حقیقت میں ٹوٹی کروانے زخمی شیر کے دل دہلا دینے والے منظر سے زیادہ ہیبت ناک شکار میں دوسرا منظر ہے بھی نہیں۔ اپنے اُس پاس کے پتھروں، جھاڑیوں اور خود اپنے جسم تک کا وہ کچومر نکال دیتا ہے۔ ایک گولی اور چلا کر اسے اس دکھ اور تکلیف سے نجات دلانا میرے لیے ضروری ہو گیا تھا۔

سانبھر کی آواز سے تو کبھی کبھی بالکل ٹھیک خبر مل جاتی ہے۔ منالا ضلع کے چاندویل مقام پر ایک بار سانبھر نے میری بڑی مدد کی۔ یہاں میں ایک مویشی کھانے والے شیر کے شکار کے لیے آیا تھا۔ رات کو ایک بھینسے کا بچہ باندھ دیا گیا۔ اس کے کھانے کا طریقہ بھی سمجھداری اور چالاکی سے بھرا ہوا تھا۔

ایک بار تو میں اُسے ڈھونڈنے میں ناکام رہا کیوں کہ میرے ہاتھی نے چنگھاڑ مار کر سارا کام بگاڑ دیا تھا لیکن دوسری بار میں نے اُسے ڈھونڈھ نکالا۔ ایک سانبھر میرے پاس ہی چلایا میں نے مڑ کر دیکھا تو اس کے چلانے کی وجہ سامنے موجود تھی۔ میں بڑی مشکل سے اس شیر کو مار سکا۔ ناپنے پر اس کی لمبائی ۱۰ فٹ ایک انچ تھی۔

یہاں میں ایک مددگار شکاری کا ذکر کروں گا۔ اُسے لوگ لالہ کہتے تھے۔ وہ اتنا موٹا، بے ڈول اور بدصورت تھا کہ وہ خود بھی کہا کرتا تھا کہ کوئی شیر بھی اُسے کھانے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ اس نے اپنے ابتدائی دن شمالی ہندوستان کے سرداروں اور راجپوتوں کے لیے باز اکٹھا کرنے اور انھیں شکار کا فن سکھانے میں گزارے تھے۔

ریت پر جنگلی جانوروں کے پاؤں کے جو نشان بن جاتے ہیں انھیں وہ خوب پہچانتا تھا۔ وہ بالکل ان پڑھ اور جاہل تھا مگر اس کی نظر بڑی تیز تھی۔

شیر کی نقل و حرکت کی خبر دینے میں تو وہ بڑا محنتی چالاک اور ایماندار تھا۔ صرف اندازے پر اس نے شیر کی موجودگی کی خبر کبھی نہیں دی۔ جب تک وہ خود شیر کو نہ دیکھ لیتا تھا تب تک اس کی خبر نہیں دیتا تھا۔ شیر کے آگے وہ تنہا چلا جاتا تھا۔ یوں سمجھیے کہ وہ اپنے کو ان ہی میں سے ایک سمجھتا تھا۔

ایک بار مجھے بہت تیز بخار آ گیا۔ لالہ میرا سب سے معتمد شکاری ساتھی تھا۔ اس لیے میں نے اُسے چند پرندے مار لانے کو کہا۔ وہ جنگل گیا تو اتفاق سے اُسے ایک شیرنی نظر آ گئی۔ وہ الٹے پاؤں میرے پاس واپس آیا اور اس نے مجھے تفصیل بتائی۔

میں بیمار تھا اس لیے نہ جا سکا۔ لیکن لالہ کو تو شیر کے شکار کی سنک سوار تھی۔ میرے کہنے کے مطابق اس نے ایک بچھڑا باندھ دیا اور شیر کے انتظار میں ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

شیرنی آئی اور اپنی ران میں لالہ کی گولی کھا کر گھنے جنگل میں گھس گئی۔ بہادر لیکن ناسمجھ لالہ نے صبح سویرے زخمی شیرنی کا تعاقب اس کے خون کی بوندوں سے کیا۔ لیکن جلد ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ بغیر شکار کے ارادے کے شیر کا پیچھا کرنے اور بندوق لے کر شکار کی خواہش سے زخمی شیر کا پیچھا کرنے میں بہت فرق ہے۔

وہ مشکل سے چند ہی قدم گیا ہو گا کہ شیرنی نے اُسے آدبوچا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ اور بدنصیب لالہ شیرنی کے نیچے تھا — جب شیرنی اس پر اپنا غصہ اتار چکی تو اُسے چھوڑ گئی۔

بعد میں تقریباً نیم مردہ لالہ کو میلوں دور کھنڈوا لایا
گیا۔ لیکن اس کی بہادری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کی آنکھوں
سے انتقام کی آگ برس رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے
زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو تم اس شیرنی کو مار کر میرے سامنے لے
آؤ۔ میں اس کی قدر کرتا تھا اور مقامی لوگوں کی قدامت پرستی
کو بھی سمجھتا تھا۔ اس لیے میں اسی تیز بخار میں شیرنی کے شکار کی
ٹوہ میں روانہ ہو گیا۔

اسے اتفاق کہیے کہ شیرنی کی تلاش میں ہم نکلے تھے
لیکن ہم سے پہلے شیرنی نے ہی ہمیں پا لیا۔ ابھی میرے ساتھی
درختوں پر چڑھ بھی نہیں سکے تھے اور میں سنبھل بھی نہ سکا تھا
کہ شیرنی میرے اوپر جھپٹ پڑی۔ وہ دبلی شیرنی ایک ایسی بلی کی
طرح نظر آتی تھی جسے کتوں نے گھیر رکھا ہو۔

پہلی دو گولیاں ٹھیک نشانے پر لگیں لیکن وہ اُسے
نہ روک سکیں۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے جھپٹتی ہوئی میرے ہاتھی
کی سونڈ کے بالکل نزدیک آ گئی۔

میں ہکا بکا تھا لیکن دو گولیاں کھا کر بھی دوڑتی ہوئی
شیرنی کے دم خم کی تعریف کرنے یا متحیر ہونے کا وقت نہیں تھا
میں نے ایک اور گولی چلا دی جو گلے سے ہوتی ہوئی چھاتی
تک نکل گئی۔ اب وہ مجبور تو تھی لیکن اس کے غصے میں کوئی
کمی نہیں آئی تھی۔ وہ زور سے دہاڑنے اور پیچھے ہٹنے لگی۔
اس کی یہ حالت اس وقت تک رہی جب تک میں نے اس کے سر
پر ایک اور فائر کر کے اُسے ختم نہیں کر دیا۔ لالہ کا بدلہ میں نے
لے لیا تھا لیکن وہ اتنے بھیانک اور مہلک زخم کھا کر بچ نہ سکا
وہ چل بسا اور اپنی یادیں چھوڑ گیا۔

ایک بار تقریب قریب ایک ہفتہ تک میں ایک آدم خور
شیر کے شکار میں پریشان رہا۔ اس نے لگ بھگ سو آدمیوں کو
کھا ڈالا تھا اور اس کے خوف سے سڑکیں تک بند ہو گئی تھیں۔

ان میں سے ایک سڑک تو خاص تھی جو بیتول کے
ساگون کے جنگلوں میں نربدا گھاٹی کی طرف جاتی تھی۔ جہاں ان
دنوں ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی اور کام مزدوروں سے چل
رہا تھا۔ لیکن اس آدم خور کی وجہ سے سلیپروں کے ٹھیکیداروں
کا کام بالکل رک گیا تھا۔ اس شیر نے ۳۰-۴۰ مربع میل کے
علاقے میں مورن سے گنجال ندی تک تہلکہ مچا رکھا تھا۔

میں نے معائنے کے بعد اندازہ لگایا کہ یہ کام صرف
ایک شیر کا نہیں ہے اور پھر جلد ہی یہ حقیقت ظاہر بھی ہو گئی
ایک شیر مارا گیا لیکن آدمی اب بھی غائب ہو رہے تھے۔ لالہ ان
دنوں ہمارے ساتھ تھا اور وہ اس شیر سے متعلق طرح طرح کی
خبریں ہمیں سناتا تھا۔

لوگ اُسے بہت موٹا تازہ بتاتے تھے اور اس کی پیشانی
پر پورے چاند کا نشان بھی تھا۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ راہ
چلتے مسافروں کی ٹولیوں کو روک دیا کرتا تھا اور خود ریت میں
لوٹ لگاتا رہتا۔ پھر خوفزدہ مسافروں کا معائنہ کرتا اور ان میں
سے سب سے موٹے آدمی کو چن کر لے جاتا۔

یہ بھی مشہور تھا کہ وہ جب چاہتا کسی بھی شکل میں خود
کو تبدیل کر لینے کی طاقت رکھتا تھا۔ اکثر اسے بھولے بھالے
لکڑہارے کی شکل میں دیکھا گیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اس کے
ذریعے مرے ہوئے لوگوں کی روح اس پر سوار رہتی تھی۔ ایسی
ایسی ہی عجیب اور توہم پرستی کی باتیں اس کے بارے میں پھیلی
ہوئی تھیں۔ جو یقیناً من گھڑت اور خوفزدہ دماغ کی پیداوار
تھیں۔

پھر بھی میں نے اس شیر کو مارنے کی ٹھان لی تھی میں
ہاتھی پر سوار ہو کر چرکھیرا گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں
ان ویران گاؤں کو بھی دیکھا جہاں کے لوگ اس آدم خور
شیر کے ڈر سے مکان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

میں ایک نالے کے پاس پہنچا، جس کے چاروں طرف
گھنا جنگل تھا۔ اسی گاؤں کے پاس شیر کے ذریعے کچھ مسافروں
کو پکڑ لے جانے کی خبر ملی تھی۔ جائے واقعہ پر خون کے دھبے
پھٹے کپڑے اور ہڈیاں گواہ کے طور پر ملیں۔

اس شیر میں یہ خاص بات تھی کہ وہ لاش کو کھانے
دوبارہ نہیں آتا تھا اس لیے اس کے شکار کے لیے لاش کے
پاس بیٹھنا بے کار سمجھ کر ہم لوگوں نے آس پاس کا سارا علاقہ
چھان مارا۔ لیکن اس شیر کا کہیں کوئی پتہ نہ ملا۔

اس وقت شام ہو رہی تھی اور ہم تھک بھی گئے تھے
اتنے میں میرے ہاتھی کے بغل سے چلنے والے ایک آدمی نے
رک جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے شیر کے پنجوں کے نشان دیکھے
تھے۔ رات میں زیادہ تلاش کرنے کو بے کار اور خطرناک سمجھ کر
ہم لوگوں نے وہیں خیمہ ڈال دیا اور آرام کرنے لگے۔

صبح اٹھ کر میں نالے کی طرف گیا لیکن کوئی نشان
نہیں ملا۔ میں لوٹ کر ابھی ناشتہ کرنے بیٹھا ہی تھا کہ بنجاروں
نے آکر بتایا کہ ان کے ایک آدمی کو شیر اٹھا کر لے گیا ہے۔

موقع واردات پر سب چیزیں صاف تھیں اس بنجارے
کا جسم گھسیٹ کر شیر نالے تک لے گیا تھا۔ وہاں تک تو نشان
صاف تھے لیکن اس کے بعد اونچی اونچی گھاس شروع ہو جاتی تھی
جو ہودے تک پہنچتی تھی۔

جہاں میرے ہاتھی نے ایک بار لات زور سے زمین پر
ماری۔ اس کے فوراً بعد لمبی گھاس ہلتی نظر آئی۔ ہم لوگ تیزی سے
آگے بڑھ کر اس ابھاگے بنجارے کے ادھ کھائے جسم تک پہنچ
گئے۔

ہمیں اگرچہ ایک پیلی چیز ضرور نظر آئی لیکن گھاس گھنی
ہونے کی وجہ سے نشانہ لگانا دشوار تھا۔ اور پھر ہم فائر کرنے کی
حالت یا پوزیشن میں بھی نہیں تھے۔ آگے جا کر راستہ پتھریلا ہو گیا
تھا اور کوئی نشان نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ شام کا دھندلکا اندھیری
رات میں تبدیل ہو گیا۔

یہ رات بھی ہمیں ایک چھوٹے سے گاؤں میں گزارنی پڑی۔
میں تڑکے ہی ندی کی طرف روانہ ہوا۔ اب ہمیں اس کے نشان
ملنے لگے تھے۔ اور سچ مچ ہم لوگ اس آدم خور کے پیچھے ہی تھے۔
اس شیر کی نقل و حرکت دیکھنے کے لیے لوگوں کو اونچے اونچے
درختوں پر بٹھا دیا گیا۔ تھوڑا آگے جانے پر کچھ چڑیوں کی
چہچہاہٹ سنائی دی اور میرا ہاتھی بھی رک رک کر ٹھوکریں
مارنے لگا۔

مجھے شیر کی موجودگی کا اندازہ لگاتے دیر نہیں لگی۔
مہاوت نے کہا کہ اسے شیر کی موجودگی کا احساس جامن کی
جھاڑی میں ہوتا ہے۔ ہودے میں کچھ پتھر بھی تھے۔ اس نے ایک
پتھر جھاڑی میں پھینکا۔ شیر اچھلا اور دہاڑتا ہوا نکل بھاگا لیکن
جب اسے بھاگنے کے راستے میں ہاتھی نظر آیا تو اس نے پلٹ کر
مجھ پر حملہ کر دیا۔

یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہوا تھا۔ میں بھی تیار تھا۔
ابھی وہ لگ بھگ ۲۰ گز کی دوری پر رہا ہوگا اور میں نے گولی
چلانی ہی چاہی تھی کہ اچانک میرا ہاتھی پلٹ گیا۔ اور میرا
رخ دوسری طرف ہو گیا۔ لیکن ہاتھی کے پلٹنے کی وجہ معلوم

دراصل خوفزدہ ہو کر میرے ساتھ آئے ہوئے کئی آدمی میرے ہاتھی سے چمٹ گئے تھے اور دو اس کی دُم میں بھی لٹکے ہوئے تھے۔

خیریت یہ ہوئی کہ میری بندوق نیچے گرنے سے بچ گئی۔ ہاتھی اور شیر دونوں ہی ایک سیکنڈ کے لیے ہکا بکا رہ گئے۔

اس اچانک صورتِ حال کا اثر مجھ پر بھی پڑا حالانکہ محکمۂ جنگلات میں آنے سے پہلے میں نے اپنی فوجی زندگی میں بہت سی جان لیوا قوتوں کا سامنا کیا تھا۔ جوکھم اٹھانے اور جان خطرے میں ڈالنے کی مجھے عادت سی ہو گئی تھی۔ لیکن چاہے مجھے آپ کمزور یا بزدل کہیں آج بھی اس لمحے کا تصور کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ذرا سوچیے، ہودہ، مہاوت، شکاری اور شکاری سے نیچے ہاتھی سے لپٹے ہوئے آدمی اور شکار کے درمیان مشکل سے ایک گز کی دوری۔ کیوں کہ شیر ہاتھی کے پٹھے پر آ موجود ہوا تھا اور موت خونخوار جبڑوں اور خوفناک پنجوں کی شکل میں سامنے موجود تھی۔

وہ خونخوار جبڑے اور خوفناک پنجے کسی کا بھی دل ہلا دینے کے لیے کافی تھے۔ اگر ہمارے درمیان کی دوری کچھ بھی کم ہو گئی ہوتی تو شکاری خود ہی شکار بن گیا ہوتا۔

ہاتھی سدھایا ہوا تھا پھر بھی تکلیف اور خوف سے بے چین تھا۔ یہ سوچنے اور فکر کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اس کم وقت میں ہی جب میرے اور موت کے بیچ ایک گز کا فاصلہ رہ گیا تھا، بندوق کی نال شیر کے سر سے لگا کر لبلبی دبا دی۔ شیر آلو کے بورے کی طرح نیچے گر گیا اور ہاتھی نے غصہ اتارنے کے لیے جھٹ سے اپنا پاؤں اس کے مردہ جسم پر رکھ دیا۔

وہ شیر دس فٹ لمبا تھا لیکن اس کی پیشانی پر لوہے کا نشان نہیں تھا اور نہ اس میں کوئی خاص بات تھی وہ تو بس جنگل کا ایک شیر تھا۔

کتابوں کی دنیا

اسلامی معلومات (پہلا حصہ)

از مولانا حافظ بدرالدین بی۔ اے۔ استاد دینیات جامعہ

۲۰×۳۰ ضخامت ۴۸ صفحات، لکھائی چھپائی اچھی خاصی، ٹائٹل دو رنگا، قیمت پچاس پیسے

اسلامی معلومات (دوسرا حصہ)

ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت نوّے ۹۰ پیسے

یہ دونوں کتابیں مدرسہ ابتدائی میں دینیات کے استاد اور پیام تعلیم کے مضمون نگار مولانا بدرالدین نے بچوں کے لیے لکھی ہیں بہت سادہ اور آسان زبان میں اسلامی عقیدوں اور مذہبی عبادتوں کا ذکر ہے۔ بدرالدین صاحب ایک تو بچوں کو خود پڑھاتے ہیں بچوں کو آسان زبان میں اپنی باتیں بتانے کا ڈھب آگیا ہے۔ یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ بچوں سے کس انداز میں بات کرنی چاہیے کہ کام کی بات ان کے ذہن میں بیٹھ جائے۔ اور پھر آسان زبان میں لکھنے کی بھی مشق کرتے رہتے ہیں۔ اسی لیے یہ دونوں کتابیں ان کی کامیاب کوششوں کا اچھا نمونہ ہیں۔

دونوں کتابیں آپ کو ادارہ اشاعتِ دینیات نظام الدین دہلی ۱۳ یا قومی کتاب گھر دیوبند (ضلع سہارنپور۔ یوپی) سے مل سکتی ہیں۔

---x---

ناب غلام حیدر

پیسہ

(مسلسل)

پھر کچھ بعد کی سونے اور چاندی کی بنی ہوئی کچھ وزنی پتریاں بھی نظر آتی ہیں، جن پر کچھ نشان کھدے ہوئے ہیں۔ خیال یہی کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں بھی دوسرے ملکوں کی طرح پہلے سناروں اور تاجروں نے ہی اپنی آسانی کے لیے مجھے رائج کیا۔ اور شروع میں بلکہ کافی بعد تک میرے لیے چوکور شکل ہی پسند کی گئی مگر بعد میں مجھے گول کر دیا گیا۔ ایسے ٹکڑوں پر جو کچھ بھی نشان ہیں وہ شاید تاجروں نے خود ہی اپنی آسانی کے لیے ڈالے ہوں گے۔

لوگوں کی ذاتی ملکیت سے نکل کر میں شاہی دربار میں اس وقت پہنچا جو ہندوستان کی پرانی تاریخ کا شاید سب سے پہلا بڑا دور کہلاتا ہے۔ موریہ خاندان نے ہندوستان میں لگ بھگ ۳۲۲ قبل مسیح سے ۱۸۵ قبل مسیح تک تقریباً ایک سو سینتیس سال حکومت کی۔ میری درباری شکل صاف طور پر تو نہیں بتائی جا سکتی مگر اندازہ یہی ہے کہ شاید چندرگپت موریہ اور اس کے پوتے اشوکِ اعظم کے درمیانی دور میں مجھے دربار میں قبول کر کے عام آدمیوں کے پاس بھیجا گیا۔

مگر جنوبی ہندوستان میں میری ترقی ذرا دیر سے شروع ہوئی۔ یہاں میں اپنی اسی شکل میں جس میں شمال مجھے جانتے تھے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تقریباً دو سو سال بعد تک چلتا رہا۔ اس قسم کے سکے بھی یہاں شمالی حصے کے مقابلے میں ذرا بعد میں ہی شروع ہوئے تھے۔ پھر بھی جنوبی ہندوستان میں پرانے سے پرانے دھات کے ٹکڑے خاص طور پر تانبے کے، جو کچھ سکوں کی شکل کے ہوتے تھے پانچویں چھٹی صدی قبل مسیح تک کے مل جاتے ہیں۔

ہندوستان میں بھی سکے پہلے دھاتوں کو کوٹ کوٹ کر بنائے جاتے تھے مگر بعد میں جب دھات پگھلائی جانے لگی تو سکوں کی دھات کو بھی سانچوں میں ڈھالا جانے لگا۔ اس میں کبھی کبھی سکوں کی قیمت کو بڑھانے کے لیے دو دو تین تین کو جڑا ہوا بھی چھوڑ دیا جاتا تھا۔

میرے اوپر ہندوستان میں بھی اور ملکوں کی طرح شروع میں جانوروں کی شکلیں نظر آتی ہیں۔ جیسے گائے بیل کو لوگ مذہبی اعتبار سے مقدس مانتے تھے اس لیے شروع میں ایک عرصے تک ان کی شکلیں سکوں پر نظر آئیں شیر بہادری کی نشانی تھا۔ لہٰذا بادشاہوں نے اسے بھی سکوں کے لیے چنا۔ بعد میں پھر اور زیادہ مذہبی چیزیں سکوں پر نظر آئیں جیسے ویدک دیوتاؤں کی شکلیں۔

سکندر کے ہندوستان پر حملے اور ایران کی شمال مغربی بکٹری بادشاہوں کی حکومت نے جو ایک نظام پنجاب میں راولپنڈی تک پھیلی گئی تھی، شمالی ہندوستان کے

سکوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ۳۲۶ قبل مسیح میں سکندر ہندوستان کے
شمال مغربی حصے کو فتح کرنے کے بعد اُسے اپنے سرداروں کے
سپرد کرکے واپس لوٹ گیا۔ اس وقت تک یونان میں مجھ پر انسانی
شکلیں نظر آنے لگی تھیں۔ خود سکندر کے سکے بھی دنیا کے خوبصورت
ترین سکوں میں گنے جاتے تھے۔ سکندر کے سکوں کی دیکھا دیکھی
جلدی ہی ہندوستانی سکوں پر بھی انسانی تصویریں آنے لگیں۔

کشان خاندان کے بادشاہوں میں ایک بادشاہ کا نام
سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ کنشک تھا۔ اس کی حکومت کی
سرحد ایک طرف کابل شہر تھی اور دوسری طرف گنگا کا کنارہ۔
اس بادشاہ نے میرے لیے بہت کام کیا۔ اس کے زمانے میں
سونا شاید چاندی سے بہت زیادہ تھا۔ اس لیے اس کے
سکے چاندی سے زیادہ سونے کے نظر آتے ہیں۔

کشان خاندان کے زوال سے ہندوستان کی پرانی
تاریخ کے سنہری زمانے کا آغاز ہوتا ہے اور یہ ہے گپتا خاندان
کی حکومت۔ اس کو سنہری زمانہ اس لیے کہتے ہیں کہ صرف
بادشاہوں کی حکومت ہی بڑی نہیں تھی اور خزانے میں
صرف سونا چاندی ہی بہت جمع نہیں ہو گیا تھا بلکہ اسی زمانہ
میں ہندوستان میں بڑے بڑے کام بہت سے ہوئے۔ اگر ایک
طرف عالم بہت بڑے بڑے ہوئے تو دوسری طرف پتھروں
کو کھود کھود کر ان سے بہت خوبصورت مورتیاں بنانے
والے بھی پیدا ہوئے۔

اور تم جانو جب اور باتوں میں اتنی ترقی ہو رہی ہو
تو میں تو بادشاہوں کا سب سے چہیتا اور "منھ بولا بیٹا" ہوں۔
میرے ہی ذریعہ تو بادشاہوں کی بڑائی کا اندازہ ہوتا تھا۔
چنانچہ اس زمانے میں بھی بہت خوبصورت خوبصورت سکے
بادشاہوں نے چلائے۔ اب ان کے سانچوں کی کھدائی بھی بہت
خوبصورت ہوتی۔ گولائی بالکل ٹھیک۔ بادشاہوں اور دیوی
دیوتاؤں کی شکلیں مجھ پر نظر آئیں۔ خاص طور پر لکشمی دیوی کو
میرے لیے پسند کیا گیا۔ چونکہ اُسے دولت کی دیوی مانا جاتا تھا۔

گپتا خاندان کے بعد ہمارے ملک میں کئی سو سال کا
زمانہ گڑبڑ کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں ظاہر ہے میرے ساتھ
بھی کوئی بہت اچھا سلوک نہ ہوا ہوگا۔ اور تم تو جانتے ہی ہو
کہ جس دن سے میں پہلی بار بادشاہوں کے دربار میں آیا تو
میں انھیں کچھ ایسا بھایا کہ خود میری قسمت بھی بادشاہوں کے
ساتھ لکھی گئی۔ بادشاہ بڑا ہوتا ہے۔ اس کی حکومت بڑی
ہوتی ہے۔ اس کے پاس خوب دولت ہوتی تو خود میری شکل
پر بھی نکھار آجاتا۔ مجھے سونے چاندی کے کپڑے پہنائے
جاتے۔ جوں ہی بادشاہ کمزور ہوتا تو فوراً ہی میری صورت
بھی مرجھائی ہوئی سی دکھائی دینے لگتی۔ مجھے سونے چاندی
کی بجائے تانبے پیتل وغیرہ کا معمولی لباس ملنے لگتا۔ میرے اوپر
کھدی ہوئی صورتیں اور لکھے ہوئے الفاظ بھی اتنے خوبصورت
نہ رہ جاتے اور بس بھائی۔ اس عرصے میں بھی میرے ساتھ
یہی ہوا۔ میرا سونے کا لباس چھن گیا۔ ان تین چار سو سالوں
میں بہت کم بادشاہوں نے مجھے سونے کا لباس پہنایا۔

میری کہانی کا اگلا حصہ خاص اس وقت سے
شروع ہوتا ہے جب مسلمان ہندوستان میں آئے۔ مسلمانوں
سے پہلے عرب تو ہندوستان میں آتے جاتے رہے تھے مگر
وہ تاجر ہوتے تھے۔ سندھ، گجرات اور مغرب اور جنوب
مغربی بندرگاہوں پر بہت پہلے سے ان کا گزر تھا۔ اس کے
بعد ۷۱۲ء عیسوی میں محمد بن قاسم نے اور تسلیہ سے [illegible]

محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملے کیے مگر ان دونوں کی حیثیت
صرف حملہ آوروں کی سی ہے۔ ہندوستان پر مسلمانوں کی باقاعدہ
حکومت محمد غوری نے قائم کی۔ اس نے ۱۱۹۲ء میں پرتھوی
راج کو شکست دے کر شمالی ہندوستان پر قبضہ کیا۔ پھر
اس کے جانشین قطب الدین ایبک نے دہلی کو راجدھانی
بنا کر یہاں بڑی بڑی چیزیں بنوائیں جن میں سے دہلی کا
قطب مینار بھی ہے۔

محمد غوری سے پہلے کئی سو سال مجھ پر عجیب غربت
میں گزرے۔ راجاؤں کی آپس کی دشمنیوں اور جنگوں نے مجھے
بالکل غریب کر کے چھوڑ دیا۔ میں کہیں سونے کے لباس میں
نظر ہی نہ آتا۔ میری پرانی شکلوں کو بھی لوگوں نے شاید اس
لیے گھروں میں دبا کر رکھ لیا کہ کوئی مجھے چھین نہ لے۔ اس
زمانے میں مجھے تانبے سے زیادہ کچھ نہ مل پاتا۔ بہت اگر
کسی نے میری خاطر کی تو دوسری دھاتوں میں تھوڑی بہت
چاندی ملا کر میرا لباس بنوا دیا۔ ویسے تو خیر محمود غزنوی نے
بھی اپنے ہندوستانی علاقے کے لیے کچھ سکے چلوائے تھے مگر
وہ بس معمولی ہندوستانی سکوں کی نقل ہی تھے۔ وہ ایسے
نہیں تھے جیسے وہ اپنے ملک میں چلاتا تھا۔ مگر محمد غوری نے
ہندوستان کو باقاعدہ اپنا ملک سمجھ کر اس میں نئی نئی چیزوں
کی ابتدا کی۔ اس نے سونے چاندی کے سکے چلائے اور
بالکل اسی انداز سے چلائے جیسے دوسرے مسلمان بادشاہ
اور ملکوں میں چلاتے تھے۔ تم پہلے بھی سن چکے ہو کہ مسلمان
بادشاہ عام طور پر کسی قسم کی تصویر یا کسی جاندار کی صورت سکوں
پر نہیں بنواتے تھے۔ تو بس بھائی محمد غوری اور اس کے جانشینوں
نے بھی اس معاملے میں بھی سختی سے عمل کیا۔ یہ بات کہیں اکبر اور
جہانگیر کے زمانے میں تھوڑے عرصے کے لیے ختم ہوئی۔

اس زمانے میں میری شکلیں کچھ اس طرح ہوتی تھیں کہ
سونے کے سکے کو "ٹنکہ" کہتے تھے۔ یہ کچھ کم زیادہ ایک تولے
کے برابر ہوتا تھا۔ ویسے "ٹنکہ" کا وزن ہمیشہ بدلتا رہا ہے "ٹنکہ"
نام کا سکہ شاید مسلمان بادشاہوں کی ایجاد نہیں ہے۔ جنوبی
ہندوستان میں دوسری تیسری صدی عیسوی کے قریب ایک
سونے کے سکے کو "پدم ٹنکہ" ہی کہتے تھے۔ ممکن ہے شمالی ہندوستان
میں اس سے پہلے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہو۔ محمود غزنوی نے
بھی جو چاندی کا سکہ ہندوستان کے لیے چلوایا تھا وہ بھی ٹنکہ
ہی کہلاتا تھا۔ مگر اس کے بعد یہ لفظ خاص طور پر محمد غوری
اور اس کے جانشین بادشاہوں کے زمانے میں مشہور ہوا اور بعد
میں ٹنکہ صرف سونے کا سکہ سمجھا جانے لگا۔

محمد غوری کے زمانے سے بابر کی فتح تک میری کہانی
میں سوائے ایک بہت نئی اور خاص بات کے کوئی بڑی تبدیلی
نہیں آئی۔ بڑے بڑے طاقتور بادشاہ ہوتے تھے، خزانے سونے
چاندی سے بھرے ہوتے اس لیے مجھ میں کوئی خاص بڑی
تبدیلی پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ صرف ایک بادشاہ ایسا
آیا کہ جس نے میری صورت کو بدل ڈالنا چاہا۔ لوگ اس کے
اس کام کو اس کی حماقت کہتے ہیں مگر میں اسے اتنا بے وقوف
نہیں مانتا۔ حالانکہ اس وقت کے لحاظ سے تو اس نے میرے
اوپر زیادتی ہی کی تھی مگر بعد میں تم دیکھو گے کہ بالکل وہی بات
جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ تو چلو میں اس بادشاہ کی کہانی بھی
تمھیں سنا دوں۔

(باقی اگلے پرچے میں)

دِل چسپ کھیل

لیجیے پیامیوں کے لئے ایک بہت دلچسپ کھیل حاضر ہے سابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ آپ ایماندار ہیں یا کیا؟ ——— نیچے حاشیے میں آپ چھ دائرے دیکھ رہے ہیں۔ ان دائروں کو آپ بہت غور سے دیکھیے اور ان کی جگہ کو ذہن میں رکھنے کی کوشش کیجیے۔ اب آنکھیں بند کیجیے اور ان دائروں کے اندر پنسل سے نشان لگائیے۔ اگر آپ اِن سب دائروں کے اندر پنسل سے نشان لگانے میں کامیاب ہو گئے، ٹھیک ——— ورنہ آپ کو تین موقع اور دیے جائیں گے۔ کوشش کیجیے اور بتائیے کہ آپ کتنی مرتبہ کامیاب ہوئے۔
دیکھیے یہ ایمانداری کی جانچ ہے۔ آپ کو آنکھیں بند کر کے نشان لگانا ہیں۔۔۔ جھانکیے گا نہیں۔

نتیجہ صفحہ ۳۶ پر دیکھیے

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

ایک دن ہم نے اُسے خوب ذلیل کیا۔ جب ہم اُس کی ہنسی اُڑاتے اور پوچھتے کہ آج سودے میں کیا بچایا تو وہ بتا دیتا اور بے حیائی سے ہنستا۔ راستے میں ہمارا گھوڑا مر گیا تو اپنے ہاتھ سے کھال اُتار کر بیچ ڈالی۔ اور دام اپنے پاس رکھ لیے۔ راستے کے ایک گاؤں میں اس کی بہن رہتی تھی۔ بے چاری ہمارے لیے بہت سا خشک میوہ لائی ہم نے اُسے کچھ دینا چاہا تو حاجی نے کہا اسے دینے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ دینا ہو مجھے دے دیجیے۔ ہم نے اسے بھی دے دیا اور حاجی سے چھپا کر اُس کی بہن کو بھی دے دیا۔

بولی

بولی شہر قریب تھا مگر راستے میں ایک ندی پڑتی تھی۔ دیکھنے میں تو چھوٹی سی ندی تھی مگر پانی کا اتنا زور تھا کہ جب میں گھوڑے پر بیچ ندی میں پہنچا تو گھوڑے نے مجھے گرا دیا۔ میرے پیچھے میری کنیز دبا ندی بھی تھی وہ بھی غوطے کھانے لگی۔ ساتھیوں نے بڑی مشکل سے مجھے نکالا مگر باندی باہر آتے آتے ختم ہو گئی۔ شہر میں پہنچ کر بھائی چارہ ستی کی خانقاہ میں ٹھہرے۔ سردی کی وجہ سے ٹھٹھر رہے [illegible] خانقاہ میں آگ جل رہی تھی۔ ہم نے بھیگے ہوئے کپڑے اتارے اور آگ کے سامنے بیٹھ کر تاپا تو جان میں جان آئی۔ اخی کھانا اور پھل اتنے لایا تھا کہ ہم نے پیٹ بھر کر کھایا

کردی

اچھا شہر ہے۔ بازار اچھے ہیں، بادشاہ بہت خوبصورت ہے۔ عادتیں بھی اچھی ہیں مگر ذرا کنجوس ہے۔ جمعہ کی نماز ہم نے کردی میں پڑھی۔ شمس الدین دمشقی بادشاہ کا خطیب ہے۔ بادشاہ ہم سے ملنے خانقاہ میں آیا اور ہمارے لیے زین سے کسا ہوا گھوڑا بھیجا۔

یہاں سے ہم برلو گئے۔ برلو ایک پہاڑی پر آباد ہے یہاں کا امیر علی بن سلطان مکرم ہے۔ امیر کو ہماری خبر ملی تو اس نے ہمیں بلایا اور بڑی خاطر کی۔ برلو کی آبادی چھوٹی سی ہے اونچائی پر ایک قلعہ ہے

جس مدرسے میں ہمارا قیام ہے ہمارے ساتھ والا حاجی اس مدرسے کو اور طلباء کو جانتا ہے۔ یہاں سے قسطمونیہ پہنچے۔

قسطمونیہ

قسطمونیہ میں ہر قسم کا مال سستا ہے۔ روزانہ دشمن آنے

کہ نہایت عمدہ بکرے کے گوشت اور دس آنے کی روٹیوں میں
ہم دس آدمی آرام سے کھاتے پیتے تھے اور دس آنے کا حلوہ
سب کو کافی ہوتا تھا۔ جس خانقاہ میں ہم ٹھہرے ہیں یہاں کے
شیخ حد درجہ بہرے ہیں مگر کمال یہ ہے کہ طلباء ہوا میں یا زمین
پر انگلی سے لکھ دیتے ہیں تو وہ ذرا ذرا بات سمجھ جاتے ہیں۔

قسطونیہ میں ہمارا قیام چالیس روز رہا یہاں ہماری ملاقات
شیخ الامام تاج الدین سے ہوئی جو بڑے اونچے درجے کے علماء
میں ہیں۔ اور شیخ المعمر دادا امیر علی سے ہوئی جن کی عمر ۱۶۳ سال
کی ہے۔ میں جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو چت لیٹے
ہوئے تھے۔ خدام نے اُٹھایا اور بھنویں آنکھوں پر سے اٹھائیں
تو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فصیح عربی میں باتیں کرتے
رہے۔ میں نے عمر پوچھی تو فرمایا میں خلیفہ مستنصر اللہ خلیفہ بغداد
کے رفیقوں میں سے ہوں۔ میرے معروضہ پر حضرت نے میرے
لیے دعائے خیر فرمائی۔

سلطان قسطونیہ سلیمان سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس
کے رفیق علماء اور صالح لوگ ہیں۔ میں اس سے ملا تو بڑی
عزت و اکرام سے پیش آیا۔ گھوڑا اور لباس دیا۔ روزانہ
بعد عصر مجلس میں بیٹھتا ہے۔ کھانا آتا ہے تو دروازہ کھول دیا
جاتا ہے۔ جس کا جی چاہے آئے اور کھانا کھائے شہری ہو،
دیہاتی ہو، پردیسی ہو، امیر ہو، غریب ہو، اذنِ عام ہے۔
جمعہ کے دن سوار ہو کر جامع مسجد جاتا ہے۔ جامع مسجد لکڑی
کی بنی ہوئی ہے۔ سب سے اونچی منزل میں ولی عہد اس
کے ساتھی خادم خدمت گار غلام بیٹھتے ہیں۔ دوسری منزل
میں سلطان کا بھائی جسے آفندی کہتے ہیں اس کے خادم اور
اہل شہر بیٹھتے ہیں اور سب سے نیچے کی منزل میں سلطان
ارباب دولت، قاضی، قاری، عالم، فقیہ اور افسران فوج
ہوتے ہیں۔ قاری محراب کے سامنے حلقہ بنا کر بیٹھتے ہیں۔ ان
کے ساتھ قاضی اور خطیب ہوتا ہے۔ سامنے سلطان کی نشست
رہتی ہے۔ قاری سورۂ کہف کی تلاوت نہایت خوش آوازی
سے کرتے ہیں اور آیات کو عجیب ترتیب سے مکرر کرتے جاتے
ہیں۔ پھر خطیب خطبہ پڑھتا ہے اور نماز ہوتی ہے۔ نماز
کے بعد جب نوافل ختم ہو جاتے ہیں تو قاری دس آیتیں
کلام مجید کی پڑھتا ہے۔ پھر قاری سلطان کے بھائی کے
سامنے اور پھر بیٹے کے سامنے تلاوت کرتے ہیں پھر سلطان
کی تعریف میں قصیدہ پڑھا جاتا ہے اور دعا کی جاتی ہے۔
جب یہ سب ہو جاتا ہے تو ولی عہد باپ کے حضور میں حاضر
ہوتا ہے۔ پہلے چچا کا ہاتھ چومتا ہے پھر بھائی اور بیٹا دونوں
مل کر سلطان کی دست بوسی کرتے ہیں۔ یہ نشست عصر کے
وقت تک رہتی ہے۔

بعد عصر بھائی دست بوسی کر کے رخصت ہو جاتا
ہے اور اگلے جمعے تک نہیں آتا اور بیٹا حسب دستور روزانہ
صبح کے وقت حاضری دیتا ہے۔

یہاں سے چل کر ہم ایک گاؤں میں پہنچے۔ اب تک
جتنی خانقاہیں ہم نے دیکھی ہیں ان سب میں یہاں کی خانقاہ
اچھی ہے۔ اسے امیر فخر الدین نے بنایا ہے اور اپنے بیٹے
کی نگرانی میں دے دیا ہے۔ خانقاہ میں ایک حمام بھی بہت
اچھا ہے جس میں ہر ایک غسل کر سکتا ہے۔

ایک بازار بنایا ہے جس کی آمدنی جامع مسجد کے
مصارف میں خرچ کی جاتی ہے۔ اس خانقاہ میں ہر درویش
جو حرمین شریف، مصر، عراق اور خراسان سے آئے

پورا لباس ایک سو درہم جس وقت وہ آتا ہے دے دیے جاتے
ہیں اور تین سو درہم جب وہ جاتا ہے تو دیے جاتے ہیں جب
تک ٹھہرتا ہے روٹی گوشت بریانی اور حلوہ کھلایا جاتا ہے۔
رومی مسافروں کو دس درہم دیے جاتے ہیں اور تین دن تک
مہمان رکھا جاتا ہے۔

صنوب

یہاں سے چل کر شہر صنوب آتا ہے۔ صنوب میں
ہر چیز مل جاتی ہے۔ یہاں ہم اخی عزالدین جلبی کی خانقاہ
میں ٹھہرے ہیں۔ صنوب میں ایک بلند پہاڑ ہے جس پر مشکل سے
چڑھا جاتا ہے۔ اوپر حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ صحابی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرقد مبارک ہے جہاں خانقاہ
ہے۔ ہر ایک کو کھانا دیا جاتا ہے۔

جامع مسجد نہایت خوبصورت ہے جس کے وسط
میں پانی کا حوض ہے۔ حوض پر سنگِ مرمر کا قبہ ہے۔

یہاں کے رہنے والے حنفی ہیں اور ہمیں ہاتھ چھوڑ کر
نماز پڑھتے دیکھا تو سمجھے کہ ہم شیعہ ہیں۔

ہم نے کہا بھی کہ ہم امام مالک کے مسلک کو مانتے
ہیں مگر انھیں یقین نہ آیا۔ سلطان کے نائب نے ہمیں ایک
خرگوش بھیجا اور لانے والوں کو سمجھا دیا کہ دیکھتے رہیں ہم
خرگوش کا کیا کرتے ہیں۔ جب ہم نے اسے ذبح کر کے پکالیا
تو سب کو یقین ہوگیا کہ ہم شیعہ نہیں ہیں کیوں کہ شیعہ خرگوش
نہیں کھاتے ہیں۔

فارم IV حسب قاعدہ ۸ بابت پیام تعلیم

۱۔ مقام اشاعت — جامعہ نگر نئی دہلی

۲۔ وقفہ اشاعت — ماہنامہ

۳۔ پرنٹر کا نام — سید احمد ولی، قومیت: ہندوستانی

۴۔ پبلشر کا نام — سید احمد ولی، قومیت: ہندوستانی

۵۔ ایڈیٹر کا نام — محمد حسین حسان، قومیت: ہندوستانی

۶۔ مالکان کے نام و پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ چیرمین [illegible]
پتہ: جامعہ نگر نئی دہلی

ڈائرکٹرز: ۱۔ سید مجتبیٰ حسین زیدی، جامعہ نگر نئی دہلی
۲۔ ڈاکٹر عبدالعلیم یونیورسٹی روڈ۔ علی گڑھ
۳۔ مسٹر ایم آر چاپلے مہر بلڈنگ چوپاٹی بمبئی
۴۔ ہز ہائی نس نواب اقبال محمد خاں آف پالن پور۔ کف پریڈ، کولابہ، بمبئی۔
۵۔ کرنل بشیر حسین زیدی۔ ایم۔پی
۶۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد روڈ نئی دہلی
۶۔ ضیاء الحسن فاروقی۔ جامعہ نگر نئی دہلی

کمپنی کے سرمایہ کے ۱ فیصد سے زیادہ کے حصے دار۔
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر نئی دہلی
اسلام جیم خانہ، کنیڈی سی فیس بمبئی

میں سید احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات
میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں

دستخط احمد ولی ۲۸ فروری ۱۹۶۹ء

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں

مسلسل

احتیاط پسند وزیر نے تب سانپ کی یہ کہانی سنائی۔

کسی شہر میں ایک بہت طاقتور راجہ راج کرتا تھا۔ اس کے بیٹے کے پیٹ میں ایک سانپ رہتا تھا۔ سانپ نے وہیں اپنا بل بنا رکھا تھا۔ سانپ کی وجہ سے لڑکا دن بہ دن سوکھتا جاتا تھا۔ راجہ نے بہت علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جب وہ شہزادہ بالکل مایوس ہوگیا تو وہ اپنی سلطنت چھوڑکر کسی اور جگہ چلاگیا اور فقیروں جیسی زندگی بسر کرنے لگا۔

شہزادہ جہاں فقیرانہ زندگی گزار رہا تھا وہاں کے راجہ کی دو لڑکیاں تھیں۔ ان دونوں لڑکیوں کا معمول تھا کہ روز صبح اٹھ کر اپنے والد کو سلام کرتیں۔ ان میں سے ایک لڑکی باپ کو سلام کرتے وقت کہتی کہ آپ کی مہربانی سے ہی دنیا کا سارا سکھ چین ہے۔ دوسری لڑکی کہا کرتی "خدا آپ کو نیکیوں کی جزا دے۔" دوسری لڑکی کی بات سن کر راجہ غصے سے لال ہو جاتا۔ ایک دن اسی غصے کے عالم میں اس نے اپنے وزیر کو بلا کر حکم دیا کہ "خدا کی رٹ لگانے والی اس لڑکی کو کسی غریب پردیسی کے ہاتھ سونپ دو جس سے اسے خود اپنے کرموں کا پھل مل جائے۔"

راجہ کے وزیر نے اس لڑکی کی شادی مندر میں رکے ہوئے غریب بھکاری بیمار لڑکے سے کردی۔ شہزادی اس میں بھی خوش رہی اور دونوں وہ ملک چھوڑکر کہیں اور چلے گئے۔

ابھی تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ راستے میں ایک تالاب ملا وہ دونوں وہیں ٹھہر گئے۔ شہزادی پاس کے گاؤں میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں خریدنے گئی۔ جب وہ سودا خرید کر واپس لوٹی تو اس نے دیکھا کہ اس کے شوہر کے منھ میں سے ایک پھن والا سانپ باہر نکل کر ہوا خوری کر رہا ہے۔ قریب ہی ایک بل میں سے دوسرا سانپ بھی نکل آیا۔ دونوں میں بات چیت ہونے لگی۔

بل والے سانپ نے پیٹ والے سانپ سے کہا، "ارے بدمعاش تو اتنے خوبصورت شہزادے کی زندگی کیوں برباد کر رہا ہے؟"

پیٹ والا سانپ بولا "اور تو بھی تو اس بل کے نیچے دبی ہوئی سونے کی دیگ کو خراب کر رہا ہے۔"

بل والا سانپ بولا "واہ بہت اکڑ رہے ہو جیسے کسی کو تمہیں پیٹ سے باہر نکلنے کی دوا معلوم ہی نہ ہو؟ تجھے پتہ ہونا چاہیے کہ کوئی بھی آدمی اس شہزادے کو ابلی ہوئی رائی کا پانی پلا کر تیری موت کا سامان کر سکتا ہے۔"

پیٹ والا سانپ بولا: "اور تم کیا سمجھتے ہو؟ کوئی
بھی اُبلا ہوا تیل تیرے بل میں ڈال کر مجھے ہمیشہ کی نیند سُلا
سکتا ہے۔"

اس طرح ان دونوں نے ایک دوسرے کا بھید
کھول دیا۔ شہزادی ان دونوں کی بات سُن رہی تھی اور اس
نے دونوں کا اسی ترکیب سے خاتمہ کر دیا۔ اس کا شوہر بھلا
چنگا ہو گیا اور بل میں دبا خزانہ ہاتھ آ گیا۔ دونوں کی غریبی
بھی دور ہو گئی۔ اب دونوں اپنے وطن واپس آ گئے۔ شہزادے
کے ماں باپ نے اس کی خوب آؤ بھگت کی۔

اُلّو شاہ نے بھی احتیاط پسند وزیر کی بات سن
کر یہی فیصلہ کیا کہ کوّے شاہ کے وزیر خاص کو مارا نہ جائے۔
گرم مزاج وزیر نے اس پر احتجاج بھی کیا۔ اس نے کہا کہ
الوؤں کی خیر اسی میں ہے کہ کوّے شاہ کے وزیر کا فوراً خاتمہ
کر دیا جائے۔ اس نے دوسرے وزیروں سے کہا کہ تم —
اس کوّے کو نہ مارنے کی رائے دے کر اُلوؤں کی قوم کا ستیاناس
کرا رہے ہو مگر اس کی بات پر کسی نے دھیان نہ دیا۔

اُلّو شاہ کے سپاہیوں نے گھائل کوّے کو ایک پلنگ
پر لٹا کر قلعے کی طرف رُخ کیا

قلعے کے پاس پہنچنے پر کوّے نے اُلّو شاہ سے درخواست
کی کہ "مہاراج مجھے آپ جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیجیے۔
آپ ناحق میرے اوپر اتنی مہربانی دکھا رہے ہیں میں بہت
پاپی ہوں۔"

اُلّو شاہ نے کہا "بھائی ایسا کیوں کہتے ہو؟"
کوّا بولا "مہاراج آگ میں جل کر میرے پاپ
دھل جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے اندر کوّے کی جو
خصلت ہے وہ جل کر راکھ ہو جائے اور مجھ میں اُلّوؤں کی
سی خصلت پیدا ہو جائے تبھی میں اس پاپی کوّے شاہ کو
اس کے کیے کا مزا چکھا سکتا ہوں۔"

گرم مزاج وزیر کوّے کی اس چال کو خوب سمجھ رہا
تھا۔ اس نے کہا: "ارے کوّے تو بہت ہوشیار ہے میں جانتا
ہوں کہ تو اُلّو بن کر بھی کوّوں کا ہی بھلا سوچے گا۔ تجھے بھی اس
چوہیا کی طرح اپنی قوم کے لوگوں سے پیار ہے جس نے سورج
چاند، ہوا وغیرہ سبھی کو چھوڑ کر ایک چوہے سے شادی رچائی تھی۔

وزیروں نے پوچھا "وہ کیسے؟"

تب گرم مزاج وزیر نے چوہے کے سوئمبر کی یہ
دلچسپ کہانی سنائی۔

(یہ دلچسپ کہانی اگلے پرچے میں)

★ ایک گنجا آدمی دوسرے سے لڑ رہا تھا۔ لڑتے لڑتے گنجے نے کہا
"تم تو میرے سر پر چڑھے آ رہے ہو!"
دوسرا آدمی بولا: "تمھارے سر پر چڑھ کر پھسلنا تھوڑی ہے۔"

★ ایک مجرم کو بجلی کی کرسی پر بٹھا کر سزائے موت دی جانے
والی تھی۔ انسپکٹر نے مجرم سے پوچھا: "تمھاری آخری خواہش کیا ہے؟"
مجرم نے جواب دیا "میری خواہش یہ ہے کہ اس کرسی
پر میری جگہ آپ بیٹھ جائیں۔"

★ ماں نے بچے کو دودھ میں ڈبل روٹی ڈال کر دی
تو بچہ رونے لگا۔
ماں: بیٹا کیوں رو رہے ہو؟ بچہ: ممی جان سارا دودھ
تو ڈبل روٹی پی گئی۔ اب میں کیا پیوں!"

اگر بجلی نہ ہوتی

(بمبئی کے میونسپل اردو اسکولوں کے درمیان ہمیشہ کی طرح اس سال بھی تقریری مقابلے ہوئے تھے۔ مختلف عنوانوں پر لڑکوں اور لڑکیوں نے تقریریں کیں۔ دیونار میونسپل اردو اسکول سے محمد حسن بن شیخ چاند (جماعت ششم) کی تقریر بعنوان "اگر بجلی نہ ہوتی" پہلے لپنے بیٹ ۱۵ میں اوّل انعام کی مستحق قرار پائی۔ اس کے بعد انٹر بیٹ تقریری مقابلے میں بھی اسی تقریر کو پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ آپ بھی پڑھیے۔ دیکھیے کتنی اچھی ہے۔ ایک رپورٹر)

آج سے پچاس ہزار برس پہلے جب انسان نے آگ کی دریافت کی تو یہ دریافت انسانی ترقی کی ایک اہم سیڑھی بن گئی۔ آگ نے کچا گوشت کھانے والے اور جنگلی جانوروں کے ڈر سے غاروں میں پناہ لینے والے شروع کے انسان کی تاریخ ہی بدل دی۔

اس درمیان میں انسان نے کافی ترقی کی۔ تہذیب نے کتنی ہی کروٹیں بدلیں۔ انسان کی عقل نے بہت سی چیزیں ایجاد کیں اور یہ ایجاد اور دریافت کا سلسلہ برابر جاری رہا مگر آگ کی دریافت اس سلسلے کی اہم اور بنیادی کڑی تھی۔ آخر سترھویں صدی میں انسانی ذہن نے ایک ایسی چیز کھوج نکالی جس کے سامنے آگ کی اہمیت بھی ماند پڑ گئی۔ یہ بجلی تھی۔

جس طرح ہم انسانی تہذیب کو کئی زمانوں میں تقسیم کرتے ہیں جیسے پتھر کا زمانہ، لوہے کا زمانہ۔ اسی طرح موجودہ زمانے کو ہم بلا جھجک بجلی کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔

آپ غور سے دیکھیں گے تو جان جائیں گے کہ آج ہماری زندگی پر بجلی کا راج ہے۔ ہماری ساری ترقی، موجودہ تہذیب کا سارا ٹھاٹ باٹ انہی بجلی کے دم سے ہے۔ اگر بجلی کو ہمارے دور سے الگ کر دیجیے تو ہماری ترقی کی یہ عظیم الشان عمارت اڑا اڑا دھم ـــ زمین پر آ رہے گی۔

ہم اس جلسے میں شریک ہونے کے لیے پانچ چھ میل دور سے آ رہے ہیں۔ بجلی کی ٹرین نے ہمیں صرف دس منٹ میں یہاں پہنچا دیا۔ کیا بجلی کی دریافت سے پہلے کوئی ایسی سواری تھی جو چھ میل کا فاصلہ دس منٹ میں طے کرا دیتی۔ یہ تو بجلی کا ایک معمولی سا معجزہ ہے۔

آپ گھر میں بیٹھے بیٹھے ایک چھوٹے سے بکس کو ذرا چھیڑیے اور پھر یہاں سے ہزاروں میل دور میکسکو میں ہونے والے اولمپک کھیلوں کی تفصیل سن لیجیے۔ بلکہ آپ چاہیں تو ان کھیلوں کو دیکھ بھی سکتے ہیں۔ صرف ٹیلیویژن کا سوئچ آن کر دیجیے بس۔ آپ کا دوست دلّی میں رہتا ہے۔ آپ اس کی خیریت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ خط اور تار سے تو خیریت معلوم ہوگی ہی مگر ٹیلیفون کا چونگا اٹھا کر اس کے نمبر ملائیے۔ لیجیے آپ کا دوست آپ سے مزے مزے کی باتیں کر رہا ہے۔ انسانی عقل کے یہ سارے معجزے بجلی کے احسان مند ہیں۔

یہ میلوں پھیلے ہوئے کارخانے، فیکٹریاں، ملیں۔ ان سب کی جان بجلی کی مٹھی میں ہے۔ ان کارخانوں اور ملوں میں ہماری اور آپ کی ضرورتوں کی ہر چیز تیار ہوتی ہے۔ موٹریں، ریلیں، کپڑے، دوائیاں، گھڑیاں غرض یوں سمجھ لیجیے کہ معمولی سوئی سے لے کر آسمان پر اڑنے والے ہوائی جہاز تک بجلی سے تیار ہوتے ہیں۔

آپ گرمی سے پریشان ہو رہے ہیں۔ پسینے میں نہائے جا رہے ہیں، پنکھے کا بٹن آن کر دیجیے۔ دیکھیے کیسی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ ایرکنڈیشنڈ بنگلے میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی صحت افزا مقام یا پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھے ہیں۔ یہ سب بجلی کی کرامت ہے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ بجلی کے ہم پر کتنے احسانات ہیں۔ اگر بجلی نہ ہوتی تو یہ ساری سہولتیں، ہماری ساری ترقی، نئی تہذیب کی یہ ساری چمک دمک، سب ماند نہ پڑ جاتی؟

(باقی ص ۶۴ پر)

بڑوں کی کوششیں

میرا ایک سفر

سردی کا موسم تھا۔ آج دس دن کی چھٹیوں کے بعد اسکول جانا تھا۔ میں تیار ہو کر جانے کو تھی کہ میری خالہ نے کمرے میں پاؤں رکھا تو میں انھیں دیکھتے ہی سہم گئی۔ وہ بولیں بستہ رکھو اور تیار ہو جاؤ۔ ہمیں آج رات کی گاڑی سے پٹھان کوٹ جانا ہے وشنو ماتا کے درشن کرنے۔ تمھارے جیجا جی شام کو اسٹیشن پہنچ جائیں گے۔ تم اب جلدی کرو۔ سامان لے کر ہم اسٹیشن پہنچے۔

بہت سی گاڑیاں اِدھر سے اُدھر جا رہی تھیں کچھ اُتر رہے تھے کچھ چڑھ رہے تھے۔ اسی وقت ریلوے لاؤڈ سپیکر سے سُنائی دیا "پٹھان کوٹ یعنی کشمیر میل لیٹ ہے"۔ دو گھنٹے کا انتظار اکھرنے لگا۔ میں ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگی۔

ٹھیک دس بجے گاڑی اسٹیشن پر آ پہنچی۔ لوگوں کی قطاریں چڑھنے اترنے لگیں۔ شور کافی تھا۔ ہم قلی کی مدد سے رزرو ڈبے میں جا بیٹھے۔ بجلی کا پنکھا زور سے چل رہا تھا ہم نے چین کی سانس لی۔

گاڑی چل پڑی۔ چاندنی رات تھی۔ آسمان تاروں کا آنچل اوڑھے بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بادل چھا گئے چاند رہ رہ کر بادلوں سے جھانک رہا تھا۔ میں نے باہر جھانک کر دیکھا انجن تیزی سے سیٹی دیتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ کچھ لال لال انگارے ہوا کے ساتھ اڑ کر پیچھے آ رہے تھے۔ مانو آنکھ کھول کر آگ اگل رہا ہو۔ پیڑ پودے، کھیت، جنگل سبھی کچھ دھوئیں سے ہو رہے تھے گاڑی ان کو چھوڑ کے آگے چلی جا رہی تھی۔ لگتا تھا چیزیں پیچھے اڑ رہی ہیں۔

ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں سے میری آنکھیں بھاری ہونے لگیں میں سکڑ کر تھوڑی دیر میں نندیا کی گود میں جا پہنچی۔

گاڑی کب اور کہاں سے گزری، کون سے اسٹیشن آئے مجھے پتہ نہیں۔ امبالا اسٹیشن پر کوئی مجھے جگا رہا تھا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا ٹکٹ چیکر کھڑا ہمارے ٹکٹ دیکھ رہا ہے میرے پوچھنے پر آنٹی نے بتایا گاڑی امبالا اسٹیشن پر ٹھیری ہوئی ہے۔

اسٹیشن بجلی کی روشنی سے چمک رہا تھا۔ چیزوں کی ریڑھیاں گھوم رہی تھیں۔ کوئی کہتا لیمن، سوڈا! کوئی کہہ رہا تھا چائے البتی! ہم نے چائے اور بسکٹ لیے اور کھانے لگے۔ کچھ دیر بعد گاڑی نے سیٹی دی۔ لوگ جلدی جلدی سوار ہوئے پھر گاڑی پھک پھک پھک پھک کرتی چل دی۔ میں پھر آرام سے بیٹھ گئی۔

راستے میں کتنے اسٹیشن آئے پھر ہمارے ڈبے کو کسی نے نہیں چھوا کیوں کہ یہ ڈبہ رزرو تھا۔ میں سکھ سے سوتی رہی جب اٹھی تو صبح کا منظر آسمان کے رنگ منچ (اسٹیج) پر بکھرے بادلوں کے پردے کے پیچھے کھل رہا تھا۔ مشرق سے سورج نکل رہا تھا۔ سورج کی کرنیں ایک سنہری پٹ بُن رہی تھیں۔ مغرب میں مجھے ایک تارا نظر آیا اور کچھ دیر میں وہ بھی چھپ گیا۔

اب بھی گاڑی پہاڑوں کے پیٹ کو چیرتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔ ندیاں، نالے، جنگل، کھیت، سبھی تیزی سے ہارے ہوئے پیچھے ہی بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ سورج کی کرنیں

آسمان میں چھائیں ادھر شمان کوٹ کے پاس والی ندی نے انھیں اپنے دل میں بسالیا۔

ہم نے سامان سنبھالا اور اتنے میں گاڑی اسٹیشن پر پہنچی۔ ایک ایک کرکے لوگ اتر پڑے۔ ہم نے سامان اتروالیا اور ٹکٹ دے کر باہر آگئے یہ سفر بڑا اچھا رہا۔ میں نے کئی سفر کیے پر ایسا سفر نہیں کیا۔ گھر جیسی نیند، نہ لڑائی نہ جھگڑا شانتی ہی شانتی۔ اب بھی کسی سفر پر جانے کو تیار ہوتی ہوں تو اس سفر کے نظارے ایک ایک کرکے آنکھوں سے گزرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

سندرشانتا (ڈپلوما بیک جامعہ۔ دوسرا سال)

آگ کا ناچ

بات چند سال پہلے کی ہے پر یاد کرتے ہی تازی ہو جاتی ہے۔ دسمبر کے آخیر یا جنوری کے شروع کا مہینہ اور کڑاکے کی ٹھنڈ تھی۔

آگ! آگ!! آگ!!!

چاروں طرف آگ لگی ہے۔ سب جل رہا ہے۔ پرانی گلی کے موڑ پر سنو وائٹ کی برانچ جل رہی ہے آگ کی تیز لپٹیں سانپ کی طرح پھنکار رہی ہیں۔ ہوا تیز ہو گئی۔ شالیمار سنیما' راج دوت ہوٹل سبھی جل رہے ہیں۔ آگ اب بھی کم نہ ہوئی۔ آدمی کتنا مجبور ہے۔ چاروں طرف آگ لگی ہے پر اسے شانت کرنے کی طاقت کسی میں نہیں۔ سبھی کھڑے کھڑے آگ کے اس ناچ کو دیکھ رہے ہیں۔

ارے یہ لو! رام لیلا گراونڈ میں آگ پہنچ گئی۔ ارے!!! کی، وہ دھ[illegible] لوٹی جل کر کالی ہو گئی پھر بھی وہ مسکراتے نظر آتے ہیں۔ کئی لوگ اسے ان کی ہمت سمجھیں گے پر یہ ایک برداشت نہ کرسکنے کی طاقت کی مثال ہے۔ ادھر شاستری جی کی تھوڑی جل رہی ہے لیجیے، اُن کا منھ بھی جھلس گیا۔ آگ کرتے تک پہنچ گئی ہے بس جلے ہی سمجھیے۔ اُدھر دیکھیے جمنا میں ایک جلتا ہوا ہوائی جہاز گر پڑا۔ نیچے گہرا پانی اور اوپر تیز آگ کا ملنا! راکھ ہونے میں بہت تھوڑا وقت لگے گا۔ اِدھر دیکھیے میجر جنرل برٹش سینا اور پاس کھڑی شریمتی وجے لکشمی پنڈت کے کپڑوں میں آگ لگ گئی ہے۔ ارے! آگ بڑھ رہی ہے! یہ دیکھیے مسٹر جانسن کے اوپر ہی آگ کی لپٹ آگری۔ یہ بھی بھسم ہونے والے ہیں۔

آگ کا ناچ ختم ہونا شروع ہوا۔ پھر بھی یہ اپنا آخری ناچ دکھا رہی ہے۔ یہ لیجیے، پرتاپ سنگھ کیروں کے پاس نہ جانے کہاں سے چنگاری آپہنچی کر وہ بھی جل کر راکھ ہو گئے۔

دسمبر کا آخر، کڑاکے کی سردی، صبح صبح کون آگ جلائے۔ ارے سستی تو اپنا پیدائشی حق ہے۔ تو صاحب نہ جانے کب کا پرانا اخبار جلا کر چائے کا پانی گرم کرنے لگے ہیں۔ دھت ترے کی! پانی تو کبھی کا ابل گیا۔ بس چائے چینی ڈالنی باقی ہے۔ بس اتنی سی بات پر آپ کے منھ پر مسکراہٹ کیوں؟

چندر کانتا

(ڈپلوما بیک جامعہ)
دوسرا سال

بچوں کی کوششیں

امی جان

کتنی اچھی ہیں میری امی جان

صبح تڑکے مجھے جگاتی ہیں — پیار سے مُنہ مرا دُھلاتی ہیں
پھر وہ کرتی ہیں ناشتہ تیار — اور مجھے ناشتہ کراتی ہیں

کتنی اچھی ہیں میری امی جان

صبح جس دم سکول جاتا ہوں — وہ مجھے ٹافیاں کھلاتی ہیں
پڑھ کر اسکول سے جب آتا ہوں — پیار سے وہ گلے لگاتی ہیں

کتنی اچھی ہیں میری امی جان

اچھے کپڑے مجھے پہناتی ہیں — عمدہ کھانے مجھے کھلاتی ہیں
نام روشن کروں بڑا ہو کر — اس لیے وہ مجھے پڑھاتی ہیں

کتنی اچھی ہیں میری امی جان

سید محمود علی (کراچی)

ہاتھی کا بٹوارا

ایک امیر آدمی تھا۔ اس کے دو لڑکے تھے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی جائداد کا بٹوارا ہونے لگا۔ جگہ، زمین، مکان کھیتی باڑی کا سامان سبھی کچھ تھا۔ بٹوارے میں کئی دن لگ گئے سب چیزیں بٹ گئیں بس ایک ہاتھی کا بٹوارا رہ گیا۔ ہاتھی کا بٹوارہ کیسے ہو یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

دونوں بھائیوں میں کئی دن تک جھگڑا ہوتا رہا۔ آخر میں کسی لال بجھکڑ نے یہ فیصلہ کیا کہ ہاتھی کو دو برابر حصوں میں چیر دیا جائے، دونوں بھائی ایک ایک حصہ لے لیں۔ دونوں بھائی اس فیصلے سے بہت خوش ہوئے۔

اتفاق سے ہاتھی کو چیرنے سے کچھ دیر پہلے لڑکوں کے ماموں آ گئے۔ انھیں جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے لڑکوں کو سمجھایا کہ اس طرح کے بٹوارے سے تو ہزاروں کا مال کوڑیوں کا بھی نہیں رہے گا۔ یہ بات دونوں کی سمجھ میں آ گئی۔

مبارک احمد

سانپ بھی کھائے جاتے ہیں۔

دکن پوربی ایشیا کے بعض ملکوں کی طرح سنا گیا ہے کہ جاپان میں بھی سانپ کھائے جاتے ہیں۔ جاپان کی راجدھانی ٹوکیو کے کئی ہوٹلوں میں لوگ بڑے مزے لے لے کر سانپ کا گوشت اور اس کے خون کی شراب پیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم شامی کباب اور چائے سے مزہ لیتے ہیں۔ یہ سن کر شاید آپ کو تعجب ہوگا کہ جاپان میں سال بھر میں دس لاکھ سانپ پکڑے جاتے ہیں اور ان میں آٹھ لاکھ سانپ وہاں کے لوگ مختلف ہوٹلوں میں چٹ کر جاتے ہیں۔ جاپانیوں کے خیال میں سانپ کے خون کی شراب بے حد فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔ اس کے پینے کے بعد تھکاوٹ بالکل دور ہو جاتی ہے۔ جس ہوٹل میں یہ

شراب بنتی ہے اس کا نام ٹو۔ٹو۔شو۔ہوٹل ہے۔ یہ ٹوکیو سے ۴۰ میل دور ہے۔

بدر وفا مہسرامی

گینڈا

گینڈا بڑا ہی خطرناک اور طاقتور جانور ہے۔ آج کل ہندوستان میں یہ صرف آسام کے جنگلی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ جوں جوں جنگل کٹتے گئے اس طرح کے جانوروں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ کچھ عرصے سے جنگلی جانوروں کی حفاظت کے لیے تین نیشنل پارک بنائے گئے ہیں

(۱) ہیلی نیشنل پارک (اتر پردیش) (۲) کجیرنگ پارک (آسام برہمپتر ندی کے دونوں طرف)

(۳) پیری بھرگم بزرد (ٹراونکور)

ان پارکوں میں شکار کھیلنا قطعی منع ہے۔

گینڈا دیکھنے میں بڑا ہی خطرناک اور بھیانک معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک سینگ ہوتا ہے جو بڑا مضبوط ہوتا ہے۔ یہ کوئی پھرتیلا جانور نہیں۔ اس کا بھی وہی حال ہے جو ہاتھی کا ہے۔ اس کا جسم بڑا وزن دار اور موٹا ہوتا ہے۔ اس کا چمڑہ اس قدر موٹا ہوتا ہے کہ اگر اس پر رائفل چلائی جائے تو ذرا بھی اثر نہ ہوگا۔ یہ دیکھنے میں بہت کم آتا ہے۔ بڑے بڑے چڑیا خانوں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ ہمیشہ تھوڑے پانی میں رہتا ہے۔ اس کی خاص غذا سبز گھاس اور درختوں کی پتیاں وغیرہ ہیں۔ یہ خشکی اور تری دونوں ہی کو پسند کرتا ہے۔ بڑا ہی کاہل جانور ہے۔ یہ ہمیشہ آہستہ آہستہ [illegible] جاتا ہے۔ کہتے ہیں

افریقی گینڈے کے سر پر دو سینگ ہوتے ہیں!

محمد رمضان ساحل مہسرامی

لطیفے

ایک آدمی: کیا تمھاری گھڑی وقت بتاتی ہے؟

تیز لڑکا: نہیں صاحب آپ کو اس میں دیکھنا پڑتا ہے!

بھلکڑ پروفیسر صاحب رات کو کتاب پڑھ رہے تھے۔ نشانی کے طور پر انھوں نے چھوٹی قینچی کتاب میں رکھ دی اور سو گئے۔ صبح قینچی کی تلاش شروع ہوئی — پروفیسر صاحب سے پوچھا انھوں نے کہا مجھے تو نہیں معلوم۔

دوسرے دن وہی کتاب لیے ہوئے پروفیسر صاحب کالج پہنچے۔ جماعت میں ہاتھوں نے کتاب کھولی تو قینچی نکلی۔ انھوں نے قینچی ہاتھ میں لی اور خوش ہوکر بولے:

"ارے مت ڈھونڈو! مل گئی!"

افضل امام

چند موجد اور ان کی کارآمد ایجادیں

ٹیلی ویژن سے تو آپ سب لوگ واقف ہوں گے ہی جس کے ذریعہ بہت دور کی تصویریں ہم گھر بیٹھے دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کے ایجاد کرنے والے کا نام بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔ آئیے میں آپ کو بتاؤں کہ اس کے موجد کو کن کن مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا اور کس طرح اس نے کامیابی حاصل کی۔

ایک اسکاٹ سائنس [illegible]

لندن میں مقیم تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب کہ ٹیلیفون کی
ایجاد نے سب کو حیران کر دیا تھا۔ یہ آدمی لندن کے ایک
چھوٹے سے کمرے میں مقیم تھا اور تجربے کر رہا تھا۔ اس سے پہلے
ٹیلی گرافی کے ذریعے تصویریں بھیجی جاتی تھیں۔ کنگ ایڈورڈ ہفتم
کی تصویر ایک جرمن سائنسدان کورن نے ایک جگہ سے دوسری
جگہ بھیجی تھی۔

بیرڈ دن رات اپنی کھوج میں مشغول تھا۔ لگاتار محنت
کے بعد آخرکار وہ ایک مورتی کی پرچھائیں (HEAD LINE)
ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک بھیجنے میں کامیاب ہو گیا۔
اس کو امید ہو گئی کہ اب وہ صرف پرچھائیں ہی نہیں پوری
تصویر بھیج سکے گا۔ لیکن تنگدستی نے اس کی کمر توڑ دی۔
"ہمت مرداں مددِ خدا" آخر اُسے چند ایسے دوست مل گئے
جنھوں نے اس کی بڑے پیمانے پر مدد کی۔ وہ پھر تجربوں
میں لگ گیا۔ دن رات مشغول رہنے کے بعد آخر خدا نے اُس
کی سن لی۔ ایک دن شام کو بیرڈ نے ایک لڑکے کو مشین
کے سامنے کھڑا کیا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ دوسرے
کمرے میں گیا.... اور اسکرین؟ وہ تو خالی تھا! بیرڈ
تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ واپس دوسرے کمرے میں گیا۔
جلد ہی وہ سمجھ گیا کہ اسکرین کیوں خالی تھا۔ وہ لڑکا تیز روشنی
سے گھبرا کر سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ بیرڈ نے آدھا کراؤن انعام
کے طور پر اُسے دیا اور سمجھایا کہ اس روشنی سے اُسے کوئی
نقصان نہ پہنچے گا۔ دوبارہ وہ اس کمرے میں گیا اور اسکرین
کو دیکھا۔ اس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ سامنے اسکرین
پر لڑکا کھڑا اُسے صاف نظر آ رہا تھا۔ آخرکار اس کی
کوشش رنگ لائی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

اب جب کہ ٹیلی ویژن ہندوستان میں بھی پہنچ گیا ہے
بلکہ تیار بھی ہونے لگا ہے، آپ لوگ جب بھی اُسے دیکھیں
بیرڈ کو یاد کیجیے گا۔

ستید حسن مہر (مرادآباد)

دہلی سے دوسرے شہروں کا فاصلہ

(۱)	آگرہ	۱۴۳ میل	(۱۳)	حیدرآباد	۱۰۴۴ میل
(۲)	احمدآباد	۵۳۹ میل	(۱۴)	جے پور	۱۸۰ میل
(۳)	اجمیر	۲۳۵ میل	(۱۵)	جھانسی	۲۵۶ میل
(۴)	الہ آباد	۳۹۱ میل	(۱۶)	جالندھر	۲۲۶ میل
(۵)	انبالہ کینٹ	۱۲۳ میل	(۱۷)	لکھنؤ	۳۰۳ میل
(۶)	امرتسر	۲۷۸ میل	(۱۸)	مدراس	۱۳۶۱ میل
(۷)	بنارس	۴۷۳ میل	(۱۹)	ناگپور	۶۷۹ میل
(۸)	بھوپال	۴۳۷ میل	(۲۰)	پٹنہ	۶۲۳ میل
(۹)	بمبئی	۸۶۱ میل	(۲۱)	شیلانگ	۱۰۴۹ میل
(۱۰)	کلکتہ	۹۰۲ میل	(۲۲)	شملہ	۲۴۰ میل
(۱۱)	کٹک	۱۱۱۴ میل	(۲۳)	ترپوندرم	۱۸۷۱ میل
(۱۲)	دہرہ دون	۲۱۰ میل	(۲۴)	کان پور	۲۷۳ میل

مشیدہ پروین برلی

لطیفہ

ننھا: "ہمارے پاس ایک ایسی موٹر ہے جس میں ڈرائیور خود نہیں بیٹھتا۔"

پپّی: "تو موٹر چلتی کیسے ہے؟"

ننھا: "چابی بھرنے سے!"

افضل امام

قلمی دوستی

نام:۔ نگار آرا تسنیم
عمر:۔ ۱۶ سال
مشغلہ:۔ شعر کہنے کی مشق، لڑکیوں سے قلمی دوستی
پتہ:۔ "شبستاں" چوکھنڈی سہسرام شاہ آباد۔ بہار

نام:۔ سانڈو دیوگاؤں کر
عمر:۔ ۱۶ سال
مشغلہ:۔ پیام تعلیم پڑھنا، بچوں کے دوسرے رسالے پڑھنا کہانیاں لطیفے لکھنا، انعامی مقابلوں میں حصہ لینا۔
پتہ:۔ محلہ پینڈار پورہ، پوسٹ کاسودہ۔ تعلقہ ایرنڈول ضلع جلگاؤں۔ (مہاراشٹر اسٹیٹ)

نام:۔ کے۔ ایم۔ سعد اللہ
عمر:۔ ۱۵ سال
مشغلہ:۔ بچوں کے رسالے پڑھنا، اخبار پڑھنا والی بال کھیلنا۔ لڑکوں سے قلمی دوستی۔
پتہ:۔ ۱۱۵۔ اقبال روڈ۔ سلمپور وانمباڑی

نام:۔ دلشاد الٰہی
عمر:۔ ۱۴ سال
مشغلہ:۔ افسانے لکھنا، پیام تعلیم اور دوسرے رسالوں کا پڑھنا بہن بھائیوں کے خطوں کا جواب دینا۔
پتہ:۔ دلشاد الٰہی۔ اسلم منزل ۲۔ مدرسہ ثانوی جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۔ ۲۵

نام:۔ آصف الدین خاں
عمر:۔ ۱۴ سال
مشغلہ:۔ پیام تعلیم پڑھنا، کیرم کھیلنا، نیک لوگوں کی کہانیاں پڑھنا، قلمی دوستی کرنا، پتنگ اڑانا۔
پتہ:۔ جماعت ہفتم، اردو مڈل اسکول، بارسی ٹاکلی معرفت ولایت اللہ خاں پٹھان ضلع اکولہ مہاراشٹر۔

نام:۔ خیر النساء بی
عمر:۔ ۱۳ سال
مشغلہ:۔ پیام تعلیم، کھلونا وغیرہ بچوں کے رسالے پڑھنا۔ ملکی، غیر ملکی ٹکٹ جمع کرنا۔
پتہ:۔ خیر النساء بی معرفت ایم شبنم کارواری کوکنی سالسیٹ۔ گوآ۔

نام:۔ عبد الباری عارف
عمر:۔ ۱۵ سال
مشغلہ:۔ پیام تعلیم پڑھنا، بہنوں سے کشیدہ کاری سیکھنا، شعر و شاعری سے لگاؤ۔ سچے دوستوں کو تحفے تحائف بھیجنا
پتہ:۔ عبد الباری ولد عبد الحفیظ وارث پورہ (فیضوگنج) پوسٹ آفس کامٹی۔ ضلع ناگپور (مہاراشٹر)

آدھی ملاقات

جناب حسان صاحب

دس جنوری کی خوبصورت صبح دوسرے خطوں کے ساتھ پیام تعلیم کا پیارا سالنامہ لائی۔ میں نے سارے خطوط ایک طرف رکھے اور پیام تعلیم پڑھنا شروع کر دیا۔ شکر ہے کہ اس دن میں چھٹی پر تھا ورنہ غضب ہی ہو جاتا۔ کیوں کہ سالنامہ پڑھتے پڑھتے جو چونکا ہوں تو ایک بج چکا تھا۔

اس بار معلوماتی مضامین آپ نے زیادہ دیے ہیں مگر ساری چیزیں بے حد دلچسپ ہیں۔ خاص طور پر نظمیں، مشورہ سیر و شکار، ماموں جان کے دانت، ہزار کھم کا دیول، کالو لو خرگوش اور کشمیر پر مضمون بہت عمدہ ہیں۔

ٹائٹل پیج بھی بڑا خوبصورت ہے۔

سالنامہ ۶۹ء پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ ... ہاں آپ حیدرآباد تشریف لائے اور آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وقار خلیل صاحب نے جو اطلاع دفتر میں کی تھی وہ مجھے بہت بعد میں ملی۔ میں ان دنوں یعنی پہلی جنوری سے ۲۰ جنوری تک چھٹی پر تھا۔ شرف ملاقات سے محرومی کا بے حد افسوس ہے۔

اظہر افسر

حیدرآباد

سالنامہ کی عنایت کا شکریہ بعد میں ادا کروں گا پہلے آپ سے شکایت ہے کہ آپ نے حیدرآباد آکر بھی مجھ غریب کو یاد نہیں فرمایا۔ ایوان اردو میں آپ کے اعزاز میں ایک محفل ہوئی میں اسی دن ایوان اردو آنے والا تھا لیکن اتفاق سے اپنے ایک دوست انور رشید کے پاس چلا گیا جہاں اثر فاروقی صاحب کے اعزاز میں ایک محفل کا پروگرام ہو گیا۔ دوسرے دن جب ایوان اردو پہنچا تو معلوم ہوا آج ہی آپ دہلی روانہ ہو گئے۔ بے حد افسوس ہوا کہ آپ سے نیاز حاصل نہ کر سکا۔ خیر پھر کبھی سہی۔ انشاء اللہ۔

سالنامہ پہلے صفحہ سے لیکر آخری صفحہ تک دیکھا۔ اب سوچ میں ہوں کہ کس کس کہانی، نظم اور مضمون کی تعریف کروں۔ سبھی ایک دوسرے پر سبقت لیے ہوئے ہیں۔ "نیا سال" کا "مشورہ" قبول کرتے ہوئے "تین سوال" حل کر کے جب "ہزار کھم کے دیول" میں داخل ہوتا ہوں تو "شاطر لڑکا" روک لیتا ہے کہ "ہم بچے" "حسین کرنیں ہیں اور" جب ہم اسکول جانے لگتے ہیں" تو ہماری "آرزو" ہوتی ہے کہ "ہم اپنا وعدہ پورا کریں"۔ "کالو لو خرگوش" اپنی میٹھی زبان میں اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اُسے ساتھ لے کر جب آگے بڑھتا ہوں تو "مکڑیاں" جالے تن دیتی ہیں۔ بہت "تکرار" ہوتی ہے لیکن چونکہ "جانوروں میں حفاظت کے طریقے" بڑے مدلل ہوتے ہیں اس لیے "چورا ہے" سے ہوتے ہوئے واپس آجاتا ہوں۔

یہ رہا سالنامے کا سفر۔ خدا کرے زندگی میں ایسے سفر بار بار آئیں اور آپ جیسا ہمسفر بھی ساتھ ہو تو کیا کہنے۔

رؤف خیر۔ حیدرآباد

سالنامہ ملا۔ بہت بہت شکریہ۔

یہ سالنامہ عام طور پر پسند کیا جا رہا ہے اور یہ سب

...گی کوششوں کا پھل ہے۔

شاہد، بمبئی

نوازش نامہ اور پیام تعلیم موصول ہوئے۔ سالنامہ نوازی کا شکریہ۔ سالنامہ سابقہ آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ ٹائیٹل پیج لاجواب ہے۔ نقشِ اول (سالنامہ ۶۸ء) سے نقشِ ثانی سبقت لے گیا۔ اتنے اچھے ٹائیٹل کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے۔

مضامین ہر اعتبار سے معیاری، معلوماتی اور علم افزا ہیں۔ مندرجہ ذیل دو چار مضامین خصوصی طور سے بے حد پسند آئے یہ مضامین چھوٹوں سے زیادہ بڑوں کے لیے مفید ہیں جیسے مغلوں کے سیر وشکار، "ہزار کم کا دیول"، "قلندر"، "کاغذ کی کہانی" "کشمیر میں چند دن"، "ہیلن کیلر" وغیرہ ان کے علاوہ نیر صاحب یوسف ناظم صاحب، سید ابو تمیم فرید آبادی صاحب، سیف سہسرامی صاحب، آصفہ مجیب صاحبہ، غلام یزدانی صاحب کی تخلیقات پسند آئیں۔

سالنامے کے لیے اتنے اچھے معیاری اور بہترین ادیبوں کی تخلیقات کے لیے بھی مبارکباد قبول فرمائیے۔ باوجود چند پریشانیوں کے آپ نے یہ حسین گلدستہ اس خوبصورتی سے سجایا ہے کہ کوئی بھی معیار شناس قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خدا کرے آئندہ بھی آپ اس کے معیار کو اسی انداز سے قائم رکھیں تاکہ آنے والی شاندار نسل ملک اور قوم کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔ پیام تعلیم ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ ایک ادارہ ہے، ایک مکتب ہے "ایک مدرسۂ علم وفن ہے جس کے ذریعہ نونہالانِ وطن اپنے دل ودماغ کو ہر اعتبار سے روشن رکھ سکتے ہیں۔ خدا کرے پیام تعلیم کی اشاعت اور زیادہ ہو اور ملک کے گوشے گوشے میں یہ پہنچ سکے اور اپنی روشنی سے تمام نونہالانِ وطن کے دل ودماغ کو روشن کرے۔

دو ایک خریداروں کا چندہ بہت جلد بھجواؤں گا۔ کچھ پرانے پرچے بھیج سکیں تو بھیج ہی دیں۔

مقیم شاد مونگیری

پیام تعلیم کا سالنامہ ملا۔ یوں تو یہ تاخیر سے ملا لیکن 'دیر آید درست آید' کے مصداق ہوا۔ سالنامہ کیا تھا۔ حسین سے پھولوں کا حسین سا گلدستہ۔ سرورق بھی کافی دیدہ زیب ہے مواد کا تو خیر پوچھنا ہی کیا۔ کتنے اچھے اچھے فن کار آپ نے جمع کیے ہیں۔ بھئی اتنے اچھے اچھے لوگوں سے آپ کیسے لکھوا لیتے ہیں۔ آج کل اردو جس کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزار رہی ہے اگر آپ جیسے اردو نواز حضرات کا بھی یہ تھوڑا سا سہارا نہ ملے تو پتہ نہیں اس کی کیا حالت ہو۔

زیر نظر شمارے کے یوں تو سبھی مضامین اچھے ہیں پھر بھی کچھ خاص طور پر پسند آئے ہیں۔ "بجلی کے کھیل"، "کشمیر میں چند دن"، "دنیا کی سب سے ننھی چڑیا" اور "کتاب کی کہانی" نظموں میں "نیا برس"، "آنسو" اور "بہادر ہوں میں" کافی سے زیادہ پسند آئیں۔

شفق بہرامڈوی

سالنامہ پیام تعلیم رجسٹری سے ملا۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ میری طرف سے سرورق بنانے والے صاحب کو مبارکباد قبول ہو۔ تمام مضامین اور نظمیں پسند آئیں۔ خاص کر مضمونوں میں کالو لو خرگوش، بھوت، بندر اور شیر، سمجھدار سوداگر، روسی کہانیاں، شاطر لڑکا، سبق اور مشورہ اور نظموں میں حضور کی پیدائش، علم، بھارت درشن، آرزو، نیا سال اور نیا سال مبارک بے حد پسند آئیں۔ میری طرف سے ان کے

لکھنے والوں کی خدمت میں مبارک باد۔

سالنامہ بالکل معلوماتی بن گیا ہے جناب دینا ناتھ گرد ہر، جناب جمیل الدین قریشی، جناب منوہر پرشاد ماتھر، محترمہ شاکرہ ندیم، محترمہ فرزانہ انصاری، جناب خالد عرفان، جناب قیصر سرمست، جناب محمد ابراہیم، جناب اقبال مہدی اور جناب فرحت قمر کے معلوماتی مضامین سے ہماری بہت معلومات بڑھی۔ سالنامے میں قلمی دوستی، بچوں کی کوششیں اور گلاب کی کمی محسوس ہوئی لیکن یہ سالنامہ علمی، ادبی، معلوماتی اور تفریحی تخلیقات کا ایک انمول نمونہ ہے۔ میری طرف سے آپ کو اتنا اچھا سالنامہ نکالنے پر مبارکباد۔ اور تمام حصہ لینے والوں کی خدمت میں سلام و آداب قبول ہو۔ میں خریدار بنانے کی کوشش میں ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی خریدار روانہ کروں گا۔

افضل امام کلکتہ

نئی نویلی دلہن کے روپ میں قلم کاروں کی گراں قدر تخلیقاتی زیورات سے آراستہ ۱۹۶۹ء کا دیدہ زیب سالنامہ موصول ہوا۔ شکریہ یہ بھی غرض تجارت ہو یا مقصد خدمت بہر کیف کوئی کچھ بھی سمجھے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی کامیاب کوششیں اردو کی بقا اور اس کی ترقی پذیر خواہشوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتی ہیں کہ کمر توڑ گرانی کے اس مشکل ترین عالم میں بھی "پیامِ تعلیم" کو آپ غریب انسانوں کی قوتِ خرید کے مطابق جاری وساری رکھنے کے حوصلہ افزا قدم بڑھاتے جا رہے ہیں۔

محمد شفیع تمنّا

محترم حسین حسان صاحب تسلیم

[illegible]

ایک طرح کا معلوماتی ذخیرہ تھا۔ ٹائٹل البتہ پچھلے سال کے سالنامے کا مقابلہ نہ کر سکا۔ بہرحال اچھا ہے۔ نظموں میں 'نیا سال آیا'، 'حضور صلعم کی پیدائش'، 'حسین کرلو'، 'علم'، 'تکرار'، 'طلباء سے خطاب' بے حد پسند آئیں۔ ویسے ہر نظم بہترین ہے۔ مضمونوں و کہانیوں میں خاص کر 'شاطر لڑکا'، 'سیر کا سوا سیر'، 'آٹوگراف جمع کرنا'، 'کالو لو خرگوش'، 'مکڑیاں'، 'بجلی کے کھیل'، 'اڑن کھٹولے سے جیٹ جہاز تک'، 'بھوت' بے حد پسند آئیں ویسے ہر مضمون، ہر کہانی اچھی ہے۔

دنیا کی سب سے ننھی چڑیا والے مضمون میں ادیب نے چڑیا کو صرف 'ہمنگ برڈ' کے نام سے پکارا ہے جب کہ اردو میں اسے 'پھلچسپی' اور 'پھل سنگھی' کے نام بھی دیے گئے ہیں۔

آخر میں پیامِ تعلیم اور آپ کی درازیٔ عمر کے لیے دعا کرتا ہوں۔ خدا آپ کو اور پیامِ تعلیم کو یونہی ہزار ہا برس تک زندہ رکھے۔

سید حسن مہر

سالنامہ موصول ہوا۔ شکریہ۔

سرورق اس بار بھی لاجواب ہے۔ مضامین کہانیاں اور نظمیں، ایک دو کو چھوڑ کر، سب ہی پسند آئیں۔ اپنی شاندار کامیابی پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

ایم۔ این۔ خاں امروہوی

سالنامہ نظر نواز ہوا۔

گزشتہ سال کی طرح اس سال کا سالنامہ بھی برسوں یاد رہے گا۔ ٹائٹل وغیرہ دیدہ زیب ہیں۔ مضامین کہانیاں اچھی ہیں، اچھوتی ہیں۔ غرضیکہ سالنامہ ایک یادگاری تحفہ ہے اس سلسلے

[illegible]

اِدھر اُدھر سے

پچھلے پرچے میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ امریکہ کے نئے صدر کی تنخواہ (سالانہ) دُگنی کر دی گئی ہے۔ انھیں اب ایک لاکھ کی جگہ دو لاکھ ڈالر (سالانہ) ملا کریں گے۔ لگ بھگ پندرہ لاکھ روپے سالانہ۔

عام طور سے یہ خیال تھا کہ دنیا کے سب سے زیادہ دولت مند ملک کے صدر کی تنخواہ سب سے زیادہ ہوگی مگر ایسا نہیں ہے۔

دیکھیے، مسٹر رچرڈ نکسن (موجودہ صدر) اس ملک کے صدر ہیں جس کا رقبہ ۳۵ لاکھ مربع میل ہے۔ انھیں کُل ۸۰ ہزار پونڈ تنخواہ ملتی ہے۔ اس کے مقابلے میں گرانڈ ڈیوک آف لکسم برگ کو ۲۰ ہزار پونڈ زیادہ ملتے ہیں اور جناب لکسم برگ کا رقبہ کل ایک ہزار مربع میل ہے۔

اسی پر بس نہ کیجیے، اور بہت سے چھوٹے ملکوں کے سربراہوں یا صدروں کی تنخواہیں بھی امریکہ کے صدر سے زیادہ ہیں، بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سب سے پہلا نمبر تو ہالینڈ کی ملکہ جولیانا کا ہے۔ انھیں پانچ لاکھ پونڈ سالانہ ملتے ہیں۔ یہ رقم انگلستان کی ملکہ کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہے انھیں چار لاکھ پچھتر ہزار پونڈ ملتے ہیں۔ بلجیم جیسے ننھے سے ملک کے بادشاہ کو تین لاکھ پچاس ہزار پونڈ ملتے ہیں۔ سویڈن ناروے اور ڈنمارک کے بادشاہوں کو ڈھائی ڈھائی لاکھ پونڈ سالانہ ملتے ہیں۔

یورپ کے ان ملکوں کے مقابلے میں جاپان کے بادشاہ ہیروہتو کو کل ایک لاکھ پونڈ ملتے ہیں۔ حالاں کہ جاپان ان چند ملکوں میں ہے جو صنعت اور تجارت میں حیرت انگیز تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

لیکن دنیا میں سب سے اونچی تنخواہ کے معاملے میں یہ بڑے بڑے لوگ بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ سب سے بڑی تنخواہ جاپان کے ایک مینوفیکچرنگ کیسٹ کو ملتی ہے اور یہ ہے جناب سات لاکھ نوّے ہزار پونڈ۔

مگر ابھی بات ختم کہاں ہوئی۔ ایک اور بزرگ ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہ سب بڑے بڑے لوگ ہیچ اور بونے نظر آتے ہیں اور یہ ہیں شکاگو کے چور بازاری کے بے تاج بادشاہ آل کاپون — کہتے ہیں ۱۹۲۷ء میں فقط ایک شراب کے ناجائز کاروبار سے انھیں چار کروڑ تیس لاکھ پونڈ کی آمدنی ہوئی تھی۔

دُم اُگ رہی ہے۔

ڈنڈ کارنیہ (مدھیہ پردیش) کے علاقے میں ایک قبائلی لڑکے کے دُم اُگ رہی ہے۔ اس ۱۴ سالہ لڑکے کا نام سن میا ہے۔ وہ نرسیا گونڈ کا لڑکا ہے اور بھوپال پٹنم تحصیل کا

رہنے والا ہے۔ یہ تحصیل بستر ضلع کے بالکل جنوب میں ہے بستر کے سول سرجن ڈاکٹر اے سی گوڑ کا بیان ہے کہ لڑکے کے باقی اعضا بالکل ٹھیک ہیں اور عمر کے ساتھ اس کی دم بھی بڑھ رہی ہے۔ ڈاکٹر گوڑ نے ہماری اسپتال میں اس کا معائنہ کیا اور بتایا کہ دم نرم گوشت کی ہے اور جہاں ریڑھ کی ہڈی ختم ہوتی ہے وہاں ایک انچ ہے۔ ڈاکٹر نے یہ بھی بتایا کہ لڑکے کو دم کو حرکت دینے پر قابو نہیں لیکن جب وہ چلتا ہے تو دم ہلتی ہے۔ اس دم میں کوئی ہڈی نہیں ہے اور نہ ریڑھ کی ہڈی میں کوئی خرابی ہے۔ دم میں درد، گرمی اور چھونے کا احساس باقی جسم کی طرح موجود ہے۔

(انتخاب)

انجینیرنگ کا معجزہ

بون (ڈاڈ) ابوسمبل کے مشہور تاریخی مندر کو اس کی اصلی جگہ پر سے جو دریائے نیل پر نیا بند بندھ جانے کی وجہ سے غرقاب ہوگیا ہے، تقریباً ۷ میٹر بلند نئی جگہ پر منتقل کرنے کا کام مکمل ہوگیا ہے۔ اس تصویر میں فراعنہ مصر کی اس تین ہزار سال پرانی یادگار کے بانی رامسیس کے دو مجسمے ہیں جو ابوسمبل کی نادر چیزوں میں بہت ہی زیادہ قیمتی اور نادر ہیں۔

دھوپ اور بارش کے لیے چھت والی سائیکل

میونخ (ڈاڈ) وفاقی جمہوریہ جرمنی میں سائیکل پر سیر کرنے کا شوق دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ پہلے پہل جو لوگوں نے اپنے جسم کو تندرست رکھنے کی خاطر چلانے فیشن کی ار، گاڑی کو جس کا استعمال وفاقی جمہوریہ جرمنی میں دھیرے دھیرے کم ہونے لگا تھا، دوبارہ اختیار کرنا شروع کیا۔ پھر ڈاکٹروں کے صلاح و مشورے سے دفتروں میں کام کرنے والے مرد بھی اکثر کھلی ہوا میں ورزش کرنے کی خاطر سائیکل چلانے لگے ہیں۔ اس تصویر کے دونوں صاحبان نے اپنی سائیکل پر دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے ایک چھت لگا لی ہے یہ دونوں حضرات ہمارے فوٹوگرافر کو کوہستان آلپس کے دامن میں سیر کرتے ملے تھے۔

(اطلاعاتِ جرمنی)

سائیکل کے موجد ہیرفان، ڈرائس کے بھیس میں

کولونیہ (ڈاڈ) وفاقی جمہوریہ جرمنی کے شہر کولونیہ میں بائیسکل اور موٹر سائیکل کے امسالہ بین الاقوامی میلے میں ایک نوجوان نے سائیکل کے موجد فرائی ہیر ڈرائس فان کے بھیس میں انہی کی ۱۸۱۷ء میں ایجاد کردہ مشین پر سوار ہوکر صحافیوں اور فوٹوگرافروں کے سامنے اس تاریخی واقعہ کا منظر کھینچنے کی خاطر نمائش گاہ کے ایک دو چکر لگائے۔ اس سال کے میلے میں اس صنعت کے جدید ترین ماڈلوں کے پہلو بہ پہلو کئی اصلی اور نادر ماڈلوں کی مدد سے اس کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کا ایک نہایت ہی دلچسپ اور قابلِ دید جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈرائس صاحب کی اولین کوشش کے علاوہ یہاں ۱۸۵۳ء کی پہلی پیڈل والی اور اونچی نیچی گدے دار کرسی والی اور لیٹ کر چلانے والی عجیب و غریب سائیکلوں کے بھی مشہور ماڈل شامل ہیں۔

(اطلاعاتِ جرمنی)

ایک شہر کا دسترخوان

ایک شہر میں شلاً ماسکو میں صرف ایک دن میں کھانے پینے کا کتنا سامان صرف ہوتا ہے اور یہ دسترخوان چنتا کون ہے؟

۲ہزار سے ۲ہزار ۲سوٹن تک ڈبل روٹی، ڈھائی ہزار ٹن گوشت اور مچھلی۔ ۸سوٹن شکر اور تقریباً ۲سوٹن نمک۔ اور یہ سب حلق سے اتارنے کے لیے ایک ہزار ۸سو ٹن دودھ اور پھلوں کے عرق۔ جن کے لیے تقریباً ۲ہزار دوکانیں ہیں جنھیں سیکڑوں گاڑیاں مال فراہم کرتی ہیں۔

(خبرنامہ شعبۂ اطلاعات سفارت خانہ سوویت یونین)

جناب اظہار الحق

باغبانی

مارچ میں باغیچہ کے کام کی تفصیل

لان :- وہی پرانا کام یعنی پانی وغیرہ دیتے رہنا۔ اب گھاس ذرا تیزی سے بڑھتی ہے اس لیے اس کو کاٹنے کا کام بھی جلدی جلدی کرنا ہوتا ہے۔

گملوں کے پودے :- بلب وغیرہ (گلوکسینیا، اللیم، ازری سس، ڈہلیا وغیرہ) کو پانی دینا بند کر دیا جائے۔ جیسے ہی ان کی پتیاں اور تنے سوکھ جائیں ان کو مع گملوں کے خشک گودام میں رکھ دیا جائے۔ کیلیڈیم، ارم، گلوریوسا وغیرہ کے بلبوں کو بویا جائے۔

موسمی پھلواری :- پانی دیتے رہنا، لیکن جو پودے پھول دے چکے ہیں ان میں پانی بند کر دینا چاہیے۔

گلاب :- پانی دینا، گوڑائی کرنا، جن پودوں پر چشمے چڑھائے گئے تھے ان میں سے جو مر گئے ان پر دوبارہ مہینے کے شروع میں چشمے چڑھانا چاہئیں۔

گل تسبیح :- پانی دینا اور گوڑائی کرنا۔

آرائشی جھاڑیاں :- پوئن سیٹیا، ہوس کیولڈیا، ہیلوٹیا، ایکیفا وغیرہ جو پھول دے چکے ہیں ان کی چھنٹائی کرنا اور کٹنگ لگانا۔

گل داؤدی :- پانی دینا، نکائی اور گوڑائی کرنا (گملوں میں جو چھوٹے پودے ہیں) دوپہر کی تیز دھوپ سے بچانا۔

پھل :- لوکاٹ میں خوب پانی دینا۔ جن پودوں پر پھول آرہے ہیں ان کو پانی بالکل نہ دیا جائے۔ جب پھل بن جائے تب پانی دینا۔ کھٹا، پپیتہ اور امرود کے بیج بونا۔ آڑو اور ترشاوہ میں چشمے چڑھانا۔ لیچی کے دیتے اور گوٹی لگانا۔ اگر پانی کی افراط ہے تو پھلوں کے پودے لگانا۔

ترکاریاں :- اگر گرمیوں کی سبزیاں ابھی تک نہیں بوئی گئی ہیں تو پہلے ہفتے میں بوائی ختم کر دینی چاہیے۔ کیاریوں میں پانی دینا اور نکائی و گوڑائی کرنا۔

باقی مضمون "اگر بجلی نہ ہوتی تو"

بجلی نے انسانی ترقی کو وہ بلندی عطا کی ہے کہ انسان کے وہ خواب جو وہ صدیوں سے دیکھتا آیا تھا صرف بجلی کے ذریعہ ہی پورے ہوئے ہیں۔ پرانے زمانے کے قصوں میں آپ نے علاء الدین کے چراغ کے بارے میں سنا ہوگا جس کا جن گھنٹوں کے کام کو منٹوں میں کردیتا تھا۔ یہ بجلی بھی ہمارے دور کا جن ہے۔ یہ بھی گھنٹوں کے کام کو منٹوں بلکہ سکنڈوں میں کر دیتی ہے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے جمال پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی
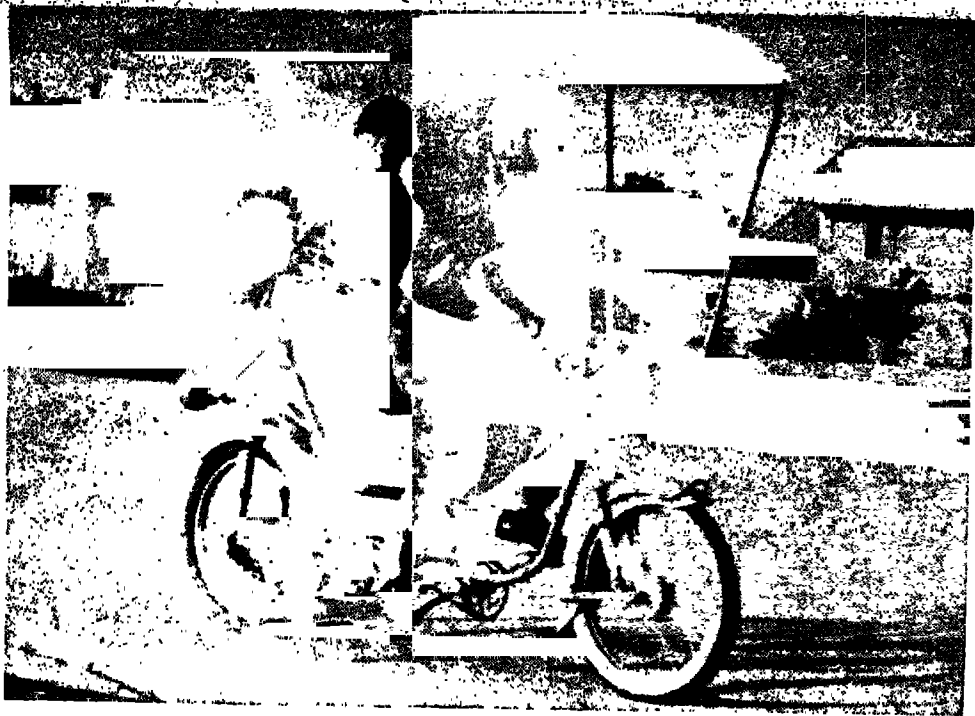
تصویریں (بشکریہ اطلاعاتِ جرمنی)

Regd. No. D. 1457 MARCH 1969

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.

اِن کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے

گورے دادا	۱/۷۵	دہلی	۱/۵۰
سمندر کے نیچے	۲/-	ہماری پارلیمنٹ	۱/۵۰
سمندر کے کنارے	۱/۱۲	برف کا گھر	۰/۸۷
میر انیس	۱/۲۵	برف کے تیرتے پہاڑ	۰/۳۷
میر تقی میر	۱/-	آستین کا سانپ	۰/۵۰
ابّو خاں کی بکری	۲/۵۰	اُلٹی دوا	۰/۵۰
انوکھا عجائب خانہ (مکمل)	۱/۸۰	بادشاہ کے کپڑے	۰/۵۰
تین اناڑی	۱/۴۰	زمین کی گردش	۰/۵۰
ستاروں کی سیر	۱/۷۵	سونے کی چڑیا	۱/-
خرگوش کا سپنا	۱/۷۵	چمپاوت کا آدم خور شیر	۰/۳۵
جن حسن عبدالرّحمٰن (مکمل)	۴/-	ایک ٹانگ کا بادشاہ	۰/۳۰
آدمی کی کہانی	۱/۲۵	انوکھی ملاقات	۰/۳۵
بڑے دادا کی کہانی	۰/۵۶	جلّو مرغابی	۱/-
چٹانوں کی کہانی	۱/۷۵	گلّا بوجھیّا	۰/۴۵
دادا نہرو	۱/۵۰	ظالم کسان	۰/۳۵

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار، دہلی ۶

نیشنل مطبوعہ فائن پریس دلی

قاعدہ

یَسَّرْنَا الْقُرْاٰن

یہ قاعدہ مکتبہ جامعہ نے تعلیمی اصولوں کے پیش نظر نئی ترتیب کے ساتھ نئے سرے سے مرتب کیا ہے۔ غیر ضروری چیزیں کم کی گئی ہیں۔ سبقوں اور مشقوں میں مفید اضافے کیے گئے ہیں۔

ہر سبق کے شروع میں پڑھانے والوں کے لیے آسان اور مختصر ہدایتیں دی گئی ہیں جن کی مدد سے معمولی اردو جاننے والے والدین بھی اپنے بچوں کو آسانی کے ساتھ بہت کم مدت میں قرآن مجید پڑھا سکتے ہیں۔

اِن خوبیوں کی وجہ سے اِس قاعدے کی افادیت بازار میں ملنے والے عام قاعدوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

سفید گلیز کاغذ .... آفسٹ کی چھپائی

پیامِ تعلیم نئی دہلی
جلد ۶
اپریل ۱۹۶۹ء
شمارہ ۴
ایڈیٹر
محمد حسین حسّان (ندوی)
قیمت فی پرچہ
۶۰ پیسے
قیمت سالانہ
۶ روپے
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دہلی ۶
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ علیگڈھ
صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

فہرست

بچوں سے باتیں

پچھلے پرچے میں ہم نے اپنے پیامیوں سے پیام تعلیم کے خریدار بڑھانے کی درخواست کی تھی خوشی کی بات ہے کہ خود ہمارے مکتبے کے ساتھی اس سے بہت متاثر ہوئے۔ ہمارے آرٹسٹ گلیڈون لیسی صاحب نے ایک خریدار مرحمت فرمایا اور آئندہ کے لیے وعدہ کیا۔ تین خریدار جناب عبدالوحید خاں صاحب نے اور دو خریدار جناب شوکت صاحب نے مرحمت فرمائے۔ شوکت صاحب اب تک بہت سے خریدار مرحمت فرما چکے ہیں اور برابر کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ان کے علاوہ تین خریدار جناب معین الدین صاحب (استاد ٹیچرس کالج) اور دو خریدار جناب قاضی احمد عمر صاحب نے مرحمت فرمائے۔ بارہ خریداروں کا وعدہ عرفان شبلی اور جاوید اشرف صاحب نے کیا ہے۔ خدا انھیں اس وعدے کو پورا کرنے کی جلد توفیق عطا کرے۔

آج کل آپ امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا ہوگا پھر بھی اپنے پرچے کے لیے تھوڑا بہت وقت نکال لیجے آپ کی تھوڑی سی محنت اور توجہ سے ہماری بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔

پچھلے پرچے میں ہم نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ ایک، دو یا تین خریدار بنانے والوں کے نام ہم پرچے میں شائع کریں گے۔ پانچ خریدار بنانے والے پیامیوں کو پیام تعلیم سال بھر کے لیے مفت نذر کیا جائے گا۔ ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ خریدار بناتے وقت اس وعدے کو بھی ذہن میں رکھیے گا۔

اس پرچے میں ہم آپ کے لیے ایک خاص مضمون شایع کر رہے ہیں "کیسے یاد کریں؟" آج کل سبھی پیامی امتحان کی پریشانی میں مبتلا ہوں گے اور دن رات پڑھنے پڑھانے

کا' پڑھے ہوئے کو یاد کرنے کا شغل ہوگا ایسے میں یہ مضمون آپ کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس مضمون کو خوب غور سے پڑھیے اور اس میں بتائی ہوئی باتوں پر عمل کیجیے۔ پھر دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

چچا آبا کے روزے کی داستان پیامیوں کو بہت بھائی۔ اس کا دوسرا حصہ اس پرچے میں پڑھیے۔ پر داستان تو اب بھی ختم نہیں ہوئی۔ آخری قسط اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

ستمبر (۶۸ء) کے پیام تعلیم میں آپ ایک روسی لوک کہانی پڑھ چکے ہیں۔ اس پرچے میں اسی سے ملتی جلتی اپنے دیس کی لوک کہانی پڑھیے۔ مقصد دونوں کا ایک ہے۔ بس لکھنے کا ڈھنگ الگ الگ ہے۔ ویسے ہے یہ بھی بہت دل چسپ!

ایک اور مضمون ہے "افواہیں کیسے پھیلتی ہیں" مضمون نگار صاحب نے حساب خوب لگایا ہے۔ موقع ہو تو آپ بھی تجربہ کرکے دیکھیے۔

ایک اور دل چسپ اور معلوماتی مضمون "آسٹریلیا کے انوکھے جانور" ہے۔ یہ بھی ذرا لمبا تھا۔ دو قسطوں میں کر دیا گیا ہے۔ اگلا حصہ اور بھی دل چسپ ہے۔ "اتر پردیش" بھی آپ کو پسند آئے گا۔

اوپر بتائی ہوئی کہانیوں کے علاوہ "چار دوستوں کی کہانی" پڑھیے "چاند کی بڑھیا" پڑھیے، ضیا، جعفر کا ڈرامہ "فرشتہ" پڑھیے اور ---- اور "رائی کا پہاڑ" یہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ مرزا غالب غیرسے اس پرچے میں بھی موجود ہیں "مرزا غالب خط کیسے لکھتے تھے۔" یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے اردو نثر لکھنے والوں کو ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔

اور ہاں بھئی باتوں باتوں میں آپ ہماری پہلی بات نہ بھول جائیے گا ---- وہی خریدار بنانے والی بات۔ یہ بات ضروری ہے، اشد ضروری ہے۔ ہمیں اس وقت ایک ہزار خریدار چاہییں۔ اور یہ ایک ہزار خریدار آپ کی ذرا سی توجہ ذرا سی کوشش سے ہمیں مل سکتے ہیں یقیناً مل سکتے ہیں۔

دفتر سے خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے!

جناب سعادت نظیر

تارو!

آؤ، اے آسمان کے تارو
آؤ، مل جل کے کھیلیں، ہم پیارو

تم سے روشن ہے آسماں، تارو
ہم سے آباد ہے جہاں، تارو

تم بھی ننھے ہو ہم بھی ننھے ہیں
تم بھی اچھے ہو ہم بھی اچھے ہیں

تم میں انداز سب ہمارے ہیں
ہم میں انداز سب تمھارے ہیں

تم ہمارے ہو، ہم تمھارے ہیں
اور ہم سب جہاں کے پیارے ہیں

آگے اپنا قدم بڑھاتے ہوئے
اور خوشیوں کے گیت گاتے ہوئے

آؤ، اے آسمان کے تارو
آؤ مل جل کے کھیلیں ہم پیارو

جناب خاور جبل پوری

رائی کا پہاڑ

رات کا کھانا کھا کر کوئی ۸ بجے گھر سے لگ بھگ ۳ میل دور لائبریری جانا، اخبار اور رسالے پڑھنا اور وہاں سے کتابیں انتخاب کر کے لانا میرا ہمیشہ کا معمول ہے۔ چاہے کیسا ہی سخت موسم ہو، آندھی چلے، پانی برسے کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہو مگر اتوار کی تعطیل کے علاوہ کوئی دن ناغہ نہیں ہوتا۔ اس طرح خاصی چہل قدمی بھی ہو جاتی ہے اور اپنا شوق بھی پورا ہو جاتا ہے۔

پچھلے سنیچر کو سچ مچ کڑاکے کی سردی تھی۔ گرم کپڑے پہن کر انگیٹھی کے پاس بیٹھنے پر بھی ہاتھ پیروں میں گرمی نہیں آ رہی تھی۔ ادھر ۲ دن سے شدید زکام ہو رہا تھا۔ چھینکتے چھینکتے ناک میں دم آ گیا تھا۔ سارا بدن ٹوٹ رہا تھا، بار بار جماہیاں آ رہی تھیں۔ ہلکا ہلکا بخار (یا حرارت) بھی معلوم ہو رہا تھا

ارادہ تھا کہ کھانا کھا کر چائے پیتے ہی لحاف میں گھس جاؤں لیکن دوسرے دن اتوار تھا۔ اتوار کو لائبریری نہیں کھلتی اور مجھے مطالعے کے لیے کچھ کتابیں لانی تھیں ورنہ تعطیل کا دن نکل جاتا۔

سوچا کہ اس طوفانی موسم میں گھر سے باہر کون نکلے مگر پھر ہمت باندھ کر ٹارچ ہاتھ میں لے کر لائبریری جانے کی نیت باندھ لی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی کچھ کچھ بوندا باندی بھی ہو رہی تھی مگر میں اللہ کا نام لے کر لائبریری کی طرف چل پڑا۔

اکا دکا آنے جانے والے سڑک پر چل پھر رہے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار اب بھی پڑ رہی تھی۔ بیت اور چھتری رکھنے کی عادت نہیں ہے۔ اگر کبھی ساتھ رکھوں بھی تو کھو جاتی ہے اس لیے رومال سر پر ڈال کر پھوار سے بھیگتا ہوا اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ کوئی ایک میل چل کر سڑک کے بائیں طرف ایک چھوٹا سا ٹیلا پڑتا ہے۔ اس پر سے ہو کر تھوڑی دور چلنے کے بعد دوسری سڑک آ جاتی ہے یہی سڑک سیدھی لائبریری کو جاتی ہے۔

اس دن عجیب اتفاق ہوا۔ ٹیلا پار کر کے بائیں طرف اترنے کی بجائے داہنی طرف والی سڑک پر جا پہنچا سڑک کے دونوں طرف بجلیاں جل رہی تھیں۔ کچھ عمارتیں بھی تھیں۔ مجھے یہی خیال رہا کہ صحیح راستے پر چل رہا ہوں کیوں کہ یہ راستہ برسوں سے دن رات کا دیکھا بھالا تھا اور اسے بھول جانے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔

لیکن آگے جاکر جانی پہچانی عمارتیں، پارک اور
پل ملے تھیں، انھیں دیکھ کر یہ تو خوب سمجھ رہا ہوں کہ لائبریری
جانے والی سڑک پر یہ سب چیزیں نہیں ہیں پھر بھی قدم
غلط راستے کی طرف تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں جیسے
کسی نے کوئی نشیلی چیز کھلا دی ہو۔

ہوا اور تیز ہو گئی اسے لیجیے پانی بھی اچھی طرح
برسنے لگا اور مجھے کسی عمارت میں پناہ لینے کی سوجھی نہ
کسی پیڑ کے نیچے سر چھپانے کی، کھلی سڑک پر سرپٹ دوڑتا
چلا جا رہا تھا۔ اسی طرح کئی میل آگے نکل گیا۔

سڑک پر بجلیوں کے کھمبے ختم ہو گئے، اس کے بعد
گیس کی لالٹینوں کے کھمبے ملے۔ کچھ اور آگے چلکر وہ بھی ختم
ہو گئے، گھٹا ٹوپ اندھیرا اور سونی سڑک۔ وہ تو اتفاق
سے میرے پاس ٹارچ تھی ورنہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانا پڑتیں

مزے کی بات یہ کہ اس روز میری جیب میں چھ سو
روپے کے نوٹ موجود تھے۔ اب مجھے جیسے ہوش آیا، اور
محسوس ہوا کہ میں غلط راستے پر چل کر بستی سے چھ سات
میل دور نکل آیا ہوں۔ اب تو دل زور زور سے دھڑک
رہا تھا، بھلا ایسے میں کوئی لٹھ بند مل گیا تو ایک ہی وار میں
کام تمام کر کے روپے لے بھاگے گا اور میری لاش اس ویرانے
میں گدھوں کی غذا بنے گی۔

مرتا کیا نہ کرتا واپسی کا ارادہ کر کے پلٹا تو یکایک
بجلی چمکی اور سڑک سے دور پورب کی طرف ایک اونچی سی
عمارت نظر آئی۔ بادل برس کر کھل گیا تھا مگر ہوا اب بھی بہت
تیز چل رہی تھی، سڑک کے کنارے دونوں طرف لگے ہوئے
درخت جھوم جھوم کر اپنے پتوں سے پانی کی بوندیں ٹپکا رہے

میں نے ٹارچ جلا کر عمارت کا رخ کیا کیچڑ اور
پانی سے بھرے ہوئے کچے راستے کو جیسے تیسے طے کر کے
وہاں تک پہنچ سکا۔ سر سے پاؤں تک تر بتر ہو چکا تھا اور
سردی کی وجہ سے سارا بدن بید کی طرح لرز رہا تھا۔

یہ عمارت ایک پرانے بوسیدہ اور اونچی سنگین
دیواروں کے بنے ہوئے مندر کی تھی۔ صدر دروازے پر بڑا
سا پھاٹک تھا جس میں بغیر تالے کی صرف کنڈی ہی لگی تھی۔ میں
نے جلدی سے کنڈی ہٹا کر مندر کا پھاٹک کھولا اور اس کے
اندر داخل ہو گیا۔ مندر پرانا اور ویران سا تھا گھپ اندھیرے
میں وہاں قدم رکھتے ہی ڈر لگا۔ مگر میں دل کڑا کر کے اندھیرے
کی پروا کیے بغیر مندر کے صحن میں پہنچ گیا اور صحن کے چو طرفہ
برآمدے میں جا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ٹارچ کی روشنی
میں سوکھی ہوئی لکڑیاں تلاش کیں لکڑیاں تو نہیں ملیں مگر
سوکھے پتے جو برآمدے میں ہوا سے اڑ کر اکٹھا ہو گئے تھے
انھی کو جلا کر گرمی پہنچانے کا ارادہ کیا لیکن میرے پاس ماچس
کہاں تھی۔ آخر مجبور ہو کر ایک کونے میں دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

اندھیری رات، سنسان مقام، ویران عمارت
میں تن تنہا۔ طرح طرح کے خیالات نے دماغ پر دھاوا بول دیا۔
میں بھوت پریت کا قائل نہیں ہوں اور اپنے ساتھیوں سے
ڈینگیں مارتا رہتا ہوں مگر آج میں سوچ رہا تھا کہ اگر کوئی
ان ہونی بات ہو گئی اور کسی بھوت پریت جیسی چیز کا سامنا
ہو گیا تو کیا ہو گا؟

تھوڑی دیر میں بچوں کے رونے کی آوازیں طرح
طرح کے قہقہے اور ناچنے کودنے کی چھما چھم اور چھما چھم
کانوں کو سنائی دی۔ یہ سنتے ہی میرا خون خشک ہو گیا

مارے چیخ نکلنے والی ہی تھی کہ ایک کر دروازے کے قریب آگیا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے کو ہی تھا کہ سامنے سے مدھم روشنی نظر آئی۔

ٹارچ سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ایک لڑکی اپنے دامن کی اوٹ میں چراغ لیے ہوئے میری طرف بڑھی چلی آرہی ہے میں بدحواسی میں کچھ اول فول بکنے ہی والا تھا کہ اس نے قریب آکر کہا "کون ہے بھیا؟" میں نے ہوش و حواس درست کر کے جواب دیا "ایک بھولا ہوا مسافر ہوں بائی جی۔ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے، اور جب کسی شہری کی موت آتی ہے تو وہ جنگل کا رخ کرتا ہے"

اس نے مسکرا کر کہا "کوئی بات نہیں، اندر چلو" وہ اس مندر کی رحمدل اور نیک سیرت پجارن تھی۔ بے چاری نے اپنے سر کا دوپٹہ مجھے باندھنے کو دیا۔ اور میرے بیحد اصرار کرنے پر بھی میرے بھیگے ہوئے کپڑے نچوڑ کر جلتی ہوئی آگ پر دوڑی باندھ کر سوکھنے کو ڈال دیے۔ مندر کی ایک کوٹھری کھول کر کچھ پرشاد لائی اور مجھے کھلایا۔ پھر پوجا سے فارغ ہو کر آگ کے پاس آبیٹھی اور میری رام کہانی سن کر بولی "ایسی تو کوئی بات نہیں، یہ صرف آپ کے دماغ کا کرشمہ ہو سکتا ہے ورنہ میں تو روزانہ رات کو یہاں آتی ہوں مجھے آج تک کسی نے ڈرایا نہیں"

"اور میرے غلط راستہ اختیار کرنے پر کیا خیال ہے تمہارا؟"

"یہ ضرور ایک تعجب کی بات ہے" پھر مجھے خود ہی ایک ڈاکٹر کی بات آگئی۔ ایک دن اس نے بتایا کہ دماغ پر سردی کا زیادہ اثر ہو جانے سے اس طرح کی بھول ہو سکتی ہے۔

پجارن کچھ دیر ٹھہر کر چلی گئی۔ میرے کپڑے ابھی اچھی طرح سوکھنے نہیں پائے تھے کہ میں نے وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور مندر کے کواڑ بند کر کے کچا راستہ طے کرنے کے بعد سڑک پر آگیا۔ سڑک پر گیس کی لالٹینیں جل رہی تھیں۔ رات آدھی سے زیادہ ہو گئی تھی۔ سامنے جو نظر اٹھائی تو ایک لمبا تڑنگا گیس کے کھمبے سے بھی زیادہ اونچا سیاہ پوش میرے سامنے موجود تھا۔ میں پیچھے کی طرف ہٹنے لگا تو وہ میری طرف بڑھنے لگا۔ جب میں کھڑا ہو گیا تو وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ میں خوف سے کانپنے لگا اور ایک حیدری نعرہ لگانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میرا ہاتھ اپنے ننگے سر پر خود بخود پہنچ گیا۔ دیکھا تو وہ چھلاوا غائب تھا۔ سر سے ہاتھ ہٹانے پر پھر آموجود ہوا۔ کئی مرتبہ ایسا ہی عمل کرنے سے یہ راز کھلا کہ میرے سر کا ایک لمبا بال گیس کی روشنی کے سامنے آکر مجھے پریشان کر رہا تھا اور کوئی خاص بات نہ تھی۔

لطیفہ

ماں نے موہن کو دو انگنیاں دیں۔ ایک اس کے لیے ایک اس کے چھوٹے بھائی شام کے لیے۔ موہن تھوڑی دیر بعد باہر سے آکر بولا۔ ماتا جی کھیلتے میں شام کی انگنی گر گئی!

ماں: کیوں بیٹا تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ شام ہی کی انگنی گری ہے؟

شام: (جیب سے انگنی نکال کر) میری انگنی تو یہ رہی ماتا جی!

جناب حمید عثمانی

کیسے یاد کریں؟

بھولنے کا مرض کس کو نہیں ہوتا۔ بچے اپنا سبق بھول جاتے ہیں تو ماسٹر صاحب اپنی عینک۔ مزے کی بات تو یہ کہ کسی کو اپنی اس کمزوری کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی۔ لیکن نفسیات کے ایک بہت بڑے ماہر فرائڈ کا کہنا ہے کہ بھولنا بھالنا اتفاقیہ نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے عام طور پر کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔

نفسیات کے ماہروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر کسی کی یادداشت کمزور ہو تو اُسے مایوس نہیں ہونا چاہیے جس طرح کمزور جسم کوشش کر کے طاقتور بنایا جا سکتا ہے اسی طرح ہم اپنی یادداشت کو بھی بہتر بنا سکتے ہیں۔

جو بچے اپنا سبق اچھی طرح یاد نہیں کر پاتے ان کے دماغ میں اس طرح کے سوالات ضرور پیدا ہوتے ہوں گے۔

(۱) کس طرح پڑھنے سے جلد یاد ہوتا ہے؟

(۲) کس وقت پڑھا جائے کہ جو پڑھیں وہ یاد رہے۔

(۳) کس جگہ پڑھا جائے کہ سب ذہن نشین ہو جائے۔

کس طرح پڑھا جائے

کوئی چیز حواس خمسہ (سننے، دیکھنے، چکھنے، سونگھنے اور چھونے کی حسیں) کے ذریعے ہمارے دماغ تک پہنچے بغیر یاد نہیں ہوتی لیکن دیکھنے اور سننے کی حسیں پڑھائی لکھائی کے سلسلے میں خاص طور پر اہم ہیں۔

عام طور پر لوگوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو کوئی چیز دیکھ کر اچھی طرح یاد رکھ سکتے ہیں اور کچھ سُن کر۔ اگر ہم کو یہ پتہ چل جائے کہ ہم کس گروہ میں سے ہیں تو ہم اسی کے مطابق پڑھ کر کم محنت اور تھوڑے سے وقت میں بہت سا علم حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ پتہ لگا لینا زیادہ مشکل بھی نہیں۔

جس کے بارے میں پتہ لگانا ہو اس کو کچھ الفاظ دے کر کہا جائے کہ ان سے نسبت رکھنے والے جو الفاظ تمہارے ذہن میں آئیں سامنے لکھ دو۔

جو بچے سن کر یاد رکھنے والے ہوں گے وہ ایسے الفاظ منتخب کریں گے جو سننے میں مطابقت رکھتے ہوں گے مثلاً

باغ سے مناسبت رکھنے والا لفظ داغ

گھر سے مناسبت رکھنے والے الفاظ سر، در، پر وغیرہ

آگ سے مناسبت رکھنے والے الفاظ ساگ، تاگ وغیرہ

لیکن جو لوگ دیکھ کر اچھی طرح یاد رکھنے والے ہوں گے وہ

باغ سے مناسبت رکھنے والے الفاظ پھول، پھل، گھاس

گھر سے مناسبت رکھنے والے الفاظ میز، کرسی، پلنگ

آگ سے مناسبت رکھنے والے الفاظ کھانا، روٹی، توا، پتیلی

یعنی ایسی چیزوں کے نام لکھیں گے جو اس کے ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں۔ اس طرح جانچ لینے کے بعد جو بچے سُن کر یاد کرنے والے گروہ میں سے ہوں ان کو چاہیے کہ اپنے سبق

کو بلند آواز سے دہرائیں تاکہ آواز سے ان کو مدد ملے۔

جو بچے دیکھ کر یاد رکھنے والے گروہ میں سے ہوں ان کو چاہیے کہ کچھ دیر اپنے سبق پر غور سے نگاہ ڈالیں۔ کچھ بچے اپنے سبق کو کئی کئی رنگوں میں لکھ کر تیار رکھنے میں مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ طریقہ خاص طور سے چھوٹے بچوں کے لیے موزوں ہے۔

چاہے دیکھ کر یاد کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے چاہے سُن کر، دونوں طریقوں میں ایک ہی وقت میں لگاتار پندرہ بیس بار پڑھنا ٹھیک نہیں۔ اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس کی بجائے اگر بچے اپنا سبق دو دو تین تین بار کر کے تھوڑے تھوڑے وقفے سے یاد کرتے رہیں تو محنت اور وقت دونوں کی بچت ہوتی ہے جیسے صبح دو چار بار پڑھ لیا، دوپہر کو پھر اسی طرح دُہرا لیا اور خاص طور سے سونے سے پہلے اگر دو ایک بار جی لگا کر پڑھ لیا جائے تو وہ خوب اچھی طرح سے یاد ہو جاتا ہے۔

بہت سے بچے طویل سبقوں کو کئی چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم کر کے یاد کرتے ہیں۔ اس طرح یاد کرنے میں آسانی کے بجائے دشواری ہی ہوتی ہے۔ اگر کوئی بہت طویل نظم یا عبارت ہے تو اس کی دو دو چار چار سطریں یاد کرنے کے بجائے پوری نظم یا عبارت ایک ساتھ دہرا کر یاد کرنا بہتر رہتا ہے۔

جس طرح کسی کشتی کو کنارے سے بندھی دوسری کشتی کے ساتھ باندھ دیا جائے تو وہ کشتی بہہ کر کہیں دور نہیں جا سکتی اس طرح ہم جو نئی بات یاد کرنا چاہیں اُسے پہلے سے یاد کسی چیز [illegible] مثلاً اگر ہم کو

۱۸۵۷ء پہلی جنگِ آزادی کا سن یاد ہے تو اس کے سہارے ہم دو سن اور بھی یاد کر سکتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں سے سَو گھٹا دیجیے ۱۷۵۷ء میں میر جعفر کی غداری سے نواب سراج الدولہ انگریزوں سے ہار گئے۔ اور اس طرح بنگال پر انگریزوں کا عمل دخل بڑھا۔ ۱۸۵۷ء میں سَو کا اضافہ کر دیجیے۔ ۱۹۵۷ء میں چینیوں نے لداخ میں ایک سڑک بنائی جس کی وجہ سے ہندوستان اور چین کے درمیان تعلقات خراب ہوئے اور جنگ کی نوبت پہنچی۔

اس اصول کا سہارا لے کر ہم نئے نئے الفاظ سیکھ سکتے ہیں۔ اور نئی زبانیں بھی سیکھ سکتے ہیں۔ COW (کاؤ) انگریزی میں گائے کو کہتے ہیں یہ تو تم لوگ جانتے ہی ہوگے۔ جرمن زبان میں گائے کو 'کو' کہتے ہیں۔ 'چاند' کو پنجابی میں 'چن'، 'باغ' کو بنگلہ میں 'باگان'، اور لحاف کو 'لیپ' کہتے ہیں۔ 'زہر' کو گجراتی میں 'جھیر' کہتے ہیں۔ دیکھا تمھارے دماغ میں جو الفاظ پہلے سے موجود تھے ان کی مدد سے تم نے کتنے اور الفاظ سیکھ لیے۔

جہاں اس طرح کی واضح (صاف صاف) مناسبت نہیں ملتی وہاں تلاش کر کے پیدا کی جا سکتی ہے۔

کبھی کبھی خشک مضمون کو یاد کرنے کے لیے اس کو نظم کر لیا جاتا ہے۔ جیسے کون انگریزی مہینہ تیس کا ہے اور کون اکتیس کا یہ یاد رکھنے کے لیے ایک نظم ہے

30 DAYS HAS SEPTEMBER

APRIL JUNE AND NOVEMBER

اسی طرح فارسی سیکھنے میں مدد کرنے کے لیے ایک نظم ہے

بیا برادر آؤ رے بھائی

بنشیں مادر بیٹھ

نظم [illegible] کر [illegible] یاد کر سکتے ہیں۔

کس وقت پڑھا جائے؟

کس وقت پڑھنے سے اچھی طرح یاد ہوتا ہے؟ یہ سوال بھی بہت اہم ہے۔ جس طرح کسرت نہ تو بالکل خالی پیٹ کرنا چاہیے نہ خوب پیٹ بھر کے کھا لینے کے بعد۔ اسی طرح نہ تو اس وقت پڑھائی اچھی ہو سکتی ہے جس وقت بھوک لگی ہو، نہ خوب پیٹ بھر کے کھا لینے کے بعد۔ پیٹ بھر کے کھا لینے کے بعد پڑھنے سے دونوں کام ٹھیک نہیں ہو پاتے۔ نہ تو پڑھائی اچھی طرح ہو پاتی ہے نہ کھانا ہی ٹھیک سے ہضم ہو پاتا ہے۔

ایک خیال اور غلط رواج پا گیا ہے کہ صبح تڑکے پڑھنے سے جلد یاد ہوتا ہے کیوں کہ اس وقت دماغ تازہ رہتا ہے بعض لوگوں کے لیے تو یہ صحیح مشورہ ہے لیکن ہر ایک کے لیے درست نہیں۔ رات کو جو بچے لیٹتے ہی غافل سو جاتے ہیں اور صبح اٹھنے میں ان کو دشواری نہیں ہوتی (کیونکہ اس وقت تک ان کی نیند ہلکی ہو چکی ہوتی ہے) ایسے بچوں کے لیے تو صبح ہی کا وقت موزوں ہے لیکن کچھ بچے جب سونے کے لیے لیٹتے ہیں تو بہت دھیرے دھیرے ان پر نیند کا اثر طاری ہوتا ہے اور کہیں صبح ہوتے ہوتے وہ بے خبری کی نیند سو پاتے ہیں۔ ایسے بچے شام ہی کو پڑھ لیں تو اچھا ہے کیونکہ گہری نیند سے بیدار ہونے کے بعد کافی دیر میں آہستہ آہستہ دماغ کی قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ الارم گھڑی سے یا بڑوں کے خوف سے بچے جاگ تو جاتے ہیں مگر ان کا دماغ جاگنے میں اپنا وقت لیتا ہے۔

کیسے پڑھا جائے، کس وقت پڑھا جائے؛ ان دونوں سوالات کا ہم تم لوگوں کو جواب دے چکے۔ کس جگہ پڑھنا بہتر ہے اس کو بھی سمجھ لو۔

جسمانی محنت کے لیے جس طرح کھلی ہوا ضروری ہے اسی طرح دماغی محنت کے لیے بھی ضروری ہے۔ کھڑکی دروازے سب کھول کر پڑھنا چاہیے تاکہ ہوا کا اچھی طرح گزر ہوتا رہے اس طرح دماغ جلد نہیں تھکتا۔

جس جگہ پر تمہارے بیٹھنے کا انتظام ہو وہاں سامنے کی دیوار خالی چھوڑ دو۔ اکثر تصویریں وغیرہ ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور پڑھائی میں حارج ہوتی ہیں۔

رات کے وقت کمرے میں روشنی کا اچھا انتظام ہونا چاہیے۔ اگر بجلی کی روشنی میں پڑھنا ہے تو دودھیا رنگ بلب شفاف بلب کی نسبت اچھا رہتا ہے۔ کیوں کہ جس بلب میں چمکتا ہوا تار دکھائی دیتا رہتا ہے اس سے آنکھوں پر تکان اثر جلد ہوتا ہے۔ بلب چاہے جیسا ہو لیکن روشنی براہِ راست آنکھوں پر نہیں پڑنا چاہیے۔ لیمپ پر شیڈ لگانا ہر حال میں ضروری ہے۔ میز پر تو تیز روشنی لازمی ہے مگر کمرے اور میز کی روشنیوں میں زیادہ فرق نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس سے بھی آنکھوں پر اثر پڑتا ہے۔ وہ جلد تھک جاتی ہیں اور تکان ہمیشہ یاد کرنے میں حارج ہوتی ہے خواہ وہ پورے جسم کی ہو یا صرف آنکھوں کی۔

ہر بچے کو پڑھتے وقت ان پہلوؤں کا لحاظ رکھنا اور کوشش کرنا چاہیے کہ اپنے حالات کے مطابق جہاں تک ممکن ہو ان پر عمل کیا جائے تاکہ سبق اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے اور کتابوں میں لکھی ہوئی باتیں شخصیت کا جز بن جائیں اور ایک اچھا انسان بننے میں مدد دیں۔

جناب مرزا شکور بیگ

چچا ابا نے روزہ رکھا

دن کے بارہ بج رہے تھے کہ گھر کا چھوٹا ملازم گیتو آیا اور چچا ابا سے پوچھنے لگا "سرکار کیا نہانے کے لیے پانی گرم کیا جائے؟" چچا ابا نے پوچھا "اب کیا وقت ہے؟" گیتو نے جواب دیا "بارہ بج رہے ہیں۔"

چچا ابا نے بگڑ کر کہا "مردود تو اب پانی گرم کرے گا تو ہم نہائیں گے کب اور نماز کو کب جائیں گے؟ جب سے کیا کر رہا تھا؟ تجھے معلوم نہیں آج جمعہ ہے۔ اِدھر آ، اور نزدیک آ۔ بالکل نزدیک آ جا۔" یہ کہہ کر چچا ابا نے اس کا کان مروڑا اور ایک دھول جمائی۔ وہ رونی صورت بنا کر چلا گیا مگر سلطانہ جلدی سے اٹھی اور امی کے پیچھے چھپ گئی۔

چچا ابا نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا اور اپنی لڑکی ممتاز کو آواز دی "ممتاز! او ممتاز ـــ!"

"جی حاضر ہوئی۔" ممتاز نے جواب دیا۔

"حاضر ہو کر کیا کرے گی، اپنی آپا سے کہہ دے کر ہمارے لیے کپڑوں کا جوڑا نکال دیں۔"

یہ کہہ کر چچا ابا نے آنکھیں بند کر لیں اور آرام کرسی پر پڑے رہے۔ گھڑیال نے ٹن ٹن بارہ بجائے تو چچا ابا نے آواز دی "ارے ابھی پانی گرم ہوا کہ نہیں؟"

"جی ہو گیا، ابھی نکالتا ہوں سرکار۔" گیتو نے جواب دیا۔ پانی کے تیار ہونے کی اطلاع پر چچا ابا دالان سے چلے گئے۔ اس وقت سلطانہ کے منہ پر رونق آئی۔

غسل خانے میں جا کر چچا ابا نے گیتو کو آواز دی "ابے تو نے اس میں اتنا ٹھنڈا پانی کیوں ملا دیا۔ یہ تو بالکل ہی ٹھنڈا ہو گیا نا۔ چل اور گرم پانی لا۔"

گیتو دوڑتا ہوا گرم پانی لے کر پہنچا۔ آدھا پانی اس نے ڈال دیا اور پھر ہاتھ روک کر چچا ابا کی طرف دیکھنے لگا۔ یعنی وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کافی ہے یا ابھی اور ڈالا جائے۔ مگر چچا نے اسے تڑ سے طمانچہ رسید کیا اور کہا "مردود ڈالتا کیوں نہیں، میری صورت کیا تکتا ہے۔"

اس نے بھی جتنا پانی وہ لے گیا تھا، سب انڈیل دیا۔ اب چچا نے جب پانی اپنے ہاتھ پر ڈالا تو اتنا گرم ہو چکا تھا کہ چرکا لگا۔ چچا ابا کو غصہ آ گیا اور لگے اُسے ٹھونکنے۔ بے گناہ گیتو اوّل تو بچہ تھا دوسرے پٹ رہا تھا روتا کیسے نہیں وہ چیخنے لگا۔ "مر گیا سرکار۔ مر گیا سرکار"

چچا ابا نے کڑک کر کہا "منہ بند کر ورنہ مارتے مارتے چمڑی اُدھیڑ دوں گا۔"

یہ سنتے ہی وہ غریب چپکا ہو گیا۔ چچا ابا نے اُسے چھوڑ دیا مگر حمام میں جاتے جاتے کہنے لگے کہ اگر آج مجھے نماز نہ ملی تو تجھے زندہ نہ چھوڑوں گا۔

چچا ابا مسجد جانے کو تیار ہوئے تو مجھے دیکھ کر کہنے لگے "تم بھی چلو گے ؟"

میں جانا تو چاہتا تھا مگر ان سے پوچھنے کی ہمت نہ تھی جب انھوں نے خود پوچھا تو میں نے ہامی بھرلی۔ میں جانے لگا تو امی نے چپکے سے کہا" بیٹا جا تو رہے ہو کوئی ایسی بات نہ کرنا جو تمھارے چچا کو بری لگے ۔" اس خیال سے کر چچا ابا کو انتظار نہ کرنا پڑے میں شیروانی کے بٹن لگاتا ہوا بھاگا۔ چچا ابا نے مڑ کر دیکھا اور کہا" عجب نالائق ہو، اتنی جلدی کیا پڑی ہے۔ کیا میں بھاگا جا رہا ہوں ؟"

میں کیا جواب دیتا۔ خاموش ہو رہا۔

مسجد میں لوگ کھچا کھچ بھرے تھے۔ خطبہ شروع ہو چکا تھا مگر چچا ابا لوگوں کے کندھوں پر سے پھلانگتے ہوئے آگے بڑھے جاتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے چلے آؤ۔ بعض لوگ غضب آلود نگاہوں سے چچا ابا کو دیکھ رہے تھے۔ مگر انھیں اس کی کیا پروا۔ وہ برابر بڑھ رہے تھے ادھر میری جان مصیبت میں تھی۔ آخر ایک صاحب سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے چچا ابا سے کہا: "مولوی صاحب آگے جگہ نہیں ہے۔ یہیں بیٹھ جائیے"

چچا ابا نے کرخت لہجے میں جواب دیا: "آپ کے زمانے کی ضرورت نہیں۔ میں کوئی اندھا نہیں ہوں۔"

وہ بے چارے اپنا سا منھ لے کر رہ گئے۔ خوش قسمتی سے اس سے اگلی صف میں چچا ابا کے ایک دوست بیٹھے تھے انھوں نے دب دبا کر چچا ابا کے لیے تھوڑی سی جگہ نکال لی اور چچا ابا وہیں ٹک گئے۔

نماز ختم ہو چکی تو چچا ابا نے مجھ سے کہا کر تم۔ یہیں ٹھیرے رہو۔ مجھے بعض لوگوں سے ملنا ہے، میں ابھی آتا ہوں۔ چچا ابا بھیڑ میں چلے گئے۔ میں وہیں ٹھیرا رہا اور اتنی دیر تک ٹھیرا رہا کر کھڑے کھڑے تھک گیا۔ لوگ چلے جا رہے تھے۔ مسجد تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ میں چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ مگر وہاں چچا ابا ہوتے تو دکھائی دیتے .... وہ تو سیدھے گھر پہنچ گئے اور انھیں میری یاد اس وقت آئی جب امی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کر بھائی صاحب رشید ابھی تک نہیں آیا۔ یہ سنتے ہی استغفراللہ استغفراللہ کہتے ہوئے الٹے پاؤں مسجد پہنچے۔ میں وہیں کھڑا تھا جہاں وہ مجھے چھوڑ گئے تھے۔ مسجد کے اندر بھی نہیں آئے سیڑھیوں کے پاس سے آواز دی: "رشید، او رشید!"

میں جلدی جلدی قریب پہنچ گیا تو کہا" اگر میں نہیں آیا تھا تو کیا تو خود گھر نہیں آسکتا تھا؟"

میں نے کہا "آپ نے مجھے یہیں ٹھیرنے کے لیے فرمایا تھا۔"

"بس چپ رہ نالائق۔ بڑا سعادت مند بنتا ہے۔ میں تو ادھر ہی سے گزرا تھا تو میرے ساتھ کیوں نہیں آیا۔ بول۔! جواب دے۔"

"جی میں نے آپ کو جاتے نہیں دیکھا۔"

"نہیں دیکھا!" یہ کہہ کر چچا ابا نے اس زور سے میرا کان مروڑا کہ تارے نظر آگئے۔ کہا "تیری آنکھیں پھوٹ گئی ہیں... خیر... گھر چل کر تیری خبر لوں گا۔"

اور پھر گھر پہنچنے تک چچا کچھ بڑبڑاتے رہے اور غصہ سے مڑ مڑ کر مجھے دیکھتے رہے۔ اس وقت میں بھی دل ہی دل میں انھیں سیکڑوں باتیں سنا رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی امی پر جو نظر پڑی تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اپنی

بیٹا سانپ۔ وہ بے چاری کیا کرتیں مجھ سے یہی کہا کر بیٹا تمہارے
مارے اس چلچلاتی دوپہری میں انھیں پھر وہاں تک جانا پڑا تم
خود ہی چلے آئے ہوتے۔

"جانا پڑا تو میں کیا کروں ... میں آتا کیسے جب انھوں
نے وہیں ٹھہرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔"

"راستہ میں تو بھیگی بلی بنا ہوا تھا مگر گھر پہنچ کر شیر ہوگیا۔"

چچی اماں بھی مجھے سنا رہی ہیں، "امی الگ خوشامد کر رہی
ہیں مگر میں برابر کہے جا رہا تھا۔ "غلطی تو اپنی تھی مگر مجھے مارنے
لگے ۔۔ اسی لیے شاید ہم کو بلایا تھا۔"

چچا ابا نے میرے یہ جملے سن لیے اور وہیں سے کہا
"رشید ذرا پھر سے کہنا تو نے کیا کہا۔۔"

امی مجھے روکتی کی روکتی رہیں مگر میں نے جواب
دیا "میں نے آپ کو کچھ نہیں کہا۔"

"پھر کس کے متعلق تو نے یہ الفاظ کہے۔ تو کس برتے
پہ پھولا ہے، ایسا ٹھوکوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔"

اب چچی اماں سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے کہا "خدا بچائے
خواہ مخواہ ٹھونکنے لگے۔ آخر اس نے کیا قصور کیا ہے؟"

"تم ہی نے تو حمایت کر کر کے بچوں کو دو کوڑی کا کر دیا
ہے۔ ٹانگ برابر کا لونڈا ہم سے سوال و جواب کرتا ہے۔"

"بس یہی باتیں آتی ہیں تمہیں پرائے بچے کا بھی خیال
نہیں۔ اس زور سے اس کا کان اینٹھا کہ لال ہوگیا۔"

"میرا بچہ ایسی نالائقی کرتا تو اسے چیر کر پھینک دیتا۔
کان لال ہوگیا۔ غنیمت ہے کہ ٹوٹا نہیں۔ ڈھونگ باز کہیں کا۔"

"ہاں دوسرے کی تکلیف تو ایسے ہی معلوم ہوتی ہے
خود پر گزرے تو قدر کھلتی ہے"

"دیکھو تم حد سے آگے نہ بڑھو۔ میری زبان نہ کھلواؤ۔
ورنہ خواہ مخواہ میرے روزے کا نام بدنام ہوگا۔"

"آگ لگے ایسے روزے کو۔ روزہ کیا رکھا کہ سارے
گھر کا ناک میں دم کر دیا۔"

یہ سنتے ہی چچا ابا آگ بگولہ ہوگئے۔ جلدی جلدی اپنے
کمرے میں گھسے اور آن کی آن میں ننگی تلوار ہاتھ میں لیے دالان
کا رخ کیا۔ انھیں دیکھتے ہی امی جان چیخنے لگیں "ہاں، ہاں،
بھائی صاحب، ہاں ہاں بھائی صاحب"۔ بیچاری کریم بی
"سرکار... سرکار!" چلاتی ہوئی بیچ میں آگئی۔ اسے چچا ابا نے
اس زور کا دھکا دیا کہ وہ دھڑام سے ادھر گر پڑی۔

اب چچا ابا چچی اماں کے قریب پہنچ کر تلوار اٹھانے
والے تھے کہ میں لپک کر چچی اماں کے آگے کھڑا ہوگیا۔ امی نے
جو یہ دیکھا تو دوڑ کر چچا ابا کے پاؤں سے لپٹ گئیں بچوں نے
الگ رونا اور بلبلانا شروع کیا۔ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ محلے
والے دروازے پر آکر جمع ہوگئے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

ادھر چچی اماں بھی آپے سے باہر ہوگئیں اور چیخ چیخ
کر کہنے لگیں۔ "لو آؤ مار ڈالو۔ میں بھی تو دیکھوں کیسے بہادر ہو
جتنا میں خاموش رہتی ہوں تم شیر ہوتے جاتے ہو۔" سب چچی
کو سمجھا رہے تھے مگر وہ برابر کہے جا رہی تھیں۔ "تم لوگ بیچ میں
نہ آؤ، خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں تو ان کے ہاتھوں مر کے
دم لوں گی۔"

امی نے چچی اماں کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ میں چچا ابا
سے لپٹا ہوا رو رہا تھا۔ سوائے چچا ابا کے سب کی آنکھوں سے
آنسو جاری تھے....."

(باقی دلچسپ کہانی مئی کے شمارے میں پڑھیے)

— سید امین نیاز

لڑکپن کا زمانہ ہے

(ننھے پیامیوں کے لیے)

محبت کو جگانا ہے
نیا دیپک جلانا ہے
فضا کو جگمگانا ہے
اندھیروں کو مٹانا ہے
مچلتا گیت گانا ہے
لڑکپن کا زمانا ہے

کبھی باغوں کے پھیرے ہیں
کبھی ندی پہ ڈیرے ہیں
یہ سب دن رات میرے ہیں
انھیں دلکش بنانا ہے
مچلتا گیت گانا ہے
لڑکپن کا زمانا ہے

نئے جو ماسٹر آئیں
شرارت ان کو دکھلائیں
بلا سے مار ہی کھائیں
مگر ان کو ستانا ہے
مچلتا گیت گانا ہے
لڑکپن کا زمانا ہے

کبڈی کے ہیں ہم رسیا
نہیں ہے کوئی ہم جیسا
ہمیں لیتے ہیں ہر پالا
ہمیں زور آزمانا ہے
مچلتا گیت گانا ہے
لڑکپن کا زمانا ہے

ہمیں چاچا کے ہیں پیارے
ہمیں ہیں دیش کے تارے
کبھی غم سے نہ ہم ہارے
سدا ہنسنا ہنسانا ہے
مچلتا گیت گانا ہے
لڑکپن کا زمانا ہے

ہمیں سے ہے چمن دنیا
ہمارا ہے وطن دنیا
ہے اب اک انجمن دنیا
یہ دنیا کو بتانا ہے
مچلتا گیت گانا ہے
لڑکپن کا زمانا ہے

محبت کے ہیں پروانے
نہیں مذہب کے دیوانے
ہم آئے ہیں یہ سمجھانے
محبت اک خزانہ ہے
مچلتے گیت گانا ہے
لڑکپن کا زمانا ہے

جناب آفاق احمد

چار دوستوں کی کہانی

رام، رحیم، رابرٹ اور رتی سنگھ چار بڑے گہرے دوست تھے۔ قریب قریب چاروں کی عمر ایک سی تھی اور یہ اتفاق تھا کہ چاروں ایک ہی درجہ میں پڑھتے تھے۔ جب آٹھویں میں آئے تو اچھے خاصے سمجھدار ہو چکے تھے اور ان پانچ برسوں میں ان کی دوستی بہت بڑھ گئی تھی۔ ان چاروں کا ساتھ چوتھی جماعت میں ہوا۔ رابرٹ نے اس سے پہلے اپنے گھر پر پڑھا تھا۔ رحیم کسی مکتب میں پڑھتا تھا اور رام اور رتی پہلی جماعت سے اسکول میں موجود تھے۔ چوتھی جماعت میں جب رابرٹ اور رحیم نے داخلہ لیا تو وہ دوسرے کلاس والوں کے لیے اجنبی تھے۔ خود یہ دونوں بھی ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔

البتہ رام اور رتی کی پچھلے کئی برسوں سے جان پہچان تھی۔ تین سال سے تو ساتھ پڑھ ہی رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی ان دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔

رام کلاس کا مانیٹر تھا اور رتی اس کے کاموں میں ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

جب اسکول کھلنے پر پڑھائی شروع ہوئی تو بہت سے تو وہی پہلے والے جانے پہچانے اور پرانے ساتھی تھے۔ کچھ نئے لوگ بھی آئے۔ ان نئے لوگوں میں رابرٹ اور رحیم بھی تھے۔

دونوں جب اسکول میں داخل ہوئے تو اپنے آپ کو اجنبی اجنبی سا پاتے تھے۔ لیکن خوش تھے کہ یہاں بہت سے لڑکے ملیں گے، کھیلیں کودیں گے، خوب لطف آئے گا۔

رحیم اور رابرٹ ایک ہی دن داخلہ لینے آئے۔ دونوں کو کلاس میں اتفاق سے ایک ہی بنچ پر جگہ ملی۔ رابرٹ کا لکھتے میں نب ٹوٹ گیا تو رحیم نے اُسے فالتو پنسل دی۔ گھنٹہ ختم ہونے کے بعد دونوں ساتھ ساتھ اٹھے اور پھر ساتھ ساتھ ہی رہنے لگے۔

دو تین دن بعد رام نے پوچھا کہ اس درجے میں کرکٹ کے کھلاڑی کون کون سے ہیں کیونکہ آج شام سے اس کی پریکٹس ہوا کرے گی۔ رحیم اور رابرٹ نے بھی اپنے اپنے نام لکھائے۔ شام کو گراونڈ پر بہت سے لڑکے آئے۔ خوب پریکٹس ہوئی۔ رابرٹ بڑا اچھا باؤلر ثابت ہوا۔ اُدھر رحیم نے

بڑے کیچ لیے اور اپنی عمدہ فیلڈنگ سے خوب رنگ جمایا۔ رتی وکٹ کیپر تھا۔ رام کے ہاتھ میں کچھ تکلیف تھی اس لئے وہ نہ کھیلا البتہ کھیلنے کے بعد رام نے اپنے نئے ساتھیوں کی بڑی تعریف کی۔ اور کہنے لگا اس بار جب کھیلوں کے سالانہ مقابلے ہوں گے تو اپنے درجے کی ٹیم ضرور جیتے گی۔

اسکول صرف آٹھویں جماعت تک تھا۔ اس میں ہر سال کھیل کود کے مقابلے ہوتے تھے۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے کا شمار بچوں میں ہوتا اور چوتھے سے لیکر آٹھویں درجے تک الگ الگ ٹیمیں بنتی تھیں۔ ٹیمیں کل تین ہوتی تھیں آٹھویں کی الگ۔ چوتھے اور پانچویں کی ملی جلی۔ چھٹے اور ساتویں کی بھی ملی جلی۔ ان مقابلوں کی خوب تیاریاں ہوتی تھیں۔ کرکٹ کا مقابلہ خاص طور پر بہت اہم ہوتا تھا اور اس میں بڑی دلچسپی لی جاتی تھی۔

جب یہ سالانہ مقابلے شروع ہوئے تو رتی، رام، رابرٹ اور رحیم چاروں اپنے درجے سے ٹیم میں شامل کیے گئے۔ یہاں سے ان کی پکی دوستی کی بنیاد پڑی۔ یہ ہمیشہ ساتھ رہتے گئے۔

دھیرے دھیرے سال گزرتے گئے اور اب یہ آٹھویں جماعت میں آچکے تھے۔ ان کی دوستی کی لوگ مثالیں دیا کرتے تھے کبھی انھوں نے پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی برائی نہیں کی۔ اپنے راستے آنا اپنے راستے جانا۔ جو دل کے اچھے لوگ تھے وہ ان کی سنگت دیکھ کر تعریف کیا کرتے اور خوش ہوتے۔ مگر اس ہمارے اتنے بڑے سنسار میں آپ جانیں ہر طرح کے لوگ ہیں کچھ کو ان چاروں کی دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی — لیکن رحیم، رابرٹ، رتی اور رام کو اس کی فکر نہ تھی کہ کون کیا سوچتا تھا۔ وہ تو اپنے حال میں مگن تھے — ہاں اس کی سدا کوشش کرتے کہ ان کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ سب کا بھلا چاہتے تھے اور آڑے وقت میں دوسروں کے کام آنا اپنا فرض سمجھتے تھے

آٹھویں درجے کے امتحانات سے کچھ پہلے حسب معمول سالانہ کھیل کود کے مقابلے ہوئے۔ اس بار رام ٹیم کا کپتان تھا اور سالانہ جلسے کا انتظام رحیم کے پاس تھا۔

جب ٹیم بننے لگی تو کچھ لوگوں نے رام کے کان بھرنا شروع کیے۔ شروع میں تو رام نے سمجھایا:

"بھئی انھیں کیسے ٹیم میں سے کاٹ سکتا ہوں۔ ہاں ان سے اچھے کھلاڑی لاؤ میں انھیں ان کی جگہ موقع دے دوں گا۔"

مگر وہ لوگ نہ مانے۔ انھوں نے آخر رام کو رحیم اور رابرٹ کے خلاف ایسا بھڑکایا کہ اس نے ان دونوں کو ٹیم سے خارج کر دیا۔ رحیم اور رابرٹ کو بہت دکھ ہوا۔ رام کی اس حرکت سے غصہ ہو کر رتی نے بھی ٹیم میں کھیلنے سے انکار کر دیا۔ رحیم نے اُسے بہت سمجھایا بھی کہ وہ بے دلی نہ کرے لیکن رام کو خود معلوم ہو جائے گا کہ پھوٹ کا بیج بونے والے کتنے خراب ہیں۔ مگر رتی نہ مانا۔ اپنی بات پر اڑا رہا۔ نتیجہ ظاہر ہے ٹیم

بُری طرح ہار ی۔ اس پر رام ان تینوں کے اور خلاف ہو گیا۔ اور اس نے کچھ ایسی باتیں کہیں جو نہ کہنا چاہیے تھیں۔

سالانہ جلسے میں سب سے اچھے کھلاڑی کو انعام دینے کی بات چلی تو رحیم نے رام کا نام تجویز کیا۔ رحیم کے ساتھیوں نے کہا کہ رام نے تمھارے ساتھ اتنا بُرا سلوک کیا ہے اور تم اُس کی سفارش کر رہے ہو۔ مگر رحیم بولا،

"رام نے اگر غلطی کی تو کیا میں بھی کروں رام نے مجھ سے دشمنی کی ہے لیکن انعام کا حقدار تو ہے۔ میں اس دشمنی کی وجہ سے اس کا حق کسی دوسرے کو دلاؤں، یہ نہ ہوگا۔"

اس بات کی اطلاع رام کو بھی ملی اور وہ دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوا۔

اسی زمانے میں اسکول کی ٹیم کا میچ ایک دوسرے اسکول کی ٹیم سے ہوا۔ بڑا کانٹے کا مقابلہ تھا۔ رام کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ رابرٹ، رتی اور رحیم سے کہے لیکن وہ یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان تینوں کے بغیر ٹیم جیت نہیں سکتی۔ آخر وہ رابرٹ سے ملا اور اس سے معافی مانگی۔ پھر رابرٹ کے ساتھ رحیم اور رتی سے بھی ملا۔ رحیم تو فوراً گلے لگ گیا مگر رتی بڑی دیر تک روٹھا رہا۔ آخر چاروں دوست یکجا ہوئے اور پھر — ان کے اسکول کی ایسی ویسی نہیں بہت شاندار فتح ہوئی۔

اور اب تو چاروں دوست خوب ایک دوسرے سے گلے ملے اور طے کیا کہ اب کبھی کسی کے بہکانے میں نہیں آئیں گے اب ان پر یہ بھید کھل گیا تھا کہ آپس میں مل کر نہ رہنے سے کسی کام میں بھی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ بلکہ اب تو انھوں نے یہ بھی طے کیا ہے کہ اگر کوئی ان میں پھوٹ ڈالنا انھیں لڑانے کی کوشش کرے گا تو وہ اُس کا مل جل کر مقابلہ کریں گے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو بھوپال اردو)

جناب آفتاب شمسی

مُنّی

آج اک چھ برس کی بچی نے
اپنی حسرت بھری نگاہوں سے
باپ کہہ کر مجھے پکارا ہے
اور یہ اتفاق تو دیکھو
میری مُنّی بھی چھ برس کی تھی
ایک ہی ماہ تو ہوا ہے ابھی
روٹھ کر دور جا چکی ہے مگر
ایسا لگتا ہے آج کی مُنّی
کل کی مُنّی کا عکس ہو جیسے
آج سے کیوں نہ میں اُسے آخر
اپنی مُنّی سمجھ کے دن کاٹوں
غم کی گہری خلیج کو پاٹوں

جناب علیم الدین

آسٹریلیا کے چند انوکھے جاندار

اگر آپ سے پوچھا جائے کہ کیا آپ نے کبھی ایسے جانور کا نام سُنا ہے یا دیکھا ہے جو انڈے دیتا ہے اور جب انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں تو ان کو دودھ بھی پلاتا ہے ! آپ کہیں گے: بھلا ایسا جانور بھی دنیا میں ہو سکتا ہے ! اور جب دنیا میں اس کا نام ونشان ہی نہیں تو ہم اس کا نام کیسے بتا سکتے ہیں۔

لیکن جناب ایسا جانور دنیا میں موجود ہے۔ آج کل بھی پایا جاتا ہے اور اس کا نام ہے "پلاٹی پس" (PLATYPUS)۔ یہ سچ مچ بڑا ہی عجیب وغریب جانور ہے اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے اور بھی بہت سے جانور آج کل ایک خاص ملک میں پائے جاتے ہیں۔ اچھا بتائیے اس ملک کا کیا نام ہے۔ آپ نے ضرور سُنا ہوگا۔ ہندوستان کے جنوب مشرق میں دنیا کا ایک سب سے چھوٹا براعظم ہے۔ اس کا نام آسٹریلیا ہے۔ اس ملک کو زولوجیکل میوزیم "AUSTRALIA IS ZOOLOGICAL MUSEUM" بھی کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں پر دنیا کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں عجیب وغریب جانور بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔

براعظم آسٹریلیا دنیا کے دوسرے ملکوں سے بالکل الگ تھلگ ہے صرف ۱۹۹ سال پہلے تو اس کا پتہ چلا ہے ۱۷۷۰ء میں اس براعظم کو کیپٹن کک نے معلوم کیا تھا کیپٹن کک کا حال پھر کبھی سُنائیں گے۔

آپ پوچھیں گے کہ آسٹریلیا کو زولوجیکل میوزیم کیوں کہتے ہیں۔ تو سُنیے یہاں پر سینکڑوں قسم کے انوکھے جانور، پرندے، کیڑے مکوڑے پائے جاتے ہیں جو دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ملتے۔ بہت چھان بین کے بعد پتہ چلا ہے کہ یہاں تقریباً ۲۳۰ قسم کے تھیلی والے جانور (MARSUPIAL) دودھ پلانے والے جانور۔ ۳۰۰ ۔ ۲۴۰ قسم کے گرگٹ۔ ۱۴۰ قسم کے سانپ دو قسم کے مگرمچھ، دس بارہ قسم کے کیکڑے اور چار قسم کے کچھوے پائے جاتے ہیں جو اپنی شکل وصورت اور خصوصیات کے اعتبار سے دنیا کے تمام جانوروں سے الگ ہیں۔

آئیے آج آپ کی ملاقات چند بہت ہی عجیب وغریب جانوروں اور پرندوں سے کرائیں۔

کنگارو THE KANGAROO

کنگارو کو تو آپ نے اپنے یہاں کے چڑیا گھر میں ضرور دیکھا ہوگا۔ کنگارو کا اصلی وطن آسٹریلیا ہے۔ یہ وہاں کا سب سے مشہور تھیلی والا جانور ہے۔ اس کے اگلے ہاتھ پتلے پتلے، چھوٹے چھوٹے اور پچھلے بے حد لمبے، موٹے اور بڑے ہیں۔ خصوصاً اس کی دُم بہت ہی لمبی اور موٹی ہے۔ یہ بڑی طاقتور ہوتی ہے۔ کنگارو اسی دُم کے سہارے بیٹھتا ہے — شکل وصورت بہت کچھ ہرن سے ملتی ہے۔ سب سے عجیب و غریب چیز تو اس کی تھیلی ہے جو اس کے پیٹ کے پچھلے

حصے میں ہوتی ہے۔ اس میں وہ اپنے بچے کو اس وقت تک رکھتا ہے جب تک وہ بچہ خوب بڑا نہ ہو جائے اور دشمن سے بھاگ کر اپنی حفاظت خود نہ کر سکے۔

ایک اور مزے کی بات: یہ کنگارو صاحب جب پیدا ہوتے ہیں تو کُل ایک ایک انچ کے ہوتے ہیں اور پھر بڑھتے بڑھتے لگ بھگ سات فٹ کے ہو جاتے ہیں۔ کنگارو صاحب کی چال بھی بس دیکھنے کی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے چاروں پیر برابر تو ہوتے نہیں اس لیے یہ چھلانگیں لگاتے چلتے ہیں۔ عام طور پر تو چھ فٹ لمبی چھلانگ لگاتے ہیں لیکن خطرے کے وقت تو ۸ فٹ سے لیکر ۳۰ فٹ لمبی چھلانگ لگا لیتے ہیں۔ خطرے کے وقت کنگارو ۲۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا ہے۔

جس کنگارو کا ابھی میں نے حال بتایا اس کو آپ نے ضرور دیکھا ہوگا اور اس کے کچھ نہ کچھ حالات بھی آپ لوگوں نے پڑھے ہوں گے۔ لیکن کنگارو کی بہت سی چھوٹی بڑی قسمیں اور بھی ہیں اور یہ اس ملک میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ بعض کنگارو تو ہمارے یہاں کے چوہوں کے برابر ہوتے ہیں۔ بس ان کا قد چھوٹا ہوتا ہے باقی تمام باتیں وہی ہوتی ہیں جو بڑے کنگاروں میں ہوتی ہیں ان کو "مسک ریٹ کنگارو" (MUSK-RATE-KANGAROO) کہتے ہیں۔ اسی کی ایک اور قسم کا نام "ریٹ کنگارو" (RAT-KANGAROO) ہے۔ یہ بھی چوہے

(RAT-KANGARO

جیسا ہوتا ہے۔ کچھ کنگارو درختوں پر رہتے ہیں۔ ان کو "پیڑ والے کنگارو" (TREE-KANGAROO) یہ صاحب ہمیشہ درخت پر ہی چڑھے رہتے ہیں۔ اس کے پنجے کافی بڑے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ انھی کی مدد سے یہ درخت پر بہت تیزی سے چڑھ سکتا ہے اور اتر سکتا ہے۔ اپنی دُم سے سہارے کا کام لیتا ہے۔ کچھ کنگارو چٹانوں میں رہتے ہیں ان کو "ولبیز" (WALLBIES) بھی کہتے ہیں۔ ان کا قد بڑے کنگارو سے

کچھ چھوٹا ہوتا ہے لیکن یہ ان سے زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔
یہ کنگارو تقریباً پورے ملک آسٹریلیا کے ہر میدان، جنگل، ریگستان، پہاڑ اور پٹھو غرض ہر جگہ بکثرت ملتے ہیں خصوصاً ان علاقوں میں بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں جہاں پر ہری اور نرم گھاس افراط سے پائی جاتی ہے۔ مثلاً کوئنس لینڈ کے شمال مشرقی علاقے میں جہاں خوب بارش ہوتی ہے، پاپوا (PAPUA) نیوگنی وغیرہ کے علاقے میں بھی پائے جاتے ہیں۔

(PLATY PUS) "پلاٹی پس" ان صاحب کا ذکر شروع میں آچکا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے قدرت نے مذاق کیا ہو اور بہت سے جانداروں کو ملا کر ایک کھلونا بنایا ہو اور اس میں جان ڈال دی ہو۔ اب سنیے ان میں مچھلی کی، بطخ کی، دودھ پلانے والے جانوروں کی، انڈے دینے والے پرندوں کی اور اود بلاؤ کی باتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ کیسے؟

پلاٹی پس اپنی غذا دریاؤں اور کھاڑیوں کے آس پاس تلاش کرتا ہے۔ چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑے اس کی غذا ہیں۔ دریاؤں کے کنارے پر بہت گہرے گہرے سوراخ بنا کر رہتا ہے۔ مادہ پلاٹی پس سال میں ایک یا دو بار انڈے دیتی ہے۔ پھر جب ان انڈوں میں سے بچے نکلتے ہیں تو ان بچوں کا قد پیدائش کے وقت $\frac{1}{2}$ انچ ہوتا ہے۔ انڈوں سے نکل کر بچے اپنی ماں کے جسم سے کچھ دنوں چمٹے رہتے ہیں۔ اور اس کی کھال کو رگڑتے ہیں جن سے دودھ حاصل ہوتا رہتا ہے۔ پلاٹی پس ہمارے آپ کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے سائنس دانوں اور بائیلوجی کے ماہرین کے لیے بہت ہی عجیب و غریب چیز رہا ہے۔ اس کے ذریعہ سے ان لوگوں نے پرانی دنیا کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم کی ہیں۔

یہ انڈے دیتا ہے۔ انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں تو ان کو دودھ پلاتا ہے۔ مچھلی کی طرح پانی میں رہتا ہے چونچ بطخ کی چونچ جیسی اور پنجے بھی بطخ کے پنجوں جیسے ہوتے ہیں۔ ان سے یہ پانی میں تیرنے اور خشکی پر چلنے میں مدد لیتا ہے۔ پورے پلاٹی پس کی لمبائی تقریباً ۲ فٹ ہوتی ہے۔ اس کی چھ انچ لمبی دُم اود بلاؤ کی دُم کی طرح ہوتی ہے اس کا جسم سمور یعنی نرم نرم بالوں سے ڈھکا ہوتا ہے۔ جسم کا رنگ اوپر کی طرف گہرا بھورا یا گہرا نارنجی اور پیٹ کی طرف سے پیلا بھورا ہوتا ہے۔

اس عجیب و غریب جانور کی حفاظت کا انتظام خود حکومت کرتی ہے۔ کوئی نہ مار سکتا ہے، نہ پکڑ سکتا ہے بہت ہی شرمیلا جانور ہے۔ ذرا سی آہٹ ہوئی اور یہ غائب!

(اس دلچسپ مضمون کا اگلا حصہ
مئی کے پیام تعلیم میں پڑھیے)

جناب فیض انصاری۔ کامٹی

چاند کی بڑھیا

دادی اماں آج پھر چاند میں بیٹھی ہوئی چرخہ کاتنے والی بڑھیا کی کہانی سنانے کی ضد کر رہی تھیں۔ ہم سارے بچے تو دادی اماں سے ان تین مسافروں کی کہانی سننا چاہتے تھے جو ۲۱ر دسمبر کو امریکہ کے راکٹوں کے اڈے "کیپ کینیڈی" سے چاند کے سفر پر روانہ ہوئے تھے اور ۲۷ر دسمبر کو بحرالکاہل میں جیٹ ہوائی کے قریب صحیح سالم اتر آئے تھے۔ لیکن ہم سے ایک غلطی یہ ہو گئی تھی کہ یہ نئی کہانی ہم نے اپنی ۷۰ سالہ دادی اماں سے سُننا چاہی تھی۔

اس غلطی کا احساس ہم لوگوں کو اس وقت ہوا جب ہم نے دادی اماں سے کہا کہ آج چاند کے بارے میں کوئی نئی کہانی سُنائیے اور دادی اماں نے اپنی کہانی کی ابتدا اُسی بڑھیا سے کی جو چاند میں بیٹھی نہ جانے کب سے چرخہ کات رہی ہے اور یقین جانیے یہ کہانی ہم میں سے ہر ایک نے سینکڑوں بار تو سنی ہوگی۔

دادی اماں ایک تو اونچا سنتی ہیں دوسرے ان کو اپنی بات پر اڑ جانے کی پرانی عادت ہے۔ ہم نے ہزار کوشش کی کہ دادی اماں ہمیں وہ کہانی سنائیں جو ہم سننا چاہتے ہیں یا پھر کہانی سنانے سے انکار کر دیں لیکن ہم اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور دادی اماں وہی کہانی سنانے لگیں جو وہ سنانا چاہتی تھیں۔

ہم میں سے ایک بچے نے دادی اماں سے کہا بھی کہ "دادی اماں چاند کی وہ بڑھیا تو کبھی کی مر کھپ گئی جو کبھی وہاں بیٹھی ہوئی چرخا کاتا کرتی تھی۔" مگر آپ جانیں دادی اماں پھر دادی اماں ہیں۔ وہ ہم سے عمر میں ہی بڑی نہیں ہیں تجربے اور مشاہدے میں بھی بہت آگے ہیں۔ انھوں نے پوری دنیا نہیں تو آدھی کے قریب تو دنیا ضرور دیکھی ہے اور ابھی ہم میں سے کسی نے بھی ابھی اپنا ہی شہر پورا نہیں دیکھا ہے۔

وہ چار بار تو حج کر آئی ہیں۔ ایک بار کربلا کی زیارت کو گئی تھیں۔ کچھ نہیں تو پندرہ بیس بار اجمیر شریف جا چکی ہیں۔ دو بار کلیر شریف بھی ہو آئی ہیں۔ بھلا وہ ہماری باتوں میں کیسے آ سکتی تھیں۔ ساری باتیں سن کر ایک زور کا قہقہہ لگایا اور جھٹ بولیں — "ارے بچو — یہ تم سے کس نے کہہ دیا ہے کہ چاند کی بڑھیا مر گئی — ارے اس بڑھیا نے تو آبِ حیات پی رکھا ہے اور جو ایک بار آبِ حیات پی لیتا ہے وہ پھر رہتی دنیا تک نہیں مرتا۔"

یہ بات تو ہم نے کتابوں میں بھی پڑھ لی تھی اسی لیے ہم خاموش ہو گئے اور دادی اماں کو اپنی بات آگے بڑھانے کا موقع مل گیا۔ وہ کہنے لگیں "جانتے ہو چاند کی بڑھیا میں

دن مرجائے گی۔ اس دن کے بعد چاند آسمان پر نظر نہیں آئے گا۔ جب چاند نہیں نکلے گا تو رات بھی نہیں ہوگی۔ سردی بھی نہیں پڑے گی۔ شبنم بھی نہیں گرے گی۔ لوگ باگ جاڑے کے موسم کو ترس جائیں گے۔ گیہوں کی پیداوار بند ہو جائے گی۔ سرد ملکوں کے لوگ گرمی سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیں گے اور گرم ملکوں کے انسان سورج کی آگ میں جل بھن جائیں گے۔"

دادی اماں خاموش ہوگئیں۔ ان کا دم پھولنے لگا تھا اور ہم اس خاموشی سے فائدہ اٹھا کر چپکے چپکے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے جیسے آنکھوں آنکھوں میں کہنا چاہتے ہوں کہ "لو اور کہو چاند کی نئی کہانی سناؤ۔"

ریڈیو پر سنا تھا کہ جو تین آدمی چاند کے سفر پر گئے تھے وہ بڑے بہادر اور بے خوف ہیں۔ زمین سے چاند کی دوری کوئی پونے تین لاکھ میل ہے۔ ان کا خلائی جہاز چاند سے صرف ساٹھ میل قریب پہنچ کر اس کے بازو سے نکل گیا تھا۔ اور پھر چاند کے گرد چکر کاٹنے لگا تھا۔ اس نے ہر دو گھنٹے میں چاند کا ایک چکر پورا کیا تھا۔ اور اس طرح اس نے ۱۰ چکر ۲۰ گھنٹوں میں پورے کئے۔ ان ۲۰ گھنٹوں میں اس تیز سے تیز رفتار جہاز میں بیٹھے بہادر انسانوں نے نہ صرف چاند کے دونوں طرف کی تصویریں اپنے کیمروں سے لیں بلکہ ان تصویروں کو اسی وقت زمین پر بھیجتے بھی رہے یہی نہیں ان تاریخی انسانوں نے ریڈیو کے ذریعہ چاند کا آنکھوں دیکھا حال بھی زمین والوں کو سنایا تھا۔

ابھی ہم لوگ ریڈیو پر سنی ہوئی کچھ اور باتیں یاد کر ہی رہے تھے کہ دادی اماں بول پڑیں، "ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟ ہاں چاند کی بڑھیا کے مرنے کی بات تھی۔ وہ کبھی نہیں مر سکتی اور یہ بھی سن لو کہ وہ اتنے بڑے چاند میں بالکل اکیلی ہے وہاں اس کا کوئی سنگی ساتھی نہیں ہے۔ البتہ آج سے ہزاروں سال پہلے چاند میں ایک دنیا ضرور آباد تھی۔ اس میں رہنے والے لوگ بہت خوبصورت ہوتے تھے۔ پریاں یہیں کی عورتوں کو کہتے تھے۔ یہ بالکل چاند کی طرح سفید ہوتی تھیں جیسے دودھ ہوتا ہے۔ کبھی یہ پریاں بچوں کے خوابوں میں بھی آیا کرتی تھیں اور ان کو چاند کی سیر کراتی تھیں۔"

"دادی اماں یہ پریاں ہمارے خوابوں میں تو کبھی نہیں آئیں؟" ایک بچے نے سوال کر دیا۔ دادی اماں ایک منٹ رک کر تھوڑے بگڑ کر بولیں

"ارے بگلے سنا نہیں کہ یہ بات اس وقت کی ہے جب چاند میں آبادی تھی۔"

"تو کیا اب آبادی نہیں ہے؟" اس لڑکے نے پھر سوال کیا۔

"ارے وہی تو میں بتانے جا رہی تھی مگر تو تو بیچ میں بول کر خلل ڈالتا ہے۔" دادی اماں پھر بگڑ گئیں۔

"آپ بتائیے دادی اماں۔ اب کوئی بھی بات میں خلل نہیں ڈالے گا۔" میں نے دادی اماں کو منا لیا اور دادی اماں پھر شروع ہو گئیں۔

"کہتے ہیں کہ چاند اس زمین کا ہی ایک ٹکڑا ہے جو اس سے کٹ کر الگ ہو گیا ہے۔ وہاں بھی یہاں کی طرح آبادی تھی۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ وہاں کے پہاڑ آگ اگلنے لگے وہاں ہماری دنیا کے پہاڑوں سے بھی اونچے پہاڑ ہیں۔ ان پہاڑوں کی یہ آگ کئی کئی من وزن کے شعلوں کی صورت میں زمین پر گرنے لگی۔ زمین پھٹنے اور اندر دھنسنے لگی۔ لوگ

چلنے اور مرنے لگے۔ اگر چہ یہاں کے لوگوں کے پر بھی تھے مگر وہ اڑ کر جاتے کہاں۔ زمین پر چاروں طرف پہاڑوں سے نکلنے والا لاوا بہہ رہا تھا اور اوپر ساری فضا گرم ہو گئی تھی۔ جو اڑنے کی کوشش کرتا اس کے پر جل جاتے تھے اور وہ زمین پر بہنے والے لاوے پر گر کر پانی ہو جاتا تھا۔"

"یہ تو قیامت کا نظارہ ہوا دادی۔" ایک لڑکا بول پڑا مگر اس بار دادی بگڑیں نہیں اور اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بولیں "ہاں ایک قیامت ہی تو تھی وہ۔ کسی دن ایسی ہی قیامت ہماری دنیا میں آئے گی۔"

"اور یہ دنیا بھی چاند کی دنیا جیسی بن جائے گی۔ کیوں دادی؟" پھر ایک لڑکا بول پڑا۔

مگر اس بار بھی دادی اماں ناراض نہیں ہوئیں اور مسکرا کر کہنے لگیں "ہاں بیٹا اس دنیا کو بھی ایک دن تہہ و بالا ہونا ہے۔ سن رہی ہوں کہ اس دنیا کے انسانوں نے کوئی ایسا بم بنایا ہے کہ اگر اس جیسے دس بیس بم دنیا پر گرا دیے جائیں تو اس دنیا کی ہر چیز پانی پانی ہو جائے۔ اس وقت نہ انسان بچیں گے نہ اس کے خوبصورت شہر۔ نہ ہرے بھرے جنگل رہیں گے نہ ہمالیہ جیسے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ۔ سب پانی ہو کر سمندر میں مل جائیں گے اور سمندر کا پانی اسی طرح اُونٹے گا جس طرح چائے کا پانی برتن میں اونٹتا ہے۔"

"ارے باپ رے۔" ایک لڑکے کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کو سن کر دادی کا کلیجہ بھی دھک سے ہو گیا ہم لوگ بھی ایک منٹ کے لیے کانپ گئے۔ مگر جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ لڑکا کیوں چیخ پڑا تھا۔ دادی اماں جس بم کی کہانی سنا رہی تھیں اس کا خوف اس لڑکے پر طاری ہو گیا تھا۔ اُس نے بعد میں بتایا کہ اُسے ایسا لگا کہ ہم سب کے سب ایک اونٹتے ہوئے سمندر کے اوپر بہہ رہے ہیں اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے خوبصورت شہر تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔

"میں تو اللہ سے یہی دعا کرتی ہوں کہ ہماری دنیا کو چاند کی دنیا کی طرح اجاڑ نہ دینا ورنہ چاند کی دنیا کی اکیلی بڑھیا کی طرح یہاں کے انسانوں کی روح بھی ایک بڑھیا بن کر مریخ کے رہنے والوں کو چرخہ کاتنے والی بڑھیا نظر آئے گی۔" اتنا کہہ کر دادی اماں ایک دم خاموش ہو گئیں۔

یاد رکھنے کی باتیں

۱۔ صبر کامیابی کی کنجی ہے۔
۲۔ علم وہ خزانہ ہے جو ختم نہیں ہوتا۔ خرچ کرنے سے اور بڑھتا ہے
۳۔ خوبصورت وہ ہے جو خوبصورت کام کرے
۴۔ محنت کامیابی کی سیڑھی ہے۔
۵۔ سنی سنائی باتوں کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔
۶۔ میٹھی زبان بادشاہ بناتی ہے۔
۷۔ وقت کو سونے سے زیادہ قیمتی سمجھو
۸۔ غصے میں شرافت کو ہاتھ سے نہ جانے دو
۹۔ دنیا میں آبرو کے ساتھ رہنا بادشاہی کے برابر ہے
۱۰۔ سچے اور ہمدرد دوست کی دل سے قدر کرو۔
۱۱۔ اگر تم عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کی عزت کرو۔
۱۲۔ ماں باپ کی دعا پتھروں کو پھوڑ کر راستہ بنا دیتی ہے

حسن جمیل اجمل

پیامِ سحر

(بڑے پیامیوں کے لیے)

سنگ[1] بھی نایاب گوہر علم سے ہو جائے گا
ایک اک ذرّہ منور[2] علم سے ہو جائے گا
خار[3] بھی رشکِ گلِ[4] تر علم سے ہو جائے گا
جانے کیا کیا فیض پاکر علم سے ہو جائے گا
ہے جو قطرہ وہ سمندر علم سے ہو جائے گا

زندگی کی اصل میں زینت اسی کے دم سے ہے
لطف اسی کے دم سے ہے عشرت[5] اسی کے دم سے ہے
اپنے اور بیگانوں کی الفت اسی کے دم سے ہے
الغرض ہر شخص کی عزت اسی کے دم سے ہے
نام روشن تیرا گھر گھر علم سے ہو جائے گا

علم سے گاندھی، جواہر لال بن سکتا ہے تو
میر اور غالب، جگر، اقبال بن سکتا ہے تو
علم کی برکت سے نیک اعمال بن سکتا ہے تو
یہ وہ دولت ہے کہ مالا مال بن سکتا ہے تو
تو جو چاہے گا میسّر علم سے ہو جائے گا

جان کر بھی قدر جو کرتا نہیں ہے علم کی
منزلِ مقصود اپنی پا نہیں سکتا کبھی
در بدر کی ٹھوکریں کھاتا ہے ایسا آدمی
لیکن اک شہکار بن سکتی ہے اس کی زندگی
سب سے اچھا سب سے بہتر علم سے ہو جائے گا

[1] پتھر [2] روشن [3] کانٹا [4] تازہ پھول [5] عیش

جناب دینا ناتھ گردھر

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

بڑے لوگ اکثر ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں یا ایسی حرکتیں کر گزرتے ہیں، جن سے عام آدمیوں کو سبق ملتا ہے یا طبیعت خوش ہوتی ہے۔ آج ہم آپ کو ایسے چند بڑے آدمیوں کی باتیں سناتے ہیں۔

(۱) ٹیگور

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا شمار دنیا کے بہت بڑے شاعروں میں ہے۔ ان کی نظموں کے ایک مجموعے کا نام گیتانجلی ہے۔ اس پر انھیں نوبل پرائز ملا تھا۔ پر شروع شروع میں جب انھوں نے شعر کہنا شروع کیا تو اخباروں رسالوں اور کتب فروشوں نے انھیں گھاس نہ ڈالی بیچارے بہت پریشان تھے۔ آخر انھوں نے ایک ترکیب سوچی۔ اپنی کئی اچھی نظمیں کچھ پرانے بوسیدہ کاغذوں پر لکھیں اور ان سب کے نیچے اپنے نام کی جگہ "بھانو سنگھ" لکھا۔ پھر کلکتہ کے کچھ بڑے عالم، شاعر، اخبار نویس اور کتب فروشوں کو کسی بزرگ کی معرفت ایک جگہ اکٹھا کیا اور انھیں وہ نظمیں دکھائیں اور بتایا کہ اب سے کوئی پچاس ساٹھ برس پہلے کے (بنگال کے) ایک بہت اچھے مگر گمنام شاعر بھانو سنگھ کی یہ نظمیں کہیں سے ہاتھ لگی ہیں۔ لوگوں نے نظمیں بہت پسند کیں اور وہ کتابی صورت میں فوراً شایع ہو گئیں۔ اخباروں نے اچھے اچھے تبصرے کیے۔ ایک صاحب نے تو ان نظموں پر ریسرچ کی اور برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اب بھانو سنگھ ایک بڑے شاعر سمجھے جانے لگے تو رابندر ناتھ ٹیگور نے یہ راز فاش کیا کہ وہ نظمیں تو خود ان کی لکھی ہوئی ہیں۔ سنسکرت میں روبندر اور بھانو کے ایک ہی معنی ہیں "سورج"۔ اب کیا تھا۔ روبندر ناتھ ٹیگور ایک دم اچھے شاعر مان لیے گئے۔

(۲) راک فیلر

راک فیلر کا شمار دنیا کے سب سے امیر لوگوں میں ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کے پاس اتنی دولت تھی کہ خود انھیں اس کا اندازہ نہ تھا۔ وہ بہت خیرات کرتے تھے۔ کروڑوں روپے ہر سال مختلف ہسپتالوں، سوسائٹیوں، یتیم خانوں،

بھی اداروں کو دیا کرتے تھے۔ ان کی اولاد ابھی ایسا ہی
تی ہے۔ ان کے ہاں سے کوئی ضرورت مند خالی نہ جاتا
۔ لیکن آدمی ذرا سوجھ بوجھ کے تھے۔ جو سوالی ان کے
س آتا تھا وہ اس کی شکل و صورت اور اس کی باتوں سے
کی صحیح ضرورت کا بخوبی اندازہ کر لیتے تھے۔ ایک دفعہ
ک آدمی ان کے پاس آیا اور ان کی خوشامد کرنے کے بعد
ن سے مدد چاہی۔ راک فیلر نے صاف انکار کر دیا۔ وہ آدمی
لا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کسی کا سوال رد نہیں کرتے
اہے وہ مدد کا مستحق ہو یا نہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
ک آپ کے بارے میں غلط کہتے ہیں۔ راک فیلر نے جواب
یا کہ میرے بارے میں تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے جتنی جلدی
یہ غلط فہمی اپنے دل سے نکال دو اچھا ہے۔ میں بہت
کنجوس آدمی ہوں اور ایک کنجوس آدمی محض اپنی تعریف
کے چند کلمے سن کر اپنی کمائی نہیں لٹاتا۔

(۳) پادری جیمز

البرٹ جیمز ایک مشہور (انگریز) پادری تھے۔ ان
کی طبیعت میں مذاق اور بذلہ سنجی بہت تھی۔ ایک دن وہ
تقریر کر رہے تھے۔ تقریر سننے والوں میں سے کسی نے
ایک لفافے پر ان کا نام لکھ کر آگے بڑھا دیا اور وہ بڑھتے
بڑھتے پادری صاحب تک جا پہنچا۔ انھوں نے لفافہ کھولا
تو اس پر صرف ایک لفظ لکھا تھا "فول" جس کا مطلب
ہے "بیوقوف"۔ پادری صاحب پرچہ پڑھ کر مسکرائے اور
کہا: "مجھے ابھی ابھی ایک پرچہ ملا ہے۔ اس پرچے کے
[illegible] اپنا نام تو لکھا ہے، لیکن وہ
پیغام لکھنا بھول گئے۔ میری تقریر ختم ہونے پر وہ مجھ سے
مل کر اپنا پیغام دے سکتے ہیں۔

(۴) کارل زیگلر

کارل زیگلر کا شمار جرمنی کے سب سے بڑے
سائنس دانوں میں ہے۔ انھیں کیمسٹری میں ریسرچ کے
لیے نوبل پرائز مل چکا ہے۔ انھوں نے ایک سائنس
کالج میں ۳۵ سال تک پڑھایا ہے۔ حال ہی میں
ریٹائر ہوئے ہیں۔ اپنی زندگی میں انھوں نے بہت
روپیہ کمایا۔ مگر جس دن ریٹائر ہوئے تو اپنا سارا روپیہ
جو چار کروڑ جرمن مارکس یعنی ساڑھے سات کروڑ روپے
تھا، اسی کالج کو خیرات میں دے دیا جہاں سے وہ ریٹائر
ہوئے تھے اور خود دور دیہات میں جا کر رہنے لگے کسی
نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ساری جائداد کیوں دے دی
اپنے لیے کچھ تو روک لی ہوتی۔ بولے کہ اسی کالج میں میں
نے ہزاروں طالب علموں کی مدد اور تعاون سے یہ دولت
کمائی ہے اور اب یہ دولت آئندہ نسلوں کے تعلیمی تجربات
کے لیے دے کر ہی مجھے سچی خوشی حاصل ہوئی ہے

سڈنی اسمتھ

پادری سڈنی سمتھ انگلستان کے مشہور پادری
تھے۔ وہ بہت بڑے عالم تھے اور ان کا مطالعہ بہت زیادہ
تھا۔ بیماریوں کے علاج میں وہ بڑے بڑے ڈاکٹروں
کو شرمندہ کرتے تھے۔ قانونی بحث میں وہ بڑے بڑے
وکیلوں کو ہرا دیتے تھے۔ ایک بار کسی بہت بڑے وکیل
سے ان کی بحث چھڑ گئی۔ پادری صاحب نے وکیل صاحب کا

جناب ضیا جعفر۔ بنگلوری

فرشتہ

کام کرنے والے

علی رضا .... وکیل

زاہدہ .... وکیل صاحب کی لڑکی

سجاد ظہیر ..... دوست یا شناسا

غفور اور کریم ...... نوکر

(شہر کے مشہور وکیل علی رضا کی عالیشان کوٹھی شام کا جھٹپٹا۔ وہ پورٹیکو میں کار ٹھہرا کر اندر داخل ہوتے ہیں کمرے میں ان کے ضروری کاغذات بکھرے پڑے ہیں۔)

علی رضا:۔ غفور! کریم! او کریم۔! کہاں مرگئے سب کے سب ۔ زاہدہ۔! کوئی ہے بھی؟

زاہدہ:۔ ابھی آئی ابا جان (دوڑتی ہوئی آتی ہے)

علی رضا:۔ (چہرے پر غصے کے آثار) یہ سب کیا ہے؟ یہ کمرہ ہے یا کباڑی کی دوکان؟ میرے وکالت کے کاغذات اِدھر اُدھر کیوں پڑے ہیں۔ سب کے سب کہاں مرگئے۔ ہزار بار کہا کہ نوکروں کو سر پر نہ چڑھاو!

زاہدہ:۔ ابا جان میں نے کہاں سر پر چڑھایا ہے۔ وہ ابھی کہیں گئے ہیں۔ آجائیں گے۔ آخر آپ ان سے چڑتے کیوں ہیں؟

علی رضا:۔ (غصہ سے) کیوں چڑتے ہیں، کیوں چڑتے ہیں — ہمیشہ کام ادھورا کرتے ہیں یوں چڑتے ہیں۔ کوئی آجائے تو گھر کی ایسی حالت دیکھ کر کیا کہے۔

زاہدہ:۔ ابا جان آخر وہ بھی تو انسان ہیں۔ دن بھر کام میں جٹے رہتے ہیں، انھیں بھی آرام چاہیے!

علی رضا:۔ (جھنجھلاکر) پھر وہی بات — دیکھتی نہیں ہو یہاں کتنی گندگی ہے۔ وہ ڈھنگ سے کام نہیں کرتے تو استعفیٰ دے کر کیوں نہیں چلے جاتے۔

زاہدہ:۔ ابا جان اتنی سی بات پر اتنی ناراضگی۔ بے چارے غریب ہیں لاچار ہیں، ان کی حالتِ زار پر رحم کیجیے۔

علی رضا:۔ (خفگی سے) میں اس وقت غریب امیر کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ہر ایک کو اپنا اپنا کام ڈھنگ سے کرنا چاہیے۔ کام کرنے کی کسی کو فکر نہیں مگر تنخواہ کے لیے اپنی مانگیں بڑھاتے جائیں گے۔ نالائق کہیں کے!

دوسرا منظر

(تھوڑی دیر کے بعد غفور کمرے میں داخل ہوتا ہے)

غفور:۔ سرکار آپ نے مجھے یاد فرمایا؟

علی رضا:۔ کہاں گیا تھا گدھے! دیکھتا نہیں دنیا بھر کی غلاظت بھری پڑی ہے اور تو گدھے کے سینگ کی طرح غائب...!

غفور:۔ ابھی صاف کرتا ہوں سرکار — دیکھیے باہر سجاد ظہیر صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔

علی رضا:۔ (سوچتے ہوئے) کون سجاد ظہیر؟

غفور:۔ وہی بڑے مالک کے دوست

علی رضا:۔ — اوہو — سجاد ظہیر — اچھا آنے دو۔

(نوکر جاکر سجاد ظہیر کو بلا لاتا ہے۔)

سجاد ظہیر:۔ السلام علیکم علی رضا صاحب۔

علی رضا:۔ وعلیکم السلام — تشریف رکھیے — کیسے آنا ہوا؟

سجاد ظہیر:۔ کیا بتاؤں حالات کچھ ایسے ناسازگار ہو گئے ہیں کہ مجھے آپ کے پاس آنا پڑا۔

علی رضا:۔ خیر تو ہے ظہیر صاحب؟

سجاد ظہیر:۔ میری بڑی لڑکی کی شادی اسی مہینے میں ٹھہر گئی ہے پیسوں کا انتظام ابھی تک نہیں ہوا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں۔

علی رضا:۔ (چھت کی طرف گھورتے ہوئے) میں کیا کہوں ظہیر صاحب دیکھیے دوستی میں پیسے کا لین دین ہو تو سمجھ لیجیے کہ یہ دوستی ناگواری میں بلکہ دشمنی میں بدل جاتی ہے۔

سجاد ظہیر:۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر مصیبت کے وقت اپنے ہی کام آتے ہیں۔ آپ کے والد مرحوم آج زندہ ہوتے تو میری مشکل منٹوں میں حل ہو جاتی۔

علی رضا:۔ — اچھا — (غصے سے اتنا کہہ کر اندر چلے جاتے ہیں)

سجاد ظہیر:۔ علی رضا کیا میں خالی ہاتھ لوٹ جاؤں — ؟ کاش آج آپ کے والد ہوتے.....

(نا امید ہو کر کچھ سوچتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں۔)

علی رضا:۔ (اندر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنے آپ سے) بڑی ڈینگیں ہانکتا ہے، کہتا ہے باپ کا بڑا دوست ہے۔ کیا خوب روپیے کے لئے دوستی کا کس طرح واسطہ دیتے ہیں۔

تیسرا منظر

(علی رضا ادھر اُدھر کچھ ڈھونڈنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ پھر غفور کو آواز دیتے ہیں۔)

علی رضا:۔ غفور! ابے او غفور!

غفور:۔ (دوڑتا ہوا) آیا حضور!

علی رضا:۔ دیکھو بدمعاش کہاں گیا۔ جلدی جاؤ۔ اسے پکڑ لاؤ۔

غفور:۔ (حیرت سے) سرکار کون بدمعاش؟

علی رضا:۔ (غصے سے) ارے پاگل وہی جو والد کا دوست بن کر آیا تھا۔ میز پر دس روپے کا نوٹ رکھا تھا۔ اب غائب ہے۔ وہی لے گیا ہوگا۔ جا جلدی سے پکڑ لا — چور کہیں کا —!

غفور:۔ سرکار — سجاد ظہیر بھلے آدمی ہیں وہ ایسی گری ہوئی حرکت کبھی نہیں کر سکتے۔ آپ ہی نے جلدی میں کہیں رکھ دیا ہوگا۔ وہ ایسے کمینے انسان نہیں ہیں —!

علی رضا: ارے بیوقوف تو مجھے سبق پڑھا رہا ہے۔ جا جلدی جا۔ اُسے پکڑ لا۔!

(دوڑ کر بیچ راستے سے سجاد ظہیر کو بلا لاتا ہے۔)

غفور: حضور سجاد ظہیر صاحب تشریف لائے ہیں

علی رضا: (نفرت سے) قبلہ ابھی آپ فرماتے تھے کہ والد مرحوم کے بڑے گہرے دوست ہیں۔ اور دس روپے کا نوٹ صفائی سے اڑا لیا! مجھے پولیس کو بلانا پڑے گا۔!!

سجاد ظہیر: (جیسے آسمان سے یکایک نیچے گر پڑے ہوں۔) بیٹا اس عمر میں میرے چہرے پر کالک مت لگاؤ۔ پروردگار کی قسم میں نے آج تک کسی کے پرائے مال کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ (یہ کہہ کر رونے لگتے ہیں)

علی رضا: (غصے سے) سب جانتا ہوں۔ بڑے بھولے بنتے ہو جیسے کچھ نہیں جانتے۔

(سجاد ظہیر بے آبروئی کے ڈر سے پیسے نکال کر علی رضا کو دیتے ہیں اور اپنی غریبی اور بے کسی پر آنسو بہاتے واپس چلے جاتے ہیں۔)

چوتھا منظر

(رات کا وقت۔ علی رضا اپنی لائبریری میں بیٹھے کوئی رسالہ پڑھ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوسرا رسالہ اٹھاتے ہیں اور جیسے ہی کھولتے ہیں اس میں سے دس روپے کا نوٹ گر پڑتا ہے۔ شرم سے ان کی گردن جھک جاتی ہے۔ اتنے میں زاہدہ کمرے میں داخل ہوتی ہے اور یہ نوٹ گرتا ہوا دیکھ لیتی ہے)

علی رضا: یہی وہ نوٹ ہے جس کے بارے میں (کہتے کہتے رک جاتے ہیں)

زاہدہ: (بدمزہ ہو کر) ابا جان آپ نے تو مفت میں غریب کو بدنام کیا۔ سب کے سامنے ذلیل و خوار کیا۔ آج کل آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ پھر شرمندگی اٹھاتے ہیں۔

علی رضا: (عاجزی سے) زاہدہ بیٹی، زیادہ شرمندہ نہ کرو۔ مجھے معاف کر دو۔ غصے کے عالم میں نہ جانے کیا کیا منھ سے نکل جاتا ہے۔ تم ہی بتاؤ اب میں کیا کروں؟

زاہدہ: چلیے۔ سجاد ظہیر صاحب کے گھر چلیے۔ ڈھونڈنے سے بھی ایسے سچے دوست نہ ملیں گے۔ آج کل وہ بڑی مشکل میں پھنسے ہیں۔ اپنی بیٹی کی شادی ابھی تک نہ کر سکے۔ جائیے آپ جا کر ان کی مدد کیجیے۔ اس سے اچھا موقع کبھی نصیب نہ ہوگا۔ غریب کے ٹوٹے دل کو جوڑیے۔ خدا بھی معاف کر دے گا!

پانچواں منظر

(سجاد ظہیر صاحب کا گھر۔ علی رضا اور زاہدہ اندر آتے ہیں۔)

علی رضا: (السلام علیکم کے بعد) سجاد ظہیر صاحب میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ آپ کا دل توڑا ہے۔ خدارا مجھے معاف کر دیجیے۔

سجاد ظہیر: (حیران ہو کر) ارے تم۔ علی رضا۔ کون سا گناہ؟ میاں ایسی بات منھ سے مت نکالو۔ بیٹی زاہدہ تم کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔

علی رضا۔ (آنکھوں میں آنسو لاکر) میں اس وقت اندھا ہوگیا تھا۔ مجھ سے غلطی سرزد ہوگئی۔ اللہ معاف کردیجیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہ بات دل سے نکال دیجیے۔ اپنی بیٹی کی شادی کے لیے میری جانب سے یہ حقیر تحفہ قبول فرمائیے (یہ کہہ کر پانچ ہزار روپے سامنے رکھ دیتے ہیں۔)

سجاد ظہیر۔ (ان روپوں کو لوٹاتے ہوئے) نہیں بیٹا..... مجھے نہیں چاہیے.... (مایوسی سے) بیٹا تم نے کچھ نہیں کیا۔ وقت ہی ایسا آلگا ہے، غریب ہونا ہی سب سے بڑا گناہ ہے۔

علی رضا۔ بے عزتی نہ کیجیے؛ لیجیے۔ یہ پیسے آپ کے ہیں۔

(روپے پھر سجاد ظہیر کے ہاتھ میں دیتے ہیں۔)

سجاد ظہیر۔ میاں علی رضا۔ غلطی سب سے سرزد ہوتی ہے پر تعریف کے قابل ہے وہ انسان جو غلطی معلوم ہونے پر پچھتائے، شرمندگی محسوس کرے۔ آدمی غلطی نہ کرے تو سمجھو وہ فرشتہ ہے۔

علی رضا۔ پر آپ نے میری اتنی بڑی گستاخی کو معاف کردیا آپ آدمی نہیں فرشتہ ہیں (ان کے قدم چھو لیتے ہیں)

پردہ گر جاتا ہے

(صرف خیال مہدی سے)

جناب سید محمد شفیع تمنا گنگوہی

اکبر کا طوطا

کتنا پیارا، کتنا اچھا!
دیکھو یہ اکبر کا طوطا
کتنا بھولا بھالا ہے یہ
اماں ابا کہتا ہے یہ
بولی اس کی کتنی پیاری
میٹھی میٹھی، بھولی بھالی
اس کے میٹھے بول کو سن کر
خوش ہوتے ہیں اسلم، اکبر
منہ جب کوئی اس کا چڑائے
یہ بھی اس کی نقل دکھائے
غیر کوئی جب گھر میں آئے
طوطا فوراً شور مچائے
ہے تو یہ حیوان ہی بچو
مگر ہے کتنا پیارا بچو
تم بھی بنو ایسے ہی اچھے اکبر کا یہ طوطا جیسے

جناب قاضی محمد احمد لکچرر جامعہ کالج

اتر پردیش

آئیے آج آپ کو اتر پردیش کا کچھ حال سنائیں۔ کہتے ہیں شہروں میں دہلی ہندوستان کا دِل ہے تو صوبوں میں بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ صوبہ ہندوستان کا دِل ہے اور اس میں کچھ زیادہ مبالغہ نہیں۔ یہاں کا رہن سہن، یہاں کی بات چیت کا انداز یا تہذیب و تمدّن یہاں کی شائستگی یا آپس میں ملنے جلنے کا ڈھنگ دوسرے صوبوں کے لیے مثال اور نمونے کا کام دیتا ہے۔ جو ہندو مذہب اور دوسرے مذہبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ جس نے بڑے بڑے عالم پیدا کیے ہیں، بڑے بڑے لیڈر پیدا کیے ہیں، آزادی کی لڑائی میں جس کا نام ہمیشہ اونچا رہا ہے۔ دیس کے تین وزیرِ اعظم (پنڈت جواہرلال نہرو، لال بہادر شاستری، اندرا گاندھی) اسی صوبے کے ہیں اور ہاں ابھی اس وقت تو آپ کے راشٹرپتی بھی اسی صوبے کے ہیں۔ ہندوستان کے سب سے زیادہ متبرک شہر بنارس، متھرا، اجودھیا، الہ آباد وغیرہ اسی صوبے میں ہیں۔ سب سے زیادہ متبرک اور مقدس گنگا اور جمنا اسی صوبے میں ہیں

اس صوبے یا ریاست کے شمال یا اتر میں نیپال۔ تبت ہے۔ مشرق یا پورب میں ہندوستان کی ریاست صوبۂ بہار ہے۔ جنوب یا دکھن میں مدھیہ پردیش ہے مغرب یا پچھم میں راجستھان ہے، دہلی ہے اور ہریانہ ہے شمال مغرب میں ہماچل پردیش ہے۔

یہ ریاست ۷۷ درجہ مشرقی طولُ البلد سے مشرقی طول البلد اور ۲۴ درجہ شمالی عرض البلد — ۳۱ درجہ شمالی عرض البلد کے خطوط تک پھیلی ہوئی۔ اس کا رقبہ ۱۱۳۴۵۴ مربع میل ہے۔ رقبہ کے لحاظ ہندوستان کی یہ چوتھی بڑی ریاست ہے۔ اس سے ریاستیں مدھیہ پردیش، راجستھان اور مہاراشٹر بڑی

اتر پردیش کی آبادی تقریباً ½ ۷ کروڑ ہے۔ یہ ہندوستان کی کل آبادی کی ⅙ ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان ہندوستان سے الگ کیا گیا تو اس وقت اس نئے ملک (پاکستان) کی آبادی اتر پردیش کی موجودہ آبادی سے کچھ کم تھی۔ یہاں ۶۵۰ آدمی فی مربع میل رہتے ہیں۔

اتر پردیش میں پہاڑ بھی ہیں میدانی علاقہ بھی ہے اور سطح مرتفع بھی۔ شمال میں ہمالیائی حصہ اور جنوب میں سطح مرتفع ہے لیکن زیادہ حصہ میدانی ہے جسے گنگا کا میدان کہتے ہیں۔ یہ میدان دنیا کے سب سے زرخیز میدانوں میں گنا جاتا ہے۔

اتر پردیش میں بہت سے دریا بہتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم گنگا اور جمنا ہیں ان کے علاوہ دوسرے اہم دریا رام گنگا، گھاگھرا، گومتی اور بیتوا ہیں۔

اور سنیے ہمارے اتر پردیش میں ۵۴ ضلعے ہیں۔ اتنے ضلعے ہندوستان کی کسی دوسری ریاست میں نہیں ہیں۔

اتر پردیش میں لوگ زیادہ تر دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ اس ریاست میں ایک لاکھ بارہ ہزار (۱۱۲۰۰۰) گاؤں ہیں لوگوں کا پیشہ کھیتی باڑی ہے۔ کافی رقبہ کے لیے آبپاشی کی سہولتیں میسر ہیں۔ ہندوستان کا سب سے زیادہ آبپاشی والا رقبہ اسی ریاست میں ہے جو ہندوستان کے کل آبپاشی والے رقبے کا ۲۰ فی صدی ہے۔

اتر پردیش کی مٹی بہت زرخیز ہے یہاں کے کسان بھائی بہت سی فصلیں اگاتے ہیں۔ یہاں ہندوستان کا ۴۷ فی صدی گنا ۳۴ فی صدی گیہوں ۳۵ فی صدی جو ۳۷ فی صدی چنا اور ۲۴ فی صدی مٹر کی کاشت کی جاتی ہے۔ آپ نے بازار میں الہ آباد کے امرود، لکھنؤ کے آم، خربوزے اور دسہری دروں کی لیچی کی آوازیں پھل والوں کی دوکانوں سے گونجتی تو سُنی ہوں گی — یہ پھل اس ریاست میں کثرت سے پیدا کیے جاتے ہیں اور اب تو یہاں کے قلمی آم دوسرے ملکوں میں بھی بہت مقبول ہو رہے ہیں اور کافی مقدار میں باہر بھیجے جاتے ہیں

اتر پردیش میں بہت سی صنعتیں ہیں۔ شکر جو آپ لوگ چائے دودھ میں استعمال کرتے ہیں اسی ریاست سے حاصل کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی تقریباً نصف شکر یہ ریاست تیار کرتی ہے۔ اس کے کارخانے سہارنپور، میرٹھ مظفر نگر، بلند شہر، گورکھپور، بریلی، بستی اور گونڈہ اور دیوریا میں ہیں۔ کانپور میں سوتی اونی کپڑے کے کافی کارخانے ہیں۔ بنارس میں ریشمی کپڑا اور ریشمی ساڑیاں تیار ہوتی ہیں۔ مرزا پور کے قالین، علی گڑھ کے تالے اور فیروز آباد کی چوڑیاں مشہور ہیں۔ مرزا پور میں ایلومنیم اور سیمنٹ کے کارخانے ہیں۔ غازی آباد میں بجلی اور انجینیرنگ وغیرہ کے کارخانے ہیں۔ بریلی میں فرنیچر یا میز کرسی کا کام، فرخ آباد میں کپڑوں پر چھپائی کا کام، مرادآباد میں بھرت کے برتنوں کا کام بڑے پیمانے پر ہوتا ہے

لوگوں کا پہناوا سادہ ہے۔ مرد زیادہ تر دھوتی کرتا اور ٹوپی پہنتے ہیں۔ عورتیں ساڑی یا گھاگھرا اور کرتا پہنتی ہیں پاجامہ اور شلوار کا استعمال زیادہ تر مسلمان مردوں اور عورتوں میں ہے۔ مسلمان مرد عام طور کرتے پر شیروانی بھی پہنتے ہیں۔ آج کل شہروں میں خاص طور پر کوٹ پتلون کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔

اتر پردیش میں بہت سے تہوار منائے جاتے ہیں مثلاً ہولی، رکشا بندھن، دسہرہ، دیوالی، عیدالفطر، عید، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلعم کے جنم دن جنم اشٹمی وغیرہ۔

اس ریاست میں بہت سی تاریخی عمارتیں بھی ہیں۔ آپ نے تاج محل کا تو نام سُنا ہوگا۔ کیا خوب عمارت ہے۔ اسے شاہ جہاں بادشاہ نے بنوایا تھا۔ یہ عمارت سنگ مرمر کی بنی ہے۔ آگرے میں اس عمارت کے علاوہ اعتمادالدولہ کا مقبرہ، قلعہ اور اس کے قریب سکندرہ میں اکبر بادشاہ کا مقبرہ فتحپور سیکری میں خواجہ سلیم چشتی کا مقبرہ اور اکبر کی راجدھانی کے محلات ہیں۔ لکھنؤ جو اتر پردیش کا دارالخلافہ ہے، یہاں اودھ کے نوابوں کی بنائی ہوئی عمارتیں ہیں ان میں امام باڑہ بہت خوبصورت بنا ہوا ہے۔

گنگا اور جمنا الہ آباد میں ملتے ہیں۔ اسے ہم پریاگ کہتے ہیں۔ یہ ہندوؤں کا متبرک شہر ہے۔ یہاں کمبھ کا مشہور میلہ لگتا ہے۔ پورے ملک سے لوگ کمبھ کے زمانے میں گنگا میں نہانے آتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ چاچا نہرو یہیں پیدا ہوئے تھے سابق وزیر اعظم بھی یہیں کے رہنے والے تھے۔ اتر پردیش میں اس کے علاوہ کئی اور متبرک شہر ہیں مثلاً بدری ناتھ ہردوار، متھرا، ایودھیا اور وارانسی (بنارس)۔ ان شہروں میں ہندوستان کے بہت مشہور اور خوبصورت مندر ہیں۔

اتر پردیش میں آمدورفت کے ذرائع کافی ہیں۔ جتنی ریلوے لائنیں اس ریاست میں ہیں اتنی کسی دوسری ریاست میں نہیں ہیں۔ یہاں ریلوں کا جال سا بچھا ہوا ہے تقریباً سب ہی شہر ریل کے راستوں سے ملے ہیں۔ پکی سڑکیں بھی کافی ہیں۔ ان سڑکوں کی لمبائی اڑتیس ہزار ۳۸۰۰۰ میل ہے۔

آزادی کے بعد سے اس صوبے میں تعلیم کی بہت ترقی ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں انٹر کالج اور ڈگری کالج کھل گئے ہیں۔ آٹھ یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں دو زرعی یا کھیتی باڑی کی یونیورسٹیاں ہیں۔ ایک انجینیرنگ کی یونیورسٹی ہے۔ یہ رڑکی میں ہے۔

شہروں اور قصبوں میں بول چال کی زبان اُردو ہے۔ دیہاتوں میں بول چال کی کئی زبانیں ہیں مثلاً کھڑی بولی، اودھی بھوجپوری وغیرہ۔ سرکاری زبان ہندی ہے۔

لطیفے

باپ : منے میاں ذرا پنکھا تو جھلو۔ نیند آگئی تو اکنی انعام

منا پنکھا جھلنے لگا۔ اباجان کو نیند آگئی۔ منے نے جھٹ جگا دیا اور بولا، دیکھیے آپ سو گئے۔ اب لائیے انعام!

بچہ : (پولیس سے) جلدی چلیے۔ ایک آدمی کی بیا جی سے لڑائی ہو رہی ہے!

پولیس والا: ارے ارے تم نے پہلے کیوں نہ بتایا!

بچہ : جی پہلے تو ابا جی اوپر تھے۔ اب وہ نیچے آگئے ہیں۔

جمیل: کیوں بھئی، یہ موٹے آدمی اتنے شریف کیوں ہوتے ہیں؟

اجمل: نہ تو بے چارے لڑ سکتے ہیں، نہ دوڑ سکتے ہیں!

حسن جمیل اجمل گورکھپور

چوہیا کا سوئمبر

گنگا ندی کے کنارے ایک سادھو کی کٹیا تھی سادھو گنگا کے کنارے پوجا کر رہا تھا۔ پانی سے بھری اس کی ہتھیلی میں اوپر سے ایک چوہیا گر گئی۔ یہ چوہیا باز کے پنجے سے چھوٹ کر گری تھی۔ سادھو کو اس پر ترس آیا پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ انھوں نے اس چوہیا کو لڑکی بنا دیا اور اسے اپنی بیٹی کی طرح پالا پوسا۔

جب لڑکی سیانی ہو گئی تو سادھو کی بیوی نے سادھو سے کہا کہ اب اس لڑکی کی شادی کر دینی چاہیے۔

سادھو نے پہلے سورج کو بلوایا اور اپنی لڑکی سے پوچھا۔ بتاؤ بچی، تمام دنیا میں اجالا کرنے والا یہ سورج تمھیں پسند ہے؟ اگر تمھیں پسند ہو تو میں تمھاری شادی اسی سورج سے کر دوں۔

لڑکی بولی نہیں بابا۔ یہ تو آگ سے بھی زیادہ گرم ہے۔ یہ مجھے پسند نہیں۔

سادھو نے تب سورج سے پوچھا کہ آپ اپنے سے اچھا کوئی رشتہ بتا دیں۔

سورج نے کہا، مجھ سے اچھا بادل ہے وہ مجھے اپنی چادر میں چھپا لیتا ہے۔

سادھو نے بادل کو بلا کر لڑکی سے پوچھا: کیا یہ تمھیں پسند ہے؟

لڑکی بولی: نہیں۔ یہ تو بہت کالا ہے۔

سادھو نے تب بادل سے پوچھا: آپ سے اچھا کوئی رشتہ نظر میں ہو تو بتائیے۔

بادل نے کہا: مجھ سے بھی اچھا۔ مجھ سے اچھی تو بس ہوا ہے جو مجھے اڑائے لیے پھرتی ہے۔

سادھو نے تب ہوا کو بلایا اور لڑکی سے وہی سوال دُہرایا۔

لڑکی نے جواب دیا: بابا یہ تو بہت چنچل ہے۔ کہیں

اس سے بھی اچھا بر بتایئے۔

سادھو نے پھر ہوا سے بھی وہی سوال دہرایا کہ
تم سے اچھا کون ہے۔

ہوا نے کہا: مجھ سے اچھا پہاڑ ہے۔ وہ تیز سے تیز

آندھی میں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔

سادھو نے پہاڑ کو بلایا۔

لڑکی نے پہاڑ کو دیکھ کر کہا: یہ تو بہت سخت ہے
اس سے بھی کوئی اچھا بر بتایئے۔

سادھو نے پہاڑ سے پوچھا: آپ اپنے سے بھی
اچھا کوئی بر بتایئے۔

پہاڑ نے کہا: مجھ سے اچھا تو بس چوہا ہے۔ وہ
مجھے توڑ کر بل بنا لیتا ہے۔

سادھو نے تب چوہے کو بلوایا۔ لڑکی نے چوہے
کو بہت غور سے دیکھا۔ اس کی چال ڈھال اور شکل و صورت
سے اپنایت ٹپک رہی تھی۔

لڑکی نے سادھو سے کہا: بابا، یہ چوہا مجھے پسند
ہے۔ آپ مجھے چوہیا بنا کر چوہے کے ساتھ میرا بیاہ کر دیجیے۔
سادھو نے اس لڑکی کو پھر سے چوہیا بنا کر چوہے
کے ساتھ اس کا بیاہ رچا دیا۔

—×—

گرم مزاج سے یہ کہانی سننے کے بعد بھی الو شاہ کے
سپاہی کوّے شاہ کے خاص وزیر کو اپنے قلعے میں لے گئے۔
الو شاہ کے حکم سے کوّے کو اپنی پسند کی جگہ چن لینے کو
کہا گیا۔ کوّے نے اپنے لیے قلعے کے پھاٹک کے پاس رہنا پسند
کیا تاکہ موقع آنے پر قلعے سے باہر بھی نکل سکے۔ ہوشیار
کوّے نے الو شاہ سے کہا، مہاراج میرے لیے تو آپ کے در
کی دھول بہت ہے۔ میں آپ کے دروازے پر ہی پڑا ہوا اپنی
زندگی کے دن گزار دوں گا۔

کوّے کی ان چکنی چپڑی باتوں سے الو شاہ بہت
خوش ہوا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کوّے کے کھانے
پینے کا خاص خیال رکھا جائے۔

کوّے نے بھی خوب حلوہ مانڈہ اڑایا۔ اور تھوڑے
ہی دنوں میں پہلے کی طرح خوب موٹا تازہ ہو گیا۔ گرم مزاج نے
جب کوّے کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو اس نے دوسرے وزیروں
کو چیتاونی دیتے ہوئے کہا: ایسا لگتا ہے کہ الوؤں کی یہ
جماعت یا بیوقوفوں کی منڈلی ہے جیسے کہ سونے کی مینگنی دینے
والی چڑیا نے کہا تھا کہ یہ سب بیوقوفوں کی ٹولی ہے۔

وزیروں نے پوچھا: ارے یہ کس چڑیا کی بات تم
نے کی؟

تب گرم مزاج نے سونے کی چڑیا کی یہ کہانی سنائی

جناب علی وصی تشنہ

مرزا غالب خط کیسے لکھتے تھے

(آٹھویں سے دسویں درجے تک کے لڑکوں کے لئے)

مرزا غالب کے لطیفے تو آپ نے پڑھے ہوں گے کتنے دلچسپ ہیں۔ میں آج اُن کے خطوں کے بارے میں آپ کو کچھ باتیں بتاؤں گا، موقع ملے تو ان خطوں کو ضرور پڑھئے اُن کے لطیفوں کی طرح اُن کے خطوں کو بھی آپ دلچسپ اور مزے دار پائیں گے۔

مولانا حالی کے خیال کے مطابق مرزا غالب نے ۱۸۵۰ء اور اس کے بعد اُردو میں لکھنا شروع کیا اس سے پہلے زمانے کے چلن کے مطابق وہ بھی فارسی ہی میں خط لکھتے تھے۔ اس وقت کے پڑھے لکھے لوگ اُردو نثر میں لکھنا بُرا خیال کرتے تھے۔ لیکن غالب وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اُردو میں خط لکھنے کی ابتدا کی اور اُن خطوں کو ایک خاص انداز سے لکھا۔ اُن کے خطوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مجموعے سلسلے وار اس طرح سے ہیں:۔

(۱) اُردوئے معلیٰ۔ (۲) مکاتیب غالب۔ (۳) عودِ ہندی اور نادراتِ غالب۔

آپ میں سے اکثر بچوں کو بزرگوں نے مثلاً والدین وغیرہ نے بتلایا ہوگا کہ سب سے پہلے خط کے اُوپر دائیں طرف جگہ کا نام اور ٹھیک اُس کے نیچے خط لکھنے کی تاریخ لکھو۔ لیکن مرزا غالب نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اس طریقے کو بہت کم اپناتے ہیں، وہ زیادہ تر خط کے خاتمے کے بعد ایک الگ سطر میں جگہ کا نام اور تاریخ لکھ دیتے ہیں۔ کبھی خط کے شروع میں پہلی سطر میں جگہ کا نام اور تاریخ لکھ دیتے ہیں، کبھی صرف تاریخ لکھ دیتے ہیں اور کبھی صرف جگہ کا نام اور کبھی کبھی تو وہ نہ تاریخ لکھتے ہیں اور نہ جگہ کا نام۔

دوسری بات یہ کہ آج بھی شاید بھاری بھرکم اور لمبے القاب آداب لکھنے کی ہدایت ہوتی ہو گی مگر آپ جانتے ہیں کہ القاب آداب لکھنے میں جگہ بہت زیادہ گھر جاتی ہے فائدہ کچھ بھی نہیں۔ مرزا غالب نے بھی اسے محسوس کیا اور اس پر اپنے طریقے کو ختم کر دیا۔ وہ خط کو۔ میاں، بھائی، بھائی صاحب، جناب، جنابِ والا، حضرت، قبلہ، برخوردار وغیرہ مختصر لفظوں سے شروع کرتے ہیں۔ البتہ جب وہ اپنے بزرگوں اور نوابوں کو خط لکھتے ہیں تو القاب کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ القاب بھی بڑے مختصر ہوتے ہیں۔

غالب کا خیال تھا کہ خط سے آدھی ملاقات، بلکہ آدھی
سے بھی زیادہ ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے وقت یہ سوچ
لیتے ہیں کہ جسے وہ خط لکھ رہے ہیں (یعنی مکتوب الیہ) وہ اُن
کے سامنے بیٹھا ہے اور پھر اسی لحاظ سے باتیں کرنے کے انداز
میں لکھنے لگتے ہیں۔ اس خوبی سے خط میں مکالمہ یا آپس کی
بے تکلف بات چیت کا لطف آجاتا ہے۔

اپنے ایک خط میں وہ خود لکھتے ہیں :۔ "پیر و مرشد یہ
یہ خط نہیں ہے باتیں کرنی ہیں، اور یہی سبب ہے کہ میں
القاب و آداب نہیں لکھتا۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔ "مرزا صاحب میں
نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے
ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔۔۔۔ کیا تم نے مجھ
سے بات چیت کرنے کی قسم کھائی ہے۔ اتنا تو کہو کہ یہ کیا
بات تمھارے جی میں آئی ہے۔"

مرزا غالب کبھی کبھی القاب کے لئے ایک لفظ
بھی نہیں لاتے اور خط کو بڑے دلچسپ انداز سے شروع
کر دیتے ہیں۔ اُن کے ایسے خطوں میں ایک خاص ڈرامائی
کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ جو شخص بھی اُن خطوں کو پڑھتا ہے
وہ اپنی نگاہوں کے سامنے ایک تصویر دیکھتا ہے۔ گویا
ایک واقعہ کو ہوتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔

یوسف مرزا کے نام ایک خط کو اس طرح سے
شروع کرتے ہیں :۔

"کوئی ہے، ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب
وہ آئے۔ میاں میں نے خط تم کو بھیجا ہے مگر ایک سوال
کا جواب رہ گیا ہے۔"

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط کو اس طرح
شروع کرتے ہیں :۔

"میاں لڑکے کہاں پھر رہے ہو! ادھر آؤ خبریں
سنو۔"

یا ایک اور خط جو مرزا تفتہ کے نام ہے اُس کو
یوں شروع کرتے ہیں :۔

"آؤ مرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ! بیٹھو اور
میری حقیقت سنو!"

مرزا کے مزاج میں شوخی اور زندہ دلی کوٹ،
کوٹ کر بھری تھی، وہ نہ صرف زبانی گفتگو یا بات چیت میں
میں اپنے ملنے والوں اور دوستوں کو ہنساتے رہتے تھے بلکہ
اپنے خطوں کے ذریعہ مکتوب الیہ سے بھی اس کے مزاج اور رتبہ
کے مطابق ایسی باتیں کرتے کہ وہ مسکرا پڑتا۔ بات میں بات
نکالنے کی عادت نے ہمیشہ ان کی مدد کی۔ غالب کی اسی
زندہ دلی اور ظریفانہ طبیعت کو دیکھتے حالی نے اِن کو
"حیوانِ ظریف" کے نام سے یاد کیا ہے۔

یہاں پر میں کچھ خطوں کے ٹکڑے پیش کرتا ہوں
جن سے غالب کی ظریفانہ اور پُرسوز طبیعت کا اندازہ ہوگا
وہ منشی نبی بخش حقیر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔ "دھوپ
بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلائے
رکھتا ہوں کبھی پانی پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا
یہاں کے لوگ عجب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں۔ میں تو
روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ روزہ
نہیں رکھتا۔"

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں بائیس مہینے

کے بعد اپنی پنشن کے دوبارہ جاری کئے جانے کا تذکرہ
کرتے ہوئے خدا کا شکر اس طرح بجا لاتے ہیں۔ "حکام
سے مجھ کو عزت دلوائی، میرے صبر و ثبات کی داد لی۔
صبر و ثبات بھی اسی کا بخشا ہوا تھا، میں کیا اپنے باپ
کے گھر سے لایا تھا؟"

انگریزوں نے جب یہ حکم دیا کہ اب پنشن بجائے ماہانہ
دینے کے چھ چھ مہینے پر سال میں دو بار دی جائے گی تو
غالب اس کا تذکرہ اپنے ایک خط میں کرتے ہوئے
مرزا تفتہ کو ایک قطعہ بھی لکھ بھیجتے ہیں جو ان کی شوخی
اور زندہ دلی کا ثبوت ہے ؎

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی پہ دارو مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقید حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

غالب کا کمال یہیں وہاں نظر آتا ہے جہاں وہ
رونے رلانے کی بات میں بھی ہنسی مذاق کا پہلو نکال لیتے ہیں
وہ اپنے دوست مرزا حاتم علی بیگ مہر کی بیوی
کی وفات کی تعزیت کرتے ہیں۔ کس طرح کرتے
ہیں۔ خود ہی پڑھ لیجیے:۔

"مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ کسی کے
مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے، کیسی اشک
فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم
نہ کھاؤ، اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان
نہ سہی منا جان ہی سہی۔"

مرزا اپنی عمر کے آخری زمانے میں سخت بیمار
تھے کہ نواب مرزا غلام بابا جان نے انھیں بلوایا مرزا غالب
نے اپنے نہ آسکنے کی معافی مانگی اور اپنی مجبوری بتلائی
انھوں نے اس خط میں بھی اپنی بیماری کا تذکرہ کرتے
وقت ہنسی کا پہلو نکال لیا۔ غالب لکھتے ہیں۔

"صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں، اور
پھر دمبدم پیشاب کو اٹھنا ان مجموعۂ مصائب میں سے
ایک ادنیٰ مصیبت یہ ہے کہ ۱۲۸۲ھ شروع ہوئے
۱۲۱۲ھ کی ولادت ہے، اب کے رجب کے مہینے سے
سترواں سال شروع ہوگا سترا بہترا بوڑھا اپاہج
آدمی ہوں، جو عنایت تم میرے حال پر فرماتے ہو صرف
تمھاری خوبی ہے۔ میں کسی لائق نہیں۔
نجات کا طالب، غالب۔ چہار شنبہ۔
۳۱ مئی ۱۸۶۶ء"

غالب کے یہ خط صاف اور سادہ زبان میں ہیں
پھر بھی بڑے دلچسپ ہیں۔

یہ تو تھیں غالب کے خطوں کی کچھ خصوصیتیں۔ اب
اگر آپ ان خطوں کو پڑھیں تو غالب کی پوری زندگی ان
خطوں میں بکھری ہوئی ملے گی ان کی پیدائش سے لیکر موت
کے قریب تک کے واقعات ان خطوں میں لکھے ہیں۔ غدر
کے حالات۔ دلی کے اجڑنے کی کہانی۔ یہ سب چیزیں آپ
کو ان خطوں میں ملیں گی۔ غالب نے جس خاص انداز سے
خطوں کو لکھا ہے ان کو دیکھتے ہوئے حالی نے ٹھیک
ہی لکھا ہے کہ:۔

"نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ
اختیار کیا اور نہ اُن کے بعد کسی سے پوری پوری تقلید ہو سکی۔"

جناب رضوان احمد بارہ بنکوی

تین تحفے

(ایک ہندوستانی لوک کہانی)

کسی گاؤں میں عیدو نام کا ایک سیدھا سادھا آدمی رہتا تھا۔ عیدو کے ہاں کوئی بال بچہ نہ تھا۔ بس وہ اور اس کی بیوی۔ پھر بھی ان کی گزر بسر مشکل سے ہوتی تھی کیوں کہ عیدو میاں اول تو کام سے جی چراتے تھے، کوئی کام کرتے بھی تو اُسے بگاڑ دیتے اس لیے لوگوں نے گاؤں میں انھیں کام دینا ہی بند کر دیا اب تو عیدو میاں کو بڑی پریشانی ہوئی۔ چار و ناچار انھوں نے پردیس جانے کی ٹھانی۔ ایک دن انھوں نے اپنی بیوی سے کہا "کل صبح میں پردیس جا رہا ہوں، میرے لیے روٹیاں پکا دینا۔" صبح بیوی نے تین روٹیاں پکائیں، کچھ سبزی رکھی اور انھیں لے کر عیدو میاں روانہ ہو گئے۔

چلتے چلتے دوپہر ہو گئی۔ عیدو میاں سستانے کے لیے ایک پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ سستانے کے بعد انھوں نے سوچا کہ کچھ کھایا پیا جائے۔ روٹیاں کھولیں اور سوچنے لگے، ایک کھاؤں، دو کھاؤں کہ تینوں کو کھا جاؤں۔ بچارے اسی شش و پنج میں پڑے تھے۔ سوچتے سوچتے وہ اسی کی گردان کرنے لگے۔ "ایک کھاؤں، دو کھاؤں کہ تینوں کو کھا جاؤں۔"

اتفاق سے اس پیپل کے پیڑ پر تین بھوت رہتے تھے جب ان تینوں نے عیدو میاں کو یہ کہتے سنا تو بہت ڈرے۔ انھوں نے سمجھا شاید اس نے ہمارے بارے میں جان لیا ہے اور ہمیں کھانا چاہتا ہے۔ اب وہ اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

تینوں بھوت ہاتھ جوڑ کر عیدو میاں کے سامنے آئے اور کہا۔

"حضور ہم آپ کی خدمت میں ایک قیمتی تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔"

عیدو ان تینوں کو دیکھ کر گھبرائے لیکن تحفے کی بات سن کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ انھوں نے ہمت کر کے پوچھا "تم ہمیں تحفہ کیوں دینا چاہتے ہو؟"

"حضور آپ ہم لوگوں کی جان بخش دیں۔ ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ ایک کھاؤں، دو کھاؤں کہ تینوں کو کھا جاؤں۔ اتفاق سے ہم میں سے کوئی بھی مرنا نہیں چاہتا۔ ہم آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہیں۔"

عیدو میاں سارا ماجرا سمجھ گئے۔ انھوں نے نڈر ہو کر کہا "اچھا آج میں کسی کو نہیں کھاؤں گا۔ جاؤ میرے لیے تحفہ لاؤ۔" تھوڑی ہی دیر میں بھوتوں نے ایک کپڑے کا جھولا لا کر عیدو کے سامنے ڈال دیا۔

"اچھا تم لوگ مجھ سے مذاق کرتے ہو! میں کسی کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے یہ کپڑے کا معمولی جھولا دے رہے ہو۔ یہی ہے تمھارا تحفہ؟"

"حضور یہ کوئی معمولی جھولا نہیں ہے۔ پہلے اسے آزما کر تو دیکھیے۔ یہ بہت قیمتی جھولا ہے۔"

"ہونہہ، یہ کپڑے کا میلا جھولا (تھیلا) اور قیمتی ـــ! بھلا کون سے لعل ٹنکے ہیں اس میں؟"

"حضور آپ کی جو بھی خواہش ہوگی اُسے یہ جھولا پوری کرے گا۔ کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے تو اس سے ابھی طلب کریں۔ یہ فوراً فراہم کرے گا۔"

"اچھا میں ابھی اس کا امتحان لیتا ہوں۔ مجھے ابھی تازہ تازہ گرم گرم پوریاں چاہئیں۔" ابھی عیدو کے منھ سے بات پوری نکلی بھی نہ تھی اور جھولے میں پوریاں موجود تھیں ـــ! عیدو میاں جھولے کی کرامت دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور وہاں سے رخصت ہوئے۔

راستے میں عیدو میاں کے ایک دوست کا گھر پڑتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ انھوں نے سوچا کچھ دیر وہاں چل کر آرام کیا جائے۔ وہ خوش خوش چلے جا رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب ان کے سب دکھ دور ہو جائیں گے۔ وہ بھی شان سے زندگی گزاریں گے۔ سب لوگ ان کی عزت کریں گے۔

سوچتے ہوئے وہ اپنے دوست کریم کے گھر پہنچ گئے۔ کریم بڑا مکار اور لالچی آدمی تھا۔ اس نے سوچا کہ عیدو میاں کے پاس اگر کچھ مال مصالحہ ہو تو اینٹھا جائے۔ اس نے عیدو سے کہا "بھائی عیدو کیا کہوں آج کل بڑے بُرے دن آ گئے ہیں کچھ کام وام ملتا نہیں۔ بچے بھوکوں مر رہے ہیں۔ تین دن سے گھر میں کچھ بھی کھانے کو نہیں۔"

"فکر نہ کرو کریمو۔ دیکھو میں ابھی تمھارے دلدر دور کیے دیتا ہوں۔" انھوں نے اپنا جھولا نکالا اور اس سے طرح طرح کی چیزیں طلب کر کے کریمو کو دے دیں۔

کریمو نے سوچا اگر یہ جھولا کسی طرح مجھے مل جائے تو ساری زندگی عیش ہی عیش!! اس نے عیدو کے کھانے میں افیون ملا دی۔ عیدو میاں بے خبر سو گئے۔ کریم نے عیدو کے جھولے کی جگہ اسی طرح کا ایک معمولی جھولا رکھ دیا۔

عیدو میاں جاگے اور اپنا جھولا لے کر خوشی خوشی گھر پہنچے۔ بیوی نے انھیں دیکھا تو تعجب سے بولی: "کیا پردیس ہو آئے ہو؟"

"ہاں اور ایک بہت ہی عجیب چیز لایا ہوں۔ اب ہم لوگ بھی امیر بن جائیں گے اور ساری عمر عیش کریں گے۔"

"ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ کون سی عجیب چیز لائے ہو؟"

عیدو میاں نے جھولا دکھایا۔ جھولا دیکھ کر ان کی بیوی خوب ہنسی اور عیدو میاں کی بے وقوفی کا خوب مذاق اڑایا۔

عیدو میاں بگڑ گئے اور بولے "خدا کی بندی، یہ کوئی معمولی جھولا نہیں ہے۔ اس کی کرامات دیکھے گی تو دنگ رہ جائے گی۔"

"تو دکھاؤ اس کی کرامات"

"ایسے نہیں، سب سے پہلے اس کی کرامات میں سب کے سامنے دکھانا چاہتا ہوں۔ تم گاؤں کے لوگوں کو جمع کرو۔ میں انھی کے سامنے اس کا کمال دکھاؤں گا تاکہ سب پر رعب پڑے۔"

بیوی نے لوگوں کو جمع کیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو عیدو میاں بڑی شان سے اپنا جھولا لے کر آئے اور رعب دار آواز میں کہا "مجھے گرم گرم پلاؤ چاہیے"۔ مگر جھولا خالی کا خالی رہا۔ عیدو میاں بار بار چیخے، دہاڑے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ چلا چلا کر تھک گئے اور انھوں نے غصے میں آکر جھولا پھاڑ ڈالا۔ سب نے عیدو میاں کا خوب مذاق اڑایا۔

اب تو عیدو میاں کو بڑا غصہ آیا۔ انھوں نے پھر پیپل کے نیچے جانے کی ٹھانی۔ دوسرے ہی دن وہ پھر تین روٹیاں لے کر درخت کے نیچے پہنچے اور وہی گردان شروع کر دی "ایک کھاؤں، دو کھاؤں کہ تینوں کو کھا جاؤں۔"

تینوں بھوت پھر بدحواس ہو کر دوڑے آئے اور ماجرا پوچھا۔

عیدو میاں نے گرج کر کہا "تم لوگوں نے مجھ سے مذاق کیا، مجھے دھوکا دیا۔ اب سب کو اس کا مزا چکھاؤں گا۔"

"مگر حضور آخر ہوا کیا؟"

"تمھارا جھولا بالکل بے کار تھا۔"

"مگر اسے تو آپ نے بھی آزما کر دیکھا تھا۔"

"ہاں دیکھا تو تھا" عیدو میاں نے کہا۔

"مجھے دال میں کچھ کالا معلوم ہوتا ہے۔ ضرور کچھ دھوکا ہوا ہے۔ خیر ہم آپ کو دوسرا تحفہ دیں گے۔" یہ کہہ کر بھوت کچھ دیر کے لیے غائب ہو گئے اور پھر ایک بکری کا بچہ لے آئے۔

عیدو میاں بکری کا بچہ دیکھتے ہی بگڑ گئے "اس بکری کے بچے کو لے کر میں کیا کروں گا۔"

"حضور یہ کوئی معمولی بکری کا بچہ نہیں ہے۔ آپ اس کے سامنے ایک کپڑا بچھائیں اور اسے حکم دیں" میاں بکری کے بچے ہمیں روپے چاہئیں۔"

عیدو میاں نے ویسا ہی کیا۔ اور بکری کے بچے نے چھن چھن کر کے بہت سے روپے اگل دیے۔ عیدو میاں بکری کا بچہ پاکر بہت خوش ہوئے اور گھر کی طرف لوٹ پڑے۔ راستے میں دوست کریمو کا گھر ملا۔ دوست نے پہلے ہی عیدو میاں کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے لڑکوں کو سکھا دیا کہ عیدو میاں کو دیکھتے ہی رونا شروع کر دیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔

عیدو میاں نے کریمو سے پوچھا "یہ سب کیوں رو رہے ہیں؟"

"بھوکے ہیں کھانے کو کچھ نہیں ملا اسی لیے رو رہے ہیں۔"

"اچھا میں ان سب کو ابھی خوش کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر عیدو میاں نے بکری کے بچے کے آگے کپڑا بچھایا اور اسے حکم دیا کہ "مجھے روپے چاہئیں"۔ بکری کے بچے نے چھن چھن کر کے روپے اگل دیے۔ یہ دیکھ کر کریمو کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ کریم نے سوچا: اگر یہ بکری کا بچہ مجھے مل جائے تو کیا کہنے!

وہ روپے لیکر سامان لایا اور عیدو کے کھانے میں افیون ملائی۔ جب عید و میاں بے خبر سو گئے تو کریم اسی طرح کا ایک بچہ خرید لایا۔ اُسے عیدو میاں والے بچے کی جگہ باندھ دیا اور اس کا بچہ کھول کر الگ چھپا دیا۔

عیدو میاں جاگے اور خوشی خوشی بکری کا بچہ لے کر گھر پہنچے۔ بیوی نے بکری کا بچہ دیکھا تو چڑ کر بولی "ارے تمھاری عقل پر خدا کی مار۔ یہ بچہ کہاں سے اٹھا لائے۔ خود تو کھانے کا ٹھکانا نہیں اسے کہاں سے کھلاؤ گے۔ بکری لاتے تو دودھ ہی دیتی۔"

"عقل تو تمھاری ماری گئی ہے۔ یہ کوئی معمولی بکری کا بچہ تھوڑی ہے یہ تو بہت قیمتی بچہ ہے۔"

پھر عیدو میاں نے سارا قصہ سنایا اور اس سے کہا

"اس دن ہماری بڑی بے عزتی ہوئی تھی مگر اب تم لوگوں کو جمع کرو۔ اپنا کمال دکھائیں گے تاکہ جن لوگوں نے اس دن ہمارا مذاق اڑایا تھا اب اپنا سا منھ لے کر رہ جائیں۔"

بیوی نے لوگوں کو جمع کیا اور عیدو میاں بچہ لیکر آئے۔ اس کے سامنے کپڑا بچھایا پھر کڑک کر کہا "میاں بکری کے بچے ہمیں روپے چاہئیں۔" مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا — عیدو میاں برابر چلاتے رہے مگر وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ آخر غصے میں آکر انھوں نے اُسے پیٹنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ مر گیا۔

اس بار لوگوں نے عیدو میاں کا اور بھی مذاق اڑایا۔

اب تو عیدو میاں کے غصے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ دوسرے ہی دن وہ پھر پیپل کے درخت کے نیچے پہنچے اور وہی گردان شروع کی۔

"ایک کھاؤں، دو کھاؤں کہ تینوں کو کھا جاؤں"

بھوت پھر حاضر ہوئے اور ماجرا پوچھا۔ عیدو میاں نے غصے میں آکر بھوتوں کو خوب کھری کھری سنائیں۔ اور الٹا سیدھا جو بھی منھ میں آیا بولتے چلے گئے۔

بھوتوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور جان کی امان پائیں تو کچھ عرض کریں۔"

"بکو کیا بکنا چاہتے ہو۔ تم سب بہت مکار اور دھوکے باز ہو۔"

"حضور آپ راستے میں جن کے یہاں ٹھہرا کرتے ہیں وہی آپ کی چیزیں چرا لیتے ہیں۔"

"مگر اپنا جھولا اور بکری کا بچہ تو میں ان کے یہاں سے لے کر گیا تھا۔"

"وہ دونوں تو نقلی تھے۔ انھوں نے اصلی خود لے لیے اور ان کی جگہ پر نقلی جھولا اور بکری کا بچہ رکھ دیا۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ میں ابھی اس سے ساری چیزیں واپس لیتا ہوں۔"

"وہ ایسے تو چیزیں واپس نہیں کرے گا البتہ ہم آپ کو ایک تیر بہدف نسخہ دیتے ہیں جو آپ کی ساری چیزیں واپس دلا دے گا۔" یہ کہہ کر عیدو میاں کو بھوتوں نے ایک ڈنڈا دیا اور بتایا کہ "جب آپ اس سے کہیں "میاں ڈنڈے ہماری مدد کرو" تو یہ اس آدمی کو پیٹنا شروع کر دے گا۔"

عیدو میاں ڈنڈا لے کر غصے میں بھرے ہوئے کریم کے گھر پہنچے اور اُسے دیکھتے ہی کہا "میرا جھولا اور بکری کا بچہ لاؤ" کریم بگڑ گیا "تو تم مجھے چور کہتے ہو۔ کیا تم یہاں سے اپنے ساتھ جھولا اور بکری کا بچہ نہیں لے گئے تھے۔"

"لے گیا تھا مگر وہ دونوں چیزیں نقلی تھیں۔ اصلی تو

جناب کوثر اعظمی

تقدیر بنانے والا

(ایک منظوم ڈراما)

(سڑک کے کنارے چادر پھیلا کر آسن جمائے ہوئے ایک جوتشی بیٹھا ہے۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا پڑی ہے اور ماتھے پر تلک لگی ہوئی ہے۔ سامنے ہی طوطے کا پنجرہ رکھا ہوا ہے۔ چادر پر تقدیر بتانے والی تاشوں کی پتیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ کچھ دور فاصلے پر اسکول کے بچے آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک لڑکا تمام لڑکوں سے کہتا ہے)

لڑکا ـــــ "ساتھیو! آؤ کہ اک بات بتاؤں تم کو — آج اک اور تماشہ ہی دکھاؤں تم کو
جوتشی[1] اوروں کو بدھو وہ بنانے والا — زائچہ[2] دیکھ کے تقدیر بتانے والا
خود بھی بدھو ہے بڑا لوگ سمجھتے کم ہیں — اس کو گیانی[3] جو سمجھتے ہیں تو احمق ہم ہیں"

لڑکے ـــــ "کیا یہ سب سچ ہے؟ نہیں! جھوٹ بتاتے ہوگے — یونہی بے وجہ ہمیں اس سے ڈراتے ہوگے"

وہی لڑکا ـــــ "جھوٹ اور سچ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے — ساتھ آؤ کہ ابھی بھید کھلا جاتا ہے"

لڑکے ـــــ "اچھا دیکھیں گے چلو تم بھی دکھاتے کیا ہو — کیا ہے معلوم تمہیں؟ ہم کو بتاتے کیا ہو؟"

(لڑکے آپس میں یہ باتیں کرتے جوتشی کے پاس آتے ہیں)

وہی لڑکا (آگے بڑھ کر جوتشی کو ہاتھ دکھاتے ہوئے) ـــــ جوتشی دیکھ ذرا آج ان ہاتھوں کی لکیر
اور بتلا دے مجھے جو بھی ہے میری تقدیر
فیل ہو جاؤں گا یا پاس بتانا مجھ کو
امتحاں کا جو نتیجہ ہو جتانا مجھ کو
دھن ملے گا کہ نہیں؟ نام ملے گا کہ نہیں؟
ودیا[4] پا کے کوئی کام ملے گا کہ نہیں؟"

جوتشی ـ (زائچہ الٹ پلٹ کر ہاتھ دیکھتے ہوئے) ـــــ "لا بڑھا ہاتھ ارے واہ! یہ ریکھا تیری
صاف کہتی ہے کہ تقدیر ہے اعلیٰ[5] تیری

[1] تقدیر کا حال بتانے والا [2] وہ نقشہ جس میں تقدیر کا حال دیکھا جاتا ہے [3] عقلمند [4] علم [5] ہاتھوں کی لکیر [6] بلند، اچھی

فرسٹ آئے گا تو انعام ملے گا تجھ کو
ذہن بھی پائے گا، بڑا نام ملے گا تجھ کو
وڈیا پا کے تو کل قوم کا لیڈر ہو گا
ان لکیروں میں لکھا ہے کہ منسٹر ہو گا"

وہی لڑکا: (بظاہر خوش ہو کر مسکراتے ہوئے) —— "سچ کہا تو نے مرا دل بھی یہی کہتا ہے
بس اسی دھیان میں ہر وقت لگا رہتا ہے"

جوتشی: —— "تب تو لا فیس مری اور کچھ انعام دلا
کرتا جا خوش مجھے اب تو کر ترا کام بنا"

لڑکا: —— "فیس دلواؤں کہاں سے کہ ہے پاکٹ خالی
اک چونّی ہے پڑی جیب میں وہ بھی جعلی"

جوتشی: —— "تب تو جا بھاگ کہ اچھی نہیں تیری تقدیر
سچ تو یہ ہے کہ ہیں خالی تری ہاتھوں کی لکیر"

لڑکا: —— "خیر سے جو بھی ہو بابا! مجھے پرواہ نہیں
کہ تو خود اپنی ہی تقدیر سے آگاہ نہیں
میری تقدیر تو کیا خاک بتاتا مجھ کو
سچ تو یہ ہے کہ یہ فن ہی اگر آتا تجھ کو
تو نے پہلے ہی مری جیب کو دیکھا ہوتا
اپنی نظروں میں نہ پھر آپ یوں رسوا ہوتا
تو بھی احمق ہے نرا مجھ کو بنانے والے
اک زمانے کی او تقدیر بتانے والے!"

(جوتشی غصے کی جھونک میں گالیاں بکتا ہے اور لڑکے ہنستے ہوئے بھاگ جاتے ہیں)

--- پردہ ---

---

1 اول 2 نیتا 3 وزیر 4 جیب 5 نقلی 6 واقف۔

جناب غلام حیدر

پیسہ

(مسلسل)

اس بادشاہ کا نام محمد بن تغلق تھا۔ اس نے ہندوستان پر ۱۳۲۵ء سے ۱۳۵۱ء تک حکومت کی۔ ہوا یہ کہ جیسا تمہیں معلوم ہے اب تک میں سونے اور چاندی کا لباس پہنا کرتا تھا اور ٹنکہ میں جتنا سونا لگتا تھا اس کا اگر صرف سونا ہی بازار میں بیچا جاتا تو وہ اتنا ہی مال خریدتا جتنا ایک ٹنکہ میں خریدتا تھا۔ اسی اصول پر اب تک میں دنیا میں چل رہا تھا۔ تغلق نے سوچا کہ سکّہ کا کام صرف اتنا ہی تو ہے کہ وہ دو چیزوں کے لین دین کو آسان کردے۔ لہٰذا خواہ وہ سونے کا ہو یا تانبے کا، سامان خریدنے میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بس یہی بات اس غریب کی سمجھ میں آگئی۔ تم آج بھی دیکھ لو۔ آج ساری دنیا اس بات کو مان گئی ہے ــــ تم سو روپے کا کاغذ کا نوٹ جیب میں لیے پھرتے ہو جب کہ اس کاغذ کی اپنی قیمت شاید ایک پیسے کے برابر بھی نہیں ہے۔ یہ تو صرف اعتبار کا سودا ہے۔ جب تک تم سکّے پر اعتبار کرتے ہو کہ یہ اتنا سامان خریدے گا جتنا پہلے خریدتا تھا تو چاہے وہ سونے کا ہو یا چاندی کا، یا تانبے کا، بلکہ کاغذ کا بھی ہو تب بھی وہ اتنا ہی اچھا ہے جتنا پہلے تھا۔

تو بھائی، بادشاہ کی بات، جو سمجھ میں آجائے۔ اس کے دماغ سے اتارے کون؟ اور اس نے تانبے کے سکّے ڈھلوا لیے۔ اس میں لگے ہوئے تانبے کی قیمت تو بہت تھوڑی ہوگی! مگر حکم یہی تھا کہ اس کے بدلے میں سامان اتنا ہی خریدا اور بیچا جائے جتنا سونے کے "ٹنکے" کے بدلے میں خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ خیر، چلنے کو تو چل پڑا یہ سکہ ــــ بادشاہ کی بات کو نہ ماننے کی ہمت کس میں ہوتی۔ مگر گڑبڑ بہت پڑ گئی۔ لوگوں نے اپنے گھروں کے برتن تک پگھلا کر اسی وزن کے چھوٹے سکّے ڈھلوا لیے۔ اب پرانے سونے کے سکّے تو لوگوں نے دبا کر گھر میں رکھ لیے اور نئے تانبے کے سکّے، جھوٹے سچے، بہت سے ملک میں گھومنے لگے۔ بادشاہ نے جتنے سکّے چلائے تھے کچھ ہی دن بعد اس کے تگنے چوگنے سکّے بلکہ اور بھی زیادہ ملک میں گھومنے لگے اور بس اتنا سمجھ لو کہ اگر کسی جگہ سکّے ضرورت سے بہت زیادہ ہو جائیں تو وہاں خرید و فروخت میں بہت گڑبڑ پڑ جاتی ہے ــــ کچھ دن بعد بادشاہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے پھر لوگوں سے کہا، لاؤ بھائی میرے سکّے مجھے واپس کردو اور اس کے بدلے میں سونے کے سکّے لے جاؤ! لوگوں نے سکّے واپس کیے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت تک اتنے جھوٹے سکّے ملک میں گڑھے جا چکے تھے کہ بادشاہ کے دربار میں کئی پہاڑیوں برابر اونچے اونچے ڈھیر تانبے کے سکّوں کے لگ گئے۔

سُنی تم نے اس غریب بادشاہ کی کہانی ــــ!

اس وقت تو لوگوں نے اُسے بیوقوف بنالیا مگر آج دنیا بھر
میں وہی اصول چلتا ہے اور کوئی بیوقوف نہیں کہا جاتا۔
اچھا اب میں اپنی کہانی کے اس حصے پر آگیا ہوں جو اب
سے صرف کوئی چار پانچ سو سال پرانی ہے۔

۱۵۲۶ء میں بابر نے ابراہیم لودی کو پانی پت
کے میدان میں ہرا کر دہلی پر قبضہ کرلیا۔ چار سال بابر کے اور
دس سال شروع کے اس کے بیٹے ہمایوں کے کچھ اس قدر
پریشانی میں گزرے کہ اس زمانے میں ان کے سکے کوئی
خاص طور پر نہ چل سکے۔ پھر بھی بابر اور ہمایوں کے دو
سکے خاص طور پر مل جاتے ہیں۔ ایک سونے کا سکہ تھا جسے
خود بابر نے "شاہ رخی" کا نام دیا تھا اور دوسرا چاندی کا سکہ
تھا جس کا عربی نام "درہم" رکھا گیا تھا۔ ۱۵۴۰ء میں ایک
افغان سردار شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو ہرا کر ایران کی
طرف بھگا دیا اور دہلی اور شمالی ہندوستان پر حکومت
شروع کی۔

شیر شاہ سوری اتنا قابل آدمی تھا کہ اس کی چلائی
ہوئی بہت سی باتیں آج تک ہندوستان میں موجود ہیں۔
خیر بھائی ان باتوں کو تو تاریخ والے جانیں۔ ہم تو اپنی بات
کریں۔ تو میری وہ شکل جو تم نے اب سے چند سال پہلے
دیکھی تھی، وہ بس شیر شاہ سوری ہی کی دی ہوئی تھی۔
سب سے پہلے اسی نے چاندی کا وہ سکہ چلایا جسے "روپیہ"
کا نام دیا۔ "روپا" لفظ تو سنسکرت کا ہے جس کے معنی
چاندی کے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ چاندی کے
سکوں کو اس لفظ کے معنی کی وجہ سے اس زمانے سے
پہلے "روپا" کہتے ہوں مگر کسی خاص سکے کا نام "روپا" یا
"روپیہ" شیر شاہ سوری کے "روپیہ" سے پہلے نہیں ملتا۔ اب
تو تمھارے پاس میں اپنی نئی شکل میں بھی آگیا۔ روپیہ کے
علاوہ اس کو سولہ حصوں میں تقسیم کرنے کا کام بھی اسی کا
تھا۔ ابھی میری وہ شکل اتنی پرانی تو نہیں ہوئی کہ تم اسے
بھول گئے ہوگے، روپیہ میں سولہ آنے اور ایک آنے میں
چار پیسے ہوتے تھے۔ اس طرح چونسٹھ پیسوں میں ایک
روپیہ بنتا تھا۔ تاریخیں تو یہی بتاتی ہیں کہ "آنہ" لفظ بھی اسی
زمانے میں شروع ہوا۔ مگر یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس نام
کا سکہ شیر شاہ کے زمانے میں چلا تھا یا نہیں۔ ہاں البتہ تانبے
کا ایک اور سکہ شیر شاہ نے چلایا تھا۔ اس کا نام "دام" تھا۔
یہ تانبے کا سب سے کم قیمت کا سکہ ہوتا تھا۔ اب تم "دام" لفظ
کو بالکل دوسری طرح استعمال کرتے ہو۔ بازار میں پوچھتے
ہو "یہ کاپی کتنے دام کی ہے"۔ ممکن ہے پہلے بھی لوگ اسی
طرح پوچھتے ہوں مگر اُس وقت ان کے ذہن میں کوئی خاص
سکہ "دام" کے نام کا ہوتا ہوگا۔ تم نے دیکھا کہ اس بادشاہ
نے اپنے سکوں کو ایسے نام دیے تھے کہ آج جب اس کی
حکومت کو ختم ہوئے کئی سو سال گزر گئے تب بھی نہ صرف
اس کے ملک کے سب سے بڑے سکے کا نام "روپیہ" ہے
بلکہ کئی ملک اور بھی ایسے ہیں جہاں یہی نام چلتا ہے۔

ایسے قابل بادشاہ کے جانشین اتنے قابل نہ تھے
چنانچہ ہمایوں بادشاہ جو چند سال پہلے ایران کی طرف بھاگ
گیا تھا، پھر واپس آگیا اور ۱۵۵۵ء میں دہلی کی سلطنت
پر پھر قبضہ کرلیا۔ اب سے ہندوستانی تاریخ کا پھر وہ زمانہ
شروع ہوتا ہے جسے سنہری زمانہ کہا جاتا ہے اس زمانے کی
یادگاریں تم پورے ہندوستان میں دیکھ سکتے ہو

کشمیر میں شالامار باغ اور چشمۂ شاہی، دہلی میں لال قلعہ اور
جامع مسجد، آگرہ کا قلعہ اور فتح پور سیکری، سکندرا اور
تاج محل وغیرہ خوبصورتی کے نمونے ہیں۔

مغل زمانے کے سکوں کی ابتدا ایک طرح سے
۱۵۵۶ء سے ہوتی ہے جب اکبر تخت پر بیٹھا۔ اکبر اور
جہانگیر نے اپنے زمانے میں بہت بہت خوبصورت سکے
چلائے۔ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے سکے خوبصورتی میں
اپنی مثال بس آپ ہیں۔ جہانگیر نے اپنی بیوی نورجہاں
کو بھی اجازت دے دی تھی کہ وہ بھی اپنے نام سے سکے
جاری کرے۔ چنانچہ اس کے سکے بھی مل جاتے ہیں۔ اکبر
نے اپنے سکوں پر جاندار چیزوں کی تصویریں بنوائیں اور
جہانگیر نے خود اپنی تصویر کو اپنے سکوں پر بنوایا۔ اس زمانہ
کے سکوں میں بادشاہ کا پورا نام، القاب، سنہ، جس شہر
میں وہ سکہ بنا تھا اس کا نام اور بہت خوبصورت بیل بوٹے
نظر آتے ہیں۔ اس زمانے کے سکوں میں بڑے سے بڑے
سکے کا ذکر بھی تاریخوں میں ملتا ہے۔ سونے کا ایک سکہ جو
کسی سفیر کو تحفہ کے طور پر دیا گیا تھا اس کا کل وزن —
دو ہزار تولہ یا پچیس سیر۔ کی برابر تھا۔ اور چھوٹے سے
چھوٹا سکہ ایک تولے کے سویں حصے سے بھی کچھ کم تھا۔

اس زمانے میں میرے نام کچھ اس طرح تھے سب
سے بڑا سونے کا سکہ "مُہر" کہلاتا تھا۔ اور اس زمانے کے
نو یا دس چاندی کے روپیوں سے بدلا جا سکتا تھا۔ شیر شاہ
کا روپیہ بھی بند نہیں کیا گیا تھا "مُہر" اور چاندی کے روپیوں
کے علاوہ سونے اور چاندی کے اور بھی چھوٹے سکے چلتے
تھے جن کو الگ الگ نام دیے جاتے تھے۔ جیسے ایک
سکہ کا نام "نورافشاں" تھا، دوسرے کا "خیر قبول" تانبے
کے سکے عام طور پر "فلوس" نام سے پکارے جاتے
تھے۔ انھیں میں "دام" بھی ایک سکہ ہوتا تھا۔ تانبے کے
چھوٹے سکوں کو بھی کبھی کبھی الگ نام دیے جاتے۔ جیسے
جہانگیر نے اپنے کچھ سکوں کو "رائج" یا "روانی" بھی کہلوانا
پسند کیا۔ اکبر کے زمانے میں "دام" کے آٹھویں حصے کو "دمڑا"
یا "دمڑی" بھی کہا جاتا تھا۔ اگر تم اپنے بزرگوں سے پوچھو
تو وہ بتائیں گے کہ انھوں نے "دمڑی" یا "چھدام" نام
کے سکے دیکھے ہیں۔ یقیناً یہ اکبر کے زمانے کے نہیں تھے
بعد میں بھی "دمڑی" اور "چھدام" نام کے تانبے کے بہت
چھوٹے سکے چلتے تھے۔

اکبر کے بعض سکوں میں جو بات ہمیں خاص ملتی
ہے وہ اعشاریہ کا وہ طریقہ ہے جو ہمارے ملک میں ابھی
چند سال پہلے شروع کیا گیا ہے۔ اس نے ایک نیا "ٹنکہ"
چلایا جو پہلے ٹنکے سے وزن میں تگنے سے بھی زیادہ تھا۔ اکبر
کا یہ نیا ٹنکہ تقریباً ۲¼ تولہ برابر ہوتا اور غالباً یہی سکہ
ہندوستان میں سب سے زیادہ قیمت کا چلا ہے۔ اس
کے سونے کے چھوٹے سکے ہوتے تھے جن کا نام "ٹنکی" ہوتا
تھا۔ دس "ٹنکیاں" مل کر ایک اکبری ٹنکہ بناتی تھیں۔

بقایہ ص ۲۷ کا

دلیل کو کاٹ دیا۔ وکیل صاحب طیش میں آگئے کہا کہ اگر
میرا لڑکا ایسا ہی اجڈ اور بے وقوف ہو جیسے آپ ہیں تو میں
اسے بھی پادری ہی بناؤں گا۔ پادری سمتھ نے فوراً جواب
دیا " جناب اس بارے میں آپ کے والد کی رائے مختلف
تھی۔ تبھی تو انھوں نے آپ کو وکیل بنایا۔ پادری نہیں۔"

جناب مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابنِ بطوطہ

سنوب میں پہنچنے کے چوتھے دن یہاں کے امیر ابراہیم کی والدہ کی موت ہو گئی۔ میں بھی جنازے کی شرکت کے لیے گیا۔ اس کا بیٹا بال کھولے پیدل چل رہا تھا۔ امیر اور غلام وغیرہ ساتھ تھے۔ ان سب نے اپنے کپڑے الٹے پہن رکھے تھے۔ قاضی، خطیب، فقیہ بھی الٹے کپڑے پہنے تھے مگر ان کے بال کھلے ہوئے نہ تھے۔ اور عماموں کی جگہ سیاہ اونی رومال سر پر باندھے ہوئے تھے۔

ہم یہاں انتظار میں ۴۰ دن ٹھہرے رہے کہ شہر قرم کے لیے بحری سفر کی آسانی میسر آجائے۔ اگرچہ روم کی کشتی کرائے پر لے لی تھی مگر گیارہ دن گزر گئے اور ہوا موافق نہ چلی۔ بالآخر کشتی میں سوار ہو کر سفر شروع کر دیا۔ تین دن بیچ دریا آیا تو ایسا خوفناک واقعہ پیش آیا کہ زندگی سے مایوسی ہو گئی۔ میں اور ایک عرب جس کا نام ابوبکر تھا لکڑی کی کوٹھری میں بیٹھے تھے۔ میں نے ابوبکر سے کہا ذرا باہر نکل کر دیکھو دریا کی کیا حالت ہے۔ وہ باہر گیا اور کوٹھری میں آکر بولا، لو بھئی خدا حافظ!! یہ سن کر میں گھبرا گیا۔ مگر خدا نے خیر کر دی اور ہوا بدل گئی جس نے ہمیں شہر کے قریب پہنچا دیا۔ کچھ تاجروں نے اترنا چاہا مگر کپتان نے منع کر دیا۔ ہوا پھر درست ہو گئی۔ بیچ دریا میں پہنچ کر پہلی جیسی حالت ہو گئی۔ آخر یہ وقت گزر گیا۔ میں نے سوچا بندرگاہ کرش قریب ہے کشتی بندرگاہ میں لے جائی جائے۔ کچھ لوگ پہاڑ پر کھڑے تھے انھوں نے اشارہ کیا خبردار بندرگاہ میں نہ آنا۔ شاید دشمنوں کی کشتیاں بندرگاہ میں تھیں۔ مجبوراً اپنی کشتی بندرگاہ سے دور ہٹا کر خشکی میں اتر گئے۔

یہاں گرجا تھا جس کا نگران ایک پادری تھا۔ گرجا کی دیوار پر ایک عرب کی تصویر بنی تھی۔ سر پر عمامہ، گلے میں تلوار، ہاتھ میں برچھا۔ تصویر کے سامنے چراغ جل رہا تھا۔ میں نے پادری سے پوچھا: یہ کس کی تصویر ہے؟ پادری نے کہا: یہ نبی کی تصویر ہے۔ اس کا نام علی" ہے۔ رات کو ہم گرجا میں رہے۔

دشت قفچق

ترکی زبان میں دشت صحرا اور جنگل کو کہتے ہیں قفچق کے صحرا میں نہ درخت ہے نہ پہاڑ ہے۔ نہ ٹیلا نہ آبادی ہے۔ نہ جلانے کی لکڑی ہے۔ گوبر اور لید جلاتے ہیں اور بڑے بڑے آدمی اپلے اور سوکھی لید دامنوں میں لیے پھرتے ہیں۔

اس صحرا میں پیدل سفر نہیں کیا جاسکتا۔ چھ مہینے کی مسافت ہے۔ ہم نے ایک گھوڑا گاڑی کرایہ پر کی

اور توکل بہ خدا سوار ہوگئے۔ پہلے کفا آیا۔ کفا ایک گاؤں
ہے جہاں ہم نے مسجد میں قیام کیا۔ ابھی ایک گھنٹہ بھی نہ
گزرا تھا کہ ہر طرف سے ناقوسوں[۱] کی آوازیں آنے لگیں ہم
نے اب تک ناقوس کی آواز نہ سُنی تھی۔ بڑی وحشت ہوئی
ساتھیوں سے کہا اوپر چڑھ کر قرآن پڑھو، اذانیں دو اور
بلند آہنگی سے خدا کا ذکر کرو۔ اتنے میں ایک آدمی ہمارے
پاس زرہ بکتر پہنے ہتھیار لگائے آیا۔ ہمیں سلام کیا اور بولا
خیریت تو ہے۔ اذان سن کر آیا ہوں۔ کہ شاید آپ کسی مصیبت
میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ میں یہاں کا قاضی ہوں۔ جب اسے اطمینان
ہوگیا تو وہ چلا گیا۔ اور ہم نے اطمینان سے رات گزاری۔ دوسرے
دن بستی کا امیر آیا اور ہم نے اس کے ساتھ کھانا کھایا۔ مسلمان
یہاں نہیں ہیں۔ بازار اچھے ہیں۔ یہاں کا بندرگاہ مشہور
بندرگاہوں میں ہے۔ چھوٹی بڑی ایک سو سفری کشتیاں
اور جنگی کشتیاں تیار رہتی ہیں۔

قرم

قرم بڑا خوبصورت شہر ہے۔ سلطان ازبک خاں کے
علاقے میں ہے۔ سلطان کی طرف سے قرم میں ایک امیر
مقرر ہے جو تمام حالات کی نگرانی رکھتا ہے۔ ہم یہاں شیخ زادہ
خراسان کی خانقاہ میں اترے۔ شیخ ہمارے ساتھ بڑے اعزاز
سے پیش آیا۔

قرم والے شیخ کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اس کے
سلام کے لیے قاضی، فقیہہ، شاہی خطیب تک آتے ہیں۔
شیخ نے مجھ سے یہاں کے ایک عیسائی راہب کا حال بیان
کیا کہ بڑا عبادت گزار ہے اکثر روزے سے رہتا ہے کبھی کبھی
متواتر چالیس دن تک روزہ رکھتا ہے اور چنے کی برابر کسی چیز
سے افطار کرتا ہے۔ صاحبِ کشف و کرامات ہے۔ مگر میں
اس سے نہ مل سکا۔

یہاں سواریاں خوب ہیں۔ انھیں عرّبہ یا غرّابہ[۲] کہتے
ہیں۔ ان میں چار پہیے ہوتے ہیں جنھیں گھوڑے یا اونٹ کھینچتے
ہیں۔ گاڑیوں میں دو گھوڑے جوڑتے ہیں کبھی بڑھا دیتے
ہیں زین کسے ہوئے گھوڑے پر چابک سوار ہوتا ہے۔ غرّابہ پر
گنبد جیسا بنا ہوتا ہے جسے لکڑیوں کے تسمے سے جوڑ کر بنایا
جاتا ہے اور اس پر نمدہ یا کوئی دوسرا کپڑا چڑھا دیا جاتا
ہے۔ سواری کے بیٹھنے کی جگہ اتنی کشادہ رکھی جاتی ہے کہ
آرام سے لیٹا جا سکے۔ غرابہ چلتا رہے سواری سوتی رہے،
پڑھتی رہے اور کسی طرح کی تکلیف نہ اٹھائے۔ گنبد میں
چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بھی بنا دی جاتی ہیں جس سے سواری
جھانکنا چاہے تو باہر جھانک لے اور ہوا بھی آتی رہے۔ وہ
سب کو دیکھے اور اُسے کوئی نہ دیکھے۔ بار برداری کی گاڑیاں
الگ ہوتی ہیں اور ان میں قفل لگا دیے جاتے ہیں۔ میں نے
بھی ایسی ہی سواری تلاش کی جس پر نمدہ چڑھا ہوا تھا اور
میری کنیز میرے پاس بیٹھی تھی۔

ترکوں کی عادت ہے سورج نکلنے پر کوچ کرتے
ہیں اور دن چڑھے سواری روک دیتے ہیں پھر کسی باغ یا
سایہ دار جگہ پر گھوڑوں یا بیلوں کو چھوڑ دیتے ہیں تاکہ جنگل میں

---

[۱] ناقوس کی جمع ۔ نرسنگھا

[۲] رتھ۔

چل پھر کر چرلیں۔ اس صحرا کے گھاس اور پتے "جو" کے
قائم مقام ہیں۔ یہاں چوری کا ڈر نہیں ہے کیوں کہ چوری
کی سزا اتنی سخت ہے کہ چوری کی ہمت نہیں ہوتی ہے۔

کسی کے پاس سے چوری کا گھوڑا، بیل، اونٹ
پکڑا جاتا ہے تو چور کو ۱۰ گھوڑے، بیل پکڑا جائے اور
اونٹ پکڑا جائے تو ۹ عدد بیل اور ۹ عدد اونٹ دینے
پڑتے ہیں۔

گھوڑے نہ دے سکے تو اپنی اولاد بدلے میں دے
گھوڑا اور اولاد نہ دے سکے تو اُسے بکری کی طرح ذبح
کر دیا جاتا ہے۔

ترکوں کا کھانا: ترک ثقیل چیزیں نہیں کھاتے۔ ہلکی
غذا استعمال کرتے ہیں۔ سفر میں عموماً کھانے کا سامان ان
کے ساتھ رہتا ہے جسے دوقی کہتے ہیں۔ یہ املی جیسی کوئی
چیز ہوتی ہے۔ پہلے آگ پر پانی چڑھا دیتے ہیں۔ پانی
کھولنے لگتا ہے تو تھوڑی سی دوقی ڈال دیتے ہیں۔
گوشت ہوتا ہے تو اس کی بوٹیاں کاٹ کر ساتھ میں پکاتے
ہیں اور ہر ایک کا حصہ الگ الگ پیالوں میں رکھتے ہیں۔ اس
پر میٹھا دودھ ڈال دیتے ہیں اور پی جاتے ہیں۔ پھر گھوڑی
کا دودھ پیتے ہیں۔ کبھی کبھی بورخانی بھی کھاتے ہیں۔

بورخانی گندھا ہوا آٹا ہوتا ہے جس کے چھوٹے
چھوٹے ٹکڑے سوراخ کر کے ہانڈی میں ڈال دیتے ہیں
پک جاتے ہیں تو ان پر میٹھا دودھ ڈال کر پی جاتے ہیں
ترک حلوہ کھانا معیوب سمجھتے ہیں۔

ترک شہروں میں گھوڑے کثرت سے ہیں۔ نہایت
چالاک گھوڑا پچاس درہم (پندرہ روپیہ) میں مل جاتا ہے
ایسے ترک بھی ہیں جن کے اصطبل میں ہزاروں گھوڑے
ہیں۔ ترکی گھوڑے ہندوستان بھی جاتے ہیں سندھ پہنچ
کر سندھ کی گھاس کھاتے ہیں تو بہت سے کمزور ہو کر مر جاتے
ہیں۔ اس گھاس میں وہ طاقت نہیں ہوتی جو ترکی گھاس میں
ہوتی ہے۔ سندھ میں گھوڑوں کی چوری بھی ہو جاتی ہے
ہندوستان میں یہ گھوڑے بہت نفع سے بکتے ہیں گھٹیا سے
گھٹیا گھوڑا سو سوا سو سے کم میں نہیں بکتا۔

ہندوستان میں یہ گھوڑے گھوڑ دوڑ کے لیے
خریدے جاتے ہیں۔ اعلیٰ قسم کے گھوڑے جن کا دھاوا
دور دور تک ہوتا ہے، عمان و فارس سے آتے ہیں اور ایک
گھوڑا تین چار ہزار میں بکتا ہے۔

ماجر

ترکوں کے شہر میں ماجر بڑا شہر ہے۔ باغات اور
سواریوں کی کثرت ہے۔ ہم جس خانقاہ میں ٹھہرے ہیں وہ
محمد البطائحی کی خانقاہ ہے۔ محمد البطائحی شیخ احمد رفاعی
کے خلیفہ ہیں۔ اس خانقاہ میں ۷۰ درویش ترک اور روم
کے رہتے ہیں جن کی گزر بسر نذرانوں پر ہے۔

ماجر والوں کو درویشوں اور فقیروں سے بڑی
عقیدت ہے۔ کبھی کبھی سلطان آتے ہیں اور محلات شاہی
کی خواتین بھی آتی ہیں اور نذریں پیش کرتی ہیں۔

جناب اعجاز اختر

افواہیں کیسے پھیلتی ہیں

کیا آپ کو معلوم ہے کہ افواہیں کتنی تیزی سے پھیلتی ہیں۔ بس چند لوگوں کے دیکھے ہوئے واقعے کی خبر صرف ۲ گھنٹے میں کسی شہر میں پھیل سکتی ہے۔ جی آپ نہیں مان رہے ہیں۔ آئیے ہم اس کا پورا حساب کرکے بتائیں تو آپ ہماری بات کا یقین کریں گے۔

فرض کیجیے صرف ایک آدمی ایک خبر لے کر پچاس ہزار کی آبادی والے قصبے میں داخل ہوتا ہے اور جس گھر میں ٹھہرتا ہے وہاں کے صرف تین آدمیوں کو وہ خبر سنا دیتا ہے۔ فرض کیجیے کہ خبر کے سنانے میں اُسے کل ۱۵ منٹ لگے یعنی اگر وہ آدمی صبح ۸ بجے قصبے میں داخل ہو تو ۸ بجکر ۱۵ منٹ تک یہ خبر ۴ آدمیوں کو معلوم ہوگی۔ یعنی خود اُسے اور تین آدمیوں کو۔ اب ان تین آدمیوں میں سے ہر ایک دوسرے تین تین آدمیوں کو خبر سنا دیتا ہے اس طرح اگلے ۱۵ منٹ اور خرچ ہو جاتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ آدھے گھنٹے میں یہ خبر ۱۳ (۴ + ۳×۳) آدمیوں کو معلوم ہو جاتی ہے۔ (حساب کرکے دیکھ لیجیے)۔ پھر وہ ۹ آدمی جنھوں نے پہلے ۳ آدمیوں سے خبر سنی تھی تین تین آدمیوں کو سنا دیتے ہیں۔ اس طرح پندرہ منٹ اور خرچ ہوئے۔ یعنی ۸ بجکر ۴۵ منٹ تک یہ خبر ۴۰ (۱۳ + ۹×۳) آدمیوں کو معلوم ہو جائے گی۔

اگر اسی طرح افواہ پھیلتی جائے یعنی ہر ایک آدمی اپنے تین دوسرے ساتھیوں کو خبر سنا دے تو اس کا حساب کچھ اس طرح ہوگا۔

۹ بجے تک وہ خبر ۴۰ + (۲۷×۳) = ۴۰ + ۸۱ = ۱۲۱ آدمیوں کو معلوم ہو جائے گی۔

۹ بجکر ۱۵ منٹ تک وہ خبر ۱۲۱ + (۸۱×۳) = ۱۲۱ + ۲۴۳ = ۳۶۴ آدمیوں کو معلوم ہو جائے گی۔

۹ بجکر ۳۰ منٹ تک وہ خبر ۳۶۴ + (۲۴۳×۳) = ۳۶۴ + ۷۲۹ = ۱۰۹۳ آدمیوں کو معلوم ہو جائے گی۔

دوسرے الفاظ میں خبر صرف ڈیڑھ گھنٹے میں تقریباً ۱۱۰۰ آدمیوں کو معلوم ہو جائے گی۔ لیکن ۵۰۰۰۰ کی آبادی کے حساب سے ابھی افواہ بہت کم پھیلی ہے مگر اب دیکھیے یہ کتنی تیزی سے پھیلنا شروع ہوتی ہے

۹ بجکر ۴۵ منٹ تک یہ خبر ۱۰۹۳ + (۷۲۹×۳) = ۱۰۹۳ + ۲۱۸۷ = ۲۲۸۰ آدمیوں کو معلوم ہوگی۔

۱۰ بجے تک وہ خبر ۳۲۸۰ + (۲۱۸۷×۳) = ۳۲۸۰ + ۶۵۶۱ = ۹۸۴۱ آدمیوں کو معلوم ہوگی۔

۱۰ بجکر ۱۵ منٹ تک یہ خبر ۹۸۴۱ + (۶۵۶۱×۳) = ۹۸۴۱ + ۱۹۶۸۳ = ۲۹۵۲۴ آدمیوں کو معلوم ہوگی۔

یعنی وہ خبر قصبے کی آدھی سے بھی زیادہ آبادی کو سوا دو گھنٹے میں معلوم ہو چکی ہوگی بعد پھر ۱۰ بجکر [illegible] منٹ تک

وہ خبر

۲۹۵۲۴ + (۳ × ۹۸۴۱) = ۲۹۵۲۴ + ۲۹۵۲۳ = ۵۹۰۴۷

آدمیوں کو معلوم ہوگی۔ جو قصبے کی آبادی سے بھی ۷۰۴۷ زیادہ ہے یعنی ساڑھے دس بجے سے پہلے ہی پورے قصبے میں وہ افواہ پوری طرح پھیل چکی ہوگی — یاد رکھیے یہ وہی خبر ہے جو ۸ بجے صرف ایک آدمی کو معلوم تھی۔

ایک اور مثال لیجیے۔

فرض کیجیے کہ اس قصبے کے رہنے والے زیادہ باتونی ہوں یعنی ان میں سے ہر ایک تین کی جگہ پانچ یا دس آدمیوں کو خبر سنائے تو یہ افواہ یا خبر اور زیادہ تیزی سے پھیلے گی اگر ہر ایک آدمی پانچ دوسرے آدمیوں کو یہ خبر سنائے تو افواہ اس حساب سے پھیلے گی۔ (فرض کیجیے کہ اس بار بھی خبر سنانے میں ۱۵ منٹ خرچ ہوتے ہیں۔)

۸ بجے وہ خبر صرف ایک آدمی کو معلوم ہوگی۔

۸ بجکر ۱۵ منٹ تک وہ خبر ۱ + ۵ = ۶ آدمیوں کو معلوم ہوگی۔

۸ بجکر ۳۰ منٹ تک وہ خبر ۶ + (۵ × ۵) = ۶ + ۲۵ = ۳۱ آدمیوں کو معلوم ہوگی۔

۸ بجکر ۴۵ منٹ تک وہ خبر ۳۱ + (۵ × ۲۵) = ۳۱ + ۱۲۵ = ۱۵۶ آدمیوں کو معلوم ہوگی۔

۹ بجے تک وہ خبر ۱۵۶ + (۵ × ۱۲۵) = ۱۵۶ + ۶۲۵ = ۷۸۱ آدمیوں کو معلوم ہوگی۔

۹ بجکر ۱۵ منٹ تک وہ خبر ۷۸۱ + (۵ × ۶۲۵) = ۷۸۱ + ۳۱۲۵ = ۳۹۰۶ آدمیوں کو معلوم ہوگی۔

۹ بجکر ۳۰ منٹ تک وہ خبر ۳۹۰۶ + (۵ × ۳۱۲۵) = ۳۹۰۶ + ۱۵۶۲۵ = ۱۹۵۳۱ آدمیوں کو معلوم ہوگی۔

۹ بجکر ۴۵ منٹ تک وہ خبر ۱۹۵۳۱ + (۵ × ۱۵۶۲۵) = ۱۹۵۳۱ + ۷۸۱۲۵ = ۹۷۶۵۶ آدمیوں کو معلوم ہوگی۔

یعنی ۹ بجکر ۴۵ منٹ تک وہ خبر قصبے کی تقریباً دوگنی آبادی کو معلوم ہو چکی ہوگی — یعنی پورے قصبے کو — ۹ بجکر ۴۵ منٹ سے بھی پہلے وہ خبر معلوم ہو جائے گی — !

اور اگر ہر آدمی دوسرے ۱۰ آدمیوں کو یہ خبر سنائے تو یہ افواہ اس طرح پھیلے گی۔ (خبر یا افواہ کہنے میں ۱۵ منٹ لگتے ہیں)

وہ خبر صبح کے ۸ بجے صرف ایک آدمی کو معلوم ہوگی۔

وہ خبر ۸ بجکر ۱۵ منٹ تک ۱ + ۱۰ = ۱۱ آدمیوں کو معلوم ہوگی۔

۸ بجکر ۳۰ منٹ تک وہ خبر ۱۱ + (۱۰ × ۱۰) = ۱۱ + ۱۰۰ = ۱۱۱ آدمیوں کو معلوم ہو جائے گی۔

۸ بجکر ۴۵ منٹ تک وہ خبر ۱۱۱ + (۱۰ × ۱۰۰) = ۱۱۱ + ۱۰۰۰ = ۱۱۱۱ آدمیوں کو معلوم ہو جائے گی۔

۹ بجے تک وہ خبر ۱۱۱۱ + (۱۰ × ۱۰۰۰) = ۱۱۱۱ + ۱۰۰۰۰ = ۱۱۱۱۱ آدمیوں کو معلوم ہو جائے گی۔

۹ بجکر ۱۵ منٹ تک وہ خبر ۱۱۱۱۱ + (۱۰ × ۱۰۰۰۰) = ۱۱۱۱۱ + ۱۰۰۰۰۰ = ۱۱۱۱۱۱ آدمیوں کو معلوم ہو جائے گی۔

یعنی سوا گھنٹے میں خبر پوری آبادی کے دگنے سے بھی زیادہ لوگوں کو معلوم ہو جائے گی۔ یا یوں کہیے کہ ۹ بجکر کچھ ہی منٹ کے بعد وہ خبر پورے قصبے کو معلوم ہو جائے گی۔ — اب تو آپ کو یقین آیا کہ افواہ کتنی تیزی سے پھیلتی ہے — !

کتابوں کی باتیں

نئی قواعد

پڑھنے لکھنے والے بچوں سے بڑھ کر کون جانتا ہے کہ اچھی کتاب کیسی ہوتی ہے اور اس سے کتنی مدد ملتی ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ بچے کو اس کی مادری زبان میں ہی لکھی ہوئی کتاب ملنی چاہیے یعنی اس زبان میں جسے اس نے اپنے بچپن سے برتا ہے۔ اس لیے اردو بولنے والے بچوں کو بھی سب کتابیں اردو زبان میں ہی لکھی ہوئی ملنی چاہئیں۔ مگر ان دنوں اردو کی کتابیں کچھ ناپید سی ہوتی جارہی ہیں۔ خطا تو یہ بڑوں کی ہے مگر سزا بچے بھگتے ہیں کیونکہ مادری زبان کے علاوہ کسی اور زبان کے ذریعے پڑھانے لکھانے سے بچے کو پورا پورا فائدہ نہیں پہنچتا۔

خوشی کی بات ہے کہ بھارتی بھون پٹنہ نے اس طرف دھیان دیا ہے اور اردو میں بچوں کے لئے مختلف مضامین کی کتابیں چھاپی ہیں۔ ان کتابوں کو پورے طور پر مفید بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دیکھنے میں صاف ستھری معلوم ہوتی ہیں اور قیمت بھی ٹھیک ٹھیک ہے "نئی قواعد" بھی 'بھارتی بھون' ہی کی ایک کتاب ہے جسے مولوی نذر حسن گوپال پوری صاحب نے تیار کیا ہے۔ قواعد کیا اور کیوں؟ مولوی صاحب ہی کے الفاظ میں سنیے: "قواعد وہ علم ہے جس کے جاننے سے صحیح لکھنا اور صحیح بولنا آتا ہے۔ زبان چاہے جو بھی ہو اس کا غلطیوں سے پاک ہونا ضروری ہے اس لیے قواعد کی ضرورت ہوئی۔"

اردو میں قواعد کی اچھی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اول تو وہ آسانی سے ملتی نہیں ہیں اور دوسری بات یہ کہ زبان بدلتی رہتی ہے، اس میں نئے قاعدے شامل ہوتے ہیں اور کچھ چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ قواعد کی نئی کتاب سامنے آئے۔ اسی خیال سے یہ نئی کتاب لکھی گئی ہے اور اس کا نام 'نئی قواعد' رکھا ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی نام بھی لکھ دیے ہیں۔ اس طرح اور آسانی ہو جاتی ہے۔ سمجھانے کا ڈھنگ بھی سیدھا سادا ہے اور اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جسے عام طور پر دسویں درجے تک پڑھایا جاتا ہے۔ امید ہے کہ 'نئی قواعد' سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے گا۔

(معلم)

غنچہ (دوماہی) ایڈیٹر خورشید شیدائی

سائز $\frac{20\times30}{16}$ ضخامت ۴۴ صفحے، لکھائی چھپائی اوسط کاغذ سفید۔ قیمت فی پرچہ ۳۰ پیسے سالانہ ۲ روپے۔

ملنے کا پتہ: دفتر غنچہ ۱۶ چاندنی چوک اسٹریٹ کلکتہ ۱۳

خورشید شیدائی صاحب سے تو آپ واقف ہوں گے۔ پیام تعلیم میں مضمون لکھتے رہتے ہیں یہ ننھا منا

رسالہ انھی نے نکالا ہے۔ شیدائی صاحب کو لکھنے والے
اچھے مل گئے ہیں۔ اس رسالے میں مضمون، کہانیاں
کارٹون، لطیفے، نظمیں سبھی کچھ ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ
شیدائی صاحب اس کی لکھائی چھپائی اور ظاہری خوبصورتی
پر بھی پوری توجہ کریں گے۔

کشاف (غالباً دوماہی)
ایڈیٹر جناب دستگیر عزمی
سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۴۲ صفحے
لکھائی چھپائی اوسط درجے کی
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ۔ سالانہ ۵ روپے
ملنے کا پتہ: ایڈیٹر کشاف۔ اسٹیٹ ہیڈکوارٹرس حیدرآباد ۲۹

اسٹیٹ ہیڈکوارٹرس زوپ بھارت اسکاوٹس
اینڈ گائیڈز آندھرا پردیش کے اہتمام میں ایک سال سے نکل
رہا ہے۔ اس میں سہل اور سادہ زبان میں اسکاؤٹ تحریک
کے بارے میں بہت مفید اور کارآمد مضمون ہیں۔ ایک فنی
پرچہ ہے پھر بھی عام دل چسپی کی چیزیں شائع کی جاتی ہیں
مثلاً لطیفے، نظمیں، معلومات وغیرہ۔ اردو زبان میں اپنی
قسم کا یہ ایک ہی رسالہ ہے۔ اسکاوٹ تحریک سے
دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ بہت مفید ہے اس لیے
یقین ہے کہ بہت جلد مقبولیت حاصل کرے گا۔ لکھائی چھپائی
کی طرف اور زیادہ توجہ کی ضرورت ہے اس طرح کے رسالوں
کو ظاہری طور پر دلکش بنانے کی خاص طور پر ضرورت ہے

جغرافیہ مصنف سوشیل پرشاد
مترجم رضی عظیم
صفحات ۱۰۲۷
کتاب بہت عمدہ لکھی گئی ہے خاص طور سے
طبعی جغرافیہ اور عملی جغرافیہ۔ اردو میں اس مضمون پر
بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ رضی عظیم صاحب قابلِ
مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ بہت
محنت سے آسان زبان میں کیا ہے۔ بعض جگہ مشکل
الفاظ ضرور استعمال کیے گئے ہیں مثلاً موسمی تخریب
جب کہ اس کی جگہ عمل فرسودگی رائج ہے یا اس سے
بھی بہتر صرف "چٹانوں کا ٹوٹنا پھوٹنا اور ختم ہونا"
ہو سکتا تھا۔ "بادِ طوفاں" سے بہتر "سیکلون" اور
"باد" سے زیادہ بہتر "ہوا" کا استعمال کتاب میں اگر
کیا جاتا تو اور آسان زبان ہو سکتی تھی۔
اس کتاب سے بہتر کوئی دوسری کتاب اردو
میں جغرافیہ پر نہیں لکھی گئی ہے۔ ہائی اسکول ہائر سکنڈری
اور انٹرمیڈیٹ کے طلباء اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ
اٹھا سکتے ہیں۔

قاضی محمد احمد
استاد جغرافیہ جامعہ کالج

آدھی ملاقات

آپ کا ۱۲ر جنوری کا کارڈ پیشِ نظر ہے۔ سالنامہ بھی ملے بھی کئی دن ہوئے۔ اتنے اچھے سالنامے کے لیے میری دلی مبارکباد قبول کیجیے۔ نشیبا اقبال سلمہٗ آج تک سالنامہ مزے لے لے کر پڑھ رہے ہیں آپ کی خدمت میں تسلیم عرض کرتے ہیں۔

آپ حیدرآباد تشریف لائے اور میں محروم ملاقات رہا لیکن اب کے آئیے گا تو تلافی کیجیے گا۔ ممنون ہوں گا۔

اقبال متین

سالنامے کے بارے میں مجموعی اعتبار سے کہنا ہے کہ موجودہ سالنامہ پچھلے سالناموں سے کم از کم تین چار امور میں سبقت لے گیا ہے

(۱) پچھلے سالنامے کی طرح یقیناً اس بار کا ٹائیٹل بھی دلکش اور جدت آمیز ہے۔

(۲) چھپائی یقیناً بہتر ہے۔ تصاویر اور اشکال بھی نسبتاً بہتر ہیں سوائے "نیا سال مبارک" "تین سوال" "سیر کا سوا سیر" "سمجھ دار سوداگر" اور "چورا ہا" کے ساتھ دی جانے والی اشکال کے۔ بہتر اشکال میں "جانوروں میں حفاظت کے طریقے" "مغلوں کے سیر و شکار" اور ٹائیٹل پیج یعنی صفحہ ۱ قابلِ ذکر ہیں کئی اور مضامین اور کہانیوں کو بھی مصور بنایا جا سکتا تھا۔

(۳) کئی مضامین جلی خط میں لکھے گئے ہیں کم عمر بچوں کے نقطۂ نظر سے یہ ٹھیک بات ہے۔ یوں خفی خط کی کتابت سے مواد بھی زیادہ آسکتا تھا یا اس سے ضخامت اور اس طرح لاگت میں بھی کمی کی جاسکتی تھی۔

(۴) مضامین کی کثرت صحت مند پہلو ہے اور انتخاب میں تنوع اور افادیت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ چار پانچ مضامین تو بہت اچھی طرح لکھے گئے ہیں۔

(۵) حصۂ نظم بھی زیادہ جاندار ہے۔ ہلکی پھلکی اور تفریحی نظموں کا پلہ بھاری ہے اور یہ وقت کی ضرورت ہے۔ 'طلباء سے خطاب' مجھے پسند آئی۔

(۶) کہانیوں کی تعداد بھی بڑھائی جا سکتی تھی اور اس حصے کو زیادہ جاندار بنایا جا سکتا تھا۔ 'رنگ برنگی دنیا' بہت پیاری اور خوب کہانی ہے۔

بہر حال سالنامہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ایک موقر، موثر اور بہتر قدم ہے۔ ٹھوس اور بہتر خدمت کرنے کی آپ کی ہر کوشش قابلِ تحسین و مبارکباد!

خالد عرفان

سالنامہ ماشاء اللہ بہت اچھا نکلا۔ چند مضامین تو بہت اچھے ہیں۔ اسکول کے طلباء بھی بہت پسند کرتے ہیں

ابراہیم عمادی۔ بمبئی

سالنامے کے متعلق صرف چند سطور تحریر کرنا کافی ہیں سالنامہ (۱) ظاہری و معنوی خوبی سے مزین ہے

(۲) بچوں کی ذہنی ترقی پر خاص توجہ رکھی گئی ہے
(۳) کہانیاں دل کش اور مفید ہیں اور معلومات سے پُر ہیں۔
(۴) ٹائٹل انتہائی سادہ اور پرکار ہے جو قابلِ تعریف ہے۔
(۵) نظمیں بہت ہی نصیحت آمیز اور سلیس اردو میں
ہیں جس کے لیے آپ کی کاوش قابلِ مبارک ہے۔

مختار احمد بارہ بنکوی ہیڈ ماسٹر

ابھی ابھی اپنی آب و تاب کے ساتھ "پیامِ تعلیم" کا
سالنامہ ملا ہے۔ سرورق کی سادگی و پُرکاری نے دل موہ لیا
پھر مضامین کی رنگا رنگی اور تنوع نے دل و نظر اور ذہن
کو شاد کیا۔ اتنا سارا مواد آپ نے اکٹھا کر دیا ہے کہ بے اختیار
داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس سالنامے کے مطالعے سے
اندازہ ہوتا ہے کہ پیامِ تعلیم کے معیار میں مزید اضافہ ہوا ہے۔
اور مواد کے لحاظ سے یقیناً یہ سالنامہ ہمہ گیریت کا درجہ رکھتا
ہے۔ اس ضخیم، عظیم، باتصویر، جاذبِ نظر اور معیاری نمبر
کے لیے اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں

مناظر عاشق ہرگانوی۔

.... خاموشی کے اس عرصے میں میں پیامِ تعلیم سے بے خبر
بھی نہیں رہا۔ ایک، دو خریداروں سے چندے بھجوائے اور ماہ
بماہ انھی کے ذریعہ پیامِ تعلیم کا رنگ ڈھنگ دیکھتا رہا۔ قدیم
روایات کے مطابق اس بار بھی سالنامہ بیحد جاذبِ نظر، دلکش
اور معنوی لحاظ سے معیاری اور گرانقدر رہا۔ میری طرف سے
آپ حضرات کو پُرخلوص مبارکباد

نثار اعظمی مئو

.... سالنامہ دیکھا۔ دل کش اور دیدہ زیب سرورق
کے لیے سب سے پہلے مبارکباد قبول فرمائیے۔ حصۂ نظم میں
"تین سوال"، "علم"، "بھارت درشن" اور "طلباء سے خطاب"
بہترین رہے۔ معلوماتی مضامین سب ہی اچھے ہیں لیکن بچوں
کے رسالے میں انھیں اس کثرت سے نہ ہونا چاہیے تھا۔ کہانیوں
میں بلغاریائی اور روسی کہانیاں عمدہ ہیں۔ سمجھ دار سوداگر اور سبق
جیسی فارمولا کہانیاں آج کل ہر رسالے میں نظر آجاتی ہیں۔
مجموعی طور پر سالنامہ آپ کی انتھک کوششوں کا
مظہر ہے جس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

بانو سرتاج۔ یوت مل

سالنامہ دیکھا۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ اس سال کا
پیامِ تعلیم کا سالنامہ بے حد خوبصورت اور دیدہ زیب ہے
سرورق خاص طور پر نگاہوں کو اچھا لگنے والا ہے مضامین
کے انتخاب اور نظموں کی ترتیب قابلِ ستائش ہے۔ میری
طرف سے سالنامہ کی کامیابی پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

مشیدہ پروین برنی

سالنامہ ملا۔ سرورق دیکھتے ہی طبیعت خوش ہوگئی
گھر میں بھائی وغیرہ نے بہت پسند کیا۔ آپ نے سب سے
پہلے سالنامہ نکال کر ہم سب پر احسان کیا۔ جناب رشید الوحیدی
صاحب کی نظم "حضور کی پیدائش" بہت پسند آئی۔ ہم لوگوں کی
طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

عادل فرید کٹک۔

سالنامے کے متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا
ہے۔ پیامِ تعلیم کے سالنامے کا ٹائٹل دیکھ کر طبیعت پھڑک
اٹھی۔ آپ کی کوششیں واقعی قابلِ صد مبارکباد ہیں۔
مضامین اور نظمیں پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔

محمد ارمغان ساحل

بڑوں کی کوششیں

میں کون ہوں؟

ارے ارے کون ہو تم؟ جو میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہو! جی ہاں میں یہی پوچھ رہی ہوں کہ تم ہو کون؟

"میں؟ میں وہ ہوں جو تمہیں تمہاری زندگی کی سبھی شکلیں دکھا سکتی ہوں۔ جی ہاں زندگی کی سبھی شکلیں۔ ذرا سوچو تو جب تم مجھے مان لیتے ہو تو کیا اپنے آپ کو زندگی کی سبھی شکلوں میں نہیں دیکھ سکتے؟"

"کیا کہا؟ نہیں سمجھ پا رہے ہو کہ میں کون ہوں؟ بڑے ناسمجھ ہو جی۔ پھر سے سوچو۔ ہاں ذرا سوچو تو سہی تم مجھے اپنے گلے لگا لو تو کیا تم ڈاکٹر، پولیس میں، فوجی افسر ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، بھائی، بہن، سبھی کچھ نہیں بن سکتے؟ میں کہتی ہوں اگر چاہتے ہو اپنے کو زندگی کی الگ الگ شکلوں میں دیکھنا تو مجھے اپنے گلے لگا لو۔"

"جی ہاں اب تو سمجھ گئے کہ میں کون ہوں؟ اگر نہیں سمجھے تو پریشان نہ ہوں میں ہی بتلائے دیتی ہوں۔ میں ہوں "مونو ایکٹنگ" جی ہاں مونو ایکٹنگ! جسے آپ لوگوں نے ابھی کچھ دن پہلے گاندھی ہاؤس کے جلسے میں بھی دیکھا ہے۔

دینا
ڈپلوما بیسک، سال دوم جامعہ

ہماری ناسمجھی

ایک دن ہمارے ابا کے پاس ان کے کچھ ملنے والے آئے۔ وہ پان کھاتے تھے۔ ابا جان نے گھر میں امی سے کہلوایا کہ کچھ پان لگوا کر بھیج دو۔ میں نے اور میرے بھائی نے امی سے نہیں کہا لیکن خود پان لگانے لگے۔ دونوں میں لڑائی ہوئی۔ اس طرح الٹے سیدھے چار پان لگائے۔ کتھ چونا ایک ہو گیا اور تمباکو بھی چونے میں مل گیا۔ اس طرح ہم وہ پان ابا جان کے پاس لے کر گئے۔ ابا جان دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ پان بچوں نے لگائے ہیں۔ وہ غصے سے ہماری طرف دیکھنے لگے۔ میں کواڑ کے پیچھے چھپ گئی اور میرا بھائی پلنگ کے نیچے۔ وہ پان ان کے دوستوں نے کھا لیے۔ جو لوگ تمباکو نہیں کھاتے تھے ان کو چکر آنے لگے۔ کسی طرح ابا جان نے ان کو سنبھالا۔

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب میں آٹھ سال کی تھی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے۔

ہربنس آہوجہ
بیسک ڈپلوما۔ دوسرا سال، جامعہ

کیا سے کیا ہو گیا۔

امتحان تو ہر سال ہوتے رہتے ہیں اور ان کا نتیجہ بھی نکلتا رہتا ہے لیکن مجھے اتنی پریشانی نہیں ہوئی [illegible]

پچھے والے دن ہوئی۔ میرے پیپر تو اچھے ہوئے تھے پھر بھی ڈر لگ رہا تھا کہ کیا ہوگا۔ میں نے کئی دن تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ سارا دن بیٹھے رہنا، اداس بیٹھے رہنا ہی میرا کام تھا۔ گھر میں سب غصہ ہوتے لیکن اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ آخر وہ دن بھی آگیا جس دن نتیجہ آنا تھا۔ میرے چہرے پر تو ہوائیاں اڑ رہی تھیں ایک رنگ آتا، ایک جاتا۔ میرے بھائی نے اخبار خریدا۔ اور اس نے میرا رول نمبر دیکھا۔ اس میں میرا رول نمبر نہیں تھا۔ میرا تو رونا شروع ہوگیا۔ آنکھوں سے پانی اس قدر بہہ رہا تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ روتے روتے بارہ بج گئے۔ اتنے میں میری سہیلیاں دوڑی دوڑی آئیں اور مجھے مبارکباد دینے لگیں۔ میں تو ان سے چھپ رہی تھی لیکن انھوں نے مجھے پکڑ لیا اور میری حالت دیکھی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ تم تو اوّل درجے میں پاس ہو اور سارے کلاس میں بھی اوّل آئی ہو۔ جب میں نے یہ سنا تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ مجھ سے دعوت کے لیے کہنے لگیں۔ گھر میں سب حیران ہو گئے کہ یہ ایک منٹ میں کیا ہوگیا۔ اس کے بعد میں نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر ان کے ساتھ اسکول گئی۔ میری استانیوں نے جب میرا چہرہ دیکھا تو حیران ہوگئیں۔ میں نے جب اپنے نمبر دیکھے تو میں بہت خوش ہوئی۔ میں نے گھر آکر اپنی سب سہیلیوں کو دعوت دی۔ اسی دعوت کے وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ٹیلی فون اٹھایا تو مجھے یہ خبر ملی کہ میرے چاچا جی نے دس ہزار روپے کی لاٹری جیتی ہے۔ گھر میں سب لوگ خوش ہوئے۔ میری سہیلیوں نے جب یہ سنا تو وہ کہنے لگیں ایک بار پھر دعوت ہونی چاہیے۔ میں اپنی زندگی میں اس واقعہ کو کبھی نہیں بھول سکتی۔

ممتا۔ بیک ڈپلوما، دوسرا سال جامعہ

بقایا کہانی: "تین تحفے"

تم نے چرائی تھیں۔"

"میں نے تمھاری کوئی چیز نہیں چرائی۔ تم چپ چاپ میرے گھر سے چلے جاؤ۔" کریمو نے بگڑ کر کہا۔

"اچھا چوری اور سینہ زوری۔ میری چیزیں واپس کرتے ہو یا ــ"

"یا کیا کرو گے۔ میں ابھی تمھیں دھکے دے کر یہاں سے نکالتا ہوں۔" کریمو غصے سے لال پیلا ہو کر بولا۔

"میں کیا کروں گا! ابھی تمھیں بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر عیدو میاں نے ڈنڈے کو حکم دیا کہ کریمو پر وار کرے۔

ڈنڈے کو حکم ملنا تھا کہ وہ کریمو کے سر پر پڑنا شروع ہوگیا۔ میاں کریمو ادھر بھاگے ادھر بھاگے مگر ڈنڈے کے عذاب سے نجات نہ ملی۔ وہ چلائے۔ "اچھا اچھا میں ساری چیزیں واپس کر دوں گا مجھے اس بلا سے نجات دلاؤ۔" عیدو نے ڈنڈے کو رکنے کا اشارہ کیا اور وہ دوبارہ عیدو کے ہاتھ میں واپس آگیا۔

کریمو نے جھولا اور بکری کا بچہ عیدو کے حوالے کر دیا اور معافی مانگی۔ عیدو نے اسے معاف کر دیا اور خوشی خوشی تینوں تحفے لے کر گھر پہنچے۔

اور اب کے گاؤں کے سارے لوگوں کو جمع کیا۔ انھیں اپنے تحفوں کا تماشہ دکھایا اور سب کی خوب شاندار دعوت کی۔ سب کو ایسے ایسے کھانے کھلائے جو لوگوں نے کبھی نہ کھائے تھے۔ سب نے عیدو میاں کی خوب تعریف کی۔

[illegible]

بچّوں کی کوششیں

ایک بلی اور چوہا

یہ کہانی تو آپ میں سے بہت سے پیامیوں نے پڑھی ہوگی کہ ایک بلی چوہوں کو بہت پریشان کیا کرتی تھی۔ اُسے جب بھی موقع ملتا غریب چوہوں پر ہاتھ صاف کر جاتی۔ چوہے زندگی سے تنگ تھے۔ پر وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ ایک دن انھوں نے اپنی برادری کی میٹنگ کی کہ اس بلی سے کیسے چھٹکارا پایا جائے۔ سب نے اپنی اپنی تجویزیں سبھا میں رکھیں لیکن کسی کی بات بھی مانی نہ جا سکی۔ یہ رنگ دیکھ کر ایک نوجوان چوہا آگے بڑھا اور بولا: دوستو ایک ترکیب میرے دھیان میں آئی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو بتاؤں۔ جواب ملا کیوں نہیں۔ جوان چوہا بولا کیوں نہ بلّی کے گلے میں ایک گھنٹی باندھ دی جائے۔ بلّی کے پاؤں کی چاپ تو سنائی نہیں دیتی۔ یہ گھنٹی تو اس کے ہلتے ہی بجنے لگا کرے گی۔ ساری میٹنگ خوشی میں جھوم اٹھی اور کہا واہ کیا ترکیب سوجھی ہے۔ لاؤ گھنٹی لاؤ کہ یہ روز روز کا خون خرابہ ختم ہو۔ گھنٹی آگئی۔ سب اچھلنے لگے۔ ایک بوڑھا چوہا بولا میرے نوجوانو یہ تو بتاؤ کہ اس گھنٹی کو بلّی کے گلے میں باندھے گا کون؟ ابھی وہ بیٹھے سوچ ہی رہے تھے کہ دبے پاؤں بلّی آئی اور بولی 'میاؤں'۔ یہ سننا تھا کہ بھگدڑ پڑ گئی چوہے اپنے اپنے بلوں میں ہو رہے اور بلّی گھنٹی سے کھیلنے لگی۔

لیکن میں اپنے بچپن کا آنکھوں دیکھا واقعہ سناتا ہوں: یہ برسوں پہلے کی بات ہے کہ میں اپنے والدین کے ساتھ بمبئی سے اپنے وطن مالیر کوٹلہ آیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں میرے منھ سے نکلا کہ بمبئی میں ایسے چوہے دیکھے گئے ہیں جن سے بلّی کا دم خشک ہوتا ہے۔ میرے نانا صاحب نے کہا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بلّی آخر شیر کی خالہ ہے۔ چوہے کی کیا مجال کہ اس کو ڈرا سکے۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ اگر آپ بمبئی گئے تو شاید یہ نظارہ دیکھ لیں۔ بات آئی گئی ہوئی۔ کچھ عرصے بعد میرے نانا صاحب نے بمبئی کا سفر کیا۔ ایک دن وہ گھر کی تیسری منزل کے گٹر کی طرف کی کھڑکی میں بیٹھے تھے جہاں لوگ بے احتیاطی سے کوڑا کرکٹ پھینک دیا کرتے تھے۔ کسی نے باسی چاول بھی پھینک دیے تھے۔ چاول دیکھ کر ایک بلّی اس طرف آئی اور چاول کھانے لگی اتنے میں ایک گرانڈیل چوہا بھی اپنے بل سے نکلا۔ اسے دیکھتے ہی بلّی نے چاول کھانا چھوڑ دیے۔ چوہا چاولوں کی طرف اطمینان سے بڑھنے لگا اور بلّی چاولوں سے دور ہٹنے لگی۔ چوہا بڑھ کر چاول کھانے لگا اور بلّی دور کھڑی دیکھتی رہی۔ جب چوہا خوب پیٹ بھر کر اپنے بل میں چلا گیا

تب بلّی چاولوں کے پاس آئی اور جو بچا تھا کھانے لگی ۔!
نانا صاحب مرحوم یہ نظارہ دیکھ کر حیران ہوئے اور تعجب
سے اس بات کو بیان کرتے تھے ۔

یہ اس وقت کی بات ہے کہ ہمارے مکان کے
آس پاس کے راستے اور گٹر وغیرہ پکے نہیں بنے تھے ۔

احمد مصطفیٰ خان شیروانی
مالیر کوٹلہ

لطیفے

ماں : (بیٹے سے) بھاگ کر سامنے والی دوکان سے
ایک آنے کا گرم مصالحہ لے آؤ۔
بیٹا : (معصومیت سے) امّی میں گرم مصالحہ نہیں لاتا
میرا ہاتھ جل جائے گا۔

استاد ، (شاگرد سے) تمھارے سارے سوالات صحیح
ہیں صرف ایک غلط ہے ۔ یہ کیوں غلط ہوا ؟
شاگرد ، (جلدی سے) جناب یہ سوال میں نے خود کیا تھا ۔

سید محمود علی
کراچی

بری عادتیں

ایک مسافر تھکا ماندہ ایک غار کے دروازے پر رکا
اور اندر داخل ہوا ۔ اندر ایک بوڑھی عورت بیٹھی سوت کات
رہی تھی ۔ مسافر نے بڑھیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا " ماں
کیا میں اندر لیٹ سکتا ہوں ؟"

" ضرور ضرور " بڑھیا نے خوش دلی سے کہا ۔
مسافر لیٹنے لگا اور دل میں سوچا ؛ کیا [illegible] عورت
ہے " میاں مسافر میری ایک شرط ہے " بڑھیا نے کہا
" فرمائیے " مسافر نے مختصراً کہا
" جب تک تم سوتے رہو گے میں تمھارے چاروں طرف
سوت لپیٹتی رہوں گی ۔ منظور ! " بڑھیا نے اس کو تکتے ہوئے
کہا ۔ " منظور ہے " مسافر یہ کہہ کر سو گیا ۔

آنکھ لگنے سے پہلے اس نے سوچا جب جاگ
جاؤں گا تو سوت توڑ کر چلا جاؤں گا ۔ سوت کوئی رسی تو ہے نہیں

یکایک اس کی آنکھ کھل گئی ۔ بڑھیا اس سے دور
بیٹھی منھ پھاڑ کر ہنس رہی تھی ۔ مسافر نے اٹھنے کی کوشش
کی اور اٹھ نہ پایا

ذرا سا سوت ایک موٹا رسّا محسوس ہو رہا تھا اور پھر
وہ سوت نہ توڑ پایا ۔

یہی حال بری عادتوں کا ہے ۔ ہم سوچتے ہیں آج
اور ہے بس کل نہیں ، اور کل کو کہتے ہیں ارے آج اور کل کو
نہیں ، اور پھر بری عادتیں جکڑ لیتی ہیں اور لاکھ پیچھا چھڑانے
پر بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں ۔

سید حسن مرادآباد

پہیلیاں

(۱) ایک پھل اور پھول ملا کر ایک مٹھائی بنتی ہے ۔ نام بتائیے ؛
(۲) اونٹ کی بیٹھک ہرن کی چال عجب ہے وہ جانور نہ دُم نہ جان ۔
(۳) کچا کالا پکا سفید ۔ ایسا کہاں پہ دیکھا کھیت ۔
(۴) رہوں تمھارے آگے پیچھے + کبھی چھوڑتی نہیں میں ساتھ
(۵) آوے تو اندھیری لاوے جاوے تو سکھ دے جاوے

سید ذوالفقار احمد

[illegible]

ناریل کی کہانی

ناریل کی یہ کہانی مشہور ہے، ہندوستان کے کسی بادشاہ کے دربار میں ایک بڑا حکیم تھا۔ بادشاہ کے وزیر میں اور حکیم میں دشمنی تھی۔ حکیم اس تاک میں رہتا تھا کہ وزیر کسی طرح بادشاہ کی نظروں سے گر جائے اور بادشاہ اُسے قتل کر دے۔

ایک دن حکیم نے بادشاہ سے کہا۔ جہاں پناہ آپ کا وزیر بہت دانا، بڑا عقلمند ہے۔ اس کا سر کاٹ کر دفن کر دیا جائے تو ایک ایسا درخت اُگے گا جس سے ساری دنیا فائدہ اٹھائے گی۔

بادشاہ نے کہا: یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔

حکیم بولا: آپ اس کا تجربہ کر لیں۔ میرا کہنا پورا نہ ہو اور درخت نہ اُگے تو فوراً میری گردن کاٹ دی جائے۔

بادشاہ نے کہا، اگر یہ بات ہے تو میں تجھے وزیر کی جان کا اختیار دیتا ہوں

حکیم کے اشارے پر وزیر کی گردن مار دی گئی۔ حکیم نے وزیر کا سر کھرچا اور بھیجے میں ناریل کا بیج دواؤں میں بھگو کر رکھ دیا اور سر کو زمین میں گاڑ دیا۔ پھر ان دواؤں میں پانی پہنچاتا رہا۔ کچھ دنوں کے بعد پودا اگا اور بڑھتے بڑھتے اونچا ہو گیا۔ پھل آئے تو آدمی کے سر جیسے تھے۔ آنکھ اور منہ کا نشان، اوپر بال، سفید بھیجا۔

شیخ شان محمد

تین سوال

کسی زمانے میں ایک راجہ رہتا تھا جو تین سوالوں کے جواب چاہتا تھا۔ اس کا پہلا سوال تھا کونسا وقت سب سے قیمتی ہے۔ دوسرا سب سے زیادہ اہم آدمی کون ہے اور تیسرا سوال تھا کہ کونسا کام سب سے اچھا ہے؟ بڑے بڑے وزیر اور عقلمند اس کے سوالوں کا جواب نہ دے سکے۔

تب وہ ایک سادھو کے پاس اپنا بھیس بدل کر پہنچا۔ اس وقت سادھو اپنا باغیچہ کھود رہا تھا۔ راجہ نے اس سے تینوں سوال پوچھے لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

اب راجہ سادھو کے ساتھ باغیچہ کو کھودنے لگا۔ جب شام ہوئی تو کسی آدمی کے رونے کی آواز آئی۔ راجہ اور سادھو باہر نکلے اور ایک آدمی کو بہت گھائل دیکھا۔ راجہ نے اس کی مرہم پٹی کی یہاں تک کہ اس کا خون نکلنا بند ہو گیا جو بہت تیزی سے نکل رہا تھا۔ پھر وہ گھائل آدمی سو گیا۔ جب صبح ہوئی اور گھائل آدمی کی آنکھ کھلی تو اس نے راجہ سے معافی مانگتے ہوئے کہا: جناب مجھے معاف کر دیجیے میں آپ کا دشمن ہوں اور آپ کو مارنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ آپ کے حفاظتی دستے نے مجھے پہچان کر گھائل کر دیا۔ اگر آپ میری مدد نہ کرتے تو میں مر جاتا۔ اب میں زندگی بھر آپ کا غلام رہوں گا۔

راجہ کو بہت خوشی ہوئی اور اسے اپنا دوست بنا لیا۔ اب راجہ نے آخر میں پھر وہی تینوں سوال پوچھے۔ سادھو نے کہا آپ کے سوالوں کا جواب مل چکا ہے۔ سب سے قیمتی وقت وہ تھا جب آپ باغ میں کھدائی کر رہے تھے۔ میں آپ کے لیے سب سے اہم آدمی تھا اور آپ کا سب سے اچھا کام میرے باغ کی کیاری کھودنا تھا۔ اس کے بعد سب سے اچھا وقت وہ تھا جب آپ گھائل آدمی کی تیمارداری کر رہے تھے۔ یہ گھائل سب سے اچھا آدمی تھا اور اس کی

اِدھر اُدھر سے

ننھے آرٹسٹوں کا مقابلہ

ہمیشہ کی طرح اس سال بھی ہندوستان کے مشہور آرٹسٹ اور کارٹونسٹ شنکر پلّئی صاحب کی سرپرستی میں ننھے آرٹسٹوں کا وقت کے وقت تصویریں بنانے کا مقابلہ ہوا پہلے کی طرح یہ مقابلہ ماڈرن ہائی اسکول کے میدان میں ہوا۔

لگ بھگ پندرہ ہزار بلکہ زیادہ بچے اس مقابلہ میں شریک ہوئے۔ شامیانے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ دیر سے آنے والوں کو شامیانے میں جگہ نہ مل سکی بیچاروں کو دھوپ میں بیٹھنا پڑا۔

کہتے ہیں ہمارے آرٹسٹ یا مصور تصویر بنانے کے لئے موڈ کا یا پھر سہانی فضا کا انتظار کرتے ہیں۔ مگر ان آرٹسٹوں کا معاملہ تو دوسرا تھا۔ یوں انھیں ان کے سرپرستوں نے برش اور رنگ یا پینٹ دے کر بھیج دیا تھا مگر جس جس چیز نے ان میں سے بہت سوں کو یہاں لانے پر آمادہ کیا وہ طرح طرح کی مٹھائیاں تھیں، ٹافیاں تھیں، آئس کریم تھی اور نہ جانے کیا کیا۔ غرض بہت سے آرٹسٹ اسی لالچ میں یہاں تک پہنچے

ایک سال سے پانچ سال تک کے بچوں کا سیکشن یا حلقہ سب سے زیادہ دلچسپ تھا۔ ان ننھے فنکاروں کو اجازت تھی کہ کاغذ پر [illegible] بنائیں۔ اور انھوں نے اپنی سمجھ سے کچھ تصویریں بنائیں بھی جیسے ایک فنکار نے ایک گائے بنائی مگر بے دم کی۔ کسی صاحب نے کاغذ پر اتنا رنگ نہیں پوتا جتنا اپنے منہ پر تھوپا۔

پانچ سال سے زیادہ عمر کے بچوں کا دل خواہ یا پسندیدہ موضوع تھا۔ ٹریفک پولس، ننھے بچے کو سلانے کی تیاری امّی کھانا پکا رہی ہیں، پھول چنا اور فینسی ڈریس وغیرہ۔

آٹھ سے بارہ سال کے بچے زیادہ غور و فکر سے زیادہ سنجیدگی سے تصویریں بنا رہے تھے۔ اُن کے لئے عنوان مقرر کر دیئے گئے تھے۔ لیکن یہ آزادی تھی کہ چاہے جس موضوع پر تصویریں بنائیں اور چاہے جتنی بنائیں۔ اسی لئے مقابلہ ختم ہوا تو تصویروں کا ایک پہاڑ کھڑا ہو گیا۔

اس مقابلہ میں دلی کے سب ہی اسکولوں کے بچوں نے حصّہ لیا۔ بلکہ کچھ بچے باہر کے بھی آ گئے تھے۔ تماشائیوں کو یا یوں کہیے کہ سرپرستوں کو اس مقابلے سے دور ہی رکھنے کی کوشش کی گئی تھی پھر بھی پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کو خاص طور پر تھوڑی بہت اخلاقی مدد حاصل رہی۔

بھیڑ اتنی زیادہ تھی کہ ماڈرن اسکول کا لمبا چوڑا میدان بالکل ناکافی معلوم ہو رہا تھا۔

مقابلہ ختم ہونے پر چھوٹے فن کاروں کی تلاش میں ابھی خاصی کش مکش رہی۔ یہ بچے آخر مل گئے۔ ان میں سے کچھ تو اپنے ساتھیوں سے اپنی تصویروں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

نائب وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی اور وزیر تعلیم ڈاکٹر وی کے آر، راؤ بھی تماشا دیکھنے پہنچ گئے۔ ڈاکٹر راؤ تو نونہالو کو کام کرتے دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ اس مقابلے کے بانی مسٹر شنکر پلائی سے کہنے لگے۔ جی چاہتا ہے کہ باہر سے آئے ہوئے بچوں کی منسٹری کی طرف سے خوب خاطر مدارات کی جائے۔

سامنے کے صفحے پر ایک لڑکا اور دو لڑکیاں نظر آ رہی ہیں۔ تینوں کے ہاتھوں میں ایک ایک پرندہ ہے۔ بھلا یہ پرندوں پر کیا عمل کر رہے ہیں۔

بات یہ ہوئی کہ تیل لے جانے والے ایک جہاز کے کپتان صاحب کو کیا سوجھی کہ دریائے الب سے نکلتے وقت جہاز صاف کروا کر باقی ماندہ تیل اور تیل کی تلچھٹ سمندر میں پھنکوا دی۔ نتیجہ یہ کہ جرمنی کے مغربی ساحل پر تیس میل تک کثیف سطح پھیل گئی۔ جنگلی مرغابیاں، بطخیں اور دوسرے سمندری جانور اسے ٹھہرا ہوا پانی سمجھ کر اس میں اُترے اور ناگہانی آفت کا شکار ہو گئے۔ اور اب شمالی جرمنی کے چڑیا گھروں اور مویشی خانوں میں رضا کاروں کی ٹولیاں ان بے چارے بے بس پرندوں کو اس جان لیوا کثافت سے نجات دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس مہم میں مویشیوں کی انجمن پیشہ ور شکاریوں۔ اسکول کے بچے اور اُن کے ساتھ فوج کے

ذرا سامنے کے صفحے پر دیکھئے بندروں کا ایک جوڑا کیسے مزے میں بیٹھا ہے۔ اور ہاں بیگم صاحبہ (مادہ) کی گود میں ایک ننھا منا بچہ بھی تو ہے۔ مامتا بھری ماں کیسے اپنے ننھے کو کلیجے سے لگائے ہوئے ہے۔ پر یہ مامتا بہت ہی تھوڑی دیر باقی رہی کُل چھ گھنٹے۔ پھر ان امی صاحبہ نے اپنے ننھے سے بالکل نظریں پھیر لیں جیسے یہ ان کی اولاد ہی نہیں یہ واقعہ مغربی جرمنی کے شہر اسٹوٹ کارٹ کے چڑیا گھر میں پیش آیا۔ اور یہ کوئی پہلا حادثہ نہیں ہے۔ ڈیڑھ سال پہلے بھی یہی ہو چکا ہے۔ اسی ننھے کی بہن انہی بیگم صاحبہ کی سرد مہری کا شکار ہو چکی ہے۔ وہ تو کہیے کہ چڑیا گھر کے ایک ملازم کی بیوی نے بوتل سے دودھ پلا پلا کر اُسے بچا لیا۔ اس بچے کو بھی اسی طرح پالنے کی کوشش کی جائے گی۔

بندر کی یہ نسل اورانگ اوٹانگ کہلاتی ہے۔ اور دنیا کا ہر چڑیا گھر اس نادر حیوان یا بن مانس کو اپنے چڑیا گھر میں رکھنے کی آرزو رکھتا ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ چڑیا گھر میں پہنچ کر یا تو ان کے بچے ہی نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو انھیں ان بچوں سے ذرا محبت یا دلچسپی نہیں ہوتی۔

چاند پر پہنچنے کے لیے خلائی دوڑ

آپ نے پچھلے پرچے میں پڑھا ہوگا کہ روس خلا میں اسٹیشن قائم کرنے کے سلسلے میں کامیاب تجربے کر چکا ہے پچھلے ہفتے چاند پر اترنے کے سلسلے میں اور زیادہ کامیاب تجربہ کیا گیا۔ امریکہ کے خلاء باز دو راکٹوں میں دس دن تک خلاء میں چکر لگاتے رہے۔ ایک وقت پر یہ دونوں راکٹ ایک دوسرے سے جُڑ گئے اور خلاء باز ایک سے دوسرے راکٹ میں پہنچ گئے۔ امریکن سائنس دانوں کو توقع ہے کہ ان کے

Regd. No. D. APRIL 1969

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.

ٹائیٹل مطبوعہ فائن پریس دہلی

تعلیم و تربیت

قاعدہ

یسّرنا القرآن

یہ قاعدہ مکتبہ جامعہ نے تعلیمی اصولوں کے پیشِ نظر نئی ترتیب کے ساتھ نئے سرے سے مرتب کیا ہے۔ غیر ضروری چیزیں کم کی گئی ہیں سبقوں اور مشقوں میں مفید اضافے کیے گئے ہیں۔

ہر سبق کے شروع میں پڑھانے والوں کے لیے آسان اور مختصر ہدایتیں دی گئی ہیں جن کی مدد سے معمولی اردو جاننے والے والدین بھی اپنے بچوں کو آسانی کے ساتھ بہت کم مدت میں قرآن مجید پڑھا سکتے ہیں۔

ان خوبیوں کی وجہ سے اس قاعدے کی افادیت بازار میں ملنے والے عام قاعدوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

سفید گلیز کاغذ .... آفسٹ کی چھپائی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی

ریاست ہائے اترپردیش، مدھیہ پردیش، جموں و کشمیر و ہریانہ کے تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

فہرست

بچّوں سے باتیں

یہ پرچہ جس وقت آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا آپ میں سے بہت سے پیامی امتحان دے کر اطمینان کا سانس لے رہے ہوں گے، بہت سے پیامی امتحان میں مشغول ہوں گے۔ ہماری دِلی دُعا ہے کہ خدا آپ سب کو کامیاب کرے۔ آمین!

ان امتحانوں کے بعد گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو جائیں گی۔ لمبی چھٹیاں۔ یہ چھٹیاں یا تو آپ اپنے گھر پہ گزاریں گے یا سیر و تفریح کا پروگرام بنائیں گے۔ اچھا ہو کہ آپ اپنا تھوڑا سا وقت پیامِ تعلیم کے خریدار بڑھانے کے لیے نکال لیں۔ مارچ کے پیامِ تعلیم میں، انھی صفحوں میں ہم ذرا تفصیلی باتیں کر چکے ہیں۔ موقع ہو تو انھیں بھی پڑھ لیجیے۔

اس پرچے میں پیسے کی کہانی کا آخری حصہ شایع ہو رہا ہے۔ بڑی دل چسپ کہانی تھی۔ غلام حیدر صاحب نے یہ کہانی بہت ہی محنت سے لکھی ہے۔ ایک بہت ہی معلوماتی مضمون ایسے دل چسپ انداز میں لکھا ہے کہ ہمیں آپ کو سچ مچ کہانی کا مزہ آگیا۔ بڑے تو بڑے چھوٹے بچّوں نے اسے بہت پسند کیا ہے۔ ہم غلام حیدر صاحب کو اس کامیابی پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

غلام حیدر صاحب نے ہمارے لیے ایک لمبی کہانی لکھی ہے۔ یہ کہانی تو تیار ہوگئی ہے تصویریں بننے میں دیر لگے گی۔ یہ تصویریں ایک خاص آرٹسٹ سے بنوا رہے ہیں۔ ایک طرح سے تصویری کہانی ہوگی۔

اس کے علاوہ چند بہت ہی اچھی کہانیوں کا انھوں نے ترجمہ بھی کیا ہے۔ ترجمہ کیا کیا ہے اپنے دیس کے رنگ، دیس کے ماحول میں بہت ہی انوکھے بہت ہی دل چسپ انداز میں ڈھالا ہے۔ ان میں سے ایک کہانی اگلے پرچے میں دی جائے گی۔

پچھلے پرچے میں غالب پر ایک مضمون شایع ہو چکا ہے۔ اس پرچے میں بھی اسی طرح کا ایک مضمون پڑھیے۔ فرق یہ ہے کہ شعیب اعظمی صاحب نے

ان خطوں سے غالب کی زندگی کا حال یا ان کی سوانح عمری مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے مضمون لمبا ہو گیا ہے۔ اس کا اگلا حصہ اگلے پرچے میں چھپے گا۔

محترم مرزا شکور بیگ صاحب کا مضمون بچوں اور بڑوں سب کو بہت پسند آیا۔ اس پرچے میں اس کی آخری قسط چھپ رہی ہے۔ امید ہے کہ مرزا صاحب محترم اپنی سرپرستی جاری رکھیں گے۔

آسٹریلیا کے جانوروں والا مضمون بھی پیامیوں کو بہت اچھا لگا۔ مضمون نگار صاحب نے بہت محنت سے لکھا ہے۔ یہ اگلے پرچے میں ختم ہوگا۔

ہمارے امین صاحب نے اس مرتبہ اتھوپیا کی چند لوک کہانیاں بھیجی ہیں۔ انھیں پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کس قدر انوکھی ہیں، ہمارے ہاں کی کہانیوں سے کس قدر مختلف ہیں پھر بھی کتنی دل چسپ ہیں۔ ان میں سے ایک کہانی اس پرچے میں دی جا رہی ہے۔ یہ آپ کو پسند آئی تو دوسری کہانیاں بھی شایع کی جائیں گی۔

سلام بن رزاق صاحب کی جگنو والی کہانی بھی بہت مزے کی ہے۔ فرحت قمر صاحب کا ڈرامہ 'نیا راستہ' رضوان رضوی صاحب کا "بڑے اور موٹے چوہے" خاصے کی چیزیں ہیں۔

نظموں میں محترم حرمت الاکرام صاحب کی نظم 'بچے کا گیت' ابو مسلم مرحوم کی نظم "ننھا ستارہ" سیف سہسرامی کی نظم "گیت سنا دو" یہ سب آپ کو خاص طور پر پسند آئیں گی۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت اچھی اچھی نظمیں ہیں۔

قلمی دوستی کے سلسلے میں پیامی اپنی عمر لکھنا بھول جاتے ہیں اس لیے ہم ان کا نام شایع نہیں کر سکتے۔ یاد رکھیے ہمارے ہاں عمر کی آخری حد سولہ سال ہے۔ اس لیے اسی عمر کے پیامی قلمی دوستی کے سلسلے میں اپنا نام لکھیں۔

اگلے پرچے میں خدا نے کیا تو بعض بہت دل چسپ مضمون شایع ہوں گے۔ انتظار کیجیے۔
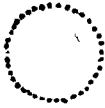
اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو چکی ہے۔

پیام تعلیم سال بھر تک آپ کے پاس آتا رہا ہے اس کے دل چسپ مضمون اور مزے دار کہانیاں آپ کو پسند آئی ہوں گی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ نہ صرف اس کے خریدار بنے رہیں گے بلکہ اپنے دوستوں کو بھی خریدار بنائیں گے۔

اس لیے ۲۵ مئی تک آپ سالانہ چندہ صرف ۲۰ روپے منیجر صاحب پیام تعلیم کے نام بھیج دیجیے۔ آپ کا خریداری نمبر ...... ہے۔ اگر آپ نے ۲۵ مئی تک منی آرڈر نہیں بھیجا تو آپ کا نام خریداری سے خارج ہو جائے گا۔

جناب سید حرمت الاکرام

بچّے کا گیت

ٹھنڈک دلوں کی آنکھوں کا تارا بنوں گا میں
انسانیت کا راج دُلارا بنوں گا میں

منجدھار میں نہ ڈوبنے پائے گی کوئی ناؤ
طوفان سے لڑوں گا کنارہ بنوں گا میں

آئے گا مجھ کو چین نہ اک پل کے واسطے
عزم و عمل کی راہ میں پارہ بنوں گا میں

چھا جاؤں گا دمکتی ہوئی صبح کی طرح
ظلمت میں روشنی کا منارہ بنوں گا میں

مایوسیوں کے جسم میں دوڑاؤں گا لہو
ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا بنوں گا میں

اٹھا ہوں زندگی کی حرارت لیے ہوئے
بیدار حوصلوں کا شرارہ بنوں گا میں

میرے خیال سے بھی ہے منزل مری بلند
ذرّے سے ایک روز ستارہ بنوں گا میں

محمد امین ایم۔ اے۔

بوم بومی اور سمبا

افریقہ کے کسی لڑکے یا لڑکی نے بوم بومی کو نہیں دیکھا ہے لیکن دادی اماں سے اس کی کہانی ضرور سنی ہے۔ بوم بومی بڑا ہی عجیب و غریب قسم کا جانور تھا اور اس کی دم ایک عجوبہ تھی۔

مغربی افریقہ کے جنگل میں سمبا نام کا ایک لڑکا تھا جو بڑا ہی بہت بہادر تھا۔ اس نے ہمت کر کے اپنے باپ لنگاری کو بوم بومی کی دم لا کر دی تھی۔ یہ دم دراصل جادو کی دم تھی اور اس میں کچھ

عجیب کمال تھے۔

اور بمبی سُمبا بھی ایک انوکھا لڑکا تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تو اس کے مُنھ میں دانت تھے اور جناب پیدا ہوتے ہی وہ بات چیت کرسکتا تھا۔ جیسے ہی اس نے جنم لیا اپنی ماں سے بولا: "ماں میرے جسم میں گندگی بہت لگی ہے، مجھے نہلا دو!"

لیکن اس کی ماں بھی بڑے کمال کی عورت تھی۔ اُس نے جواب دیا: "میں تمھیں نہیں نہلاتی۔ تمھارے مُنھ میں دانت ہیں اور تم ابھی سے جب بات چیت کرسکتے ہو تو کیا اپنے آپ نہیں نہا سکتے؟" یہ سُن کر سُمبا کو جوش آگیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چل کر وہ دریا کے کنارے گیا۔ اپنے جسم کو صاف کیا اور جی بھر کے نہایا۔

سُمبا کی عمر تین دن کی ہوئی تو وہ ہماری تمھاری طرح کافی بڑا اور ہوشیار ہو چکا تھا۔ سات دن کے بعد باقاعدہ جوان ہو گیا اور اب وہ شکار کھیلنے کے لیے جنگل میں جا سکتا تھا۔ آخر اُس نے اپنے باپ سے کہا: "میرے لیے تیر کمان بنا دیجیے لیکن کمان بہت مضبوط ہونی چاہیے۔"

تنگاری خود زبردست شکاری لیکن حقیقتاً دل ہی دل میں وہ اپنے لڑکے سے کچھ سہما سہما سا تھا۔ اس کا لڑکا سُمبا جد اصل گاؤں کے آزمودہ اور بہادر شکاریوں سے بھی زیادہ مضبوط اور بہادر تھا۔

بہرحال تنگاری نے بکرے کی کھال کی کمان بنائی۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے نشانہ ٹھیک بیٹھے گا اور تیر کوسوں دُور جائے گا لیکن جب سُمبا نے تیر چلانے کے لیے کمان کو کھینچا تو اس کا پھندا ٹوٹ گیا۔ وہ جھٹ بولا: "کمان کا پھندا مضبوط ہونا چاہیے۔"

اس کے باپ نے افریقہ کے ہرن کی کھال کا پھندا بنایا۔ سُمبا نے اسے بھی آزمایا اور جیسے ہی اس نے تیر لگا کر اُسے کھینچا یہ بھی تڑ سے ٹوٹ گیا۔ اس کے باپ نے کہا: "اچھی بات ہے میں اب تمھارے لیے ہاتھی کی کھال سے رسی بٹ کر پھندا بناؤں گا۔" لیکن اتنی مضبوط رسّی کو بھی نوجوان شکاری خاطر میں نہ لاتا تھا۔

لڑکے نے باپ سے کہا: "تنگاری! شیر کی ٹانگ کا چمڑہ سب سے مضبوط ہوتا ہے۔ میری کمان کی رسّی اس سے بناؤ اور پھر ایسی لاجواب کمان کے کر تم مجھ سے جو فرمائش کروگے میں وہی شکار مار کر لاؤں گا۔"

تنگاری نے اپنے تیز بلم سے ایک زبردست شیر کو مارا۔ اس کی ٹانگ کی کھال اس نے نکالی اور کمان کی رسّی اس سے بنائی جو واقعی مضبوط تھی۔ اور جب سمبا نے اس سے تیر چلایا تو تیر اس طرح بھاگا گویا کہ ایک بجلی کوند گئی ہو۔

سُمبا خوش ہو گیا اور اُس نے اپنے باپ سے کہا: "اب میں شکار کھیلنے کے لیے جاتا ہوں۔ بولو تم کو کون سا شکار چاہیے؟"

اس کے باپ نے کہا: "میرے لیے تم بُوم بُومی کی دُم لا دو اس لیے کہ اس کی دُم میں جادو ہوتا ہے۔"

پُرانے زمانے میں افریقہ میں جتنے جنگلی جانور پائے جاتے تھے ان میں بُوم بُومی سب سے نرالا تھا۔ یہ اتنا مضبوط اتنا بڑا تھا کہ ایک ساتھ دو ہاتھیوں کو اٹھا کر اپنی پیٹھ پر لے جا سکتا تھا۔

لیکن اس کا نام بُوم بُومی کیوں تھا۔ دراصل اس کے کُھر بڑے بڑے تھے اور خوب بھاری تھے۔ جب یہ چلتا تھا تو زمین بھم بھم" بولتی تھی جیسے کہیں سے ڈھولک کی آواز آ رہی ہو۔ اس آواز سے سارا جنگل گونج اٹھتا تھا اور اس طرح دوسرے جانور سمجھ جاتے تھے کہ بُوم بُومی آ رہا ہے۔

بُوم بُومی کی دُم بھی نرالی تھی۔ شیر کی دُم سے یہ دس گنا لمبی تھی۔ سفید بالوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ گویا آسمان پر سفید

بادل چھائے ہوں۔ اس میں چمک بھی بہت تھی۔ اس کی روشنی سے ماحول جگمگا اٹھتا۔ سورج کی روشنی بھی ماند پڑ جاتی۔

اس لیے تنگاری نے آگاہ کرتے ہوئے کہا "میرے بیٹے سمبا! ذرا سنبھل کر جانا۔ بُوم بُومی کی دُم سے بچے رہنا۔ اگر تم نے قریب جانے کی کوشش کی تو جادو کی طرح اس کے بال لپک کر تمھاری طرف آئیں گے، پھر تم کو لپیٹ لیں گے اور تم کو جکڑ لیں گے۔ یہ سمجھ لو کہ ایک ہاتھی بھی اس کی گرفت سے اپنے کو چھڑا نہیں سکتا۔"

سمبا کی ماں نے بھی نصیحت کرتے ہوئے کہا "بیٹا ہوشیار رہنا اور یاد رکھو کہ اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو فوراً میٹھے سُر میں کوئی گانا شروع کر دینا۔ ان جنگلی جانوروں میں ایک اچھی بات یہی ہے کہ انھیں میٹھے گیت بہت پسند ہیں۔" اور اس میں شک نہیں کہ ان دنوں جنگلی جانور جونہی ڈھولک کی آواز سنتے اور گاؤں سے گانے بجانے اور ناچنے کی آواز آتی وہ کھنچ کر آجاتے اور کبھی کبھی تو وہ خود ناچنے گانے میں شریک ہو جاتے۔ شیر گانے کی آواز سن کر گرجتا، بندر چڑ چڑاتے، لکڑ بگھے چیختے، ہاتھی سونڈ اٹھا کر چنگھاڑتے۔ اس لیے سمبا نے سوچا کہ بُوم بُومی کو گانا پسند ہے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

اس کے بعد خدا کا نام لے کر سمبا سیدھا مشرق کی طرف چل پڑا۔ بڑے عجیب عجیب جنگلی جانور اسی طرف ملتے تھے۔ یہاں تک کہ ہر شخص یہی کہتا تھا کہ بُوم بُومی کا گھر بھی اُدھر ہی ہے۔

میلوں جنگل ہی جنگل تھا۔ پھر اُسے کھُر کے نشان نظر آئے۔ وہ دن رات ان کا پیچھا کرتا رہا۔ آخر کار بُوم بُومی کے گھر کے قریب پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے گھر میں محض بُوم بُومی کی ماں موجود تھی۔ سمبا کو دیکھتے ہی وہ بولی "میرے لڑکے سب شکار پر گئے ہوئے ہیں۔ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ کیا تم جانتے نہیں کہ بُوم بُومی آدمیوں کو کھا جاتے ہیں؟" ماں کا چہرہ بھی بڑا خوفناک تھا۔ سمبا کو بھی ڈر لگنے لگا۔ اسی وقت اس کو اپنی ماں کی نصیحت یاد آئی۔ اس نے اطمینان سے میٹھے میٹھے سروں میں ایک گانا گانا شروع کر دیا۔

"ماں لو ماں   مجھے ناکام نہیں لوٹنا ہے
بُوم بُومی کی ایک دُم   تنگاری کے پاس لے جانا ہے۔"

یہ گانا سن کر بُوم بُومی کی ماں خوش ہوئی۔ اس نے کہا "مجھ کو اور گانے سناؤ اور پھر تم جو چاہو گے میں تمھیں دوں گی۔ اگر تم دُم چاہتے ہو تو وہ بھی میں تم کو دے دوں گی۔"

لیکن سمبا جب گانے میں مصروف تھا کہ اتنے میں بھم بھم کی آواز آئی۔ بُوم بُومی کی ماں نے چیخ کر کہا "تم جا کر گوشت کے کمرے میں چھپ جاؤ۔ چپ رہنا۔ ہلکی سے ہلکی آواز بھی نہ نکالنا۔ اگر پتہ چل گیا تو میرے لڑکے تم کو کھا جائیں گے۔"

اتفاق کی بات سب بُوم بُومی تھکے ہوئے تھے۔ وہ دو ہاتھیوں کو شکار کر کے کھا گئے تھے اس لیے ان کو بھوک نہیں تھی آتے ہی وہ ایک طرف پڑ کر سو گئے۔ آدھی رات میں بُوم بُومی کی ماں نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے کی چمکیلی دُم کاٹ لی اور اُسے سمبا کو دے دیا پھر اس نے سمبا سے کہا کہ وہ دُم لے کر فوراً بھاگ کھڑا ہو۔ صبح تڑکے حسبِ معمول بُوم بُومی اُٹھ گئے۔ ہر ایک کو پہلے اپنی دُم یاد آئی۔ سورج کی پہلی کرن پھوٹتے ہی ہر ایک نے یہ گانا گایا:

"سورج نکل رہا ہے ÷ آؤ اسے دیکھیں
ہاتھی پکڑنے والی ÷ دُم کو سنبھالیں"

اس کے بعد اپنی لمبی چمکیلی سفید شفاف دُم کو گھسیٹ کر ہر ایک

بوم بومی سامنے لاتا تاکہ اس کو اطمینان ہو جائے کہ اس کی دم محفوظ ہے۔ اس کے بعد وہ یہ گیت گاتا:

گھسیٹ گھساٹھ : مجھے کوئی چنتا نہیں ہے

میری پیاری ماں : میری دم محفوظ ہے

ہوتے ہوتے سب سے چھوٹے بوم بومی کی باری آئی۔ شروع میں اس نے ٹھیک گایا مثلاً:

سورج نکل رہا ہے : آؤ اسے دیکھیں

ہاتھی پکڑنے والی : دُم کو سنبھالیں

لیکن اس کے بعد جب اس نے اپنی قیمتی دم کو گھسیٹنا چاہا تو وہ چیخ پڑا:

"گھسیٹ گھساٹھ : کدھر ہے کدھر!

میری پیاری ماں : میری دُم ہے کدھر؟"

پھر اس نے کہا "مانس ہے مانس۔ کہیں مانس چھپا ہے۔" اسے غصہ آیا۔ بہت غصہ۔ دو دن سے پہلے یہ دُم نہیں اُگے گی یہ سوچ کر اُسے اور غصہ آیا۔

سب جانوروں نے سونگھتے ہوئے کہا "ہمیں بھی مانس کی مہک آرہی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی مانس تمھاری دُم کاٹ کر لے بھاگا ہو۔" یہ سنتے ہی سب بوم بومی بھاگے اور چور کو پکڑنے کے لیے نکل پڑے۔ نتھنوں سے زمین کو سونگھتے ہوئے وہ دوڑے۔ ان کے چلنے سے زمین دہل پڑی گویا کہ کوئی طوفان آرہا ہو۔

سُمبا کو بھی ان کی آواز سُنائی دی۔ دھم دھم! بوم بوم! کھُروں کی آواز سن کر سمبا سمجھ گیا کہ بوم بومی اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اس نے جھٹ سے ایک تیر اُن کی طرف چلایا۔ شیر کی ٹانگ کی کھال سے بنے پھندے سے نکل کر بھی تیر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بوم بومی کی کھال بہت موٹی تھی۔ تیر بالکل اندر نہیں گھُسا۔

سُمبا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ لیکن عین وقت پر اس کو ماں کی نصیحت یاد آگئی کہ بوم بومی گانے کے عاشق ہوتے ہیں۔ اس لیے جیسے ہی وہ قریب آئے اس نے زور زور سے گانا شروع کر دیا۔

"اے باپ، اے باپ : وہ میرے پیچھے پڑے ہیں

یہ بوم بومی سارے بھائی : دُم لینے آئے ہیں

اگر میرے باپ : اس جانور کی دُم

تم نے ہرگز : نہ مانگی ہوتی

جنگلی بھینسے کی دُم : نہیں! نہیں! نہیں!

چیتے کی دُم : نہیں! نہیں! نہیں!

ہاتھی کی دُم : نہیں! نہیں! نہیں!

تمھیں چاہیے یہ دُم : تو لو بوم بومی کی دُم"

بوم بومی محو حیرت بنے کھڑے رہ گئے۔ سمبا کے میٹھے سُر سُن کر وہ جھوم اُٹھے۔ وہ ایک دوسرے سے بولے "چلو ماں کو لائیں۔ ماں کو بھی اس لڑکے کا گانا سننا چاہیے۔" پھر وہ اپنی ماں کو لانے کے لیے پلٹے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو سمبا نے بھاگنا شروع کر دیا۔ بھاگتے بھاگتے اسے اپنے گاؤں کے جھونپڑے نظر پڑے۔ اتنے میں بوم بومی لوٹ کر آگئے۔ انھیں دیکھتے ہی سمبا نے پھر اپنا گانا شروع کیا

"اے باپ اے باپ : وہ میرے پیچھے پڑے ہیں

یہ بوم بومی سارے بھائی : دُم لینے آئے ہیں"

گانا سنتے ہی سب محو حیرت رہ گئے۔ سب نے کہا

"یہ لڑکا واقعی گانا اچھا گاتا ہے۔ افسوس کہ ہم

نہیں لاسکے ورنہ وہ بھی گانا سن کر خوش ہو جاتی"۔

ایک بار پھر وہ جنگل سے ہو کر دوڑے اور پھر منٹوں میں واپس آ گئے۔ اب کی بار وہ ماں کو ڈھونڈ کر لائے لیکن اتنی دیر میں سمبا اپنی جھونپڑی میں داخل ہو چکا تھا۔ بوم بومی ہاتھ مل کر رہ گئے۔ انھیں اس کا افسوس نہیں تھا کہ وہ ان کے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا بلکہ افسوس اس کا تھا کہ ان کی ماں اس کا گانا نہیں سن سکی۔ وہ چاہتے تو گاؤں میں بھی جا سکتے تھے لیکن آدمیوں کی بستیوں میں ان کو جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔

چھوٹے بوم بومی نے کہا "اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ نئی دُم نکلنے کا میں انتظار کروں"

بہادر لڑکے نے بوم بومی کی سفید چمکیلی دُم اپنے باپ کے قدموں میں ڈال دی۔ شکاری کا دل بلّیوں اچھلنے لگا۔ اب جادو منتر اس کا بڑھ جائے گا اور اپنے علاقے میں وہ سب سے زبردست شکاری بن جائے گا۔ بھاری سے بھاری شکار۔ یہاں تک کہ ہاتھی کو بھی پلک جھپکتے وہ پکڑ لے گا۔

خبر سنتے ہی جنگل کی بستی کی ساری جنتا شکاری کے گھر ٹوٹ پڑی۔ دُم دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ سب کو دُم میں جمع کرنے کا شوق ہو گیا۔ جس جانور کا شکار کرتے اس کی دُم لے آتے لیکن سمبا جیسی قسمت سب کی کہاں!

بادلوں میں کپڑے کا عیب نظر نہیں آتا

ایک بزرگ چادریں اور زنانے دوپٹے بیچا کرتے تھے۔ جس دن بادل ہوتے بازار نہ جاتے مال بھی نہ بیچتے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی۔ فرمایا۔ بادلوں میں (یا ابر کے دن) کپڑے کا عیب نظر نہیں آتا۔ اس لئے نہیں بیچتا۔

پاک کہانیاں
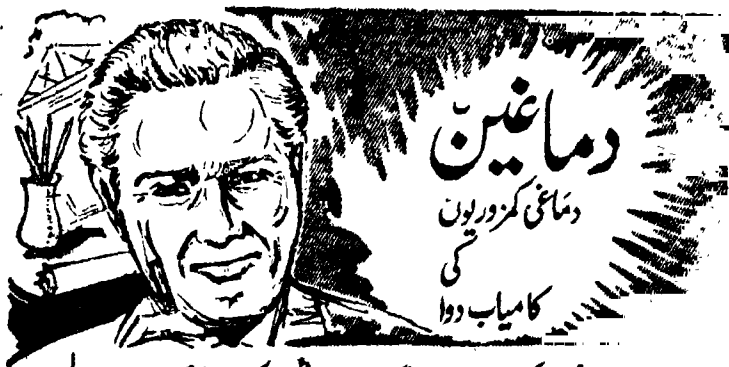
جناب سیف سہسرامی

گیت سُنادو

امی مجھے اچھا سا کوئی گیت سنادو
میں دیس کے کام آؤں مجھے ایسی دعا دو

سچائی کا نغمہ ہو محبت کا ترانہ
ارجن کی کہانی ہو تو ٹیپو کا فسانہ
جس گیت میں تعریف ہو سلطان ظفر کی
جس گیت سے توصیف نمایاں ہو کنور کی
جس گیت میں چشتیؒ کے پیاموں کی مہک ہو
اور گوتم و نانک کے ارادوں کی جھلک ہو
گاندھی کے عزائم کی ہو اک زندہ کہانی
آزاد و جواہر کی ہو تابندہ کہانی
ہر بول میں پاکیزگی گنگ و جمن ہو
ہر لفظ کے معنی سے بیاں حب وطن ہو
ہر شعر محبت کا، اخوت کا نشاں ہو
ناقوس کی آواز ہو پیغام اذاں ہو
جو گیت ہمالہ کی بلندی کا امیں ہو
پھولوں سے بھی نازک ہو ستاروں سے حسیں ہو

ایسا ہی کوئی گیت مجھے آج سنادو
میں دیس کے کام آؤں مجھے ایسی دعا دو

جناب شعیب اعظمی

غالب کی کہانی

خود ان کی زبانی

ہم میں سے زیادہ تر لوگ یہ جانتے ہیں کہ غالب اُردو زبان کے بہت بڑے شاعر تھے لیکن بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ انھوں نے بہت اچھی اُردو نثر لکھی ہے۔ یہ نثر کسی مضمون یا کتاب کی نہیں ہے بلکہ غالب کے ان خطوں کی ہے جو انھوں نے اپنے دوستوں، بزرگوں اور شاگردوں کو لکھے تھے۔ ان خطوں کی تعداد کئی سو کے قریب ہے اور یہ کتابی شکل میں کئی ناموں سے چھاپے جا چکے ہیں۔

خط کسی آدمی کی ذاتی زندگی کا حال احوال بتاتے ہیں۔ جو چیزیں لوگ اپنے مضمون یا کتاب میں نہیں لکھ سکتے یا عام لوگوں کو بتا نہیں سکتے وہ باتیں اپنے خطوں میں اپنے دوستوں رشتہ داروں اور بزرگوں یا ملنے جُلنے والوں کو لکھ دیتے ہیں۔ بہت دنوں تک ہمارے اُردو کے اچھے اچھے لکھنے والوں کے خط اس لیے نہیں چھاپے گئے کہ ان خطوں میں ان کی اپنی ذاتی اور نجی زندگی کا ذکر تھا۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ ان خطوں کو شایع کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ غالب نے جن لوگوں کو خط لکھے ان میں سے بہت سے بزرگوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ ان خطوں کو شایع کر دیا جائے تو جیسے ہم لوگ پڑھ کر مزہ حاصل کرتے ہیں ویسے ہی غالب سے عقیدت رکھنے والے دوسرے لوگ اور اردو ادب کے شیدائی ان سے فائدہ حاصل کریں گے۔ شروع شروع میں خود غالب اس بات کے لیے تیار نہ ہوئے مگر دوسروں کی فرمائش اور ضد پر وہ مان گئے اور بہت سارے خط ان کی زندگی ہی میں شایع ہو گئے۔

غالب کے خطوں کے کئی مجموعے آج چھپ گئے ہیں اور ہم انھیں پڑھ کر بے تکلف بول چال کا لطف حاصل کرتے ہیں بلکہ غالب کی زندگی کے بارے میں بہت سی اچھی اچھی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں مثلاً غالب کے باپ دادا کون تھے، خود ان کا کیا حال تھا، ان کے کون کون ملنے والے تھے، کیا کھاتے پیتے تھے، کیا پہنتے تھے، کیسے مکان میں رہتے تھے، ان کی جوانی کیسی تھی، بڑھاپا کیسا رہا، اس زمانے کی دلّی کیسی تھی، موسم کیسے ہوتے تھے، لوگ کیسے تھے اور غدر کے زمانے میں دلّی پر کیا بیتی۔ غرض یہ تمام باتیں ان کے خطوں میں بڑی سادگی اور سلیقے سے بیان کی گئی ہیں اور جگہ جگہ ان کی ہنسنے ہنسانے والی باتوں نے بڑی دلچسپی پیدا کر دی ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ہماری اُردو کا اتنا بڑا شاعر کتنا مجبور، ہمدرد اور زندہ دل انسان تھا۔ آیئے آج ہم ان کے خطوں کی زبانی ان کی زندگی کے

کے حالات جاننے کی کوشش کریں گے۔

غالب اپنے آپ کو ترک سلجوقی سمجھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں

"میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔ صرف پچاس گھوڑے نقارہ و نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ بعد انتقال باپ میرا عبداللہ بیگ نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا چند روز بعد جاکر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ کئی برس وہاں رہا۔ خانہ جنگی کے بکھیڑے میں وہ نوکری جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصراللہ بیگ خاں میرا حقیقی چچا اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزی سرکار میں سو سوار کا بریگیڈ ہوا۔ سال بھر بعد بمرگ ناگاہ مر گیا۔ ملک کے بدلے نقدی مقرر ہوئی وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا، آٹھ برس کا تھا تو چچا مر گیا۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ سات پارچے سرپیچ و مالائے مروارید۔ یہ تین رقم خلعت ملا۔ دہلی میں دربار ہوا۔ مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بہادر شاہ کے درباری ہونے کے جرم میں دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔"

غالب آگرے میں پیدا ہوئے اور شروع جوانی میں دہلی آگئے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ انگریزی سرکار سے ان کو کچھ وظیفہ ملتا تھا۔ اسی وجہ سے دہلی میں ان کا رہنا سہنا کرائے کے مکان میں ہوتا تھا۔ زندگی بھر کرائے کے مکانوں میں رہے وہ مکان بھی دہلی کی برسات میں ان کے رہنے کے قابل نہ رہتے تھے۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں:

"میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں، پاخانہ ڈھے گیا، چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمھاری پھوپھی (غالب کی بیوی) کہتی ہیں ہائے دبی، ہائے مری۔ دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ چھت چھلنی ہے ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے مالک اگر چاہے تو مرمت کرے تو کیوں کر کرے مینھ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھکو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوادو۔ برسات گزر جائے گی فرصت ہو جائے گی پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ (غالب، ان کی بیگم اور عارف کے دونوں لڑکے) اپنے قدیم مسکن میں آرہیں گے۔"

غالب کے مکان کی یہ تباہی برسات کی وجہ سے تھی۔ ان کے زمانے کی برسات بڑی تیز ہوتی تھی اور اس کا نقشہ غالب نے اپنی نثر میں بڑی اچھی طرح پیش کیا ہے ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

"برسات کا حال نہ پوچھو خدا کا قہر ہے!

قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے میں جس مکان
میں رہتا ہوں، عالم بیگ خاں کے کٹرے کی طرف کا
دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے
جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے
بیٹھنے کا حجرہ ٹپک رہا ہے، چھتیں چھلنی ہو گئیں۔ مینہ
گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ فرش پر
کہیں لگن رکھا ہوا ہے، کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ خط
لکھوں تو کہاں بیٹھ کر۔"

اسی طرح ایک اور خط میں اس برسات کا ذکر کرتے
ہیں جس نے سارے شہر میں ہلچل مچا دی ہے اور پانی کی زیادتی نے
شہری زندگی کو درہم برہم کر دیا ہے۔ غالب نے دوسری پریشانیوں
کے ساتھ اس کو ملا کر واقعہ کو اور ڈراؤنا بنا دیا ہے۔

"برسات کا نام آگیا سو مجملاً سنو، ایک غدر کالوں
کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا،
ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی، اب یہ
برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن
ہے، آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی
چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی
دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری
راتوں میں چوروں کی بن آئی۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار
جگہ کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا
ہزار ہا مکان گر گئے، سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر
مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ
اَن کال تھا کہ مینہ نہ برسا، یہ پَن کال ہے، پانی ایسا
برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے، جنھوں نے
ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔ سن لیا دلی
کا حال۔ اس کے سوا کوئی نئی بات نہیں۔"

غالب کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی اور انھوں نے اپنے
بھانجے زین العابدین خاں عارف کے بچوں کو پال لیا تھا۔ ان
کا نام باقر علی خاں اور حسین علی خاں تھا۔ دونوں بچوں کو بہت
عزیز رکھتے تھے چاہے دہلی میں ہوں یا باہر رامپور میں ہوں
یا مرادآباد میں۔ ہمیشہ ان کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ یہ بچے بھی
ان کو اپنا سگا دادا سمجھتے تھے اور ان سے بہت ہل گئے تھے
خاص طور سے چھوٹے صاحب تو اپنے دادا کے بستر پر
ننگے پیر چلے آتے تھے اور ان سے کہتے "مجھے کھلونے منگا دو
میں بجار جاؤں گا" غالب نے ان بچوں کا ذکر بھی ان خطوں میں
بار ہا کیا ہے۔ ایک بار رامپور کا سفر کیا تو سفر کا تفصیلی حال بیان
کرتے ہوئے ان لڑکوں کا بھی حال یوں لکھا:

"ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب
کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے
رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی، ہاپوڑ کو روانہ
ہوا۔ دونوں برخوردار (باقر علی خاں، حسین علی خاں)
گھوڑوں پر سوار چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے ہاپوڑ
کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے
اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے
قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا اور شامی کباب
اس میں ڈال دیے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی
خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو
کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا ترکاری نہ
ڈلوائی۔ بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے

آپس کی صلح و مشورت سے کام کرتے ہیں اتنی
بات ہے کہ حسین علی منزل پر اتر کر پاپڑ اور مٹھائی
کے کھلونے خرید لاتا ہے، دونوں بھائی مل کر
کھا لیتے ہیں۔ چار پانچ بجے کے عمل میں ہاپوڑ
سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے
میں آ پہنچا۔ چارپائی بچھائی، بچھونا بچھا کر حقہ پی
رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔"

رامپور میں وہ ریاست رامپور کے سرکاری مہمان ہوتے
تھے اور بالکل گھریلو زندگی گزارتے تھے۔ وہاں بھی بچے اپنی
فرمائشوں اور شوق کی چیزوں سے دل بہلایا کرتے تھے۔ دیکھیے
غالب لکھتے ہیں:

"لڑکے دونوں اچھی طرح سے ہیں۔ کبھی میرا دل
بہلاتے ہیں، کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر،
بٹیریں، تکل، کنکوا سب سامان درست ہے۔
فروری مہینے کے دو دو روپے لے کر دس دن
میں اٹھا ڈالے پھر پرسوں چھوٹے صاحب
(حسین علی خاں) آئے کہ دادا جان کچھ ہم کو قرضِ حسنہ
دو، دیا گیا۔ آج ۱۴ ہے مہینہ دور ہے۔ دیکھیے
کتنے بار قرض لیں گے۔"

رامپور میں اگرچہ غالب کو ہر طرح کا آرام تھا مگر ان
کے عزیز اور دوست پریشان تھے کہ وہ کھاتے پیتے کیا ہوں
گے۔ ان کو لکھتے ہیں:

"تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے
تشویش ہے۔ خدا کی قسم میں یہاں خوش اور تندرست
ہوں۔ دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن
چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔
شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن
پلاؤ، متنجن، پسندے۔ دونوں وقت روٹی خمیریاں،
چپاتیاں، مربے، اچار، میں بھی خوش لڑکے بھی خوش۔"

اس زمانے کے دستور کے مطابق غالب کے ساتھ
بھی بہت سے لوگ لگے رہتے تھے اور ان کے گھر پڑے رہتے
تھے اور غالب کو ان کا خرچ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ایک خط میں
وہ اپنی مجبوریاں بیان کرتے ہیں۔

"حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اس کی بیٹی
اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج
جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں
ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی میرا
بھی کوئی چچا ہے۔ اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں
ایک بیوی دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلو،
کلیان، ایاز یہ، باہر داری کے جورو بچے بدستور۔
میاں گھمن مہینہ بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا
بھئی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں، بیس آدمی
روٹی کھانے والے موجود۔"

ان کی آمدنی واقعی بہت محدود تھی سارا حال ایک صاحب کے
خط میں لکھتے ہیں:

"اگر میں دنیادار ہوتا تو اس کو نوکری کہتا مگر چونکہ فقیر
تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں۔
ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار سرکار انگریزی سے پاتا ہوں،
سو روپے ماہوار رامپور سے، چوبیس روپیہ سال ان
مہاراج سے یعنی ۱۴۳ روپیہ آٹھ آنہ ماہانہ۔"

جناب کیف احمد صدیقی

گاندھی جی

وقارِ مادرِ ہندوستان تھے گاندھی جی

ہر ایک فرد کے ہمدرد غم گسارِ وطن
صداقتوں کے پرستار جھوٹ کے دشمن
نظامِ امن کے روحِ رواں تھے گاندھی جی
وقارِ مادرِ ہندوستاں تھے گاندھی جی

وہ ایکتا کے پجاری ہر ایک کے بھائی
وہ فخرِ قوم وہ انسانیت کے شیدائی
زمیں پہ رہ کے بھی اک آسماں تھے گاندھی جی
وقارِ مادرِ ہندوستاں تھے گاندھی جی

کلی کلی کو تبسم کا ایک ڈھنگ دیا
ہر ایک پھول کو اپنے لہو کا رنگ دیا
بہارِ گلشنِ امن و اماں تھے گاندھی جی
وقارِ مادرِ ہندوستاں تھے گاندھی جی

ہر ایک دل میں جلایا چراغ آزادی
ہے جن کے خون سے شاداب باغِ آزادی
ہمارے ملک کے وہ باغباں تھے گاندھی جی
وقارِ مادرِ ہندوستان تھے گاندھی جی

سنی نہ بات تشدد بھرے اصولوں کی
مہک لٹائی اہنسا کے نرم پھولوں کی
خلوص و عجز کے اک گلستاں تھے گاندھی جی
وقارِ مادرِ ہندوستاں تھے گاندھی جی

جناب مرزا شکور بیگ

(۳)

بڑی منت سماجت کے بعد چچا ابّا اپنے کمرے میں چلے گئے اس وقت سب کی جان میں جان آئی چچی امّاں کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ بے چاری کریم بی کے کولھے میں ایسی چوٹ آئی کہ وہ اب تک وہیں کی وہیں پڑی تھی۔ اتنے میں ممتاز نے پریشان ہو کر کہا "امّی دیکھیے، بڑی آپا کو کیا ہو گیا ہے؟"

نزدیک جا کر جو دیکھا تو بے ہوش ہیں۔ چچی نے چیخ ماری "ہائے میری بچی"! میں فوراً پانی لے کر پہنچا۔ منھ پر پانی چھڑکا۔ امّی آنچل سے ہوا دینے لگیں۔ اس وقت کوئی چچی کی حالت دیکھتا۔ ماہی بے آب تھیں۔ بچے الگ سہمے کھڑے تھے۔ گنو کے ذریعے چچا ابّا کو اس کی اطلاع دی گئی مگر انھوں نے کوئی جواب دیا نہ اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ کچھ دیر بعد بڑی آپا نے آنکھیں کھول دیں اور کہا "امّاں جان، امّاں جان"

امی نے کہا "بی بی، تم فکر نہ کرو، آپا بالکل اچھی ہیں۔ دیکھو یہ کیا بیٹھی ہیں"

چچی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ انھوں نے محبت سے بڑی آپا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹی پانی پیوگی، پانی؟"

بڑی آپا نے مسکرا کر کہا "میرا تو روزہ ہے نا؟"

ساڑھے چار بجے کے قریب چچا ابّا اپنے کمرے سے برآمد ہوئے مگر غصّے سے منھ پھولا ہوا تھا۔ چچی امّاں اوڑھے لپیٹے پڑی تھیں مگر امّی کچھ سی رہی تھیں۔ سلطانہ نے جونہی چچا ابّا کو دیکھا "امّاں بڈھا آیا" کہتے ہوئے بھاگی اور امّی کے پیچھے چھپ گئی۔ اس کی دیکھا دیکھی محمود بھی چھپنے دوڑا مجھے ہنسی آ گئی مگر امّی نے گھور کر ہم سب کو ڈرا دیا۔ خیر گزری کہ چچا ابّا نے سلطانہ کا وہ جملہ نہیں سنا اور سیدھے منھ دھونے کی چوکی کی طرف چلے گئے۔ منھ ہاتھ دھو کر وضو کیا اور پھر کپڑے بدل کر باہر چل دیے۔

افطار میں کوئی آدھ گھنٹے کی دیر تھی۔ ہم سب صحن میں تختوں پر بیٹھے تھے اور سب کے سب تھوڑی دیر کے لیے دوپہر کے واقعے کو بھولے ہوئے تھے کیوں کہ اس وقت بچے عجیب تماشا کر رہے تھے۔ سلطانہ چچا ابّا بنی تھی۔ محمود کو اس نے چچی امّی بنایا تھا اور خود ایک چھوٹی سی لکڑی لیے محمود کو مارنے جا رہی تھی۔ اسے سمجھانے منانے کا فریضہ ممتاز کے ذمّے تھا۔ رضیہ کو کریم بی کا پارٹ کرنے کی ہدایت تھی۔ اس پر ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے اور سب کے سب ہنسی میں ایسے مصروف

تھے کہ چچا ابا کے آنے کی کسی کو خبر نہ ہوئی۔ یا تو بچے ابھی
ہنس بول رہے تھے یا ابھی دیکھا کہ چاروں کے چاروں
دم بخود کھڑے ہو گئے۔ مڑ کر جو دیکھا تو چچا ابا قہر آلود نگاہوں
سے انہیں گھور رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی گھڑوں پانی پڑ گیا۔
کچھ دیر چچا ابا گھورتے ہوئے وہیں ٹھہرے رہے اور پھر
"بچوں کو خوب تعلیم دی جا رہی ہے" کہتے ہوئے اپنے کمرے
میں چلے گئے۔ ان کے اندر جاتے ہی یہاں کانا پھوسی
شروع ہوئی۔

چچی نے کہا "میں نہ کہتی تھی کہ ان کے آنے کا وقت
ہے اب ہنسی دل لگی بند کرو۔"

"ابا جب آئے تو معلوم ہوتا ہے دروازہ کھلا ہوا
تھا، ورنہ اس کے کھلنے کی آواز ضرور آتی" بڑی آپا نے کہا۔

"ٹھیک ہے" امی نے کہا "یہ موا گبو برف لانے
جو گیا تو دروازہ کھلا چھوڑ گیا۔ مگر ہم ایسا بھی کیا ہنس رہے
تھے کہ ان کے پاؤں کی آہٹ نہ سن سکے۔"

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ چچا ابا کرتے کی
آستین چڑھاتے ہوئے باہر آ گئے۔ آنکھیں غصے سے لال
تھیں کسی کی ہمت نہ تھی کہ نظر بھر کر دیکھ لے۔ اپنے تخت
پر گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھے اور پھر آواز دی "کریم بی!"

"جی سرکار" کریم بی نے باورچی خانے ہی سے
جواب دیا۔

"گبو کہاں گیا ہے؟"

"سرکار وہ برف لانے گیا ہے۔"

"تو تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس مردود سے
حقہ تازہ کرنے کو کہتیں۔ اگر وہ چلا گیا تھا تو کیا کوئی اور
یہ کام نہ کر سکتا تھا؟" یہ کہہ کر چچا ابا جوش میں خود اٹھے
اپنے ہاتھ سے حقہ تازہ کیا اور چلم پر آگ رکھنے باورچی خانہ
میں پہنچے۔ وہاں بڑی آپا تشتریوں میں افطاری لگا رہی
تھیں چچا ابا کو آتا دیکھ کر بڑی آپا سرک گئیں۔ کریم بی
الگ کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ بچاریوں نے جلدی جلدی
چولھے تک جانے کا راستہ صاف کر دیا۔ پھر بھی تشتریاں
اور پیالے پھیلے ہوئے تھے۔ چچا ابا جلدی جلدی جو ادھر
سے گزرے تو ایک جگ کو ان کا پاؤں لگا۔ وہ لڑھکا اور
تمام لیموں کا شربت بہہ گیا۔ بچوں کو اپنی نقل کرتا دیکھ کر
غصے کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ گبو کے بغیر حقہ تازہ کیے جانے
سے وہ آگ اور بھڑکی۔ اب جگ سے ٹھوکر لگی تو غصہ
اتارنے کا بہانہ بھی ہاتھ آ گیا۔ طیش میں اور کچھ تو نہ سوجھا لگے
چینی کے برتنوں کو انگنائی میں پھینکنے۔ کئی پیالے شہید ہوئے
بہت سی تشتریوں کا خون ہوا۔ سب کی آنکھوں کے سامنے
خوبصورت خوبصورت برتن چھنا چھن چھنا چھن ٹوٹ رہے
تھے۔ کریم بی اور بڑی آپا تو وہیں کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی
تھیں مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ چچا ابا کو روکتا۔ انگنائی میں
تمام افطاری کا فرش ہو گیا۔ برتنوں کے ٹکڑے جا بجا بکھرے
پڑے تھے۔ جب وہاں کے سب برتن ختم ہو گئے تو چچا ابا
کا ہاتھ رکا۔ انھوں نے اپنی چلم پر آگ رکھی اور وہاں سے
لوٹے۔ ابھی اپنے تخت کے پاس بھی نہ پہنچے تھے کہ دھائیں سے
توپ چل گئی۔ توپ کی آواز سنتے ہی چچا ابا کے ہاتھ سے چلم
گر گئی۔ سبھوں نے تو پانی سے روزہ کھول لیا مگر چچا ابا نے
وہیں سے جھک کر ایک کھجور اٹھا لی اور اسے اپنی انگلیوں
سے پونچھ کر منہ میں ڈال لیا۔

مغرب کی نماز ہو گئی۔ دستر خوان بچھ گیا کھانا چن دیا
گیا مگر چچا ابا اپنے کمرے سے نہ نکلے۔ گبو نے جا کر اطلاع دی
کہ خاصہ تیار ہے تو اس سے کہا کہ ذرا بڑی بی بی کو بھیج دے
بڑی آپا ڈرتے ڈرتے وہاں پہنچیں تو چچا ابا نے پوچھا "تمھاری
امی بھی تو کھائیں گی نا ؟"

"جی مجھے نہیں معلوم مگر وہ فرما رہی تھیں کہ طبیعت
صاف نہیں ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے انھیں سمجھایا نہیں۔"

"میں نے بہتیرا کہا مگر وہ یہی کہتی رہیں کہ بھوک
نہیں ہے۔"

"تو پھر اپنی امی سے کہہ دو کہ ہمیں بھی بھوک نہیں
ہے۔ وہ نہیں کھائیں گی تو ہم بھی نہیں کھائیں گے۔"

بڑی مشکل سے چچی اماں کھانے پر راضی ہوئیں۔
یہ سن کر چچا ابا بھی مسکراتے ہوئے کمرے سے چلے آئے
اور کھاتے کھاتے بچوں سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتے گئے۔
کھانے سے فارغ ہو کر دالان میں چلے آئے۔ گبو کے
ذریعہ گراموفون منگوایا۔ پھر کچھ خیال آتے ہی خود اٹھے
اور بسکٹوں کی پاکٹ لے آئے اور پھر بچوں سے مذاق
کرنے لگے۔ اس وقت انھیں کوئی دیکھتا تو اسے دن
بھر کی باتوں کا یقین نہ آتا۔ حد ہو گئی کہ چچا ابا نے خود
سلطانہ سے کہا: بٹیا ذرا بتانا تو ہم کیسے تلوار لے کر آئے تھے۔
اس کے بعد انعاموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کریم بی کو ۲ روپے
دیے۔ گبو سب سے زیادہ پٹا تھا مگر اسے انعام سب سے
کم ملا۔ پھر بھی وہ آٹھ آنے پا کر بہت خوش تھا۔ اسے انعام دے
کر کہا: صبح جو فقیر آیا تھا اس کا خیال رکھنا کہیں ملے تو ہمارے
پاس لے آنا۔ کہنا کہ شاہ صاحب سرکار انعام دینے بلاتے ہیں۔
مجھے اور بڑی آپا کو پانچ پانچ روپے دیے۔ دوسرے بچوں
کو مٹھائی کھانے کے لیے ایک ایک روپیہ دیا۔ پھر چچا ابا
بولے: "بھئی ہماری وجہ سے آج کسی کو رنج ہوا ہو تو معاف
کر دے ہم نے جس جس کو رلایا تھا اسے انعام بھی دے دیا۔"

"آپ نے چچی اماں کو کچھ بھی نہیں دیا۔" سلطانہ نے کہا۔

"بیشک، بیشک، ہم نے دیا تو کچھ نہیں مگر ان سے
معافی مانگ لی ہے۔ مگر ابھی ان کا دل پوری طرح صاف
نہیں ہوا ہے۔ شاید یہ وجہ ہے کہ ہم نے انھیں کچھ انعام
نہیں دیا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہم اگر دیں تو وہ لیں گی نہیں۔"

محمود نے کہا "نہیں چچا ابا وہ ضرور لیں گی۔"

"اچھا تم ان سے پوچھو۔"

محمود چچی اماں کے پاس جا کر ان سے لپٹ گیا۔ ادھر
سلطانہ نے چچا ابا سے کہا "اب باجا بجائیے نا!"

چچا ابا نے گراموفون کو کنجی دیتے ہوئے کہا: "ہم باجا
اس وقت تک نہیں بجائیں گے جب تک تمھاری چچی ہم سے
بات نہ کریں گی۔"

یہ سن کر سلطانہ بھی چچی اماں کے پاس پہنچ گئی
کہ ذرا بات کر لیجیے۔ مگر جب بچوں نے انھیں تنگ کرنا شروع
کر دیا تو چچی نے بگڑ کر کہا: "اب تم لوگوں کی شامت آئی
ہے۔ میں ٹھوک دوں گی۔"

یہ سنتے ہی چچا ابا نے کہا "اب تم لوگ ادھر آ جاؤ
وہ ہم سے بات نہیں کریں گی۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ ہم سے
کیوں خفا ہیں۔ خیر ان کی خاطر ہم کل ایک روزہ اور
رکھ لیں گے۔"

باقی صفحہ ۲۵ پر

جناب ابوسلم

ننھا ستارہ

دیکھو ہے آشکارا[۱] ننھا سا اک ستارا
بے تاب جیسے پارا یا رقص[۲] میں شرارا
منظر ہے کتنا پیارا

(۲)

جونہی اندھیرا چھایا اس نے دیا جلایا
آنکھوں میں نور آیا راہی[۳] نے رستہ پایا
جگمگ جہاں ہے سارا

(۳)

اللہ ری خوشنمائی کیا پیاری شکل پائی
یہ نور، یہ صفائی جگنو کا ہے یہ بھائی
فطرت نے ہے سنوارا

(۴)

کیا صاف روشنی ہے بلور سی بنی ہے
اک عام دلکشی ہے ہر اک نظر جمی ہے
ہر آنکھ کا ہے تارا

(۵)

ہوتی ہیں اس سے باتیں کٹتی ہیں خوب راتیں
روشن ہیں اپنی آنکھیں پیدا ہیں دل میں راہیں
دوری نہیں گوارا

(۶)

اپنے یہاں بلائیں آنکھوں میں بھی بٹھائیں
کب اس کو راس آئیں پستی کی یہ فضائیں
ہے آسماں کا تارا

---

۱ ظاہر ۲ ناچ ۳ راستہ چلنے والا

(۷)
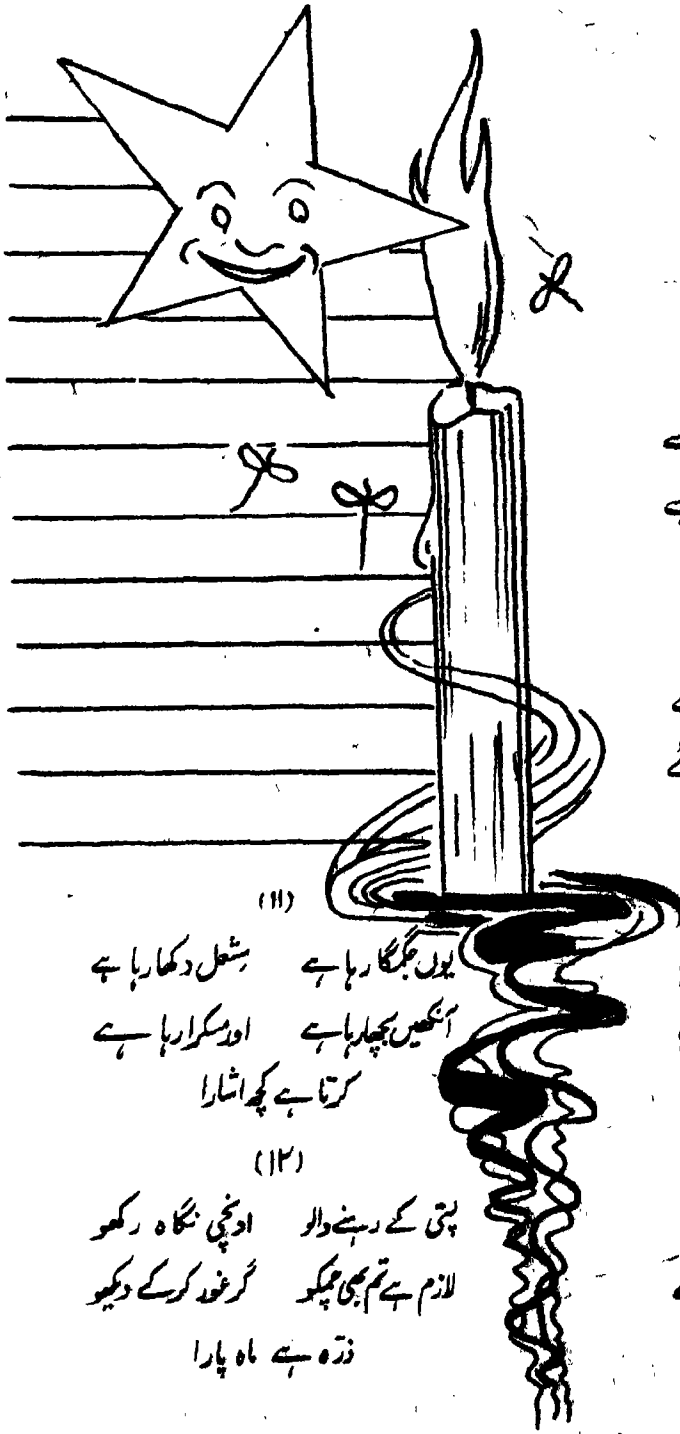
پھر اس کو پائیں کیسے　　دل کو منائیں کیسے
سیڑھی لگائیں کیسے　　پاس اس کے جائیں کیسے
قابو نہ کوئی یارا —

(۸)

لیکن نظر جمائے　　من کا دیا جلائے
بیٹھے ٹکٹکی لگائے　　کیوں دھن نہ کام آئے
پیدا ہوا سہارا

(۹)

قسمت نے گل کھلایا　　شوق اپنا رنگ لایا
کرنوں کا تار آیا　　اس نے ہمیں بلایا
[illegible] دن پھرا ہمارا

(۱۰)

تاروں کا سلسلہ ہے　　زینہ لگا ہوا ہے!
نظروں کا قافلہ ہے　　تیزی سے جا رہا ہے
بھرتا ہوا اڑارا

(۱۱)

یوں جگمگا رہا ہے　　مشعل دکھا رہا ہے
آنکھیں بچھا رہا ہے　　اور مسکرا رہا ہے
کرتا ہے کچھ اشارا

(۱۲)

پستی کے رہنے والو　　اونچی نگاہ رکھو
لازم ہے تم بھی چمکو　　گر غور کر کے دیکھو
ذرّہ ہے ماہ پارا

جناب فرحت قمر

نیا راستہ

(کھانے کی میز پر چمچوں کی آواز)

ماں: لو بیٹا تھوڑا سا حلوہ اور لو!

رمیش: نہیں ماں۔ اب طبیعت سیر ہو گئی۔ جی نہیں چاہتا۔

ماں: آج تم اُداس اُداس کیوں ہو رمیش؟

رمیش: (پھیکی ہنسی ہنس کر) نہیں تو ماں، ایسی تو کوئی بات نہیں!

ماں: بات کیسے نہیں۔ تم روز کتنا کام کرتے ہو۔ آدھی آدھی رات تک اپنی لیبوریٹری میں گھسے رہتے ہو۔ نہ کھیل نہ تفریح ــــ یہ بھی کوئی زندگی ہے!

رمیش: (ٹھنڈی سانس لے کر) ٹھیک ہی کہتی ہو ماں۔ مگر ماں آپ جانتی ہیں میں سائنس کا طالبِ علم ہوں سائنس کے نت نئے تجربے کرتا ہوں۔ یہی میری زندگی ہے۔ بھلا میں اسے کیسے چھوڑ دوں؟

ماں: پھر بھی کوئی حد تو ہونی چاہیے کام کی۔

رمیش: (اسی لہجے میں) میں نے بوتلوں میں بھرے رنگین رسائنوں میں رنگین سپنے دیکھے ہیں۔ میں نے اُڑتی ہوئی گیسوں میں ہوائی قلعے بنائے ہیں۔ میں نے یہی سوچا ہے کہ کچھ خود بنوں، کچھ دیش کی سیوا کے لیے بناؤں۔

ماں: پھر؟

رمیش: پھر کیا۔ آج میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔ پر ماں میرا سپنا ٹوٹ گیا ہے۔

ماں: کیسے؟

رمیش: میں نے ایک ایسی گیس بنائی ہے جو آدمی کو پاگل کر سکتی ہے۔

ماں: (طنز سے) شاباش۔ اتنی محنت کے بعد کوئی چیز بنائی بھی تو ایسی کہ دنیا کو اس سے نقصان پہنچے یہ تو کوئی بات نہ ہوئی رمیش۔

رمیش: اس گیس کو بنانے کا میرا مقصد کچھ اور ہے ــ!

ماں: یعنی؟

رمیش: دیش کو دشمنوں سے خطرہ ہے تو کیوں نہ بموں میں بھر کر اس گیس کا استعمال ان پر کیا جائے ــــ بنا خون کی ایک بوند بہائے ہم ان کو ہرا سکتے ہیں۔

ماں: لیکن یہ تو کوئی اچھی بات نہ ہوگی کہ لاکھوں لوگ پاگل ہو جائیں۔

رمیش: لڑائی میں سب کچھ ٹھیک ہوتا ہے ماں ــ!

ماں: تو تم بم بناؤ گے؟

رمیش : میں تو نہیں — اگر دیش کے نیتا چاہیں تو بنوا سکتے ہیں اس طرح اربوں روپے کی بچت ہو سکتی ہے —

یہ اربوں روپیہ جو ہر سال فوج پر خرچ ہوتا ہے۔

ماں : تو تم نے کسی سے بات کی ؟

رمیش : ہاں کی — اور یہی میری اداسی کا کارن ہے۔

ماں : کیسے ؟

رمیش : (تیز آواز میں) ہمارے دیش کے نیتا کہتے ہیں کہ بھارت مہاتما بدھ اور مہاتما گاندھی کا دیش ہے۔ اس قسم کا پاگل پن اس دیش کے آدرشوں کے خلاف ہے — انسانیت کے خلاف ہے —!

ماں : یہ بات تو ٹھیک ہی کہتے ہیں وہ۔

رمیش : تم بھی وہی بات کرتی ہو۔ تمھاری بھی سمجھ میں نہیں آتا —!

ماں : بیٹا تم اس بارے میں پھر سوچو۔ ٹھنڈے دل سے سوچو —!

رمیش : ہاں۔ اب میں یہ کام کر رہا ہوں۔ میں اپنی لیبوریٹری میں بیٹھ کر کچھ فیصلہ کرتا ہوں —

(چلے جانے کی آواز)

رمیش : (اکیلے میں آپ ہی آپ رک رک کر بولتا ہے) اُوہ میرا سر اس طرح کی الجھنوں سے پھٹا جا رہا ہے۔ میری ساری محنت بے کار گئی — انھوں نے میری بے عزتی کی — میں بھی اس کا بدلہ لوں گا — ضرور لوں گا — اچھا اب تو تھوڑا سو لوں — سارا دن بھاگتے بھاگتے گزرا ہے —

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

رمیش : کون ہے ؟

ایک شخص : گڈ ایوننگ !

رمیش : گڈ ایوننگ — معاف کیجیے میں نے آپ کو پہچانا نہیں

وہ شخص : میں ایمبیسی (سفارت خانے) سے آیا ہوں ہمارے ایمبیسڈر (سفیر) نے آپ کو بلایا ہے۔

رمیش : کیوں ؟

وہ شخص : معلوم ہوا ہے کہ آپ نے ایک گیس بنائی ہے جو لوگوں کو پاگل بنا سکتی ہے۔

رمیش : ہاں — پھر —؟

وہ شخص : اسی سلسلے میں وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں باہر ٹیکسی تیار ہے۔

رمیش : میں خود ہی وہاں آنے کا ارادہ کر رہا تھا — اچھا ہوا آپ آ گئے — چلیے —!

(قدموں کی آواز — ٹیکسی کی آواز)

وہ شخص : (ٹیکسی رکنے پر) آئیے ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

(قدموں کی آواز)

وہ شخص : آپ سے ملیے — آپ ہیں ہمارے ایمبیسڈر (سفیر) اور آپ مسٹر رمیش۔

ایمبیسڈر : ہیلو مسٹر رمیش۔ میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔

رمیش : شکریہ۔

ایمبیسڈر : ہم کو آپ کی گیس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ اگر آپ اس کا فارمولا دینا چاہیں تو اپنی شرطیں بتا سکتے ہیں۔

رمیش : میری شرطیں بہت سیدھی سادی ہیں۔

ایمبیسڈر : کیا ؟

رمیش: نمبرایک یہ کہ آپ اس گیس کو ہمارے دیش کے
لوگوں پر استعمال نہ کریں گے — نمبر دو یہ کہ —
یہ کہ مجھے دس لاکھ روپیہ دیں گے —!

ایمبیسڈر: منظور ہے — لائیے ہاتھ ملائیے۔

رمیش: اچھا میں چلوں — کل آپ کا آدمی آرہا ہے نا؟

ایمبیسڈر: ضرور —!

رمیش: او۔ کے۔

ایمبیسڈر: او۔ کے۔

(ٹیکسی کی آواز)

(موسیقی)

رمیش: (اپنے آپ سے) میری محنت ٹھکانے لگی —
دس لاکھ روپے ملے کئی مہینے ہوگئے۔ خوب
آرام سے گزری — لیکن ابھی میرا پاسپورٹ نہیں
آیا۔ اب میں دوسرے دیش میں جاکر رہوں گا۔
یہ گھر اور یہ لیبورٹری اپنے ان پروفیسر صاحب کو
دے دوں گا جن کے شوق دلانے سے میں نے
کیمسٹری پڑھی تھی۔

(بہت سے جہازوں کی آواز — سگنل کی آواز۔
بہت سے لوگوں کے شور کی آواز)

(چونک کر) ہائیں۔ یہ کیا؟

(جہازوں کی آواز دھیرے دھیرے کم ہو جاتی ہے)

ایک آواز: ہائے میرا دم گھٹا۔!

دوسری آواز: ارے یہ کیسا دھواں ہے!

تیسری آواز: میرا سر ابل رہا ہے۔

پہلی آواز: قہ۔قہ۔قہ۔ ہم راجا ہوگئے۔

دوسری آواز: آہا۔ ہم بھی راجا ہوگئے۔

تیسری آواز: ہم سب راجہ ہوگئے۔ قہ۔قہ۔قہ۔

پہلی آواز: ہم حکم دیتے ہیں کہ ہمارے سر پر تاج
رکھا جائے۔!

دوسری آواز: ہم حکم دیتے ہیں کہ ہم کو گدی پر بٹھایا جائے۔

تیسری آواز: ارے دیکھو مچھلیاں اڑ رہی ہیں —!

دوسری تیسری آواز: ہاں بھئی ہاں مچھلیاں اڑ رہی ہیں۔ قہ قہ۔ قہ۔

رمیش: غضب ہوگیا — انھوں نے دھوکا دیا — میری
گیس کے بم میرے ہی دیس کے لوگوں پر چھوڑ
دیے — اب کوئی راستہ نہیں — اب کوئی
راستہ نہیں — اب ہم سب پاگل ہو جائیں گے
— لو یہ دھواں یہاں بھی آنے لگا۔ (چلاتا ہے)
ماں! ماں! — جلدی آؤ — لو یہ ماسک اپنے
چہرے پر چڑھالو — ماں — ماں —! (چیخ پکار
کی آواز)

پہلی آواز: دیکھو بھئی ہاتھی آرہا ہے —

دوسری آواز: کار میں بیٹھا ہے۔

تیسری آواز: نہیں ہاتھی کے اوپر کار ہے۔

ملی جلی آوازیں: قہ۔ قہ۔ قہ۔

رمیش: ماں — ماں!

ماں: کیا ہے بیٹا — کیوں چلا رہا ہے؟

رمیش: (ہانپتے ہوئے) ماں — میری پیاری ماں —!
شکر ہے کہ یہ سب کچھ سپنا تھا، خواب تھا!

ماں: کیسا سپنا بیٹا؟

رمیش: بڑا بھیانک سپنا ماں — پر شکر ہے صرف

جناب ندیم مرزا ترکمانی

گرما رُت

رُت گرما کی آئی ہے
ساتھ پسینہ لائی ہے
خون پسینہ ایک ہوا ہے
ہر اک شے سنولائی ہے
رُت گرما کی آئی ہے

ڈیڈی کہتے شربت شربت
منّا کی شامت آئی ہے
جھل رہی ہے نشّو پنکھا
کشّو بھی گھبرائی ہے
رُت گرما کی آئی ہے

ممّی بھابھی چیخ رہی ہیں
سر پہ قیامت آئی ہے
بھیا کی بک بک توبہ
نازو بھی گھبرائی ہے

غرض بندھا ہے عجب سماں
دنیا سب گھبرائی ہے
رُت گرما کی آئی ہے

سپنا ہی تھا۔

ماں: کچھ تو بتاؤ بیٹا۔ اتنا گھبرا کیوں رہے ہو؟ کیا دیکھا ہے تم نے؟

رمیش: پھر بتاؤں گا ماں، پہلے میں اس گیس کے فارمولے کو پھاڑ دوں

(الماری کھولنے کی آواز اور کاغذ کو پھاڑنے کی آواز)

ماں: ارے کچھ بتا تو سہی —؟

رمیش: ماں اس سپنے نے میری آنکھیں کھول دیں — میں غلطی پر تھا۔ اس سپنے نے مجھے نیا راستہ دکھایا ہے۔ اب میں اپنی کیمسٹری کی جانکاری کو انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال کروں گا۔

(موسیقی)

باقی مضمون "چچا ابا نے روزہ رکھا"

روزے کا نام سنتے ہی چچی اماں سے چپ نہ رہا گیا انھوں نے فوراً کہا کہ "اگر تم نے پھر روزہ کا نام لیا تو سواری منگا کر میکے چلی جاؤں گی اور عمر بھر صورت نہ دکھاؤں گی۔"

اس پر ہم سب ہنس پڑے۔ چچا ابا نے بھی ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور گراموفون بجنے لگا کہ
بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

جناب علیم الدین

آسٹریلیا کے چند انوکھے جانور

(۳)

کولا: KOALA

یہ بھی بہت ہی عجیب وغریب اور نرالا جانور ہے بہت ہی پیارا اور خوبصورت۔ دیکھنے میں بھالو جیسا۔ جبھی تو سب لوگ غلطی سے اسے بھالو کی قسم سمجھنے لگتے ہیں۔ آپ نے اگر کھلونے کا بالوں والا ریچھ دیکھا ہو تو یہ بالکل اسی کی طرح لگتا ہے۔

کولا صرف آسٹریلیا ہی میں پایا جاتا ہے۔ اس کا وزن کُل ۲۰ پونڈ ہوتا ہے۔ جسم پر بہت ہی نرم نرم ہلکے بھورے

بھورے بال ہوتے ہیں۔ یہ جانور بھی تھیلی والا جانور ہے مادہ کولا اپنے چھوٹے بچوں کو اسی تھیلی میں رکھتی ہے۔

یوکلپٹس کے پیڑ آپ لوگوں نے ضرور دیکھے ہوں گے۔ بہت اونچے اونچے قدآور درخت ہوتے ہیں۔ پتیاں کافی لمبی اور نکیلی ہوتی ہیں۔ ان سے الائچی کی سی خوشبو بھی آتی ہے اور اکثر بچے اور بڑے غلطی سے اس کو الائچی کا پیڑ بھی کہہ دیتے ہیں۔ اسکولوں اور عمارتوں کے احاطے میں اسے عموماً خوبصورتی کے لیے لگاتے ہیں۔ ان درختوں کا اصل وطن آسٹریلیا ہے۔ یہاں یوکلپٹس کے پیڑوں کی تقریباً بارہ قسمیں پائی جاتی ہیں۔ کولا بھی ہمیشہ ان ہی درختوں پر اپنا وقت گزارتا ہے اور اسی کی پتیوں سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔ ایک دن میں تقریباً ڈھائی پونڈ نرم پتیاں کھا جاتا ہے پانی کبھی کبھی پیتا ہے۔ یوکلپٹس میں جو گوند نکلتا ہے عموماً یہ اسی سے پانی بھی حاصل کرتا ہے۔

یوں تو دیکھنے میں بہت ہی نرم و نازک اور چھوٹا سا ہوتا ہے لیکن اس میں طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ درختوں پر ستر ستر فٹ کی اونچائی پر چڑھ جاتا ہے اور ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر چھلانگ لگا کر پہنچ جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ ستو ستو گز لمبی چھلانگ لگاتا ہے۔ پیڑ پر بہت ہی تیزی کے ساتھ چڑھ جاتا ہے اور اس پر بہت تیزی کے ساتھ دوڑ پھر سکتا ہے۔

آسٹریلیا کے لوگوں کا بہت ہی پسندیدہ اور محبوب جانور ہے اور وہاں کی حکومت اس کی حفاظت کرتی ہے۔

SPINY ANT-EATER یا THE ECHIDNA

چیونٹی خور: اس کے عجیب وغریب نام سے ہی آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ اس جانور کی غذا کیا ہے۔ بہت ہی عجیب وغریب جانور ہے۔ اس کی غذا صرف چیونٹیاں اور چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑے ہی ہیں۔ جب بھی اسے بھوک لگتی ہے یہ اپنی بہت ہی لمبی چھڑی جیسی زبان باہر نکالتا ہے تھوڑی ہی دیر میں اس زبان پر ہزاروں لاکھوں چیونٹیاں اور کیڑے مکوڑے چمٹ جاتے ہیں۔ پھر یہ اسے منھ کے اندر کرلیتا ہے اور یہ کیڑے مکوڑے اس کی غذا بن جاتے ہیں۔ کھانے میں یہ صرف زبان کا استعمال کرتا ہے کیونکہ اس کا مُنھ گول ہوتا ہے (پائپ کی طرح۔ کھل نہیں سکتا۔ اس میں سے بس زبان نکال سکتا ہے۔ اس کی دیکھنے کی قوت بہت کمزور ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں سونگھنے کی قوت بہت تیز ہوتی ہے۔

اس کا جسم لمبے لمبے کانٹوں سے ڈھکا رہتا ہے

پیٹ کی طرف نرم نرم بال ہوتے ہیں۔ ایک تھیلی ہوتی ہے جس میں کنگارو اور کولا کی طرح یہ بھی اپنے بچوں کو رکھتا ہے۔ یہ دنیا کا دوسرا جانور ہے جو انڈے بھی دیتا ہے اور انڈوں سے جب بچے نکل آتے ہیں تو ان کو دودھ بھی پلاتا ہے۔ جس وقت اس کے بچے انڈوں سے نکلتے ہیں تو ان کا قد صرف ½ انچ ہوتا ہے۔

چیونٹی خور اپنا گھر نہیں بناتا۔ کسی جانور کے بل یا گھر میں یا پھر کسی جھاڑی وغیرہ میں گھس جاتا ہے یہ بہت ہی طاقتور جانور ہے۔ اپنے قد کے برابر اور اس سے بھی بڑی بڑی چٹانوں کو دھکیل دیتا ہے اور اس کے نیچے اپنی غذا تلاش کرتا ہے۔

آسٹریلیا کے جنوب مشرق میں جزیرہ تسمانیہ ہے اس میں یہ بکثرت پایا جاتا ہے۔ سخت سردیوں کے موسم میں یہ معتدل علاقوں میں چلا جاتا ہے۔

قدرت نے تمام جانوروں کو اپنی حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ ہتھیار ضرور دیے ہیں۔ اسی طرح چیونٹی خور اور پلاٹی پس کو بھی اپنے بچاؤ کے لیے ہتھیار ملے ہیں۔ پلاٹی پس کی کمر پر ایک تیز اور نوکیلی چیز ہوتی ہے۔ یہ بہت ہی زہریلی اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اس سے یہ اپنے دشمنوں سے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔ اسی طرح چیونٹی خور کے جسم پر تیز اور نکیلے کانٹے ہوتے ہیں۔ دشمن سے بچنے کے لیے یہ تیزی کے ساتھ گڑھا کھود کر اس میں چھپ جاتا ہے۔ صرف کمر ہی نظر آتی ہے لیکن اس پر کوئی حملہ نہیں کرسکتا۔

BONDED ANT-EATER یا THE NUMBAT

یہ چیونٹی خور کی دوسری قسم ہے۔ آسٹریلیا کے اصلی باشندے اس کو نامبیٹ کہتے ہیں۔ یہ جانور بھی تھیلی والا ہے اس کے پاس بھی اپنی اور اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے صرف لمبے لمبے کانٹے دار بال ہیں۔

نامبیٹ کا منھ بھی گول ہوتا ہے اور زبان گول ہوتی ہے اور اس کی غذا بھی چیونٹی اور کیڑے ہیں۔ اس کا قد ایک بڑے چوہے کے برابر ہوتا ہے۔ رنگ مٹیالا بھورا ہوتا

ہے اور جسم پر ۶ سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔ دُم بہت لمبی بالوں کی طرح ہوتی ہے۔ دشمن کو دیکھ کر فوراً فرار ہو جاتا ہے نہ یہ کاٹ سکتا ہے، نہ نوچ سکتا ہے اور نہ کسی پر حملہ کر سکتا ہے۔

یہ جانور برِاعظم آسٹریلیا کے جنوبی مغربی اور جنوبی مشرقی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ جنوری اور اپریل کے دوران میں ہمیشہ چار بچے دیتا ہے۔

مول THE MOLE

اس جانور کی دریافت ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ بہت ہی غیر معمولی قسم کا تھیلی والا جانور ہے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ یہ بہت ہی قدیم زمانے کا جانور ہے جو آسٹریلیا ہی میں پایا جاتا ہے۔ اس کا قد صرف ۱۴ انچ ہوتا ہے۔ جسم پر ہلکے بھورے رنگ کے بال ہوتے ہیں۔ اس کے نہ آنکھیں ہوتی ہیں اور نہ کان۔ ہمیشہ زمین کے اندر ہی رہتا ہے لیکن اس کے باوجود بہت ہی چالاک اور پھرتیلا جانور ہے۔

یہ جانور بڑا پیٹو ہوتا ہے۔ بڑی مقدار میں کھاتا ہے۔ چیونٹیوں اور کیڑے مکوڑوں کے لاروے اور پیوپا وغیرہ اس کی پسندیدہ غذا ہیں۔ جب تک یہ جاگتا رہتا ہے اس وقت تک برابر کھاتا رہتا ہے اور صرف سوتے وقت نہیں کھاتا۔

مادہ مول کے جسم کے پچھلے حصے کی طرف تھیلی ہوتی ہے جس کا منھ پیچھے کی طرف سے کھلا ہوتا ہے۔ سال میں صرف ایک مرتبہ بچے دیتی ہے۔ اس کے بچے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ آپ ان کو بآسانی دیکھ بھی نہیں سکتے آسٹریلیا کے کن علاقوں میں یہ پایا جاتا ہے، ابھی تک تحقیق نہیں ہوا ہے۔ ویسے یہ جنوبی آسٹریلیا کے جنوبی ریگستان میں، وسط آسٹریلیا اور مغربی آسٹریلیا کے شمال مغرب میں پایا جاتا ہے۔ اپنی قسم کا واحد اور نرالا جانور ہے۔

ڈنگو THE DINGO

اس کو ویریگل WARRIGAL یا جنگلی کتا بھی کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں عام لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اصل میں یہ ایشیا کا رہنے والا ہے اور وہاں کے اصل باشندوں کے ساتھ ایشیا سے آسٹریلیا پہنچا۔ ڈنگو کا شمار گوشت خور جانوروں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ گوشت حاصل کرنے کی غرض سے گائے اور بھیڑوں کو خوفناک طریقے سے مار ڈالتا ہے اور ان کا گوشت کھا جاتا ہے۔ یہ ڈنگو بھونکتا یا چلاتا نہیں بلکہ بھیڑیے کی طرح سے غراتا ہے۔ اس کا قد بھی بھیڑیے کی طرح ہوتا ہے۔ جنگلوں میں جھاڑیوں میں اکثر رات کے وقت اس کی غراہٹ کی آواز سنائی دیتی ہے۔

آسٹریلیا کا صرف یہی واحد جانور ہے جس کے تھیلی نہیں ہوتی۔ اس ملک کے اصلی باشندے اس کو پالتے بھی ہیں لیکن اور کوئی اس کو نہیں پالتا۔ کافی خطرناک قسم کا جانور ہے۔ گھنے جنگلات میں رہتا ہے۔

جناب سید محمد شفیع تمنّا کلکتوی

ایک گیت

آئے جائے حکم سے جس کے ہر دن شام سویرا
جس نے چاند اور سورج کا یہ لگا دیا ہے پھیرا
وہی تو رب ہے میرا بچو وہی تو رب ہے میرا
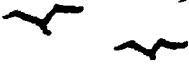
باغ میں جس نے کلیوں کو بھی بخشا روپ سہانا
کام اسی کا ہے پتوں پر شبنم کو ٹھہرانا
جس نے پھولوں پر اپنی قدرت کا رنگ بکھیرا
وہی تو رب ہے میرا بچو وہی تو رب ہے میرا
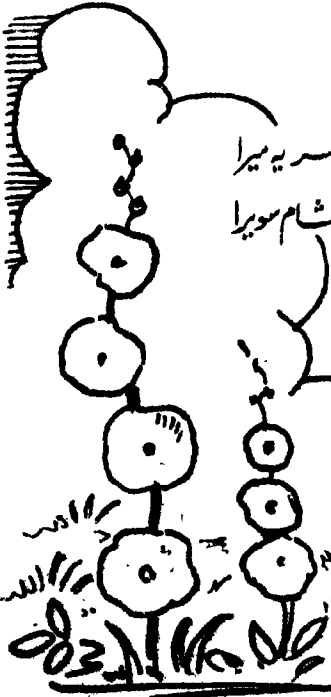
سب کا حاکم، سب کا مولا، سب کا ہے جو آقا
جس نے ہم سب کو اے بچو کیا جہاں میں پیدا
اسی کے آگے تو جھکتا ہے ہر دم سر یہ میرا
آئے جائے حکم سے جس کے ہر دن شام سویرا
وہی تو رب ہے میرا بچو
وہی تو رب ہے میرا

جناب سلام بن رزاق

جُگنو

(ایک جاپانی لوک کہانی)

کسی گاؤں میں ایک لکڑہارا رہتا تھا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ بیوی بے چاری انتہائی شریف اور سمجھ دار تھی۔ لکڑہارا بھی بہت نیک، پرہیزگار اور اپنی قسمت پر شاکر تھا۔ روکھا سوکھا کھاتا مگر زبان پر کبھی شکایت کا ایک لفظ تک نہ لاتا۔ دن بھر محنت کرتا اور رات کو خدا کی عبادت کے بعد اپنے بستر پر پڑ کے سو رہتا۔ یہی اس کا معمول تھا۔

مگر لکڑہارے کی بیوی بہت اداس رہنے لگی۔ وہ رات کو دیر تک خدا سے دعا مانگتی رہتی "پروردگار! میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا، شوہر کی خدمت کرتی ہوں پڑوسیوں سے پیار کرتی ہوں، غریبوں سے مہربانی سے پیش آتی ہوں پھر بھی تو مجھ سے خفا ہے؟ ابھی تک میری گود کیوں خالی ہے؟ کیا میری گود کبھی نہ بھرے گی؟ میرا آنگن ہمیشہ سونا رہے گا؟ میرے کان اپنے بچے کی کلکاریوں کے لیے ترستے ہی رہیں گے؟ میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتی، کچھ نہیں مانگتی، بس ایک گل گوتھنا سا بچہ!"

ایک دفعہ وہ ہمیشہ کی طرح "فیوجی یاما" پہاڑ کی طرف منھ کرکے دعا مانگ رہی تھی، اچانک اسے پہاڑ کی چوٹی پر ایک خوبصورت، بھولی بھالی شکل نظر آئی۔ چاند کے ٹکڑے کی طرح جگمگ جگمگ کرتی۔ "کہیں یہ خواب تو نہیں!" وہ اپنی آنکھیں ملنے لگی، بازو میں چٹکی لی۔ بار بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ سامنے فیوجی یاما کی چوٹی پر وہ چاند سا بچہ برابر مسکرائے جا رہا تھا، اُسے اپنی طرف بلا رہا تھا اپنے ننھے سے ہاتھوں کو اس کی طرف اٹھائے ہوئے ٹھمک رہا تھا۔ بے چاری لکڑہاری بے چین ہوگئی۔ اس کی ساری ممتا اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ اس نے اپنے شوہر کو پکارا:

"اے جی! ذرا یہاں تو آنا۔ وہ دیکھو کیسا خوبصورت بچّہ ہے۔ کیسی پیاری ہنسی ہنس رہا ہے۔ کتنی بھولی بھالی صورت ہے اس کی! ننھے مُنّے ہاتھوں سے ہماری طرف ہمک رہا ہے۔ جاؤ جاؤ، جلدی سے جاکر اسے لے آؤ شاید خدا نے ہماری دعا قبول کرلی ہے۔"

لکڑہارے نے دیکھا سچ مچ فیوجی یاما کی بلند چوٹی پر ایک گل گوتھنا سا بچہ کھڑا تھا اور اپنے ننھے منّے ہاتھوں سے جیسے انھیں بلا رہا تھا۔ لکڑہارا تیزی سے فیوجی یاما کی چوٹی کی طرف بڑھا۔

اس نے دیکھا کہ ایک انتہائی خوبصورت بچی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی ہے۔ وہ آسمان کی ننھی سی پری معلوم ہو رہی تھی۔ چاند کی طرح روشن چہرہ، کنول کے پھولوں جیسی بڑی بڑی آنکھیں، گلاب کے پھولوں کی طرح سُرخ سُرخ گال، یاقوت جیسے ہونٹ اور رات کی اندھیاری کی طرح کالے اور گھنے بال۔ لکڑہارا پتھر کے بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا اُسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا جیسے اس کے ہونٹ کسی نے سی دیے ہوں!

اچانک اس خوبصورت بچی نے اپنی مدھر آواز میں کہا "بابا تمھاری بیوی اولاد کے لیے روز رویا کرتی تھی نا۔ میں تمھاری بیٹی بن کر آئی ہوں۔ میں چاند دیوتا کی بیٹی ہوں۔ تمھاری بیوی کو روز آنسو بہاتے دیکھ کر میرے ابّی کو اس پر ترس آگیا۔ انھوں نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔ کیا تم مجھے اپنی بیٹی بنا لوگے؟ آج سے آپ لوگ ہی میرے ماں باپ ہیں!"

لکڑہارا خوشی کے مارے ناچنے لگا۔ اس نے اس خوبصورت بچی کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور تقریباً دوڑتا ہوا اپنی جھونپڑی میں آیا۔ لکڑہارن نے بچی کو چھاتی سے لگا لیا "پروردگار آخر تو نے میری دعا قبول کرلی! شکر، ہزار شکر!"

وہ چاند شہزادی اُس جھونپڑی میں بڑی ہونے لگی۔ اس کا حُسن روز بہ روز نکھرتا ہی جا رہا تھا۔

ایک دن جاپان کا راج کمار شکار کھیلتے کھیلتے لکڑہارے کے جھونپڑے کی طرف آنکلا۔ اتفاق سے چاند شہزادی نہا کر جھونپڑی کے دروازے میں کھڑی اپنے بال سکھا رہی تھی۔ جوں ہی راجکمار کی نظر اس پر پڑی وہ اس کی حوروں جیسی شکل دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ ایسی خوبصورت لڑکی اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ لکڑہارے کے پاس پہنچا اور بولا:

"بابا، میں آپ کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے بہت پسند آگئی ہے۔ میں آپ کو مالا مال کردوں گا۔ کیا آپ اپنی لڑکی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں گے!"

بے چارا لکڑہارا سوچ میں پڑ گیا۔ اپنی چاند جیسی بیٹی سے جدا ہونے کے خیال سے وہ اُداس ہوگیا۔ پھر اس نے سوچا مگر لڑکی ذات تو پرایا دھن ہے۔ آج نہیں تو کل اس کی شادی تو کرنی ہی پڑے گی پھر کیوں نہ اس راجکمار سے اس کا بیاہ کردیا جائے۔ جلد ہی وہ سارے ملک کی رانی بن جائے گی۔

اس نے ہنستے ہوئے راجکمار سے وعدہ کرلیا۔ چاند شہزادی کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے لکڑہارے کو جھونپڑی میں بلایا اور بولی:

"بابا، میں چاند دیوتا کی بیٹی ہوں۔ تم لوگ اولاد نہ ہونے سے بہت دُکھی تھے اس لیے تمھارے غم کو ہلکا کرنے کے لیے میں یہاں آئی تھی۔ میری شادی کسی آدم زاد سے نہیں ہوسکتی اب میں بڑی ہوگئی ہوں، میں اپنے گھر چاند نگر واپس جانا چاہتی ہوں!"

چاند شہزادی کی بات سن کر لکڑہارا بہت رنجیدہ ہوگیا اس نے راجکمار کو ساری حقیقت کہہ سنائی۔ راجکمار غصے کے مارے آگ بگولا ہوگیا۔ ایک لکڑہارن کی یہ مجال کہ مجھ سے شادی کرنے سے انکار کردے۔ میں دیکھوں گا اُسے یہاں سے کون لے جاتا ہے۔ یہاں میرا راج ہے۔ یہاں صرف میرا حکم چلے گا۔ کل صبح تمھاری بیٹی کی شادی مجھ سے ہوگی۔ ضرور ہوگی!

راجکمار نے رات کی رات ایک زبردست فوج جمع کرلی اور لکڑہارے کے جھونپڑے پر ننگی تلواروں کا پہرہ

لگ گیا۔

رات ہوگئی۔ چودھویں کا پورا چاند نیلے آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ چاند کی ایک ٹھنڈی اور جگمگاتی کرن اس لکڑہارے کے جھونپڑے میں داخل ہوئی۔ کرنوں کی جھلمل کرتی سیڑھی سے چاندنگر کا راجہ جھونپڑے میں اُتر آیا اور اپنی بیٹی سے بولا "بیٹی، چلو اب گھر چلیں!"

چاند شہزادی باپ کی انگلی پکڑ کر کرنوں کی سیڑھی سے آسمان کی طرف بڑھنے لگی۔ سپاہیوں نے اُسے دیکھا۔ انھوں نے سنگینوں اور تلواروں سے اُسے روکنا چاہا۔ مگر وہ تو پلک جھپکتے دُور آسمان پر تارہ بن چُکی تھی۔ چاند شہزادی کا دل بھر آیا۔ دھرتی پر اپنے غریب ماں باپ کی یاد اُسے ستانے لگی۔ لکڑہارنی اُسے کتنا چاہتی تھی۔ ایک پل کے لیے اُسے اپنے سے جُدا نہ ہونے دیتی تھی جوں جوں وہ جھونپڑی سے دور ہوتی گئی اس کی کنول جیسی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی ڈھلکنے لگے۔ وہ موتی چمکنے لگے۔ پھر ان ننھے ننھے موتیوں میں چھوٹے چھوٹے پر پھوٹ آئے اور لوگ انھیں "جگنو" کہنے لگے۔

رات کے اندھیرے میں جگ مگ جگ مگ کرتے یہ جگنو چاند شہزادی کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسو ہیں۔ اس کی دل کی بے قراری کا حال گویا وہ ساری دنیا سے کہتے پھر رہے ہیں۔

جناب حکیم مقصود

چھٹی

چھٹی ہے آدمی کی سب سے بڑی ضرورت
چھٹی کے دم سے راحت چھٹی بغیر وحشت
چھٹی کی ہر سو عزت چھٹی کی ہر سو عظمت

چاہت سے اس کی خالی کوئی بشر نہیں ہے
چھٹی سے بڑھ کے دلکش کوئی خبر نہیں ہے
دنیا میں کچھ نہیں ہے چھٹی اگر نہیں ہے

زینت تماشہ گھر کی، سرکس کی جان چھٹی
بازار کی یہ رونق، عیدوں کی شان چھٹی
محنت کشوں کا حق اور آقا کی آن چھٹی

ڈلو کی ہر شرارت، ڈبو کا ہر کھلونا!
ننھی کا چلبلا پن، مُنّا کا خوب سونا!
کردے گا بے مزہ سب چھٹی کا اک نہ ہونا۔

جناب اقبال مدراسی

انوکھا تیراک
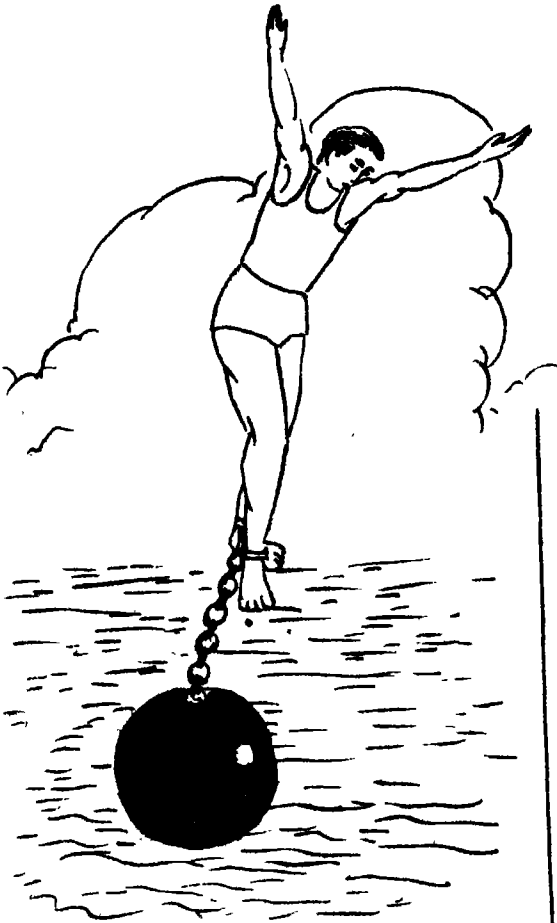
این جلو فے ٹی کونی (ANGELOFATICONI) کا نام شاید آپ نے سُنا ہو۔ دنیا کی عجیب و غریب شخصیتوں میں اس کا شمار تھا۔ اس کے قصے سچ مچ حیرت میں ڈالنے والے ہیں اور آج تک ساری دنیا میں مشہور ہیں۔

این جلو فے ٹی کونی کو دنیا کی کوئی طاقت پانی میں ڈبو نہیں سکتی تھی۔ وہ گھنٹوں پانی کی سطح پر سو سکتا تھا اور تماشائی جو بھی اس سے کرنے کو کہتے وہ فوراً تیار ہو جاتا تھا۔

ایک بار لوگوں نے ۲۰ پونڈ وزنی گولا اس کے پیروں میں باندھ کر پانی میں ڈال دیا۔ سب کو یقین ہو گیا کہ اب یہ میاں پانی میں سے کیا نکلیں گے۔ ڈوب کر ختم ہو گئے ہوں گے۔

لیکن ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب انھوں نے دیکھا کہ تھوڑی دیر میں وہ پانی کے اوپر آگیا اور سترہ گھنٹے پانی پر لیٹا رہا۔ لیٹا رہا اور بہتا رہا۔

ایک دفعہ لوگوں نے توپ کا وزنی گولا فیٹی کونی کے ٹخنوں میں باندھ دیا اور اسے تھیلے میں بند کر کے پانی میں پھینک دیا گیا۔ لیکن کشش ثقل کے سارے قانون توڑ کر وہ ایک بار پھر پانی کے اوپر آگیا اور آٹھ گھنٹے پانی پر پڑا رہا۔

فے ٹی کونی اٹلی کا رہنے والا تھا۔ امریکہ میں آکر بس سا تھا۔ جیکسن [illegible] میں رہتا تھا۔ یہاں کے لوگوں نے اس کے عجیب عجیب نام رکھ چھوڑے تھے۔ کوئی ہیومن کارک (کارک کا انسان) کہتا تھا۔ کوئی کچھ کوئی کچھ۔

بعض ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کا خیال تھا کہ اس کے جسم میں ضرور کوئی خاص بات ہے جو اُسے پانی میں ڈوبنے نہیں دیتی۔ اس لیے اس کے جسم کا بڑی احتیاط سے معائنہ کیا گیا اور ڈاکٹر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے جسم میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

اب سے کوئی ۳۸ برس (۱۹۳۱ء) پہلے یہ عجیب و غریب انسان ۷۲ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔

جناب غلام حیدر

پیسہ

اور بھائی میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ پرانے زمانے میں میرا عروج وزوال تو بادشاہوں کے ساتھ ہوا کرتا۔ ادھر مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا اور ادھر میری حالت بگڑی۔ میری شکلیں خراب ہوئیں، میرے لیے خراب اور گھٹیا دھاتیں استعمال کی گئیں۔ میری صورت میں وہ خوبصورتی اور بناوٹ میں وہ بانکپن نہ رہا جو اکبر اور جہانگیر نے بخشا تھا۔ نئی نئی اور چھوٹی چھوٹی حکومتیں بنتی گئیں، اور اپنی اپنی بساط کے مطابق سکے بھی چلاتی رہیں۔ مگر جیسا ایجاد لیا سکہ۔ اور ایک وقت تو ایسا پریشانی کا آیا کہ تاریخ والوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک کوئی ۹۹۴ مختلف قسم کے سکے بازاروں میں نظر آتے تھے۔ جن میں نئے بھی تھے اور پرانے بھی، اچھے سونے کے بھی اور خراب سونے کے بھی۔ اب تم سوچو کہ جب میرے ایک ہزار بھائی لوگوں کے ہاتھوں میں ہوں تو ان کو لین دین میں کتنی مشکل ہوتی ہوگی!

اور بس پھر تمھارے ملک پر انگریزوں نے قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ پہلے ایک کمپنی کے نام سے۔ جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ ہندوستان میں صرف تجارت کرنا چاہتی ہے۔ اس کا نام 'ایسٹ انڈیا کمپنی' تھا۔ اور پھر بعد میں ۱۸۵۷ء میں تو مغلوں کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور ان کے ساتھ ہی دوسرے آزادی مانگنے والے ہندوستانیوں کو قید کیا، پھانسیاں دیں، اور انگریزوں نے باقاعدہ ہندوستان پر راج شروع کر دیا۔

فرخ سیر بادشاہ نے جو ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک راج کرتا تھا سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بمبئی میں ٹکسال کھولنے کی اجازت دی اور اس میں اپنے سکے ڈھلوائے۔ اور پھر بعد میں جب مغل بادشاہ صرف نام کے ہی بادشاہ رہ گئے تو محمد شاہ نے خود کمپنی کو بھی سکے ڈھالنے کی اجازت دے دی۔ مگر کچھ عرصے بعد تک بھی مغل بادشاہوں کا نام سکوں پر آتا رہا۔ لیکن ۱۸۳۵ء میں باقاعدہ انگریزی سکے ہندوستان میں آ گئے۔ تمام پرانے بادشاہوں کے سکے بند کر کے انگریز بادشاہ کے سکے ہندوستان میں چلائے گئے

اور بھائی میری یہ شکلیں تو تم نے خود بھی دیکھ لی ہیں ان کے بارے میں میں تمھیں کیا بتاؤں۔ بس جو دو چار باتیں نئی ہو سکتی ہیں وہ اور بتا دوں۔ تم نے تو بس روپیہ آنے سے لے کر بہت ہوا تو سو روپیہ تک کے نوٹ دیکھے ہوں گے مگر اب سے تیس چالیس برس پہلے تک ایک، دو، پانچ، دس، اور سو روپیہ کے نوٹوں کے علاوہ ہندوستان میں ڈھائی

بیس، پچاس، ایک ہزار اور دس ہزار روپے کے نوٹ چلتے تھے۔ روپیہ سے نیچے اٹھنی، چونی، دوانی، اکنی، دو پیسہ کا ادھنا اور پیسہ، پھر پیسہ کا آدھا دھیلا اور ایک تہائی پائی، چلتی تھی۔ سب سے چھوٹے سکے پائی کے بعد بھی اگر اور چھوٹے ٹکڑوں کی ضرورت پیش آتی تو کوڑیوں سے کام چلایا جاتا۔ اور تم نے ایک پیسہ کا وہ سکہ بھی دیکھا ہوگا جس میں سوراخ ہوتا تھا۔ یہ سکہ خود ہندوستان کے لیے اور دنیا کے لیے کوئی نئی ایجاد نہیں تھی۔ اس قسم کا سکہ شاید سب سے پرانا تو چین کے سکوں میں نظر آتا ہے جو تقریباً چار پانچ سو قبل مسیح میں یعنی اب سے کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے چلتے تھے۔ اس میں سوراخ شاید اس لیے کیا جاتا تھا کہ تاگا پرو کر بہت سے سکوں کو ایک ساتھ رکھا جا سکے۔ لیکن خود ہندوستان میں بھی بعض چھوٹے چھوٹے سکوں میں اس سے پہلے بھی سوراخ رکھا گیا ہے۔

آزادی کے بعد

پھر انگریزوں کے آنے کے بعد سے جو کچھ ہوا وہ تم بہت کی کتابوں میں پڑھ ہی لیتے ہو اور مجھ سے زیادہ تم ہی جانتے ہو۔ ۱۹۴۷ء میں انگریز چلے گئے، ملک آزاد ہو گیا مگر تم جانو مجھے ایک دم بدل ڈالنا بھی اتنا آسان نہیں ہے۔ پھر بھی آزاد ہندوستان میں مجھے آزاد ہندوستانی کی شکل دینے میں زیادہ دیر نہیں کی گئی ——— ۱۹۵۵ء میں ہندوستان کی پارلیمنٹ نے میرے لیے یہ قانون پاس کر دیا کہ مجھے نئی شکل دے دی جائے اور میری صرف دو شکلیں ہوں ——— روپیہ اور اس کے سو نئے پیسے ——— مگر تم جانتے ہی ہو کہ میرے بدلنے میں وقت لگتا ہے۔ اس پر عمل ۱۹۵۷ء سے شروع ہوا اور پھر آہستہ آہستہ میری پرانی شکلیں غائب ہوتی چلی گئیں ——— اور اب میرا بالکل نیا روپ تمھارے سامنے آ گیا ہے۔

اس وقت میری جو صورتیں تمھارے ہاتھوں میں ہیں ان کے متعلق بھی تھوڑا سا تمھیں بتا دوں ——— ایک پیسہ کا ڈیڑھ گرام وزن کا گول سکہ برونز دھات کا ہوتا ہے۔ ایک ہی پیسے کا ایک اور نیا سکہ بھی چلا ہے۔ یہ چار کونوں کا ہے اور یہ ایک ایسی دھات کا ہوتا ہے جس میں المونیم کافی مقدار میں اور لوہا اور زنک تھوڑی مقدار میں ملے ہوتے ہیں۔ اس کا وزن صرف ۷۵۰ ملی گرام ہے۔ دو پیسوں کا آٹھ کونوں والا سکہ وزن میں ۲ گرام اور ایک مرکب دھات (کیپرونکل) سے بنتا ہے۔ دو پیسوں کا بھی ایک اور نیا سکہ ابھی چلا ہے جس کی دھات میں اور ایک نئے پیسے کے چوکور سکے والی دھات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں بھی آٹھ کونے ہوتے ہیں اور وزن میں ایک گرام کا ہوتا ہے۔ تین پیسوں کا چھ کونوں والا سکہ ۱½ گرام کا ہوتا ہے۔ اس کو بھی اسی دھات سے بناتے ہیں جس سے پیسے کا چوکور سکہ بنتا ہے۔ پانچ پیسوں کا چوکور سکہ جس کے کونوں پر گولائی پیدا کر دی گئی ہے بالکل ایسا لگتا ہے جیسے پیسے کے چوکور والے سکے کو بڑا کر دیا گیا ہو۔ یہ وزن میں ۴ گرام ہوتا ہے اور یہ بھی کیپرونکل سے بنایا جاتا ہے۔ دس پیسے کا آٹھ کونوں والا سکہ بھی کیپرونکل کا ہوتا ہے اور وزن میں ۵ گرام کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ۲۵ پیسے، ۵۰ پیسے اور سو پیسے (یعنی ایک روپے کے) سکے ہوتے ہیں جو خالص نکل سے بنائے جاتے ہیں اور تم دیکھتے ہی ہو کہ بالکل گول

ہوتے ہیں۔ ان میں ۲۵ پیسے والا ۲½ گرام، ۵۰ پیسے والا ۵ گرام اور سو پیسے والا روپیہ دس گرام کا ہوتا ہے۔
نوٹوں میں آج کل ایک روپیہ، ۲ روپے، ۵ روپے، ۱۰ روپے، ۱۰۰ روپے اور ۱۰۰۰ روپے کے نوٹ ہندوستان میں چلتے ہیں۔

لو بھائی! تو یہ تھی میری کہانی جو نہ معلوم کب سے شروع ہو کر بالکل آج تک آکر ختم ہو گئی۔ اور مجھے پتہ ہے کہ میری کہانی کبھی پوری نہیں ہوگی۔ یہ تو انسان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

تم اگر چاہتے ہو کہ میری پرانی شکلیں خود دیکھو تو ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں جو میوزیم ہیں وہاں چلے جاؤ۔ مگر بھائی تم ٹھہرے خوبصورت خوبصورت سکوں کے استعمال کرنے والے، نہ معلوم تمھیں میری پرانی، ٹیڑھی ترچھی شکلیں پسند آئیں گی بھی یا نہیں!

جناب عبدالمجید آئیکل

گلاب میں کانٹے کیوں

پودوں کے ماہروں کا کہنا ہے کہ زیادہ تر پودوں میں جانوروں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں سے بچاؤ کی طاقت ہوتی ہے۔ ان کی جڑیں اور پتے اور ڈالیں اتنی سخت ہوتی ہیں کہ انھیں آسانی سے کھایا نہیں جا سکتا۔ مثال کے طور پر کوکو کے پودے کے پتوں پر ایک خاص قسم کا چکلدار چونا سا ہوتا ہے جسے کھا کر کیڑے مکوڑے جلن محسوس کرتے ہیں۔
گلاب لذیذ بھی ہوتا ہے اور خوبصورت بھی۔ اس لیے ایسے درختوں اور پودوں کی حفاظت کے لیے قدرت

جناب واحد پریمی

بننا۔ بگڑنا

ایک چڑیا
اپنی ننھی چونچ سے
تنکے اٹھا کر لا رہی ہے
چُن رہی ہے
یعنی اپنے اور بچوں کے لیے
سر چھپانے کا سہارا کر رہی ہے

لیکن اک بجلی
سرِ افلاک جو
منتظر ہے گھونسلا تیار ہو
اور یہ گر کر جلائے
خاک کر دے
تاکہ چڑیا اور بچوں کے لیے
سر چھپانے کا سہارا نہ رہے

جناب رضوان رضوی

بڑے اور موٹے چوہے!

کام کرنے والے

حامد	بارہ سال کا لڑکا
منی	حامد کی چھوٹی بہن

حامد کی امی اور ابا جان

پہلا منظر

مقام: حامد کا کمرہ۔ وقت ۲ بجے دن

(پردہ اٹھتا ہے تو ایک چھوٹا سا کمرہ نظر آتا ہے۔ حامد اور منی اپنے اپنے اسکول کی کتابیں پڑھ رہے ہیں۔)

حامد:۔ (منی سے) دیکھو ابا جان گئے باہر۔

منی:۔ کیوں؟ (کیوں کو ذرا کھینچ کر)

حامد:۔ اری پگلی تو جاکر دیکھ تو۔

منی:۔ (تعجب سے) خیریت تو ہے بھیا؟

حامد:۔ بالکل خدا کا فضل ہے، تو جاکر دیکھ تو ے۔

منی:۔ نہیں بھیا آپ مجھے بتا دیجیے۔ کیوں اور کس لیے؟

حامد:۔ آج ابا جان بہت اچھی اچھی چیزیں لائے ہیں۔

منی:۔ (جلدی سے) کون سی اچھی اچھی چیزیں؟

حامد:۔ آج ابا جان کے دوست آنے والے ہیں

منی:۔ تو؟

حامد:۔ تو یہ کہ آج صبح ہی سے ابا جان نے طرح طرح کی مٹھائیاں منگا رکھی ہیں۔

منی:۔ سچ مچ؟

منی:۔ (چٹخارا لیتے ہوئے) تب تو آج ہم لوگوں کی خوب....

حامد:۔ (بات کاٹ کر) اس میں بھی کوئی شک ہے؟

منی:۔ تب کوئی صورت نکالو نا بھیا۔

حامد:۔ صورت تو میں نکال چکا ہوں۔ تم صرف ابا جان کو دیکھ کر آؤ

منی:۔ اچھا میں ابھی آئی

(وہ دوڑ کر دیکھنے چلی جاتی ہے اور پھر تھوڑی دیر

میں دیکھ کر واپس آجاتی ہے۔)

حامد: کہو ابا جان گئے باہر؟

منّی: ابا جان تو باہر چلے گئے ہیں لیکن امی جان جو موجود ہیں۔

حامد: بڑے کمرے میں ہیں امی؟

منّی: ہاں ہاں بڑے کمرے میں چارپائی پر لیٹی ہیں۔

حامد: تب تو بہت مشکل ہے۔

منّی: مٹھائی کس کمرے میں ہے؟

حامد: جس کمرے میں امی جان لیٹی ہیں اسی کے بغل والے کمرے میں....

منّی: تب ہم لوگوں کی کیسے چلے گی بھیا؟

حامد: (گال پر ہاتھ رکھ کر) یہی تو میں سوچ رہا ہوں منّی

منّی: (منھ بنا کر) چوری بھی بہت سخت کام ہے بھیا۔

حامد: ہاں منّی بہت سخت کام ہے اور خاص کر آج کی چوری۔

منّی: (بات کاٹتے ہوئے) میرے منھ میں تو پانی آرہا ہے بھیا!

حامد: پانی روکنے ہی کی ترکیب تو سوچ رہا ہوں منّی

منّی: (تھوکتے ہوئے) تو ذرا جلدی بتائیے نا۔

حامد: (خوش ہو کر) بس صورت نکل آئی منّی

منّی: (جلدی سے) بتائیے نا؟

حامد: چلو ہم دونوں امی کے پاس چل کر بیٹھیں۔

منّی: پھر؟

حامد: ان سے خوب میٹھی میٹھی باتیں کریں۔

منّی: پھر؟

حامد: پھر پھر کیے جائے گی۔ چل میرے ساتھ۔

منّی: اچھا تو چلو۔

(دونوں امی جان کے کمرے میں پہنچ جاتے ہیں اور ان کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

امی: (حامد سے) کیا ہے حامد؟

حامد: جی کچھ نہیں امی۔

امی: تم دونوں کیا کر رہے تھے؟

حامد: ہم دونوں پڑھ رہے تھے امی۔

امی: (حامد سے) تمھارا امتحان کب ہے؟

حامد: جی، امتحان کے بس پندرہ روز رہ گئے ہیں۔

امی: (منّی سے) اور تمھارا؟

منّی: میرے امتحان کو صرف بارہ روز باقی ہیں

امی: خوب جی لگا کر پڑھو تم دونوں۔ پڑھنے لکھنے سے آدمی ہیرا ہوتا ہے۔ علم ایک بہترین دولت ہے جو دل کے صندوق میں محفوظ رہتی ہے۔ جسے کوئی چرا نہیں سکتا۔

حامد: جی امی اسی لیے خوب پڑھتے ہیں ہم دونوں۔

امی: اور سنو!

منّی: کیا امی؟

امی: (منّی سے) اگر تو پاس ہو جائے تو تجھے سونے کا جگنو انعام دوں گی۔

حامد: (جلدی سے) اور مجھ کو؟

امی: اور تجھے ایک قیمتی گھڑی انعام دوں گی۔

حامد: اچھا امی میں ضرور پاس ہوں گا۔

امی: ہاں میرے لال کوشش کرو۔

منّی :۔ میں تو خوب محنت کر رہی ہوں امّی۔

امّی :۔ ہاں بیٹی خوب جی لگا کر پڑھو محنت کا پھل ضرور ملے گا۔

حامد :۔ اچھا امّی اب ہم دونوں ذرا باہر چلیں کھیلنے کے لیے۔

امّی :۔ اچھا جاؤ اب ذرا میں سوتی ہوں۔

حامد :۔ تو کیا آپ کو نیند آ رہی ہے؟

امّی :۔ ہاں مجھے نیند آ رہی ہے اور میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔

حامد :۔ اچھا آپ آرام کریں (منّی سے) چلو منّی ہم دونوں باہر چلیں۔

(وہ دونوں وہاں سے اپنے کمرے میں آجاتے ہیں)

منّی :۔ اب کیا کرنا چاہیے بھیا؟

حامد :۔ اب کرنا یہ چاہیے کہ ہم دونوں مٹھائی والے کمرے میں چلیں اور الماری میں بیٹھ کر پیٹ بھر مٹھائی کھائیں۔

منّی :۔ تو کیا الماری میں سما سکیں گے ہم دونوں؟

حامد :۔ (چڑ کر) تو بالکل عقل کی کھوٹی ہے۔ اری پگلی، بڑی الماری میں مٹھائی ہے نا!

منّی :۔ اچھا تب تو مزے سے ہم دونوں اس میں سما سکیں گے۔

حامد :۔ لیکن دیکھو شور نہ کرنا ورنہ سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

منّی :۔ (خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے) تو بس جلدی چلیے نا بھیا۔

حامد :۔ اری پگلی تو تو ابھی سے شور مچانے لگی۔

منّی :۔ (کان پکڑ کر) اچھا بھیا اب ....

حامد :۔ تو چل جلدی کر۔

(وہ دونوں آہستہ آہستہ مٹھائی والے کمرے میں گھس جاتے ہیں اور الماری کھول کر اطمینان سے اس کے اندر بیٹھ جاتے ہیں اور مٹھائی کھانے لگتے ہیں)

(کسی چیز کے گرنے کی آواز) ٹن - ڈھن!

امّی : (اٹھ کر بیٹھتے ہوئے) کون ہے --!

جھن - جھن - جھناک!

امّی :۔ (کمرے کی طرف آتے ہوئے) کون ہے اس کے اندر؟

ڈھا - ڈھن - ڈھب!

امّی :۔ ارے باپ رے باپ! کوئی ہے اس میں!

(اتنے میں حامد کے ابّا آجاتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں)

ابّا :۔ اے حامد کی امّی!

امّی :۔ کیا ہے؟

ابّا :۔ وہ لوگ تو آنے ہی والے ہیں!

امّی :۔ وہ تو آئیں گے جب آئیں گے۔ پہلے اس کمرے میں جا کر تو دیکھیے۔

ابّا :۔ کیا ہے اس کمرے میں؟

امّی :۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ڈبے وغیرہ گرنے کی آواز آرہی ہے۔

ابّا :۔ چوہے ہوں گے اور کیا!

امّی :۔ نہیں جی کوئی چور معلوم ہوتا ہے۔ جب میں اس کمرے میں داخل ہوئی تو کسی کے سانس لینے کی آواز آرہی تھی۔

ابّا :۔ (تعجب سے) سانس لینے کی آواز آرہی تھی؟

امّی :۔ ہاں ہاں سانس لینے کی آواز آرہی تھی۔

ابّا :۔ اچھا تو چلو آؤ میرے ساتھ۔

(وہ دونوں ایک لاٹھی لے کر مٹھائی والے کمرے

میں پہنچتے ہیں۔)

امی:۔ کونے میں دیکھیے۔

ابا:۔ (ڈر سے لاٹھی ٹیکتے ہوئے) کون ہے بے۔ جلدی بول ورنہ کچومر نکال دوں گا۔

امی:۔ میرا خیال ہے الماری کو کھول کر دیکھا جائے۔

ابا:۔ (الماری کھول کر) اوہو۔ یہ تو بہت بڑے اور موٹے چوہے ہیں

امی:۔ (تعجب سے) ارے، تم لوگوں نے تو کہا تھا کہ باہر کھیلنے کو جا رہے ہیں۔

حامد:۔ (ہاتھ جوڑ کر) امی بھوک لگی تھی۔

امی:۔ تو کھانا کھا لیتے۔

ابا:۔ اچھا نیچے اترو

حامد:۔ (گردن نیچی کر کے) آج ہمیں معاف کر دیجیے ابا حضور اب ہم کبھی چوری نہیں کریں گے۔

ابا:۔ اچھا جاؤ معاف کیا۔ اب آئندہ سے ایسی ذلیل حرکت کبھی نہ کرنا۔

حامد:۔ اب ہم کبھی ایسا کام نہیں کریں گے ابا جان۔

ابا:۔ جاؤ چپ چاپ پڑھو جا کر۔ امتحان نزدیک ہے۔

(دونوں سر نیچا کیے چپکے سے چلے جاتے ہیں۔)

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

جناب طالب قریشی جہلم

تارو

او آسماں کے پیارو — اے ننھے منے تارو
نیچے اُتر کے آؤ — کچھ داستاں سناؤ

بولو تو ماہ پارو
اے ننھے منے تارو

کیوں منہ کو تک رہے ہو — جھلمل چمک رہے ہو
کیوں کر دمک رہے ہو — کیا راز ہے بتاؤ

بولو تو ماہ پارو
اے ننھے منے تارو

آکاش پر جڑے ہو — کیا سوئے تم پڑے ہو
پُرکیف رُت ہے گاؤ — ہر لمحہ مسکراؤ

چندا کے رازدارو
اے ننھے منے تارو

جناب مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

ماجر میں جمعہ کی نماز کے بعد شیخ محمد البطائجی نے
یک واعظ کے لیے چندے کی اپیل کی تو ذرا سی دیر
ں روپیہ پیسہ، کپڑے اس کثرت سے لوگوں نے دے
یے کہ ڈھیر ہوگیا۔ یہاں کے گدڑی بازار میں اندلس کے
ے یہودی سے میری ملاقات ہوئی تھی جس نے اندلس
ے ماجر تک فقط خشکی کے راستے سفر کیا تھا۔

ترکی میں عورتوں کی زندگی بڑی شاندار ہے
یروں کی بیگمات بڑے آرام سے رہتی ہیں۔ امیر سلبطیہ
ں خاتون کو میں نے دیکھا کہ اپنی ذاتی گاڑی میں سوار
ں۔ نیلے رنگ کا ریشم کا پردہ تھا، نشست کی جگہ کھڑکی
ں تھی جس میں بیٹھی ہوئی جھانکتی چلی جاتی تھی۔ سامنے چار
ن چھوکریاں زرق برق لباس پہنے بیٹھی تھیں۔ پیچھے
ڑیوں کا جلوس تھا جس میں خوبصورت خادمائیں سوار تھیں
ں کے قریب پہنچیں تو سب کی سب گاڑیوں سے اتر پڑیں۔

یہ سب خادمائیں ۳۰ سے کم نہ تھیں۔ ان کے کپڑوں
کھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ اور دامن سمیٹ کر نازو انداز سے
ا کر چل رہی تھیں جس سے ان کی شان دوبالا ہوگئی تھی
ن امیر کے پاس پہنچی تو وہ کھڑا ہوگیا۔ سلام کیا اور پاس
بٹھایا۔ پھر پیالے میں گھوڑی کا دودھ آیا جسے خاتون نے
دوزانو ہو کر امیر کی خدمت میں پیش کیا۔

سوداگروں کی عورتیں بھی گاڑیوں میں نکلتی ہیں
ان کے سامنے بھی خادمائیں بیٹھتی ہیں۔ یہ بھی دامن اٹھا کر
اٹھلا کر چلتی ہیں۔ ان عورتوں کے سر پر جواہرات کی مرصع
ٹوپیاں ہوتی ہیں جن پر مور کے پر لہراتے ہیں۔ کبھی کبھی ان
کے مرد بھی ساتھ ہوتے ہیں جن کا معمولی لباس دیکھ کر شبہ
ہونے لگتا ہے کہ یہ شوہر نہیں ہیں غلام یا خادم ہیں۔

یہاں کا بادشاہ محمد ازبک خان ہے۔ ترکی زبان
میں خان سلطان کو کہتے ہیں۔ سلطان اوزبک اعلیٰ مرتبہ
رکھتا ہے۔ بڑے بڑے شہر اس کے زیر حکومت ہیں۔ دنیا کے
مشہور بادشاہوں مصر، عراق، ہندوستان، چین میں اس
کا شمار ہے۔ اس کی حکومت اور شان و شکوہ کا حال لکھا
جائے تو پوری ایک کتاب بن جائے۔ پہنچنے کے دوسرے
دن عصر کی نماز کے بعد سلطان کی خدمت میں باریابی
ہوئی۔ مشائخ، قاضی، فقیہہ اور معززین شہر حاضر تھے۔ رمضان
کا مہینہ تھا۔ بعدہ سلطان کے ساتھ افطار ہوا۔

سلطان کی بیگمات میں سب سے زیادہ بڑی بیگم

اعزاز ہے۔ بادشاہ کے دو بیٹے جان بک اور تمن بک اسی بیگم کی اولاد ہیں۔ بادشاہ کی زیادہ راتیں اسی کے محل میں گزرتی ہیں۔

بادشاہ اس کی تعظیم و تکریم کرتا ہے اس لیے تمام اہلِ دولت بھی ادب اور عزت کرتے ہیں اس کا نام طیط غلی ہے اور تمام خواتین میں سب سے زیادہ کنجوس ہے۔ اس کے پاس رہنے میں ہر رات بادشاہ یہ محسوس کرتا ہے کہ نئی دلہن کے پاس رات گزار رہا ہے۔ جب میں چین گیا تھا تو وہاں کے لوگوں نے بتایا تھا کہ یہاں کچھ عورتیں ایسی ہیں کہ ہر رات میں ان کے پاس رہنا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے نئی دلہن کے پاس رات گزر رہی ہے۔

سلطان کی ملاقات کے بعد دوسرے دن میں بڑی بیگم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بیگم کے دائیں بائیں دس دس عورتیں کھڑی تھیں اور پچاس خوبصورت لڑکیاں سامنے تھیں۔ میرے ساتھ مصر کا ایک خوش الحان قاری تھا قاری نے تلاوت کی تو بیگم خوش ہوئی اور گھوڑی کا دودھ منگا کر پیالے میں اپنے ہاتھ سے مجھے دیا۔ یہ بڑی عزت کی بات تھی۔ میں نے اس کی خدمت میں حاضری دینی اس لیے ضروری سمجھی کہ بادشاہ اسے زیادہ محبوب رکھتا ہے۔ پھر دوسری خواتین کے حضور میں جانا بھی ضروری ہو گیا۔

دوسری خاتون کا نام کبک خاتون ہے۔ ہم پہنچے تو قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ گھوڑی کا دودھ اس نے بھی پیش کیا

تیسری خاتون کا نام بیلون ہے۔ یہ سلطان تکفور کی بیٹی ہے۔ ایک مرصع تخت پر بیٹھی تھی جس کے پائے چاندی کے تھے۔ ایک سو چھوکریاں رومی ترکی سامنے تھیں۔ اس نے ہماری بڑی خاطر کی۔ کھانا کھلایا۔ رخصت ہوتے تو کہنے لگی جب تک آپ کا قیام ہے آتے رہیے اور جو ضرورت ہو بے تکلف کہہ دیجیے۔ جاتے وقت بہت سا کھانا، بکرے، گھی اور عمدہ کپڑے اعلیٰ درجے کے تین گھوڑے اور دس معمولی درجے کے گھوڑے ساتھ کر دیے۔

چوتھی خاتون کا نام اردوجہ ہے اور یہ بھی بہت شریف خاتون ہے۔

جان بک اور تمن بک

یہ دونوں لڑکے بادشاہ کے ولی عہد ہیں۔ تمن جسم کو کہتے ہیں اور بک کے معنی امیر کے ہیں۔ تمن بک بڑا خوبصورت لڑکا ہے۔ عربی زبان میں اسے امیر الجسد اور جان بک کو امیر الروح کہنا چاہیے۔

شہر بلغار

بڑی شہرت تھی کہ شہر بلغار کی دن اور رات چھوٹی ہوتی ہے۔ میں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ بلغار تک کسی کو میرے ساتھ کر دیا جائے۔ بادشاہ نے میری درخواست منظور کر لی اور مجھے بلغار بھیج دیا۔

بلغار میں گرمی سردی دونوں موسموں میں برفباری ہوتی ہے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ افطار کا وقت ہوا تو ہم افطار کر رہے تھے کہ اتنے میں عشاء کی نماز کا وقت ہوا اور اذان کی آواز آئی۔ عشاء کی اذان سے فارغ ہوئے کچھ دیر گزری کہ صبح کی اذان ہوئی۔ یہاں کی رات کم چھوٹی

ہوتی ہے اور دن بھی چھوٹا ہے۔

سرزمینِ ظلمات

بلغار میں ہمارا قیام تین دن رہا۔ یہاں سے سرزمینِ ظلمات چالیس دن کے راستے پر ہے جس کے عجیب عجیب قصے سننے میں آئے ہیں۔ بڑی دشوار گزار منزل ہے فقط چھوٹی چھوٹی گاڑیاں جن میں کتے جوڑے جاتے ہیں اس راستے پر جا سکتے ہیں۔ اس راستے پر جب تک کھانے پینے کا پورا سامان نہ ہو سفر نہیں کیا جا سکتا۔ سوختہ آٹا، بکرے، بھیڑیں، نمک، مصالحہ، گھی سب کچھ ساتھ رہنا چاہیے۔ کتے ان راستوں کی رہبری کرتے ہیں یہ کتے خاص نسل کے ہیں جن کی قیمت ڈھائی تین ہزار ہوتی ہے انھیں سدھایا جاتا ہے۔ جب تک یہ کتے ایک دو مرتبہ اس سرزمین پر سفر نہیں کر لیتے ان سے کام نہیں لیا جاتا۔ اس پورے راستے پر نہ کوئی درخت ہے، نہ پہاڑ ہے نہ آبادیاں ہیں۔ جہاں تک نگاہ جاتی ہے برف ہی برف دکھائی دیتی ہے جس پر نہ آدمی قدم جما سکتے ہیں، نہ گھوڑے اور بیل چل سکتے ہیں۔ فقط سدھے ہوئے کتے چلتے ہیں۔ یہ کتے اپنے پنجے جما کر اور ناخون گاڑ کر چلتے ہیں۔ ان کی گردن میں گاڑی پھنسا دی جاتی ہے اور یہ پنجے جما کر چلتے ہیں۔

سب سے آگے کا کتا راستے کا شناسا ہوتا ہے اور تین کتے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ آگے والا کتا ٹھہر جاتا ہے تو سب ٹھہر جاتے ہیں۔ مالک اس کتے کو نہ جھڑک سکتے ہیں نہ مار سکتے ہیں۔ کھانے کا وقت آتا ہے تو پہلے کتوں کو کھلاتے ہیں اور ہر وقت چمکارتے اور خوشامد کرتے رہتے ہیں۔ اگر کتا ناراض ہو جاتا ہے تو گاڑی چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے اور مسافر کے برباد ہو جانے کے سوا کوئی صورت نہیں ہوتی۔ چالیس دن کے بعد سرزمین ظلمات آ جاتی ہے اور سوداگر لوگ اپنی بڑی بڑی رقمیں چھوڑ کر ٹھہرنے کی جگہ چلے جاتے ہیں۔ دوسرے دن جہاں رقم چھوڑ کر جاتے ہیں سمور، سنجاب اور قاقم کا ڈھیر لگا دیکھتے ہیں۔ مال رقم کے لحاظ سے ٹھیک اور مناسب ہوتا ہے تو اٹھا لیتے ہیں ورنہ جوں کا توں چھوڑ کر اپنے ٹھکانے پر چلے جاتے ہیں دوسرے دن پھر آتے ہیں۔ یا تو مال حسبِ مراد پاتے ہیں یا رقم واپس مل جاتی ہے۔

یہ عجیب کاروبار ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے اور سوداگروں کو یہ پتہ نہیں لگتا کہ رقم کون لے جاتا ہے اور کون مال رکھ جاتا ہے انسان یا جنات۔

ہندوستان میں قاقم کے چوغہ کی قیمت دو ڈھائی ہزار سے کم نہیں ہوتی۔ سمور اس سے گھٹیا ہوتا ہے۔ ان کھالوں میں کیڑا نہیں لگتا چین کے امیر لوگ سمور کی بڑی قدر کرتے ہیں اور من مانی قیمت ادا کر دیتے ہیں۔

جناب ل۔ ایم۔ شاہد

چرواہے کی عقلمندی

آج سے سینکڑوں برس پہلے کی بات ہے کہ انگلینڈ میں ایک بادشاہ تھا اس کا نام جان تھا۔ وہ ظالم تھا، لالچی تھا، حاسد تھا۔ اُس کی ہمیشہ یہی خواہش رہتی تھی کہ وہ دنیا کا سب سے امیر آدمی بن جائے۔ وہ کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی دوسرا اس سے زیادہ مشہور اور مقبول ہو۔

ایک دن اس نے سُنا کہ اس کا ایک سردار روز بروز ترقی کرتا جا رہا ہے اور مشہور ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ سردار کی نیکی کے گن گاتے رہتے تھے۔

اُس نے لوگوں سے یہ بھی سُنا کہ سردار کے پاس بہت سی دولت ہے۔ وہ ایک عالی شان محل میں رہتا ہے۔ یہ سُن کر بادشاہ کو بہت غصہ آیا۔ اُس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ فوراً اس سردار کو اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔

دوسرے دن سردار کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ تم مجھ سے بھی زیادہ دولت مند ہو اور تمھارا محل میرے محل سے بھی بڑا ہے؟"

"حضور ایسی بات نہیں ہے۔ میں کوئی امیر آدمی نہیں ہوں اور سبھی جانتے ہیں کہ میں کسی کی چیز پر اپنا حق نہیں جماتا۔"

"تو کیا میں دوسروں کی جائیداد پر قبضہ کر لیتا ہوں، کیا میں بے رحم ہوں؟" بادشاہ کو غصہ آ گیا۔ "تم نے میری بے عزتی کی ہے۔ میں تمھیں موت کی سزا دیتا ہوں!"

سارے دربار میں سناٹا چھا گیا۔ تمام درباریوں کو اس نیک آدمی کے مارے جانے کا افسوس تھا۔

"حضور میرا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔" سردار نے التجا کی۔

"اچھی بات ہے" بادشاہ نے کہا "اگر تم میرے تین سوالوں کا درست جواب دو گے تو تمھیں معاف کر دوں گا۔"

مرتا کیا نہ کرتا۔ سردار نے حامی بھر لی۔

بادشاہ نے پہلا سوال کیا: "بتاؤ میری قیمت کیا ہے؟" دوسرا سوال تھا "اگر میں چاہوں تو کتنے وقت میں گھوڑے پر سوار ہو کر دنیا کا چکر لگا سکتا ہوں؟" اور تیسری بات یہ کہ "میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں؟"

سردار کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ اُسے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیا جائے۔ بادشاہ نے تین ہفتوں کا وقت دے دیا۔

سردار شہر کے بڑے بڑے دانشمندوں کے پاس گیا لیکن کسی نے ٹھیک ٹھیک جواب نہیں دیا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے، سردار کی موت اس کے قریب آتی جا رہی تھی۔

آخر میں کوئی امید نہ رہی اور اُسے یقین آ گیا کہ اب وہ بچ نہیں سکے گا تو آخری بار اپنی بیوی اور بچوں سے ملنے اپنی ریاست چلا گیا۔

جب وہ اپنی ریاست کی سرحد میں داخل ہوا تو اُسے

ایک بوڑھے چرواہے نے سلام کیا۔ سردار نے اس کے سلام کا
جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ بوڑھا چرواہا چند لمحوں تک کچھ
سوچتا رہا پھر بھاگ کر سردار کے پاس پہنچا اور بولا:

"حضور آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟"

"کیا بتاؤں بڑے میاں۔ میری زندگی کے دن بس
گنتی کے ہیں۔"

اس بوڑھے چرواہے کے اصرار پر سردار نے پوری
کہانی سنا ڈالی۔ کہانی سن کر تھوڑی دیر تک چرواہا چپ رہا
پھر بولا:

"آپ فکر نہ کریں۔ میں ان سوالوں کا جواب دوں گا۔"
سردار کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا لیکن جب چرواہے
نے اسے بہت مجبور کیا تو اس نے اپنے کپڑے پہنا کر گھوڑے
پر بٹھا دیا اور اس کے ہمراہ اپنے دو ملازم کر دیے۔

وقت پر وہ چرواہا سردار کے کپڑے پہنے ہوئے
دربار میں حاضر ہوا۔ اپنے چہرے کو تھوڑا چھپاتے ہوئے
چرواہے نے جھک کر سلام کیا۔ بادشاہ نے سخت لہجے میں
کہا — "کیا میرے سوالوں کا جواب لائے ہو؟"

"لایا ہوں حضور —"

"تو بتاؤ کہ میری قیمت کیا ہے؟"

"حضور جیسے کہ ہمارے دیس میں پونڈ سب سے زیادہ
قیمتی چیز ہے اسی طرح آپ سب سے بلند آدمی ہیں اور چونکہ
پونڈ کی قیمت ۲۰ شلنگ ہوتی ہے اس لیے جناب کی قیمت
بھی اسی کے مطابق ہونی چاہیے۔"

بادشاہ اتنا مناسب جواب سن کر حیران رہ گیا۔ اس
نے دوسرا سوال کیا: "بتاؤ اگر میں چاہوں تو گھوڑے پر سوار ہو کر
کتنی دیر میں دنیا کا چکر لگا سکتا ہوں؟"

"حضور اگر آپ سورج کے نکلتے ہی گھوڑے پر سوار
ہو جائیں اور سورج کی رفتار کے ساتھ بڑھتے جائیں، کہیں نہ
رکیں تو ۲۴ گھنٹوں میں ساری دنیا کے گرد چکر لگا کر لوٹ آئیں گے۔"

بات بالکل ٹھیک تھی۔ بادشاہ کو بات جچ بھی گئی۔

"اچھی بات۔ ہے میرے سب سے مشکل اور آخری سوال
کا جواب دو کہ میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں؟"

"حضور یہ تو بہت ہی آسان سوال ہے!"

"کیسے؟"

"حضور آپ اس وقت یہ سوچ رہے ہیں کہ میں وہی
سردار ہوں جسے آپ نے موت کی سزا دی ہے۔"

"تو تم کون ہو؟" بادشاہ نے بے چین ہو کر پوچھا۔

چرواہے نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا اور
بادشاہ کے قدموں پر جھک گیا "حضور میں تو سردار کا نوکر ہوں۔
میں ایک معمولی چرواہا ہوں۔"

چونکہ بادشاہ اس کے جواب سے بہت خوش ہوا تھا
اس لیے اس نے چرواہے سے کچھ مانگنے کو کہا۔

"حضور اگر دینا ہی ہے تو میرے مالک کو زندگی بخش
دیں مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے۔"

بادشاہ چرواہے کی اس فراخدلی سے بہت متاثر ہوا
اسے بہت ساری دولت دی اور سردار کو بھی معاف کر دیا

(ہندی سے)

ایک خطرناک سمندری مہم

معمولی کشتی پر آٹھ سو میل سمندری سفر

کلکتہ سے پورٹ بلیر (انڈمان) تک

یہ ابھی ابھی پچھلی فروری کی تو بات ہے دیس کے دو جوان مرد، بال باز، مہم جو، ایک معمولی سی کشتی میں چپوؤں سے چلنے والی کشتی میں، سمندری سفر پہ نکلے۔ سفر بھی دس بیس میل کا نہیں، سو پچاس میل کا نہیں، پورے آٹھ سو میل کا! یہ کشتی کُل چھ میٹر لمبی تھی اور اس کی تہہ بالکل سپاٹ تھی۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ سمندر میں مدّو جزر (یا اتار چڑھاؤ) آتا ہے، طوفان بھی آتے ہیں۔ ایسے ہیبت ناک طوفان کہ اچھے خاصے جہاز پریشانی محسوس کرتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ سمندر کو غصہ آجاتا ہے اور سمندر میاں ایسے غضب ناک، ایسے تن پھن ہو جاتے ہیں کہ پانی کی لہریں جیسے آسمان سے جالگتی ہیں۔ پھر سمندر کی تہہ میں زلزلے بھی آتے رہتے ہیں۔

اب آپ خود سوچیے کہ ایسے سفر میں اس بیچاری چھ میٹر کی کشتی کی کیا حیثیت، کیا اوقات! مگر صاحب ان من چلوں نے یہی طے کیا تھا کہ آٹھ سو میل کا یہ خطرناک سفر اسی کشتی میں کیا جائے گا۔ اور بھئی یہی من چلاپن تو زندگی کی جان ہے۔

ان میں سے ایک صاحب سمندری فوج کے لیفٹننٹ ڈِلوک تھے دوسرے صاحب پناکی چٹرجی ریسرچ اسکالر ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی میں سائنس کے کسی موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری کر رہے ہیں۔

یہ دونوں نوجوان پہلی فروری ۱۹۶۹ء کو دوپہر کے وقت اسی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر کلکتہ سے چل پڑے تین دن تک تو یہ دریائے ہگلی میں چلتے رہے۔ تین دن بعد خلیج بنگال میں داخل ہوئے۔ کوئی سات دن تک مختلف سمندری جہاز انھیں راستے میں ملتے رہے۔ ان جہازوں کے کپتانوں نے ان کی خوب ہمت بڑھائی، خوب خاطر تواضع کی۔

اور پھر؟ پھر اپنی منزل تک پہنچنے کی دُھن میں انھوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنی کشتی لمبے چوڑے سمندر کے گویا حوالے کر دی۔ اور یہیں سے قدرت کی طرف سے آزمائشیں بھی شروع ہوگئیں۔ پورے ایک ہفتے انھیں سمندر کی خطرناک موجوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ پوری طاقت سے آگے بڑھتے اور غضب ناک موجیں انھیں پیچھے دھکیل دیتیں۔ اسی جگہ پہنچا دیتیں جہاں

سے چلے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے سمندر کے دیوتا کو ان کی یہ ہمت و جرأت ایک آنکھ نہیں بھائی ہے۔

مگر دھن کے پکے نوجوانوں کے حوصلے ذرا بھی پست نہ ہوئے۔ انھوں نے ذرا بھی ہار نہ مانی۔ صرف اتنا ہی نہیں کبھی کبھی سمندری تہہ کے زلزلے بھی انھیں حیران پریشان کر دیتے تھے، کبھی شارک مچھلیاں ان کا پیچھا کرتی تھیں، کبھی سمندری مگرمچھ انھیں ہڑپ کرنا اور تر نوالہ بنانا چاہتے تھے۔ مگر یہ تھے کہ ان سب مصیبتوں کا مقابلہ کرتے برابر آگے ہی بڑھے چلے جا رہے تھے

لیفٹننٹ ڈیوک اور بنا کی چٹرجی کا بیان ہے کہ سفر کے اس زمانے میں انھوں نے کبھی افق کو نہیں دیکھا۔ چاروں طرف نیلگوں یا نیلا نیلا پانی ہی نظر آتا تھا۔ اس سے کبھی کبھی تنہائی کا عجیب احساس پیدا ہوتا تھا۔ طرح طرح کے وہم، طرح طرح کے وسوسے، طرح طرح کے خدشے ذہن میں جنم لیتے تھے۔ کبھی ایسا لگتا تھا جیسے بڑے بڑے مگرمچھ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں، کبھی یہ محسوس ہوتا کہ وھیل مچھلیاں ہمارا پیچھا کر رہی ہیں۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ خون میں نہلائے ہوئے انسان ہوائی جہازوں سے ہم پر گر پڑے ہیں۔

غرض کوئی ۳۰ دن تک ان کی یہ ننھی منی کشتی موجوں کے تھپیڑے کھاتی برابر آگے بڑھتی رہی پیچھے ہٹ ہٹ کر آگے بڑھتی رہی۔ فروری کے پورے مہینے دیس کے ان من چلے جوانوں کی اس خطرناک مہم کا چرچا رہا۔ اس زمانے میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کچھ دن ان کی کوئی خیر خبر نہ ملی اور اخباروں میں بڑی پریشانی کی خبریں شایع ہوئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ [illegible]

کے لیے اپنی گود میں سلا دیا۔ اور پھر یہ خوش خبری سننے میں آئی تھی کہ نہیں نہیں، باوجود سخت پریشانیوں کے، باوجود سخت قدرتی رکاوٹوں کے ان کی کشتی برابر آگے بڑھ رہی ہے۔

آخر ۲ر مارچ کو ان کو اپنی منزل نظر آئی اور جب جزیرہ انڈمان کا پورٹ بلیر کل دو میل دور رہ گیا تو ان پر ایسی تھکن سوار ہوئی کہ کچھ نہ پوچھیے۔ بڑی مشکل سے جیسے تیسے کر کے انھوں نے یہ دو میل طے کیے۔ پورٹ پر پہنچ کر جزیرہ کے لوگوں نے ہزاروں کی تعداد میں ان کا خیر مقدم کیا اور پھر؟ ہندوستان بلکہ دنیا کے تمام اخباروں میں ان کی کامیابی کی خبریں شایع ہوئیں۔ بنگال میں بلکہ دیس کے ہر حصے میں جہاں جہاں بھی یہ خوش نصیب پہنچے خوب شاندار سواگت ہوا۔

اور بھئی سچ پوچھو تو ان کا یہ کارنامہ تھا بھی اسی قابل۔ ہمیں اور آپ کو شاید اس کا اندازہ نہ ہو لیکن جو لوگ سمندری سفر کرتے رہتے ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ایک معمولی سی کشتی میں آٹھ سو میل کا سفر کیسی خطرناک جرأت تھی۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ ایک ہزار سال میں اپنی قسم کا یہ پہلا کارنامہ تھا۔

جامعہ کے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کی تعلیمی و تفریحی سرگرمیاں

جامعہ کے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں جوں جوں سالانہ امتحان قریب آتے جاتے ہیں بچے اپنے پڑھنے لکھنے کے شغل پر سب سے زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ تاہم بیچ بیچ میں ایسے پروگرام بھی آجاتے ہیں جو تفریحی اور بہت کچھ تعلیمی اہمیت رکھتے ہیں مثلاً سالانہ اسپورٹس، کھلی ہوا کا مدرسہ، ایک دن کا مدرسہ وغیرہ

ثانوی مدرسہ میں ایک دن کا مدرسہ ہمیشہ کی طرح بہت اہتمام، بہت دھوم دھام سے منایا گیا۔ یہ دن لگ بھگ پندرہ سال سے منایا جا رہا ہے۔ پورا اسکول اس دن لڑکوں کے انتظام میں آجاتا ہے اور مدرسے کا سارا اسٹاف کیا اُستاد کیا کلرک سب کہیں دور پک نک پہ چلے جاتے ہیں۔

اب کے اس دن کا افتتاح محترم انس یوسف یاسین سعودی عرب کے سفیر نے کیا۔ انجمن طلبہ کے صدر نے پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔ اپنے دوسرے عہدہ داروں کو ذمّہ داری کے دوسرے کام سونپے کہ انتظامی کاموں کو خوش اسلوبی سے چلائیں۔ نسبتہً سمجھ دار لڑکوں اور لڑکیوں کو پڑھانے کا کام دیا گیا۔ کچھ کلرکوں کی کرسیوں پر بیٹھے کچھ بیروں، چپراسیوں، بھشتیوں بھنگیوں کے کاموں پر جٹ گئے۔ چھوٹے بچے اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ خوب مل جل کر کام کرتے ہیں۔ جس کے ذمّہ جو کام کیا جائے، جو خدمت سپرد کی جائے اُسے بہت اچھے انداز میں انجام دینے کی کوشش کرتا ہے۔

ان سب کام کرنے والوں کے لیے ایک آزمائش اور بھی ہوتی ہے۔ اس دن جامعہ کے دوسرے اداروں کے طالبعلموں اور استادوں کا تانتا لگ جاتا ہے یہ سب ایک دن کا مدرسہ دیکھنے آتے ہیں اور پرنسپل صاحب اور دوسرے ذمّہ دار کارکنوں سے طرح طرح کے سوال کرتے ہیں اور یہ سب بڑی خندہ پیشانی سے مُسکرا مُسکرا کر انھیں جواب دیتے ہیں۔ ذرا جو بددل ہوتے ہوں یا اکتاتے ہوں۔ جو سچ پوچھو تو جامعہ نے ان لڑکوں میں ذمّہ داری کا احساس پیدا کرنے کا، اپنے اوپر بھروسہ کرنے کا یا خود اعتمادی کا بہت اچھا وسیلہ تلاش کیا ہے۔

شام کو مختلف قسم کے اسپورٹس ہوتے ہیں اور رات کو کوئی مفید تعلیمی فلم دکھائی جاتی ہے اور یوں یہ ایک دن کی حکومت ختم ہو جاتی ہے۔

مدرسہ ابتدائی کا کھلی ہوا کا مدرسہ

کئی سال پہلے مدرسہ ثانوی کے اور مدرسہ ابتدائی کے بچے جامعہ سے باہر جاکر کم سے کم ایک ہفتے تک کیمپ لگاتے تھے، خیموں میں زندگی گزارتے تھے، نصابی تعلیم کے علاوہ آس پاس کی تاریخی عمارتوں اور دوسری اہم چیزوں کا مشاہدہ کرتے تھے۔ کھلی ہوا میں رہنے سے

تندرستی پر، دماغ پر، خیالات پر خوشگوار اثر پڑتا تھا۔

پچھلے سال سے مدرسہ ابتدائی نے اس اچھی رسم کو پھر سے زندہ کیا ہے۔ گذشتہ سال کے پیام تعلیم میں اس کا حال آچکا ہے۔

اس سال کھلی ہوا کے مدرسہ کے لیے جامعہ سے ۱۲-۱۳ میل دور مہرولی کا علاقہ پسند کیا گیا۔ جہاز محل کے سامنے مشہور تاریخی تالاب "شمسی تالاب" سے بالکل قریب ایک باغ (اندھیری باغ) میں (۱۸ مارچ ۱۹۶۹ء کو) ترتیب سے خیمے لگا دیے گئے۔ تیسری جماعت سے چھٹی جماعت تک کے بچوں نے دس دن ان خیموں میں گزارے۔ بہت ہنسی خوشی گزارے۔

مہرولی یا قطب صاحب تاریخی مقامات اور تاریخی کھنڈروں کا خزانہ ہے۔ ان بچوں نے جی بھر کے اس علاقہ کی سیر کی اور اپنے استادوں کی مدد سے تاریخی معلومات حاصل کیں۔ ایک اہم تاریخی جگہ تو ان کے خیموں کے بالکل قریب ہی تھی۔ یہ اب سے سات سو برس پہلے کی مسجد تھی جہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ عبادت فرماتے تھے۔

روزانہ رات کو کیمپ فائر بھی ہوتا تھا۔ بچے بڑی محنت سے تیار کی ہوئی نقلوں کا مظاہرہ کرتے خوب مزہ آتا تھا۔

آخری دن (۲۶ مارچ ۱۹۶۹ء) مدرسہ ابتدائی کے نگران صاحب نے جامعہ والوں کو مہرولی میں بچوں کا آخری تقریب دیکھنے کی دعوت دی۔ اس دن تقریباً پوری جامعہ مہرولی پہنچ گئی۔ مختلف درجوں کے بچوں نے اپنے اپنے خیموں کے آگے کی زمین کو خوب سجا رکھا تھا۔ یوں سمجھیے کہ ان دس دنوں میں انھوں نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کو نمائش کے لیے پیش کر دیا تھا۔ جناب شیخ الجامعہ صاحب نے اور دوسرے بزرگوں نے باقاعدہ ان سب کا معائنہ کیا۔ انھیں نمبر دیے گئے اور ان نمبروں پر انھیں انعام ملا۔

بعد میں شیخ الجامعہ صاحب نے جلسے کا افتتاح کیا۔ پھر کیمپ فائر کی چنی ہوئی نقلیں دکھائی گئیں آخر میں انعام تقسیم ہوئے اور اس طرح کھلی ہوا کے مدرسے کی آخری رسم بخیر و خوبی ادا ہوئی۔

مدرسہ ابتدائی کا ایک دن کا مدرسہ

یہ اب کے ۱۲ اپریل ۱۹۶۹ء کو منایا گیا۔ اس کا انداز بھی قریب قریب مدرسہ ثانوی جیسا ہے۔ فرق یہ ہے کہ رات کو فلم نہیں دکھائی جاتی۔ کیمپ فائر کی نقلیں ہوتی ہیں۔ اس مرتبہ بھی بچوں نے اپنے اپنے بورڈنگ بہت اچھی طرح سجائے تھے اور بڑی جدتیں پیدا کی تھیں۔ کیمپ فائر کی نقلیں بھی بڑے مزے کی رہیں۔ ان نقلوں کے بعد بچوں کو انعامات بھی تقسیم کیے گئے۔

پنچ تنتر کی کہانیاں

سب بیوقوف ہیں!

گرم مزاج کوے نے تب چڑیا کی یہ کہانی سنائی۔

ایک پہاڑ پر پیڑ کی بہت اونچی شاخ پر ایک چڑیا رہا کرتی تھی۔ وہ سونے کی بیٹ کیا کرتی تھی۔ ایک دن ایک شکاری اس راستے سے گزر رہا تھا۔ بھلا شکاری کو یہ کیا پتا کہ اس پیڑ پر رہنے والی چڑیا سونے کی بیٹ کیا کرتی ہے۔ مگر اس بے وقوف چڑیا نے شکاری کے سامنے ہی سونے کی بیٹ کر دی۔ پھر کیا تھا، شکاری نے فوراً ہی پیڑ کے اوپر اپنا جال پھیلا دیا اور سونے کی بیٹ کرنے والی وہ چڑیا اس کے جال میں پھنس گئی۔

شکاری اس چڑیا کو اپنے گھر لایا اور اُسے ایک اچھے سے پنجرے میں بند کر دیا۔ ابھی ایک دن بھی نہیں گزرا تھا کہ اُسے یہ فکر ستانے لگی کہ کہیں راجہ کو اس کا پتہ نہ ہو جائے۔ راجہ سے اگر کسی نے جا کر کہہ دیا تو یہ چڑیا تو ہاتھ سے جائے گی ہی، مفت میں سزا بھی بھگتنی پڑے گی۔ اس ڈر سے بیوقوف شکاری خود ہی وہ سونے کی چڑیا لے کر راجہ کے دربار میں حاضر ہو گیا۔

راجہ نے حکم دیا کہ اس چڑیا کو پوری حفاظت کے ساتھ رکھا جائے مگر راجہ کے وزیروں نے کہا، یہ بھی خوب رہی۔ ایک بے وقوف شکاری کی بات پر اس طرح یقین کر کے آپ دوسروں کو ہنسی اڑانے کا موقع دے رہے ہیں۔ بھلا چڑیا بھی کہیں سونے کی بیٹ کر سکتی ہے؟ راجہ نے وزیروں کی بات سُننے کے بعد اس چڑیا کو رہا کرا دیا۔

جال سے نکلتے نکلتے وہ چڑیا اس کی فصیل پر سونے کی بیٹ کرتی گئی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ گئی کہ پہلی بیوقوفی تو میری تھی کہ میں نے شکاری کی موجودگی میں سونے کی بیٹ کی۔ دوسری بے وقوفی شکاری نے کی جو مجھے راجہ کے دربار میں لے کر حاضر ہو گیا مگر سب سے زیادہ بے وقوف تو راجہ اور اس کے درباری نکلے جنھوں نے ہاتھ آئی ہوئی سونے کی چڑیا چھوڑ دی۔

گرم مزاج سے یہ کہانی سننے کے بعد بھی الوشاہ کے وزیروں نے اپنے احمقانہ رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ وہ پہلے ہی کی طرح کوے شاہ کے خاص وزیر کو انڈا گوشت وغیرہ کھلا کھلا کر موٹا تازہ بناتے رہے۔

میاں گرم مزاج نے جب یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو ایک دن انھوں نے اپنے ہم خیال الوؤں کو جمع کر کے

کہا کہ اب ہمیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ ہم کسی دوسرے پہاڑ کی کھوہ میں اپنے لیے جگہ بنالیں گے۔ ہمیں آنے والے خطرے کا احساس کر کے عقلمند گیدڑ کی طرح اپنی گپھا چھوڑ دینی چاہیے۔

اس کے ساتھیوں نے پوچھا: یہ گیدڑ کی کیا کہانی ہے؟ تب گرم مزاج الو وزیر نے بولنے والے غار کی یہ کہانی سنائی:

غار کیوں بولا؟

ایک جنگل میں ایک شیر رہا کرتا تھا۔ ایک دن وہ جنگل میں بہت مارا مارا پھرا مگر کوئی شکار ہاتھ نہ آیا بھوک اور پیاس کے مارے اس کا برا حال تھا۔ شام ہونے پر اُسے ایک غار دکھائی دیا۔ وہ غار کے اندر جاکر چھپ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اس غار میں جو بھی جانور رہتا ہوگا وہ رات کو اپنے گھر واپس ضرور آئے گا۔ آج رات میں اس کو ہی مار کر اپنی بھوک مٹاؤں گا۔

اس غار میں ایک گیدڑ رہتا تھا۔ شام ہونے پر وہ گیدڑ لوٹ کر آیا۔ اس نے شیر کے پنجوں کے نشان سے سمجھ لیا کہ غار کے اندر کوئی شیر آگیا ہے۔ شیر کے پنجوں کے واپسی کے نشان نہیں تھے اس لیے اُسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ غار کے اندر شیر موجود ہے۔ مگر اس نے سوچا کہ اس بات کی تصدیق کیسے کی جائے۔ اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ غار کے اوپر بیٹھ کر وہ جھوٹ موٹ کسی کو پکارنے لگا۔ "دوست میں آگیا ہوں۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جب میں آؤں گا تو تم مجھ سے باتیں کروگے مگر اب چپ کیوں ہو؟"

گیدڑ کی آواز سن کر شیر نے سوچا کہ شاید یہ غار گیدڑ کے آنے پر خود بولتا ہے اور گیدڑ سے بات چیت کرتا ہے جو آج میرے خوف سے چپ ہے۔ اس کے چپ رہنے سے گیدڑ کو میرے یہاں موجود ہونے کا شبہ ہو جائے گا۔ وہ خود ہی گیدڑ کے جواب میں بول پڑا! شیر کی آواز سے غار گونج اٹھا۔ گیدڑ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اپنی بے وقوفی پر شیر بہت پچھتایا اس نے یہ نہ سوچا کہ غار کبھی بول نہیں سکتا ہے۔

گرم مزاج نے یہ کہانی سنانے کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا کہ بے وقوفوں کی اس جماعت میں رہنا آپ اپنی آفت مول لینا ہے۔ گرم مزاج اور اس کے ہم خیال الوؤں کا گروہ اسی رات وہاں سے دور چلا گیا۔ الو شاہ کے تمام وزیروں میں گرم مزاج ہی تنہا دور اندیش اور عقلمند تھا۔

گرم مزاج وزیر کے چلے جانے کے بعد کوے شاہ کے وزیر خاص نے الوؤں کی تباہی کا نقشہ بنانا شروع کیا۔ الوؤں کو دن میں تو سجھائی دیتا نہیں ہے۔ دن میں کوا چھوٹی چھوٹی لکڑیاں چن کر پہاڑ پر بنے الوؤں کے قلعہ کے چاروں طرف اکٹھی کرنے لگا۔ جب بہت ساری لکڑیاں اکٹھی ہوگئیں تو ایک روز دن کی روشنی میں جب کہ الوؤں کو کچھ سوجھتا نہیں ہے وہ اڑ کر اپنے آقا کوے شاہ کے پاس گیا اور اس سے بتایا کہ اس نے الوؤں کی تباہی کے لیے کیا کیا کام مکمل کر لیا ہے۔ کوے شاہ سے کہا کہ بس

اپنی چونچ میں جلتی ہوئی لکڑی لاکر الوؤں کے قلعے کے پاس کہیں گرادو۔ قلعہ جل کر راکھ ہو جائے گا۔

کوّے شاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اُسے بٹھا کر اور بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا مگر خاص وزیر نے اُسے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ یہاں میرا زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر کسی دشمن نے الوؤں کو میرے یہاں آنے کی خبر کر دی تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ شبہ ہونے پر دشمن اپنا ٹھکانا ہی بدل ڈالیں۔ اسی لیے جلدی سے کرنے کے کام میں تاخیر کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ ایک بار دشمن سے بدلہ لے لیں پھر آرام سے بیٹھ کر بات کرنے کے لیے تو ساری زندگی پڑی ہے۔

کوّے شاہ نے اس کی بات مان لی۔ سبھی کوّے اپنی چونچوں میں ایک ایک جلتی ہوئی لکڑی لے کر الوؤں کے قلعے پر ٹوٹ پڑے۔ الوؤں کا قلعہ جل کر راکھ ہو گیا اور سارے ہی الو اندر تڑپ کر مر گئے۔

اس طرح الوؤں کا خاتمہ کر کے کوّے شاہ پھر اپنے پرانے پیپل کے پیڑ پر واپس آگیا۔ فتح کی خوشی میں جشن منایا گیا۔ وزیر خاص کو بہت سے انعام واکرام سے نوازا گیا۔

کوّے شاہ نے پھر وزیر خاص سے دریافت کیا کہ آپ نے الوؤں کے قلعے میں اتنے دن بھلا کیسے گزارے؟ دشمنوں کے بیچ میں رہنا تو بڑے جوکھم کا کام ہے۔ ہر وقت جان کو خطرہ لگا رہتا ہے۔

وزیر خاص نے جواب دیا: مہاراج آپ کی بات ٹھیک ہے۔ مگر میں آپ کا خدمت گزار ٹھہرا۔ خدمت گزار کو اپنی خدمت پر اتنا بھروسا ہوتا ہے کہ اس کی انجام دہی میں جو عارضی تکلیفیں آتی ہیں ان کا اُسے پتہ بھی نہیں چلتا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے دشمن الو شاہ کے وزیر سب کے سب احمق ہیں۔ ایک گرم مزاج ہی عقلمند تھا جو الو شاہ کو چھوڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ بدلہ لینے کا اس سے اچھا اور کوئی وقت نہیں ہو سکتا۔ دشمنوں کے بیچ رہ کر جاسوسی کرنے والوں کو اپنی عزت اور بے عزتی کی پرواہ نہیں ہوتی ہے۔ اس کا تو بس یہی ایک مقصد رہ جاتا ہے کہ اپنے آقا کے مفاد کی خاطر جو کچھ کرنا پڑے کر گزرے۔ اگر موقع آئے تو اُسے دشمن کو اپنی پیٹھ پر لاد کر بھی چلنا چاہیے۔ جیسے کہ کالے ناگ نے مینڈکوں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر سیر کرائی تھی۔

کوّے شاہ نے پوچھا: وہ کیسے؟

تب وزیر خاص نے سانپ اور مینڈک کی یہ کہانی سنائی:

(سانپ اور مینڈک کی یہ دل چسپ کہانی پیامِ تعلیم کے جون کے شمارے میں پڑھیے!

یادداشت کا امتحان

نیچے بہت سی تصویریں دی جا رہی ہیں۔ یہ روزمرّہ یا تو استعمال ہوتی ہیں یا دیکھنے میں آتی ہیں اور آپ ان سب چیزوں کے نام جانتے ہیں۔
ان سب تصویروں کو غور سے دیکھیے۔ اور ان کے نام ذہن میں رکھیے۔ اس کام کے لیے آپ کو چھ منٹ دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ صفحہ الٹ دیجیے اور اپنی یادداشت کے سہارے ان سب چیزوں کے نام لکھیے۔۔۔۔۔ بھلا بتائیے تو آپ کتنی چیزوں کے نام بھول گئے۔
اپنی فہرست صـ ۱۶ پر دی گئی فہرست سے ملائیے

بڑوں کی کوششیں

سات کے کرشمے

آج بھی یاد آرہا ہے وہ دن جب گھڑی کا الارم بج اُٹھا اور میں چونک کر اٹھی تو دیکھا کہ صبح کے سات بج رہے تھے۔ لیکن میں نے تو ساڑھے چھ بجے کا الارم لگا رکھا تھا۔ ضرور میرے سات بہن بھائیوں میں سے کسی کی حرکت تھی۔

خیر یہ سوچنے کا وقت نہ تھا۔ میں جلدی تیار ہو کر ناشتہ کرنے آئی تو دیکھا ناشتہ کیا تھا سات بسکٹ اور دودھ کا گلاس! ماتاجی کے ان سات بسکٹوں سے میں تنگ آگئی تھی۔

خیر خالی پیٹ بس اسٹاپ پر پہنچی۔ سات منٹ بعد ایک بس آئی۔ بس کے آنے پر دیکھا تو اس کا نمبر بھی سات تھا۔ سات نمبر بس ہمارے اسکول سے آدھا میل دُور رُکتی تھی۔ آدھا میل دَوڑ کر جب میں بُری حالت میں اسکول پہنچی تو دیکھا پورے سات منٹ لیٹ تھی۔ ماسٹرجی کی بینت نظروں کے سامنے ناچنے لگی۔

خیر ہمت کر کے اندر گئی۔ جاتے ہی سات بینت لگے اور سات نشان ہاتھ پر پڑے۔ بھیگی بلی بن کر ساتویں سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ دن بہت بُرا تھا۔ اس کالے دن کی سب تکلیفوں کی وجہ سات نمبر تھی جسے آپ چاہے اچھا کہیں لیکن میری نظروں میں وہ ہمیشہ دکھ دائی ہی رہے گا۔

کانتا دیوی

ٹیچرس کالج بیسک۔ پہلا سال

ٹریننگ کے دو سال

آداب عرض بھائی جان۔ کہیے کیا حال ہے؟

ارے ابھی ابھی آپ مجھ سے کیا پوچھ رہے تھے؟ یہی نا کہ میں نے اپنے ٹریننگ کے دو سال کیسے بتائے اور جامعہ میں آکر کیا خاص باتیں سیکھیں۔ لو باتوں ہی باتوں میں جامعہ میں سیکھی ایک بات کا پتہ آپ کو چل گیا۔ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ میں نے تو آپ کو ابھی کچھ بھی نہیں بتایا۔ دیکھیے بھائی جان ابھی جب ہم ملے تو آپس میں آداب کیا۔ یہ میں نے جامعہ میں آکر ہی تو سیکھا ہے۔ کتنا پیارا طریقہ ہے کہ دوسرے کی عزت میں سر جھکادو۔

اور دیکھیے نا بھائی جان میں آپ سے کس زبان میں بات کر رہی ہوں؟ اُردو میں۔ یہ بھی تو میں نے انہی ٹریننگ کے سالوں میں سیکھی ہے۔ پہلے جب میں آیا جان

کو اُردو میں خط لکھتے اور پڑھتے دیکھتی تو میں سوچتی تھی کاش مجھے بھی اُردو آتی۔ میرا یہ شوق یہاں آکر پورا ہو گیا۔

اب آپ یہ سوچ رہے ہیں نا کہ میں نے جامعہ میں آکر اور جو باتیں سیکھیں وہ بھی بتا دوں اور یہ بھی بتا دوں کہ ان باتوں کو سیکھنے کے ساتھ ساتھ میں نے دو سال کا وقت کیسے گزارا؟ کیوں میں نے جان لی نہ آپ کے دل کی بات! اتنی دیر میں تو آپ نے ایک بات اور بھی سمجھ لی ہو گی۔ لیکن آپ تو سمجھ کر بھی نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اب مجھے خود ہی بتانا ہو گا۔ میں نے اس کالج میں ہندو، مسلمانوں اور سب طرح کے لوگوں کو میل کرتے دیکھا۔ اب آپ بھی تو اپنی ایک ہندو بہن سے بات کر رہے ہیں۔ دیکھیے کتنی صفائی سے ہم آپس میں بات کر رہے ہیں۔ بھلا اس طرح کا موقع اس ٹریننگ کالج سے پہلے مجھے ملا تھا؟

اور بھائی اس کالج میں آنے سے پہلے میں صرف لڑکیوں کے ساتھ پڑھتی رہی ہوں۔ اس کالج میں لڑکوں کے ساتھ پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ ذرا سوچیے تو اگر میں لڑکوں کے ساتھ نہ پڑھتی تو میں آج اس طرح آپ سے باتیں کر پاتی؟

جی ہاں، اب ایک مزے کی بات اور یاد آئی۔ اس کالج میں آکر ہم نے مزے بھی تو بہت کیے۔ ذرا آپ بھی ان باتوں کو سُن کر لُطف اٹھائیے۔ سب سے زیادہ مزا تو مجھے بچوں کو پڑھانے میں آیا۔ بتاؤں تمہیں بھائی جان کہ جب بچوں کو پڑھانے کے دن آتے تو میں کتنی خوش ہوتی تھی! بھولے بھالے بچوں کی پیاری پیاری باتیں، ان کا آنٹی کہہ کر پکارنا ان کے ساتھ کھیلنا، آہا کیسے ہوتے ہیں یہ دن بھی! ارے میں تو اپنے آپ میں کھو سی گئی۔ خیر اب تو آگے بھی دن پھر سے آہی جاتے ہیں۔

ہاں تو بھائی جان اگر سُن سکتے ہیں تو اور باتیں بتاؤں۔ کتنے اچھے ہیں آپ جو میری سب باتیں سُن رہے ہیں۔ اب تو میں سب باتیں ضرور بتاؤں گی۔ میرے آگے میرے سارے دن ایک ایک کر کے آتے جا رہے ہیں۔ پہلے سال کی پکنک (Girl Guide Camp) یاد ہو کتنے اچھے دن تھے۔ کیمپ میں ایک ساتھ سونا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا۔ کبھی کبھی جب میں سوچنے لگتی ہوں تو سوچتی ہی رہ جاتی ہوں کہ کبھی یہ دن پھر سے واپس آجائیں! کتنی زیادہ دوستی بڑھ گئی ہے میری اور پربھا کی۔ یہ بھی تو کیمپ کی بدولت ہوا ہے۔

ایک اور خاص بات وہ یہ کہ دوسرے سال میں میں اپنے ہاؤس کی سیکریٹری بنی تو کئی باتوں کا پتہ چلا۔ ارے میں تو بولے ہی جا رہی ہوں۔ سچ پوچھو تو بھائی جان میرا دل یہ سوچ سوچ کر اکثر اداس ہو جاتا ہے کہ اس کالج کو میں کیسے چھوڑ پاؤں گی، دوستوں سے کیسے الگ ہو سکوں گی۔ لیکن آدمی اس دنیا میں اگر کسی سے ملتا ہے کسی سے الگ ہوتا ہی رہتا ہے یہ سوچ کر دل کی اُداسی دور کرتی ہوں۔ اب بھی دل تو نہیں کر رہا ہے کہ باتیں کرنی چھوڑ دوں لیکن وقت بہت ہو چکا ہے۔ میری بھولی ہوئی باتیں یاد آرہی ہیں لیکن پھر بھی اب اپنی باتوں کو بس کرتی اور یہی دعا کرتی ہوں کہ یہ کالج اور زیادہ آگے بڑھے۔

اچھا اب تو چلتے ہیں بھائی
بہت دیر ہونے کو آئی   خدا حافظ

وینا
ٹیچرس کالج ڈپلوما بیک سال دوم

بچوں کی کوششیں

رحم کا پھل

بادشاہ سبکتگین پہلے ایک غریب اور معمولی سپاہی تھا۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے۔ ایک روز وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کی غرض سے جنگل میں نکل پڑا اور بہت دیر تک شکار کی تلاش میں گھومتا رہا لیکن شکار اس کے ہاتھ نہ آیا۔ بے چارا بہت مایوس ہوا۔ مایوسی کے عالم میں وہ ادھر اُدھر بھٹک رہا تھا کہ اس کی نظر ایک ہرنی پر پڑی جو اپنے بچّے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ہرنی کو دیکھتے ہی سبکتگین کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس نے اپنا گھوڑا ہرنی کی طرف دوڑایا گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز پاتے ہی ہرنی گھبرا گئی اور گھبراہٹ میں وہ اپنے بچے کو وہیں چھوڑ کر بھاگ گئی اور جا کر ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ سبکتگین ہرنی کے بچّے کے پاس پہنچ گیا۔ اُسے اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا اور وہاں سے واپس لوٹا لیکن اس بچے کو پا کر اسے کوئی خاص خوشی نہ ہوئی کیونکہ اسے ہرنی کی ضرورت تھی۔

یہ سارا واقعہ جھاڑی میں بیٹھی ہرنی دیکھ رہی تھی بچے کو جدا ہوتے دیکھ کر ماں کی ممتا جوش میں آئی فوراً وہ جھاڑی سے باہر آئی اور سبکتگین کے پیچھے دوڑنے لگی۔ یہ دیکھ کر سبکتگین کو بڑا اچنبھا ہوا۔ فوراً اس نے اپنا گھوڑا روک دیا۔ ہرنی کی حالت دیکھ کر اُسے بہت رحم آیا اور اپنی گود میں بیٹھے ہوئے ہرنی کے بچے کو آہستہ سے زمین پر چھوڑ دیا۔ یہ بچّہ دوڑ کر ماں سے لپٹ گیا۔ ہرنی اُسے پیار کرنے لگی۔ سبکتگین اُسے حیرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا اور دیکھتے دیکھتے گھوڑے کو دوڑایا اور گھر کی طرف لوٹ آیا۔ اسی رات سبکتگین نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا۔ انھوں نے کہا: سبکتگین تم نے آج ایک ہرنی پر رحم کیا، خدا تم سے بہت خوش ہوا اور اس نے تمھارا نام بادشاہوں کی فہرست میں لکھ دیا ہے ـــــ اور پھر ایک دن سبکتگین کا خواب حقیقت میں بدل گیا اور سبکتگین ایک بہت بڑا بادشاہ بن گیا۔

قاضی سعید الدین

عقل مند لڑکی

ایران کے ایک بادشاہ نے اپنے محل کے باہر ایک صندوق رکھوایا تھا۔ جس شخص کو کسی ظالم کے خلاف کوئی شکایت ہوتی تو وہ عرضی لکھ کر اس صندوق میں ڈال دیتا تھا۔ بادشاہ ہفتے میں ایک [illegible] صندوق کھولتا ا[illegible]

رعایا کی شکایتیں دور کرتا تھا۔ ایک دن بادشاہ نے صندوق کھولا تو اس میں ایک عرضی ایسی نکلی جس میں بادشاہ کی تعریف نہایت ہی اچھے شعروں میں کی گئی تھی۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور اعلان کیا کہ جس نے یہ شعر کہے ہیں وہ دربار میں حاضر ہو۔

اعلان سن کر ایک غریب لڑکی پھٹے پرانے کپڑے اور میلا کچیلا نقاب ڈال کر بادشاہ کے حضور میں آئی۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا "تم اپنے انعام میں کیا چاہتی ہو؟"

لڑکی نے کہا: بادشاہ سلامت ایک شخص سے شادی کرنا چاہتی ہوں لیکن وہ انکار کرتا ہے۔"

بادشاہ نے سوچا لڑکی بدصورت ہوگی اسی وجہ سے وہ شخص انکار کرتا ہے۔ بادشاہ نے نقاب اٹھانے کا حکم دیا۔ لڑکی نے نقاب الٹا تو بادشاہ حیران رہ گیا۔ بادشاہ نے پوچھا: کون بیوقوف ہے جو تم جیسی حسین لڑکی سے شادی کرنے پر رضامند نہیں ہے۔ فکر نہ کرو، ہم اسی شخص سے تمھاری شادی کروادیں گے!

بادشاہ نے اسی وقت اس شخص کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس سے پوچھا: تم اس لڑکی سے شادی کیوں نہیں کرتے؟

اس شخص نے جواب دیا: بادشاہ سلامت یہ لڑکی تو میری سگی بہن ہے، میں اس سے کس طرح شادی کر سکتا ہوں؟

بادشاہ نے کہا: تم جھوٹے ہو، کون کہتا ہے کہ تم اس کے سگے بھائی ہو؟ اگر تم سچے ہو تو گواہ پیش کرو۔

وہ شخص فوراً محلے میں گیا اور دو بوڑھوں کو اپنے ساتھ لایا۔ ان دونوں نے قسم کھا کر کہا بے شک یہ لڑکی اس کی سگی بہن ہے

لڑکی نے بوڑھوں کا یہ جواب سن کر بادشاہ سلامت سے کہا: بادشاہ سلامت، میرے باپ کے مرنے کے بعد میرے اسی بھائی نے مجھے جائیداد کا حصّہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تب انہی بے ایمان بوڑھوں نے عدالت میں گواہی دی تھی کہ یہ لڑکی اس کی بہن نہیں ہے، اس کا جائداد پر کوئی حق نہیں ہے۔ اگر حضور کو میرے بیان پر یقین نہ ہو تو عدالت سے کاغذات منگوا کر دیکھ لیجیے۔

مقدمے کے کاغذات فوراً حاضر کیے گئے۔ انھیں دیکھنے سے معلوم ہوا کر لڑکی واقعی سچی ہے۔

اس راز کے فاش ہوتے ہی دونوں بوڑھوں اور نوجوان بھائی کے ہوش اڑ گئے۔ بادشاہ اور درباری لڑکی کی عقلمندی پر عش عش کرنے لگے۔ لڑکی نے اپنا حصّہ پالیا۔ دونوں بوڑھوں اور نوجوان بھائی کو جھوٹ بولنے کے جرم میں سزا ہوئی لیکن نیک دل لڑکی کی سفارش پر انھیں معاف کر دیا گیا اور انھوں نے توبہ کی کہ آئندہ ایسا نہ کریں گے۔

رشیدہ بی بی مصطفےٰ بھائی شبنم

لطیفہ

جبّار (گوالے سے) تمھاری لاٹھی مجھے مل گئی ہے

گوالا: تو مجھے دے دیجیے۔

جبّار: نہیں بلکہ تم مجھے بھینس دے دو۔ جانتے نہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس!

فرید

ہندوستان میں...

سب سے اونچی پہاڑی	نندہ دیوی ۲۵،۶۶۰ فٹ
سب سے اونچا آبشار	گرسوپّہ (میسور) ۹۶۰ فٹ
سب سے اونچا دروازہ	بلند دروازہ (فتحپور سیکری) ۱۶۰ فٹ
سب سے اونچا مینار	قطب مینار دہلی
سب سے بڑا دریا	برہم پتر
سب سے بڑی جھیل	وولر (کشمیر)
سب سے بڑا ڈیلٹا	سندربن ۸،۰۰۰ مربع میل۔
سب سے بڑا گنبد	گول گنبد بیجاپور
سب سے بڑا برآمدہ	رامیشورم مندر ۴،۰۰۰ فٹ
سب سے بڑا پل	ہوڑہ (کلکتہ)
سب سے بڑی مسجد	جامع مسجد دہلی
سب سے بڑا شہر	کلکتہ
سب سے بڑا صوبہ	اتر پردیش۔
سب سے بڑا غار	ایلورہ
سب سے بڑا چڑیا گھر	علی پور کلکتہ
سب سے بڑا عجائب گھر	کلکتہ
سب سے لمبا پل	سون پل ۱۰،۰۵۲ فٹ
سب سے لمبا پلیٹ فارم	سون پور ۲،۴۱۵ فٹ
سب سے لمبا مجسمہ	گومٹیشور (میسور) ۵۶ فٹ
سب سے بڑا ڈیم	بھاکرا
سب سے بڑی سڑک	جی۔ ٹی۔ روڈ ۱،۵۰۰ میل
سب سے زیادہ آبادی والا صوبہ	اتر پردیش

مشیدہ پروین برنی۔

دو بچے

دو بچے ہیں نیارے نیارے
لگتے ہیں وہ سب کو پیارے
ابّو کی ہیں آنکھ کے تارے
امّی کے ہیں راج دلارے
سیدھا سادا ان کا چلن ہے
کاموں میں پھرتیلا پن ہے
ان کے دلوں میں حبِ وطن ہے
پڑھنے کی دن رات لگن ہے
نام ہیں ان کے اکبر، اصغر
راج کریں گے اک دن سب پر

سید محمود علی (کراچی)

الفاظ کی تمیز

عَلَم : جھنڈا	اَلَم : رنج
عالِم : علم کا جاننے والا	عالَم : دنیا
ارض : زمین	عرض : چوڑائی
مآل : انجام	مال : دولت
دانا : عاقل	دانہ : تخم، بیج
عدیم : نایاب	ادیم : سرخ چمڑا
عَن : سے	اَن : دانہ
عُجل : جلدی	اَجل : موت
مزاح : خوش طبعی	مزہ : لذت

محی الدین خاں، گوکل

آدھی ملاقات

(پچھلے سالنامے میں پروفیسر اکبرالدین صدیقی صاحب کا ایک مضمون چھپا تھا "ہزار کھم کا دیول" ہمارے محترم مضمون نگار جناب سید ابوتمیم صاحب (فرید آبادی) نے اس پر کچھ اعتراض کیے تھے۔ ہم نے یہ اعتراض جناب اکبرالدین صاحب صدیقی کی خدمت میں پیش کر دیے۔ محترم پروفیسر صاحب نے فوراً جواب مرحمت فرمایا۔ یہ جواب ہم نے سید صاحب کو بھیج دیا۔ اپنے پیامیوں کی دل چسپی اور معلومات کے لیے یہ تینوں خط یہاں شایع کیے جاتے ہیں۔)

حسان صاحب السلام علیکم

پیام تعلیم کا سالنامہ (۶۹ء) ملا شکریہ۔ "ہزار کھم کا دیول" (صفحہ ۲۴) میں صدیقی صاحب نے چالوکیہ کا "دارالخلافہ" لکھا ہے۔ آپ نے شاید اس میں اصلاح نہیں کی۔ دینا ناتھ گردھر صاحب نے بھی یہی غلطی کھائی ہے (ص ۴۷) ان کو تو معاف کیا جا سکتا ہے۔

ہزار کھم کے دیول کی تعمیر کی تاریخ پر بھی مجھے شبہ ہے کہ سلطنت کاکتیا کے آغاز کا بھی یہی سال تاریخ میں ہے۔ مدورا (مدراس) میں ۹۹۷ کھم کا دیول دو ہزار سال پرانا موجود ہے (تین کھم گر گئے ہیں) کسی سے اس کے متعلق مضمون حاصل کریں۔ اس کے ہر کھم پر تصویر کندہ ہے بعض پر فحش قسم کی۔ بہر حال اس کی تاریخی قدر و قیمت اور اہمیت بہت زیادہ ہے۔ صنعت کے اعتبار سے تعریف کا مستحق۔

'کتاب کی کہانی' مفید اور معلوماتی ہے۔ موجد ہومیو پیتھی کا تذکرہ بھی قابلِ تعریف ہے مقبول احمد صاحب سیوہاروی تو پرانے ادیب ہیں۔ داد سے مستغنی۔ بہر حال بہت عمدہ انتخاب ہے۔ جزاکم اللہ۔

(سید ابوتمیم صاحب کے خط کا جواب پڑھیے اکبرالدین صاحب فرماتے ہیں)

ـــــ دیول ہزار کھم کے بارے میں بیشتر مواد اس کتبہ سے لیا گیا ہے جو دیول میں موجود ہے۔ یہ کھم تقریباً ۲ فٹ چوڑا ۲۰ انچ موٹا اور چھ فٹ اونچا ہے اور چاروں طرف اوپر سے نیچے تک تحریر موجود ہے۔ یہ کتبہ پڑھا جا چکا ہے قدیم ریلوے گائیڈ میں دیول کے متعلق جو معلومات دی گئی ہیں میں نے اس سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ہاشمی صاحب فرید آبادی مرحوم کی تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ تاریخ راجہ کا نام اور اس کے کارنامے کتبے میں موجود ہیں۔ اس وقت جو پرانی تاریخیں ہیں ان کا مواد زیادہ تر اس کے متعلق قیاسات پر مبنی ہے اس لیے کہ اس وقت تک کتبہ پڑھا نہیں گیا تھا۔ مدورا کے دیول کے تعلق سے دریافت کروں گا اور جیسے ہی کسی کا پتہ ملے مطلع کروں گا۔ فرزانہ سلمہا کو لکھا ہے اور کتابیں بھی فراہم کر دی ہیں۔ وہ لکھ رہی ہوں گی۔

آپ نے سالنامے پر بہت محنت کی ہے۔ ٹائٹل سے آخری صفحہ تک حسین، دل کش اور دل چسپ ہے۔ خدا کرے

کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔

(ابو تمیم صاحب اس خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں)

— میں نے صدیقی صاحب پر یہ اعتراض نہیں کیا تھا کہ دیول کی تاریخ میں غلطی ہے۔ بلکہ خیال یہ ظاہر کیا تھا کہ وہی سال اس حکومت کے آغاز کا ہے اس لیے یہ دیول کچھ عرصے بعد کا ہوگا۔ ایک مقصد یہ تھا کہ وہ اتنا اہم نہیں۔ اس کے کھنڈر بن جانے سے ہی اس کے ناقص مصالحے کی تصدیق ہوتی ہے جب کہ مدورا کا دیول ۲ ہزار سال قبل کا بیان کیا جاتا ہے اور صناعی کے اعتبار سے قابلِ تعریف ہے۔ میں نے صدیقی صاحب کے دارالخلافہ لکھنے پر اعتراض کیا تھا۔ رہے دیا ناتھ جی تو ان کا دارالخلافہ لکھنا اتنا قابلِ گرفت نہیں۔ آپ موصوف کی تشفی کر دیں۔ آئندہ ہر ایسے موقعہ پر دارالحکومت لکھنا چاہیے۔ دارالخلافہ صرف خلفاء کے مسکن و جائے حکومت کے لیے صحیح ہے۔ یہ غلطی آپ کے رسالے میں ایک اور جگہ نظر پڑی۔ معلوم ہوا کہ ہمہ گیر بیماری ہے۔

سید ابو تمیم

آج اپریل کا پیام تعلیم نظر نواز ہوا۔ وقت کی پابندی میں آپ نے سب رسالوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ آپ کا ارسال کردہ سالنامہ بھی ملا۔ مگر افسوس ہے کہ اب تک پڑھنے کو نہ ملا۔ کیوں کہ ہمارے بھیا اور بھتیجوں سے ہوتا ہوا وہ ان کے دوستوں اور سہیلیوں کے پاس پہنچ چکا ہے۔ ابھی تک کسی نے اُسے بغیر پڑھے چھوڑا نہیں ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ اس طرح پڑھنے سے آپ کو کئی گاہک مل جائیں گے اور "گاہکوں" کو ایک "اچھا ساتھی" مل جائے گا۔

اپریل کا ٹائٹل سادہ ہونے کے باوجود آنکھوں کو اچھا لگتا ہے۔ مضامین کی ترتیب اور مضامین بہت خوب ہیں۔ یہ سب آپ کی مسلسل دن ورات کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ امید ہے برابر اسی وقت پر رسالہ ملتا رہے گا۔ دیکھیے دو تین گاہک میں بھی بنوانے کی فکر میں ہوں۔

جہانگیر احمد شمسی۔

اپریل کا پیام تعلیم نظر نواز ہوا۔ جناب حمید عثمانی کا مضمون "کیسے یاد کریں" عین امتحانات کے دنوں میں بھلا کیسے کارآمد ثابت ہوگا۔ جب یہ مضمون امتحانات سے ۲، ۳ ماہ قبل شایع ہوتا تھا۔ الغرض عثمانی صاحب نے کافی لگن ومحنت سے بچوں کی فطرت پرکھ کر مضمون لکھا ہے جس کی داد دینا ہر پیامی کا اولین فرض ہے۔

مضمون کے دوسرے صفحے کے تیسرے پیراگراف سے مجھے کچھ اختلاف ہے۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ "طویل سبقوں کو کئی چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے یاد کرنے سے آسانی کے بجائے دشواری پیش آتی ہے۔" بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے۔ مثل مشہور ہے کہ قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے۔ مگر یہاں اس کی ہدایت الٹی کی گئی ہے۔ طویل نظم یا عبارت کو یاد کرنا ہو تو دو دو چار چار سطریں دہرانا ہی بہتر ہے۔ پورا پہاڑ ایک دم سے سر پر دھر لیں تو بوجھ سے کچومر نکل جائے گا۔ اس کے متعلق آپ کی اور عثمانی صاحب کی رائے سے بڑھ کر میں پیامیوں کی رائے جاننے کا طالب ہوں۔

عبدالمجید آنیکل (ٹیچر)
کنگے نیلی (بنگلور)

کتابوں کی باتیں

ہمارے نہرو۔ از جناب صفدر حسین

سائز ۲۰×۱۶/۱۷

ضخامت ۲۳۲ صفحے

لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا

ٹائٹل دورنگا

قیمت ۳/۵۰

ملنے کا پتہ: ڈائرکٹر پبلیکیشنز اولڈ سکریٹریٹ دہلی ۶

پنڈت جواہر لال نہرو پر مختلف زبانوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہت ہی سادہ اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ ہائی اسکول کے لڑکے اور معمولی استعداد کے لوگ اسے بڑی آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ اندازِ بیان بھی بہت دل چسپ ہے۔

پنڈت جی کی زندگی جوانی سے لے کر آخری سانس تک سیاسی سرگرمیوں میں گزری ہے اس لیے قدرتی طور پر ان کے زمانے کی سیاسی تاریخ بھی آگئی ہے۔ آزادی کے بعد ملک کو ترقی دینے کے لیے جو پلان، جو اسکیمیں جو پروگرام پنڈت جی کے مشورے سے بنائے گئے ان کا بھی ذکر ہے۔ غرض پوری کتاب کو پڑھ کر دل پر یہ اثر ہوتا ہے کہ پنڈت جی ہمارے دیس کے بڑے آدمی تھے۔ بہت بڑے آدمی۔

کتاب میں ۱۶ صفحوں کی فوٹو کی تصویریں بھی ہیں، ان کے بچپن سے لے کر ان کی موت تک کی تصویریں۔ ہیں ان کے خاندان کے عزیزوں اور بزرگوں کی تصویریں ہیں

اس اچھی کتاب کے لیے مصنف اور پبلیکیشن ڈویژن دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔

نتیجہ "یادداشت کا امتحان"

(۱) تھرمامیٹر	(۲) پائپ	(۳) برش
(۴) چشمہ	(۵) ٹیلی فون	(۶) چھرا (شکاری)
(۷) ٹوتھ برش	(۸) ہتھوڑی	(۹) جوتا
(۱۰) بریف کیس	(۱۱) گیند	(۱۲) پیچ
(۱۳) کالر	(۱۴) فاؤنٹن پین	(۱۵) چھڑی
(۱۶) داڑھی بنانے کا برش	(۱۷) ٹائی	(۱۸) ٹائی پن
(۱۹) ڈبہ	(۲۰) سنو (کریم)	(۲۱) قینچی
(۲۲) کپڑے صاف کرنے کا برش		(۲۳) کنگھا
(۲۴) کیلیں	(۲۵) ٹیبل کلینڈر	(۲۶) چھتری
(۲۷) چلم	(۲۸) چپل	(۲۹) دستانہ
(۳۰) چاقو	(۳۱) رسٹ واچ	(۳۲) ہیٹ
(۳۳) لوٹا	(۳۴) شمع	(۳۵) شمع دان
(۳۶) ٹائم پیس	(۳۷) پستول	(۳۸) استرا
(۳۹) پیالہ	(۴۰) تلوار	(۴۱) بانسری
(۴۲) تاش	(۴۳) موزہ	(۴۴) ہینگر
(۴۵) کتاب	(۴۶) کارک کھولنے کا پیچ	(۴۷) تھرماس

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شایع کیا۔

اِدھر اُدھر سے

قران مجید کا سب سے چھوٹا نسخہ

تہران ۔ ۲ ہزار صفحات پر مشتمل چیکوسلواکیہ میں قران کریم کا سب سے چھوٹا نسخہ شایع ہوا ہے۔ اسے صرف خوردبین کے ذریعہ پڑھا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے جاپان میں قران پاک کا سب سے چھوٹا نسخہ چھپا تھا۔ یہ نسخہ جاپانی ناشروں نے ۱۹۵۰ء کے عشرے میں اس کے انگریزی اور جاپانی ترجمہ کے ساتھ شایع کیا تھا۔ اسے بھی خوردبین سے پڑھا جاتا ہے۔

گڑیاں بنانا بھی اچھا مشغلہ ہے

ایک جاپانی مس نوریکوادا چی NORICOADHACHI کو بچپن میں گڑیوں کا بہت شوق تھا۔ سبھی بچیوں کو ہوتا ہے مس نوریکوادا چی خیر سے اب بڑی ہوگئی ہیں مگر یہ شوق اب بھی باقی ہے بلکہ زیادہ ہوگیا ہے بس فرق اتنا ہے کہ پہلے بازار سے گڑیاں خرید کر شوق پورا کرتی تھیں اب وہ اپنی گڑیاں خود بناتی ہیں۔ بڑی ہنرمندی سے بناتی ہیں۔ بڑے سلیقے سے بناتی ہیں۔ آپ دیکھیں تو عش عش کر جائیں۔

یہ بات آپ اپنے ذہن میں رکھیے کہ مس نوریکو یہ گڑیاں بیچنے کے لیے نہیں بناتی ہیں شغل یا ہابی کے طور پر بناتی ہیں۔ وہ خود کہتی ہیں: "میرے لیے تو یہ بس ایک شغل ہے۔ عام طور پر میں یہ گڑیاں بنا کر اپنے دوستوں کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کر دیتی ہوں۔ خود میرے گھر میں میری بنائی ہوئی گڑیاں مشکل سے پانچ چھ ہوں گی۔"

آج کل وہ انٹرنیشنل ڈولس میوزیم کی دعوت پر ہندوستان آئی ہوئی ہیں۔ یہاں وہ اپنی گڑیوں کی نمایش کریں گی۔ اس نمایش میں ان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ۸۴ گڑیاں ہوں گی طرح طرح کے نمونے ہوں گے۔ جاپان کی گڑیاں خوبصورتی نزاکت اور انوکھے پن میں تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ یہ گڑیاں جاپان کے آرٹ کا بہترین نمونہ ہوں گی۔

جو گڑیاں انھوں نے ہندوستان میں بنائی ہیں انھیں وہ شریمتی اندرا گاندھی کی خدمت میں پیش کر دیں گی ہندوستان سے محبت اور خلوص کی یادگار کے طور پر۔

ان پیاری پیاری گڑیوں کے کپڑے بھی وہ خود ہی سیتی ہیں۔ یہ ریشمی اور دوسرے قیمتی کپڑے ہوتے ہیں۔ جاپان میں ہر گڑیا بنانے والے کو ٹریننگ لینا پڑتی ہے۔ کپڑے سینا بھی اسی ٹریننگ کے کورس میں شامل ہے۔ اس ٹریننگ میں وہ تین سال تک رہ چکی ہیں۔ ابھی دو سال اور لگیں گے اس کے بعد انھیں ڈپلوما مل جائے گا۔ مگر اس سے فائدہ؟ مس نوریکو اداچی مسکرا کر کہنے لگیں، "بس یہ

فائدہ ہے کہ گڑیاں بنانے کا سامان آدھے داموں ملنے لگے گا۔ (اسٹیٹس مین)

چوہے کتوں کو ہلاک کر سکتے ہیں

کسی پچھلے پرچے میں "بچوں کی کوششیں" کے سلسلے میں ایک پیامی کا مضمون چھپا تھا مضمون میں لکھا تھا کہ بمبئی کے چوہوں سے بلیاں بھی دہشت کھاتی ہیں مگر اب تو ایک اور بھی اچنبھے کی بات معلوم ہوئی۔ چوہے کتوں پر حملہ کر بیٹھتے ہیں اور انھیں ہلاک کر دیتے ہیں۔ آپ نے انڈونیشیا کا نام سُنا ہوگا بہت بڑا ملک ہے۔ اس میں بس جزیرے ہی جزیرے ہیں اور ان میں سے ایک جزیرے کا نام لومبوک ہے یہاں کے چوہے عام چوہوں سے کئی گنا بڑے ہوتے ہیں۔ اخبار نے تو انھیں دیوقامت لکھا ہے۔

"دیوقامت" چوہے جزیرے کے لوگوں کو بہت پریشان کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں اب سے کوئی تین سال پہلے ان چوہوں کی یلغار کی وجہ سے جزیرے کے ہزاروں لوگ بھوکے مر گئے۔ ساری خوراک یہ چوہے کھا گئے۔

اب یہ چوہے بچوں پر حملہ کر رہے ہیں، کتوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔ جزیرے والوں نے ان سے نجات حاصل کرنے کی ایک تدبیر سوچی ہے۔ انھوں نے بہت سے دیوقامت چوہوں کو کئی دن تک بھوکا رکھ کر ان چوہوں میں چھوڑ دیا کہ بھوک کی تاب نہ لا کر وہ دوسرے چوہوں کو کھا جائیں — کیا اس تدبیر سے، چوہے ختم ہو جائیں گے؟ — آپ بھی سوچیے

(الجمعیۃ)

ریل گاڑی کو تباہ ہونے سے بچا لیا

آپ نے نصاب کی کتابوں میں ایک بہادر بچے کی کہانی پڑھی ہوگی کہ کس طرح اس نے ہمت اور جرأت اور سوجھ بوجھ سے کام لے کر ریل گاڑی کو تباہی سے بچایا۔ نہ جانے یہ محض کہانی ہے یا سچی واردات ہے آئیے آج آپ کو ایک دیہاتی لڑکے کا سچا واقعہ سنائیں۔

یہ ابھی پچھلے مہینے (مارچ ۶۹ء) کی بات ہے — آسام کے اوپری علاقے میں ایک جگہ ریل کی لائن ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اتفاق سے لگ بھگ دس سال کا ایک لڑکا ریل کی اس لائن کے قریب پہنچا۔ اسی وقت ایک سواری گاڑی تیزی سے اسی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ بچہ فوراً خطرے کو بھانپ گیا۔ اُسے اور تو کچھ سوجھا نہیں قمیص اتار کر اُسے اونچا کر کے ہلانے لگا۔

اُدھر ڈرائیور کی نظر اس بچے پر پڑ گئی۔ اس نے سوچا نہ جانے کیا بات ہے اور گاڑی میں بریک لگا دیا۔ گاڑی تھوڑی دور آگے جا کر رک گئی۔ اتر کر دیکھا تو بات سمجھ میں آئی۔ یہ بچہ اس وقت نہ ہوتا تو کتنا بڑا حادثہ ہو جاتا گاڑی الٹ جاتی، جان اور مال کا نہ جانے کتنا نقصان ہوتا

بچے کے اس کارنامے کی ہر جگہ تعریف ہو رہی ہے یہاں تک کہ دیس کی پارلیمنٹ میں بھی اس کا نام آگیا۔ اور یہ طے کیا گیا کہ اس بچے کو مناسب انعام دیا جائے۔ (اسٹیٹسمین)

ڈولفن کو انسانوں سے فطری محبت

ابھی چند دن ہوئے ایک

اور اس تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ڈولفن مچھلی کو انسانوں سے فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ اسے سدھانے کی ضرورت نہیں۔ بہت دنوں سے یہ بات روایت کے طور پر چلی آ رہی ہے کہ کوئی رومی لڑکا ڈولفن پر سوار ہو کر اسکول جایا کرتا تھا۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی کے ایک صاحب کے دل میں کیا آئی کہ اس کی تصدیق کرنی چاہیے۔ وہ مشہور شہر ڈوئسبرگ کے چڑیا گھر میں پہنچے۔ وہاں وہ اس حوض یا تالاب پر پہنچے جہاں "میا" نام کی ڈولفن رہتی ہے۔ ان کے ساتھ چار تیراک لڑکیاں تھیں ڈولفن تھوڑی ہی دیر میں ان سے کھیلنے لگی جیسے بہت پرانی سہیلیاں ہوں۔ یہ لڑکیاں باری باری اس کی پیٹھ پر چڑھتی تھیں اور وہ ذرا نہ گھبراتی تھی۔ اچنبھے کی بات تو یہ کہ نہ تو ان لڑکیوں نے اس سے پہلے کوئی ڈولفن دیکھی تھی اور نہ ڈولفن کو اس سے پہلے انسانوں کو اس قدر قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

(اطلاعاتِ جرمنی)

فضا کے بادشاہ سے رخصت

ذرا اس عقاب کو اور ان بڑے میاں کو دیکھیے جیسے آپس میں بہت راز کی باتیں ہو رہی ہوں۔ اصل میں یہ صاحب ایک ۳۵ سالہ سنہرے عقاب پیٹر سے رخصت ہو رہے ہیں۔ ان صاحب کا نام "آڈالف ڈیپے" ہے۔ شروع زندگی سے انھیں پرندوں سے لگاؤ ہے چڑیا خانے میں عقاب خانہ انہی کی بدولت کھلا تھا۔ انہی نے اس کی داغ بیل ڈالی تھی اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ نایاب عقابوں

[illegible]

خبر گیری میں گزار دیا تھا۔

"ڈیپے صاحب" کے عقاب خانے میں صرف اسّی پرندے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر مختلف قسم کے عقاب ہیں۔ شاہینوں اور گدھوں کی بھی بعض نایاب قسمیں ہیں۔ یہ پرندے بالکل کھلے رہتے ہیں یا انھیں مچانوں پر باندھ دیا جاتا ہے۔ پر عقاب کو اڑاتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ایک وقت میں دو عقاب نہ اڑنے پائیں ورنہ ایک دوسرے سے لڑ کر ہلاک ہو جائیں گے۔

کوئی عقاب اڑتے وقت چالیس کلومیٹر کے دائرے میں دوسرے عقاب کی پرواز برداشت نہیں کر سکتا۔ ڈیپے صاحب اب ۷۵ برس کے ہو گئے ہیں اور چڑیا خانے سے رخصت ہو رہے ہیں۔

(اطلاعاتِ جرمنی)

چار سالہ لڑکی کے داؤ پیچ

اب سامنے کے صفحے پر دوسری تصویر دیکھیے۔ اس چار سالہ بچی آریانا نے اپنی ماں کو چاروں شانے چت کر دیا ہے۔ اس کی ماں کا نام لینڈے گنٹر ہے۔ ۲۷ سال کی عمر ہے۔ جاپانی کشتی "جو جِتسو" کی ماہر ہے اس کشتی کے اُسے ۲ سو داؤ پیچ آتے ہیں۔ اس کے باپ بھی "جو جِتسو" "جوڈو" اور "کاراٹے" کے ماہر ہیں۔ باپ اور بیٹی نے مل کر ان کشتیوں کا فن سکھانے کے لیے ایک مدرسہ بھی کھول رکھا ہے۔ آریانا کی عمر کے بچے کشتی لڑنے میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

ذاکر صاحب کی یہ تصویر جناب اقبال فرید میسوری نے ٹائپ رائٹر
پر بنائی ہے، اور وہ بھی صرف ایک حرف زیڈ (Z) سے۔ اس
صرف داڑھی کے لیے 'ہائی فن' (HYPHEN) وغیرہ کا استعمال کیا گیا
ہے۔ فن کار نے یہ تصویر ذاکر صاحب کی خدمت میں [illegible]
کی تھی۔ ذاکر صاحب نے تصویر کو بہت پسند کیا اور فرمایا [illegible]
اتنی خوبصورت ٹائپ رائٹر پر بنائی ہوئی تصویر کبھی نہیں [illegible]
یہ جانتا تھا کہ ٹائپ رائٹر تصاویر بنانے کے لیے بھی [illegible]
[illegible] اس تصویر کو میسور کی نمائش میں آراستہ کرا [illegible]

ریاستہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں وکشمیر و ہریانہ کے تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی

جلد ۶ جولائی ۱۹۶۹ء شمارہ ۷

ایڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار جامع مسجد
دہلی ۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ جے جے ہسپتال
بمبئی ۳

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ علیگڈھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے ، سالانہ چندہ ۶ روپے

بچوں کی دلچسپ و مزیدار کہانیاں

کتاب	مصنف	قیمت
ایک تھی راج کماری	عبداللہ کمال	۴۰/-
ایک تھی رانی	عبداللہ کمال	۴۰/-
آدم خور زنگی	عبداللہ کمال	۳۰/-
افراسیاب کی بیٹی	عبداللہ کمال	۳۰/-
بہادر راج کمار	عبداللہ کمال	۲۰/-
باغی شہزادہ	عبداللہ کمال	۳۰/-
بے وقوف پریاں	عبداللہ کمال	۴۰/-
پریوں کے تحفے	عبداللہ کمال	۲۰/-
پھول شہزادی	فاروق ارگلی	۴۰/-
تیسرا انعام	عبداللہ کمال	۴۰/-
تین شہزادے	عبداللہ کمال	۲۰/-
جادو کا ہاتھ	عبداللہ کمال	۴۰/-
جادو کی شطرنج	عبداللہ کمال	۴۰/-
جادو کا گھوڑا	عبداللہ کمال	۳۰/-
جادو کا پھل	عبداللہ کمال	۳۰/-
چڑیوں کی ملکہ	عبداللہ کمال	۴۰/-
خوفناک جادوگر	عبداللہ کمال	۳۰/-
دیو پیکر پرندہ	عبداللہ کمال	۴۰/-
ڈاکٹر بوجھ بجھکڑ	شاہد اقبال	۲۰/-
رحمدل پریاں	عبداللہ کمال	۲۰/-
رستم و سہراب	عبداللہ کمال	۴۰/-
شیش محل	عبداللہ کمال	۴۰/-
شہزادی بدورا	عبداللہ کمال	۳۰/-
شہزادی پری زاد	عبداللہ کمال	۳۰/-
عراق کی شہزادی	عبداللہ کمال	۴۰/-
لنگڑا دیو	عبداللہ کمال	۳۰/-
مسٹر عقلمند	عبداللہ کمال	۲۰/-
مغرور شہزادی	عبداللہ کمال	۴۰/-
ہنس مکھ شہزادہ	شاہد اقبال	۲۰/-
ہیروں کا جزیرہ	عبداللہ کمال	۳۰/-

فہرست

پرنٹر پبلشر سید احمد دہلوی نے مکتبہ جامعہ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

بچوں سے باتیں

مئی کے پرچے میں آپ سے باتیں کرتے کرتے آخر میں ہم نے خوش خبری کے طور پر آپ سے کہا تھا: "اگلے پرچے میں خدا نے کیا تو بعض بہت دل چسپ مضمون شائع ہوں گے۔ انتظار کیجیے۔"

مگر مئی کے شروع میں ذاکر صاحب قبلہ اچانک ہم سے رخصت ہوگئے۔ بہت بڑا حادثہ تھا جامعہ کے لیے، مکتبہ جامعہ کے لیے، پیام تعلیم کے لیے۔ ہم نے جون کا پرچہ ان کے حالات کے لیے مخصوص کر دیا اور جون میں شائع ہونے والے مضمون جولائی کے پرچے میں شائع ہو رہے ہیں۔

اور اب ان مضمونوں کو غور سے پڑھیے۔ سب سے پہلے تو جاوید اشرف کی نظم پڑھیے۔ ننھے میاں کا خواب۔ کتنی مزے کی ہے۔ پھر غلام حیدر صاحب کی کہانی ہمارے ننھے پیامیوں کو خاص طور پر اچھی لگے گی۔

اور صاحب ایتھوپیا کی لوک کہانی "کون بری عادت چھوڑ سکتا ہے" کتنی دل چسپ کہانی ہے۔ ہمارے امین صاحب نے ترجمہ بھی خوب جی لگا کے کیا ہے۔ ترجمے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ پن نہ ٹپکے۔ اس کہانی میں یہ عیب آپ کو دور دور نظر نہ آئے گا۔

پھر محترمہ آصفہ مجیب کی کہانی لال شہزادہ پڑھیے۔ محترمہ آصفہ مجیب کبھی کبھی لکھتی ہیں، مگر جب لکھتی ہیں تو خوب لکھتی ہیں۔ یہ ہمارے لیے بڑی خوشی، بڑے فخر کی بات ہے کہ ہماری درخواست کو کبھی رد نہیں فرماتیں۔

شعیب اعظمی صاحب کا مضمون "غالب اپنے خطوں کے آئینے میں" کی آخری قسط اس پرچے میں چھپ رہی ہے۔ آسٹریلیا کے جانوروں والا مضمون اگلے (اگست کے) پرچے میں ختم ہوگا۔ اسے آپ نے خاص طور پسند کیا ہے۔

لینن والا مضمون بھی خدا کرے آپ کو اچھا لگے۔ یہ بھی ابھی نا تمام ہے۔ مگر اسے پڑھ کر آپ کو چند باتوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ لینن اپنے بچپن میں بہت چنچل، بہت ہنسوڑ، بہت کھلنڈرے تھے مگر پڑھنے لکھنے میں بھی اتنے ہی تیز تھے اور اپنا سبق

یاد کرنے یا دہرانے کے بعد ہی کھیل کود یا شرارتوں میں حصّہ لیتے تھے۔

نظموں میں سے جاوید اشرف کی نظم کے علاوہ "صبح" پر حضرت خضر برنی اور جناب عبداللہ شرقی کی نظمیں پڑھیئے۔ اقبال نصیب صاحب کی دُعا پڑھیئے۔ اور ہاں مولانا بدرالدین صاحب کی نظم کھلی ہوا کا مزہ پڑھیئے۔ یہ سب آپ کو پسند آئیں گی بیچ بیچ میں منہ کا مزہ بدلنے کے لیے لطیفے بھی پڑھیے۔

نظموں کے بارے میں ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ پیامِ تعلیم پیامیوں کا یعنی آپ لوگوں کا پرچہ ہے۔ اس میں ایسی ہی نظمیں چھپ سکتی ہیں جو آپ لوگوں کی سمجھ سے باہر نہ ہوں۔ دل چسپ ہوں مزے دار ہوں۔

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے بہت سے ساتھی اور بزرگ برابر ہماری سرپرستی فرماتے ہیں۔ نظمیں تو نظمیں غزلوں سے بھی ہمیں نوازتے ہیں بعض حضرات ایسی نظمیں بھیج دیتے ہیں جنھیں نظم کی جگہ نثر کہا جائے تو زیادہ اچھا رہے گا۔ یہ حضرات اس طرح کے تبرکات ہمیں بھیجنے سے پہلے کسی پڑھے لکھے سمجھ دار شاعر کو دکھا لیا کریں تو کیسا اچھا ہو۔ غزلیں تو پیام تعلیم میں کبھی چھپی ہی نہیں نہ آئندہ اس طرح کا کوئی ارادہ ہے۔ غزلیں بھیجنے والے حضرات ہماری طرف سے معذرت قبول فرمائیں۔

جون کا پرچہ تو آپ نے پڑھ لیا ہوگا۔ نہ جانے کیسا لگا۔ خدا کرے اچھا ہی لگا ہو۔ آج کل جامعہ میں چھٹیاں ہیں۔ کافی لوگ باہر گئے ہوئے ہیں لیکن جو تھوڑے بہت موجود ہیں انھوں نے اسے بہت پسند کیا۔

ایک بات کا خیال رکھیے گا۔ اس (جون کے) پرچے کو بہت حفاظت بہت احتیاط سے رکھیے گا۔ یہ پرچہ اب کسی قیمت پہ بھی آپ کو نہ ملے گا۔ اگر آپ کے پاس ذاکر نمبر ہے تو وہ بھی بہت قیمتی چیز ہے۔ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں نے ان دونوں پرچوں کو ذاکر صاحب کے حالات کے بارے میں تاریخی دستاویز بتایا ہے۔ بہت سے مصنفوں نے اس میں سے مضمون اکثر بلا حوالہ نقل کیے ہیں۔

جون کا پرچہ چونسٹھ صفحوں کی جگہ اسّی صفحوں کا نکلا ہے۔ پھر بھی ہم نے قیمت وہی (۶۰ پیسے) رکھی ہے جو پیامی سالانہ خریدار بننا چاہیں تو بہتر ہے کہ اس پرچے سے خریداری کا سلسلہ شروع کریں۔

پیام تعلیم کا اگلا شمارہ اللہ نے کیا تو اور بھی دلچسپ ہوگا۔ اتھوپیا کی لوک کہانی۔ انڈونیشیا کی لوک کہانی غلام حیدر صاحب کی کہانی "کھلونوں کی جنگ" حاجی عبدالملک صاحب کا مضمون "نگے کے دن رات"۔ لینن کا باقی حصہ [illegible]

ننھّے میاں کا خواب

جناب جاوید اشرف

مُنّی تمھیں خبر بھی ہے کل رات کیا ہوا
ٹھہرو، ابھی بتاتا ہوں تم کو میں ساری بات
باجا سا بج رہا تھا مرے کان کے قریب
حیران ہو کے میں نے ذرا غور جب کیا
کمرے میں ہلکا نیلا تھا اک بلب جل رہا
جیسے کہ چاند خود مرے کمرے میں آگیا
کپڑے تھے اُس کے چاندی کے موتی جڑے ہوئے
خود بھی سفید موتی بھی اس کے سفید تھے

کمرے میں میرے آئی تھی اک چاندسی پری
کل رات جانے کیسے مری آنکھ کھل گئی
شاید اسی سبب سے مری آنکھ کھل گئی
دیکھا تو میرے کمرے میں کچھ روشنی سی تھی
اس نیلی روشنی میں پری تھی کھڑی ہوئی
اب نیلی روشنی نہ تھی اک چاندنی سی تھی
مُنّی میں تم سے کیا کہوں کیسی تھی وہ پری
آپا سے بھی بڑی تھی وہ باجی سے بھی بڑی

کاندھے پہ ننھے ننھے تھے دو پَر لگے ہوئے
اک ہاتھ میں تھا ہار تو اک میں کتاب تھی

مجھ کو جو دیکھا جاگتے، بولی کہ، دیکھ لو
تحفہ تمھارے واسطے لائی ہے اک پری

خوشبو سے میرا کمرہ تھا سارا مہک رہا
پھولوں کے ہار ہی سے یہ خوشبو تھی آرہی

آگے پری جب آئی تو میں نے کیا سلام
چہرے پہ اُس کے آگئی کچھ اور روشنی

مجھ کو گلے سے اس نے لگاتے ہوئے کہا
شاباش میرے ننھے، تری عمر ہو بڑی

اللہ کے خزانے کی چابی یہی تو ہے
لو میں تمھیں بتاتی ہوں اک بات کام کی

بچے جو حکم اپنے بڑوں کا ہیں مانتے
کرتے نہیں جو آ کے شکایت بُری بھلی

پڑھتے ہیں پورے سال جو محنت سے شوق سے
ماں باپ کے بھی حکم بجالاتے ہیں سبھی

استاد کی جو کرتے ہیں عزت خلوص سے
پھولوں کا ہار دیتی ہے لاکر اُسے پری

اگلے برس پھر آؤں گی اچھے کیے جو کام
لو تحفہ تم یہ میری طرف سے میں اب چلی

ڈالا گلے میں ہار مرے اور اس کے بعد
وہ پھر سے اڑ کے چاند کی جانب چلی گئی

کمرے میں اس کے بعد اندھیرا سا چھا گیا
دوبارہ خود بخود ہی مری آنکھ لگ گئی

لیکن یہ میں نے سوچ لیا ہے کہ سال بھر
محنت کروں گا خوب ہی تگڑی، بہت کڑی

مانوں گا اپنے سارے بزرگوں کا حکم میں
ہرگز نہیں لڑوں گا کسی سے میں اب کبھی

اچھے جو ہوں گے کام تو پھر سال بھر کے بعد
پھولوں کا ہار میرے لیے لائے گی پری

پہلے تو خوب شوق سے سنتی رہی یہ بات
اور اس کے بعد جوش میں منّی یہ کہہ اٹھی

میں بھی پڑھوں گی شوق سے مانوں گی سب کی بات
میرے لیے بھی لائے گی تحفہ کوئی پری

کون بڑا ہے؟

جناب غلام حیدر ایم۔ اے۔

ایک لومڑی اور ایک بھیڑیا دونوں ساتھ ساتھ گھوم رہے تھے۔ چلتے چلتے سڑک پر آ گئے۔ سڑک پر ٹین کا ایک بڑا سا ڈبّا پڑا تھا۔ جب اُسے اِدھر اُدھر ذرا لڑھکایا تو معلوم ہوا کہ اس میں مکھن بھرا ہوا ہے۔ بس پھر کیا تھا، دونوں کی رال ٹپک پڑی۔ ظاہر ہے مکھن ان دونوں کو بہت پسند تھا۔

"اب ہمارا ناشتہ ذرا مزے کا ہوگا۔!" بھیڑیے نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا

"مگر یہاں نہیں"! لومڑی جلدی سے بولی "یہاں کھانے میں بہت خطرہ ہے۔ دیکھتے نہیں ہم اس وقت سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہیں۔ ہم اس ڈبے کو لڑھکا کر اُدھر درختوں کے جھنڈ میں لے جائیں، وہاں ہمیں کوئی نہ دیکھ سکے گا۔ وہاں مزے میں بیٹھ کر ناشتہ ہوگا۔"

"ہاں بی لومڑی، تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو" بھیڑیے نے کہا اور درختوں کے جھنڈ کی طرف ڈبے کو لڑھکانے لگا۔ اُس نے خود اکیلے ہی ڈبے کو دھکیلا اور ایک بار بھی لومڑی کو اپنی مدد کے لیے نہ بُلایا۔ شاید اب اُس کے دل میں لالچ پیدا ہو گیا تھا کیوں نہ اس ڈبے کا سارا مکھن اُسی کے حصے میں آئے!

ڈبے کو پوری حفاظت کے ساتھ جھنڈ میں پہنچا دیا گیا تو لومڑی بولی:

"دیکھو بھیڑیے میاں، اس ڈبے میں اتنا مکھن تو ہے نہیں کہ ہم دونوں کا پیٹ بھر جائے۔ اس کے بانٹنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ ذرا سوچو، بانٹنے کے بعد تو ہم میں سے کسی ایک کا پیٹ بھی اچھی طرح نہ بھرے گا میرے خیال میں تو سارا مکھن ہم دونوں میں سے کسی ایک کو کافی ہوگا!"

بھیڑیے میاں اقرار میں سر ہلاتے رہے "مگر ہم میں سے اسے کھائے کون؟"

"بھئی ہم میں سے جو بڑا ہو اُسے ملنا چاہیے یہ مکھن" لومڑی نے فوراً جواب دیا۔

"مجھے منظور ہے" بھیڑیے نے جواب دیا اور سوچنا شروع کیا کہ کون سی جھوٹی سچی کہانی گھڑے جس سے وہ عمر میں لومڑی سے بڑا مان لیا جائے اور

ڈبے کا سارا مکھن اسی کے حصے میں آجائے۔

آخر تھوڑی دیر بعد بھیڑیا ہی بولا: "تم کہتی ہو کہ یہ مکھن اسی کا حصہ ہے جو عمر میں بڑا ہے، اس صورت میں تو میں ہی تم سے بڑا ہوں!"

"کیسے۔؟" لومڑی نے پوچھا۔

"تمھیں وہ پہاڑ نظر آرہا ہے۔؟" بھیڑیے نے سامنے والے اونچے سے پہاڑ کی طرف اشارہ کیا

"ہاں نظر آرہا ہے۔" لومڑی نے سر ہلایا۔

"جب میں بچہ تھا" بھیڑیے نے کہا "تو یہ پہاڑ اس وقت زمین سے اُگا نہیں تھا۔ بس یہاں چاروں طرف بہت سی کیچڑ تھی اور اُس کے بیچ میں یہ ایک بہت چھوٹا سا ٹیلا تھا اور اس کے نیچے جو یہ جھیل اب نظر آرہی ہے اس وقت یہاں برساتی پانی کا ایک چھوٹا سا گڑھا تھا۔!"

لومڑی گھاس پر لیٹ گئی اور بڑے زور سے ہنسی۔

"کیوں کیوں، تم کیوں ہنس رہی ہو؟" بھیڑیے نے جلدی سے پوچھا۔

"میں اپنی ہنسی روک ہی نہیں سکتی" لومڑی نے جواب دیا "میرے دو بچے ہیں۔ ان میں چھوٹا والا بچہ بالکل تمھاری عمر کا ہے!"

بھیڑیے میاں مات کھا گئے۔ انھیں اپنی ہار پر اتنی شرم آئی کہ وہ آگے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے اور چُپ چاپ وہاں سے کھسک گئے۔

اور ظاہر ہے اب ڈبے کا سارا مکھن لومڑی کے حصہ میں آیا۔

محمد حسین حسّان ندوی

لینن ـــــ اپنے بچپن میں

ولادامیر ایلچ الیانو وو VALADIMIRILYICH ULYANOV (لینن) اپریل ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ نام ہمارے آپ کے لیے بڑا ٹیڑھا سا ہے اس لیے آئندہ ہم وہی نام لکھیں گے جو اس وقت اُن کے دیس روس میں بلکہ ساری دنیا میں مشہور ہے۔ وہی ـــــ لینن

دریائے والگا کے قریب ایک شہر ہے سمبرسک SIMBIR SIK لینن اسی قصبہ یا شہر میں پیدا ہوئے اب اس شہر کا نام انھی کے نام پر الیانوسک ULYANOVSK رکھا گیا ہے۔

لینن کے باپ الیانکولے ای وچ ILYANE KOLAYE VICH پبلک اسکول کے انسپکٹر تھے۔ ابھی یہ تھوڑی عمر کے تھے کہ باپ کا انتقال ہوگیا بڑے بھائی نے سرپرستی کی اور ان کی مدد سے انھوں نے یونی ورسٹی تک تعلیم پائی۔

یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہو کر انھوں نے استادی کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ نمونے کے استاد تھے بڑے حلیم، بردبار، نیک، شریف اپنے شاگردوں کے سچے ہمدرد۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو کبھی سزا نہ دی، کبھی ہیڈ ماسٹر سے ان کی شکایت نہ کی۔ آسان سے آسان عبارت میں بچّوں کو سبق سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اتوار کے اتوار وہ کمزور بچوں کو پڑھاتے تھے جنھیں گھر پر کوئی پڑھانے والا نہ تھا۔ اس لیے ان کے شاگرد انھیں دل سے چاہتے تھے دل سے ان کی عزت کرتے تھے۔

ان کی بیوی ماریا الیکزنڈرو وونا (لینن کی ماں) MARIA ALEKENOROVNI ایک ڈاکٹر کی لڑکی تھیں انھیں سماجی تقریبوں اور مشغلوں سے ذرا دلچسپی نہ تھی وہ بس ہر وقت اپنے بچّوں کے ساتھ گھر ہی پر رہتی تھیں اور ان کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھیں۔

تو بھئی اس نیک، شریف اور ہمدرد گھرانے میں یہ ننھا بچہ (لینن) پروان چڑھا۔ یہ اپنے گھر میں تیسرا بچہ تھا۔ بہت چونچال، چنچل، کھلنڈرا، ہنسوڑ۔ اس کی ایک چھوٹی بہن تھی اولیا (OLYA) اس سے ڈیڑھ برس چھوٹی تھی یہ بھی بڑی پیاری بچی تھی اپنے بھائی لینن کی طرح زندہ دل اور شریر، دونوں گھر میں خوب اودھم مچائے رکھتے تھے۔

پانچ برس کی عمر میں ماں کی نگرانی میں دونوں بھائی بہنوں نے پڑھنا لکھنا شروع کیا ان کے باپ ان کے لیے بچوں کی کتابیں منگواتے تھے۔ [illegible] کے رسالے

منگواتے تھے اور یہ دونوں انھیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے گھنٹوں پڑھتے رہتے تھے۔

تھوڑے ہی دنوں بعد لینن روسی تاریخ کی کہانیاں اور نظمیں پڑھنے لگا۔ پر وہ بڑا ذہین بچہ تھا تھوڑی دیر میں بہت کچھ پڑھ ڈالتا اور پھر وہ اپنی بہن کے ساتھ کھیل کود میں لگ جاتا۔ دونوں خوب بھاگ دوڑ مچاتے سارا گھر سر پر اٹھا لیتے۔ دونوں کو شور غل والے کھیل ہی اچھے لگتے تھے گرمی کے موسم میں وہ لان میں یا باغ میں خوب دوڑیں لگاتے۔ درختوں پر چڑھتے اور اپنے بڑے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیلتے کودتے۔

لینن میاں شریر تو تھے ہی پر ان میں ایک عادت بہت اچھی تھی بہت ہی اچھی شرارت کرتے میں اگر ایسی ویسی بات ہو جاتی کوئی غلطی کر بیٹھتے تو فوراً اسے مان لیتے۔ پانچ برس کے تھے کہ انھوں نے اپنی بڑی بہن کا فٹ رول توڑ دیا اور انھیں یہ بات بتا بھی دی۔ بڑی بہن نے پوچھا تم نے اسے کیسے توڑا انھوں نے فوراً بتا دیا کہ ایسے توڑا۔ لینن کی ماں لینن کی اس بات سے بہت خوش ہوتیں۔ کہتیں میرا بیٹا کبھی گھٹیا بات نہیں کرتا، کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

آٹھ برس کی عمر میں وہ اپنی پھپھی کے ہاں قازان گئے وہاں اسی طرح کی بات ہو گئی۔ بچے کھیل کود رہے تھے۔ ایک کمرے میں چھوٹی سی میز پر شیشے کی صراحی رکھی تھی سب شور مچاتے ہوئے اس کمرے میں گھسے۔ اتفاق سے لینن صاحب میز سے ٹکرا گئے۔ شیشے کی صراحی فرش پر گری اور گرتے ہی پاش پاش ہو گئی۔

اتنے میں پھپھی بھی آگئیں اور پوچھنے لگیں "بچو! یہ صراحی کس نے توڑی ہے؟" اور جناب سب نے ایک ساتھ مل کر نعرہ لگایا "ہم نے نہیں توڑی، ہم نے نہیں توڑی۔" انکار کرنے والوں میں ہمارے لینن میاں بھی تھے۔

اب سنئے۔ تین مہینے کے بعد لینن صاحب اپنے گھر لوٹ آئے تو ایک دن رات کو سوتے وقت ان کی امی بچوں کے کمرے میں گئیں۔ جوں ہی وہ لینن کے پلنگ کے پاس پہنچیں اچانک انھوں نے رونا شروع کیا "میں نے پھپھی کو سچی بات نہیں بتائی کہہ دیا کہ صراحی مجھ سے نہیں ٹوٹی پر وہ مجھی سے ٹوٹی تھی۔"

ساڑھے نو سال کی عمر میں لینن اسکول میں داخل ہو گئے۔ وہ بہت ہی ذہین اور شوقین طالب علم تھے۔ اپنے اور بھائی بہنوں کی طرح ان میں ایک اچھی عادت تھی بہت اچھی جو کام بھی کرتے تھے پوری دلچسپی سے کرتے تھے پوری لگن سے کرتے تھے اس کو انجام دینے میں پوری احتیاط برتتے تھے اور یہ ماں باپ کی اچھی تربیت کا طفیل تھا۔ خصوصاً ان کے باپ نے اپنے سب بچوں کو اسی ڈھنگ پہ ڈھال دیا تھا۔

لینن کے استاد کہا کرتے تھے کہ سبق پڑھاتے وقت استاد کی باتوں کو لینن بہت دھیان سے پوری توجہ سے سنتے تھے۔ اس طرح سبق کا مطلب اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ اس کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ ان کی اپنی ذہانت سے بھی اس میں بہت مدد ملتی تھی۔

شام کے وقت ان کے سب بھائی بہن "ہوم ورک" کے سلسلے میں کھانے کے کمرے میں ایک بڑی میز کے چاروں طرف بیٹھ جاتے تھے۔ سب کے ساتھ لینن بھی۔ لیکن اکثر ہوتا یہ

تھا کہ لینن جلدی سے اپنا سبق دہرا کر کھیل کود میں لگ جاتے تھے۔ اکثر بھائی بہنوں کو پریشان بھی کرتے تھے انھیں پڑھنے نہیں دیتے تھے۔

ان کے باپ گھر میں ہوتے تھے تو وہ انھیں اس کمرے سے لے جاتے تھے۔ ان کے ہوم ورک کو خود دیکھتے تھے اور اچھے ڈھنگ سے انھیں پڑھنے لکھنے میں لگا لیتے تھے۔ لینن ہر سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتے تھے لیکن اگر وہ گھر میں نہ ہوتے تو ڈائننگ روم کا امن و سکون بس تھوڑی دیر کا مہمان ہوتا۔

شطرنج تو بس یوں سمجھیے کہ ان کا خاندانی کھیل تھا۔ لینن کے باپ شطرنج کے شوقین تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کے سب بچوں کو اس کھیل سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ لینن تو آپ جانیے جس کام میں ہاتھ ڈالتے تھے پورے انہماک سے کرتے تھے۔ شطرنج کا کھیل انھوں نے اپنے بڑے بھائی ساشا کی طرح بڑی توجہ سے سیکھا تھا۔ اس کھیل کے بارے میں انھوں نے کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اور تھوڑے دنوں میں اچھے کھلاڑی بن گئے۔

شام کے وقت، گھر میں چہل پہل رہتی۔ سب بچے اسکول سے واپس آجاتے۔ کچھ دیر آرام کرکے پڑھائی میں لگ جاتے پھر تفریحی مشغلوں کی باری آتی۔ شطرنج بھی کھیلا جاتا۔ لینن کے باپ بھی کھیلتے۔ ساشا اور لینن بڑے اچھے کھلاڑی تھے ان کے باپ کو بہت سوچ سمجھ کر چالیں چلنا پڑتیں۔

ہفتے کا دن اس گھر میں خاص طور پر بڑی دلچسپی، بہت خوشی کا دن ہوتا۔ اس دن بچے اپنا اخبار نکالتے تھے۔ یہ ہفتہ وار تھا۔ اس لیے اس کا نام "سپوتنک" رکھا گیا۔ بڑے بھائی ساشا اس کے چیف ایڈیٹر تھے۔ ساشا رنگین پنسلوں سے اس کا خوبصورت سرورق بناتے اور موٹے موٹے حرفوں میں اس کا نام لکھتے۔

ساشا کے علاوہ اس گھر کے اور تمام بچے اسٹاف میں شامل تھے۔ وہ اپنی کہانیاں، لطیفے، اپنی لکھی ہوئی کہانیاں وغیرہ ہر ہفتہ چیف ایڈیٹر ساشا کے حوالے کر دیتے تھے لینن اس وقت شروع کے درجوں میں تھے لیکن وہ بھی اپنے اسکول کے بارے میں اپنے دوستوں کے بارے میں کہانیاں لکھتے۔ اس طرح یہ رسالہ تیار ہوتا۔

شام کو ڈائننگ روم (کھانے کے کمرے) میں سب جمع ہوتے یہ رسالہ شروع سے آخر تک پڑھا جاتا اور پھر سب بچوں میں گشت کرایا جاتا۔ ساشا اپنا ایڈیٹوریل لکھتے۔ اس میں اپنے بہن بھائیوں کے خاکے اڑاتے۔ گھر کے سب لوگ ان خاکوں کو پڑھ کر خوب ہنستے، ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

گرمیوں گرمیوں پورا خاندان کوکوسینکو گاؤں چلا جاتا۔ یہ گاؤں ایک دریا کے کنارے اونچے ٹیلے پر آباد تھا۔ چاروں طرف جنگل تھا، گھاٹیاں تھیں، ڈھلوانوں پر رسیلے پھلوں کی جھاڑیاں تھیں۔ بچے ان جھاڑیوں کے پھل جمع کرتے، مش روم یا گکرمتنا اکٹھا کرتے۔

جنگل کی کھلی ہوا میں انھیں کتنا مزہ آتا، خوب کھیلتے، کودتے، دوڑ لگاتے، شور مچاتے، کبھی گپیں ہانکتے کبھی اچھی اچھی نظمیں پڑھتے، کبھی الاؤ لگاتے، آلو اور کھٹے میٹھے سیب اس میں ڈالتے اور سب مل کر کھاتے کتنی مزے کی زندگی تھی! روزانہ صبح تڑکے اٹھ جاتے جلدی

باقی صفحہ [illegible] پر

جناب خضر برنی

برسات

ٹھنڈی ٹھنڈی چلیں ہوائیں، بدل رہا ہے موسم
کالے اودے دوڑ رہے ہیں "بادل" پورب پچھم
گرمی کے منہ پر لگا طمانچہ، لُو کے تھپیڑے بھاگے
چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے گہری نیند سے جاگے
بارش نے کچھ ایسی شکلیں نئی نئی دکھلائیں
رہتی ہیں جو بلوں میں اپنے نکل کے باہر آئیں
مہکیں کلیاں، پھول کھلے ہیں، لہک رہا ہے سبزہ
غنچوں کی تقدیر تو دیکھو چمن چمن ہے جلوہ
بچّے اپنے ساتھ میں لے کر دوڑ رہی ہے ہرنی
اِس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں شوکت، کمّو، پچھمی
باغ میں جا کر دیکھا ہم نے لٹک رہے ہیں آم
پکّے پکّے ٹپک رہے ہیں کچھ پیڑوں پر خام[1]
آڑو، لیچی اور خوبانی، نیلی نیلی جامن!
چڑھ کر پیڑ پہ توڑ رہے ہیں جن کو حامد لچھمن!
قدم قدم پر پھوٹ رہا ہے بارش سے فوّارا
دیکھ رہے ہیں ننھے منّے قدرت کا نظارا

[1] خام ـ کچّا

کون بُری عادت کو چھوڑ سکتا ہے

ناب محمد امین
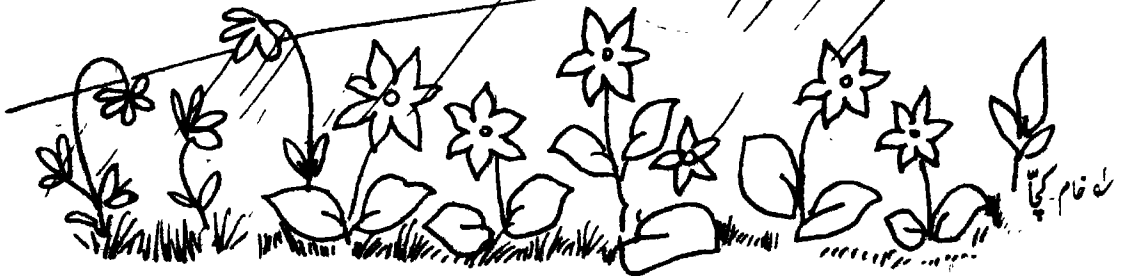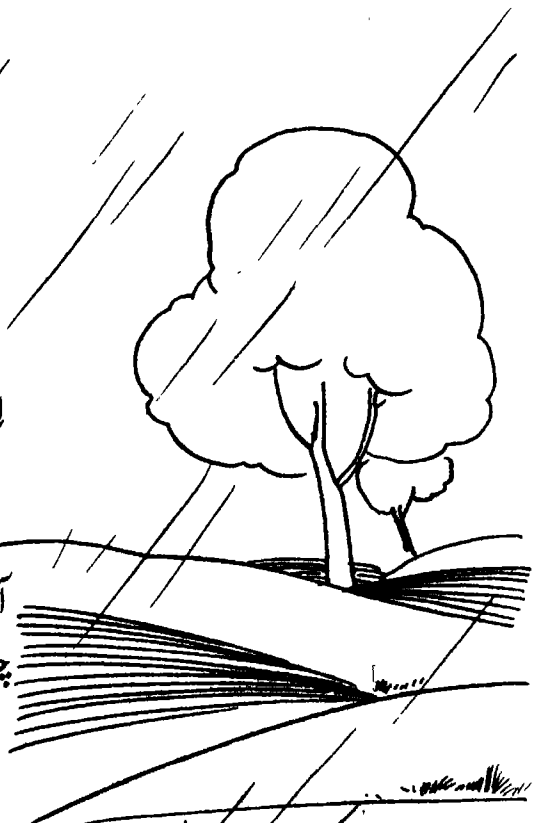
مغربی افریقہ کے جنگل میں دریا کے کنارے ایک درخت کے سائے میں ایک خرگوش بیٹھا تھا اور ایک بندر بیٹھا تھا۔ بندر اپنے جسم کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے برابر کھجلائے جا رہا تھا۔ پہلے اس نے اپنی گردن کو کھجلایا پھر اپنے گھٹنوں کو۔ اپنے لمبے بازوؤں سے یہاں تک کہ وہ اپنی پیٹھ کو بھی کھجلاتا تھا۔ جیسے بدن کھجلانا بندروں کی عادت ہو۔

اب رہے میاں خرگوش تو یہ بھی چپ چاپ نہیں بیٹھے تھے۔ بار بار اپنے نتھنوں سے ہوا کو سونگھتے

ان کی ناک کبھی سکڑتی کبھی پھیلتی۔ اپنا سر بھی برابر ادھر ادھر
گھماتے رہتے اور ان کے لمبے کان پٹ پٹ کرتے۔ گویا
خرگوشوں کی بھی یہی عادت ہے۔ ان کو ہر وقت یہی کھٹکا
رہتا ہے کہ کہیں کوئی جان جوکھوں کی بات تو نہیں۔

دونوں جانوروں نے ایک دوسرے کی حرکتوں
کو بھانپ لیا۔ بندر کی خارش دیکھ کر خرگوش سے نہ
رہا گیا۔ کہنے لگا "یہ تو بتاؤ کہ تم برابر کھجلاتے کیوں رہتے
ہو۔ عجیب بات ہے کہ تم ایک منٹ خاموش نہیں بیٹھتے
ہر وقت اپنے ناخنوں کو جسم میں پیوست کرتے رہتے ہو
تمھاری یہ عادت اچھی نہیں۔"

ظاہر ہے کہ اگر کوئی کسی کو لعن طعن کرے تو
بہت کھلتا ہے۔ اس لیے بندر نے بھی تابڑ توڑ جواب
دیا "میرے پیارے خرگوش! میری عادت تمھاری عادت
سے بری نہیں۔ تم بھی تو آخر خاموش نہیں بیٹھتے۔ ذرا اپنی
ناک کو تو دیکھو، برابر سکڑتی اور پھیلتی ہے۔ تمھارے لمبے
کان بھی پٹ پٹ بجتے رہتے ہیں۔ ہر لمحہ ڈرپوک کی طرح
تم اپنے سر کو ادھر ادھر کیوں گھماتے ہو جیسے یہی تمھارا
شیوہ ہے اور دہشت زدہ رہنا تمھاری فطرت میں
داخل ہے۔"

"یہ صحیح ہے کہ میں اپنی ناک سکیڑتا اور سر ہلاتا ہوں
لیکن جب چاہوں آسانی سے خاموش بھی بیٹھ سکتا ہوں"
خرگوش نے کہا

"میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ تم ایسا نہیں
کر سکتے۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے میں جب چاہوں چپ
سکتا ہوں۔" پھر بندر نے اپنے چاروں پنجوں کو
ایک ساتھ جوڑ لیا اور کھجلانا بند کر دیا۔

دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے سے الجھے
رہے اور یہ کہتے رہے "میں اپنی عادت چھوڑ سکتا ہوں
لیکن تم میں ہمت نہیں۔"

"اگر تم چھوڑ سکتے ہو تو میں بھی ایسا کر سکتا ہوں"
دونوں اسی طرح سر مغزنی کرتے رہے۔ آخر کار بندر سے
ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے کہا: "چلو ہم ایک دوسرے کو آزمائیں
دیکھیں ہم میں کس کے رگ پٹھے مضبوط ہیں اور اپنے اوپر
قابو رکھ کر اپنی بری عادتوں کو چھوڑ سکتے ہیں۔ ابھی ہم
دونوں کی شرط ہو جائے۔ میں دوپہر سے شام تک
خاموش بیٹھ سکتا ہوں لیکن میرا دعویٰ ہے کہ تم ایک لمحہ
ایسا نہیں کر سکتے۔"

"بہت خوب" اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ
خرگوش تیار ہو جائے۔ "اگر ہم میں کوئی ہلا تو وہ شرط
ہار جائے گا" اس نے سنبھل کر اطمینان سے آخری بار اپنے
سر کو ہلایا اور اپنی ناک کو سکیڑا۔

دونوں جہاں بیٹھے تھے وہیں جم کر بیٹھ گئے۔ پر
یہ کام تھا دونوں کے لیے مشکل۔ خواہ مخواہ شرط کی مصیبت
مول لے لی۔ دونوں یہی سوچ رہے تھے۔ دل میں
یہ بھی خیال آیا کہ چلو آج آزما کر اسے دیکھ ہی لیں لیکن
حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں سے کوئی خوش نہیں تھا۔

ساری عمر بندر کو کبھی بھی اپنے جسم کی خارش
اور خشکی کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ ادھر خرگوش کا بھی
برا حال تھا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسے برابر ڈر لگا
تھا کہ کہیں ...

ضبط کیا۔ خرگوش نے بھی اپنا سر نہیں ہلایا۔

شرط بندھے ابھی کوئی خاص دیر نہیں ہوئی تھی انھوں نے دیکھا کہ ان کے پاس سے جو کیڑا رینگ رہا تھا ابھی مشکل سے دریا کے کنارے چند گز آگے چڑھ پایا تھا لیکن دونوں کو ایسا لگ رہا تھا کہ شرط باندھے شاید پورا دن گزر گیا ہے "کیا کروں؟" خرگوش سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ "واقعی دیر تک خاموش رہنا مشکل ہے۔ برے پھنسے۔ کاش ایک بار ہی میں سونگھ سکوں! اپنا سر بھی کچھ نہیں تو آدھی دور ہی گھما سکوں! شاید پھر مجھے زیادہ نہیں کھلے گا۔"

بندر صاحب کا حال بھی پتلا تھا۔ ان کے جسم میں آگ لگ رہی تھی۔ کھجلی بری طرح تنگ کر رہی تھی۔ انھوں نے سوچا "دیر تک کھجلانے سے میں اپنے آپ کو روک نہیں سکتا۔ یہ خرگوش اگر میری طرف نہ دیکھتا تو ایک بار تو میں کم سے کم کھجلا ہی لیتا۔"

خرگوش سے رہا نہ گیا اور اس نے کہا "میرے دوست بندر! دیکھو کافی دیر ہو چکی ہے۔ جہاں تک میرا سوال ہے مجھے پروا نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن ابھی دن بہت پڑا ہے، زیادہ اچھا یہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کو کہانی سنائیں۔ اس طرح جلدی وقت گزر جائے گا۔"

بندر نے سوچا شاید اس میں خرگوش کی کوئی چال ہے۔ اس نے جواب دیا "ٹھیک ہے۔ تجویز مناسب ہے۔"

"تو پھر سنو۔ پہلے میں سناتا ہوں۔ پچھلے مہینے ایک دن کی بات ہے کہ میں جنگل میں دور نکل گیا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر میں نے دیکھا کہ جنگل صاف ہے اور میرے چھپنے کے لیے ایک جھاڑی بھی نہیں۔"

بندر سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ دل ہی دل میں پریشان کہ یہ خرگوش کیا چال بازی دکھا رہا ہے۔ اگرچہ اپنے طور پر وہ بھی تیار تھا۔ اس نے کہا "خرگوش صاحب! یہی واقعہ میرے ساتھ بھی ایک بار پیش آیا تھا۔"

"ذرا سنو تو" خرگوش کو کہانی سنانے کی جلدی تھی۔ "پھر یہ ہوا کہ ایک طرف سے لمبی گھاس کے اندر سے آواز آئی" ہر کہانی سنانے والے کی طرح اس نے ایک طرف اپنی گردن گھمائی کہ اشارے سے سمجھائے "میں نے دیکھا کہ کچھ لکڑ بھگے میری طرف بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ ایک ادھر سے آیا، دوسرا ادھر سے آیا" اس طرح بار بار خرگوش نے اپنا سر ہلا کر سمجھایا۔

"بہت سارے لکڑ بھگے میری طرف لپکے کچھ داہنی طرف سے، کچھ بائیں طرف سے اور کچھ سامنے سے۔" اب تو خرگوش کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ وہ کہانی سنانے کے بہانے اپنا سر خوب ہلا رہا تھا اور ناک کو بھی برابر سکوڑ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب کہانی میں ایسے خطرے در پیش آئیں تو کہانی سنانے والا یہی کرے گا۔

بندر کو احساس ہوا کہ اچھا تو خرگوش میاں کی یہ چال ہے! سانس لینے کے لیے جو خرگوش رکا تو جھٹ بندر نے اپنی کہانی شروع کر دی۔

اس نے کہا "ایک دن کی بات ہے کہ جنگل کے پار میں ایک گاؤں میں گیا۔ وہاں کچھ بچوں نے مجھے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی میرے اوپر انھوں نے پتھر پھینکے!

ایک پتھر یہاں آکر لگا" بندر نے لپک کر اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا اور اسی بہانے اس نے گردن کو کھجلا لیا۔ کافی مزا آیا۔

"دوسرا پتھر یہاں آکر لگا" بندر نے اب کی بار اپنے شانے کو کھجلایا۔" اور پھر پتھر ہی پتھر آنے لگے۔ ان کی بارش شروع ہوگئی"۔ اب تو بندر صاحب کے پنجے پورے جسم پر تیزی سے چل رہے تھے اور وہ مزے سے کھجلاتے جاتے تھے۔

اب تو خرگوش ضبط نہ کر سکا۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ مارے ہنسی کے اس کا برا حال تھا۔ بندر سے بھی نہ رہا گیا۔ وہ بھی ہنس پڑا۔ دونوں سمجھ گئے کہ کہانی سنانے کا مقصد کیا تھا۔

پھر تو دونوں ٹھٹھے مار مار کر دیر تک ہنستے رہے اس قدر ہنسے، اس قدر ہنسے کہ بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ دونوں ایک دوسرے کو سہارا نہ دیتے تو صاف دریا میں گر جاتے۔

بندر نے چیخ کر کہا "دیکھو بھئی دیکھو میں ابھی شرط نہیں ہارا ہوں"۔

خرگوش نے جواب دیا "نہ میں ہارا ہوں۔ ہم دراصل ایک دوسرے کو کہانی سنا رہے تھے۔ اور کہانی سنانے میں جو ہوتا ہے وہی ہم کر رہے تھے"۔

"لیکن دیکھو دوست سچی بات تو یہ ہے کہ بری عادتیں چھوڑنا اتنا آسان نہیں۔ کوئی بھی آسانی سے اپنی عادت نہیں بدل سکتا۔ اچھا چلو قصہ ختم کرو"۔

اس طرح خرگوش کی ناک پھر سکڑنے اور پھیلنے لگی۔ اس کا سر ہلنے لگا اور اس کے کان پٹ پٹ بجنے لگے۔

بندر بھی خاموش نہیں بیٹھا۔ اس کے پنجے ایک دم حرکت میں آگئے۔ جہاں اسے کھجلی محسوس ہوتی وہ لپک کر کھجلاتا۔

اس وقت سے لے کر اب تک ان جانوروں کے خاندان میں کوئی بھی خاموش نہیں بیٹھا۔ ہاں سونے کی، آرام کرنے کی بات دوسری ہے۔

مُنّے کی ناؤ

چھوٹی سی ہے میری نیّا
اس کو چلاتے رامو بھیّا
یہ تو ہے ساگر میں چلتی
پانی میں ہے خوب مچلتی

دھیرے دھیرے چلتی ہے یہ
کیونکہ مجھ سے ڈرتی ہے یہ
جب کہتا ہوں رک جاتی ہے
جب کہتا ہوں چل دیتی ہے

چھوٹی سی ہے میری نیّا
اس کو چلاتے رامو بھیّا

سید ذوالفقار احمد مبارکپور

جناب سعادت نظیر

صُبح

وہ آسماں کے تارے غائب ہوئے نظر سے
جو جھلملا رہے تھے بن کر چراغ شب کے

لو کارواں سحر کا، مشرق کی سمت آیا
ہر پھول مسکرایا، ہر باغ ڈہڈہایا

آغوش میں افق کی سورج نے آنکھ کھولی
ہر چیز کو عطا کی رعنائی زندگی کی

چھیڑے سریلے نغمے فطرت کی بانسری نے
پائی زبان گویا جنگل کی خامشی نے

وہ باغ کے پرندے شاخوں پہ بیٹھے جم کے
سب کو جگا رہے ہیں گا کر نئے ترانے

سویا ہوا زمانہ کروٹ بدل رہا ہے
ہر سمت روشنی کا چشمہ اُبل رہا ہے

شہروں میں زندگی ہے قصبوں میں زندگی ہے
ہر سو چہل پہل ہے، ہر سمت تازگی ہے

عالم نیا نیا ہے، نکھری ہوئی فضا ہے
ہر ذرہ اِس زمیں کا رنگین ہو گیا ہے

محترمہ آصفہ مجیب

(ننھے پیامیوں کے لیے)

لال شہزادہ

ایک بادشاہ تھا۔ اللہ میاں نے اس کو سات بیٹے دیے تھے۔ چھوٹے بیٹے کو وہ سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ پیار سے اُسے لال شہزادہ کہتا تھا۔ لال شہزادہ تھا بھی بڑا ہونہار۔ عادتیں بہت اچھی تھیں۔ سب کا کہنا مانتا، سب کی عزت کرتا۔ اسی وجہ سے سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ سب کو دل سے عزیز تھا۔

جب بیٹے بڑے ہوئے، بادشاہ سلامت نے سب کی شادیاں ٹھہرائیں۔ خوب تیاریاں ہونے لگیں۔ خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ آخر بارات کا دن آیا۔ سب شہزادوں کو دولھا بنایا گیا۔ سبھی اچھے لگ رہے تھے۔ مگر لال شہزادہ تو بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔ ماں باپ صدقے ہو رہے تھے اور سب بلائیں لے رہے تھے۔

پر اچانک ایک عجیب اتفاق ہوا۔ اُدھر سے پریوں کا تخت گزر رہا تھا۔ انھوں نے جو اتنا سُندر سماں دیکھا تو نیچے اتر آئیں اور لال شہزادہ کو تخت پر بٹھا کر اڑا لے گئیں۔ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ایک کہرام مچ گیا۔ ماں باپ پچھاڑیں کھانے لگے۔

سب سوچ میں تھے کہ شہزادہ کیسے ملے۔ بغیر دولھا کے بارات کیسے جائے اور پھر دوسری سلطنت والوں کو، سسرال والوں کو کیا جواب دیں؟ بادشاہ کا وزیر بڑا سمجھ دار تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ بارات جائے گی۔ دلہن والوں سے کہا جائے گا کہ دولہا اتفاق سے بیمار ہو گیا ہے۔ ہم ساتھ نہیں لا سکے، دلہن کو رخصت کردیں۔

سب شہزادے اپنی اپنی دلھنیں لے آئے۔ چھوٹی دلھن کو دوسرے لوگ لے آئے۔ جب وہ محل میں اتری دیر تک انتظار کرتی رہی کہ کہیں تو اس کا بیمار دولہا نظر آئے مگر وہ کہیں نہیں تھا۔ کوئی کہتا: اسے دیو لے گئے۔ کوئی کہتا: اسے پریاں لے گئیں۔ دلہن سُن سُن کر پریشان ہوتی۔

ایک دن کیا ہوا کہ ایک فقیر آیا۔ اس نے پوچھا "بیٹی تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"

شہزادی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے بولی، "میرا شہزادہ غائب ہے، قسمت پھوٹ گئی۔ اب یہ آس

ملنے کو جی رہی ہوں کہ وہ آجائے۔"

فقیر کو بڑا ترس آیا۔ کہا: "چل بیٹی تو میرے ساتھ چل۔ میں کوشش کروں گا کہ تیرا شہزادہ تجھے مل جائے۔"

دلہن شہزادی فوراً تیار ہو گئی اور فقیر بابا کے ساتھ چل پڑی۔

چلتے چلتے بہت دن بیت گئے۔ جنگل بیابان پہاڑ، ندی، دریا پار کیے۔ ایک دن ایک بہت گھنے جنگل سے دونوں گزر رہے تھے کہ عجیب عجیب ڈراؤنی آوازیں کانوں میں آنے لگیں۔ فقیر نے کہا: "بیٹی خبردار پیچھے مُڑ کر نہ دیکھنا ورنہ پتھر بن جاؤ گی۔"

آخر تھوڑی دور چل کر ایک عالیشان سنہرا محل نظر آیا۔ فقیر نے شہزادی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: آنکھیں بند کر لو۔ شہزادی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ اُڑ رہی ہے۔ جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک نہایت حسین شہزادہ کرسی پر بیٹھا اسے دیکھ رہا ہے۔ فقیر نے شہزادے سے کہا:

"لے بچہ سنبھال اپنی امانت کو!" یہ کہہ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

شہزادہ اپنی دُلہن کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اُسے آرام سے بٹھایا۔ لیکن فوراً پریشان سا معلوم ہونے لگا۔

شہزادی نے پوچھا: "کیا بات ہے، آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ کیسی مبارک گھڑی ہے کہ ہم ملے ہیں۔"

شہزادہ بولا: "ہاں شہزادی، تم نے بڑی مصیبتیں جھیلیں۔ آج خدا نے ہمیں ملایا ہے۔ ہزار ہزار شکر ہے۔ مگر مجھے یہ ڈر لگ رہا ہے کہ ابھی پری آئے گی اور تمھیں مار ڈالے گی۔ یہی سوچ رہا ہوں کہ تمھیں کیسے اس ظالم سے بچاؤں؟" پھر خوش ہو کر کہا "ہاں ابھی مجھے فقیر بابا کی بات یاد آ گئی۔ جب پری کے آنے کا وقت آئے گا میں تمھیں بتا دوں گا۔ تم بس اُس درخت پر بیٹھ جانا اس کی یہ تاثیر ہے کہ کوئی انسان اس پر بیٹھ جائے تو چڑیا بن جاتا ہے۔ اسے جب آدمی بنانا چاہیں تو درخت کا پھول توڑ کر چڑیا کی ناک میں لگا دیں۔ وہ پھر آدمی ہو جاتا ہے۔"

شہزادی خوشی سے بولی: "اچھا تب تو میں اطمینان سے تمھارے پاس رہ سکوں گی۔"

اور یوں اطمینان سے دونوں رہنے لگے۔ مگر کچھ دنوں اس طرح رہتے رہتے شہزادی کا جی گھبرانے لگا۔ ایک دن اس نے کہا: "آخر شہزادے ہم لوگ کب تک ایسے رہیں گے اب تم اپنی سلطنت واپس چلو۔ تمھارے لیے سب تڑپ رہے ہیں۔"

شہزادے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے حسرت سے بولا، "میں آزاد ہوتا تو کب کا اپنے پیارے وطن اور ماں باپ کے پاس پہنچ چکا ہوتا۔ مصیبت تو یہی ہے کہ پری نے مجھے یہاں قید کر رکھا ہے۔ کہیں جانے کی اجازت

نہیں دیتی۔ بس ایک ترکیب ہے اگر تم کر سکو۔
تم میری سلطنت میں واپس جاؤ اور ابا جان
سے کہو کہ وہاں خوب اچھا سا جشن کریں۔ اس
میں سب پریوں کو بلائیں۔ جب یہ سب اکٹھی
ہوں تو بڑی بھابھی اپنے بچے کے چٹکی لے
لیں وہ رونے لگے گا۔ یہ ہاں پوچھیں گی کہ یہ
کیا ہوا تو کہیں کہ لال پری یہ ہار جو پہنے ہے
یہی مانگ رہا ہے۔ تم بھی بچے کو سکھا دینا کہ
ہار کے لیے مچل جائے۔ ہار میں ہیرے،
موتی اور لعل جڑے ہیں۔ اس میں میری جان
ہے۔ جب وہ ہار پری بچے کو دے گی میں تمہارے
پاس آ جاؤں گا۔"

شہزادی یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور
تن تنہا اتنے بڑے سفر کے لیے نکل کھڑی
ہوئی۔ راستے میں اس نے بہت دکھ اور مصیبتیں
جھیلیں اور محل پہنچ کر سب کو شہزادے کے
ملنے کی خوش خبری سنائی۔ ہر طرف خوشی چھا گئی
شہزادے کی سلامتی اور جلد واپسی کی دعائیں
مانگی جانے لگیں۔ جشن کی تیاریاں بڑے زوروں
میں شروع ہوئیں۔ پریوں کو دعوت نامے
بھیجے گئے۔

اللہ اللہ! کیا شاندار جشن تھا۔ چپہ چپہ پر
بہار تھی۔ محل خوب سجایا گیا تھا۔ پریوں کا
جمگھٹ تھا۔ خوشی کے ترانے گونج رہے تھے
پھر شہزادے نے جیسا بتایا تھا ویسا ہی کیا گیا۔
بچہ ہار کے لیے مچل گیا۔ روتے روتے ہلکان
ہو گیا۔ دوسری پریوں نے لال پری سے کہا
"اے بہن دے دو نا۔ ہار کی کیا حقیقت ہے۔
بچہ ہلکان ہوا جا رہا ہے۔"

پری نے غصے سے ہار اتار کر بچے کے
سامنے ڈال دیا اور فوراً اڑ گئی کہ شہزادے
کو جا کر پکڑ لے اور آنے نہ دے۔ مگر شہزادہ
اس سے پہلے محل میں آ کر چھپ گیا۔ کب کے
بچھڑے ماں باپ بھائی ملے۔ مارے خوشی کے
سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ سبھی خوش
تھے اور خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔

بقایا صفحہ ۱۲

جلدی ناشتہ کرتے اور کھیل کود میں لگ جاتے۔
لینن کو تو قدرتی نظاروں سے جیسے عشق تھا۔
پہاڑوں اور جنگلوں کی سیر کا بہت شوق تھا۔ ڈوبتے سورج
کا منظر دیکھ کر کھو جاتے تھے اسی لیے اس گاؤں کی زندگی
میں انھیں سب سے زیادہ لطف آتا تھا۔

لینن کو اپنے بڑے بھائی شاسا سے غیر معمولی
محبت تھی۔ بہت گہرا لگاؤ تھا وہ ہر بات میں ان کی نقل
کرتے تھے۔ یوں بھی سب بھائی بہنوں [illegible] شاسا کی زندگی
نمونے کی زندگی تھی۔ سب انھی کے ڈھنگ پر چلنے کی
کوشش کرتے تھے۔ لینن تو چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی
ان کی نقل کرتے تھے۔ (باقی)

نایاب علیم الدین

آسٹریلیا کے چند انوکھے جانور

ہم آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ آسٹریلیا میں تقریباً سات سو قسم کے پرندے پائے جاتے ہیں جن میں چار سو سے زیادہ یہاں کے اصل پرندے ہیں جو کہیں اور نہیں پائے جاتے اور ان خصوصیات کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہیں اور لوگ ان کو چڑیا گھروں میں رکھتے ہیں۔ اب ہم آپ کو چند پرندوں کے حالات بتاتے ہیں۔

ایمو (EMU)

آسٹریلیا ایمو کا گھر کہلاتا ہے کیونکہ ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ قد کے لحاظ سے یہ دنیا کا دوسرا بڑا پرندہ ہے یعنی افریقہ کے شتر مرغ (OSTRICH) کے بعد اس کا قد ۶ فٹ کا ہوتا ہے اور بھاری ہونے کی وجہ سے یہ اُڑنے سے مجبور ہے یعنی اڑ نہیں سکتا۔

ایمو آسٹریلیا کے مختلف علاقوں میں پایا جاتا ہے جیسے نیو ساؤتھ ویلس، مغربی کوئنس لینڈ، جنوبی آسٹریلیا کے شمال میں اور مغربی آسٹریلیا کے جنوب میں خصوصاً بہت پایا جاتا ہے۔

عموماً ایمو گروپ اور پارٹی کی شکل میں رہتے ہیں۔ پانچ پانچ اور سات سات کے گروپ میں اکٹھے رہتے ہیں اور کبھی کبھی جوڑے بھی گھومتے نظر آتے ہیں لیکن ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوتا کہ ایمو اکیلا پایا جائے۔ اس وجہ سے ان کا شمار جھنڈ میں اور غول میں رہنے والے پرندوں میں ہوتا ہے۔

انڈے دینے کا وقت یوں تو پورے سال رہتا ہے لیکن پھر بھی جب مناسب موسم اور موزوں حالات ہوں تو اسی وقت انڈے دیتے ہیں۔ عام طور سے اندرونی خشک علاقوں میں جہاں بارش وغیرہ نہیں ہوتی، یہ انڈے دیتے ہیں۔ درختوں اور جھاڑیوں کے نیچے یہ اپنا گھونسلہ یا گھر بناتے ہیں اور اسی میں انڈے دیتے ہیں۔ مادہ ایمو ایک وقت میں تقریباً ۱۵ انڈے دیتی ہے۔ ہر انڈے کا وزن ۲۰ آونس ہوتا ہے جو کہ

ہمارے یہاں کی مرغیوں کے ۱۴ انڈوں کے برابر ہوتا ہے ایک انڈے کی لمبائی ۵ اینچ ہوتی ہے اور اس میں مرغی کے دس انڈوں کے برابر غذائیت ہوتی ہے۔

ایمو کی ٹانگیں بڑی لمبی اور مضبوط ہوتی ہیں۔ اپنی ان ٹانگوں سے یہ فائدہ بھی خوب اٹھاتا ہے یعنی ان کی وجہ سے بہت تیزی کے ساتھ دوڑ سکتا ہے۔ عموماً تمام پرندوں کے پنجوں میں چار انگلیاں ہوتی ہیں لیکن ایمو کے صرف تین ہی انگلیاں ہوتی ہیں۔ اس کے جسم کا رنگ بالکل زمین کے رنگ کی طرح ہوتا ہے۔ آنکھیں سرخ رنگ کی ہوتی ہیں۔ پروں کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اونٹ پر بہت سارے بورے لاد رکھے ہوں۔ یہ اپنے قدم بہت ہی ہلکے ہلکے بغیر آواز کیے اٹھا سکتا ہے۔ چوں کہ زمین کے مشابہ رنگ ہوتا ہے اس وجہ سے بہت آسانی کے ساتھ چھپ جاتا ہے۔ اس وقت اس کا نظر آنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ قدرت نے اس کو قدرتی طور سے دشمن سے بچنے کی غرض سے یہ خوبی عطا کی ہے۔ (اس کو ہم فوجی اصطلاح میں CAMOUFLAGE کہتے ہیں جس کے معنی ہیں دشمن کو دھوکا دینے اور اس کی نظر سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو جگہ کے مطابق ڈھال لینا۔

اگر کبھی آپ کا اتفاق ان کے جنگلات میں جانے کا ہو تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ یہاں پر کوئی جانور نہیں رہتا لیکن اچانک ہی لمبی لمبی گردنوں اور لمبی لمبی ٹانگوں والے ایموؤں کا گروپ کا گروپ آپ کے سامنے ظاہر ہو جائے گا اور آپ حیران رہ جائیں گے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے جادو کے ذریعے اچانک ہی زمین سے نکال دیے ہوں۔

گھنے جنگلات یا گھنی گھاس کے علاقے میں یہ پانی کے نزدیک رہتے ہیں۔ ان کی غذا گھاس، سبزی اور چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑے ہیں۔ تھوڑی سی غذا اور تھوڑے پانی پر یہ کئی دنوں تک رہ سکتا ہے۔ غذا کی تلاش میں یہ بہت دُور دُور نکل جاتے ہیں۔ ساحل کے قریب رہنے والے ایمو تیرنے کے فن سے بھی خوب واقف ہوتے ہیں۔

ایمو کا بچہ (چوزہ) بہت ہی پیارا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے نائٹ سوٹ پہن رکھا ہو۔ آپ کے سامنے ہوتے ہوئے بھی یہ آپ کو بہت مشکل سے ہی نظر آسکتا ہے کیوں کہ یہ بالکل اسی جگہ کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی بہترین قسم کا CAMOUFLAGE ہوتا ہے۔

چھپن دن تک یہ انڈے میں رہتا ہے اور جب یہ انڈے سے نکلتا ہے تو پوری طرح تیار ہوتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی۔ اس کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ انڈے سے نکل کر فوراً ہی دوڑنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود کئی ہفتے تک یہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا ہے۔ عام طور سے یہ بچہ اپنے باپ کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور رات کو بھی اسی کے پروں میں منھ چھپا کر سوتا ہے۔

ایمو بہت ہی نڈر اور بہادر پرندہ ہے۔ کاروں اور موٹروں کے بالکل نزدیک آجاتا ہے۔ فوٹو کھنچوانے کا شوق اس کو بہت زیادہ ہے۔ جب کبھی اس کا فوٹو لیتے ہیں تو یہ بالکل کیمرے کے لینسوں کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بہت ہی مشہور پرندہ ہے۔

دوسرا اہم اور عجیب و غریب پرندہ کوکابرا ہے۔

کوکابرا KOOKABURRA

یہ آسٹریلیا کا بہت مشہور پرندہ ہے اور اسے انگریزی میں " LAUGHING JACKASS " بھی کہتے ہیں جس کا ترجمہ کریں تو اس کا مطلب ہوتا ہے "ہنستا ہوا گدھا" آپ پوچھیں گے کہ اس کو ہنستا ہوا گدھا کیوں کہتے ہیں تو بھئی اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ ہنستا ہے تو بہت ہی زور سے ہنستا ہے۔ جیسے کوئی گدھا ہنس رہا ہو۔ بہت ہی دل کھول کر ہنستا ہے۔ آسٹریلیا کی جھاڑیوں میں عام طور سے انسانوں کی ہنسی کی مانوس آوازیں آتی رہتی ہیں۔ وہاں کوئی آدمی نہیں ہوتا بلکہ یہی کوکابرا صاحب ہوتے ہیں۔

کوکابرا کنگ فشر (یعنی مچھلیوں کا بادشاہ) سے بڑا ہوتا ہے لیکن بہت حد تک اسی سے مشابہہ ہوتا ہے۔ بڑا سا سر اور مضبوط گردن ہوتی ہے۔ اس کی غذا گرگٹ، چھوٹے سانپ اور چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے ہیں۔ اپنا گھونسلہ درختوں کے سوراخوں میں بناتا ہے شمالی آسٹریلیا میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

اس کی دوسری قسم آزُر کنگ فشر ہے۔ اس کی غذا صرف مچھلیاں ہیں۔ بڑی ہی چالاکی سے مچھلیوں کا شکار کرتا ہے۔

کوکیٹو COCKATOO

رنگ برنگے کوکیٹو کی تقریباً ۵ قسمیں آسٹریلیا میں پائی جاتی ہیں۔ یوں تو یہ ہمارے یہاں کے طوطوں سے ملتے جلتے ہیں لیکن ان سے بہت زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ اور بناوٹ کے لحاظ سے بھی کچھ مختلف ہوتے ہیں پیلے، سفید، گلابی، نیلے، ہرے، کالے، غرض ہر رنگ کے رنگ برنگے ہوتے ہیں۔

یہ عام طور سے ساحلی پہاڑوں کے اندرونی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان علاقوں کو سوانا یا بارش کے جنگلات بھی کہتے ہیں۔ پھل ان کی خاص اور مرغوب غذا ہے لیکن گیہوں اور چاول کے کھیتوں میں بھی گھس کر فصل کا نقصان کر جاتے ہیں۔

درختوں کے سوراخوں میں انڈے دیتے ہیں۔

ان کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ اپنا زیادہ تر وقت زمین پر گزارتے ہیں۔ پیڑوں پر تو شاذ ہی نظر آتے ہیں یا پھر گھومتے ملیں

جناب اقبال نصیب

بچوں کی دعا

جہانوں کے مالک زمانے کے آقا　　تو معصوم بندوں کی فریاد سن لے
ہمیں شوق دے علم کی برتری کا　　ہمیں حوصلہ دے نئی زندگی کا
بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلیں ہم　　زمانے کی آنکھوں کا تارا بنیں ہم

جہانوں کے مالک، زمانے کے آقا
تو معصوم بندوں کی فریاد سن لے

ہوں خوش ہم سے استاد، ایسی خوشی دے　　دعائیں دیں ماں باپ، وہ زندگی دے
ہم علم و ادب سے کریں نام پیدا　　وطن کے لیے بھی کریں کام اچھا

جہانوں کے مالک، زمانے کے آقا
تو معصوم بندوں کی فریاد سن لے

کرم کر غریبوں کی فریاد سن لے　　سبھی غم نصیبوں کی فریاد سن لے
ہمیں علم و اخلاق کی آگہی دے　　دلوں میں بھی ایمان کی روشنی دے

جہانوں کے مالک، زمانے کے آقا
تو معصوم بندوں کی فریاد سن لے

سہاروں میں تیرا سہارا بڑا ہے　　تو ہی ساری دنیا کا حاجت روا ہے
وفا آشنا ہم کو قلب و نظر دے　　زمانے کے دکھ درد آسان کر دے

جہانوں کے مالک، زمانے کے آقا
تو معصوم بندوں کی فریاد سن لے

جناب شعیب اعظمی۔
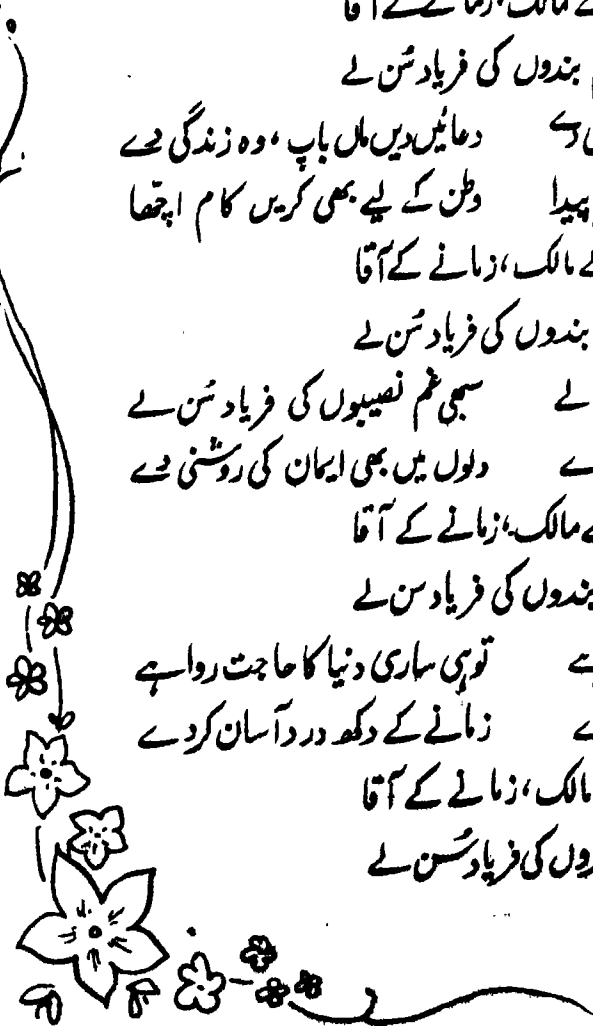
غالب کی کہانی خود اُن کی زبانی
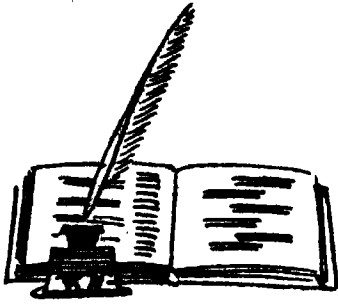
(سلسلے کے لیے مئی کا پرچہ دیکھیے)

پھر بھی غالب کا دل بہت درد مند تھا۔ وہ لوگوں کی تکلیف سے خوش نہ تھے لیکن بات اپنے بس کی بھی نہ تھی۔ ایک خط میں ان کا یہ درد کس طرح پڑھنے والے کو محسوس ہو جاتا ہے۔

"نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسّی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی، جس شہر میں رہوں وہاں کوئی بھوکا ننگا نہ نظر آئے۔"

غالب دہلی میں بہت کم عمری میں آگئے تھے اسی میں اُن کا بچپن گزرا تھا۔ جوانی کے اچھے دن بتائے تھے۔ دہلی کی سج دھج اور آن بان دیکھی تھی۔ مگر یہی دہلی ان کے سامنے لٹ گئی تباہ و برباد ہو گئی۔ غدر کی لڑائی نے شہر کی اور بازاروں کی رونق ختم کر دی۔ انگریزوں نے دہلی کا نقشہ ہی بدل دیا۔ بہت دنوں تک دہلی اجڑی رہی، ویران اور سنسان رہی۔ غالب نے بار بار اپنے خطوں میں دہلی کا حال افسوس اور رنج کے ساتھ لکھا ہے۔ غالب پر خود انگریزوں کو باغیوں کے ساتھ مل جانے کا شبہ تھا اور اس لیے غالب گھر سے کم باہر نکلتے تھے۔ مگر شہر کا حال لکھتے ہیں:

"شہر کا حال کیا جانوں کیا ہے؟ سوائے اناج اور اپلوں کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد ۲۵-۲۵ فٹ گول میدان نکلے گا دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کی بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے بھاوڑا چل رہا ہے۔ کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں؟ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دہلی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں تھا۔"

انگریز سرکار نے جامع مسجد پر پہرہ بٹھا دیا تھا کوئی آ جا نہ

سکتا تھا۔ غالب اپنے خطوں میں کئی جگہ اس کا ذکر کرتے ہیں ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"جامع مسجد پر پابندی لگادی گئی تھی اور
اُسے گرادینے کی تیاری تھی مگر مسجد جامع
واگذاشت ہوگئی۔ چتلی قبر کی سیڑھیوں پر
کبابیوں نے دکانیں بنالیں انڈا مرغی،
کبوتر بکنے لگا۔"

غالب دلی کے گلی کوچوں سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔ وہ ان کا نقشہ اور رونق یاد کرتے ہیں اور اس طرح بیان کرتے ہیں گویا ہماری آنکھوں کے سامنے وہ چیزیں ہیں۔ غدر کی تباہی نے دلی میں میٹھے پانی کا کال کردیا۔ غالب بھی تماشے کو نکلتے ہیں۔

"مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند
ہوگیا، لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری
ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم
پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہوکر
کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔
جامع مسجد ہوتا ہوا راج گھاٹ کے
دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ
تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے
اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ
جائیں تو ہُو کا میدان ہوجائے۔ یاد کرو
مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو
کئی بانس نشیب تھا۔ اب باغیچہ کے صحن
کے برابر ہوگیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا
دروازہ بند ہوگیا۔ فصیل کے کنگورے
کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری
دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب
آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے
سے کابل دروازہ تک میدان ہوگیا
پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رامجی گنج،
سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی
حویلی، ان میں کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ
مختصر شہر صحرا ہوگیا۔ اب جو کنوئیں جاتے
رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا تو یہ
صحرا صحرائے کربلا ہوجائے گا۔"

دہلی اردو زبان کا مرکز تھی اور دلی والوں کو اس پر ناز تھا۔ غدر کی الٹ پلٹ نے وہاں کی زبان بھی ختم کردی۔ غالب اپنے دوست کو یاد دلاتے ہیں۔

"اللہ اللہ دلی والے ابھی تک یہاں
کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ ارے
بندۂ خدا، اُردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں؟
دلی واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے، چھاؤنی
ہے نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار۔"

خط لکھنا اور ان کا پابندی سے جواب دینا غالب کا عزیز ترین مشغلہ تھا۔ ان کے دن کا زیادہ وقت اسی خط و کتابت میں گزرتا تھا۔ اسی کے سہارے یہاں کا دن کٹ جاتا تھا۔ غالب کو اپنے خط لکھنے پر اور اس کے طریقہ پر ناز تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میرے خط میں وہ مزا ہوتا ہے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کرتے ہیں کسی کا

خط آجانا گویا اس کا آجانا تھا۔ وہ خط میں یوں بتاتے ہیں۔

"کیوں صاحب روٹھے ہی رہوگے یا منو
گے بھی اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو
روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی
میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی
جس کا خط آیا میں نے جانا وہ شخص تشریف
لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا
نہیں ہوتا جو دو چار خط نہ آرہتے ہوں۔
بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک
کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح ایک
دو شام۔ میری دلگی ہو جاتی ہے۔ دن ان
کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے"

جب غالب کو خط لکھنے سے فرصت ملتی تو وہ بے کار نہ بیٹھتے اور لفافے بنایا کرتے تھے۔ چونکہ انھی لفافوں میں وہ خط بھیجا کرتے تھے اس لیے انھیں خود ہی تیار کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں،

"بھائی مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی
آتی ہے کہ یہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت
مکالمت پیدا ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے
ہیں۔ اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے خط
سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجھ کو اکثر اوقات
لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ
لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔ غنیمت یہ
ہے کہ محصول آدھ آنا ہے ورنہ باتیں
کرنے کا مزہ معلوم ہوتا"

ہم سب یہ جانتے ہیں کہ غالب آم کے بہت شوقین تھے آموں کے بارے میں ان کے کئی لطیفے بھی مشہور ہیں۔ ان کے خطوں میں ہمیں ان کے اس شوق کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے۔ ان کے دوست، ملنے والے اور شاگرد ان کے پاس آم بھیجتے تھے اور آموں کی دعوت بھی دیا کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"یہاں تک لکھ چکا تھا کہ دو آدمی آگئے
دن بھی تھوڑا رہ گیا۔ میں نے بکس بند کیا
باہر تختوں پر آن بیٹھا۔ شام ہوئی، چراغ
روشن ہوا کہ ناگاہ سید نصیر الدین آیا۔
ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ اس
کے سر پہ ٹوکرا، اس پر گھاس ہری بچھی
ہوئی۔ میں نے کہا آہا ہا ہا سرفراز حسین
دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے معلوم
ہوا کہ یہ وہ نہیں۔ یہ کچھ اور ہے۔ لطف
عام ہے آم ہے۔ ایک ایک آم کو سر بمہر
گلاس سمجھا یا بادہ انگوری سے بھرا ہوا مگر
واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ ۶۵ گلاس
(۶۵ آم) میں ایک قطرہ نہیں گرا ہے میاں
کہتا تھا کہ یہ ۸۰ تھے۔ پندرہ بگڑ گئے بلکہ سڑ
گئے۔ تا ان کی برائی اور وں میں سرایت
نہ کرے، ٹوکرے میں سے پھینک دیے میں
نے کہا بھائی یہ کیا کم ہیں"

ایک صاحب نے آم بھیجے اور گھر دعوت دی مگر غالب نے اپنے خط میں یہ بات لکھی۔ دیکھیے اس خط سے ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس قدر آم کھاتے تھے اور کتنے شوقین تھے۔

"کہار آیا، خط لایا، آم پہنچے، کچھ بانٹے کچھ
کھائے۔ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں
مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ
بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے
لاؤں؟ طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں
کی طرف وہ رغبت، نہ معدے میں اتنی
آموں کی گنجایش۔ نہار منھ میں نہ آم کھاتا
تھا، کھانے کے بعد میں نہ آم کھاتا تھا۔
رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں۔ ہاں آخر روز
معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف
عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ
بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔
اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس
بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوتے تو پانچ
سات۔"

مولانا حالی نے غالب کو حیوانِ ظریف یعنی ہنسنے ہنسانے
والا انسان لکھا ہے۔ غالب کے کئی خطوط ایسے ہیں جن میں
ہم ایسی بہت سی باتیں پڑھ کر اپنی ہنسی نہیں روک سکتے
غالب نے جب پہلی بار داڑھی رکھی تو اگرچہ کوئی خاص بات
نہ تھی مگر ان کا بیان ہنسائے بغیر نہیں رہتا۔ دیکھیے لکھتے ہیں۔

"جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے۔
تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر
آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے
دو دانت ٹوٹ گئے۔ نا چار مسّی بھی چھوڑ دی
اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے
شہر (دہلی) میں ایک وردی ہے عام، مُلّا، بساطی
نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا
منھ پر داڑھی، سر پر بال۔ فقیر نے جس دن
داڑھی رکھی اسی دن سر منڈوایا۔"

ان کی ایک ملازمہ تھیں جو باہر نکل کر سودا سلف بھی
لانے لگیں۔ ان کی خصوصیات آج کل کی ملازماؤں سے بہت
ملتی تھیں۔ دیکھیے غالب نے ان کی ہر بات کو کتنی دلچسپی سے لکھا۔

"جی وفادار جن کو تم کچھ اور بھائی خوب
جانتے ہیں اب تمھاری پھوپھی (غالب کی
بیوی) نے انھیں وفادار بیگ بنا دیا ہے
باہر نکلتی ہیں۔ سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق
اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی
ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی ممکن نہیں
کہ اطرافِ نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ
دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں
ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی جی
کو لے جاکر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ یہ پھول
تمھارے چچا کے بیٹے کی کائی کے ایں"
(تمھارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)

ایک بار غالب کو اپنے کسی ملنے والے کو کسی بات کا
یقین دلانا تھا۔ دیکھیے وہ کتنے قسم کی قسمیں کھا کر اس بات کا
یقین دلاتے ہیں اور کتنا ہنساتے ہیں اور تمام مذاہب کی
کتابوں کا نام لے ڈالتے ہیں۔

"بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت
کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی

قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم یا ژند کی قسم،
اُستاد کی قسم، گورو کے گرنتھ کی قسم نہ میرے
پاس وہ قصیدہ نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔"

غالب کے زمانے میں انگریزی حکومت شروع ہوئی اور انگریزی زبان کا چلن ہوا۔ غالب نے اپنے خطوط میں انگریزی کے الفاظ بہت زیادہ استعمال کیے ہیں۔ وہ پنجابی اور ہندی سے ناواقف نہ تھے۔ اور اپنے خطوں میں کئی جگہ پنجابی اور ہندی کے محاورے استعمال کیے ہیں۔ دو مثالیں دیکھیے:

(۱) پیٹ پڑیں روٹیاں تے سبھی گلاں موٹیاں (پیٹ بھرا ہو تو سبھی باتیں سوجھتی ہیں۔)

(۲) کھچڑی کھائی دن بہلائے، کپڑے پھاڑے گھر کو آئے۔

غالب اپنے زمانے میں اپنے شہر میں کافی مشہور ہو گئے تھے۔ ان کے خط پر صرف ان کے نام کی ضرورت تھی محلّہ اور شہر لکھنا ضروری نہ تھا ایک صاحب کو لکھتے ہیں۔

"اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ میرے خط
کے سرنامے پر محلّہ کا نام لکھنا ضرور نہیں
شہر کا نام اور میرا نام، قصہ تمام۔"

ہم نے اپنے خاندان اور پاس پڑوس میں بہت سے بزرگوں کا بڑھاپا اور آخری وقت دیکھا ہے۔ دیکھیے ایک خط میں وہ اپنے بڑھاپے کا کتنا تکلیف دہ منظر پیش کرتے ہیں

"میں برس دن سے بیمار تھا ایک پھوڑا اچھا
ہوا دوسرا پیدا ہوا۔ اب فی الحال دونوں
ہاتھ پاؤں میں ۹ پھوڑے ہیں۔ دونوں
پانوؤں پر دو پھوڑے پنڈلی کی ہڈی
پر ایسے ہیں کہ جن کی گہرائی ہڈی تک ہے
انھوں نے مجھ کو بٹھا دیا۔ اٹھ نہیں سکتا
حاجتی دھری رہتی ہے۔ پلنگ پر سے
کمّل پڑا بھر پڑا رہا۔ روٹی بھی اسی طرح
کھاتا ہوں۔ پاخانہ کا کیا کہوں کیوں کر جاتا
ہوں۔ صبح سے شام اور شام سے صبح
تک پڑا رہتا ہوں۔ یہ سطور لیٹے لیٹے
لکھے ہیں۔ نیم مُردہ ہوں قریب بمرگ ہوں"

غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ "غالب مُرد" کہی تھی مگر مرے نہیں۔ جب لوگوں نے پوچھا تو کہا اس سال ہیضے کی وبا سے بہت لوگ مرے تھے اور چونکہ میں عام آدمی نہ تھا اس لیے اس وقت نہ مرا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اور جینے کے خواہش مند نہ تھے مرنے سے چند مہینے قبل ایک صاحب کو لکھا اور کتنا صحیح لکھا:

"اگر جوان ہوتا تو دعائے صحت کا طلبگار
ہوتا۔ اب جو بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت
کا خواہاں ہوں۔"

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

لطیفہ

شاگرد۔ (ٹیلیفون پر ہیڈ ماسٹر سے) ہلو آج میرے لڑکے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ اسکول میں حاضر نہیں ہو سکتا اس کو چھٹی دے دیجیے۔

ہیڈ ماسٹر۔ کون بول رہا ہے؟
شاگرد۔ میرے والد

جناب بدرالدین۔ استاد مدرسہ ابتدائی

کھلی ہوا کا مدرسہ

(اب کے مدرسہ ابتدائی جامعہ کا کھلی ہوا کا مدرسہ مہرولی میں ہوا تھا یہ نظم آخری دن کے جلسے میں پڑھی گئی تھی۔)

ہو تم سبھوں کو مبارک قیامِ مہرولی
خوشی دکھائیں تمھیں صبح و شامِ مہرولی

یہاں پہ کھیلنا پڑھنا تمھیں مبارک ہو
بسا رہے ہو جو دنیا تمھیں مبارک ہو

یہ شاہزادوں کا مسکن ہے اولیا کی زمیں
یہاں ہوئے ہیں کبھی آ کے تاجدار مکیں

یہاں پہ شیخ محدث کا مقبرہ بھی ہے
یہاں پہ حضرتِ کاکی کا مقبرہ بھی ہے

یہاں جمالی کمالی کی شان عالی ہے
کہ جن کا نام بھی دنیا میں اک مثالی ہے

قطب مینار ہے مسجد ہے قوت الاسلام
ہزاروں سال سے دیتی ہے لاالہ کا پیام

یہاں پہ صدیوں اذاں کی صدائیں گونجی ہیں
فقیروں شاہوں کے دل کی صدائیں گونجی ہیں

یہاں قریب ہی دیکھو گے التمش کا مزار
جبیں پہ جس کی چمکتی ہے آیتوں کی قطار

یہاں تمدن و تہذیب کے خزانے ہیں
یہاں بلندی و پستی کے کارنامے ہیں

قدیمی دور کے فن کے یہاں دفینے ہیں
نظر کے سامنے قدرت کے آبگینے ہیں

کمال اب بھی جھلکتا ہے اس زوال کے بعد
زوال لازمی آتا ہے ہر کمال کے بعد

تمھارے دم سے ہوئی آج یہ زمیں روشن
بنایا تم نے اسے آج اک حسیں گلشن

تمھیں یہاں کی فضائیں سلام کہتی ہیں
خوشی میں مست ہوائیں سلام کہتی ہیں

قدم تمھارے مبارک ہوں اس زمیں کے لیے
یہاں کا آنا مبارک ہو تم سبھی کے لیے

جناب م۔ ندیم۔

احسان کا بدلہ

میری توبہ! اب کبھی دھوکہ نہیں دوں گی

جانوروں کا ڈراما

ڈرامہ میں حصہ لینے والے جانور

لومڑی
خرگوش
اُلو
میاں ککڑوں کوں اور
بی مینڈکی

(پردہ اٹھتا ہے، اسٹیج پر ایک بڑا سا پنجرہ رکھا ہے
اس کے اندر لومڑی بند ہے۔ پاس ہی ایک درخت کی شاخ
پر اُلو بیٹھا ہے۔ دیوار پر میاں ککڑوں کوں بیٹھے ہیں۔ ابھی
سورج نہیں نکلا ہے۔)

لومڑی (نہایت خوشامد کے لہجے میں) بھائی اُلو، خدا کے
واسطے میری مدد کرو، مجھے اس پنجرے کے اندر
سے نکالو۔ میں رات بھر کی بھوکی پیاسی ہوں۔
مجھے ایک چالاک آدمی نے اس پنجرے میں بند کردیا

ہے... میں وعدہ کرتی ہوں اب کسی جانور کو نہ ستاؤں گی۔ میں نے توبہ کرلی ہے ... میری مدد کرو...!

الو (خاموش رہتا ہے)

لومڑی بھائی ذرا سوچو تو، اگر تم کو بھی کسی پنجرے کے اندر بند کر دیا جائے تو تمھارا کیا حال ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے اس مصیبت سے نکال سکتے ہو... تم بہت عقلمند ہو... دنیا کے سارے الو بہت عقلمند ہوتے ہیں...

الو (اونگھتا رہتا ہے، کوئی جواب نہیں دیتا۔)

لومڑی بھائی الو اب زیادہ دیر نہ کرو، صبح ہونے کو ہے مجھے بہت زور کی بھوک بھی لگ رہی ہے۔ ہاں تم نے بھی تو اب تک ناشتہ نہیں کیا ہوگا۔ میں تمھارے ناشتے کے لیے ایک موٹا سا چوہا پکڑ دوں گی۔ مجھے اس پنجرے سے نکال دو ___

(آواز نکالتا ہے) گھو... گھو... گھگ... گھگ... گ... گ...

میاں ککڑوں کوں (چونک پڑتا ہے) یہ کس نے مجھے جگا دیا؟

لومڑی بھائی ککڑوں کوں...!

میاں ککڑوں کوں اچھا تو یہ تم تھیں! تم نے مجھے کیوں جگا دیا۔ سب کو تو میں جگاتا ہوں۔ یہ میرا کام ہے تمھارا نہیں... (دو مرتبہ زور سے بانگ دیتا ہے ککڑوں کوں... ککڑوں کوں...!)

لومڑی یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ تم جاگ گئے۔ اب ذرا میری مدد کرو... بھوک اور پیاس کے مارے میرا دم نکلا جا رہا ہے... مجھے اس پنجرے کے اندر سے نکالو... میں توبہ کر چکی ہوں اب کسی مرغے، مرغی یا چوزے کو نہیں کھاؤں گی۔ کبھی نہیں...

میاں ککڑوں کوں (خوشی کے لہجے میں) واہ، واہ تم پنجرے کے اندر بند ہو۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔

ککڑوں کوں... ککڑوں کوں... ابھی تک کچھ بچے بستروں سے نہیں اٹھ پائے۔ اسکول کا وقت قریب ہے۔

(خرگوش داخل ہوتا ہے)

خرگوش چچا ککڑوں کوں آداب... صبح بخیر

میاں ککڑوں کوں خوش رہو۔ صبح کی ورزش کرنے نکلے ہو؟

خرگوش جی ہاں۔ ذرا دو چار میل کی دوڑ لگا لوں۔

(چاروں طرف دوڑتا ہے۔ اس دوران اس کی نظر لومڑی پر پڑتی ہے۔ سہم جاتا ہے۔)

خرگوش اوہ! معاف کیجیے گا محترمہ لومڑی صاحبہ... میں نے بڑی گستاخی کی آپ کے سامنے...

(وہ بھاگنا ہی چاہتا ہے کہ لومڑی آواز دیتی ہے)

لومڑی میاں خرگوش مجھ سے بالکل مت ڈرو... دیکھو میں پنجرے کے اندر بند ہوں...

خرگوش (غور سے دیکھتا ہے اور اطمینان کی سانس لیتا ہے۔) اچھا تو یہ بات ہے۔ آپ اندر بند ہیں

یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔

لومڑی بیٹا! ذرا میرے قریب آؤ۔ میں تو اب توبہ کر چکی ہوں۔ اب کبھی کسی خرگوش کو نہ کھاؤں گی۔ چاہے بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جاؤں۔ اب میں بالکل بدل گئی ہوں۔ مجھ پر بھروسا کرو۔

خرگوش یعنی آپ نے اور توبہ کر لی ... ! اس سے زیادہ عجیب بات تو میں نے آج تک نہیں سنی کہ کسی لومڑی نے خرگوش کھانے سے توبہ کر لی ہو!

لومڑی میاں میری بات کا یقین کرو۔

خرگوش مگر محترمہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟

لومڑی کیا تم اس پنجرے کو دیکھتے ہو؟ یہ باہر سے بند ہے۔ اس کو کھول دو۔۔

خرگوش اور آپ باہر آجائیں گی اور میں آپ کے پیٹ کے اندر .... نا، نا، میں ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔

لومڑی اف، تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میں نے بالکل توبہ کر لی ہے۔ میں تمھارے احسان کا بدلہ کبھی نہیں بھولوں گی۔ مجھے اس نامعقول پنجرے سے باہر نکال دو۔۔۔ نکال دو نا، میرے اچھے خرگوش۔ میں تم کو نہیں کھاؤں گی۔۔۔

خرگوش مگر محترمہ آپ میرے چچا بھورے میاں کو کھا چکی ہیں...

لومڑی وہ میری غلطی تھی مجھے اس کا افسوس ہے اب کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ میں اب اچھی بن کر اچھی زندگی بسر کروں گی۔ اب مجھے کوئی بھی اچھا بن جانے سے نہیں روک سکتا۔

خرگوش مجھے تو ذرا بھی امید نہیں کہ آپ واقعی اچھی بن جائیں گی۔

لومڑی مگر بھلا اس پنجرے کے اندر رہ کر میں کیسے اچھی بن سکتی ہوں۔ میں توبہ کر چکی ہوں، کسی بھی خرگوش کو کبھی نہیں کھاؤں گی۔

خرگوش مگر آپ اپنا وعدہ بھول گئیں تو؟

لومڑی نہیں۔ میں اپنا وعدہ نہیں بھول سکتی.... میری یادداشت اتنی خراب نہیں ہے۔

خرگوش اچھا اگر آپ وعدہ کرتی ہیں تو... میں آپ کو پنجرے سے باہر نکالے دیتا ہوں.... مگر دیکھیے آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں اسے بھولیے گا نہیں...
(وہ پنجرے کے قریب آتا ہے۔ تالے میں لگی ہوئی چابی گھماتا ہے۔ تالا کھل جاتا ہے۔ دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔ لومڑی باہر نکل آتی ہے۔)

لومڑی (خوش ہوتی ہے) ہاہا... ہاہا... اب میں آزاد ہوں (خوشی کے مارے ناچنے لگتی ہے۔ ناچتے ناچتے رک جاتی ہے اور خرگوش کو سونگھتی ہے) اف میں تو بھول ہی گئی۔ میں بہت بھوکی ہوں میں نے بہت دنوں سے کسی خرگوش کو نہیں کھایا ہے۔ میاں خرگوش میں تم کو کھاؤں گی ...!

خرگوش (خوف سے کانپ جاتا ہے) مگر... مگر... آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ میں آئندہ کسی خرگوش کو نہیں کھاؤں گی ... آپ اتنی جلدی بھول گئیں.....!

لومڑی ہاں میں نے وعدہ کیا تھا۔ مگر میں اس وقت یہ بھول گئی تھی کہ میں بہت بھوکی ہوں۔

خرگوش مگر میں نے آپ کے ساتھ احسان کیا ہے اس کا بدلہ مجھے یہ دے رہی ہیں!

لومڑی احسان اور بدلہ یہ سب بے وقوفی کی باتیں ہیں تم نے یہ سب کہاں سے سُنا؟

خرگوش یہ سب باتیں میری ماں نے مجھے بتائی ہیں جناب!

لومڑی کیا تم نے کبھی احسان کو دیکھا ہے؟

خرگوش نہیں محترمہ، احسان اور نیکی وغیرہ دیکھنے کی چیزیں نہیں۔ انھیں کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ آپ بھی نہیں!

لومڑی افسوس! ورنہ تمھارے بدلے ان کو کھا لیتی... خیر مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے تیار ہو جاؤ...

خرگوش جناب میں نے آپ کے ساتھ ایک بھلائی کی ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ بھلائی کر دیجیے۔ مجھے بخش دیجیے۔ مجھے نہ کھائیے۔

لومڑی نہیں میں تم کو ضرور کھاؤں گی... ہاں میں تمھارے ساتھ اتنی بھلائی کر سکتی ہوں کہ اگر تم تین جانوروں میں سے دو سے یہ کہلوا دو کہ احسان کا بدلہ اچھی چیز ہے تو میں تم کو نہیں کھاؤں گی...

خرگوش اچھا، مجھے منظور ہے... پہلے چچا لگڑوں کوں سے ہی پوچھا جائے۔

(لگڑوں کوں سے مخاطب ہو کر) چچا کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ احسان کا بدلہ اچھی چیز ہے؟

میاں لگڑوں کوں احسان کا بدلہ! میں نے اس دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے مگر احسان کا بدلہ مجھے کہیں نہیں ملا۔ اب ذرا حضرتِ انسان ہی کو لے لو۔ میری بیوی کے انڈے کھا جاتا ہے میرے بچوں کا شوربہ بنا کر پی جاتا ہے۔ اور تو اور میں جب صبح صبح زور دار بانگ دیتا ہوں تو بجائے اس کے کہ بستر سے باہر نکل آئے، مجھے برا کہتا ہے کہ اس مرغے نے نیند خراب کر دی.... جہاں تک میں سمجھتا ہوں احسان کا بدلہ نہیں ہے۔

لومڑی میاں خرگوش۔ میرا خیال ہے تم کو اب چٹ کر جانا چاہیے.... احسان کا بدلہ اچھی چیز نہیں۔ اس کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔

خرگوش مگر ٹھہریے۔ ذرا الّو میاں سے بھی پوچھ لیا جائے ان کی عقلمندی ساری دنیا میں مشہور ہے۔

(الّو سے مخاطب ہوتا ہے) محترم الّو صاحب ذرا سنیے، ایک بات کا فیصلہ کر دیجیے۔ آپ تو عقلمندوں کے بادشاہ ہیں... آپ نے...

اُلّو میں ابھی سو رہا ہوں.... میری نیند خراب نہ کرو...

خرگوش بس میرا ایک چھوٹا سا سوال ہے۔ کیا احسان کا بدلہ اچھی چیز ہے؟

اُلّو میں ابھی سو رہا ہوں۔ میری نیند خراب نہ کرو۔

لومڑی الّو کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ احسان کا بدلہ اچھی چیز نہیں۔ فیصلہ ہو گیا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ

تم کو کچا کھایا جائے یا پکا کر ؟

اُلّو (جاگ جاتا ہے) کیا لومڑی پنجرے کے باہر ہے ؟

خرگوش ہاں اب وہ پنجرے کے باہر ہے

اُلّو کیا تم نے اُسے باہر نکالا ؟

خرگوش جی ہاں !

اُلّو تب مجھے کہنا چاہیے کہ احسان کا بدلہ اچھی چیز ہے

خرگوش (خوش ہو کر) خدا کا شکر ہے۔ ایک تو ملا۔

لومڑی مگر تم کو دوسرا تلاش کرنا ہے۔ جلدی کرو..... بھوک کے مارے میری آنتوں میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔

(بی مینڈکی داخل ہوتی ہیں)

خرگوش اوہو، یہ تو بہری بی مینڈکی ہیں۔ ان کی سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔ کیا اچھا ہوتا اگر بی بطخ ہوتی...

بی مینڈکی صبح بخیر۔ سب کو سالگرہ مبارک۔ ہر روز اس دنیا میں کسی نہ کسی کی سالگرہ ہوتی ہی رہتی ہے۔ میری یادداشت اتنی کمزور ہے کہ میں نام یاد نہیں رکھ سکتی۔ خیر...

لومڑی (خرگوش سے) اب تم اس سے پوچھتے ہو یا میں تم کو کھانا شروع کروں !

خرگوش (بی مینڈکی سے) دادی آداب !

بی مینڈکی جیتے رہو۔ اچھا تو آج تمھاری سالگرہ ہے خوب۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔

خرگوش نہیں، میری سالگرہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ لومڑی صاحبہ پنجرے کے اندر بند تھیں۔ میں نے ان کو باہر نکالا۔ اب وہ مجھے...

مینڈکی (بات کاٹ کر) میں اب سوئیٹر نہیں بن سکتی... تمھارے دادا کا سوئیٹر بھی پھٹ گیا ہے... مگر میری آنکھوں سے سجھائی ہی نہیں دیتا...

خرگوش (زور سے کہتا ہے) اللہ رحم کرے... بات یہ نہیں ہے... ذرا غور سے سنو..... میں نے لومڑی صاحبہ کو پنجرے کے اندر سے نکالا تھا۔ اب وہ مجھے کھا جانا چاہتی ہیں۔ مجھے دو جانور ایسے تلاش کرنا ہیں جو یہ بتائیں کہ احسان کا بدلہ اچھی چیز ہے...

بی مینڈکی اچھا تو یہ بات ہے۔ تم پنجرے کے اندر بند تھے۔

خرگوش نہیں میں بند نہیں تھا۔ لومڑی صاحبہ بند تھیں۔

بی مینڈکی اچھا تو تم دونوں بند تھے۔

خرگوش نہیں صرف لومڑی...

لومڑی جلدی کہو مجھے بھوک ستا رہی ہے۔

میاں ککڑ طول کول (دیوار سے اُڑ کر آتا ہے) ٹھہرو، میں سمجھاتا ہوں۔ بی لومڑی پنجرے کے اندر بند تھیں اور خرگوش باہر تھا...

بی مینڈکی اچھا تو یہ کس کی سالگرہ تھی ؟

خرگوش (جھنجھلا کر) کسی کم بخت کی سالگرہ نہیں تھی۔ ذرا غور سے سنو... !

بی مینڈکی (سنبھل کر بیٹھ جاتی ہے) اچھا تو اب بتاؤ بھلا پنجرے کے اندر کون تھا ؟

لومڑی میں تھی۔

بی مینڈکی تم اندر کیسے پہنچیں ؟

لومڑی بس میں اندر چلی گئی۔

بی مینڈکی اچھا تو بات سیدھی ہے۔ تم اندر چلی گئیں، اور باہر آگئیں۔

میاں گکڑوں کوں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ بی لومڑی اندر سے باہر خود نہیں آئیں۔

بی مینڈکی تعجب ہے۔ بی لومڑی اندر جا سکتی ہیں... باہر نہیں آسکتیں ؟

میاں گکڑوں کوں دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس میں تالا پڑا تھا۔ ایک آدمی نے بند کر دیا تھا۔ آیا کچھ سمجھ میں ؟

بی مینڈکی بات تو اور الجھ گئی... پہلے تو صرف ایک لومڑی تھی، ایک خرگوش تھا اور اب ایک آدمی بھی آگیا اور دروازہ اور تالا.... میری سمجھ میں ابھی کچھ نہیں آیا۔ چلو پنجرے کے پاس چلیں۔ بس ذرا سی دیر میں بات سمجھ میں آجائے گی۔

(سب پنجرے کے پاس جاتے ہیں)

لومڑی میں پنجرے کے اندر تھی۔ خرگوش باہر تھا۔

بی مینڈکی تم اندر کیسے گئیں۔ ذرا جاکر بتاؤ تو سہی !

(لومڑی اندر چلی جاتی ہے۔)

بی مینڈکی اچھا اور آدمی کہاں تھا ؟

میاں گکڑوں کوں آدمی وہاں نہیں تھا۔

بی مینڈکی تو دروازہ کھلا تھا ؟

خرگوش نہیں دروازہ بند تھا۔ تالا بھی لگا ہوا تھا۔

بی مینڈکی اچھا ذرا بتاؤ تو کیسے بند تھا۔

(خرگوش دروازہ بند کر دیتا ہے۔ تالا لگا دیتا ہے)

بی مینڈکی ہوں، اب سمجھی۔ میاں خرگوش نے حماقت کی تھی دروازہ کھولنے کی۔

لومڑی (چلاتی ہے) ارے دروازہ کھولو... دروازہ کھولو... یہ تو صاف دھوکا ہے... یہ بہت بری بات ہے !

بی مینڈکی بی لومڑی.. اب اسی میں بند ہو اور چلاتی رہو۔ جو دوسروں کو دھوکا دیتا ہے اُسے ضرور سزا ملتی ہے

لومڑی (روتی ہے، چلاتی ہے) میری توبہ، اب کبھی دھوکا نہیں دوں گی... مجھے باہر نکالو...

(میاں گکڑوں کوں، خرگوش اور بی مینڈکی ناچتے ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے)

(انگریزی سے ترجمہ)

لطیفہ

بڑا بھائی (چھوٹے بھائی کو مارنے کے بعد) میں تمہیں اس لیے سزا دیتا ہوں کہ تم پھر بعد میں خراب کام نہ کرو اور اچھے لڑکے بن جاؤ ورنہ مجھے تم سے محبت بہت ہے۔

چھوٹا بھائی محبت تو مجھے بھی آپ کے ساتھ بہت ہے۔ مگر میں اس قدر چھوٹا ہوں کہ اس کا اچھی طرح سے اظہار نہیں کرسکتا

محمد یٰسین خالد۔ اندور

برسات کے لیے دُعا

محمد عبداللہ شرقی مدراس

ابرِ رحمت برسا مولا! ہم کو نہ اب تو ترسا مولا

جائیں کہاں یہ تیرے بندے مانگیں آخر کس سے بندے

تو ہی ہم سب کا ہے سہارا تیرے سوا ہے کون ہمارا

گرمی اب کے ایسی کڑی ہے سارے بدن میں آگ لگی ہے

شدّت کی اب پیاس لگی ہے تجھ سے سب کی آس لگی ہے

سوکھ گئی ہیں سب کی زبانیں سب کے لب پر آئیں جانیں

باغ میں ہے جو گُل کی ڈالی گود ہے اُس کی خالی خالی

دھوپ سے بچے ایسے جھلسے سوکھ گئے ہیں پھول سے چہرے

موسم گرمی کا ہے قیامت پانی کی ہے کیسی قلت

تکنے لگی ہے آنکھ ہماری دیکھیں کب ہو فضلِ باری

آئے بادل گھر کے آئے جھوم کے آئے پھر کے آئے

برسا دے تو اتنا پانی دور ہو سب کی خستہ جانی

بھر دے ندی نالے بھر دے سوکھی کھیتی تازہ کر دے

مانگ رہے ہیں ہم یہ دعائیں بخش دے مولا ساری خطائیں

بے شک تو مالک ہے سبھی کا واسطہ تجھ کو اپنے نبی کا

مانگ رہے ہیں بھیک کرم کی دور ہو اب یہ حالت غم کی

سر تھا جُھکا دربارِ خدا میں ہم تھے ابھی مصروف دعا میں

ابر وہ اٹھا، بجلی چمکی رحمت پانی بن کر برسی

دیکھو شرقی شان خدا کی

اُس نے راحت سب کو عطا کی

جناب مولانا مقبول احمد سیوہاروی

یہ ہے ایک راجہ کا انصاف

اب سے سیکڑوں برس پہلے کی بات ہے گجرات کے علاقے میں ایک بڑی مسجد تھی اس میں ایک مینارہ بھی تھا جہاں مسلمان اذان دیتے تھے۔ جس علاقے میں مسجد تھی وہاں سب ہی لوگ رہتے تھے۔ ہندو، مسلمان، پارسی ...

جب بھی اذان ہوتی پارسی اذان سن کر ناخوش ہوتے پارسیوں نے ہندوؤں کو اکسا کر مسلمانوں سے لڑا دیا، اور ہندوؤں نے مسجد بھی توڑ دی اور منارہ بھی گرا دیا۔

مسجد کا امام بھاگ گیا ورنہ وہ بے چارہ بھی مارا جاتا۔ امام کا نام تھا "علی"۔ علی جانتا تھا کہ یہاں کا راجہ بڑا انصاف کرنے والا راجہ ہے۔ اس نے درخواست لکھ کر راجہ تک پہنچانی چاہی تو کسی اہلکار نے علی کی بات نہ سنی اور راجہ تک درخواست نہ پہنچائی۔

علی نے راجہ تک رسائی کی تدبیر یہ سوچی کہ جب بھی راجہ شکار کو جائے درخواست اس تک پہنچا دی جائے اس وقت نہ کوئی وزیر اور امیر روک سکے گا اور نہ کوئی اہلکار ......

علی پوچھ گچھ کرتا رہا کہ راجہ شکار کو کب جائے گا اور جب اسے پتہ چل گیا تو شکار پر جانے کے راستے میں ایک جھاڑی میں جا چھپا۔

علی نے ہندی زبان میں ایک نظم لکھی تھی۔ اس نظم میں مسجد اور منارے کے ٹوٹنے کا حال لکھا تھا اور مسلمانوں کو مارنے پیٹنے کا ذکر تھا۔

اب دیکھیے! علی دیکھتا رہا۔ گھوڑوں، ہاتھیوں اور اونٹوں پر شکار کا سامان تھا اور شکار کی تلاش کرنے والے لوگ گاتے بجاتے جا رہے تھے۔

راجہ کا ہاتھی آیا تو علی جھاڑی سے نکل کر راجہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا: "مہاراج میری فریاد سن لیجیے۔ حضور کے راج میں مسجد توڑ دی گئی اور اسّی مسلمان شہید کر دیے گئے ہیں۔" یہ سب حال علی نے اپنی نظم میں بھی لکھا تھا۔ راجہ نے علی سے درخواست لے لی اور ایک افسر کو دے کر ہدایت کی کہ ہمیں فرصت کے وقت یہ درخواست پھر دکھائی جائے۔ پھر وزیر کو بلا کر کہا کہ میں تین دن تک محل میں آرام کروں گا۔ ان تین دنوں میں کوئی بھی کھیل نہ ہو نہ مجھ سے ملے نہ کسی کام کے لیے

مجھے تکلیف دی جائے۔ راج کے سارے کام تم کرنا۔

وزیر نے کہا: "ان داتا جیسا حضور فرماتے ہیں ایسا ہی ہوگا۔ حضور آرام فرمائیں۔"

رات ہوئی تو راجہ محل میں چلا گیا۔ پھر ایک تیز رفتار سانڈنی منگا کر اور بھیس بدل کر جس علاقے کی مسجد کا علی نے اپنی درخواست میں ذکر کیا تھا، اس طرف روانہ ہو گیا۔

جب اس علاقے میں پہنچا تو اس نے اپنی صورت اور لباس سوداگروں جیسا بنا لیا تھا۔ راجہ بازاروں میں، گلیوں میں، محلوں میں پھرا اور جس کسی سے مسجد اور منارہ کا ذکر کیا، سب نے افسوس ظاہر کیا اور مسجد و منارہ کی داستان سنائی۔ اور سب ہی نے کہا کہ مسلمان بے گناہ مارے گئے ہیں۔

سمندر اس علاقے کے قریب تھا۔ راجہ نے ایک لوٹے میں سمندر کا پانی بھرا، اس کا منھ بند کیا اور پھر اسی طرح راتوں رات اپنی راجدھانی میں پہنچ گیا۔

صبح ہوئی تو راجہ دربار میں آیا اور مسجد کے امام "علی" کو یاد کیا۔ علی حاضر ہوا تو حکم دیا کہ اپنی درخواست بھرے دربار میں پڑھ کر سنائے۔ علی نے درخواست سنائی تو سارے امیروں اور وزیروں نے علی کی درخواست کو غلط بتایا: "یہ سب جھوٹ ہے اور علی کا دعویٰ غلط ہے!"

راجہ نے سمندر کے پانی کا لوٹا منگا کر تمام امیروں اور وزیروں کو تھوڑا تھوڑا دیا کہ وہ چکھ کر بتائیں کیسا پانی ہے۔

سب نے کہا: "ان داتا یہ تو سمندر کا پانی ہے!"

راجہ نے کہا: "میں جانتا تھا کہ تم لوگ مذہب کے معاملے میں کسی کی بات چلنے نہ دوگے اور مجھے مسجد کے لوٹنے کی پوری تحقیق کرنی تھی۔ اس لیے راتوں رات گیا اور پوری جانچ کی۔ مسلمان مظلوم ہیں اور ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ میرے راج میں کسی پر بھی جو میرے سائے میں ہے، ایسا ظلم نہیں کیا جا سکتا!" پھر برہمنوں اور پارسیوں کو سزا دی اور مسلمانوں کو ایک لاکھ بالوتڑا (گجراتی سکہ) دینے کا حکم دیا تاکہ مسجد اور مینارہ دوبارہ بنوالیں۔ اور امام کو خلعت اور انعام دیا۔

مسجد دوبارہ بن گئی۔ اور یہ انعامات اس میں بطور یادگار کے رکھے گئے۔ عید کے دن انھیں نکال کر سب کو دکھایا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ راجاؤں کا انصاف ایسا بے لاگ ہوتا تھا!

جس سیاح نے یہ حال لکھا ہے اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسلام کی یہ یادگار اب تک اس ملک میں موجود ہے۔

اور یہ سیاح اب سے سات سو بیس برس پہلے اس علاقے سے گزرا تھا۔

لطیفہ

مرزا غالب سے ایک صاحب ملنے کے لیے آئے۔ اوپر سے نیچے تک ہرا لباس پہنے ہوئے تھے۔ غالب نے ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ حقہ پلایا، پان کھلایا۔ پان کھلا کر کہنے لگے: "پہلے تم ہریل تھے اب پان کی وجہ سے چونچ لال ہو گئی اور پورے میاں مٹھو بن گئے۔ اب کہو! نبی جی ریوڑی بھیجو۔"

سید قمرالحسن

جناب رفیق شاستری ایم اے

پنچ تنتر کی کہانیاں

مینڈکوں نے سانپ کی سواری کی

ایک جنگل میں ایک بوڑھا سانپ رہا کرتا تھا اسے بہت دنوں سے کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ کسی طرح گھسٹتا ہوا وہ تالاب کے پاس پہنچا وہاں بہت سے مینڈک اچھل کود رہے تھے۔ سانپ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ ان مینڈکوں کو پکڑ پاتا۔ لاچار ہو کر وہ ایک کونے میں اداس جا کر بیٹھ گیا۔ سانپ کو اس طرح اداس دیکھ کر کچھ مینڈکوں کو تعجب ہوا۔ اور ایک مینڈک سانپ کے قریب جا کر بولا "کہ آپ آج کچھ کھا نہیں رہے ہیں۔ کیوں اس قدر اداس ہیں"

سانپ نے کہا "ہاں بھائی اس اداسی کا بھی ایک سبب ہے"

مینڈکوں نے پوچھا: "بھلا کیا سبب ہے؟"

سانپ نے مینڈک کو ایک من گڑھت کہانی سنا دی "کہ آج صبح جب میں ایک مینڈک کو مارنے کے لیے آگے بڑھا تو وہ مینڈک وہاں سے اچھل کر کچھ پہنچے ہوئے اللہ والے سادھو کے بیچ چلا گیا۔ میں بھی اس مینڈک کے لالچ میں سادھوؤں کی ٹولی میں پہنچ گیا۔ ایک سادھو کا پیر میرے اوپر آگیا اور میں نے اسے ڈس لیا۔ وہ سادھو تو مر گیا۔ مگر دوسرے سادھو نے جل کر مجھے یہ بددعا دی کہ مینڈک کے لالچ میں تو یہاں تک آیا تھا اب مینڈکوں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر انھیں سیر کرا۔ یہ مینڈک سیر سپاٹے سے خوش ہو کر جو کچھ تجھے دیں گے بس وہی تیری خوراک بنے گی۔ اس کے علاوہ تو اور کچھ نہیں کھا سکے گا اب میں یہاں تم لوگوں کو سیر کرانے آیا ہوں"

اس مینڈک نے سانپ کی یہ بات اپنے ساتھی مینڈکوں سے کہی۔ سارے مینڈک بہت خوش ہوئے۔ ہوتے ہوتے یہ بات مینڈکوں کے راجہ تک پہنچی۔ راجہ نے اپنے وزیروں سے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ مینڈکوں کے لیے اس سانپ کی سواری اچھی رہے گی۔ راجہ کے ساتھ سارے مینڈک سانپ کی پیٹھ پر لد گئے۔ جن کو سانپ کی پیٹھ پر جگہ نہیں ملی وہ پیچھے ایک گاڑی جوڑ کر اس میں بیٹھ گئے۔

پہلے تو سانپ نے بہت تیزی دکھائی بعد میں اس کی چال سست ہو گئی۔ راجہ نے پوچھا "کیا بات ہے؟ چال کیوں دھیمی ہو گئی" سانپ نے جواب دیا "مہاراج صبح سے بھوکا ہوں" اس پر راجہ نے اسے چھوٹے چھوٹے مینڈک کھانے کی اجازت دے دی۔

سانپ نے کہا "سادھوؤں نے مجھے یہی بد دعا دی تھی کہ مینڈک اپنی خوشی سے جو بھی کھانے کو دیں گے۔ وہی کھایا کروں گا"

چھوٹے چھوٹے مینڈک کھانے کے بعد سانپ کے اندر کچھ طاقت آگئی۔ اور وہ پھر تیزی سے گاڑی چلانے لگا۔

کچھ دیر بعد ایک اور کالا سانپ ادھر آنکلا۔ سانپ کے اوپر مینڈکوں کی سواری کا تماشہ دیکھ کر اسے بہت تعجب ہوا۔ وہ بوڑھے سانپ سے پوچھنے لگا کہ آخر

یہ ماجرا کیا ہے۔ مینڈک تو تمھاری خوراک ہیں انھیں اپنی پیٹھ پر کیوں لادے پھرتے ہو" بوڑھا سانپ بولا۔ ہاں بھائی ٹھیک ہے۔ مگر کیا کیا جائے وقت وقت کی بات ہے۔ میں بھی بس وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ بوڑھا سانپ مینڈکوں سیر کراتا رہا اور مناسب موقع آنے پر تمام مینڈکوں کو چٹ کر ڈالا۔

یہ کہانی سننے کے بعد کوے شاہ نے وزیر خاص کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ بہت دور اندیش اور باہمت ہیں کسی کام کو شروع کر کے اسے انجام تک پہنچانا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ پست ہمت لوگ تو دشواریوں کے اندیشے سے کوئی کام شروع ہی نہیں کرتے۔ اس کے بعد ان کا نمبر آتا ہے جو دشواریوں سے گھبرا کر بیچ ہی میں کام چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ مگر سب سے اعلیٰ وہ ہوتے ہیں جو دشواریوں سے گھبرا کر کام کو بیچ میں نہیں چھوڑتے بلکہ اسے انجام تک پہنچانے کے لیے جدوجہد میں لگے رہتے ہیں۔ آپ نے میرے دشمنوں کا خاتمہ کر کے واقعی ایک بڑا کارنامہ کیا ہے۔"

وزیر خاص نے جواب میں کہا:۔ مہاراج میں نے تو بس اپنے فرض کو پورا کیا ہے۔ کبھی کبھی بڑے بڑے جواں مردوں کے بھی حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں آپ کو اپنی کھوئی حکومت مل گئی مگر ایک بات آپ کبھی نہ بھولیے گا کہ یہ سارا راج پاٹ چند دنوں کا کھیل ہے اس لیے اقتدار کے نشے میں آکر کبھی ظلم اور تشدد نہیں ڈھانا چاہیے اور امن وانصاف سے رعایا پر حکومت کرنی چاہیے۔ اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ راجہ رعایا کا مالک نہیں خادم ہوتا ہے۔"

اس کے بعد کوے شاہ کئی برسوں تک وزیر خاص کی مدد سے ہنسی خوشی حکومت کرتا رہا۔

(تیسرا تنتر ختم ہوا)

اگلے شمارے سے اب چوتھا تنتر شروع ہوگا جس کی بنیادی کہانی بندر اور مگرمچھ کی دوستی ہے۔

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

مئی ۱۹۶۹ء سے سلسلہ ملائیے۔

عید آگئی

عید کے دن بادشاہ کا جلوس نہایت شان دار نکلتا ہے فوجیں ساتھ ہوتی ہیں بیگمات گاڑیوں میں اپنے باڈی گارڈ کے اور خادماؤں کے ساتھ چلتی ہیں۔ سلطان کی بیٹی کی سواری نکلتی ہے جس کے سر پر تاج ہوتا ہے۔ جان بک اور تین بک اپنی فوجوں کے ساتھ چلتے ہیں۔ جلوس میں قاضی القضاۃ شہاب الدین بھی ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ علماء و مشائخ ہوتے ہیں۔ امام بدرالدین قواس شریف ابن عبدالحمید ولی عہد تین بک کے ساتھ چلتے ہیں۔

عید کی نماز قاضی القضاۃ شہاب الدین نے پڑھائی خطبہ نہایت شان دار تھا۔ نماز کے بعد سلطان سوار ہو کر اپنی نشست گاہ پہنچا جسے خاص عید کے لئے آراستہ کیا جاتا ہے۔ بیٹی اور ولی عہدوں کے لیے دوسری نشست گاہ تھی۔

امیروں اور اہلِ خاندان کی نشست الگ تھی، جس میں نہایت عمدہ کرسیاں جنھیں یہاں صندلی کہتے ہیں برابر برابر بچھی ہوئی تھیں۔ پھر فوجی کھیل دکھائے گئے۔ تیر اندازی کے کمالات دکھائے گئے۔

امیروں میں سترہ امیر تھے، انھیں امیرِ طومان کہتے ہیں امیر طومان کے جلوس میں دس ہزار سوار رہتے ہیں۔ اس حساب سے یہ تمام امیر ایک لاکھ ستر ہزار فوج کے سرگردہ تھے۔ فوجی کمالات اور تیر اندازی ایک گھنٹہ تک ہوتی رہی۔ پھر خلعتیں لائی گئیں اور بادشاہ کی طرف سے امیروں کو پہنائی گئیں خلعت پہن کر ہر ایک امیر سلطان کی نشست تک جاتا اور دوزانو ہو کر تعظیم بجا لاتا۔

ان تمام رسموں کے بعد سلطان نشست گاہ سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا دائیں طرف ولی عہد بائیں طرف دوسرا بیٹا، بیچ میں بیٹی سامنے چاروں بیگمات۔ بیگمات گاڑی میں سوار تھیں جس میں زرنگار جھولوں سے آراستہ گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ سلطان کے سوار ہوتے ہی چھوٹے بڑے تمام امرائے دولت پاپیادہ ہو گئے اور جو بارگاہ عید کے دربار کے لیے آراستہ کی گئی تھی وہاں تک ساتھ گئے۔

یہ بارگاہ لکڑی کے چار کھمبوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ جن پر چاندی کے پتر نہایت کاریگری سے چڑھے ہوتے تھے۔ چاروں کھمبوں پر چاندی کے کلس جن پر سونا جڑا ہوا تھا سورج کی روشنی میں ایسے جگمگا رہے تھے کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ بارگاہ کیا تھی ایک عظیم الشان عمارت تھی جس کا پورا فرش ریشمیں غالیچوں سے آراستہ تھا۔ وسط بارگاہ میں شاہی تخت تھا۔ تخت پر بھی چاندی کے پتر چڑھے ہوئے تھے اور سونے کی ملمع کاری تھی۔ بیچ میں شاہی مسند تھی جس پر سلطان اور سلطان کی بیگم جلوہ افروز تھی۔ دائیں طرف کی مسند پر لڑکی بیٹھی تھی جس کے ساتھ دروجا بیگم اور بائیں طرف کی مسند

پر بیلون بیگم اور کبک خاتون کی نشست تھی۔

تخت کی دائیں طرف کی کرسی پر تین بک ولی عہد سلطنت اور بائیں طرف جان بک بیٹھے تھے۔ اور پھر دائیں بائیں حسب مراتب بڑے چھوٹے امیر بیٹھے تھے۔ اس کے بعد چاندی سونے کی کشتیوں میں کھانا لایا گیا۔ گھوڑوں اور بکروں کا گوشت تھا۔

ہر امیر کے سامنے ایک کشتی رکھ دی گئی۔ پھر ریشمی لباس اور ریشمی پٹکے باندھے ہوئے باورچی حاضر ہوئے جن کے پاس تھیلیوں میں چھریاں تھیں۔

باورچی ہر ایک امیر کے سامنے سونے یا چاندی کا پیالہ رکھ دیتا تھا جس میں نمک کا پانی ہوتا تھا۔ اور ایسے گوشت کے ٹکڑے جو ہڈیوں سے لگے تھے کاٹ کاٹ کر سامنے رکھ دیتا تھا۔

کھانا ختم ہوگیا تو نبیذ آئی جسے شہد سے بنایا جاتا ہے نبیذ میں نشہ نہیں ہوتا مگر ہلکا سا سرور ہوتا ہے۔ حنفی مسلمان اسے جائز سمجھتے ہیں۔ سلطان نے پیالہ لینا چاہا تو فوراً اسکی بیٹی مسند سے اٹھی اور سلطان کے سامنے نہایت ادب سے پیالہ پیش کیا۔ سلطان کے بعد دوسرے پیالے بڑی بیگم اور دوسری بیگمات کے سامنے پیش کیے۔ اس کے بعد پیالہ ولیعہد نے لیا   بیگمات کے سامنے درجہ بدرجہ پیش کیے۔

پھر ولی عہد کے بھائی جان بک نے ساقی گری کی اور سب کو نبیذ پلائی۔ اس کے بعد امیروں کے لڑکے کھڑے ہوتے اور اپنے اپنے بزرگوں کے سامنے پیالے پیش کیے۔

جب تک دور چلتا رہا گانے والے اپنے گانے کے کمالات سے سامعین کو لطف اندوز کرتے رہے۔

علماء اور مشائخ کے لیے بھی ایک خیمہ نصب کیا گیا تھا اور ان کے سامنے بھی سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے لائے گئے جن میں کچھ نے ان برتنوں میں کھانا پسند نہیں کیا اور لکڑی کے پیالوں میں کھایا۔ کچھ نے ان ہی برتنوں میں کھا لیا۔

جہاں تک نگاہ جاتی تھی گھوڑوں کے دودھ کے بھرے ہوئے برتن گاڑیوں میں بھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جنھیں سلطان نے تقسیم کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ میرے سامنے بھی ایک گاڑی لائے جسے میں نے اپنے ترک پڑوسی کو دے دیا۔

حاج ترخان

جس شہر سے کسی قسم کا ٹیکس نہیں لیا جاتا یعنی معاف الاخراج ہوتا ہے اسے ترکی زبان میں ترخان کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں ایک حاجی نے قیام کیا تھا۔ یہ بڑا مقدس اور نیک آدمی تھا اس لیے یہ جگہ اسے بطور معافی دیدی گئی تھی، اس وقت یہاں کوئی آبادی نہ تھی کچھ دن بعد لوگ آنے لگے اور رفتہ رفتہ اچھی خاصی آبادی ہوگئی۔ اور اب بڑا اچھا شہر ہوگیا ہے۔ سلطان یہیں رہتا ہے شہر کی آبادی نہر اتل پر ہے۔

نہر اتل دنیا کی بڑی نہروں میں سے ایک نہر ہے سردی کے زمانے میں اس کا پانی اور آس پاس کے تالاب جم جاتے ہیں پھر ہزاروں گھاس کے لٹھے دریا میں ڈالے جاتے ہیں تاکہ گاڑیاں اور گھوڑے گزر سکیں۔

سردی کے آخر میں کبھی کبھی مسافر ڈوب کر ہلاک بھی ہوجاتے ہیں کیونکہ برف نرم پڑ جاتا ہے اور چلنے والا بے خبری میں غرق ہوجاتا ہے۔

سفرِ قسطنطنیہ

بیگم بیلون نے سلطان سے میکہ جانے کی اجازت مانگی

ہے اور اپنے باپ سے ملنے جارہی ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی اپنے ہمراہ چلنے کی اجازت دلا دیجیے قسطنطنیہ دیکھنے کا بڑا اشتیاق ہے۔"

بیگم نے کہا "قسطنطنیہ میں ہر وقت مسلمانوں کی جان کا خطرہ ہے وہ خالص عیسائیوں کا ملک ہے آپ نہ جائیے۔"

میں نے کہا "آپ کے ساتھ رہ کر خطرہ کا کیا سوال ہے آپ تو شاہِ قسطنطنیہ کی نورِ نظر ہیں۔" اس پر وہ خوش ہوگئی اور مجھے سلطان سے اجازت دلا دی۔ چلتے وقت مجھے سلطان نے ڈیڑھ ہزار اشرفیاں، خلعت، بہت سے گھوڑے کپڑے سنجاب اور سمور کی پوستینیں دیں۔ بیگمات اور لڑکوں نے بھی دیا اور بڑی عزت سے رخصت کیا۔

سلطان ملکہ اور ولی عہد نے بیلون بیگم کو ایک منزل تک پہنچایا۔ پانچ ہزار سوار، ایک سو چھوکریاں، چار سو گاڑیاں گاڑیوں کو کھینچنے والے ایک ہزار گھوڑے تین سو بیل اور دو سو اونٹ تھے۔ ساتھیوں میں دس ہندی اور دس رومی جوان تھے ہندی جوانوں کا سردار سنبل تھا اور رومیوں کا میخائیل۔

راستے میں ایک شہر آیا جس کا نام اگک ہے۔ یہاں سردی زیادہ تھی اس شہر سے ایک دن کے فاصلے پر روس کے ڑ ہیں۔

روس میں رہنے والے عیسائی بڑے دغا باز ہیں اُن کی رت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ روسیوں کے بال بھورے آنکھیں کرنجی ہوتی۔ روس میں چاندی کی کانیں ہیں۔

یہاں سے چلے تو دس رات سفر کرنے کے بعد سرادق پہنچے جو اٹے خلیج کے ساحل پر ہے۔ یہاں بہترین گودی ہے حکومت ہاکی ہے یونانی اس کے تابع ہیں۔

ان تمام شہروں سے گھوڑے بھیڑیں گائے دوئی گھوڑیوں کا دودھ بیگم کے لئے بطور دعوت آتا تھا۔ اور ہر ایک شہر کا امیر بیگم کو دوسری سرحد تک پہنچا دیتا تھا۔ اس سفر میں پانی کم ملتا ہے ترکوں نے پانی اور دودھ مشکوں میں بھر لیا تھا۔ اس لئے کوئی تکلیف نہیں ہوئی

صبح شام میں بیگم کے سلام کے لیے جاتا تھا۔ اور جب بھی وہ ہمارے لیے کھانا بھیجتی دو تین گھوڑے بھیج دیا کرتی۔ اور بھیڑیں بھی۔ میں گھوڑوں کو ذبح نہ کرتا تھا اور میرے پاس پچاس گھوڑے ہوگئے تھے۔ سرحد کے آخر میں شہر بابا سسطوق میں ہم پہنچے تو خوب سردی تھی اور پیاس کا نام و نشان نہ تھا۔ ایک دن بیگم کے سلام کو گیا تو انھوں نے اپنے وکیل کو حکم دیا کہ باورچی خانے سے پندرہ تیار گھوڑے مجھے دے دیے جائیں اور مجھ سے کہا۔ آپ ذرا فکر نہ کریں ضرورت ہو تو اور منگالیں۔

مہنولی

مہنولی سے رومی عمل داری شروع ہوگئی ہے اور بیگم اپنے باپ کے دار الحکومت میں پہنچ گئی ہے۔ رومی حکمراں کی طرف سے بڑی شان دار دعوت آئی ہے۔

مہنولی سے فقط گھوڑوں کے ذریعے سفر ہوگا، گاڑیاں سب چھوڑ دی گئیں۔ حکمراں نے بہت سے خچر بھیج دیے ہیں۔ ان میں سے کچھ خچر بیگم نے مجھے بھیج دیے۔ مسجد کا خیمہ قلعہ میں چھوڑ دیا اور ان کی ممانعت کر دی گئی۔

کھانے میں سور اور کھانے کے بعد مشروب میں شراب آنے لگی خواصوں نے مجھے بتایا کہ بیگم نے شراب بھی پی ہے اور سور بھی کھایا ہے بیگم کے ساتھیوں میں ترکوں کے سوا کوئی نماز پڑھنے والا نہیں رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میرے قلب پر تاریکی آگئی ہے شاید

جناب محمد شاہد عظیم

وہ بے قصور تھا!

جب دوسری بس بھی رُکے بغیر گذر گئی تو میرا چہرہ اتر گیا۔ انتظار میں کھڑے کھڑے ٹانگیں دُکھنے لگی تھیں۔۔۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور بس آئی۔ اس میں بھی جگہ نہیں ملی میں نے اپنے دل کو تسلی دی "اگلی بس میں ضرور جگہ مل جائے گی۔"

"بابو جی۔۔۔ میرا پیر!!" پیچھے کھڑا ہوا آدمی چلا اُٹھا۔ اس کا پیر میرے جوتے سے کچل گیا تھا۔ میں نے معافی مانگ لی۔ وہ بہت دیر تک آپ ہی آپ بڑبڑاتا رہا۔ اس کے کپڑوں سے سخت بدبو نکل رہی تھی۔ یہ بدبو میری برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔۔۔ مَیلی چکٹ قمیض کے پھٹے ہوئے حِصّوں سے اس کا بدن نظر آرہا تھا جس پر مَیل کی تہیں جمی تھیں۔ شاید بارش کے چھینٹوں سے بچنے کے لیے اس نے جھولی سر پر اوڑھ رکھی تھی۔ یہ کپڑوں سے زیادہ غلیظ تھی۔ اس کے چہرے کا کافی حِصّہ ڈھک گیا تھا۔

ایک بار اس کا زخمی ہاتھ میری سفید بے داغ بش شرٹ سے چھو گیا تو میں تلملا کر رہ گیا۔ بدبو کے مارے دماغ پھٹا جارہا تھا۔ میں اُسے اپنے پیچھے جگہ دے کر پچھتا رہا تھا۔ اتنے میں ایک اور بس آئی۔ دوبارہ دھکّم دھکّا شروع ہو گیا۔ لائن کب کی ٹوٹ چکی تھی، ہر کوئی اندر گھسنے کے لیے اپنا پورا زور لگا رہا تھا۔

جیسے تیسے میں بس کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن ابھی ایک اور مرحلہ باقی تھا۔۔۔ یعنی اندر داخل ہونا۔ بہت سے آدمی پہلے ہی دروازے سے چمٹے کھڑے تھے۔ میں نے بھی کوشش کرکے وہاں کھڑے رہنے کے لیے جگہ بنا لی لیکن بس کنڈکٹر نے روک دیا "اندر جگہ نہیں ہے"

میں نے سُنی ان سُنی کر دی۔ "میں کہتا ہوں جگہ نہیں ہے!" اس نے چیخ کر کہا۔ اس کے کانوں کی لویں تک سرخ ہو گئیں۔ ساتھ ہی اس نے گھنٹی بجا دی۔ بس ایک جھٹکے کے ساتھ چل پڑی۔ میں جھنجھلایا ہوا اپنی جگہ واپس آگیا۔ وہ گندا سا آدمی اب بھی میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی جیسے میرا مذاق اڑا رہا ہو۔

میں نے نفرت سے اپنا مُنھ پھیر رکھا تھا۔ اس کے جسم سے نکلتی ہوئی بدبو نے شدّت اختیار کر لی تھی

میں ذرا اور آگے ہوگیا۔ مصیبت یہ تھی کہ اپنی جگہ چھوڑ بھی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں مجھے بارش میں بھیگنا اور لائن میں سب سے پیچھے یعنی آخری سرے پر کھڑا ہونا پڑتا اور غالباً دو تین گھنٹے بعد ہی بس مل پاتی۔ میں نے ادھر اُدھر نگاہ ڈالی شاید کوئی دوست نظر آجائے۔ پھر دور کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے اپنے پیچھے مجھے جگہ دے دی۔ یہ صاحب خاصے فیشن ایبل تھے۔ گبرڈین کا سوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر فیلٹ ہیٹ جمی ہوئی بڑی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ایک اور بس آئی۔ ابھی رکی بھی نہ تھی کہ لوگ ٹوٹ پڑے۔ اب کے لوگوں کو دھکیل دھکال میں چڑھنے میں کامیاب ہوگیا۔ سیٹ پر پہنچ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بس فراٹے بھرنے لگی۔ وہ گندا سا آدمی دروازے کے پاس والی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بس کے جھٹکوں کے ساتھ اس کا سر پاس بیٹھے ہوئے مارواڑی لالہ کے کندھوں سے ٹکرا جاتا اور وہ اسے گالیاں دیتا۔

"بابو جی ٹکٹ !"

"آں ... ں۔" میں چونک پڑا۔ کنڈکٹر سامنے کھڑا تھا۔ آپ سے آپ میرے منھ سے نکل گیا "راجہ جی نگر" کنڈکٹر نے ٹکٹ دے دیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا پر یہ تو خالی واپس آگیا! میں نے گھبرا کر دوسری جیب دیکھی جلدی سے بش شرٹ کی دونوں جیبیں دیکھ ڈالیں۔ اس وقت میری پریشانی دیکھنے کے قابل تھی کسی نے موقع پاکر میری جیب پر ہاتھ صاف کر دیا۔ اس وقت بس میں بیٹھے سارے مسافر اب میری طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

"جیب کٹ گئی — !"

"ارے کب ؟"

"کس کی — ؟"

آخری سرے پر بیٹھا عینک والا بوڑھا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سب کی نظروں میں بے پناہ ہمدردی اور رحم کے جذبات پاکر میری ڈھارس بندھی۔ اتفاق سے اسی بس میں میرے ایک دوست بھی تھے۔ انھوں نے ٹکٹ کے پیسے ادا کیے تب کہیں جاکر اطمینان نصیب ہوا۔ ورنہ شاید اس اندھیری طوفانی رات میں بس سے اتار دیا جاتا۔

مجھے اپنے روپوں کا بے حد رنج تھا۔ یہ میں نے ایک ایک پیسہ جوڑ کر جمع کیے تھے۔ یہی کوئی بیس کے قریب روپے ہوں گے۔ لوگوں کے سروں پر سے پھسلتی ہوئی میری نظریں اسی گندے آدمی پر آکر ٹک گئیں۔ میں نے سوچا یہی چور ہے، لائن میں وہی میرے قریب تھا۔ بس پر چڑھتے وقت اس نے مجھے دھکا بھی دیا تھا — کمینے — بدمعاش — !! میں نے اس کو گریبان سے پکڑ کر اٹھا لیا اور اس کے ساتھ ہی دو تین تھپڑ جڑ دیے۔

"میں نے کیا کیا بابو جی — ؟"

"بابو جی کے بچے، اول تو جیب کاٹ لی اب ہم سے ہی پوچھتا ہے میں نے کیا کیا بابو جی — !" میں نے اُسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی۔

"میں نے کسی کی جیب نہیں کاٹی — دیکھ لو میرے سارے کپڑے دیکھ لو —" وہ روتا ہوا بولا۔ اس کھینچا تانی میں اس کے سر پر سے کپڑا ہٹ گیا۔ لیکن یہ کیا — ! میں نے حیرت سے دیکھا اور دونوں آنکھیں بند

کریں۔ وہ دونوں آنکھوں سے معذور تھا اور جذامی بھی کیونکہ اس کی ناک کچھ دب سی گئی تھی۔ چہرہ پھولا پھولا سالگ رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر دوبارہ کپڑا ڈال لیا۔ وہ بے قصور تھا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

فلیٹ ہیٹ والے نوجوان کا بس میں کہیں پتہ نہ تھا۔ وہی جیب کترا تھا۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا لیکن جب کنڈکٹر نے بتایا کہ فلیٹ ہیٹ والا کوئی نوجوان بس میں سوار ہی نہیں ہوا تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ کارروائی اسی کی تھی۔ لائن میں کھڑے کھڑے اس نے میری جیب کاٹ لی اور چلتا بنا۔ میں غلطی سے اندھے کو چور سمجھ بیٹھا۔ مجھے اپنی غلطی پر بڑا افسوس ہوا۔

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور میں جیسے سوچتے سوچتے چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اندھے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ پچھلے اسٹاپ پر اتر گیا تھا۔ پھر کبھی نظر نہ آیا۔ میں مسلسل کئی دن تک سڑکوں پر ادھر اُدھر پھرتا رہا کہ شاید وہ مجھے مل جائے۔ میں آج تک اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوں۔ میرا ضمیر مجھے برابر ملامت کر رہا ہے۔ کاش وہ مجھے معاف کر دے۔

مالک :۔ (نوکر سے) تم بڑے احمق ہو! میں نے تم سے کہا تھا کہ بیگم صاحبہ کو یہ نہ بتانا کہ میں رات کو کب واپس آیا تھا۔ پھر تم نے کیوں بتایا۔"

نوکر :۔ حضور میں نے نہیں بتایا۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ جب آپ واپس آئے تو۔۔۔۔ میں صبح کا کھانا تیار کرنے میں مصروف تھا گھڑی نہ دیکھ سکا۔

نہال احمد صدیقی

ساٹھ برس پورے ہوگئے

جناب رشید الوحیدی جالبی

اکتوبر نومبر کی گلابی سردی شروع ہو چکی تھی۔ انگیٹھی کے کنارے بیٹھنے کی ضرورت تو ابھی نہیں تھی مگر رات کی ٹھنڈک مجبور کرتی تھی کہ ہلکی رضائی میں گھس کر لیٹیں۔ ایک ایسی ہی رات میں جمیل، عرفان، ناہید اور ننھا قدیر دادی کو گھیرے بیٹھے تھے "دادی جان آپ نے کہا تھا کل ایک سچی کہانی سنائیں گی۔ میری دادی آج سنا ہی دیجیے"۔ سب بچے ضد کر رہے تھے۔ "اچھا بھائی" دادی نے تسبیح جیب میں رکھتے ہوئے کہا "تم سب صبر کیے بیٹھے رہو میں نماز پڑھ لوں تب سناؤں گی"۔

قدیر مچل گیا "دادی آپ کی نماز تو بڑی لمبی ہوتی ہے ہم سو بھی جائیں گے"۔

دادی نے محبت سے ڈانٹا: "چل شیطان! ابھی سے کیا جلدی ہے۔ نماز کو ایسا نہ کہو، اللہ پاک خفا ہو جائیں گے"۔

"توبہ، میری توبہ!" قدیر جلدی سے بولا۔

ناہید بولی- "دادی آپ خوب لمبی نماز پڑھیے جتنی عزیز کے دادا کی داڑھی لمبی ہے۔ اتنی لمبی! ہم انتظار کرلیں گے"۔

عرفان نے لقمہ دیا: "نہیں دادی اتنی لمبی نماز پڑھیے جتنی لمبی مال گاڑی ہوتی ہے۔ تب اللہ میاں بہت خوش ہوں گے اور ساری مال گاڑی کے ڈبوں کو ثواب سے بھر دیں گے"۔

دادی ان معصوم باتوں پر مسکراتی ہوئی جانماز پر کھڑی ہوگئیں۔

بچے آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔

اور جب دادی نماز سے فارغ ہوکر چارپائی پر آئیں تو سب بچوں نے گھیر لیا۔ قدیر چلایا "آگئیں دادی، بڑی اچھی دادی ہیں، ننھی سی"۔

"جی ہاں!" جمیل نے منہ بنا کر کہا "ننھی سی کیوں ہوتیں ماشاءاللہ ۱۰۰ برس کی تو ہیں"۔

"جی نہیں ایک سو دس برس کی"۔ ناہید نے اس کی بات کاٹی۔

"دادی آپ کی عمر کیا ہے؟" قدیر نے فیصلہ کرنا چاہا۔

دادی نے اس کے گال پہ ہلکے ہلکے تھپکی دیتے ہوئے کہا "بیٹا کل نومبر کی ۲۵ تاریخ کو میں پورے ساٹھ برس

کی ہو جاؤں گی۔"

"آہا" قدیر چلایا "تب تو ہم دادی کی ساٹھویں سالگرہ منائیں گے۔"

"جی ہاں" جمیل نے اُسے چپ کرتے ہوئے کہا "ہماری دادی بچاری کتنی تو بیمار ہیں۔ دیکھو نا انھیں کبھی کبھی نیند میں جو دورہ پڑتا ہے تو گھنٹوں بے ہوش رہتی ہیں۔ وہ تو اللہ کا فضل ہے کہ جلد ٹھیک ہو جاتی ہیں نہیں تو مر ہی جائیں۔"

"چپ پاگل!" ناہید نے ڈانٹا "ایسی بات منھ سے کیوں نکالتا ہے۔ دُعا کر کہ دادی دیر تک زندہ رہیں اچھی ہو جائیں۔"

اسی کائیں کائیں میں دادی نے کہا "اب تم لوگ بکتے رہو گے کہ کہانی بھی سنو گے۔"

"ہاں! ہاں!!" سب بچے ایک دوسرے کو چپ کرنے لگے "سنائیے دادی" ہم سب چپ ہو گئے۔

دادی نے کہانی شروع کر دی "سنو بچو! بیچ میں مت بولنا، بالکل سچی کہانی سناؤں گی۔"۔۔۔

"بہت دنوں کا قصہ ہے اسی شہر میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ اپنے ماں باپ کی بڑی لاڈلی تھی۔ ماں باپ اس کی ہر ضد پوری کر دیتے تھے۔ اس لڑکی میں ایک خراب عادت تھی۔ وہ غصہ بہت کرتی تھی۔ اکثر غصے میں وہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو پیٹ دیتی، گھر کے برتن توڑ ڈالتی، گڑیاں نوچ کر پھینک دیتی۔"

ایک بار اس کے ابّا کہیں دورے پر جا رہے تھے اس نے بھی ضد کی کہ میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ ابّا نے بہت سمجھایا "نہیں بیٹی میں معلوم نہیں کہاں جنگل بیابان میں گھومتا پھروں گا، تم میرے ساتھ کہاں چلو گی۔" مگر وہ نہ مانی۔

آخر مجبور ہو کر اس کے باپ کو ساتھ لے جانا پڑا۔ اس کے باپ محکمۂ جنگلات میں کام کرتے تھے۔ انھیں اکثر دورہ کرنا پڑتا اور مہینوں گھر سے باہر جنگل میں پڑاؤ ڈال کر رہتے۔ اس بار بھی انھیں جنگل میں کافی دنوں ٹھہرنا پڑا۔ ایک جگہ خیمے لگا کر اپنی لڑکی کے رہنے کا انتظام کر دیا۔ اس کے ساتھ مزدوروں میں سے ایک مزدور کی بیوی اور ۵ سال کا ننھا بچہ رہتے تھے۔

باپ تو دور دور کام کے لیے نکل جاتے۔ لڑکی مزدور کے لڑکے کے ساتھ کھیلتی اور کبھی کبھی غصے میں اس کی بُری طرح مرمت کر دیتی۔ مزدور کی بیوی بچاری کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔

ایک بار اس نے مزدور کے لڑکے کے سر پر اس زور سے لکڑی ماری کہ وہ بے ہوش ہو گیا اور بہت سا خون نکلا۔ بچاری بچے کی ماں رونے لگی اور اس کے دل سے اس لڑکی کے لیے بد دعا نکلی۔

مرہم پٹی تو کہاں سے ہوتی کچھ دیہاتی اور جنگلی دواؤں سے کام لے کر اس نے بچے کا علاج کیا اور وہ ٹھیک ہو گیا۔ مگر اب وہ اس لڑکی سے بہت ڈرنے لگا۔ لاکھ بلانے کے بعد بھی وہ اس کے پاس نہ آتا۔ اسی طرح دن گزرتے رہے۔ لڑکی طرح طرح سے اس معصوم کو ستانے لگی۔

آخر دو ماہ بعد واپسی کا پروگرام بنا۔ واپس ہوتے ہوئے لڑکی نے ضد کی کہ بچے کے پاس جو بکری ہے وہ میں لوں گی۔ باپ نے لاکھ سمجھایا کہ بیٹی بچارے ماں کو اس طرح

نہیں چھینا کرتے۔ مگر وہ کب ماننے والی تھی۔ زبردستی بکری کو
گاڑی میں رکھوالیا۔ بچہ بلک بلک کر روتا رہا اور یہ چل دی
بکری کے دو بچے تھے دونوں جنگل میں چرنے گئے تھے
دونوں ماں کو نہ پاکر چلانے لگے۔ اب بکری کے دونوں بچے
اور مزدور کا معصوم ننھا بکری کے لیے بے تاب تھے۔ اُدھر بکری
کا یہ حال تھا کہ اپنے بچوں اور چھوٹے سے مالک کی یاد میں اور
کھلے جنگل کی تڑپ میں دن رات چلاتی تھی۔ گھاس دانہ سب
چھوٹ گیا۔ لڑکی نے پہلے تو اسے بہلانا چاہا مگر جانور بھی بچوں سے
اور اپنے مالک سے پیار کرتے ہیں۔ اُسے کہاں چین تھا۔ آخر
لڑکی کو ایک دن غصہ جو آیا تو اس نے بکری کو ایک کمرے
میں بند کر دیا۔ نہ دانہ نہ پانی۔ دو دن دو رات بند رکھا اور
تیسرے دن جب کھولا تو وہ سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی۔ اب اس
نے چاہا کہ اپنے ساتھ لے کر چرانے جائے مگر وہ ایک جگہ جم کر رہ
گئی۔ لڑکی کو جو غصہ آیا تو ابا کا بید اُٹھا لائی اور اس کی پٹائی
شروع کر دی۔ اس قدر مارا، اس قدر مارا کہ اس کے مُنھ اور
ناک سے خون نکل آیا۔ آخر وہ غریب اپنے بچوں کی ممتا اور
ننھے مالک کی یاد سینے سے لگائے مار کی تاب نہ لا کر مر گئی۔ لڑکی
پہلے تو گھبرائی مگر پھر فوراً اسے کھینچ کر باہر پھینک دیا۔

رات کو جب لڑکی سوئی تو اس نے ایک خواب دیکھا
ایک نہایت خوفناک دیو اس کی طرف لال لال آنکھیں نکالے چلا
آرہا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں بکری ہے اور دوسرے ہاتھ کی
انگلی ایک بچے نے پکڑ رکھی ہے۔ دیو قریب آیا تو بچے نے انگلی سے
اس لڑکی کی طرف اشارہ کر دیا۔ دیو نے پہلے تو بکری کو اس کی
طرف کر دیا۔ بکری نے پوری قوت سے اس کی پیشانی پر سینگ
مارا۔ لڑکی چکرا گئی اور ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ دیو کا جبڑا کھلا
اور دوسرے لمحے وہ ہاتھ جس سے اس نے بکری کو مارا تھا، اپنے
جبڑے سے چبا ڈالا۔

لڑکی ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ اسے جب ہوش
آیا تو دیکھا کہ اس کی چارپائی کے پاس اماں ابا بیٹھے ہیں، وہ ان
کی گود میں ہے۔ جب اس نے آنکھ کھولی تو ابا نے پوچھا، بیٹی کیسی
طبیعت ہے کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ مگر لڑکی نے کچھ جواب
نہ دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد اس کی طبیعت سنبھل گئی۔

دوسرے دن پھر اس نے یہی خواب دیکھا اب کے
اُسے ایک عورت بھی نظر آئی جو خواب ہی میں اس سے کہہ رہی تھی
"اے ظالم لڑکی تو ساٹھ برس جیے گی اور ہمیشہ تجھ کو تیرے
ظلم کی سزا ملتی رہے گی۔۔!"

لڑکی کے ماں باپ نے علاج تعویذ میں کوئی کسر نہ چھوڑی
مگر ہر مہینے یا دوسرے مہینے اُسے یہ خواب نظر آتا اور وہ بے ہوش
ہو جاتی۔ جب ہوش آتا تو اس کی پیشانی اور ایک ہاتھ میں سخت
درد ہوتا تھا۔ اتنا کہہ کر دادی چپ ہو گئیں۔ عرفان، ناہید اور جمیل
حیرت سے ایک دوسرے کا منھ دیکھ رہے تھے۔

"بچو اب سو جاؤ، باقی کہانی کل سناؤں گی" دادی
نے اٹھتے ہوئے کہا۔ دوسرے دن دادی دوپہر میں آرام
کر رہی تھیں کہ اچانک انھیں پھر دورہ پڑا۔ سب بچوں نے انھیں
گھیر لیا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ جمیل نے کان لگا کر سُنا تو یہ سمجھ
میں آیا:

"آج تیرے ساٹھ برس پورے ہو گئے۔ آج
بکری، بکری کے بچے اور ننھے مالک کا انتقام بھی پورا
ہو گیا۔"

اور دادی اب بے ہوش ہو گئیں۔ شام تک

باقی صفحہ

محترمہ زہرہ جبیں

نامِ گاندھی

جہاں میں رہے گا اَمر نام گاندھی !
ہے مانند شمس[1] و قمر[2] — نام گاندھی !

کیا کام تب نام اتنا ہے پایا غلامی کے بندھن سے ہم کو چھڑایا
حکومت سے غیروں کی ہم کو بچایا وطن کے لیے جان کو بھی کھپایا

جہاں میں رہے گا اَمر نام گاندھی!
ہے مانند شمس و قمر — نام گاندھی!

ہے امن واماں کا وہ اوتار اپنا ہے الفت محبت کا کردار اپنا
بڑھا اُس کی ہستی سے دربار اپنا ہے سردارِ جگ کا وہ سردار اپنا

جہاں میں رہے گا اَمر نام گاندھی!
ہے مانند شمس و قمر — نام گاندھی!

تعصب سے دل ان کا ایسا بری تھا کہ بس ایک اُس کو خدا اور ہری تھا
مسلمان، عیسائی یا پارسی تھا وہ زنجیرِ حبِ وطن کی کڑی تھا

جہاں میں رہے گا امر نام گاندھی!
ہے مانند شمس و قمر — نام گاندھی!

وہ اخلاق وانسانیت تھا سراپا غریبوں کا حامی، ہری جن کا داتا
بسا تھا اچھوتوں کی بستی میں ایسا دلوں پہ بھی اُن کے تھا قبضہ اسی کا

جہاں میں رہے گا امر نام گاندھی!
ہے مانند شمس و قمر — نام گاندھی!

[1] سورج [2] چاند

مہر بانو عبداللہ فقیہ (بمبئی)

ہم نے ریڈیو سُنا

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں بمشکل چار پانچ سال کی تھی۔ ایک دن گھر میں ریڈیو آیا۔ ویسے تو سبھی خوش تھے لیکن میری خوشی سب سے بڑھ کر تھی (حالانکہ ریڈیو کا بٹن آن کرنا نہیں آتا تھا) میری سب سہیلیوں کے گھر ریڈیو تھا۔ نہیں تھا تو میرے گھر میں۔ کبھی کبھی مجھ میں احساسِ کمتری بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ امی کے سامنے کئی بار بسور چکی تھی کہ ہمارے گھر میں ریڈیو کیوں نہیں۔ لیکن ابا سے کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی بالآخر خدا نے سن لی اور ہمارے گھر میں ریڈیو آگیا۔ امی کی کوششوں سے آیا۔

پھر کیا تھا۔ دن بھر سب اس کے گرد رہتے۔ کوئی تو کوئی آکاش وانی لگا رہا ہے تو کوئی آل انڈیا ریڈیو ایک سن دو پہر تک ریڈیو چلا سے تھک گئے اور انھیں نیند کی دیوی نے اپنی آغوش ں لے لیا۔ اب میں آزاد تھی۔ کافی دیر سے میں بس اسی کا نتظار کر رہی تھی۔ کوئی جاگتا ہوتا تو بھلا کاہے کو ہاتھ لگانے یتا۔ تو خیر اب میں نے چاروں طرف دیکھا سب کی آنکھیں ند تھیں۔ میں بلی کی طرح دبے پاؤں باہر نکلی ابھی قدم دروازے طرف بڑھے ہی تھے کہ ایک آواز "نرگس کہاں جا رہی ہو اس ری دھوپ میں" میرے کانوں پر ہتھوڑا بن کر لگی۔ اور میں دی سے بستر میں دبک گئی۔ امی پھر پانچ منٹ میں دوبارہ کی تھیں۔ اب میں نے کافی احتیاط سے کام لیا۔ اور چھپڑی کی طرح باہر نکلی۔ دروازہ کھولتے ہی اس طرح بھاگی جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہو۔

جلدی جلدی اپنی سہیلیوں کو جمع کیا اور ایک لیڈر کی طرح تقریر کی "دیکھو سیما، عذرا، صبا اور غزالہ ایک خوش خبری سنو۔ بات یہ ہے کہ ہمارے گھر میں آج ریڈیو آیا ہے۔ اب گھر میں صرف میری حکومت ہے چلو ہم موقع سے فائدہ اٹھا کر کیوں نہ ریڈیو سنیں" سب نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ اور ہم چھپتے چھپاتے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور ہم ریڈیو کی طرف بڑھ گئے۔

لیکن اب جو میں نے اسٹیشن لگانا چاہا تو چکرائی صبح کے وقت تو اچھی طرح یاد تھا مگر اب کیا کروں۔ سہیلیاں سامنے تھیں ان کے سامنے اپنی ہار کیسے مان لیتی۔ چاروں خاموشی سے میرا منہ تک رہی تھیں۔ ہولے سے میں نے ایک بٹن دبا دیا۔ مگر مایوس ہونا پڑا۔ آواز نہیں آ رہی تھی۔

کچھ سوچ کر میں نے کہا: "دیکھو مجھے تو ریڈیو لگانا آتا ہے۔ لیکن دیکھتی ہوں تم لوگوں میں سے کس کو آتا ہے ذرا لگاؤ تو" یہ سننا تھا کہ چاروں ریڈیو پر پل پڑیں۔ کوئی یہ بٹن دبا رہی ہے کوئی وہ۔ اور ساتھ ہی ساتھ گل افشانیاں بھی کرتی جا رہی ہیں۔ عذرا ایک بٹن دباتے ہوئے بولی۔ میری

آپا یہی بٹن دبا کر ریڈیو لگاتی ہیں یہ غزالہ دوسرا بٹن دباتے ہوئے بولی :- "نہیں بھائی جان اس بٹن کو دباتے ہیں۔ صبا بولی "نہیں نہیں یہ بٹن دباؤ"۔ خوش قسمتی سے سیما نے جو بٹن دبایا تو ریڈیو کی لائٹ روشن ہوگئی۔ ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ لیکن فوراً ہی خوشیوں کو بریک لگ گیا۔ لائٹ تو روشن ہوگئی مگر آواز نہیں آرہی تھی۔ بالآخر میں نے سیما سے کہا "سیما تم ہی چلاؤ نا ہمیں تو نہیں آتا"۔ سیما نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ سے ریڈیو کی طرف دیکھا شاید باقی تینوں سہیلیوں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ بھلا سیما میں کون سے لال لگے تھے جو ان سے فرمائش کی۔ ایک نے دوسرے کو اشارے کئے اور عذرا نے کہا "بھئی ہم تو جاتے ہیں تمھارا ریڈیو ہی خراب ہے"۔ صبا نے ہاں میں ہاں ملائی "اور نہیں تو کیا جب سے ہم لگا رہے ہیں لگتا ہی نہیں"۔ غزالہ بھی کم نہ تھی اس نے کہا "تمھارے آبا آدھی قیمت میں لے آئے ہوں گے"۔ یہ جملے سن کر مجھے غصہ آگیا۔ میں نے تڑ سے ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا "بڑی آئی تیرے گھر ہوگا سیکنڈ ہینڈ ریڈیو"۔ وہ اپنی بے عزتی برداشت نہ کرسکی۔ اور فوراً میرے بال پکڑ لئے اور پھر زوردار جنگ چھڑی تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ غضب تو یہ ہوا کہ سیما نے نہ معلوم کون سا بٹن گھمایا کہ ریڈیو اپنی پوری طاقت سے واہی تباہی بکنے لگا۔ اور اب سیما بھی گھبرا گئی۔ ایک ریڈیو کا شور ہی کیا کم تھا کہ ہمارا دوسرا شور۔

اتنے میں امی باجی آندھی کی طرح آئیں صورتِ حال پر غور کیا پھر جیسے ساری وجہ ان کی سمجھ میں آگئی۔ میری سہیلیوں کو باہر نکالا گیا ریڈیو کو زوردار آواز سے نجات دلائی گئی اور میری تو خیریت ہی نہ تھی باجی نے جو کان پکڑے تو بالکل اسٹینڈ اپ ہوگئی۔ اور پھر تو امی کی باتیں خدا جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ میری سمجھ میں تو صرف اتنا

بقیہ "ساٹھ برس پورے ہوگئے" :

انھیں ہوش میں لانے کی ترکیبیں ہوتی رہیں مگر بے سود۔ شام کو ڈاکٹر نے آکر فیصلہ کردیا۔

بڑی بی تو کب کی مرچکی ہیں!

سارے بچے سہمے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور سب نے مل کر عہد کیا کہ کبھی غصہ نہ کریں گے! کسی کو ماریں گے نہیں!! جانوروں کو نہ ستائیں گے!!!

ناہید جمیل سے کہہ رہی تھی۔ "آہ کیا معلوم تھا کہ رات دادی نے اپنا ہی قصہ سنایا تھا۔!"

عرفان بول پڑا۔ "ہمیں کیا خبر تھی کہ دادی کو اکثر دورہ کیوں پڑا کرتا ہے۔ اب یہ راز کھلا۔ بھیا قدیر آج نومبر کی ۲۵ ہے۔ دادی کے ساٹھ برس پورے ہوگئے۔

نیچے کے دائرے میں سُرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدتِ خریداری ختم ہوجاتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔

براہِ کرم مبلغ ۶ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا۔ اور افسوس کے ساتھ اسے بند کردیں گے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے

آپ کا خریداری نمبر ہے۔ منیجر

بڑوں کی کوششیں

چوہیا اور ڈھولک

ایک دفعہ ایک چوہیا پہاڑ پر سے آرہی تھی اسے ایک لکڑی ملی اس نے سوچا کہ لکڑی کام آئے گی اِسے اٹھالینا چاہیے۔ وہ لکڑی لے کر جارہی تھی تو اس نے ایک بڑھیا کو روٹیاں پکاتے دیکھا۔ بے چاری کے پاس اتنی لکڑیاں نہیں تھیں کہ پوری طرح سے روٹیاں پک سکیں۔ بڑھیا نے چوہیا سے ایک روٹی کے وعدے پر وہ لکڑی لے لی۔ چوہیا روٹی لے کر آگے چل پڑی۔ اس نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک کمہار کا بچّہ بھوک سے رو رہا ہے۔ چوہیا نے روٹی بچے کو دے دی، کمہار نے روٹی کے بدلے اُسے ایک مٹکی دے دی۔ چوہیا مٹکی لے کر جارہی تھی تو اس نے دیکھا کہ ایک گوالا اپنی بیوی کو پیٹ رہا ہے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ دودھ دوہنے کی مٹکی ٹوٹ گئی ہے۔ چوہیا نے مٹکی گوالے کو دیدی، گوالے نے مٹکی کے بدلے سے ایک بھینس دے دی۔ بھینس لے جاتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ کچھ لوگ دلہن بیاہ کرلائے ہیں پر اُن کے پاس دلہن کو لانے کے لیے کوئی سواری نہیں ہے۔ چوہیا بولی :۔

"دلہن کو بٹھانے کے لیے میری بھینس لے لو"

خدا کا کچھ ایسا کرنا ہوا کہ دلہن کے بیٹھتے ہی بھینس مرگئی

چوہیا تو براتیوں کے پیچھے پڑگئی، بولی :۔

"یا تو میری بھینس زندہ کرو ورنہ مجھے دلہن دو" چوہیا کے پیچھے پڑنے پر بیاہ والوں نے اُسے دلہن دے دی۔ کیونکہ بھینس چلانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ دلہن لے کر چوہیا جارہی تھی تو راہ میں اُسے ایک ڈھولک والا مِلا۔ چوہیا نے دُلہن دے کر اس سے ایک ڈھولک لے لیا۔ وہ ڈھولک بجانے لگی اور گانے لگی :۔

"پہاڑ نے مجھے لکڑی دی
لکڑی میں نے بڑھیا کو دی
بڑھیا نے مجھے روٹی دی
روٹی میں نے کمہار کو دی
کمہار نے مجھے مٹکی دی
مٹکی میں نے گوالے کو دی
گوالے نے مجھے بھینس دی
بھینس سے میں نے دلہن لی
دُلہن کی میں نے ڈھولک لی
بج میری ڈھولک ڈھمک ڈھول
ڈھمک ڈھوں ڈھمک ڈھول

ہملا کماری کوشک۔ فرسٹ ایئر
ڈپلوما اِن ٹیچنگ آف آرٹ اینڈ
کرافٹ۔ ٹیچرس کالج جامعہ۔

بچوں کی کوششیں

انوکھا بھوت

ابھی کچھ دن ہوئے میرے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ
پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ہم چار دوست ساجد، رشید، طاہر
اور میں ہائی اسکول کا امتحان دینے علی گڈھ گئے تھے۔ ہم چاروں
کے کمرے برابر برابر تھے۔ اکثر جب میرے دوست بھوتوں وغیرہ
کا ذکر کرتے تو میں ان کا خوب مذاق اڑاتا کیونکہ میں بھوت
پریت وغیرہ کا قائل نہیں تھا۔ لیکن میرے دوست ہمیشہ یہی
کہا کرتے تھے کہ بھوت وغیرہ ہوتے ہیں اور چونکہ تمہاری کسی
بھوت سے ملاقات نہیں ہوئی اس لیے تم بھوتوں کا مذاق
اڑاتے ہو۔

ایک رات تقریباً بارہ بجے میں اپنے کمرے میں
بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔
اور پھر مجھے اپنے کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی
اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ قدم میرے کمرے کی طرف بڑھے
چلے آرہے ہیں۔ میرے دل میں خیال آیا کہ ساجد حامد میں سے
کوئی ہوگا۔ اور میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنا ہی چاہتا
تھا کہ چاروں طرف ایک دم اندھیرا ہوگیا۔ میں ڈر کے مارے
لحاف میں چھپ گیا۔ اور لحاف سے اپنا منہ بری طرح ڈھک لیا
اچانک کسی نے میرا لحاف اتار پھینکا۔ میرے منہ
سے ایک زوردار چیخ نکل پڑی کیونکہ میرے سامنے ایک سایہ
کھڑا تھا جس کے لمبے لمبے بال تھے اور اس نے بالکل کالا لباس
پہن رکھا تھا۔ یکایک اس نے گرجدار آواز میں کہا۔

"کیوں بچہ بہت مذاق اڑاتا تھا بھوتوں کا۔ اب
اڑا دیہ۔ اور اپنے خوفناک ناخن میری طرف بڑھانا شروع
کردیئے۔ میں نے اس کی بہت منت سماجت کی۔ لیکن وہ
کہہ رہا تھا۔

بچہ آج تو تیری بریانی کھاؤں گا میرا ڈر کے مارے
برا حال تھا۔ بھوت نے میری طرف دیکھا اور کہا بچہ بیس روپے
دے تو میں تجھے چھوڑ دوں گا۔ میں نے اسے پانچ روپے دیئے
تو وہ بولا بچہ مہنگائی کا زمانہ ہے پانچ روپوں سے کیا بنے
گا۔ بیس روپے دے تب ہی میں تجھے چھوڑوں گا۔ میری تو
جان پر بنی تھی اس لیے بیس روپے دے دیئے۔

دوسرے دن صبح کو جب میں نے یہ واقعہ اپنے
دوستوں کو سنایا تو وہ سب ایک دم بولے "کیوں
جناب اب تو ہوگئے بھوت پریت کے قائل۔ اور میں نے
شرم سے اپنی گردن جھکالی۔ رشید نے کہا خیر چھوڑو
ان باتوں کو۔ اب تو فلم دیکھنے چلتے ہیں۔ اور سب کے
ٹکٹ میں لوں گا۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنا کنجوس دوست

اتنا سمجھی ہو سکتا ہے اور فلم دیکھنے کے بعد رشید نے ہنستے ہنستے بتایا کہ وہ بھوت میں ہی تھا اور یہ فلم بھی انھی رولوں کی بدولت دیکھی جا رہی ہے یہ سن کر آپ خود سوچیے کہ میرا کیا حال ہوا ہوگا۔

محمد سلیمان فاروقی

پہیلی بوجھ پہیلی

ایک چیز کا بتاؤ نام
تین ہیں اس کے اچھے کام
کھانے پینے اور لگاتے
رخ سے شروع ہوتا ہے نام

شبنم ہمیشہ انجم

(۲) ایک چڑیا کے تین رنگ
دانت ہیں اس سے زیادہ تنگ
پنجرے کے اندر ایک رنگ
بڑے نرالے اس کے ڈھنگ

شانشہ انجم

(۳) ایک کہانی میں کہتا ہوں سن لے میرے پوت
بنا پروں کے اڑجائے وہ باندھ گلے میں سوت

شیخ شبنم انجم

کیا آپ جانتے ہیں کہ؟

عادل فرید (گنگ)

آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن، اور آخری گورنر جنرل۔ چکرورتی راج گوپال آچاریہ تھے۔

ہندوستان کے پہلے وائس رائے لارڈ کیننگ تھے۔

آزاد ہندوستان کے پہلے سپہ سالار جنرل کری آپا تھے
ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش چیرا پونجی (آسام) میں ہوتی ہے۔
اقوام متحدہ کے ممبر ملک ۵۵ ہیں۔
سب سے تیز اڑنے والی چڑیا سوری فٹ پیچو ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ سکتی ہے۔
دنیا میں سب سے اونچا مینار "ایفل ٹاور" پیرس میں ہے۔
ہندوستان کا سب سے بڑا چڑیا گھر کلکتہ میں ہے۔

قرار احمد آزاد رہتاسوی
(اکبرپور)

ایک ذرہ مٹی کی قیمت

علی بن مفیدؒ ایک کرایہ کے مکان میں رہتے تھے ایک مرتبہ انھوں نے کچھ لکھا اور اس کو خشک کرنے کے لیے مٹی کی ضرورت ہوئی، کچی دیوار تھی۔ اُن کو خیال آیا کہ ذرا سی مٹی کھرچ کر تحریر پر ڈال لیں۔ پھر خیال آیا مکان کرایہ کا ہے رہنے کے واسطے کرایہ پر دیا گیا نہ مٹی لینے کے واسطے۔ مگر ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ اتنی ذرا سی مٹی لینے میں کیا حرج ہے۔ معمولی چیز ہے۔ انھوں نے مٹی لے لی۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک صاحب کھڑے ہیں جو فرما رہے ہیں کہ کل قیامت کے دن معلوم ہوگا کہ یہ معمولی مٹی کیا چیز ہے۔

سانڈو دیوگاؤں
کرکا سودی

سیدہ کلیم غازی پاشاہ

اُدھر جائے تو بلّی
اِدھر آئے تو خرگوش!

کسی گاؤں میں ایک زمیندار تھا۔ اس کے پاس بہت سے جانور تھے وہ ان جانوروں کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے ملازم سے کہا "تم وہ لال خرگوش پکڑ کر میرے دوست حاجی میاں کو دے آؤ" حاجی میاں یہاں سے چھ کوس دور رہتے تھے نوکر نے خرگوش کو پکڑ کر تھیلے میں ڈال لیا۔ پہلے تو خرگوش بہت اُچھلا کودا مگر پھر خاموش تھیلے میں رہا۔ نوکر تھیلا لے کر مالک کے دوست حاجی میاں کے گاؤں کی طرف چل دیا۔ راستے میں پیاس لگی تو وہ ایک سرائے میں ٹھہرا۔ تھیلا سرائے میں رکھ کر وہ پانی پینے کنویں کی طرف گیا۔ جب سرائے والے نے تھیلے کے اندر کوئی چیز ہلتی ہوئی دیکھی تو اُسے کھولا، دیکھا کہ اندر خرگوش ہے اس نے سوچا اس آدمی سے مذاق کرنا چاہیے۔ اس نے خرگوش کو نکال لیا اور سرائے کی بلّی اس میں بند کر دی۔ پہلے تو بلّی بھی اُچھلی کودی مگر پھر خاموش ہو رہی وہ پانی پی کر آیا اور تھیلے کو کندھے پر ڈال کر یہ جا وہ جا۔

مالک کے دوست حاجی میاں کو سلام کیا اور کہا۔ "آپ کے دوست نے یہ خرگوش بھیجا ہے" یہ کہہ کر ملازم نے تھیلے کو کھولا مگر اس کے اندر بلّی کو دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گیا۔ دوست بہت بگڑا پہلے تو سوچا شاید دوست نے مذاق کیا ہے مگر پھر اس کو خیال آیا کہ یہ شرارت اسی کی ہے، خفا ہو کر ملازم سے کہنے لگا:

"چلے جاؤ تم میرے سامنے سے"

نوکر بہت شرمندہ ہوا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا بھلا کیا لایا تھا اور کیا نکلا۔ اب پھر وہ اسی راستے پر واپس ہوا رات ہو گئی سوچا کہ "اسی سرائے میں ٹھہر جاؤں صبح سویرے ہی نکل جاؤں گا"

تھیلا سرہانے رکھ کر سستانے لگا اور پندرہ منٹ میں گہری نیند سو گیا۔ سرائے والا بات کو تاڑ گیا۔ اب اس نے تھیلے کو پھر کھولا اور اس کا خرگوش اس کے تھیلے میں بند کر کے اپنی بلّی نکال لی۔ ملازم صبح سویرے اٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ دروازے میں داخل ہوا تھا کہ مالک سامنے آگیا اس نے پوچھا:

"وہاں سے کچھ لایا ہے"

پہلے تو یہ سوچنے لگا کہ کیا کہے پھر بولا:

"واہ سرکار! آپ نے بلّی بند کرا دی اس میں اور مجھ سے کہا کہ خرگوش ہے، آپ کے دوست بلّی کو دیکھ کر مجھ غریب پر برس پڑے"

زمیندار حیران تھا کہ کیا بکتا ہے۔ جب نوکر نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر بلّی کو نکالنا چاہا تو اس کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے کان آگئے۔ اور اس نے جب یہ دیکھا کہ اس کے اندر خرگوش ہے تو بولا:۔

"واہ سرکار! خوب ہے آپ کا بھی یہ خرگوش۔ اُدھر جاتا ہے تو بلّی۔ اِدھر آتا ہے تو خرگوش"

باقی ص ۶۲ پر

قلمی دوستی

نام :- سید ریاض حسین : عمر ۱۵ سال
مشغلہ :- قلمی دوستی ، رسالوں کا مطالعہ ، ٹکٹ جمع کرنا ،
ہاکی ، ٹیبل ٹینس ، بیڈمنٹن کھیلنا ۔
پتہ :- نیشنل اسٹورس ۔ آزاد روڈ ۔ برہانپور (ایم ۔ پی)

نام :- نیاز احمد میر ؛ عمر ۱۵ سال
مشغلے :- ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنا ، آٹو گراف جمع کرنا ، کرکٹ
اور فٹ بال کھیلنا ۔
پتہ :- نیاز احمد میر ۲۲۷ ۔ جواہر نگر ، سری نگر ۔
(کشمیر)

نام :- عبدالمتین عزیزی ۔ عمر ۱۴ سال
مشغلہ :- رسالے پڑھنا ، خاص طور پر پیام تعلیم ،
ٹکٹ جمع کرنا ، باغبانی وغیرہ ۔
پتہ :- عبدالمتین عزیزی معرفت نور عبدالعزیز فروٹ کمیشن
ایجینٹ باڑہ ہندو راؤ ۔ دہلی ۶

نام :- عبدالمجید ۔ عمر بارہ سال
مشغلہ :- مذہبی اور علمی ، ادبی کتابیں پڑھنا ، پیام تعلیم
پڑھنا ۔ قلمی دوستی کرنا
پتہ :- عبدالمجید معرفت کرالا اسٹورس بن چندہ کالی کٹ ۳

نام :- فراست اللہ خاں (متعلم درجہ پنجم) عمر ۱۲ سال
مشغلہ :- رسائل کا مطالعہ کرنا ، قلمی دوستی کرنا ، نقلیں کرنا
پتہ :- فراست اللہ خاں معرفت خالد حسین خاں شگفتہ
محلہ مہند جلال نگر ، ضلع شاہجہانپور ۔ یو ۔ پی ۔

نام :- محمد بن سعید عرف افسر عمر ۱۶ سال
مشغلہ :- اچھی کتابیں پڑھنا ، نماز پڑھنا ، دوستوں اور
رسالوں کے ایڈیٹروں سے خط و کتابت کرنا
پتہ :- محمد بن سعید عرف افسر ۔ محلہ مسافر شاہ
تعلقہ بسمت نگر (پربھنی)

نام :- مشتاق احمد مشتاق
مشغلہ :- پیام تعلیم پڑھنا ، قلمی دوستی کرنا ، اچھے اور
پر خلوص دوستوں کی تلاش ، نماز پڑھنا ، تفسیر
قرآن اور تلاوت قرآن کرنا ۔
پتہ :- مشتاق احمد مشتاق ولد محمد شریف
محلہ وانہ پورہ ۔ کامٹی ضلع ناگپور (مہاراشٹر)

آدھی ملاقات

محترم حسین حسان صاحب!

تسلیم و نیاز!!

عرصے کے بعد یہ خط آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ذاکر صاحب کی غیر متوقع موت سے ہندوستانی زندگی اور معاشرت میں ایک خلا آگیا ہے اور سیاسی حالات میں انتشار پیدا ہوگیا ہے مگر بھائی موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ موت کے آگے ہم سبھی بے بس اور مجبور نظر آتے ہیں۔ خیال تھا کہ صدر کا ٹرم پورا کرلنے کے بعد وہ پھر جامعہ کی خدمت میں لگ جائیں گے۔ مگر آہ ایسا نہیں ہوسکا۔ میری جانب سے (بیگم صاحبہ ذاکر حسین) ان کی بچیوں اور دامادوں کو یاد کریں گے۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں بھی دلی آکر خراج عقیدت پیش کرتا۔ مگر مالی دشواریوں کے پیش نظر مجبوری ہے۔

جواب کا منتظر آپ کا اپنا

انوار انصاری

کسے خبر تھی کہ ذاکر صاحب ایک دم چلے جائیں گے۔

اب پرانی یادیں ابھر رہی ہیں جی چاہتا ہے کہ کچھ لکھوں یہاں دنیا میں فرشتے نہیں انسان ہی بستے ہیں۔ آج کل خود بھی بیمار ہوں" فقط مخلص ——— سید محمد ٹونکی۔

برس کر ہمارے آنسو نکل پڑے کہ ہمارے محبوب رہنما اور ایک شفیق استاد ہمیں تنہا چھوڑ کر رخصت ہوگئے۔

ذاکر صاحب صرف جامعہ یا جامعہ ملیہ کے ہی سرپرست نہیں تھے بلکہ وہ پورے ہندوستان کے سرپرست تھے انھیں ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگوں سے یکساں محبت تھی۔

افسوس ہمارے آنسو اور اشکبار آنکھیں انھیں واپس نہیں بلا سکتیں۔ ہماری نیک دعا ہے کہ ذاکر صاحب کو خدا جنت میں جگہ دے آمین!!

بدر وفا۔ سہسرام

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل ہی میں نے صدر جمہوریہ کو ان کے انتخاب پر مبارکباد کا پوسٹ کارڈ بھیجا تھا جس کا جواب ایک قیمتی جنس کی طرح میرے پاس محفوظ ہے اور آج ہی ان کی جدائی کا رونا رو رہے ہیں۔ خدا ہم سب کی مدد کرے۔

آپ لوگوں سے صرف ایک التماس ہے کہ جس طرح صدر جمہوریہ کے انتخاب کے بعد ایک خاص نمبر پیام تعلیم کا نکالا تھا اس سے زیادہ آب و تاب کے ساتھ ایک یادگار نمبر نکالیں جو واقعی یادگار ہو اور محفوظ رکھا جاسکے۔

محمد شمس الدین

محترمی!

سلام علیکم! ورحمت اللہ وبرکات!

پانچ مختلف خریداروں سے (جن کے نام ویتے ذیل میں مندرج ہیں) مبلغ تیس۳۰ روپے وصول کرکے آپ کو روانہ کردیئے گئے ہیں۔ یہ رقم بذریعہ منی آرڈر ۸۰۹۴ بتاریخ ۱۲ اپریل ڈاکخانہ گارڈن ریچ کلکتہ ۲۴ سے بھیجی گئی ہے۔ براہِ کرم ان پانچ افراد کے نام رسالہ "پیام تعلیم" کے سالانہ خریداروں میں شامل کرلیں اور ماہ مئی کے شمارہ سے رسالہ مذکورہ ان کے نام جاری کردیں۔

سلیمان اختر

جی ۲۷۶/۳ الف نگر۔ مٹیا برج کلکتہ ۲۴

بہت بہت شکریہ۔ خدا اور بزرگوں اور ساتھیوں کو بھی آپ کی تقلید کی توفیق ارزانی فرمائے آمین

ایڈیٹر

مئی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ٹائیٹل بڑا دلکش تھا۔ محمد امین ایم اے کا "بوم بوی اور سما" سیف سہسرامی کا گیت "سنا دو" غالب کی کہانی خود ان کی زبانی "سلام بن رزاق کا "جگنو" "سفر نامہ ابن بطوطہ" اور "یادداشت کا امتحان" بے حد پسند آئے۔

یہ آپ کی دن رات محنت کا نتیجہ ہے جو کہ ہر ماہ ہر شمارہ انوکھے انداز میں پیش ہوتا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب یہ کامیابی کی منزل پر نظر آئے گا۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اسد اللہ خان عطاء اللہ خان جلگاؤں

محترمی

سلام مسنون

ماہ مئی کا پیام تعلیم موصول ہوا۔

میٹرک کا امتحان ختم کرکے میرے پاس صرف ایک ہی کام "رسالوں کا مطالعہ" کرنا ہے۔ ویسے تو میں کئی رسالوں کا مطالعہ کرتا ہوں لیکن پیام تعلیم جیسا کوئی رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کی شہرت کی وجہ صرف آپ کی دن رات کی محنت کا نتیجہ ہے۔

مئی کے شمارہ میں ویسے تو سب مضمون اور کہانیاں قابل تعریف ہیں لیکن خاص طور پر مجھے "بوم بوی اور سما" غالب کی کہانی "پیسہ" اور بچے کا گیت بے حد پسند آئیں میری طرف سے سب لکھنے والوں کو مبارک باد۔ خدا آپ کو پیام تعلیم کو اور خوب صورت بنانے کی ہمت دے۔

سید منور باسط

کاشانہ مستحسن

شرمندہ ہوں جواب جلد نہ دے سکا جشن غالب صدی کے سلسلے میں گیا سے کئی بار باہر رہا۔ آپ کی عنایت ہے کہ آپ نے ۲۷-۳-۱۹۳۸ کے اس مضمون نگار کو یاد فرمایا جواب زندگی کے پچاسویں برس قدم رکھ رہا ہے مجھے فخر ہے، میری ادبی زندگی کی نشوونما میں پھول، پیام تعلیم اور غنچہ جیسے معروف ومقبول رسالوں کا تعاون رہا۔ آپ کے بھیجے ہوئے پیام تعلیم کے شمارے دیکھ کر وہ دن سامنے آگئے جب ہر نیا مہینہ نئے شمارے کی آمد کی خبر لاتا تھا۔

اردو زبان کی تاریخ خصوصاً ادب اطفال۔

CHILDREN LITERATURE میں پیام تعلیم جیسے علمی و اصلاحی رسالے کا نام ناقابل فراموش ہے۔ یہ مقام حسرت ہے کہ ادب کے اس اہم شعبہ پر ہمارے ارباب نظر و اقتدار کی ویسی نگاہ نہیں جس کی اسے حاجت ہے۔

آپ مطمئن رہیں پیام تعلیم کے لیے کچھ کروں گا اور انشاء اللہ جلد ہی۔

ناچیز (ڈاکٹر) سید حسین گیا

محترم جناب بھائی صاحب! السلام علیکم!

مئی کا پیام تعلیم پیش نظر ہے۔ پیسے کی کہانی کا آخری حصہ پڑھا۔ انھوں نے بہت ہی معلوماتی اور طویل مضمون لکھا میں بھی اپنی طرف سے جناب غلام حیدر صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یوں تو میں غالب پر بہت سے مضمون پڑھ چکا ہوں۔ لیکن جناب شعیب اعظمی صاحب کی مرتب کردہ "غالب کی کہانی" ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ چچا ابا نے روزہ رکھا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ جناب علیم الدین نے آسٹریلیا کے جانور لکھ کر ہم لوگوں کی معلومات میں اضافہ کیا ہے، "ایک خطرناک مہم" بھی بہت پسند آئی۔ گو پیام تعلیم میں ہر دو انداز ہمیں اچھے لگے جو کسی دوسرے جریدے میں نہیں ہوتے۔ میری ایک رائے ہے امید ہے کہ اس پر مزید دھیان دینے کی کوشش کریں گے: بچوں سے باتیں کے تحت جو آپ کا اداریہ ہے اس میں آپ پیام تعلیم سے ہٹ کر بھی بات کریں تو بہتر ہوگا۔ یعنی کارآمد اور مہذب باتیں

ایم اسلم ۔ گیا

غلام کی عبادت

کسی شخص نے ایک غلام خریدا۔ غلام نے اپنے آقا سے کہا: "میں تین باتوں کی درخواست کرتا ہوں۔" آقا نے پوچھا: "وہ کیا؟" غلام نے عرض کیا: "جب نماز پڑھنے کا وقت ہو جائے تو آپ مجھے نماز پڑھنے کے لیے مہلت دے دیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ مجھے صرف دن میں کام کاج میں مشغول رکھیں رات میں چھٹی دے دیں۔ تیسری بات یہ کہ آپ مجھے جو کمرہ رہنے کے لیے دیں اس میں میرے سوا کوئی دوسرا آدمی نہ جائے۔" مالک نے تینوں باتیں مان لیں اور غلام سے کہا: "گھر کے کمروں میں جو کمرہ تم کو پسند ہو لے لو۔" غلام نے گھوم پھر کر سب کمرے دیکھ لیے اور ایک ٹوٹا پھوٹا کمرہ پسند کیا۔ آقا نے اس سے پوچھا: "تم نے یہ ٹوٹا پھوٹا کمرہ کیوں پسند کیا؟" غلام نے جواب دیا: "میرے آقا شاید آپ نہیں جانتے کہ خدا کی یاد سے یہ کمرہ ایک خوب صورت چمن بن جائے گا۔" غلام اس میں رہنے لگا۔ مالک کے یہاں اکثر راتوں میں ناچ رنگ کی محفل جمتی۔ ایک رات جب اس کے دوست احباب چلے گئے تو وہ غلام کے کمرے کے پاس آیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ غلام کا کمرہ روشنی سے جگمگا رہا ہے اور غلام سجدے میں پڑا کہہ رہا ہے: "اے خدا تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ تو نے مجھے مالک کی خدمت میں صرف دن ہی میں رکھا اور رات کے وقت اپنی خدمت کا موقع دیا، اگر مجھ پر مالک کی خدمت فرض نہ ہوتی تو میں رات دن تیری ہی خدمت میں لگا رہتا۔"

آقا نے دوسرے دن غلام کو بلایا اور کہا: "تم آزاد ہو خدا کے واسطے اور اس کی عبادت کے لیے۔" اور آقا نے بھی اپنی ناچ رنگ کی محفل چھوڑ دی، خدا سے توبہ کی اور اپنی زندگی خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دی۔

صبیحہ ناز

ادھر اُدھر سے

انسان کو چاند پر اتارنے والا جہاز ۱۶ر جولائی کو روانہ ہوگا!

امریکہ کی خلائی ایجنسی نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ چاند پر انسان کو اتارنے والا جہاز کیپ کنیڈی سے سولہ۱۶ جولائی کو چھوڑا جائے گا۔ ہندوستانی وقت کے مطابق یہ سولہ۱۶ جولائی کی شام کو چھ بج کر کچھ منٹ پر روانہ ہوگا اور ۲۰ جولائی کو خلا باز آرمسٹرانگ اور الڈرن چاند کی زمین پر کائنات کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قدم رکھیں گے۔ اور پھر ۲۱ جولائی کو ساڑھے نو بجے واپس زمین کی طرف رُخ کریں گے۔ اور ۲۴ جولائی کو نو بج کر ۴۲ منٹ پر (رات میں) بحر الکاہل میں اتریں گے۔ (الجمعیۃ روزانہ)

۶ آدمیوں کی جان بچائی

ٹکنالوجی انسٹی ٹیوٹ جمشید پور کے ایک طالب علم نے حال ہی میں اپنی سوجھ بوجھ، ہوش مندی اور ہوشیاری سے سات آدمیوں کی جان بچائی ہے۔ یہ طالب علم اور ڈرائیور سمیت سات دوسرے آدمی ۱۱ر فروری سنہ ۱۹۶۹ء کو ایک ٹیکسی میں جمشید پور سے رانچی پہاڑ پر جا رہے تھے راستے میں ٹیکسی کے بریک خراب ہوگئے، اور ٹیکسی پہاڑی سے نیچے کی طرف لڑھکنے لگی۔ ڈرائیور نے فوراً ٹیکسی سے چھلانگ لگا کر اپنی جان بچائی، باقی سواریوں کو خدا کے حوالے کر دیا۔ یہ طالب علم ڈرائیور کے پاس ہی بیٹھا تھا اس نے فوراً ڈرائیو[illegible] کی سیٹ سنبھال لی اور اسٹرنگ کو جیسے تیسے قابو میں کر لیا اور اپنی ہوشیاری اور ہوش مندی سے دو فرلانگ گہرائی تک لڑھکنے کے بعد ٹیکسی کو روک لینے میں کامیاب ہوگیا۔ اس طرح اپنی اور اپنے چھ ساتھیوں کی جان بچائی۔

انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل نے طالب علم کی سوجھ بوجھ اور ہمت و ہوشیاری کے لیے ہند سرکار سے اس کی حوصلہ افزائی کی سفارش کی اور ہند سرکار نے اُسے ایک ہزار روپے کا انعام دیا۔

ٹینس کے بین الاقوامی مقابلے اور ہندوستان

حال ہی میں ملک میں ٹینس کا شاندار مقابلہ ہوا۔

دنیا میں ہر سال ڈیوس کپ مقابلہ کے نام سے لان ٹینس کا بہت بڑا مقابلہ ہوتا ہے۔ اس مقابلے کے لیے دنیا کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مشرقی زون، مغربی زون اور جنوبی زون۔ پہلے ہر ایک زون کا الگ الگ مقابلہ ہوتا ہے۔ ایک زون میں اوّل آنے والی ٹیم کا مقابلہ دوسرے زون میں اوّل آنے والی ٹیم سے ہوتا ہے۔ ان دونوں میں اوّل آنے والی ٹیم کا مقابلہ [illegible]

ٹیم سے ہوتا ہے۔ اور اس آخری مقابلے میں جو ٹیم اول آتی ہے
وہ ڈیوس کپ جیتتی ہے۔ یوربی زون میں مسلسل نو سال سے
جاپان اور ہندوستان ہی فائنل میں آتے رہے ہیں اور ان نو سالوں
میں ہندوستان نے مشرقی زون میں مقابلے جیتے ہیں۔ مغربی زون
کے مقابلے میں ہندوستان صرف ایک بار جیت سکا۔ لیکن تیسرے
امریکی زون کے آخری فائنل میں آسٹریلیا سے ہار گیا۔

اس سال مشرقی زون کا فائنل مقابلہ یہاں پونہ میں
جاپان اور ہندوستان کی ٹیموں میں حال ہی میں ہوا ہے لان ٹینس
میں پانچ میچ ہوتے ہیں۔ پہلے دو سنگل جن میں ہر ٹیم کا صرف ایک
ایک کھلاڑی کھیلتا ہے۔ پھر ایک ڈبل جس میں ہر ٹیم کے ساتھ
دو دو کھلاڑی کھیلتے ہیں اور اس کے بعد پھر دو سنگل میچ
ہیں۔ جو ٹیم ان میں سے کوئی سے تین میچ جیت لے وہ میچ پاتی ہے
اب کے ہندوستان کی ٹیم نے یہ پانچوں میچ بہت شاندار طریقے
سے جیتے ہیں۔ کل ملا کر سترہ سیٹ کھیلے گئے جن میں ہندوستانی
کھلاڑیوں نے پندرہ جیتے۔ ہمارے کھلاڑی رام نمن کرشنن،
پریم جیت لال، جے دیپ مکرجی نے جاپانی کھلاڑیوں کو جمنے
ہی نہ دیا۔

چھپائی کے لیے پلاسٹک کے ٹائپ

اب پلاسٹک کا ٹائپ تیار ہو گیا ہے اور مقابلہ ابھی
تھوڑے ہی دن پہلے شروع ہوا ہے لیکن نتیجے کے بارے میں کسی
کو بھی کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہے۔ دھات کے پرانے ٹائپوں
کو اپنی جگہ سے ہٹنا پڑے گا۔ میدان پلاسٹک ٹائپ کے ہاتھ
رہے گا۔ اس لیے کہ یہ ٹائپ دھات کے مقابلے میں بہت
سکتے ہیں۔

لینن گراد ٹائپ فاؤنڈری میں تھرمو پلانٹ کی تین
بہت ہی زیادہ کارگر خودکار مشینیں چالو کر دی گئی ہیں۔ یہ مشینیں
دانے دار پلاسٹک سے، جس میں المونیم کا سفوف ملا دیا جاتا
ہے، ٹائپ اور ٹائپ بنانے کا سادہ مواد تیار کرتی ہیں۔

یہ فاؤنڈری اس سال پلاسٹک کے ۳۰ ٹن ٹائپ
تیار کرے گی۔ (سوویت خبرنامہ)

آریہ ۳ ہزار ۴ سو برس پہلے ہندوستان آئے تھے

ایک مشہور روسی عالم کا کہنا ہے کہ سوویت یونین کے
بعض کھنڈروں سے پتہ چلتا ہے کہ آریہ لوگ حضرت مسیح سے لگ
بھگ تیرہ چودہ سو برس پہلے سوویت یونین کے وسط ایشیائی
خطّے سے ہندوستان آئے ہیں۔

کچھ دنوں پہلے یونسکو کی طرف سے ایشیا کے مسئلہ پر دہلی
میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے مشہور
روسی عالم بی جی غفوروف بھی تشریف لائے تھے انھوں نے
اخباری نمائندوں کو بتایا کہ وسط ایشیائی جمہوریتوں اور ہندوستان
کی پرانی تہذیب کے بارے میں روسی ماہرین نے جو تحقیق
یا ریسرچ کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں گہرا
تعلق تھا۔ اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح سے
کوئی ۱۳ - ۱۴ سو برس پہلے خانہ بدوش آریہ قبیلے
ان علاقوں میں گھوم رہے تھے۔

(الجمعیۃ ہفت وار)

لینن — ۱۹۲۳ء میں

پیامِ تعلیم

چاند پر پہلا قدم (بہ شکریہ محکمہ اطلاعات امریکہ)

تینوں خلاباز: آرم اسٹرانگ۔ مائیکل کولنس۔ ایڈون ایلڈرین
(بہ تشکر یہ محکمہ اطلاعات امریکہ)

ریاستہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں وکشمیر اور ہریانہ کے
تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ پیامِ تعلیم نئی دہلی

جلد ۶ ستمبر ۱۹۶۹ء شمارہ ۹

ایڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے سالانہ چندہ ۶ روپے

فہرست

پچھلی جولائی کو انسان کے قدم آخر چندا ماموں پر پہنچ ہی گئے۔ لوگوں کو حیرت بھی تھی، خوشی بھی تھی۔ تنگ نظر اور کٹر قسم کے مذہبی لوگوں کو غم و غصہ بھی تھا "بھلا یہ گستاخ انسان چاند تک کیسے پہنچ گیا!"

جہالت کا یہ انداز کوئی نیا نہیں ہے گلیلیو وغیرہ جیسے بہت سے سائنس دانوں اور عالموں کو اس مذہبی تعصب کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان بے چارے لکیر کے فقیر لوگوں کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ کسی مذہب میں علمی اور سائنسی ترقی پر کوئی روک ٹوک نہیں خصوصاً مسلمانوں کے ہاں ـــــ تو پوری آزادی ہے۔ خود قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے آسمان و زمین دونوں کو تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس ایک خط آیا ہے۔ اسے ہم اسی پرچے میں شائع کر رہے ہیں۔

پچھلے پرچے میں چاند پر پہنچنے کی خوش خبری ہم نے بہت مختصر لفظوں میں سنائی تھی۔ اصل میں یہ پرچہ پریس جا چکا تھا۔ مگر اس خبر کی خاطر ہم نے چھپائی رکوا دی کی نظم نکلوا کر اس کی جگہ خلائی جہاز کی کامیاب واپسی کی مختصر رپورٹ شائع کر دی۔

اس پرچے میں آپ اس سلسلے کی کئی چیزیں پڑھیے۔ ہمیں اس وقت محمد امین صاحب رہ رہ کے یاد آ رہے ہیں۔ انھیں اس موضوع سے خاص دلچسپی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا چاند پر پہنچنے کی کوششوں کے بارے میں انھوں نے مضمونوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ آٹھ قسطوں میں چھپا تھا۔ اتنے میں وہ اتھوپیا چلے گئے اور یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

اس وقت امین صاحب یہاں موجود ہوتے تو کتنا اچھا مضمون لکھتے۔ اب مجبوراً مجھے لکھنا پڑا ہے۔ میں نے سادہ سی عبارت میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی کوشش کی ہے کہ ضروری ضروری باتیں آپ کو معلوم ہو جائیں۔ نہ جانے یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی ہے بتائیے گا۔

اس سلسلے کا سب سے اچھا مضمون تو آپ کے تایا جان یوسف ناظم صاحب کا ہے۔ یہ مزاحیہ بھی ہے۔ معلوماتی بھی ہے نکھری ستھری زبان ہے دلچسپ اندازِ بیان ہے۔ یوں سمجھیے کہ پورے رسالے کی جان ہے۔ اس مضمون کے حاصل کرنے میں میری درخواست کے علاوہ احمد ولی صاحب کی سفارش اور شاہد علی خاں صاحب کی کوششوں کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔

ایک تیسرا مضمون "چاند کی سیر چند جھلکیاں" جناب دینا ناتھ گردھر کی نوازش کا نتیجہ ہے۔

پچھلے دنوں ہمارے بہت پرانے مضمون نگار جناب اظہر افسر صاحب آل انڈیا ریڈیو کے ایک سمنار کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے تھے۔ ہمیں بھی ملاقات کی عزت بخشی۔ خود مکتبے میں آنے کی زحمت فرمائی۔ بات چیت زیادہ تر پیام تعلیم کے بارے میں رہی۔ ہماری درخواست پر آپ نے چاند پر ایک فیچر لکھنے کا وعدہ فرمایا۔ افسوس ہے کہ یہ وقت پر ہمیں نہ مل سکا۔ ورنہ اس پرچے کی زینت ہوتا۔ انشاءاللہ اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

پیام تعلیم میں بہت دنوں سے غلام حیدر صاحب مضمون اور کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ یہ کہانیاں بہت معیاری ہوتی ہیں۔ آپ کو بھی بہت اچھی لگتی ہیں اگست والی کہانی کھلونوں کی جنگ بچوں نے بہت پسند کی۔

اس مرتبہ وہ آپ کے لیے ایک خاص تحفہ لائے ہیں۔ ایک تصویری کہانی۔ اس کی تصویریں بھی انھوں نے ایک خاص آرٹسٹ سے بنوائی ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں بڑی زحمت اٹھانا پڑی ہے۔ یہ کہانی مسلسل چھپے گی۔ بڑے مزے کی ہے۔ آپ کو یقیناً پسند آئے گی۔

"چاند والے مضمونوں کی وجہ سے بعض اچھے اچھے مضمون ڈرامے اور کہانیاں اس پرچے میں شایع نہ ہو سکیں انھیں اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

اس مہینے شاہد علی خاں (انچارج شاخ مکتبہ بمبئی) نے چار خریدار مرحمت فرمائے ہیں۔ دس خریداروں کی بھیمڑی میونسپلٹی کی طرف سے فرمایش آئی ہے۔ دو خریدار جناب بدرالدین صاحب اور ایک خریدار پرانے ساتھی جناب ابراہیم عمادی ندوی جامعی صاحب نے مرحمت فرمایا ہے۔ وحیدالحسن صاحب (اوجین) نے پیام تعلیم اور کتاب نما کے تین خریدار مرحمت فرمائے ہیں۔ ہم ان سب کے شکرگزار ہیں۔

مدولی اور کئی دوسری جگہوں کے حضرات سے معلوم ہوا کہ پیام تعلیم کو اب بہت سے جان گئے ہیں۔ یہ بھی جان گئے ہیں کہ یہ بچوں کے لیے بہت مفید پرچہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان لوگوں کو خریداری پر آمادہ کیا جائے۔ کچھ حضرات نے تو ہمیں اس کام کے لیے اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دی ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ میں ہر جگہ پہنچ سکتا ہوں نہ محترم منیجر صاحب۔ پیام تعلیم کے کچھ سرپرست اور قدرداں قریب قریب ہر جگہ موجود ہیں وہ اگر توجہ فرمائیں تو یہ پیام تعلیم پر بہت بڑا احسان ہوگا۔

جناب علقمہ شبلی

چندا بھی آج اپنا ہے

ٹوٹا برسوں کا جادو
چاند نے مانی ہار اپنی
قبضے میں ہے آج اپنے
چاند نگر کی وادی بھی

کل بس دھرتی اپنی تھی
چندا بھی آج اپنا ہے
آج اک روشن سا منظر
کل کا سندر سپنا ہے

آنگن میں اب چندا کے
ہم سب بچے کھیلیں گے
نیلے پیلے پتھر سے
شام سویرے کھیلیں گے

پھول زمیں کے ہیں ہم سب
دھرتی جنت ہے ہم سے
چاند پہ بھی اب پہنچے ہیں
اس کا روپ بڑھائیں گے

جناب یوسف ناظم

کیومیں ہم بھی ہیں

ہم نے طے کیا ہے کہ اب ۲۱ رجولائی کو ہم ہر سال اپنی سال گرہ منایا کریں گے۔ ۲۱ جولائی کو ہم پیدا تو نہیں ہوئے لیکن اس دن ہم نے چاند کی سطح پر قدم رکھ دیا۔ تم پوچھو گے کہ مولانا آپ کب تشریف لے گئے تھے چاند پر تو بھئی سیدھا سیدھا جواب یہ ہے کہ وہ آرم اسٹرانگ ہوا تو کیا ہوا۔ ہے تو وہ بھی ہماری طرح کا آدمی۔ ہم تو سمجھتے ہیں، ہم ہی گئے تھے۔ اس چاند پر۔ تین سنگھ نے جب ہمالہ کی چوٹی سر کی تھی تو ہنگامہ مچ گیا تھا۔ لوگ حیرت کرتے تھے کہ یہ شخص ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر چڑھ کیسے گیا۔ یہ ۲۹ ہزار فٹ کا مطلب ہوا تقریباً پانچ میل —— لیکن اب کہو۔ کہاں پانچ میل اور کہاں دو لاکھ پچاس ہزار میل۔ ایورسٹ سے بھی چاند اتنا ہی دور ہے جتنا چوپائی سے —— لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ چاند کی سطح پر آدمی کے پہنچنے میں کمال سائنس کا ہے۔ آرم اسٹرانگ شاید ہمالہ کی چوٹی پر اب بھی نہ جاسکے اور شاید تین سنگھ چاند کے سفر کے لیے ناقابل قرار دیا جائے۔ یہ الگ الگ میدان ہیں۔ محمد علی کلے بہترین باکسنگ کر سکتا ہے لیکن سوبرس کی طرح بیٹنگ تو نہیں کر سکتا۔ اور نہ سوبرس (سوبرس ۱۰۰ برس نہ پڑھنا) راڈ لیور کی طرح ٹینس کھیل سکتا ہے۔ اور نہ یہ تینوں عمدہ سرجن بن سکتے ہیں۔

اب رہی چاند پر جانے کی بات تو اتنی بڑی تنخواہ ہمیں دی جاتی بلکہ اس کی ایک چوتھائی بھی پیشگی دے دی جاتی تو ہم چاند کیا سورج پر بھی جانے کو تیار ہو جاتے۔ آرم اسٹرانگ کو ۳۳ ہزار ڈالر دیے گئے ہیں اس چھوٹے سے سفر کے لیے —— ۹ دن کا سفر چھوٹا نہیں تو کیا بڑا ہوا۔ اور ایک ڈالر ہمارے ساڑھے سات روپے کے برابر ہوتا ہے۔ نکسن صاحب پیسے بچانا چاہتے تو ہم لوگ انھیں سستے میں مل جاتے۔ ہاں ہماری نبض کی رفتار شاید راکٹ کی رفتار کے برابر تیز ہو جاتی اور ہم چاند پر یادگار بن کر رہ جاتے —— یہ تو آرم اسٹرانگ کی نبض تھی جو راشن کی طرح کنٹرول میں رہی۔ ہم نہیں سمجھے تھے کہ چاند زمین سے اتنی دور ہوگا۔ اب ہمیں اندازہ ہوا کہ ہماری بینائی کتنی تیز ہے ہم دو لاکھ پچاس ہزار میل حکِور تک اتنی آسانی سے دیکھ لیتے ہیں کہ چاند میں بڑھیا چرخہ کاتتی دکھائی دیتی ہے رچاند میں ہم رحرخہ کاتتہ ہم [illegible]

آجاتی ہے ۔ اور یہ ڈھائی لاکھ میل کا سفر ۱٦ جولائی کو شروع ہوتا ہے اور ۲۱ جولائی کو آدمی وہاں پہنچ بھی جاتا ہے یعنی صرف ۱۱۲ گھنٹے ۴۴ منٹ میں ۔ یہ آدمی ہے یا چھلاوہ ۔ جس راکٹ میں ہمارے ان تین دوستوں نے سفر کیا وہ کوئی ۲۴ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہا تھا ۔ مذاق کی بھی حد ہوتی ہے ۔ ایسا راکٹ ہمیں مل جائے تو ہم بمبئی سے دلّی یوں آیا جایا کریں جیسے اپنے گھر میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہیں ۔ ہم جیسے کاہل آدمیوں کو ایسے ہی تیز رفتار راکٹ درکار ہیں ۔

سنا ہے ان تینوں کو جب اس مختصر سے سفر پر روانہ کیا گیا تو ان کے ہاتھ میں ایک ہدایت نامہ بھی دیا گیا ۔ یہ ساری ہدایتیں ۱۸۰ صفحوں پر پھیلی ہوئی تھیں ۔ ۱۸۰ صفحے کی کتاب تو سال بھر کے کورس کی کتاب کے برابر ہو گئی — آرم اسٹرانگ نے اپنی ذاتی عقل صرف اس وقت استعمال کی جب چاند پر اترتے وقت اس کا پاؤں کسی تار پر پڑ گیا تھا ورنہ اس کے سارے کام ہدایت نامے کے مطابق تھے ۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ تینوں آدمی وقت پر سوئے اور وقت پر جاگے ۔ ہم پوچھتے ہیں انھیں نیند کیسے آئی — جب آدمی پہلے وقت کسی نئی جگہ جاتا ہے تو راستے بھر جاگتا ہی رہتا ہے ۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ راستے میں کیا کیا چیزیں ہیں ۔ اگر تمھیں پہلے وقت دلّی سے آگرہ بھیجا جائے تو کیا تم سو جاؤ گے ؟ ناممکن ہے ۔ راستے بھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہو گے کہ سڑک کیسے پیچھے بھاگتی ہے اور ٹرین کے پل پر سے گزرتے وقت کیسی دھن دھن کی آواز

تشریف لے گئے ۔ ٹھیک بھی ہے ۔ راستے میں انھیں ملا بھی کیا ہوگا ۔ دو چار ستارے اِدھر اُدھر ملے ہوں گے تو چاند پر جانے والے ان میں کیا دل چسپی لیں گے ۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ راستے میں شاید انھوں نے خواب بھی دیکھے ہوں گے ۔ آرم اسٹرانگ سے بیرنگ خط لکھ کر پوچھا جائے کہ مسٹر نے کس قسم کے خواب ملاحظہ فرمائے تھے ۔

چند دن پہلے ہم نے کہیں ایک نظم پڑھی تھی ۔ جس میں شاعر کہتا ہے کہ جب میں بچہ تھا تو اپنے ابا کی گود میں چڑھ کر ضد کیا کرتا تھا کہ ابا جی ہمیں چاند لا دو ۔ اور ابا جی ہنس کر ٹال دیتے تھے ۔ آگے چل کر شاعر کہتا ہے کہ آج میرا بچہ مجھ سے چاند کی فرمائش کرے تو میں کیسے ٹال سکوں گا — ہے نا دل چسپ بات ۔ لیکن شاعر یہ کہنا بھول گیا کہ اگر آدمی خود چاند پر رہنے لگا تو بچے کس چیز کی فرمائش کریں گے — معلوم نہیں بچوں کے لیے وہاں اِملی کے پیڑ ہیں بھی یا نہیں ۔

ہماری رائے ہے کہ اب اگر تمھارے اسکول سے باہر جانے کا پروگرام بنے تو تم چاند کا نام لکھوا دینا ۔ اور ٹیچر چاہیں کتنا ہی منع کریں ہرگز نہ ماننا — اتنا البتہ یاد رکھو کہ چاند پر جانے کے لیے امریکہ اب تک ۲۴ ہزار کروڑ ڈالر خرچ کر چکا ہے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمھارا خرچ بھی اتنا ہی آئے گا ۔ ہمارا خیال ہے ایک آدمی کا ٹکٹ دس بیس کروڑ روپے میں تو آ ہی جائے گا ۔ اس کے علاوہ تمھیں اسکول کی طرف سے کنسیشن بھی ملے گا ۔ پھر کیا رہا ۔ اتنی رقم کا بندوبست تو تم کر ہی لوگے ۔

... ہے ... آئی کہ راکٹ نے بالکل

ٹائم ٹیبل کے مطابق کام کیا ورنہ تم جانتے ہو آج کل دنیا میں کون وقت کی پابندی کرتا ہے۔ جلسہ اور مشاعرہ تو چھوڑو کھانے کی دعوت بھی دو تو لوگ وقت پر نہیں آتے۔ تین تین وقت تو ان کے لیے کھانا گرم کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے کام بھی بس یونہی اللہ کے بھروسے پر ہو جاتے ہیں۔ لائٹ کا ایک آدھ گھنٹے کے لیے فیل ہو جانا ٹرین کا ایک دو گھنٹے لیٹ ہو جانا۔ بس کا سرے سے غائب ہو جانا۔ الارم گھڑی کا وقت پر نہ بجنا۔ اچھے اچھے رسالوں کا وقت پر نہ چھپنا، یہ ساری باتیں کتنی عام ہیں لیکن یہ راکٹ تو غضب کا نکلا۔ منٹ منٹ کی پابندی! پروگرام ہو تو ایسا پکا۔ یہ نہیں کہ بتایا ایک اور کیا ایک۔ بعض لوگ تو صرف ٹیبل رکھتے ہیں ٹائم رکھتے ہی نہیں۔ ہاں کھانے کے ٹیبل پر البتہ ٹائم کی پابندی ضروری ہے۔

یہ راکٹ جب زمین سے اڑا تو دس سکنڈ تو سمجھو یوں ہی گذر گئے لیکن ۱۵۰ سکنڈ میں یہ زمین سے ۳۸ میل اونچا چلا گیا اور فوراً ۶ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے لگا۔ اور دو گھنٹے ۴۴ منٹ ۱۰ سکنڈ گذرے تھے کہ اس کی رفتار ۲۴ ہزار میل فی گھنٹہ ہو گئی۔ ان لوگوں کو آخر اتنی جلدی کیا تھی۔ چاند کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا تھا۔ کمال یہ ہے کہ جب یہ کشتی چاند پہ پہنچ گئی تو آرم اسٹرانگ دس گھنٹے تک اس میں بیٹھا رہا۔ چاند پر اترا نہیں ——

چاند پر یہ لوگ کوئی ۲۲ گھنٹے رہے۔ اور وہاں کی مٹی اپنے ساتھ لائے۔ اب اس مٹی کو پرکھا جا رہا ہے۔ زمین پر کتنے ہی مٹی کھاتے ہیں۔ کیا چاند کی مٹی بھی اتنی ہی سوندھی ہوگی۔ اور کیا اس کے بھی کھا سکیں گے

جب تک آرم اسٹرانگ اور آلڈرین چاند پر ٹہلتے رہے۔ بے چارہ کالنس تنہا اپنے راکٹ میں بیٹھا رہا۔ ہم تو اس کی ہمت کی داد دیتے ہیں۔ نکسن صاحب نے جب ٹیلیفون پر آرم اسٹرانگ اور آلڈرین سے بات کی تو اس بے چارے کو یوں بھول گئے جیسے وہ ان کا بھیجا ہوا آدمی ہی نہ تھا۔ حالاں کہ کالنس کا کارنامہ بھی کچھ کم بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ اتنی بلندی پر تنہا رہنا کیا معمولی بات ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اس کا دم نکل جاتا۔

جنگل میں مور ناچتا ہے تو کوئی دیکھ نہیں پاتا لیکن یہ تینوں چاند پر گئے تو سب کی نظروں کے سامنے آ گئے۔ وہ وہاں کیا کر رہے ہیں۔ زمین پر دیکھنے والوں کو سب کا سب دکھائی دیا۔ اُن کے دل کی حرکت نبض کی رفتار سبھی زمین پر لکھی گئی۔ اسے کہتے ہیں سائنس کا کمال۔ یہ بنگال کا کالا جادو ہے نہ آندھرا کا بھانمتی یہ سب کی سمجھ میں آنے والی سائنس ہے۔

کیا عجب جو چاند پر کوئی سینی ٹوریم بن جائے جہاں کسی لاعلاج مرض کا علاج ہو سکے۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ بس اڑان ہی اڑان ہے صرف ایک تجربہ —— دیکھیں اگلے نومبر میں کیا خبر آتی ہے۔ اگلے نومبر میں تو تین سے زیادہ آدمی بھیجے جانے والے ہیں —— ہمارا نمبر پتہ نہیں کب آئے گا۔

چاند پر جانے والوں کی کیو تو نیلٹک پہنچ کر بھی ختم نہ ہو گی۔

جناب غلام حیدر

نیلم اور فرخ

کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ کسی ملک میں ایک ملکہ راج کرتی تھی۔ وہ بڑی بے رحم اور سنگدل تھی لوگوں کو مصیبت اور پریشانی میں دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ اس کی ایک لڑکی تھی۔ یہ لڑکی بہت خوب صورت تھی اپنی خوب صورتی میں ساری دنیا میں مشہور تھی۔ لوگ تو کہتے تھے کہ اتنی خوب صورت کوئی اور لڑکی دنیا میں ہے ہی نہیں۔ اس لڑکی کا نام نیلم تھا۔

دور و نزدیک کے ملکوں کے شہزادے یا بادشاہ شہزادی نیلم کی خوب صورتی کا چرچا سنتے اور اس سے

شادی کا پیغام لے کر اس کے ملک میں آتے پر ملکہ ان کے سامنے بہت مشکل مشکل شرطیں رکھتی جو انھیں شادی سے پہلے پوری کرنی ہوتیں، اگر ملکہ کا بتایا ہوا کوئی کام شہزادے سے پورا نہ ہوتا تو اسے فوراً قتل کروا دیا جاتا۔

اس طرح نہ جانے کتنے بادشاہ اور شہزادے اس بے رحم ملکہ کے حکم سے قتل کروا دیے گئے۔ وہ انھیں کام ہی اتنے مشکل بتاتی اتنے مشکل کہ کوئی بھی ان کاموں کو پورا نہ کر سکتا۔ ایک شہزادے سے اس نے کہا کہ وہ ایک میل دوری پر ایک دریا سے شہزادی کے پینے کے لیے چھلنی میں ٹھنڈا پانی بھر کر لائے، شرط یہ ہے کہ پانی گرم بالکل نہ ہونے پائے۔ اب بتائیے کہ چھلنی میں پانی کون لا سکتا ہے۔ اور پھر۔ وہ غریب شہزادہ قتل کروا

ایک شہزادہ تھا یہ بڑا ضدی تھا۔ اس کا نام فرخ تھا اس کے ماں باپ اس سے پیار بھی بہت کرتے تھے اور وہ لاڈلا بھی بہت تھا۔ فرخ کا کام تھا دن بھر شکار کھیلنا اور گھوڑ دوڑوں میں حصہ لینا۔ بس یہی اس کا دن رات کا شغل تھا۔

پر شہزادہ فرخ بڑا بہادر بھی تھا۔ کتنی ہی بار شکار کھیلتے کھیلتے اسے جنگل میں رات ہو ہو گئی، وہ رات بھر جنگلی جانوروں سے اکیلا لڑتا بھڑتا صبح کو گھر لوٹتا۔ اُس کے ماں باپ اپنے لڑکے کی اِن بہادری کے کارناموں سے پریشان بھی رہتے تھے۔ مگر فرخ ضدی اتنا تھا کہ وہ کسی کی بات ہی نہ سنتا تھا۔ ایک بار ایسے ہی شکار پر وہ اکیلا ایک آدم خور شیر سے بھڑ گیا۔

ہوا یہ کہ وہ ہاتھی پر بیٹھا جنگل میں شیر کی

تلاش میں ... (illegible)
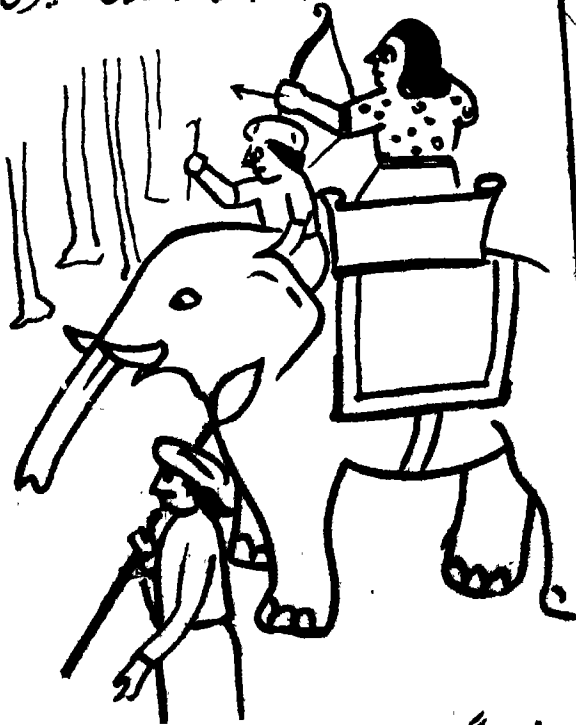
اسی طرح ایک بادشاہ کو حکم دیا گیا کہ وہ ایک رات میں شہر کے باہر ایک بڑا سا محل بنوا دے جس میں شہزادی کی شادی ہو سکے، اب وہ بے چارا اگر اپنے ملک میں ہوتا تو شاید وہاں کے سارے راج مزدوروں سے یہ کام ایک رات میں کروا بھی لیتا مگر اس وقت تو وہ دوسرے ملک میں تھا۔ یہاں اسے ایک بھی مزدور نہ مل سکا۔ ظاہر ہے محل نہ بن سکا اور وہ قتل کروا دیا گیا
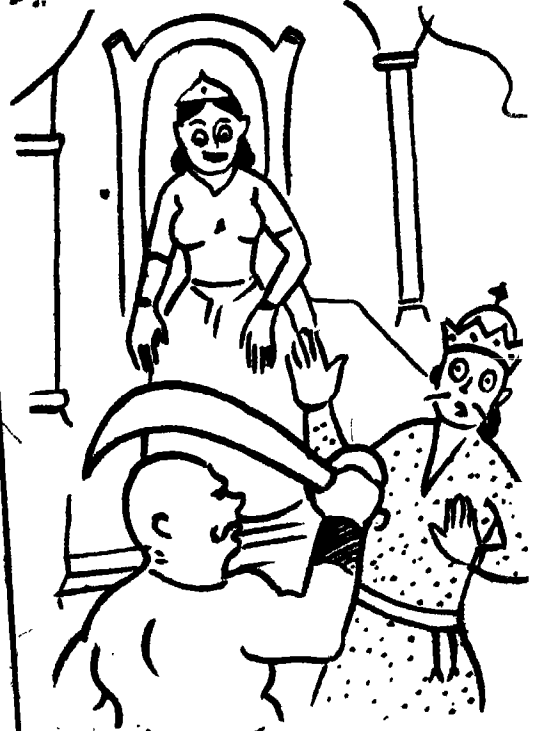
بس اسی طرح نہ جانے کتنے نوجوان شہزادوں شاہوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ملکہ کا دل اتنی کٹھور ہو گئی تھی کہ اسے کسی پر رحم نہ بس جو بھی اس کے ملک میں شہزادی سے شادی کے خیال سے آیا اور اُس نے اپنی جان سے ہاتھ دھوئے۔

اُسی زمانے میں کچھ بہت دور ...

فوج کے سپاہی بھی تھے ساتھ ساتھ چل رہے تھے،
مگر تھوڑی دیر میں، اسی شیر کی کھوج میں سب جنگل
میں اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ گھومتے گھومتے ایک دوسرے
سے بہت دور نکل گئے۔ بس ایک دم وہ شیر ایک
جھاڑی سے نکل کر شہزادے کے ہاتھی جھپٹ پڑا اور
آپ جانیے شہزادہ تو بڑا باہمت تھا۔ وہ بھاگا نہیں، فوراً اپنی
تلوار کھینچ کر ہاتھی پر سے کود پڑا، پھر کیا تھا دونوں
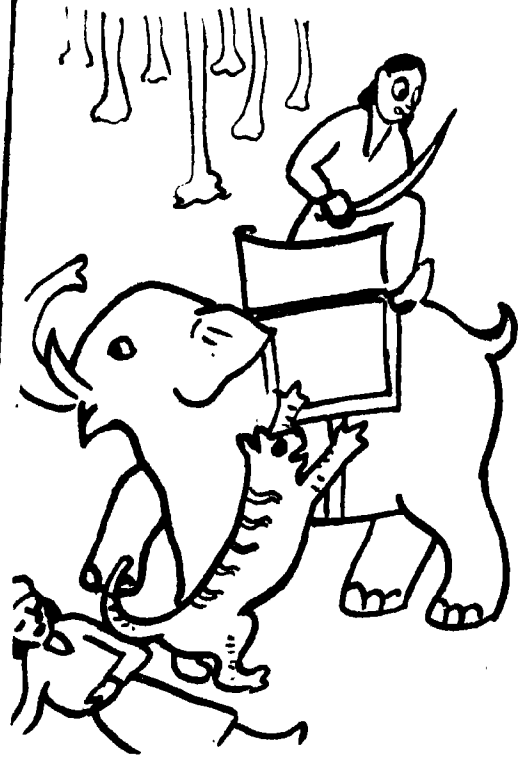
ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ دونوں بڑی دیر تک
لڑتے رہے۔ فرخ کی تلوار سے شیر کا اگلا پنجہ زخمی ہوگیا
بس اس سے شیر غصہ میں بالکل پاگل ہوگیا۔ اس نے
فرخ کو اپنی دونوں باہوں میں جکڑ کر کچل ڈالنے کی کوشش
کی، فرخ نے بڑی پھرتی سے اپنے بائیں ہاتھ میں اپنا
خنجر سنبھال لیا اور دایاں ہاتھ جس میں تلوار تھی بالکل
تیار رکھا۔ شیر جیسے ہی غصہ میں منھ پھاڑ کر دہاڑا فرخ
نے اپنا بایاں ہاتھ خنجر سمیت اُس کے منھ میں ٹھونس دیا،

شیر نے غصہ میں اس کے ہاتھ کو چبا ڈالنا چاہا، مگر جیسے
ہی اس نے اپنا جبڑا بند کیا خنجر اس کے منھ میں پھنس
گیا، اب وہ اپنے منھ کو نہ اور زیادہ کھول سکتا تھا نہ
بند کر سکتا تھا۔ اتنی دیر میں فرخ نے اپنی تلوار سے کئی
وار کر ڈالے اور شیر کی کمر اور پیٹ کو تلوار کے زخموں سے
چھلنی کر دیا۔ آخر شیر گر پڑا۔ شیر کی ہولناک آوازیں جنگل
میں گونج رہی تھیں اور پورے جنگل کے چوپائے اور پرندے
ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ بندر یہ آوازیں سن سن کر
درختوں پر سے بے ہوش ہو ہو کر ایسے گر رہے تھے جیسے
پکے آم ٹپکتے ہیں۔ ان آوازوں کو شہزادے کے ساتھیوں
نے بھی سنا اور وہ سب کے سب اس کی طرف دوڑ پڑے

جب انھوں نے آکر دیکھا ہے تو شیر زمین پر پڑا ہوا تڑپ رہا تھا، شہزادہ زخمی ضرور ہو گیا تھا مگر ہوش میں تھا، ایک طرف ہاتھی کا مہاوت بے ہوش پڑا تھا اور ہاتھی بھاگ چکا تھا۔

شہزادہ فرخ کے باپ کو شہزادے کی طرف سے بڑی فکر تھی، شہزادہ اپنی جوانی کے جوش میں ہر خطرہ میں بے دھڑک کود پڑتا تھا شہزادی نیلم کی خوب صورتی کی بات شہزادے فرخ کے کانوں میں بھی پڑی۔ اس کے دوستوں نے شہزادی کی خوب صورتی کی کچھ اس طرح تعریف کی کہ اس نے طے کر لیا کہ وہ ضرور اس سے شادی کرے گا۔ آخر ایک دن فرخ کی ماں اور باپ بیٹھے خود فرخ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اتنے میں فرخ

ان کے پاس آیا۔

بادشاہ:۔ میں کہتا ہوں یہ لڑکا اتنا نڈر ہے کہ یہ کسی نہ کسی دن ضرور اپنے آپ کو کسی بہت سخت مصیبت میں پھنسائے گا۔

ماں:۔ میں تو تم سے پہلے ہی کہتی تھی کہ تم اس کو اتنا آزاد مت چھوڑو۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شہزادہ بھی کمرے میں داخل ہو گیا

فرخ:۔ ابّا! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

بادشاہ:۔ ہوں! کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔

فرخ:۔ ابّا، میں نے طے کر لیا ہے کہ میں شہزادی نیلم سے شادی کروں گا، چاہے کچھ ہو جائے۔ میں اس کے ملک جانا چاہتا ہوں۔

یہ کہہ کر فرخ کمرے سے چلا گیا۔ فرخ کی ماں اس خیال سے ہی پریشان ہو گئی کہ اس کا لڑکا اتنے خطرناک کام کا ارادہ کر رہا ہے خود بادشاہ یہ بات سن کر بہت پریشان ہوا۔ شروع میں اس نے سمجھانے کی کوشش کی، مگر جب شہزادہ فرخ نہ مانا تو وہ ناراض ہو گیا۔

بادشاہ:۔ تم نہیں جانتے کہ آج تک وہاں سے کوئی شہزادہ زندہ نہیں لوٹا۔

فرخ:۔ جی، میں خوب جانتا ہوں۔

بادشاہ:۔ تم بچے ہو، وہ ملکہ بہت بے رحم ہے، تمھیں ضرور قتل کروا دے گی۔

فرخ:۔ مگر میں شادی کروں گا تو نیلم ہی سے کروں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو۔

بادشاہ:۔ تو میں تمھیں اجازت نہیں دیتا تم کہیں نہیں جا سکتے

اور بادشاہ غصہ میں وہاں سے چلا گیا۔ (باقی آئندہ)

جناب حافظ باقوی

چندا ماموں
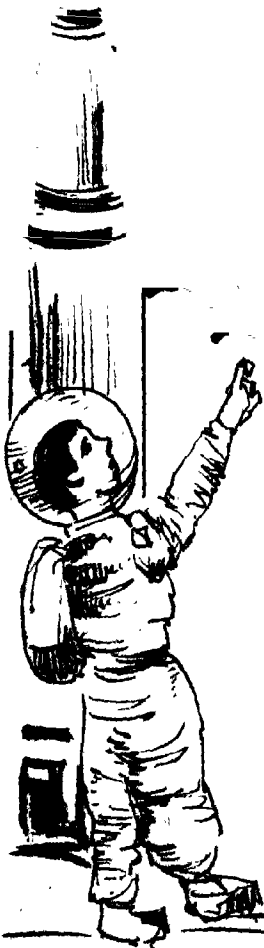
چندا ماموں، چندا ماموں! — آخر کب تک گھوروگے یوں
بات کرو تم مجھ سے ورنہ — پھر نہ منوں گا میں جو روٹھوں
ہنس کر بات کو ٹال رہے ہو — جاؤ میں نہیں سنتا "اوں ہوں"
کوئی گیت ہی آج سناؤ — جس کو سن کر میں جھوم اٹھوں
کل رات ایک سنا ہے قصّہ — دادی اماں کہتی تھیں یوں
وہ جو نظر آتی ہے تم پر — پرچھائیں سی چندا ماموں
ہیں وہ تمھاری دادی اماں — چرخہ چلاتی گاتی ہیں یوں
چندا میرا پیارا پوتا — اس کی دادی اماں میں ہوں
میری خدمت یہ کرتا ہے — اپنی جان میں اس پر واروں
رہتی دنیا تک یہ چمکے — چمکے زمانہ گزرے جوں جوں
آہا! کتنی پیاری دعا ہے — خوش قسمت ہو چندا ماموں
انساں ڈال رہا ہے ڈورے — پہنچے گا تم پر اک دن جوں توں
جی میں ہے اک راکٹ پر میں بھی — اُڑ کے تمھارے دیس میں پہنچوں
پہلے تو دادی سے ملوں گا — تاکہ انھیں میں دیکھوں بھالوں
اپنی دادی اماں کی بھی — خدمت کر کے دل کی دعا لوں
پھر دنیا والوں کے دلوں میں — چندا بن کر میں بھی چمکوں

جناب دینا ناتھ گردھر

چند دلچسپ جھلکیاں

چاند کی سیر

جب ۱۹۵۹ء میں پہلی بار خلاباز خلا میں بھیجے گئے تھے تو امریکہ کے اس وقت کے صدر کینیڈی نے کہا تھا کہ امریکہ کو دس سال کے اندر اندر انسان کو چاند پر اتارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں اس وقت زندہ نہ رہا تو بہشت ہی سے انسان کو چاند پر اترتے دیکھ سکوں گا۔ اور یعنی امریکہ کے سائنس دانوں نے دس سال کے اندر ہی انسان کو چاند پر اتار دیا۔ کینیڈی کی بات سچی کر دی۔ غالباً آنجہانی صدر کینیڈی نے یہ منظر بہشت سے دیکھا ہوگا۔

وہ راکٹ جس میں تین خلا باز چاند کے سفر پر روانہ کیے گئے تھے۔ ۱۶ جولائی (ہندوستانی وقت کے مطابق) شام کو سات بج کر دو منٹ پر چھوڑا جانے والا تھا۔ لیکن اس میں کچھ دیر ہوگئی۔ آپ جانتے ہیں کتنی؟ صرف ۲۴ء سیکنڈ یعنی پون سیکنڈ سے بھی کچھ کم۔ جن ہزاروں لاکھوں لوگوں نے یہ راکٹ زمین سے اٹھتے دیکھا ان میں امریکہ کے سابق صدر لنڈن جانسن اور ہندوستان کے وزیر خارجہ شری دینیش سنگھ بھی تھے۔

خلا باز اپنے ساتھ دنیا کے ملکوں کے ایک سو چھتیس ملکوں کے قومی جھنڈے لے گئے تھے۔ ان میں ہمارے ملک کا ترنگا جھنڈا بھی تھا۔ وہ امریکہ کے تین جھنڈے لے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کو چاند پر گاڑ گیا۔ دو واپس لے آئے جو اب امریکہ کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں لہراتے رہیں گے۔

اٹلی کے ایک پینٹر نیلو گیلی نے اعلان کیا ہے کہ اپولو گیارہ (جس میں چاند پر جانے والے خلا بازوں نے اڑان کی تھی) کے ڈیزائن کی منظوری دینے کے لیے وہ صدر نکسن کے خلاف ساڑھے دس لاکھ ڈالر کا دعوےٰ دائر کریں گے۔ ان کا دعوےٰ ہے کہ اپولو گیارہ ان کی ایک پینٹنگ کی نقل کرکے بنایا گیا ہے۔

اٹلی کے ہی نوجوان مردوں اور عورتوں نے چاند پر انسان کے اترنے پر امریکہ سے زوردار احتجاج کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ چاند دراصل ایک حسین دوشیزہ ہے جس پر نوجوان مردوں کا حق ہے۔

خلا باز جو چیزیں نشانی کے طور پر اپنے ساتھ لے جانے والے تھے، ان میں انجمن اقوام متحدہ کا ایک پوسٹ کارڈ بھی تھا۔ مگر یہ کارڈ نہیں لے جایا جا سکا ایک تو اس لیے کہ یہ کارڈ ایسے وقت کیپ کینیڈی پہنچا جب اسے پوری طرح جراثیم سے پاک کرنا ممکن نہیں تھا۔ دوسرے اس وقت راکٹ کا وزن اس قدر صحیح طور پر پورا کیا جا چکا تھا کہ اب اس میں ایک گرام کے ہزارویں حصّے کی بھی مزید بوجھ کی گنجایش نہیں رہی تھی۔ کارڈ کا وزن تو کئی گرام ہوتا ہے۔

خلا باز آرمسٹرانگ اور ایلڈرین نے چاند پر اترنے سے پہلے انجیل میں سے ایک دعا پڑھی جو ایلڈرین کے باپ نے خاص طور پر منتخب کی تھی۔ یہی دعا دونوں نے چاند پر اتر کر چاند کی سطح پر لکھی بھی تھی۔ اتفاق کی بات کہ یہی دعا پوپ پال نے ایک کپڑے پر اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر امریکہ بھیجی جو ان دوسری چیزوں کے ساتھ محفوظ کی گئی ہے جو چاند کے سفر سے متعلق ہیں۔

ایک یونانی بیمہ کمپنی نے اپنی طرف سے اپولو گیارہ کے تینوں خلا بازوں کا دس دس ہزار ڈالر کا بیمہ کیا تھا۔

اپولو گیارہ کی اڑان سے پہلی رات کو صدر نکسن نے تینوں خلا بازوں کے ساتھ کھانے کا پروگرام بنایا تھا لیکن کیپ کینیڈی کے سائنس والوں نے اس پروگرام کی مخالفت کی اور کہا۔ ان خلا بازوں کو پوری طرح جراثیم سے پاک صاف کر دیا گیا ہے، اس دعوت کے بعد پھر جراثیم کے اثرات کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا اور صدر نکسن کو اپنا پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔

امریکہ کے صدر نکسن نے ہندوستان سمیت دنیا کے آٹھ دس ملکوں کا طوفانی دورہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ شرط یہ تھی کہ تینوں خلا باز خیریت سے واپس زمین پر اتر آئیں۔ چنانچہ خلا بازوں کا راکٹ جب بحر الکاہل میں اترا تو صدر نکسن خود ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ اور اس کے فوراً بعد ان کا لمبا دورہ شروع ہوا۔ اس دورے کے درمیان وہ نئی دہلی میں ۲۳ گھنٹے رہے۔

اپولو گیارہ کی اڑان کے ایک گھنٹہ بعد ۱۶ جولائی کی رات میں ڈھاکہ (پاکستان) کے ریڈ کراس زچہ ہسپتال میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا وزن ساڑھے نو پونڈ تھا۔ بچے کے والدین کی اجازت لے کر ہسپتال کے ڈاکٹروں اور نرسوں نے اس بچے کا نام اپولو رکھا۔ چاند کے اترنے کے تین گھنٹے کے اندر ناگالینڈ اسمبلی کے صدر کے گھر ایک لڑکی پیدا ہوئی تو اس لڑکی کا نام اپولی رکھا گیا۔ ناگالینڈ میں لڑکیوں کے نام کے آخر "لی" ہوتا ہے۔ اسی طرح بیروت کے ایک گاؤں میں ماں باپ نے بچے کا نام اپالو سلیم رکھا۔

اپولو گیارہ ہندوستانی ٹائم کے مطابق ۱۶ جولائی کو سات بج کر دو منٹ پر چھوڑا گیا اور اس کا وہ حصّہ جسے چاند پر اترنا تھا۔ ۲۱ جولائی کی رات کو ایک بج کر

۹ ۴ منٹ پر چاند کی سطح پر اترا۔ اس طرح اس سفر میں اُسے کل ایک سو تین گھنٹے سے کچھ کم وقت لگا۔ لگ بھگ بائیس گھنٹے کے بعد خلا باز چاند سے اپنے چھوٹے راکٹ میں واپس چلے اور ساڑھے تین گھنٹے کے بعد اپنے اصل اپولو گیارہ سے ان کا چھوٹا راکٹ جڑ گیا۔ ۲۴ جولائی کی رات کو دس بج کر بیس منٹ کے لگ بھگ یہ خلا باز بخیریت زمین پر واپس آ گئے۔

خلا بازوں کے چاند پر جانے کے سلسلے میں صدر نکسن ایک پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ چاند پر اترنے کے بعد صدر نکسن نے خلا بازوں کو وائٹ ہاؤس سے ٹیلی فون کیا۔ اس وقت خلا باز لگ بھگ چار لاکھ کلو میٹر دور تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس ٹیلی فون کا بل کہاں سے ادا ہوگا۔ امریکہ کے صدر کے سرکاری اخراجات میں کسی دوسرے سیارے کو فون کرنے کی اجازت شامل نہیں ہے۔

۱۹۶۱ء میں روس نے چاند پر انسان کو اتارنے کی کوشش کی تھی جو ناکام رہی تھی۔ اس وقت دہلی کے ایک نوجوان ستیہ درشن نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس وقت تک اپنے بال اور داڑھی نہیں کٹوائے گا جب تک انسان چاند پر قدم نہ رکھے گا۔ چنانچہ جیسے ہی اس نے یہ خبر سنی کہ دو امریکی چاند پر اُتر گئے ہیں۔ اس نے ۲۱ جولائی کی صبح کو داڑھی منڈوا دی۔ ۲۵ جولائی کی صبح کو ان کی بخیریت زمین پر واپسی پر اس نے سر کے بال بھی کٹوا دیے۔

شری ویشتر سنگھ بھی تھے۔

آج سے لگ بھگ ۴۹ سال پہلے (۱۹۲۰ء) اس وقت کے ایک مشہور سائنس داں پروفیسر رابرٹ ایچ گوڈرڈ نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ راکٹ خلا میں اڑ سکتا ہے۔ نیویارک کے مشہور اخبار نے (۱۳ جنوری ۱۹۲۰ء) کے اس سائنس داں کا خوب مذاق اڑایا تھا۔ اور کہا تھا کہ اس سائنس داں کو علم کی اتنی شد بد بھی نہیں ہے جتنی ہائی اسکول کے لڑکوں کو ہوتی ہے۔

پر اب نیویارک ٹائمس کو اپنی غلطی کا افسوس ہے اور کھلے دل سے اس اخبار نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے۔

لندن میں ایک مشہور جوہری ہیں مسٹر الوئس عثمان پرنس آف ویلز کا تاج انھی نے تیار کیا تھا مسٹر لوئس عثمان نے اعلان کیا ہے کہ وہ مسز کینیڈی (مرحوم کینیڈی صدر امریکہ کی والدہ) کی خدمت میں سونے کا گلوب تحفے کے طور پر پیش کریں گے۔ ان کے صاحبزادے صدر کینیڈی نے اعلان کیا تھا کہ ۱۹۷۰ء سے پہلے انسان چاند پر اتر جائے گا۔

چاند پر جس جگہ خلا بازوں نے قدم رکھا ہے وہاں گلوب میں ایک ہزار پونڈ کی قیمت کا ایک ہیرا جڑا ہوگا۔

چاند کی مہم کی اس شاندار کامیابی نے لوگوں میں بڑا جوش، شوق، امنگ اور ولولہ پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ چاند تک پہنچنے کی سوچ رہے ہیں۔ امریکہ کی

ہوائی جہازوں والی مشہور کمپنی پان امریکن کے دفتر میں ان لوگوں نے اتنی بھیڑ لگا دی کہ کمپنی کو ایک چاند بکنگ آفس کھولنا پڑا۔ا

اب تک ۱۰ ہزار آدمی چاند کے سفر کے لیے اپنی سیٹیں بک کرا چکے ہیں۔ کمپنی کے ڈائرکٹر کا خیال ہے کہ اس صدی کے آخر تک یہ بات ممکن ہو جائے گی کہ عام لوگوں کے لیے بھی اڑان کا انتظام کیا جا سکے۔

اور جب انسان چاند پر رہنے بسنے کا ارادہ کرے گا تو شروع میں بنے بنائے مکان زمین ہی سے لے جانا پڑیں گے۔ یہ ایک ڈھانچے جیسے ہوں گے۔ انھیں ہوا بھر کر پھیلایا جا سکے گا۔ آکسیجن بھی بھری جا سکے گی۔ ایسے مکان بنانے کی تیاری شروع ہو گئی ہے۔ جیسے ہوا نکال کر اور پیک کر کے خلائی جہاز کے ذریعے چاند تک پہنچا دیں گے۔ وہاں آکسیجن اور ہوا وغیرہ بھر کر اسے پھیلایا جائے گا۔ اس گھر میں سردی گرمی کو معمول پر رکھنے کا خاص قسم کا سامان لگا ہو گا۔ اس کے اندر انسان ایسے ہی رہ سکے گا جیسے زمین پر رہتا ہے۔ خیال ہے کہ ایسے مکان ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۵ء کے درمیان تیار ہو جائیں گے۔

(باقی مضمون "خلا کے مسافر" صدا ۴)

آج رات خلا کے مسافر چاند کی مہم سر کر کے خیریت کے ساتھ لوٹ آئے۔ ابھی ابھی ریڈیو نے یہ خبر سنائی ہے اور ہاں ریڈیو نے یہ بھی بتایا کہ اس خوشی میں سارے اسکولوں میں چھٹی ہے۔

جناب عبدالحق پرنسپل جامعہ ہائر سکنڈری اسکول

رابندر ناتھ ٹیگور

۱۴ نومبر ۱۹۱۳ء کو نوبل پرائز کمیٹی نے رابندر ناتھ ٹیگور کے لاثانی شاہ کار "گیتا نجلی" کو نوبل پرائز کے لیے منتخب کیا۔ کمیٹی کے اس اعلان نے مغرب میں تہلکہ مچا دیا۔ یہ اعزاز اب تک یورپ اور امریکہ والوں ہی کے حصے میں آیا تھا۔

گیتا نجلی کا انگریزی ترجمہ خود ٹیگور نے کیا تھا۔ یہ انگریزی ترجمہ پہلی مرتبہ لندن کی انڈیا سوسائٹی نے شایع کیا تھا۔ کتاب کا مقدمہ آئرلینڈ کے مشہور شاعر ایٹ نے لکھا تھا۔ ایٹ نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"میں کئی دنوں تک ان نظموں کے انگریزی نسخے کو اپنے ساتھ لیے ریل گاڑیوں، بسوں اور ہوٹلوں میں پڑھتا پھرا۔ بعض وقت مجھے کتاب اس لیے بند کر دینا پڑتی تھی کہ دوسرے اجنبی کیا خیال کریں گے۔ کہ بھلا میں اس کتاب سے اتنا متاثر ہوا ہوں۔

آئیے آج آپ کو اس غیر فانی شاہ کار کے خالق ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی زندگی کے کچھ حالات سنائیں۔

رابندر بابو ۷ رمئی ۱۸۶۱ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے آپ اپنے والد بزرگوار مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور کے چودھویں بچے تھے اور سب سے چھوٹے تھے۔ گھر والے محبت سے انھیں "رابی" کہتے تھے۔

آپ کے والد مہارشی ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ ان کی ساری زندگی ایشور بھگتی اور غریبوں کی مدد کرنے میں گذری۔ اپنے زمانہ کے مشہور عالم تھے بنگالی سنسکرت اور ہندی کے ساتھ ساتھ اُردو اور فارسی زبانیں بھی اچھی خاصی جانتے تھے۔ سچے دیش بھگت اور شب و روز قوم و ملک کی بہبودی کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

آپ جانیے زندگی کا سب سے قیمتی زمانہ بچپن ہے جو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ ٹیگور اسے کبھی نہیں بھلا سکے۔ اور اسّی برس کی عمر میں انھوں نے اپنے بچپن کے حالات ایسے بھولے بھالے اور معصومانہ انداز میں لکھے ہیں جیسے کوئی بچہ اپنی آپ بیتی سنا رہا ہو۔ آپ کی یہ آپ بیتی — "چھیلے بیلا" کے نام سے شایع ہو چکی ہے۔

ٹیگور کے خاندان میں بچوں کی تعلیم و تربیت اسی مخصوص ڈھنگ سے دی جاتی تھی جس پر

صدیوں ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو فخر رہا ہے۔
صبح سویرے اٹھنا۔ منھ ہاتھ دھوکر درزش کے لیے
اکھاڑے پہنچ جانا۔ اکھاڑے سے نکلتے ہی اسکول چلے
جانا۔

تمام دن اسکول میں گذار کر سہ پہر کو جب یہ
بچے واپس آتے تو گھر پر پڑھانے والوں ـــــــــ
کا سلسلہ شروع ہوجاتا اور رات کو ۹ بجے انھیں قیدیوں
کی طرح سونے پر مجبور کردیا جاتا۔

ٹیگور بنگال کے ممتاز ترین امیر خاندان سے تعلق
رکھتے تھے۔ مگر اس خاندان میں اپنے بچوں کی تربیت کا ڈھنگ
بھی بس نمونے کا تھا۔ بچوں کے لیے نہ تو قیمتی کپڑوں کا
اہتمام تھا نہ اچھے اچھے مرغن کھانوں کا نہ عیش و آرام
کا وہ تمام سامان فراہم کیا گیا تھا جس نے آج کی نسلوں
کو برباد کردیا ہے۔ خود ٹیگور معمولی قمیص اور پاجامہ پہنتے
عام طور سے سلیپروں کا ایک جوڑا استعمال کرتا تھا۔ گھر پر زیادہ تر
ننگے پاؤں رہتے تھے۔

ٹیگور کی ماں کا انتقال ان کی کم عمری میں
ہوگیا۔ ان کے باپ زیادہ تر باہر رہتے تھے۔ خاندان
کے تمام بچے گھریلو نوکروں کے رحم و کرم پر رہتے تھے
ان نوکروں کو وہ تمام اختیارات حاصل تھے جو اس
خاندان کے کسی بزرگ کو حاصل ہوسکتے تھے۔ کیا
مجال کہ کوئی بچہ ان کے حکم کے خلاف ایک قدم بھی اٹھا
سکے۔ پھر استاد بھی ایسے سخت تھے جن سے بچے کانپتے تھے۔

ٹیگور کی تعلیمی زندگی کا یہ ابتدائی دور تھا جب
پہلی بار ان کا دل کتابوں سے اچاٹ ہوگیا اور وہ اپنے
کو تنہا محسوس کرنے لگے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

"میں تنہا تھا۔ یہ میرے بچپن کا اہم واقعہ ہے۔
روزانہ دریچہ کے سامنے بیٹھا کرتا تھا اور اس تصور میں
کھو جاتا تھا کہ باہر کی دنیا کیا ہوگی۔

مجھے خوب یاد ہے کہ اس پہلے ہی دن سے مجھے
فطرت سے بے انتہا لگاؤ بے انتہا انس پیدا ہوگیا تھا۔
میں خوشی سے دیوانہ ہوجاتا تھا۔ جب دیکھتا کہ آسمان پر
بادل ایک کے بعد ایک گذرتے چلے جاتے ہیں۔ بچپن کے
اس ابتدائی دور میں کچھ ایسا لگتا تھا جیسے میں ایک گہرے
اور بہترین مخلص دوست کی رفاقت میں ہوں۔ میں نہیں
جانتا تھا کہ اس کو کس نام سے پکاروں؟ مجھے فطرت
سے اتنی شدید اور والہانہ محبت تھی کہ بیان نہیں کرسکتا
فطرت ایک غمگسار دوست کی طرح ہمیشہ ساتھ رہتی تھی۔
اور تازہ حسن کا انکشاف کرتی تھی۔"

ابھی ٹیگور آٹھ ہی برس کے تھے کہ ان کے
بڑے بھائی "جیوتی ناتھ" نے ان سے کہا۔
"رابی تم شعر کیوں نہیں کہتے"

ٹیگور نے پہلی نظم "کنول" پر لکھی۔ نظم کیسی تھی
کچھ پتہ نہیں لیکن ایسا ضرور تھا کہ اسے دیکھ کر جیوتی ناتھ
کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے۔ انھوں نے
اپنے چھوٹے بھائی کی ہمت بڑھائی اور سب سے پہلے
بنگالی بحروں کے اتار چڑھاؤ پر تعلیم دی۔

ٹیگور کی شاعری کی یہ ابتدا تھی۔ اس کے
بعد جب نارمل اسکول پہنچے تو باقاعدہ سرخ رنگ کی
کاپی پر شعر لکھنے لگے۔ اکثر فرصت کے وقت یہ اپنے

شعر جیوتی بابو کو سنایا کرتے تھے۔ جیوتی اجب انھیں
اپنے دوستوں سے ملاتے تو ہمیشہ شاعر کی حیثیت سے تعارف
کراتے۔ اس ہمت افزائی کا یہ نتیجہ نکلا کہ یہ بہت جلد
شاعر کی حیثیت سے روشناس ہوگئے۔

بات کچھ اور آگے بڑھی ٹیگور کی شہرت نارمل اسکول
کے سپرنٹنڈنٹ تک پہنچی، انھوں نے ٹیگور کے شعر سن کر
انھیں اپنے خاص شاگردوں میں شامل کیا۔ ٹیگور کے
والد نے جب ان کے اشعار سنے تو بے قابو ہوگئے۔
اور کہنے لگے۔

"اگر اس ملک کا بادشاہ اس شاعر کی زبان اور
ادب کو سمجھتا تو ضرور انعام دیتا۔ چونکہ ایسا نہیں۔ اس
لیے میں یہ خدمت انجام دوں گا۔"

مہارشی نے 'رابی' کی طرف ایک چیک بڑھادیا
جس کی قدر وقیمت اس نوبل پرائز سے کہیں زیادہ تھی جو انھیں
گیتانجلی پر ملا تھا۔

ٹیگور کی زندگی جس ادھوری تعلیم کے دور سے
گذر رہی تھی وہ ٹیگور کے خاندان کے لیے کسی طرح
اطمینان بخش نہ تھی۔ اپنے بڑے بھائی۔ جیوتی ناتھ کے
ساتھ انھیں انگلستان تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا
گیا۔ یہ ۱۸۷۸ء کی بات ہے۔ ٹیگور کو پہلے تو ایٹن کالج
پھر یونیورسٹی کالج لندن میں داخل کرادیا گیا۔ جہاں وہ کئی
مہینے پڑھتے رہے۔

لیکن جلد ہی ان کا دل اچاٹ ہوگیا۔ نسلی تعصب
کالے گورے کا فرق۔ غلام اور آقا کا امتیاز۔ ان
سب باتوں کو ان کا دل برداشت نہ کر پایا اور ایک مرتبہ
پھر انھوں نے اپنا سارا دھیان شعروشاعری اور ادبی
مشغلوں کی طرف لگا دیا۔ اس زمانہ میں انھوں نے نظم
سے زیادہ نثر لکھنے کی کوشش کی اور خط لکھنے کا ایک
مستقل سلسلہ شروع کیا۔ یہ خط رسالہ بھارتی میں چھپتے
رہے۔

انگلستان میں کچھ دن ٹھہرنے کے بعد جیسے گئے
تھے ویسے واپس آئے کوئی ڈگری ساتھ نہ لائے۔ خاندان
کے لوگ ناراض تھے اس لیے ان کو حکم ملا کہ شیلدان پہنچ
کر جاگیر کا انتظام کریں۔

شیلدان کلکتہ کے پاس ٹیگور خاندان کی جاگیر کا
ایک گاؤں تھا یہ ان کاموں سے گھبراتے تھے مگر باپ
کا حکم تھا۔ مجبوراً شیلدان پہنچے۔ یہاں انھوں نے پہلی بار
اس ہندوستان کی غریبی اور افلاس گاؤں والوں کا بھولپن
اور انسانیت کو گہری نظر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں
انھیں غریب کاشتکاروں کی سادہ زندگی سے سابقہ پڑا
یہاں وہ غریبوں اور مزدوروں کے دکھ درد میں شریک
رہے۔ اور جاگیر کا انتظام اتنا اچھا کیا کہ سبھی مطمئن ہوگئے
یہاں ان کی شاعری کو نئی زندگی ملی ان کے بہت سے
ڈرامے اور گیتوں کے مجموعے اسی شیلدان کی پیداوار ہیں۔

ٹیگور کو موسیقی سے بھی قدرتی لگاؤ تھا۔ آپ
نے بچپن سے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں
نے نہ صرف گیت لکھے بلکہ انھیں دلکش دھنوں پر گا کر
سنایا۔ انھوں نے اپنے گیتوں کی دھنیں خود بنائیں
اُن کی بنائی ہوئی یہ دھنیں رفتہ رفتہ بنگال کی سب سے
زیادہ مقبول سنگیت بن گئیں۔ انھیں رابندر سنگیت کا

نام دیا گیا۔ بنگال کی موسیقی میں رابندر سنگیت کو ایک
خاص مقام حاصل ہے۔

ٹیگور کی ایک اور بات سُن کر آپ کو سچ مچ بڑا
اچنبھا ہوگا۔ انھوں نے ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر
میں مصوّری (چتر کاری) سیکھی۔ بھلا اتنی عمر کو پہنچ کر
انسان کسی نئے فن کو تو کیا سیکھتا اپنے اس فن سے بھی
اکتا جاتا ہے جس کا وہ ماہر ہوتا ہے۔ لیکن ٹیگور نے
عمر کے اسی حصّے میں ایک نئے فن کو سیکھا، پوری توجہ
اور محنت سے سیکھا اور جناب ابھی اسے سیکھے دس،
بارہ سال بھی نہ ہوئے تھے کہ مصوری کے ماہروں
نے انھیں مصوری کے پیغمبر کا درجہ دیا۔ ٹیگور کی
تصویریں زیادہ تر قدرتی مناظر پر ہیں جنگل کے جانوروں
پر ہیں اور پرندوں پر ہیں۔ ان تصویروں کی تعداد
لگ بھگ تین ہزار ہے

ٹیگور ہندوستان کے نہیں دنیا کے بہت
بڑے شاعر تھے۔ بہت بڑے سنگیت کار تھے بہت
بڑے مصور تھے سب باتوں کے ساتھ ساتھ انسان بھی
تھے۔ بہت بڑے انسان، جس سے ملتے برابری سے
ملتے۔ بہت اخلاق سے ملتے۔ جس کسی سے ملتے اس کی
حیثیت کے مطابق باتیں کرتے۔

انھوں نے ایک زمیندار یا جاگیردار کے گھر
میں آنکھ کھولی تھی۔ لیکن ان کی سادہ مزاجی قابلِ رشک
تھی۔ سادہ لباس پہنتے تھے کھانے میں کسی قسم کا تکلف
نہیں تھا۔ ہمیشہ سادہ غذا کھاتے تھے۔ اپنے شاگردوں
کو بھی یہی مشورہ دیتے تھے "سادہ اور قدرتی
اصولوں پر زندگی بسر کرو۔"

بہت مہمان نواز تھے گھر پر جو مہمان بھی آتا
خواہ کوئی بھی کیوں نہ ہو آپ اس کی طرف بھرپور توجہ
دیتے اور آنے والے کو ان سے کبھی شکایت پیدا نہ ہوتی
بنگال کے ایک ادیب نے سچ کہا تھا کہ ٹیگور سے
ملتے وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ضائع کرنے
کے لیے بے شمار وقت ہے ان کے دروازے ملنے جلنے
والوں کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔

ٹیگور کوئی نیتا قسم کے یا سیاسی آدمی نہیں تھے لیکن
انھیں ہندوستان کی آزادی کی اتنی ہی فکر تھی جتنی گاندھی
جی کو تھی۔ وہ گاندھی جی کی پرامن سیاسی تحریک کے
بہت بڑے حامی تھے۔ اور اس کا اظہار انھوں نے اپنی
ایک نظم میں بھی کیا ہے۔

"مہاتما گاندھی کو اس راہ کا سچا رہبر
بننے دو۔ انھیں حقیقی خدمت کے لیے
بلانے دو، قربانی اور ایثار کا خراج
طلب کرنے دو جس کی انتہا محبت اور
تخلیق ہے۔ میں نہایت خوشی سے
ان کے قدموں میں گر جاؤں گا اور ان
کا ہر حکم بجا لاؤں گا۔"

ٹیگور کو معلم (استاد) کی حیثیت سے بہت
اونچا مقام حاصل ہے۔ ہندوستان کے پرانے رشیوں
کی طرح انھوں نے ہمارے لیے ایک لازوال ترکہ
چھوڑا ہے اور وہ ہے شانتی نکیتن۔ انھوں نے کلکتہ
سے نوّے میل کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے [illegible]

بنیاد ڈالی ۔ یہاں بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی
اس اسکول کو چلانے میں انھیں بڑی مالی دشواریوں کا
سامنا کرنا پڑا ۔ پوری کا گھر بیچا ۔ بیوی کے زیور فروخت
کیے اور تھوڑی بہت امداد باہر سے حاصل کی ۔ خدا
خدا کر کے اسے وشوا بھارتی کی شکل دی اور اب
اس ادارے کو یونی ورسٹی کا درجہ حاصل ہے ۔

ٹیگور نے جن تعلیمی اصولوں پر اس ادارے
کی بنیاد رکھی اس کا اندازہ ان کی ایک تحریر سے ہوتا ہے ۔ وہ
لکھتے ہیں ۔

"ہماری تعلیم کا بہترین ادارہ وہ ہوگا جو شہر کے
ہنگاموں سے دور پُر امن مقامات پر درختوں کے
سایے میں تعلیم دینے کا انتظام کر سکے ۔ استاد پڑھتے
رہیں گے اور پڑھاتے رہیں گے ۔ اور شاگرد سکون
اور خاموشی کی فضا میں پروان چڑھیں گے ۔ اگر
ہو سکا تو باغ اور کھیتیاں بھی ودیالے کے ساتھ ملحق
کر لی جائیں گی ۔ شاگرد کھیتی باڑی میں مدد کریں گے
مویشیوں کی دیکھ بھال کریں گے ۔ گائیں دوہنا بھی
ان کے فرائض میں داخل ہوگا ۔ فالتو وقت میں وہ زمین
کھودیں گے، پیڑ لگائیں گے اور انھیں سینچیں گے ۔
درختوں کے سایے میں کلاسیں لگا کریں گی اور بچوں
کو اپنے استادوں کے ساتھ کھلے میدانوں میں پھرنے
اور تعلیم حاصل کرنے کا طریقہ بتایا جائے گا ۔ اور اس
طرح فطرت کے ساتھ ایک گہرا لگاؤ قایم ہو جائے گا ۔
اس میں صرف جذبات کو نہیں بلکہ کام اور محنت کو بھی دخل
ہوگا ۔"

لازوال ترکہ کا بانی لافانی شاہکار گیتانجلی کا
خالق اور قومی ترانہ کا جنم داتا ۷ اگست ۱۹۴۱ء کو
اس دنیا سے رخصت ہو گیا ۔ ارتھی کے ساتھ کئی میل لمبا
جلوس تھا ۔ اس جلوس میں ہندو بھی تھے مسلمان بھی تھے
عیسائی بھی تھے اور سکھ بھی تھے ۔ دوسرے ملکوں
کے وہ لوگ بھی تھے جو کلکتہ میں رہتے تھے ۔ اور یہ
سب شاعر اعظم کے آخری درشن کے لیے بے تاب
تھے، بے قرار تھے ۔

موت کی آخری رسمیں آدھی رات کے قریب
اس وقت ختم ہوئیں جب آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے
زمین کے اس المیہ سے متاثر ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے
رخصت ہو رہے تھے وہ شاید سوچ رہے تھے کہ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا ۔

ٹیگور نے زندگی کے آخری سفر کو گیتانجلی میں اس
الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

"مجھے چھٹی مل گئی ہے ۔۔۔!
اے بھائیو ۔ مجھے الوداع کہو ۔ میں تم سب کو نمسکار
کرتا ہوا رخصت ہوتا ہوں ۔
لیجیے میں اپنے مکان کے سب دعوے چھوڑ کر
چابیاں واپس کرتا ہوں ۔ اب ! میں تم سے صرف مہربانی
کے آخری الفاظ چاہتا ہوں ۔ ہم مدتوں پڑوسی رہے ۔
مگر میں نے جو کچھ دیا اس سے کہیں زیادہ لے لیا ۔
دن نکل آیا ۔۔ وہ لیمپ جو میرے اندھیرے
کمرے کو روشن کیے ہوئے تھا بجھ چکا ہے ۔ سفر کا پیام
آگیا اور میں اپنے آخری سفر کے لیے تیار ہوں ۔"

جناب کیف احمد صدیقی

مبارک باد تم کو اے امریکن خلا بازو
حقیقت چاند کی تم سے ہوئی روشن خلا بازو

پہنچ کر چاند پر کار نمایاں کر دیا تم نے
حقیقت میں ہر اک انساں کو حیراں کر دیا تم نے

بظاہر چاند کی مٹی کی دولت لے کے آئے ہو
مگر باطن میں بے پایاں مسرت لے کے آئے ہو

تمہارے ساتھ ہر انسان کے دل کی دعائیں تھیں
تمہاری کامیابی پر زمانے کی نگاہیں تھیں

ہمیشہ یاد آئے گی تمہاری یہ جواں مردی
تجسس کے لیے تم نے لگا دی جان کی بازی

عجیب انداز سے کی خدمت انسانیت تم نے
بڑھا دی آسماں تک عظمتِ انسانیت تم نے

قیامت تک تمہارا کارنامہ یاد آئے گا
ہر اک انساں تمہارے حوصلوں کے گیت گائے گا

ہر اک انساں تمہاری ہمتوں کی داد دیتا ہے
تمہارا کیفؔ بھی تم کو مبارک باد دیتا ہے

"بھائی بندر! کچھ انجیر مجھے بھی دو"

ایک دن کی بات سنیے۔ مغربی افریقہ میں ایک بڑا میدان تھا۔ میدان کے کنارے ایک گیدڑ انگور کی بیلوں میں پھنس گیا۔ یہ گیدڑ ایک چوہے کا پیچھا کر رہا تھا اور وہ اپنی رو میں دیکھ نہیں سکا۔ سیدھا جھاڑی میں گھس گیا۔ جتنا چھڑانے کی کوشش کی اتنا ہی اس میں وہ اور الجھتا گیا۔ آخر بُری طرح پھنس گیا " ہاوہو، ہاوہو، ہاوہو" گیدڑ بری طرح چیخنے چلانے لگا اس کی آواز میدان میں گونج اٹھی۔

دوسرے جانور جانتے تھے کہ گیدڑ ہمیشہ رات میں آوازیں نکالتا ہے لیکن آج دن میں چیخ رہا ہے نہ جانے کیا بات ہے۔ اتفاق کی بات ایک بندر ادھر سے گزر رہا تھا۔ یہ تماشا دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ گیدڑ نے اُسے آواز دی " مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ۔ اے اچھے بندر میری مدد کرو، اس جھاڑی سے مجھے نجات دلاؤ میں بھی کسی دن تمھاری مدد کروں گا"

اپنی تیز نگاہوں سے دیکھ کر بندر فوراً سمجھ گیا کہ کون سی بیل کو کھینچنا ہے۔ انگلیوں سے اس نے راستہ صاف کر دیا اور گیدڑ مزے سے باہر نکل آیا لیکن آزاد ہونے کے بعد اس نے شکریہ بھی ادا نہیں کیا سیدھا بھاگ کھڑا ہوا۔

دوسرے دن بھی بندر ایک درخت پر بیٹھا ہوا پکے پکے انجیر کھا رہا تھا۔ ادھر سے ایک اونٹ گزرا۔ آپ جانیں اونٹ کچھ گھمنڈی ہوتا ہے وہ بندر کی پرواہ بھی نہیں کرتا، سلام کرنا تو بڑی بات ہے۔ اپنی لمبی گردن ہلاتا ہوا گذر جاتا ہے لیسے چھوٹے چھوٹے جانوروں کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔

لیکن آج کے دن بندر اپنا سر ہلا ہلا کر میٹھے میٹھے انجیر کھا رہا تھا۔ اونٹ نے سر اٹھا کر شاخوں کو دیکھا۔ منھ میں پانی بھر آیا۔ سوچنے لگا ایک دو ہی انجیر مل جائیں تو منھ ذرا میٹھا ہو جائے گا۔

" بھائی بندر کچھ انجیر مجھے بھی دے دو" اونٹ نے منت سماجت کی۔

بندر نے لپک کر کچھ پکے پکے انجیر توڑے۔ اونٹ نے منھ اوپر اٹھایا اور میٹھے انجیر کھا لیے۔ پھر وہ اپنے راستہ پر چلتا بنا۔ لیکن تھوڑی دیر میں واپس آگیا، ایک بار پھر بندر سے اس نے کہا " کچھ انجیر مجھے بھی کھلاؤ"

یہ بات اس نے شریفانہ انداز میں اور نرمی کے ساتھ نہیں کہی۔ یہ نہیں کہا کہ مہربانی کر کے مجھے کچھ انجیر دے دیجیے۔ اس کے باوجود بندر نے بُرا نہ مانا اور پکے پکے انجیر مٹھی بھر اسے دے دیے۔ اس کے بعد اونٹ چلا گیا۔

اے لیجیے تیسری بار وہ پلٹ کر پھر آیا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ اور انجیر کھلاؤ۔ اب تو بندر بھی خفا ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ کتنا تو گھمنڈی ہے اور بار بار مجھ سے انجیر مانگتا ہے۔ اس کو شرم نہیں آتی۔ ویسے تو یہ کبھی سلام دعا بھی نہیں کرتا اور آج یہ ضد کر رہا ہے۔

" اب میں تمھارے لیے انجیر نہیں توڑوں گا۔ بس کافی دے دیے" لیکن اونٹ پر کوئی اثر نہیں ہوا جیسے چکنا گھڑا ہو۔ اب وہ منت سماجت پر اتر آیا۔ بندر بھی بدتمیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

شرارت پر اُتر آتے ہیں تو دوست میں فرق نہیں کرتے۔
مگر ایک بار ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو پھر خیریت نہیں۔
"بدشکل کہیں کا، چل یہاں سے ذرا اپنی پیٹھ تو
دیکھ کیا کُلّڑھ سا نکلا ہوا ہے۔ میں تو میاں تمھاری بھدی
بھدی صورت دیکھتے دیکھتے تنگ آگیا ہوں" بندر نے
حقارت سے اسے دیکھ کر طنزیہ جملوں کی اس پر بوچھار
کر دی۔

گھمنڈی اونٹ کا بھی صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔
ویسے وہ خود بھی اپنی کُلّڑھ سی پیٹھ کو پسند نہیں کرتا تھا۔
بلکہ اسے شرم آتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کاش اس کی
شکل بھدی نہ ہوتی گھوڑے جیسی ہوتی۔

"تم بہت بدشکل ہو" وہ بندر کی بدتمیزی
پر بولا "اپنی شکل تو دیکھو۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور وہ
بھی سر میں ایسی گڑی ہیں کہ تم کاٹھ کے اُلّو معلوم ہوتے
ہو۔ تمھاری ناک تو دکھائی بھی نہیں دیتی پھر بھی سمجھتا
ہے کہ تو بڑا خوب صورت ہے؟"

اونٹ کی باتیں بندر کو بہت کھلیں دل میں تو
واقعی اسے یہ سوچ کر شرم آئی کہ اس کی آنکھیں اندر
کو دھنسی ہوئی ہیں اور کتنی چھوٹی ہیں اور ناک بھی اس
کی جیسے نہیں کے برابر ہے۔ پر اب یہی ترکیب تھی کہ
وہ بھی اونٹ کو برا بھلا کہے۔ اس نے چڑچڑاتے
ہوئے کہا "چل بدشکل! اپنی دم کو تو دیکھو کیسی چھوٹی
کتنی بھونڈی ہے۔ گھوڑے جیسی لمبی اور مضبوط دم
تمھیں خدا نے کیوں نہیں دی؟ اور پیچھے کے کولھے
بھی تو غائب ہیں۔ ایسا بھدا جانور تو میں نے دیکھا
نہیں۔ بھلا تیری بھی کوئی حیثیت ہے، تو تو بس گھوڑے
کی نقل ہے۔ بھدی بہت بھدی سی نقل!"

افریقہ کے خشک میدانوں میں گھوڑے اور
اونٹ میں بھی بنتی نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو
مدمقابل سمجھتے ہیں۔ اس لیے بندر نے آخری بات
کہہ کر اونٹ کی جو بے عزتی کی تو یہ اس کی برداشت
سے باہر تھا۔

اس نے اپنی لمبی گردن اوپر اٹھائی اور
بڑھ کر اپنے منھ میں بندر کی دو پچھلی ٹانگیں پکڑ لیں۔
گرفت مضبوط تھی اور اس کے جبڑے سے کسی طرح
وہ نکل نہیں سکتا تھا۔ بدتمیز بندر کو اس نے شاخوں
سے نیچے گھسیٹ لیا۔

"چلو ہم اب ایک قاضی کے پاس چلیں جو
جو ہمارا جھگڑا چکائے گا۔ تم نے بڑی گستاخی کی ہے اور
اور تم کو سزا دینی ضروری ہے" اونٹ نے اپنے قیدی
سے کہا۔ اس نے اسے اٹھا کر اپنی پیٹھ پر پڑی ٹوکری
میں رکھ لیا تھا۔ ڈگ ڈگ کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تاکہ
کوئی تیسرا جانور مل جائے تو اس سے سارا ماجرا کہہ
سنائے۔

سب سے پہلے ان کو ایک مکڑا ملا اور مغربی
افریقہ کے مالی اور نائجیریا کے علاقے میں جو مکڑے
ملتے ہیں وہ کافی ہوشیار سمجھے جاتے ہیں۔ "مکڑے!
تم ہمارا فیصلہ کرو" اونٹ نے مقدمہ پیش کیا "پہلے
تم اس بندر کی کہانی سنو اور تمھیں بتاؤ کہ میں اس کو
کیا سزا دوں"

"میں انجیر کے درخت پر بیٹھا ہوا تھا اے مکڑے" بندر نے اپنی کہانی شروع کی "اونٹ نے انجیر مانگے۔ میں نے اس کو دے دیے۔ دوسری بار اس نے پھر مانگے۔ دوسری بار بھی میں نے انکار نہیں کیا تیسری بار اس نے پھر اصرار کیا۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ مجبوراً مجھے اس کو گالیاں دینی پڑیں۔"

اونٹ نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا "گل لڑو جیسی پیٹھ کس نے کہا تھا۔ پھر اس بندر نے کہا تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ تم تو محض گھوڑے کی نقل ہو۔"

"لیکن اونٹ نے بھی میری کم بے عزتی نہیں کی" بندر نے جواب میں کہا "اس نے مجھے بھی کہا۔ تو اپنی شکل تو دیکھ۔ کیسا بھدا ہے آنکھیں چھوٹی اور سر میں گڑھی ہوئیں۔ پھر اس نے کہا کہ ناک تو تیری غائب ہے۔ کیا یہ بڑے تمیز کی بات تھی؟"

مکڑا بندروں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ کبھی کبھار کیڑوں مکوڑوں کو بھی کھا جاتے ہیں۔ اس نے آگے کی ٹانگ ہلاتے ہوئے کہا "بندر نے سخت بدتمیزی کی ہے۔ اسے جانے نہ دینا۔"

"ایک جج کافی نہیں" بندر نے کہا "چلو کوئی دوسرا جج تلاش کریں۔" اب جو دوسرا جانور ملا وہ ایک شیر تھا۔

"ہمارے درمیان ایک جھگڑا ہے۔ شیر میاں فیصلہ کرو۔ پہلے بندر اپنی بات بتائے گا۔" اونٹ نے ٹوکری میں سے اپنے قیدی کو دکھاتے ہوئے کہا۔

بندر نے جو کچھ کہ مکڑے سے کہا تھا وہی سب دہرایا۔ "اگر میں نے تمیز سے کام نہیں لیا تو اونٹ نے بھی تو بدتمیزی کی" بندر نے دعویٰ کیا "اور پھر یہ کہ میں بہت سے انجیر اسے دے چکا تھا۔ اس کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ میری آنکھیں چھوٹی ہیں اور ناک غائب ہے۔ اس کی پیٹھ میں بھی تو کوبڑ نکلا ہوا ہے۔ وہ کیسا عجیب لگتا ہے اور یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ دیکھنے میں اونٹ گھوڑے سے اچھا نہیں لگتا۔"

مکڑے کی طرح شیر بھی بندر کو پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ درخت سے اخروٹ گرا گرا کر اس کے سر پر مارتے تھے۔ لہٰذا اس نے گردن کے بالوں کو ہلاتے ہوئے فیصلہ دیا "بندر نے سخت بدتمیزی کی ہے۔ اسے پکڑے رکھو۔ جانے نہ دینا۔"

اب تو بندر میاں کا برا حال تھا۔ دو جج ان کے خلاف فیصلہ دے چکے تھے۔ انھیں خدشہ تھا کہ شاید اب وہ کبھی بھی آزاد نہ ہو پائے گا "اونٹ بھیا دیکھو تین ججوں کا فیصلہ زیادہ اچھا رہے گا بہ نسبت دو کے" اس نے چالاکی سے کہا۔

"لو دیکھو! یہ سامنے سے ایک گیدڑ آرہا ہے چلو اس کے سامنے مقدمہ پیش کریں۔" بندر نے جب دیکھا کہ یہ تو وہی گیدڑ ہے جس کو اس نے جھاڑیوں سے نکالا تھا تو خوشی ہوئی۔

"مجھے کوئی انکار نہیں! اونٹ میاں کیا معاملہ ہے۔ میں تمہارا فیصلہ کروں گا۔" گیدڑ نے کہا اور یہ بات اس نے ظاہر نہ ہونے دی کہ یہ بندر اس کا دوست ہے۔

اس لیے اب اونٹ کو کیا پتہ کہ جج معتبر بھی ہے یا نہیں؟

" جھگڑا ہمارا یہ ہے کہ بندر نے میرے ساتھ سخت بدتمیزی کی ہے " اونٹ نے مقدمہ پیش کیا " بندر پہلے بتائے گا ۔ پھر تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کتنا سر پر چڑھ گیا تھا ۔ دو جج پہلے فیصلہ کر چکے ہیں ۔ مجھے امید ہے کہ ان کی طرح تم بھی یہی کہو گے کہ میں بندر کو رہا نہ کروں "

" میں انجیر کے درخت پر بیٹھا ہوا تھا ۔ اونٹ تین بار میرے پاس آیا ۔ دو بار میں نے توڑ توڑ کر اس کو انجیر دیے ۔ اس کے بار بار مانگنے سے میں بھی تنگ آگیا ۔ میں نے کہا میں اب نہیں دیتا ۔ لیکن اونٹ ٹس سے مس نہ ہوا ۔ وہ اپنی ضد پر اڑا رہا ، اس لیے مجبور ہو کر میں نے اس کو کھری کھری سنائیں " اس نے ایک بار پھر وہی الفاظ دہرا دیے ۔ اب اونٹ کی باری تھی ۔

اتنے میں گیدڑ کو وہ واقعہ یاد آگیا ۔ جب بندر نے اس کے ساتھ شرافت کا سلوک کیا تھا اور اسے انگور کی بیلوں سے رہا کرایا تھا اس کو فکر تھی کہ اپنے محسن کی کسی طرح ضرور مدد کرنی چاہیے ۔

" تمھارے مقدمہ کا فیصلہ کرنے سے پہلے " گیدڑ نے کہا " میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ تم دونوں کہاں کہاں تھے ۔ اس سرزمین پر فیصلہ کرنے کا یہی طریقہ ہے "

گیدڑ کی بات ٹھیک تھی ۔ اس لیے اونٹ نے بندر کو ٹوکری سے باہر نکالا ۔ گیدڑ نے بندر سے کہا کہ تم سیدھے بیٹھ جاؤ ۔ اونٹ سے اس نے کہا کہ تم ادھر بائیں طرف کھڑے ہو جاؤ ۔

" میرا فیصلہ یہ ہے کہ بندر نے بدتمیزی کی اور اس کی سزا یہ ہے کہ وہ اس درخت کی سب سے اونچی شاخ پر چڑھ جائے ۔ اونٹ اپنے راستے پر جا سکتا ہے ۔ جہاں تک میرا اپنا معاملہ ہے میں سیدھے اپنے سوراخ میں جاتا ہوں "

بندر آزاد ہو گیا ۔ وہ اوپر درخت پر جا بیٹھا ۔ اونٹ کتنا ہی خفا ہوا سے پا نہیں سکتا ۔ گیدڑ خود زمین کے اندر اپنی ماند یعنی گہرے سوراخ میں غائب ہو چکا تھا ۔ اونٹ اسے بھی نہیں پکڑ سکتا تھا اور ظاہر ہے کہ اب کوئی چارہ نہیں تھا ۔ اونٹ تنہا وہاں کھڑا تھا ۔

اونٹ کا شمار جانوروں میں کچھ بہت اچھا نہیں ۔ اس اونٹ کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ آخر یہ کیا ہو گیا ۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ وہ اس بکھیڑے سے تنگ آ چکا تھا ۔ اس لیے وہ خاموشی سے میدان کی طرف چلا گیا ۔ اسے امید یہ تھی کہ انشاء اللہ آئندہ ایسے بے عزتی کے الفاظ نہیں سنے گا ۔ جو اس بندر نے چڑچڑا کر اس کو سنائے تھے ۔

حسین حسان ندوی

چاند کی مہم

کئی ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ یونان میں ایک مشہور فلسفی تھا، سقراط نام تھا۔ اس نے ایک بار کہا تھا ہماری دنیا کا انسان کنوئیں کا مینڈک ہے۔ ایسا مینڈک جو کنوئیں کی بالکل نیچے کی تہہ میں رہتا ہے۔ پر اب ہمارے سائنس والوں نے، ہمارے خلا بازوں نے سقراط کی اس بات کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ کنوئیں کے اس مینڈک نے بڑی لمبی چھلانگ لگائی ہے۔ چاند تک پہنچ گیا ہے۔ مگر یہ اس کی آخری چھلانگ نہیں ہے۔ وہ اور آگے چھلانگیں لگائے گا۔ زہرہ اور مریخ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ اس سے بھی آگے اور آگے۔

چاند ہمارا پرانا دوست:- چاند سے ہماری دوستی ہمارا لگاؤ بہت پرانا ہے۔ ہزاروں سال پہلے جب لوگ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ آگ بھی کوئی چیز ہے۔ اس وقت رات کی اندھیاری کو دور کرنے والی چاندنی انھیں کیسی بھلی کتنی غنیمت معلوم ہوتی ہوگی جبھی تو انھیں اس سے اتنا لگاؤ، اتنی محبت ہوگئی۔ اسے دیوی دیوتاؤں کی طرح پوجنے لگے۔ ملکوں ملکوں کے شاعروں نے اپنے گیتوں اپنی نظموں میں ان کے گن گائے ہیں۔ ملکوں ملکوں میں چندا ماموں کے بارے میں لوگ کہانیاں لکھی گئی ہیں۔

خود اپنے دیس میں یہ چندا ماموں کتنے پیارے ہیں۔ جب آپ ننھے سے تھے آپ نے امّی، دادی یا نانی سے یہ گیت ضرور سنا ہوگا۔

چندا ماموں دور کے	بڑے پکائیں بور کے
آپ کھائیں تھالی میں	ہمیں دیں پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ	چندا ماموں گئے روٹھ

تو آپ کو کیسا اچھا لگتا ہوگا۔ اور کبھی چودھویں رات کے چاند میں کچھ دھبے دھبے سے نظر آتے ہیں۔ ہماری آپ کی بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں "وہ دیکھو چاند میں بڑھیا بیٹھی چرخہ کات رہی ہے۔ کچھ لوگ اسے خرگوش سمجھتے تھے یعنی خرگوش صاحب چاند پر دندنا رہے ہیں۔ چین کے پرانے بہت پرانے لوگوں کے خیال میں تو ان کے دیس کی ایک راج کماری کو دیس نکالا ملا تھا۔ اس نے چاند میں پناہ لی۔ یہ راج کماری آج بھی بیٹھی آنسو بہا رہی ہے۔

غرض جتنے منھ اتنی باتیں جو جس کی سمجھ میں آیا کہہ دیا۔

تو بھئی اور سب سیاروں اور ستاروں کے مقابلے میں ہم سب کی توجہ چاند ہی پر تھی۔ چندا ماموں ہی ہیں ان

سب سے بڑے نظر آتے تھے ۔

مگر جوں جوں انسان کا علم بڑھا، عقل بڑی ٹھیک ٹھیک سوچنے کا ڈھنگ پیدا ہوا، چاند تاروں کے بارے میں بھی ان کی معلومات بڑھتی گئیں ۔ یہ معلوم ہوا کہ جہاں اور ستارے یا سیارے زمین سے کروڑوں میل دور ہیں ۔ چندا ماموں ہم سے (لگ بھگ) کل ڈھائی لاکھ میل دور ہیں ۔ اسی لیے اور ستاروں سیاروں کے مقابلے میں اتنے بڑے دکھائی دیتے ہیں ۔ پھر بھی ان تک پہنچنے کی آرزو نہ جانے کیوں آپ سے آپ انسان کے دلوں میں چٹکیاں لیتی رہی ۔

لگ بھگ سو برس پہلے تو سائنسی معلومات اور سائنسی اصولوں کی بنیاد پر چاند پر پہنچنے کے فرضی اور خیالی سفرنامے بھی گھڑ لیے گئے اور پھر بعد میں بہت سے بڑے بڑے سائنس داں تو چاند پر پہنچنے کی پیشن گوئیاں بھی کرنے لگے مگر عام طور پر لوگ اسے خواب و خیال ہی سمجھتے رہے ۔

ہوتے ہوتے راکٹ ایجاد ہوا ۔ سائنس دانوں کی امیدوں کو ایک اور سہارا ملا ۔ ایک مشہور سائنس داں نے تو یقین کے ساتھ یہ پیشین گوئی کر دی کہ اب چند ہی دنوں بعد راکٹ خلا کا چکر لگانے لگیں گے ۔ یہ اب سے پچاس سال پہلے (۱۹۲۰ء) کی بات اس وقت نیویارک کے مشہور اخبار نے اس بے چارے سائنس داں کا مذاق اڑایا تھا ۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ اس وقت کے اچھے پڑھے لکھے لوگوں کا اس کے بارے میں کیا خیال تھا ۔ وہ اسے ایک طرح سے دماغ کا خلل سمجھتے تھے ۔ مگر سائنس دانوں نے ان باتوں سے ذرا بھی اثر نہ لیا ۔ بلکہ ان کی کوششوں کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی ۔

روس اور امریکہ کے سائنس داں ان کوششوں میں خاص طور پر پیش پیش تھے ۔ پہلا راکٹ یا اسپٹنک بارہ سال (۱۹۵۷ء) پہلے روس ہی نے خلا میں چھوڑا تھا پھر تو یوں کہیے کہ روس اور امریکہ میں ایک طرح سے خلائی دوڑ شروع ہو گئی ۔

خلائی پہل :- خلا میں پہلا راکٹ — روسی اسپٹنک (۱)
۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء خلا میں پہلا انسان روسی خلاباز
یوری گگارن — ۱۲ اپریل ۱۹۶۱ء خلائی جہاز وستوک ۔
سیارہ وینس کے مدار
میں پہنچنے والا پہلا خلائی جہاز ۔
امریکی خلائی جہاز میرینر
۱۴ دسمبر ۱۹۶۲ء (تین مہینے کا سفر)
سات مہینے کا سفر طے کر کے سیارہ مارس کے مدار میں پہنچنے والا پہلا خلائی ۔ امریکی خلائی جہاز میرینر
۲۸ نومبر ۱۹۶۴ء
چاند کے قریب سے گزرنے والا پہلا راکٹ لونا
روسی ۱۹۵۹ء ۔
چاند پر پہلا راکٹ جو آہستہ سے اترا ۔ لونا ۹
سیارہ وینس پر پہلا راکٹ جو آہستہ سے اترا ۔
روسی وینس ۵ اور وینس ۶ ۔ ۱۶ مئی اور
۱۷ مئی ۱۹۶۹ء ۔
خلا میں پہلی بار دو مصنوعی سیاروں کو ایک ساتھ جوڑنے کا کام بھی روس نے ہی کیا ۔

چاند پر پہنچنے والا پہلا انسان آرم سٹرانگ (امریکی) بذریعہ اپولو ۱۱۔

اور اب ان خلائی راکٹوں میں خلا باز بھی بھیجے جانے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں ملکوں کے سائنس دانوں نے اپنی پوری توجہ اس طرف لگا دی ہے۔ دونوں اپنی اڑان سے نئے تجربے حاصل کرتے رہے اور ان تجربوں کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔

غالباً ۶۱ء میں آن جہانی صدر کینیڈی نے ایک عجیب بات کہی: "دس برس کے اندر امریکی خلا باز چاند پر پہلا قدم رکھیں گے اور میں اگر مر گیا تو بہشت سے اس منظر کو دیکھوں گا۔" یہ بہت بڑا دعویٰ تھا۔ بھلا صدر کینیڈی نے یہ بات کیسے کہہ دی باوجود سائنس اور ٹیکنالوجی کی انتہائی ترقی کے ابھی قدم قدم پر مشکلیں تھیں رکاوٹیں تھیں۔ ایک تو زمین کی کشش آگے بڑھنے میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ دوسرے ہمارے چندا ماموں کی فضا آپ جانتے ہیں زندگی کے نام سے جلتی ہے۔ پھر زمین اور چاند کے درمیان دو ڈھائی لاکھ میل کا جو خلائی فاصلہ ہے اس میں سخت زہریلی کائناتی شعاعوں کا اور شہاب ثاقب کی بوچھار کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے سب حیرت میں تھے دبدھے میں تھے کہ صدر کینیڈی نے یہ مدت کیا جان کر متعین کر دی۔

مگر جناب سائنس دانوں نے بھی گویا قسم کھالی کہ صدر کینیڈی کی بات پوری کر کے دم لیں گے۔ اس موقع پر یہ بھی جان لیجیے کہ صدر کینیڈی نے اتنی بڑی بات یوں ہی نہیں کہہ دی تھی خوب سوچ سمجھ کر کہی تھی۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ چاند پر پہنچنے کی کوششوں میں روس اور امریکہ دونوں ملک آگے آگے ہیں۔ روس کی طرح امریکہ نے بھی سب سے پہلے چاند کی مہم کو سر کرنے کے لیے قدم اٹھایا۔ اس نے بنیادی کام یہ کیا کہ ۱۹۵۸ء میں خلا کے بارے میں تحقیق چھان بین اور جستجو کے لیے ایک ادارہ قایم کیا۔ اس ادارے کا نام نیشنل ایرونائکس اسپیس ایڈمنسٹریشن رکھا گیا۔ اس ادارے کے ماتحت تین منصوبے تیار کیے گئے۔ مرکری، جیمنی، اپالو۔

مرکری منصوبے کا مقصد ایسے خلائی جہاز یا راکٹ تیار کرنا تھا جو ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ خلا میں اڑ سکیں اور زمین کی کشش کے حلقے سے آسانی سے نکل کر آزادی کے ساتھ فضا میں اڑ سکیں۔ فضا یا خلا کی تمام رکاوٹوں کو دور کر کے سلامتی کے ساتھ فضا میں سفر کر سکیں انھیں زمین پر واپس لانے کے لیے راکٹ انجن لگے ہوں۔ زمین سے تعلق اور رابطہ قایم رکھنے کے لیے ریڈیو اور ٹیلی وژن کا معقول انتظام ہو۔ سورج کی شعاعوں سے بجلی حاصل کرنے کے لیے مشینیں لگی ہوں اور اس خلائی جہاز کے اندر کی فضا ایسی ہو کہ خلا باز زندہ رہ سکیں خلا بازوں کی تربیت بھی اس منصوبے میں شامل تھی۔

اس مرکری منصوبے کے ماتحت امریکہ کا خلائی جہاز پہلی بار خلا بازوں کو لے کر اڑا۔ یہ اڑان کل ۱۵ منٹ کی تھی مگر اس نے آگے کے لیے جیسے دروازہ کھول دیا۔ چھ جنوری ۶۲ء میں خلا باز زمین کے مدار میں تین بار چکر لگا کر اپنا خلائی جہاز سلامتی کے ساتھ

زمین پر لے آئے۔ یہ خلائی جہاز کل نو فٹ لمبا اور ڈیڑھ ٹن وزنی تھا۔ ۱۹۶۳ء میں چار کامیاب اُڑانیں اور ہوئیں۔ اس طرح خلاباز مجموعی طور پر ۵۴ گھنٹے خلا میں گذار چکے تھے۔

مرکری منصوبہ کی اس کامیابی سے امریکہ کے سائنس دانوں کی ہمتیں بڑھیں، حوصلے بڑھے، انھوں نے جیمنی نام کا منصوبہ بنایا اس نے پچھلے کاموں کو آگے بڑھایا۔ ایسے راکٹ یا خلائی جہاز تیار کیے جن کی اڑنے کی طاقت پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ ان کو اور بھی آرام دہ اور بہتر ساز و سامان سے لیس کیا۔ خلائی جہازوں کو زمین سے کنٹرول کرنے کے انتظام کو اور بہتر بنایا گیا۔

یہ خلائی جہاز ساڑھے گیارہ فٹ اونچے اور ساڑھے تین ٹن وزنی تھے۔ ان کے اندر ایسی مشینیں لگائی گئیں جن کی مدد سے خلاباز اپنی مرضی کے مطابق جہاز کے رخ یا سمت اور رفتار میں تبدیلی کر سکتے تھے۔ اس طرح مدار کا بدلنا اور اڑتے میں دوسرے خلائی جہاز سے جڑنا ممکن ہو گیا۔

جون ۱۹۶۵ء میں ایک خلاباز ایڈورڈ وہائٹ نے اپنے خلائی جہاز جیمنی ۴ سے باہر نکل کر خلا میں چہل قدمی کی۔ یہ ایک نئی بات تھی، دنیا حیرت میں رہ گئی۔ چھ مہینے بعد (دسمبر ۱۹۶۵ء) کیپ کینیڈی سے دو خلائی جہاز دو مختلف مداروں میں چکر لگانے کے لیے روانہ ہوئے اور اوپر پہنچ کر ان دونوں نے اپنے مدار بدلے۔ ۲۰ گھنٹے بائیس منٹ ایک دوسرے کے ساتھ اڑان کی۔ کبھی کبھی تو ان دونوں کے درمیان بس ایک فٹ کا فاصلہ رہ جاتا تھا۔ خلائی جہاز جیمنی ۷ نے چودہ دنوں میں دنیا کے چاروں طرف دو سو چھ بار چکر لگائے اور ریکارڈ قائم کیا۔

جیمنی منصوبے کے تحت بارہ خلائی پروازیں ہوئیں ان میں سولہ خلابازوں نے حصہ لیا۔ اور مجموعی طور پر ایک ہزار نو سو چالیس گھنٹے خلا میں گزارے۔

جیمنی منصوبے کی اس کامیابی سے سائنس داں اس نتیجے پر پہنچے کہ (۱) انسان بے وزنی کی حالت میں زندہ رہ سکتا ہے۔ (۲) ۳۳۰ گھنٹے تک پائلٹ، انجینئر اور سائنس داں کے کام اچھی طرح انجام دے سکتا ہے اور

چاند کے مسافر

نیل اے آرمسٹرانگ:۔ ۳۸ سالہ فلائٹ کمانڈر ایک شہری خلاباز ہے، خلا میں آزمائشی پروازوں کے دوران اس نے ایکس ۱۵ طیارے کو چالیس میل کی بلندی پر چار ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑایا تھا۔ جیمنی ۸ کے مشین کا کمانڈر بھی آرمسٹرانگ تھا جس کے دوران ۱۶ مارچ ۱۹۶۶ء کو پہلی بار خلا میں تیرتے ہوئے دو جہاز ایک دوسرے سے ملے تھے۔

آرمسٹرانگ دو بیٹوں کا باپ ہے۔

مائیکل کولنس:۔ ۳۸ سالہ کمانڈر تھا ڈول پائلٹ جیمنی ۱۰ کی پرواز میں پائلٹ تھا۔ اس خلائی جہاز نے ۴۷۵ میل کی بلندی پر پرواز کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اس مشین کے دوران وہ "خلا میں چلا تھا" کولنس چار بچوں کا باپ ہے۔

ایڈون آیلڈرین:۔ ۳۹ سالہ یو نرا ڈول پائلٹ میسا چوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے خلابازی میں ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کر چکا ہے جیمنی ۱۲ کی پرواز پائلٹوں میں وہ بھی شامل تھا۔ اپنی پرواز کے دوران اس نے تین مرتبہ اپنے جہاز سے نکل کر چہل قدمی اور کام کیا۔ ایلڈرین تین بچوں کا باپ ہے۔

(۳) چاند پر سفر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سفر کے لیے کل آٹھ دن درکار ہوں گے۔ غرض امریکی سائنس دانوں کا یہ منصوبہ بھی بہت کامیاب رہا۔

ان دونوں منصوبوں کی روشنی میں نیشنل ایرونا ٹکس اسپیس ایڈمنسٹریشن کے ادارہ نے تیسرا عظیم الشان منصوبہ تیار کیا۔ چاند پر انسان کو خیریت اور سلامتی کے ساتھ اُتارنا اس منصوبے کا بنیادی مقصد تھا۔

اس منصوبے کے تحت اربوں روپے کا بجٹ منظور کیا گیا اور اب جناب ایک دیو ہیکل راکٹ تیار کرنا تھا۔ یوں تو خود اس ادارے میں سینکڑوں سائنس داں سینکڑوں انجینیئر، ڈاکٹر، نفسیات کے ماہر خلا باز ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں۔ اس کی مختلف تجربہ گاہیں اور ورکشاپ ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر بھی اتنا بڑا کام اس کے بس کا نہ تھا۔ اسی لیے اس نے مختلف کاموں کو انجام دینے کے لیے دوسری فرموں کو ٹھیکے دیے۔ مثلاً خلائی جہاز کا کنٹرول روم، انجن روم تیار کرنے کا کام ایک فرم کو دیا گیا، چاندگاڑی تیار کرنے کا کام ایک دوسری فرم کو دیا گیا۔ چاند پر خلا بازوں کو زندہ رکھنے کے آلات تیار کرنے کا کام ایک دوسری فرم کو دیا گیا اور ان بڑی فرموں نے چھوٹے چھوٹے پرزے تیار کرنے کا ٹھیکا بہت سی چھوٹی فرموں کو دیا۔ غرض اس طرح ہزاروں لاکھوں لوگ اس منصوبے کو آخری منزل تک پہنچانے کے کام میں لگے ہے۔

دوسری طرف امریکی یونی ورسٹیاں بھی اس کام میں پورا پورا ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ ان یونی ورسٹیوں کے ہزاروں سائنس داں دن رات تحقیق میں لگے رہیں یوں سمجھیے کہ اس منصوبہ کی کامیابی امریکی سائنس دانوں حکومت کے اداروں صنعتی فرموں اور یونی ورسٹیوں کے مل جل کر کام کرنے کا ایک مثالی نمونہ ہے۔

اچھا اب اس خلائی جہاز کی بھی سن لو۔ اس کے تین حصے ہیں۔ ایک حصہ کنٹرول روم ہے۔ اس میں تین خلا بازوں کے رہنے اور آرام کرنے کی گنجائش ہے، دوسرا انجن روم ہے۔ اس میں مشینیں ہیں، الیکٹرانک آلات ہیں راکٹ انجن ہیں۔ تیسری چاندگاڑی ہے۔ یہ ایک خول جیسا ہے اور اس کے نیچے کی طرف مکڑی کی سی ٹانگوں کا اسٹینڈ ہے یہ چاندگاڑی دو خلا بازوں کو چاند پر اتارنے اور انھیں خلائی جہاز پر واپس لے جانے کے لیے ہے اس میں بھی راکٹ انجن، اور ٹیلی ویژن وغیرہ کا پورا انتظام ہے۔ یہ پورا خلائی جہاز چوراسی فٹ اونچا ہے۔

اور اس خلائی جہاز کو اوپر لے جانے کے لیے سچ مچ دیو ہیکل راکٹ تیار کیا گیا۔ سیٹرن ۵ اس کا نام رکھا گیا۔ اس ۳ منزل والے راکٹ کی اونچائی تین سو تریسٹھ فٹ اور کل وزن تین ہزار ٹن سے بھی زیادہ تھا۔

اس اپالو منصوبے کے سلسلے میں ایک بڑا حادثہ بھی پیش آگیا جنوری ۶۷ء میں تجربے کے لیے پہلی اڑان ہونے والی تھی۔ اچانک بجلی کے تاروں میں آگ لگی اور تین خلا باز بے چارے راکٹ کے اندر ہی ختم ہو گئے۔ سائنس والوں کو بڑا صدمہ ہوا۔ مگر ہمت نہیں ہاری۔ ہاں چوکنے ہو گئے اور بھی زیادہ احتیاط سے کام کرنے لگے۔ خلائی جہاز میں جو چھوٹی موٹی کمی یا خامیاں نظر آئیں انھیں دور کیا اور ہوا بازوں کی حفاظت کے اور بھی بہتر طریقے اختیار کیے۔

پھر اکتوبر ۶۸ء سے مارچ ۶۹ء تک اس منصوبے کے تحت تین اڑانوں کا انتظام کیا گیا۔ یہ اڑانیں بہت کامیاب رہیں۔ ان کی کامیابی سے سائنس دانوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ انسان کو چاند پر اتارنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مئی ۶۹ء کو اپالو ۱۰ چاند کے مدار تک پہنچ گیا۔ خلابازوں نے چاند کے سفر میں پیش آنے والے سارے مرحلوں کا تجربہ کیا اور چاند کے بالکل قریب پہنچ کر چاندگاڑی اتارنے کے لیے تین جگہیں بھی منتخب کر آئے۔ یوں سمجھیے کہ یہ مہم انسان کو چاند پر اتارنے کی ریہرسل تھی انتہائی کامیاب ریہرسل۔

اور اب جناب اپالو ۱۱ کو خود چاند پر لے جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس تاریخی سفر کے لیے ۱۶ر جولائی مقرر ہوئی۔ دنیا کی اہم سے اہم خبروں سے بھی یہ سب سے زیادہ اہم خبر تھی۔ ساری دنیا کے اخباروں میں اسے اہم جگہ دی گئی۔

آخر خدا خدا کر کے ۱۶ر جولائی بھی آ گئی۔ کیپ کینیڈی چھوٹا سا شہر ہے مگر یہاں لوگوں کا سیلاب امنڈ آیا۔ دوسرے ملکوں کے مہمانوں کے علاوہ لگ بھگ دس لاکھ آدمی خود امریکہ کے تھے۔ انتظام کرنے والوں کے لیے اتنی بھیڑ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ لوگوں میں بے پناہ جوش و خروش تھا۔

یہ انتظام پہلے سے کر لیا گیا تھا کہ اتنا بڑا مجمع خلائی جہاز کو زمین سے اوپر اٹھتے ہوئے آسانی سے دیکھ سکے۔ جوں جوں روانگی کا وقت آتا جاتا تھا لوگوں کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ اے لیجیے وہ تینوں خلاباز روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ پہلے آرم اسٹرانگ جہاز میں داخل ہوئے پھر کولنس اور پھر ایلڈرین اور دو گھنٹے پہلے خلائی جہاز کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ دروازہ بند کرتے وقت تماشائیوں کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔

آخر ہندوستانی وقت کے مطابق، بج کر منٹ پر اربوں کھربوں روپے کی لاگت سے تیار کیا ہوا خلائی جہاز اپنے تاریخی سفر پر روانہ ہوا۔ پہلے جہاز کے نچلے حصے میں سفید اور نارنجی شعلے بلند ہوئے اور پھر ایک ہیبت ناک گرج ہوئی۔ ایسی ہیبت ناک کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔ اس وقت تماشائیوں کے دلوں پر کچھ ہراس بھی طاری تھا۔ جہاز ایک دم اوپر اٹھا اور پھر اور اوپر، اوپر اور پھر منظروں سے غائب!

زمین کے مدار سے نکلتے ہی خلائی جہاز کی رفتار ۲۴۲۵۰ میل فی گھنٹہ ہو گئی۔ اپالو جہاز اڑتا رہا اڑتا رہا اور اڑتے اڑتے چاند کے مدار میں داخل ہو گیا اور گویا اس کی گود میں چکر لگانے لگا۔ چاند پر اترنے کا وقت قریب سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اب آرمسٹرانگ اور ایلڈرین کو خلائی جہاز سے جڑی ہوئی چاندگاڑی

خلاباز چاند کی فضا کو گندا کر دیں گے

انسان اب تک دنیا کی فضا کو گندا ہی کرتا رہا ہے لیکن اب وہ چاند کی فضا کو بھی خراب کر دے گا۔ چاند پر اترنے والے دو انسانوں نے ہی مل کر چاند کی فضا کو کافی حد تک گندا کر دیا ہے لونر ماڈل ایگل نے چاند کی فضا میں پانچ ٹن سے زائد گیس خارج کی ہے۔ یہ گیس چاند کی کل گیس کی پانچ فی صد ہے۔ چاند پر جانے والے دونوں انسانوں نے ایک ہزار کیڑے فی منٹ کے حساب سے چھوڑے ہیں۔ اسی حساب سے آرم اسٹرانگ اور ایلڈرین کل ملا کر تین لاکھ بیماری پھیلانے والے جراثیم چاند کی فضا میں چھوڑ آئے ہیں۔

میں پہنچ کر دونوں نے مشینوں کی بہت احتیاط سے جانچ کی اور انہیں اچھی طرح دیکھا بھالا۔ اور پھر اسے خلائی جہاز سے الگ کرلیا۔ اور آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے۔ اس وقت چاندگاڑی کے پانچ فٹ لمبے پیر باہر نکلے ہوئے تھے اور جیسے ہی انھوں نے چاند کو چھوا چاندگاڑی پر سگنل نے انھیں بتادیا کہ ایگل چاند پر پہنچ گیا ہے یہ ۲۱ جولائی کی بات ہے۔ ایک بج کر ۴۹ منٹ کا وقت تھا۔

مگر اس وقت یہ اپنی گاڑی سے باہر نہیں نکلے۔ دونوں نے گاڑی کی مشینوں کی پھر سے جانچ کی اور پروگرام کے مطابق سو گئے، مسلسل آٹھ گھنٹے سوتے رہے۔ آٹھ گھنٹے آرام کے بعد صبح کو آرم اسٹرانگ چاند گاڑی کا دروازہ کھول کر ایک پلیٹ فارم پر آگئے۔ یہ چاندگاڑی کے پیر پر بنا تھا۔ اس پلیٹ فارم سے سیڑھی کے ذریعے چاند پر یا چاند کی سطح پر اتر آئے صدر کینیڈی کی بات پوری ہوگئی۔

آرم اسٹرانگ اس وقت بھاری لباس پہنے ہوئے تھے اور جیسے اچھلتے ہوئے چل رہے تھے۔ یہ بات اس لیے تھی کہ چاند کی کشش زمین کے مقابلے میں کل ۱/۶ ہے۔ اسی تناسب سے ہر چیز کا وزن بھی زمین کے وزن کے مقابلے میں ۱/۶ ہے۔

آرم اسٹرانگ نے چاند پر اترتے ہی ایک پتھر اٹھالیا تاکہ انھیں واپس جانا ہو تو یہ نمونہ ان کے ساتھ ہے۔ اور پھر انھوں نے مختلف کام شروع کردیے۔ یکہ کا جھنڈا گاڑا ریفلیکٹر نصب کیا۔ ایریل لگایا تاکہ ند کی تصویریں زمین پر بھیجی جاسکیں۔

ایلڈرین ابھی اندر ہی تھے اور ٹیلی ویژن سے آرم اسٹرانگ کی تصویریں لے رہے تھے۔ اب وہ بھی باہر آگئے۔ انھوں نے چاندگاڑی کی تصویریں لیں چاند کی مٹی اور پتھر ایک خاص ڈبے میں جمع کیے اور لگ بھگ دو گھنٹے سے زیادہ چاند پر گھوم پھر کر چاندگاڑی میں لوٹ آئے۔

اب یہاں سے واپس بھی تو جانا تھا۔ انھوں نے پھر مشینوں کو دیکھا بھالا اور چاندگاڑی کو چالو کردیا۔ چاند گاڑی ان کی منشا کے مطابق چل پڑی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی ۲۲ جولائی کی رات دو بج کر ۴۴ منٹ پر چاند گاڑی اصلی خلائی جہاز سے جڑ گئی۔ یہ دونوں اس سرنگ کے راستے سے اصلی جہاز میں داخل ہوگئے اور اپنے تیسرے ساتھی کولنس سے مل گئے۔ کولنس اس تمام مدت میں چکر لگاتے رہے۔ اصلی خلائی جہاز میں داخل ہونے کے بعد چاندگاڑی کو وہیں فضا میں بھٹکتا چھوڑ دیا گیا۔

خلائی جہاز نے اب تیزی سے زمین کی طرف بڑھنا شروع کردیا۔ ۲۴-۲۵ جولائی کی درمیانی رات میں تینوں خلا بازوں نے رات کے دس بج کر دس منٹ پر سفر مکمل کرلیا۔ سمندر میں طوفان کی وجہ سے مقررہ جگہ سے چار سو میل دور اترے خیریت اور سلامتی کے ساتھ۔

ان کے کامیاب سفر نے ساری دنیا میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دی۔ ساری دنیا کے ملکوں نے مبارکباد کے تار بھیجے۔ بہت سے ملکوں کے اسکولوں میں اس دن چھٹیاں کردی گئیں۔

ہاں بھئی یہ سفر تو تمام ہوا مگر انسان کی بے چین

پنچ تنتر کی کہانیاں

جناب محمد رفیق شاستری ام اے

چوتھا تنتر

(جولائی ۱۹۶۹ء سے سلسلہ ملائیے)

ایک بڑی جھیل کے کنارے جامن کا ایک پیڑ تھا۔ اس پیڑ پر لَل مُنّھا نام کا ایک بندر رہتا تھا۔ ایک دن ایک مگرمچھ جھیل کے کنارے آیا۔ بندر نے پیڑ سے کچھ جامنیں توڑ کر نیچے پھینکیں۔ مگرمچھ نے انھیں کھا لیا۔ جامنیں بہت مزے دار تھیں۔ مگرمچھ کو بہت اچھی لگیں۔ پھر تو اس نے کنارے آکر جامنیں کھانا اپنا روز کا معمول بنا لیا۔

دھیرے دھیرے بندر اور مگرمچھ کی دوستی بڑھتی گئی۔ مگرمچھ میٹھی میٹھی جامنیں کھا کر بندر سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔ پانی کی زندگی کے حال سناتا۔ بندر بھی اس کی باتوں میں لطف لیتا۔ جامنیں توڑ توڑ کر مگرمچھ کے قریب گراتا رہتا۔ مگرمچھ خوب جی بھر کر جامنیں کھا لیتا تو پھر تھوڑی سی اپنی گھر والی کے لیے گھر لے جاتا۔

ایک دن مگرمچھنی نے پوچھا "میاں مگرمچھ تم اتنے بہت سے میٹھے پھل کہاں سے لاتے ہو؟" مگرمچھ نے یہ سن کر بندر کی اور اپنی دوستی کا قصہ سنایا اور بتایا کہ وہی بندر مجھے اتنے بہت سے پھل دیتا ہے۔

مگرمچھنی اس پر بولی "ذرا تم نے یہ بھی سوچا جو اتنے میٹھے میٹھے پھل ہر وقت کھاتا رہتا ہو اس کا دل گردہ کتنا میٹھا ہوگا۔ تو مگرمچھ میاں مجھے تو تم اس کا دل گردہ لا کر دو۔ ایک ہی دفعہ میں سارا مزا لے لوں۔"

مگرمچھ نے کہا "ایسی بات نہ کہو۔ اب تو وہ میرا منہ بولا بھائی بن چکا ہے۔ میں اس کا دل گردہ حاصل کرنے کے لیے اس کی جان نہیں لے سکتا۔"

مگرمچھنی اس پر بہت خفا ہوئی۔ کہنے لگی "آج تک تم نے میری کوئی بات نہیں ٹالی۔ آج یہ کیا نئی بات کر رہے ہو۔ کیا مجھ سے زیادہ تمھارا اس سے لگاؤ ہے۔ مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔"

مگرمچھ مجبور ہو گیا۔ اس نے مگرمچھنی کو پاس بلا کر کہا۔ "میں تم سے زیادہ اس دنیا میں کسی سے محبت نہیں کرتا۔ تم کو اس طرح سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔"

مگرمچھنی روہانسو ہو کر بولی "یہ سب بناوٹ کی باتیں ہیں۔ اگر تمھیں مجھ سے سچ مچ اتنا پیار ہوتا تو ایک نگوڑے بندر کا دل گردہ لانے کی ذرا سی فرمائش تم اس طرح

کبھی نہ لاتے۔ میں بھی اپنی ضد کی پکی ہوں۔ جب تک تم مجھے اس بندر کا دل گردہ لاکر نہیں دیتے میں قسم کھاتی ہوں کہ اس وقت تک ایک بھی دانا منہ میں نہ ڈالوں گی چاہے اسی طرح بھوکی کیوں نہ مر جاؤں۔"

مگرمچھنی کی اس دھمکی کے بعد مگرمچھ پس و پیش میں پڑگیا۔ دوسرے دن وہ بہت اداس دل سے بندر کے پاس پہنچا۔ بندر نے مگرمچھ کو اداس دیکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے دوست آج کچھ خوش نہیں دکھائی دے رہے ہو۔"

مگرمچھ بولا "کیا بتاؤں دوست آج تمھاری بھابی نے بہت ملامت کی ہے۔ کہتی ہے "تم روز روز جامنیں لے آتے ہو اور کبھی اپنے دوست کو گھر نہیں لاتے۔ دوست کی خاطر نہ کرنا وہ گناہ سمجھتی ہے۔ اس نے آج ضد کی ہے کہ میں تمھیں آج اپنے گھر لے چلوں۔ وہ آج گھر پر تمھارا انتظار کر رہی ہے۔" بندر بولا "دوست مجھے جانے سے انکار نہیں۔ مگر میں تو زمین پر ہی چل سکتا ہوں۔ پانی میں تیرنا میرے بس کا نہیں۔ تم پانی میں رہنے والے میں تمھارے گھر جاؤں گا کیسے ؟"

مگرمچھ نے کہا "بھلا یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔ تم میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں جھیل کی سیر کراتا ہوا گھر پہنچا دوں گا۔"

یہ سننا تھا کہ بندر اچھل کر مگرمچھ کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ مگرمچھ پانی کاٹتا ہوا بیچ دھار میں پہنچ گیا جھیل کی سیر کا بندر کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ لہروں کے تھپیڑوں کے درمیان اس طرح گھومنے سے بندر بہت خوش ہوا۔ وہ مگرمچھ سے کہنے لگا "بھائی مزہ آگیا۔ مگر تم ذرا اور آہستہ چلو تاکہ میں پانی کے تھپیڑوں سے بھیگوں نہیں ؟"

مگرمچھ بولا "بھئی ابھی کیا مزہ آیا ہے۔ مزہ تو اب آنے والا ہے۔ اللہ کو یاد کرو۔ تمھارا آخری وقت قریب آرہا ہے۔"

بندر بولا "بھئی یہ اس طرح کے مذاق کا وقت نہیں۔ آج میں پہلی بار جھیل کی سیر کو نکلا ہوں۔ ذرا اچھی طرح سیر کراؤ۔"

مگرمچھ نے کہا "میاں میں مذاق کب کر رہا ہوں۔ بس اب چند لمحے کی بات ہے۔ خوب جی بھر کر لطف لے لو۔ پھر کہاں موقع رہے گا۔ میں ایک بار ڈبکی لگاؤں گا اور تم سدا کے لیے سو جاؤ گے۔"

اب تو بندر میاں سچ مچ گھبرا گئے۔ کہنے لگے "مگر بھائی تم ایسا کیوں کرو گے۔ میں نے تمھارے ساتھ کیا برائی کی ہے جو تم اس طرح دغا کر رہے ہو۔ تم مجھے کیوں جان سے مارنا چاہتے ہو۔"

مگرمچھ بولا "کیا بتاؤں دوست۔ میری گھر والی تمھارے میٹھے دل گردے کھانا چاہتی ہے۔ اب میں تمھیں جان سے مار کر دل گردہ نکال لوں گا۔ اسے کھا کر میری گھر والی مجھ پر پھر سے مہربان ہو جائے گی۔"

بندر تھا عقل مند۔ یہ بات سن کر وہ بالکل نہیں گھبرایا۔ اور بہت اطمینان سے کہنے لگا "مگر بھائی مگرمچھ تمھیں تو یہ بات مجھے پہلے بتانی چاہیے تھی۔ میں

ہمیشہ اپنے دل گردے پیڑ کی شاخ کی ایک کھوہ میں رکھتا ہوں۔ تم نے کہا ہوتا تو میں یہ دل گردے اپنی بھابی کے لیے تمھیں وہیں دے دیتا۔ اس وقت تو میرے پاس دل گردہ ہے نہیں۔ تم بھابی کو آخر دو گے کیا؟"

مگرمچھ تھا بیوقوف بندر کی بات سن کر وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہنے لگا "چلو واپس چلتے ہیں تم جامن کے پیڑ پر سے لاکر اپنا دل گردہ مجھے دے دینا۔ میری گھر والی اسے کھائے گی تو اسے چین آجائے گا۔"

یہ کہہ کر مگرمچھ کنارے کی طرف لوٹ پڑا اور جیسے ہی پیڑ کے قریب پہنچا۔ میاں بندر تیزی سے دوڑ کر پیڑ کے اوپر چڑھ گئے۔ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ پیڑ پر چڑھ کر جیسے نئی زندگی پائی ہو۔ میاں بندر پیڑ پر بیٹھ کر مگرمچھ کو انگوٹھا دکھانے لگے۔

مگرمچھ میاں سمجھے کہ بندر مذاق کر رہا ہے۔ کہنے لگے "بھائی بندر جلدی آؤ گھر پر تمھاری بھابی انتظار کر رہی ہو گی۔"

بندر نے اسی طرح انگوٹھا دکھا کر کہا "بیوقوف کہیں کا۔ دھوکا دیتے چلا تھا۔ بھلا تو نے یہ نہیں سوچا کہ کسی کا دل گردہ کہیں باہر نہیں رکھا ہوتا۔ جسم کے اندر ہی رہتا ہے۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے واپس چلے جاؤ۔ اور پھر کبھی ادھر نہ آنا۔"

مگرمچھ بہت شرمندہ ہوا کہنے لگا "بھائی وہ تو مذاق کی بات تھی۔ تم برا مان گئے۔ خیر ہماری تمھاری دوستی میں فرق نہیں آنا چاہیے۔ تم اطمینان سے ہمارے گھر مہمان بن کر چلو۔ تمھاری بھابی وہاں تمھاری بہت خاطر کرے گی۔"

مگر بندر نے مگرمچھ کی ایک نہ سنی کہنے لگا۔
"میں ایک بار بہلاوے میں آگیا۔ بار بار نہیں آنے والا ہوں۔"

بندر کے اس انکار سے مگرمچھ بہت دکھی ہوا۔ کہنے لگا "بھئی اگر میرے ساتھ نہیں چلنا چاہتے ہو تو نہ چلو مگر دو چار میٹھی جامنیں تو پھینک دو۔ تمھاری طرف سے سوغات سمجھ کر وہی لیے گھر لے جاؤں گا۔"

مگر بندر نے پھر انگوٹھا دکھا دیا اور کہنے لگا۔
"اب ہماری تمھاری دوستی ختم۔ جھوٹے آدمی کا کوئی بھروسا نہیں۔ ایک بار دھوکا کھانے کے بعد دوبارہ تم پر بھروسا نہیں کروں گا، جس طرح گنگادت مینڈک نے نہیں کیا تھا۔"

مگرمچھ تھا تو اداس مگر بندر سے کچھ دیر بات چیت جاری رکھنے کی خاطر پوچھ بیٹھا "بھائی بندر یہ گنگادت کی کیا بات کہی تم نے۔"

بندر نے کہا "سنو گے؟"
مگرمچھ نے کہا "کیوں نہیں۔"
تب بندر نے مینڈک کی یہ کہانی سنائی۔

(گنگادت مینڈک کی دلچسپ کہانی اگلے پرچے میں پڑھیے)

محترمہ درزانہ وقار

خلا کا مُسافر

شکیل روز آسمان پر بکھرے ہوئے چمکتے ستاروں کو دیکھا کرتا، اور اکثر جی میں سوچا کرتا کہ کسی طرح آسمان کی سیر کرنے کو مل جائے، تو کیسا مزہ آئے۔
اس کی امی نے اُسے بتایا تھا کہ آج کل لوگ چاند پر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور بڑی امی کا کہنا تھا کہ چاند میں ایک بڑھیا رہتی ہے اور یہ بڑھیا وہاں بیٹھی بیٹھی چرخہ کاتا کرتی ہے۔

ایک روز شکیل اپنے بستر سے اٹھا اور کہیں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کی بہن ثریا نے دیکھا تو وہ بھی جلدی سے اٹھی اور شکیل سے پوچھنے لگی:-
"بھائی جان! آج آپ اس قدر سویرے سویرے کہاں جانے کی تیاری کر رہے ہیں"
شکیل نے کہا: "وہ دیکھو وہ جو آسمان میں ایک سفید لکیر سی نظر آ رہی ہے نا وہ ہوا کا ایک غبارہ ہے۔ یہی میرا راکٹ ہے۔ میں اس میں سوار ہو کر خلا کے سفر پر جا رہا ہوں۔ چلو! تم بھی میرے ساتھ چلو"
چند لمحوں بعد خلا کا مسافر فضا میں اُڑ رہا تھا۔
وہ اس طرح سوار ہوا جیسے اپنے ہاتھ پاؤں سے چل رہا ہو، بلکہ کسی نے اسے اٹھا کر جیسے راکٹ میں رکھ دیا ہو۔ وہ اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ بھلا اس ننھی کرن میں اس قدر طاقت کہاں سے آتی ہے جو ایک بھاری بھرکم انسان کو اوپر اڑائے جائے۔

اور اب جو شکیل نے سر جھکا کر دیکھا تو پہاڑ کے دامن سے سورج نکل رہا تھا۔ شکیل میاں خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے۔ جیسے سائنس کی دنیا میں کوئی بہت بڑی دریافت کر لی ہو۔

"اچھا تو سورج دادا یہاں رہتے ہیں"۔ ثریا نے بھی جھانک کر دیکھا، اودی اودی جھیلیں اونچے اونچے پربت اور ایک بہت بڑا میدان دکھائی دیا۔ اوپر کی طرف خلا میں کئی رنگوں کی روشنیاں تھیں۔

ان ظاہری شکلوں میں ایک "بڑے بھالو" کی شکل کا بھی تھا۔ یہ "بڑا بھالو" قطب تارے کے قریب تھا۔ بڑے بھالو کے متعلق ان دونوں نے طرح طرح کی کہانیاں سن رکھی تھیں اور وہ جو کئی رنگوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں، وہ کہکشاں تھی۔

اسے روسی کہانیوں میں سے، "تین بھالوؤں

والی کہانی یاد آئی - ایک بچی اپنے گھر سے جنگل کی طرف نکل جاتی ہے۔ جنگل میں راستہ بھٹک جاتی ہے۔ اور گھر کی طرف جانے والی سڑک ڈھونڈھنے لگتی ہے۔ بے چاری کو راستہ نہیں ملتا۔ اور وہ جنگل میں ایک چھوٹے سے مکان کی طرف چلی جاتی ہے۔ دروازہ کھلا ہوتا ہے بچی دروازے میں سے اندر کی طرف جھانکتی ہے۔ مکان میں کوئی بھی نہیں تھا وہ اندر چلی جاتی ہے اصل میں یہ مکان تین بھالوؤں کا تھا۔ اس وقت وہ تینوں جنگل کی سیر کو گئے تھے۔

مکان میں دو کمرے تھے۔ ایک کھانے کا دوسرا سونے کا۔ بچی کھانے کے کمرے میں گئی اور وہاں رکھی ہوئی کھانے کی ساری چیزیں چٹ کر گئی۔ پھر سونے کے کمرے میں جاکر سو گئی۔ تھوڑی دیر میں تینوں بھالو آئے اور انھوں نے شور مچایا "میرے پیالے میں کس نے کھایا؟" چھوٹے بھالو نے کہا۔ میری کرسی پر کون بیٹھا اور کس نے اسے جگہ سے بے جگہ کیا؟" تیسرے بھالو نے کہا "میرے بستر پر کون لیٹا اور کس نے اسے خراب کیا؟" ایک دم ان کی نظر بچی پر پڑی اور وہ بری طرح چیخے جیسے کوئی انھیں مارے ڈال رہا ہے۔ اتنے میں بچی کھڑکی میں سے کود، یہ جا وہ جا۔

اس کا دھیان ابھی اسی کہانی کی طرف تھا کہ اچانک خلا کی شہزادی نمودار ہوئی۔ وہ پوچھنے لگی "تم دونوں کون ہو کہاں جا رہے ہو؟" اس کے مسکراتے ہونٹوں سے جیسے پھول جھڑ رہے تھے۔

شکیل نے سہمے ہوئے لہجہ میں کہا "میں خلا کا مسافر ہوں۔ چاند کی سیر کرنے جا رہا ہوں۔"

شہزادی پیار بھرے لہجہ میں بولی "یہ تو بڑا اچھا ارادہ ہے۔ اچھا تو بھئی وہ دیکھو! وہ جو اونچا سا ٹیلہ نظر آتا ہے یہی چاند ہے۔ یہ ایک بہت بڑا گولہ ہے۔ دن کے وقت جب اس پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو خوب گرم ہو جاتا ہے۔ تمہاری زمین کی طرح چاند کے گولے کے چاروں طرف ہوا کا حلقہ تو ہے پر بہت کم زور ہے اتنا طاقت ور نہیں ہے جو اس گرمی کو روک لے یا کم کر دے۔ اس لیے اتنا تپتا ہے اتنا تپتا ہے کہ آگ بن جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دہکتی ہوئی آگ کا ڈھیر ہو۔ ان کرنوں کی بدولت یہ روشن بھی ہو جاتا ہے۔ تم زمین والوں سے دور ہے اس لیے تم لوگوں کو اس کی صرف روشنی نظر آتی ہے۔ لیکن تم گھراؤ نہیں۔ اس آگ سے تم جلوگے نہیں۔ چاند کی روشنی بڑی روپہلی اور ٹھنڈی ہوتی ہے۔"

یہ سن کر شکیل مسکرایا اور بولا "ہاں سورج سے تو ہمارے چندا ماما ہی بھلے۔ سورج دادا کی گرم گرم دھوپ سے تو خدا بچائے۔ ذرا گھر سے نکلے، میدان میں آئے اور پسینے میں نہا گئے۔"

پھر شہزادی نے خلا میں نیلے ساگر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ دیکھو یہ آسمان ہے۔ یہ آسمان ایک بڑا اور ٹھوس گنبد ہے جس میں چاروں طرف ستاروں کو جڑ دیا گیا ہے اور شاید تم زمین والوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یہ ستارے دراصل وہ نیک انسان یا جانور ہیں جنھوں نے زمین پر اچھے کام کیے تھے۔ مرنے کے بعد انھیں ستاروں کا روپ دے دیا گیا۔ اور یہ آسمان پر

ہمیشہ یونہی چمکتے رہیں گے۔

شکیل نے مڑکر دیکھا تو شمسی، کمال اور گڈو بھی چاند میں موجود تھے۔ ان سب کو دیکھ کر شکیل نے چاند سے کہا۔

"اے چاند! تیری دنیا کتنی خوب صورت ہے اور اس سے بھی خوب صورت تیری زمین ہے۔ تیرے جہاں کے بچے من کے سچے ہوتے ہیں۔ اور یہاں کی ہر ننھی منی بچی ایک خوب صورت شہزادی ہے۔"

"اے چاند! تیری دنیا کتنی اچھی ہے۔ نہ یہاں ایٹم بموں کا دھماکا ہے نہ انسانی خون کا کوئی قطرہ بہتا ہے۔ تیری زمین سچ مچ امن کی جنت ہے۔ یہاں ظلم وستم سے کوئی تنگ نہیں۔ ہر شخص لڑائی سے بے زار ہے اور ہر دل میں یقین کی شمع روشن ہے۔"

چاند نے دھرتی کی کوکھ سے پیدا ہونے والے بچوں کی آواز سنی کہنے لگا۔

"بچو! تمھاری دنیا کا انسان ابھی ظالم ہے۔ ——— ظلم اور سرکشی بڑھتی جارہی ہے اس کے دل میں نفرت ہے۔ وہ پیار اور دوستی کو بھول چکا ہے۔ جب وہ اپنے دل کی کتاب پڑھے گا تو دوستی اور محبت کی حقیقت سمجھے گا۔ اور ہمارے ساتھ، نیکی، سچائی اور انسانیت کی راہ پر قدم بڑھا سکے گا۔ تم زمین والوں سے جاکر کہنا کہ جب تک وہ اپنے اندر یہ خوبیاں پیدا نہ کریں گے۔ چاند کو فتح کرنے کی ان کی ساری کوششیں ناکام رہیں گی۔"

"بچو! وطن کا مستقبل تمھارے شانوں پر ہے۔ تم میں سے ہر ایک اپنے وطن کے لیے، قوم کے لیے، آنے والے کل کے لیے، بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان ذمہ داریوں کے لیے اگر تم ابھی سے اپنے آپ کو تیار نہ کروگے، تو تمھیں قوم و وطن کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔"

"مجھے یقین ہے تم اپنی نیکی اور سچائی کے اصولوں پر قائم رہ کر اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں حصّہ لوگے۔ اور زمین سے ظلم اور ناانصافی کے اندھیروں کو دور کروگے۔"

اتنے میں جہاز سے زمین کے وائرلیس کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ شکیل نے نیچے جھانک کر دیکھا تو تمام لوگ، بچے اور بوڑھے اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھے ہوئے فضا میں راکٹ کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وائرلیس والے پوچھ رہے تھے "تم کون ہو، کہاں سے آرہے ہو؟" "خطرہ خطرہ"

شکیل نے گھبرا کر اپنی سیٹ کی طرف دیکھا تو جہاز کا راڈر سسٹم خراب ہو چکا تھا۔ خلا کی شہزادی غائب ہو چکی تھی۔ اور جہاز زمین کی طرف گر رہا تھا۔ یہ راکٹ اوندھا ہو کر زمین پر گرنے والا تھا کہ یک بہ یک گھبرا کر شکیل کی آنکھ کھل گئی۔

صبح ہو گئی تھی۔ سورج کی سنہری کرنیں پہاڑ کی چوٹیوں کو سونے کا تاج پہنا رہی تھیں۔ ہر چیز میں ایک نئی خوشی نظر آرہی تھی۔ اور پرندوں کے نغمے فضا میں گونج رہے تھے۔ اور پہاڑ کی ڈھلانوں سے روشنی کے آبشار بہہ رہے تھے۔ اس کے سرہانے کھڑی اس کی امی کہہ رہی تھیں "شکیل اٹھو!"

تنگ کالر سے آپ کا دم گھٹتا ہے؟ 'سینفورائزڈ' کی مدد لیجئے اور مسٹر شرنک کے شکنجہ سے آزاد ہو جیئے!

آپ کی قمیص یا قمیص کا کالر دھلنے کے بعد سکڑ کر تنگ نہ ہوگا اگر وہ ایسے سوتی یا سوت ملے کپڑے سے بنایا گیا ہے جس پر 'سینفورائزڈ' کی چھاپ ہوتی ہے۔ یہ ٹریڈ مارک آپ کے کپڑے نہ سکڑنے کی گارنٹی ہے۔ 'سینفورائزڈ' چھاپ والے کپڑے کو سلائی سے پیشتر پانی میں بھگونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ 'سینفورائزڈ' کا شہرت یافتہ نام بھارت میں بنے ہوئے کپڑے کی برآمدگی بڑھانے میں قابل قدر امداد کرتا ہے۔
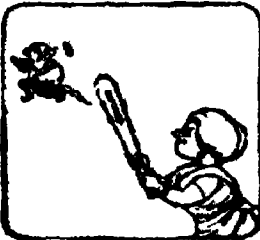
رجسٹرڈ ٹریڈ مارک 'سینفورائزڈ' کے مالکان کلیوئٹ پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو-ایس-اے میں قائم شدہ) نے جاری کیا۔ اس ٹریڈ مارک کا استعمال صرف اس حالت کے ہوئے کپڑے پر کیا جاتا ہے یا کرنے کی اجازت ملا جاتا ہے جو نہ سکڑنے کی کمپنی کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہے۔

جناب جاوید اشرف

آدمی سب سے بڑا ہوتا ہے!

میستا نام کا اِک آدمی رہتا تھا دِلّی میں کیا کرتا تھا مزدوری گزر ہوتی غریبی میں
بڑا ہی سست تھا وہ شیخ چلّی سے نہ کچھ کم تھا اسے دن رات اپنے کام کرنے کا بہت غم تھا
یہی تھا سوچتا ترکیب کوئی ایسی ہو جائے کہ جس سے میرے قبضے میں کوئی جن بھوت آجائے
مزے آجائیں میرے، کام سارا جن کرے میرا اُڑاؤں خوب دعوت ڈٹ کے، سارا غم مٹے میرا
یہی رہتا تھا اس کو دھیان، ہردم ہر گھڑی ہر پل اسی اُلجھن میں رہتا تھا ہوا تھا وہ بہت بے کل
بہت چھانی فقیروں کے دروں کی خاک بھی اُس نے نہ چھوڑا کوئی بھی سادھو اگر پایا پتا اس نے
مِلا وہ مولوی صاحب سے بھی حال ان کو بتلایا مگر منتر نہ کوئی بھی اُسے ایسا بتا پایا
کہ جس منتر سے جن قبضے میں آجائے میستا کے دِلدّر دور ہو جائیں مٹیں سب غم میستا کے

خدا کی شان اِک دن ان میستا کو مِلا سادھو بتایا جس نے جن قبضے میں کرنے کا انھیں جادو
مگر یہ بھی کہا "یہ جن بڑا سرکش ہے ضدی ہے اسے بس کام ہے مطلب اسے دھن کام ہی کی ہے
کوئی بھی کام ہو، جو کچھ بھی کروانا ہو، کروا لو ذرا سی دیر میں کر دیتا ہے، کیسا ہی مشکل ہو
اگر تم نے نہ کوئی کام بتلایا تو پھر تم کو ہڑپ کر جائے گا یہ جن تمھیں یہ بھی سمجھ رکھو"

مسیتا تو خوشی کے مارے جامے میں نہ تھے اس دم بلا کچھ سوچے سمجھے کہہ دیا سادھو سے یہ فوراً
کہ میرے پاس بے حد کام ہیں کچھ فکر مت کیجیے مجھے تو بس وہی جادو وہی منتر بتا دیجیے"

میتا آ گئے گھر سیکھ کر جادو بھرا منتر اِدھر حاضر ہوا جن جب مسیتا نے پڑھا منتر
کڑک کر بولا: "کیا تکلیف ہے تم کو سناؤ تو پڑا ہے کام ایسا کونسا مشکل بتاؤ تو"
مسیتا بولے: "میرے واسطے کھانا کرو حاضر" ابھی منہ سے نہ نکلا تھا کہ کھانا ہو گیا حاضر
مسیتا نے کہا: اِک گھر بھی عالیشاں بنا لاؤ اور اس کو قیمتی سامانِ زینت سے سجا لاؤ
نہ ہو ہرگز کسی شے کی کمی میرے لیے اس میں نہ ہو تکلیف اِک رتی برابر بھی مجھے اس میں
ذرا سی دیر میں جن نے کیا حاضر مکاں لاکر مسیتا ہو گئے خوش جس گھڑی دیکھا انھوں نے گھر
وہ جن کہنے لگا ان سے مسیتا جب گھسے گھر میں اِدھر جاتے کہاں ہو؟ یہ بتاؤ کیا کروں اب میں
اِدھر اب جن کہہ رہا تھا میں ابھی تم کو بتاتا ہوں بتاؤ کام اب مجھ کو، نہیں تو تم کو کھاتا ہوں
مسیتا کی تو سٹی ہو گئی گم سٹپٹائے وہ نہ تھا اب کام کوئی پاس ان کے کیا بتائیں وہ

یہی دو کام تھے جن کے لیے جادو یہ سیکھا تھا کہ رہنے کو ملے عمدہ مکاں کھانے کو تر لقمہ
یہ دونوں کام جن نے کر دیے اِک آن واحد میں مسیتا سوچتے ہی رہ گئے اب کیا بتاؤں میں
مگر تھے آدمی چالاک، یہ ترکیب کر بیٹھے کہا جن سے کہ اِک کتا پکڑ لا جا کے جلدی سے
ہوئی تھی دیر کہنے کی کہ جن کتا بھی لے آیا مسیتا سے سوال اپنا وہی پھر اس نے دہرایا
مسیتا ہنس کے یہ بولے: "ٹھہر جاؤ بتاتا ہوں ابھی تم کو میں اِک بے حد ضروری کام دیتا ہوں"
کہا یہ اور دُم کتے کی جھٹ سے کاٹ لی اُس نے کٹی دم دے کے کتے کی مسیتا نے کہا جن سے
سنو تم! کام یہ بے حد ضروری ہے، اِدھر آؤ یہ دُم کتے کی ٹیڑھی ہے ذرا سیدھی تو کر لاؤ
یہ جب ہو جائے سیدھی تب اِسے تم مجھ کو دے دینا میں اس کے بعد تم کو کام دوں گا اس کو تم کرنا
کہا جن نے ابھی کرتا ہوں یہ بھی کام ہے کوئی بھلا اِک دم کو سیدھا کرنا مشکل کام ہے کوئی
یہ کہہ کر اس نے دم کو دوسری جانب سے کچھ موڑا سرے دونوں پکڑ کر یوں مسیتا سے وہ جن بولا
کہ لیجے ہو گئی سیدھی یہ دُم، کیا کام مشکل تھا ذرا سا کام تھا یہ بھی کوئی کرنے کے قابل تھا
مگر جیسے ہی دُم اس نے تھی اپنے ہاتھ سے چھوڑی تو وہ پھر ہو گئی ٹیڑھی کہ جیسے پہلے تھی ٹیڑھی
گرج کر یہ مسیتا نے کہا: "ہم سے مذاق! اچھا ابھی تجھ کو چکھاتا ہوں مزا۔ تو پاس کو تو آ"

بہت اب تو ڈرا جن اس نے جب یہ ماجرا دیکھا   خوشامد سے وہ یوں کہنے لگا: "مالک بہت اچھا
میں دم جب سیدھی ہو جائے گی تب ہی آپکو دونگا   نہ ہرگز اس سے پہلے اِک گھڑی آرام میں لوں گا
مسیتا بولے غصّہ سے کہ کرتا ہے ہنسی مجھ سے   خبردار ایسی حرکت پھر نہ سرزد ہو کبھی تجھ سے
بڑا کاہل ہے تو، لگتا نہیں دل کام میں تیرا   ذرا دُم سیدھی کر دے یہ ضروری کام ہے میرا
بیچارہ جن گیا پھر بیٹھ چپ چاپ ایک کونے میں   اور اس کے بعد پھر سے لگ گیا دُم سیدھی کرنے میں
وہ جب تک دم کو پکڑے رہتا تب تک سیدھی رہتی تھی   مگر جوں ہی وہ اس کو چھوڑتا پھر ٹیڑھی ہو جاتی
کئی دن تک وہ اپنے ہاتھ سے تھامے رہا دُم کو   مگر جب چھوڑ کر دیکھا تو ٹیڑھا پایا اُس دُم کو
بہت گھبرایا اب تو جن، لگا خود سے وہ یوں کہنے   بڑی مشکل میں، مَیں تو پڑ گیا۔ یہ کیا کیا میں نے
خدا معلوم۔ دم سیدھی بھی ہوگی یا نہیں ہوگی   مجھے تو ایسا لگتا ہے میری چھٹی نہیں ہوگی
رہا بھوکا پیاسا، اِک مہینے کچھ نہیں کھایا   مگر جب چھوڑ کر دیکھا تو دم کو ٹیڑھا ہی پایا
بالآخر تھک گیا وہ بھوک سے آنکھوں میں دم آیا   تو پھر ناچار ہو کے وہ مسیتا کے قریب آیا
اور اس سے سر جھکا کر یہ کہا مالک۔ مرے آقا   میں اس کتے کی دُم کو سیدھی کرنے سے تو باز آیا
یہی وہ کام ہے مجھ سے جو ہرگز ہو نہیں سکتا   میں ورنہ کون کام ایسا ہے جو کہ نہیں سکتا
مسیتا نے کہا بس بس، نہ تو باتیں بنا بڑھ کے   بہت ہے کام چور اب دور ہو جا میری نظروں سے
بہت شرمندہ ہو کے جن یہ بولا اب میں جاتا ہوں   یہ جتنا مال و دولت ہے سبھی کچھ نذر کرتا ہوں
اگر مجھ سے یہ دُم والا بھی پورا کام ہو جاتا   تو اس کے بعد میں کچھ اور کرنے کے لیے کہتا
مقدّر سیدھا گر ہوتا ہرا سکتی نہ دم مجھ کو   ہڑپ کر جاتا اِک پل میں نہ دیتا وقت میں تم کو
مگر میں کیا کروں تقدیر ہی میری بنی کھوٹی   مہینا بھر رہا بھوکا، نہیں اِک کھیل بھی پہنچی
گرہ سے اِک مکاں دینا پڑا تم کو الگ وہ ہے   اور اتنا ڈھیر سا غلّہ ہزاروں ہی، روپے پیسے
خدارا اب اجازت دیجیے مجھ کو میں جاتا ہوں   یہ اپنی ٹیڑھی دم لے لیجیے مجھ سے میں جاتا ہوں
پکڑتا ہوں میں اپنے کان اب واپس نہ آؤں گا   نہ آئندہ کبھی آ کے تمھیں ہرگز ستاؤں گا
مسیتا نے کہا جاتا تو ہے اِک بات سنتا جا   ہڑپ کر جائے تو دنیا کو ایسا ہو نہیں سکتا
چلا جا، دور ہو جا، تو مری نظروں سے اے ناداں   مگر اتنا سمجھ لے تو، بڑا جلّاد ہے انساں

زیادہ ہر کسی سے تین پانچ اچھی نہیں ہوتی
کوئی چانٹا جما دے گا تو گر جائے گی بتیسی

مئی اور جون کے تپتے ہوئے دنوں کے بعد جب بوندا باندی ہوتی ہے یا خوب کھُل کے بارش ہوتی ہے تو زمین کو شاید ایسا ہی لگتا ہوگا جیسے آپ کو پیاس کی حالت میں ٹھنڈا میٹھا شربت ! بارش سے پہلے زمین کیسی روکھی پھیکی سی لگتی ہے اور آسمان پر کتنا غبار کتنی دھول چھائی رہتی ہے۔ لیکن بارش ہوتے ہی سب کچھ نکھر جاتا ہے۔ زمین جیسے سنور جاتی ہے۔ چاروں طرف ہریالی بکھر جاتی ہے۔

اور آسمان ــــــ ! آسمان کی تو بات ہی نہ پوچھیے۔ بارش کے دنوں میں بادلوں سے گھرا آسمان کتنا پیارا لگتا ہے۔ اور یہی بادل جب پانی کی بوندیں زمین پر برسانے لگتے ہیں تو یہی جی چاہتا ہے کہ بارش میں بھیگتے رہیں۔ سڑکوں پر پھیلے پانی میں کھیلتے رہیں۔ بارش کا وہ پانی جو بادلوں سے گرتا ہے خوب صاف ہوتا ہے پر جب زمین پر گرتا ہے تو مٹی میں مل کر گدلا ہو جاتا ہے۔

اُتری بھارت میں برسات کا موسم پندرہ جون سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ پندرہ جون کو بارش ہو ہی جائے۔ بارش تو بھی جبھی ہوگی جب مانسون آئے گا۔ بنگال، بہار، اڑیسہ، اتر پردیش، دِلی، پنجاب مدھیہ پردیش، اور تمام پہاڑی علاقہ میں اسی مانسون سے بارش ہوتی ہے۔

یہ مانسون بنگال کی کھاڑی سے اٹھتا ہے۔ ہمالیہ پہاڑ سے ٹکرا کر واپس ہوتا ہے اور سب جگہ جل تھل کر دیتا ہے۔ بنگال، بہار، آسام وغیرہ بنگال کی کھاڑی کے بالکل قریب ہیں۔ اس لیے وہاں سے شروع ہونے والے مانسون بادل اس علاقہ میں خوب برستے ہیں۔

آسام میں ایک جگہ چراپونجی ہے ــــ پورے دیس میں سب سے زیادہ بارش اسی چراپونجی میں ہوتی ہے۔ سال میں ۵۰۰ انچ یعنی ۱۲۵۰ سینٹی میٹر سے زیادہ بارش کا اوسط ہے۔ اور اس کے بالکل الٹ، راجستھان کے علاقہ میں سال بھر میں بیس انچ بھی بارش نہیں ہوتی۔ بارش کی کمی کی وجہ سے ہی راجستھان ریگستان بن گیا ہے۔ اگر کسی علاقہ میں بارش کی مسلسل کمی رہے تو چاہے وہ علاقہ کتنا ہی ہرا بھرا اور اُپجاؤ ہو، دھیرے دھیرے ریگستان بن جاتا ہے۔ اسی طرح کسی ریگستان میں لگاتار بارش ہونے لگے تو وہ دھیرے دھیرے لہلہے کھیتوں میں بدل جاتا ہے۔

ہمارے دیس میں عرب ساگر سے آنے وا

مانسونی ہواؤں سے بھی بارش ہوتی ہے۔ مہاراشٹر، گجرات، میسور اور دکھنی بھارت میں اسی عرب ساگر سے اٹھنے والے مانسون سے بارش ہوتی ہے اور اتری بھارت کے مقابلے میں دو تین ہفتے پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے۔

تو جناب چراپونجی میں تو لگ بھگ ۵۰۰ انچ بارش ہوتی ہے اور راجستھان میں بیس انچ سے بھی کم۔ شاید آپ سوچتے ہوں یہ کیا معاملہ ہے۔ بھلا بارش بھی انچوں میں ناپی جا سکتی ہے۔ ہاں بھئی ناپی جا سکتی ہے اور ناپی جاتی ہے۔ بارش کو ناپنے کے لیے ایک بوتل سی ہوتی ہے۔ اس کو انگریزی میں رین گیج کہتے ہیں۔ اس بوتل کے منھ اور نلی کی گولائی برابر ہوتی ہے۔ بارش کے وقت اس بوتل میں پانی اکٹھا ہوتا رہتا ہے اور بوتل پر لگے نشانوں سے پتہ لگایا جاتا ہے کہ کتنی بارش ہوئی۔ سال بھر ہونے والی بارش کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور ان کو جوڑ کر معلوم کیا جاتا ہے کہ سال بھر میں کتنی بارش ہوئی۔ آسان طریقے سے یوں سمجھیے کہ سال بھر میں تیس انچ بارش کا مطلب یہ ہے کہ اگر سال بھر ہونے والی بارش کا پانی نہ تو بھاپ بن کر اڑے نہ زمین میں سمائے بلکہ ٹھہرا رہے تو سال بھر میں زمین پر تیس انچ پانی پھیل جائے۔

بارش کے دنوں میں آپ خبریں سنتے یا پڑھتے ہوں گے کہ دیس کے مختلف علاقوں میں باڑھ آگئی یا سیلاب آگیا ہے اور اس سے بھاری نقصان ہوا ہے اور آپ جی میں کہتے ہوں گے کہ بارش تو بڑے نقصان کی چیز ہے۔ لیکن بارش سے ہونے والا یہ نقصان، بارش سے ہونے والے فائدوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔

جو سچ پوچھیے تو بارش کی وجہ سے ہی ہم کو کھانے پینے کو ملتا ہے ـــــ جی ہاں ـــــ مطلب یہ کہ ہمارے دیس میں زیادہ تر کھیتی بارش کے سہارے ہی ہوتی ہے۔ سینچائی کے لیے ندیوں اور تالابوں میں پانی بھی بارش کی وجہ سے رہتا ہے اور دھرتی کی زمین بارش کی بدولت اپجاؤ رہتی ہے۔ پینے کا پانی چاہے وہ ہمارے نلوں میں کسی ندی سے آئے یا کنویں سے نکالا جائے بارش ہی کا ہوتا ہے۔ بارش ہوتی ہے تو پانی زمین میں سماتا رہتا ہے اور زمین کے نیچے رہنے والا پانی آسانی سے ہم کو کنوؤں اور ہاتھ کے نلوں کے ذریعے مل جاتا ہے۔ ریگستانی علاقوں میں تو پانی زمین کے نیچے اتنی دور ہوتا ہے کہ اس کو نکالنا آسان نہیں۔

اب آپ کے دل میں یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ بارش ہوتی کیسے ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ زمین پر پھیلا ہوا پانی بھاپ بن بن کر اڑتا رہتا ہے اور وہ بھاپ اوپر اٹھ کر اوپر کی ہواؤں میں ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے جم کر بادلوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے پھر انھی بادلوں سے بارش ہوتی ہے۔

بادل کئی قسم کے ہوتے ہیں اور سال بھر دیکھے جا سکتے ہیں۔ آندھی کے ساتھ یا آندھی سے پہلے ایسے بادل آتے ہیں جو گرجتے بہت ہیں برستے کم ہیں! لیکن برسات کی لگاتار بارش ان مانسونی بادلوں سے ہوتی ہے جو سمندر سے اٹھتے ہیں اور ہواؤں کے کندھے پر سوار ہو کر دور دور تک پانی بکھیر دیتے ہیں۔ آپ نے

دیکھا ہوگا کہ برسنے والے یہ بادل بہت کم گرجتے ہیں۔

غرض سمندر سے اٹھنے والے بادلوں سے بارش ہوتی ہے، یا بارش کا پانی زمین پر پھیلتا ہے اور ندی نالوں میں ہوتا ہوا پھر سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔ بارش کا چکر ہمیشہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

آج کل بارش کے دن میں کبھی کبھی آپ کو بارش کی وجہ سے اسکول جانے میں دیر بھی ہو جاتی ہوگی اور کبھی کبھی راستے میں کیچڑ ہونے کی وجہ سے پیر پھسل جاتا ہوگا، آپ اپنے کو سنبھال نہیں پاتے اور گر جاتے ہیں۔ کپڑے سب خراب ہو جاتے ہیں۔ چوٹ بھی لگتی ہے۔ آپ کو بارش پر غصہ آتا ہے لیکن غصہ کرنے کی بات نہیں بارش آتی ہے تو اپنے ساتھ میں لاتی ہے رم جھم کا سنگیت، ہلکی ہلکی پھوار، سہانا موسم، کالے بادل، ٹھنڈی ہوائیں، چمک دار تاروں والی راتیں، رنگین شام سویرے، پکنکیں، پکوان اور چھٹیاں، اور میٹھے میٹھے آم!

(بقیہ چاند کی مہم ص۲۹ کا)

طبیعت کو چین کہاں۔ وہ تو اب اور آگے جانا چاہتی ہے اور آگے۔ امریکہ نے اپالو ۱۲ اور ۱۴ کو چاند پر بھیجنے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ یہ جہاز وہاں کی مٹی کا پتھروں کا جغرافیائی حالات کا معائنہ کریں گے۔ اور وہاں سے آگے، فی الحال زہرہ اور مریخ تک جانے کے لیے خلائی اسٹیشن بنائیں گے۔ یوں سمجھیے کہ اس کامیابی نے انسان کی کوششوں کو آگے بڑھانے کے دروازے کھول دیے ہیں۔

جناب جاوید پریمی

مینڈک

برسات آئی اور مینڈکوں نے ٹرانا شروع کیا۔ وہ شور مچاتے ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی برسات سے پہلے تو کہیں اکا دکا نظر آجاتے ہیں پر پانی کی پھوار پڑتے ہی نہ جانے کہاں سے اُبل پڑتے ہیں۔

کہتے ہیں سردی کے موسم میں جوہڑوں تالابوں وغیرہ کی تہہ میں بل بنا کر رہتے ہیں پورا موسم وہیں گذار دیتے ہیں۔ بہار کا موسم شروع ہوتے ہی باہر آجاتے ہیں۔

اپریل کے آخر یا مئی اور جون کے مہینے میں ہر طرف پھدکتے نظر آتے ہیں۔ اور ٹرانا شروع کر دیتے ہیں۔ بہت نازک مزاج بھی ہیں۔ زیادہ گرمی یا زیادہ سردی کی برداشت نہیں ہے۔ گرمیاں ختم ہونے کو آئیں اور انھوں نے ٹرانا شروع کیا۔ کسان کے لیے تو یہ جیسے برسات کا سگنل ہے۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب برسات شروع ہونے والی ہے۔

ذرا ان کی شکل تو دیکھیے کیسی بھدی کیسی گھناؤنی ہے۔ ذرا ہاتھ پیر سے چھو جائیں تو جھرجھری سی آنے لگتی ہے۔ خرگوش اور اونٹ کی طرح اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھتے ہیں۔ انھی پچھلی ٹانگوں سے چلتے کیا ہیں پھدکتے ہیں۔ ان کے کھانے کا وقت تو یوں سمجھیے کہ رات کو ہوتا ہے۔ ذرا انھیں شکار کرتے وقت غور سے دیکھیے۔ تتلی مچھر اور بھونرا ان کی مرغوب غذا ہے۔ جیسے ہی ان تینوں میں سے کوئی اڑتا نظر آتا ہے۔ یہ دم سادھ کر اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ اس وقت ان کی بڑی بڑی گول گول آنکھیں شکار پر جمی ہوتی ہیں۔

شکار کے وقت مینڈک اپنی زبان سے کوڑے کا کام لیتا ہے۔ شکار کو دیکھتے ہی یہ اپنے پھیپھڑے میں ہوا بھر لیتا ہے اور پھول کر کپا ہو جاتا ہے جسم کے پھولنے سے اور ہوا کے دباؤ سے اس کی زبان باہر آجاتی ہے۔ زبان کے آخری سرے پر ایک عجیب طرح کا لیسدار مادہ ہوتا ہے۔ اور شکار اس مادے سے چپک جائے تو پھر چھوٹ نہیں سکتا۔ اس لیسدار مادہ میں شکار چپک جاتا ہے۔ تو مینڈک صاحب ہوا خارج کر کے جسم کو معمولی حالت میں لے آتے ہیں اور ہوا کے نکلتے ہی شکار زبان سے چھوٹ کر حلق میں پہنچ جاتا ہے۔

شکار کے وقت صرف اس کی زبان مدد کرتی ہے۔ اگلی ٹانگیں اس وقت کام میں لاتا ہے جب تتلی یا مچھر اس کے منھ میں داخل ہونے میں مزاحم ہو۔ شکار کے وقت مینڈک کی زبان اتنی تیزی سے اپنا کام کرتی ہے کہ

آپ دیکھ نہیں سکتے۔ مینڈک صرف ان ہی جانوروں کو شکار کرتا ہے جنھیں وہ ایک ہی وقت میں نگل سکے۔

مینڈک کی کئی قسمیں ایسی بھی ہیں جنکی مرغوب غذا چیونٹی ہے۔ انھیں یہ ان کے بلوں میں گھس کر کھا جاتے ہیں۔ اکثر تو یہ اپنے ننھے ننھے بچوں کو بھی بڑے اطمینان سے کھا لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو بڑے مینڈک اپنے سے چھوٹے مینڈکوں کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔

مینڈک کبھی بھی مرے ہوئے جانور کو نہیں کھاتا چاہے کتنی ہی بھوک لگی ہو۔ اور انھی کیڑوں کو کھاتا ہے جو نقصان پہنچاتے ہیں۔

زمینداروں اور کاشتکاروں کا تو وفادار ساتھی ہے۔ ان کی فصلوں ان کیڑوں سے پاک کر دیتا ہے جو تیار فصلوں کو برباد کر دیتے ہیں۔ کہیں کہیں تو یہ شہد کی مکھیوں کو بھی اپنی غذا بنا لیتا ہے۔ آسٹریلیا میں ایک سائنس داں نے تجربے کے سلسلے میں ایک مینڈک کا پیٹ چاک کیا تو ۳۰۰ شہد کی مکھیاں نکلیں۔

مینڈک اتنا ذہین ہوتا ہے کہ اگر اسے سدھایا جائے تو یہ اپنے کھانے کے وقت کو ذہن نشین کر لیتا ہے۔

اچھا آیئے ذرا اس کی آنکھیں غور سے دیکھیں۔ بھئی انھیں عجوبہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے بھدے جسم سے ان آنکھوں کو ذرا سی بھی مناسبت نہیں۔ اس کے سارے جسم میں ایک الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر اتنی بڑی اور خوبصورت آنکھوں میں روشنی بہت کم ہے۔ مینڈک تیز روشنی میں اتنا صاف نہیں دیکھ سکتا جتنا مدّھم روشنی میں دیکھ سکتا ہے۔

جانور اور انسان سب کے سب منھ سے پانی پیتے ہیں۔ مگر مینڈک منھ سے نہیں پیتا۔ قدرت نے اس کا جسم کچھ ایسا بنایا ہے کہ جتنا پانی چاہے وہ اپنے جسم کے مساموں کے ذریعہ اپنے بدن کے اندر داخل کر لیتا ہے۔ آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ سردیوں کے موسم کے لیے یہ پانی کافی ہوتا ہے۔

آپ سے کوئی شخص سوال کرے کہ مینڈک جب ٹرّاتا ہے تو آواز اس کے جسم کے کون سے حصّہ سے آتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ آپ فوراً جواب دیں گے، "منھ سے"۔ مگر آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ آواز اس کے گلپھڑوں سے آتی ہے جو ٹرّاتے وقت نیلے رنگ کے غباروں کی طرح پھول جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات ان کے پھولنے سے گلپھڑوں کے حسامت اس کے سر سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ مینڈک ہوا میں سانس نہیں لیتا ہے یوں کہیئے کہ ہوا کو نگلتا ہے۔ اسی طرح ہوا کو اپنے جسم میں بھر لینے سے مینڈک کو اپنے سب سے بڑے دشمن سانپ سے اپنے کو بچانے میں بڑی مدد ملتی ہے سانپ کو دیکھتے ہی وہ جسم میں ہوا بھر لیتا ہے تاکہ سانپ کے منھ میں نہ آسکے۔

مینڈک کا جسم بہت چکنا ہوتا ہے اسے تم آسانی سے پکڑ نہیں سکتے اگر کبھی تم اسے زیادہ تنگ کروگے تو وہ جھلاہٹ میں تمھارے اوپر ایک قسم کا لیس دار مادّہ چھوڑ دے گا۔ کہتے ہیں اس میں تیزابیت ہوتی ہے اور جسم پر جہاں بھی لگ جائے وہاں ورم آجاتا ہے یا پھوڑے پھنسیاں نکل آتی ہیں۔

مینڈک مئی جون اور جولائی کے مہینوں میں انڈے دیتا ہے۔ بی مینڈکی ۲۰۰۰ سے لے کر ۲۰۰۰۰ تک [illegible] ہیں۔ یہ انڈے لچک دار اور لیس دار "جیلی" جیسی [illegible] نالیوں میں ہوتے ہیں۔ ہر انڈے کی شکل کرے کی مانند ہوتی ہے اوپر سے سیاہ اور نیچے سے کچھ کچھ سفید۔ دو تین ہفتوں بعد انڈوں سے کالے کالے بچے نکل آتے ہیں۔ تقریباً دس ہفتوں میں یہ بچے پورے مینڈک بن جاتے ہیں۔

کہتے ہیں دنیا میں مینڈکوں کی ۱۲۰۰ قسمیں پائی جاتی ہیں۔

امریکہ میں ایک ایسا مینڈک پایا جاتا ہے جس کی آواز گدھے کی آواز کی طرح ہوتی ہے۔ اس لیے اس کو "رینکنے والا" مینڈک کہتے ہیں۔ یہ انڈوں کو اپنی پیٹھ پر اٹھائے گھومتا ہے۔ انڈے دے کر مادہ کو آزادی ہو جاتی ہے۔ اب انڈوں سے بچے نکالنا نر کا کام ہے۔

ایک اور عجیب مینڈک چلی کی ایک ریاست میں پایا جاتا ہے۔ یہ اپنی مادہ کے کچھ انڈے تو کھا جاتا ہے باقی اپنے گلے کی تھیلی میں بھر لیتا ہے۔ وہیں بچے نکلتے ہیں اور دو چار دن میں ان بچوں کو گلے کی تھیلی سے باہر نکال دیتا ہے۔

وسطی یورپ کے ایک مینڈک نے تو تحقیق کرنے والوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ ایک مینڈک کی نسل کی مادہ کے پیٹھ پر ایک تھیلی ہوتی ہے جس میں وہ انڈوں کو لیے پھرتی ہے۔ [illegible]ء میں لندن کے چڑیا گھر میں یہ تحقیق ہوئی کہ نر مینڈک اپنے پیروں کی مدد سے انڈے مادہ مینڈک کی تھیلی میں ڈالتا ہے۔

جنوبی افریقہ میں ایک قسم کے مینڈک کے جسم پر بال بھی ہوتے ہیں۔ افریقہ میں مینڈک کی ایک اور قسم درختوں پر بھی چڑھ جاتی ہے۔ انھی مینڈکوں کے بارے میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ انھیں غمناک گانوں سے بڑی دلچسپی ہے۔

جنوبی امریکہ میں ایک مینڈک ٹرّاتے وقت ایسی آواز نکالتا ہے جیسے کوئی سانڈ ڈکار رہا ہو۔ امریکہ کا ایک مینڈک سچ مچ چیتے کی طرح چتکبرا ہوتا ہے۔ بڑا پھرتیلا اور چالاک۔ اسی لیے اسے چیتا مینڈک کہتے ہیں۔ جنوبی امریکہ میں ہی مینڈک کی ایک دوسری نسل بہت ہی موٹی تازی اور بے ہنگم شکل کی ہوتی ہے۔ اس مینڈک کے زبان نہیں ہوتی اور تمام عمر پانی میں رہتا ہے۔ کولمبیا میں ایک طرح کا مینڈک اپنے جسم سے لیسدار مادہ خارج کرتا ہے۔ اس مادّے سے ایمیزن کے توتوں کو نیا رنگ دیا جاتا ہے۔ کرتے یہ ہیں کہ توتے کے نیلے اور ہرے پر اکھاڑ دیتے ہیں اور توتے کی ننگی کھال کو مینڈک کے جسم سے چھوا جاتا ہے بار بار یہ عمل دہرایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پر دوبارہ نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور ان نئے پروں کا رنگ نیلے کی جگہ پیلا ہوتا ہے۔

کچھ یورپی ملکوں خصوصاً جاپان میں مینڈک کی کھال سے بڑے خوبصورت پرس بنائے جاتے ہیں۔

مینڈک عام طور پر ڈیڑھ انچ سے آٹھ انچ تک کا ہوتا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا مینڈک

جنوبی کیمرون میں ہوتا ہے اس کی لمبائی دس انچ ہے مگر افریقہ میں ایک بار ایک ایسا مینڈک بھی دیکھا گیا جو ایک فٹ لمبا تھا۔ دنیا کا سب سے چھوٹا مینڈک کیوبا میں ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی آدھا انچ ہوتی ہے۔

پیرس میں ایک خیال عام ہے کہ مینڈک زیادہ عرصہ تک زندہ رہے تو وہ سانپ کی طرح زہریلا ہو جاتا ہے۔ اسے وہاں کے لوگ دیکھتے ہی مار دیتے ہیں —— مینڈک کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ بنا کھائے پیے بہت دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔

جس طرح تمہارے یہاں اسکولوں اور کالجوں میں کھیل کود کے مقابلے ہوتے ہیں اسی طرح کیلی فورنیا میں ہر سال "مینڈکوں کی دوڑ" ہوتی ہے۔ اس مقابلہ میں شرکت کے لیے دور دور سے قسم قسم کے مینڈک لائے جاتے ہیں۔ دوڑنے سے پہلے ایک لکیر کھینچ کر مینڈک ان پر ترتیب وار بٹھائے دیے جاتے ہیں ان کے مالک ان کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں جنھیں وہ "دوڑو، دوڑو" کی آوازیں دوڑنے کا حکم دیتے ہیں۔ اور پھر یقین جانو یہ تمھاری طرح ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں جی جان سے دوڑتے ہیں اور اوّل آنے والے انعام پاتے ہیں ——

کبھی کبھی تم اپنی باجی یا آپا کو مینڈک دکھا کر کہتے ہو کہ دیکھیے آپا اس کا اچار بڑا عمدہ ہوتا ہے۔ تمھاری آپا کس طرح "آخ تھو" کہتی ہیں۔ اور یہ پڑھ کر آپ کو تعجب ہوگا کہ بہت سے ملکوں میں مینڈک بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ شمالی امریکہ میں "بل فراگ" لوگوں کی پسندیدہ غذا ہے۔ اس کی پچھلی ٹانگیں امریکی باشندے بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مینڈک کی یہ ٹانگیں جس وقت "روسٹ" کی جاتی ہیں یعنی بھونی جاتی ہیں تو ان کی سوندھی سوندھی مہک "بھونے ہوئے مرغ" کی مہک سے بھی کہیں اچھی ہوتی ہے۔ چین، اٹلی اور فرانس میں بھی مینڈک بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔

اور سائنس کی لیب یا لیبورٹری میں تو ان بے چاروں کا روز پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔ تم نے سائنس لی ہے تو تمھیں خود بھی تجربہ ہوگا۔

جناب ادیبا لی وڈی لیو

ترجمہ :- جناب اشفاق محمد خاں

تین دوست

انڈونیشیا کی ایک لوک کہانی

کبھی کبھی آدمی خوف اور دہشت کھاکر بھی اپنی جان گنوا دیتا ہے مثلاً سانپ کے کاٹے سے اکثر آدمی مرجاتے ہیں۔ حالانکہ زہر ہر سانپ میں نہیں ہوتا۔ آدمی پھر بھی مرجاتا ہے۔ اس کی وجہ وہی خوف یا دہشت ہے۔ خوف یا دہشت کبھی کبھی دل پر اس قدر گہرا اثر کرتی ہے کہ بے چارے دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔ آیئے آج انڈونیشیا کی ایک لوک کہانی پڑھیئے اس لوک کہانی میں خوف اور دہشت ہی کو موت کا بڑا سبب بتایا گیا ہے۔

ہر سال "ہیضہ" مقدس شہر مکہ کی زیارت کو آیا کرتا تھا۔ ہیضے کے دو جگری دوست بھی تھے "موت" اور "دہشت یا خوف" یہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے تھے۔

ایک سال ایسا ہوا کہ خوف اپنے دوستوں سے پہلے ہی شہر میں آدھمکا۔ شہر کا چوکیدار "خوف یا دہشت" کو جانتا نہیں تھا۔ لیکن اس نے انھیں شہر میں داخل ہونے دیا۔

جب دوسرے دو ساتھی مقدس شہر کے دروازے پر پہنچے تو چوکیدار نے ناراض ہو کر کہا "اچھا تو اب تم لوگ پھر رنج اور مصیبتیں لے کر آئے ہو۔ کیوں ٹھیک ہے نا اور ملعون ہیضے بتا اب تو کتنی جانیں لے کر ٹلے گا۔"

"ایسا نہ کہیے" ہیضہ نرمی سے بولا۔ میرا خیال ہے کہ پانچ سو سے زیادہ جانیں نہیں لوں گا۔"

"اور اے کمبخت موت تو اس شہر سے کتنی جانیں لے کر اپنی سلطنت میں واپس جائے گی؟" چوکیدار نے اس کی طرف مڑ کر پوچھا۔

"مجھے تو ہیضہ جتنی جانیں دے گا لے کر چلی جاؤں گی" موت نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"اچھا اندر جاؤ۔" چوکیدار نے بڑبڑاتے ہوئے اجازت دے دی لیکن اس سے کہا دیکھو پانچ سو سے زیادہ جانیں ہرگز نہ لینا۔ تم وعدہ کر چکے ہو اس لیے جاؤ اور ہیضے کی نگرانی کرو۔ تاکہ وہ وعدہ کے مطابق ہی لوگوں کو مارے"

میاں چوکیدار —— ہاں ہاں تم ہماری بات پر بھروسہ کرو۔" یہ کہتے ہوئے دونوں ساتھ ساتھ شہر کے پھاٹک میں داخل ہو گئے۔

کئی ہفتے تک دونوں شہر میں رہتے رہے پھر ایک دن دونوں نے چوکیدار کو بلایا کہ دوبارہ شہر کا دروازہ کھول دے۔

"اچھا اچھا — تم دونوں آگئے، ارے ہیضے تو نے کتنے آدمی مارے"؟ چوکیدار نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں نے سختی سے اس بات کا بے حد خیال رکھا کہ وعدہ سے زیادہ لوگوں کی جانیں نہ لوں۔" ہیضہ نے جواب دیا۔

چوکیدار نے ہیضہ کے اس بیان پر یقین کر لیا اور پھر موت کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا۔

"ارے موت! تو نے کتنے آدمی مارے؟"

"جی جی — میرے پاس تو ایک ہزار سے زیادہ جانیں ہیں۔" موت نے کہا۔

ہیضہ یہ سن کر بدحواس ہو گیا۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔" کر پھر خود ہیضہ نے بتایا کر موت کے پاس صرف ۹۰ جانیں ہیں"

موت نے کہا — "ہاں ہاں میرے پاس ۹۰ جانیں ہیں جو مجھے میرے دوست ہیضہ نے دی ہیں لیکن اس سے زیادہ موتیں "دہشت، خوف" کی وجہ سے ہوئی ہیں اور خوف بغیر کسی اطلاع کے تمہارے دروازے سے داخل ہوا تھا۔ اے بوڑھے چوکی دار —— ایک دن تجھے معلوم ہو گا کہ ہمارا بھائی خوف (دہشت) ہیضے اور دوسری بیماریوں سے زیادہ انسانی جانوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری —— سے ختم ہو گئی ہے۔

پیام تعلیم سال بھر تک آپ کے پاس آتا رہا ہے۔ اس کے دلچسپ مضامین اور مزیدار کہانیاں آپ کو ضرور پسند آئی ہوں گی ہمیں امید ہے کہ آپ نہ صرف اس کے خریدار رہیں گے بلکہ اپنے دوستوں کو بھی خریدار بنائیں گے۔ براہ کرم ۵ر ستمبر تک سالانہ چندہ چھ روپے منی آرڈر سے بھیج دیجیے۔ —— اگر آپ کا منی آرڈر یا اس سلسلے میں کوئی خط ۲۵ر اگست سے پہلے نہ آیا تو مجبوراً آپ کا نام خریداری سے خارج کر دیا جائے گا۔

آپ کا خریداری نمبر —————— ہے۔

مولانا مقبول احمد سیوہاروی۔

مسلسل

بیگم کے ہمراہی ترکوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ خاتون اب تک باپ کے دین پر ہے اور واپس جانا نہیں چاہتی تو اپنے وطن جانے کی اجازت مانگی جسے خاتون نے منظور کر لیا اور انھیں بہت کچھ بطور انعام دیا اور مجھے بھی بلا کر رخصت کر دیا رخصت کے وقت تین سو سونے کی اشرفیاں چاندی کے دو ہزار سکّے، لڑکیوں کے ہاتھ کا بُنا ہوا اعلیٰ قسم کا چوغہ دس ریشمی جوڑے اور دو گھوڑے مجھے دیے اور محافظ امیر کو جسے ہمارے ساتھ کیا تھا ہدایت کر دی کہ ہمیں امن اور سلامتی کے ساتھ سرحد پار پہنچا دے۔ امیر کے ساتھ پانچ سو سوار تھے۔ بطور خاص تاکید کر دی کہ میرا خیال رکھے اور کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دے۔ یہاں پر قیام ایک مہینہ چھ دن رہا۔

محافظ امیر ہمارے ساتھ بابا سلطوق کے شہر تک آیا۔

ہمارا چھوڑا ہوا سامان اونٹ، گاڑیاں، بیل سب لہیں تھے۔ اس وقت شدید سردی تھی۔ میری یہ حالت تھی کہ تلے اوپر تین لبادے، دو پجامے جن میں ایک روئی بھرا ہوا تھا۔ اونی موزے اور کتان کے دو ہرے موزے ہوں، پر گھوڑوں کی کھال کے پائتابے ... اون کا

تھی پہنتا تھا۔ انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر گرم پانی سے وضو کرتا تھا پھر بھی سردی کا یہ عالم تھا کہ وضو کرتے وقت پانی کا جو قطرہ گرتا تھا جم جاتا تھا۔ منہ دھوتے میں پانی کے قطرے داڑھی پر گرتے جم کر اٹک جاتے تھے جنھیں ہاتھوں سے جھاڑتا تھا۔ زیادہ کپڑے پہننے سے اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ جب تک ساتھی سوار نہ کراتے گھوڑے پر بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ برف کے ٹکڑے ہانڈی میں ڈال دیتے گھل جاتے تھے تو پانی پیا جاتا۔ حاج ترخان جہاں ہم سلطان سے رخصت ہوئے تھے پہنچے، معلوم ہوا کہ سلطان اپنے دارالسلطنت پہونچ گیا ہے۔

سلطان ازبک کا پایۂ تخت

سلطان ازبک کی راجدھانی کا نام سرائے برکہ ہے آج کل سلطان یہیں ٹھہرا ہوا ہے۔ ہم نے اپنے سفر کا حال بیان کیا اور جو جو سوالات سلطان نے کیے جواب دے دیا۔

سرائے برکہ اچھے شہروں میں ہے، گھنی آبادی ہے تیرہ مسجدیں ہیں جن میں جمعہ ہوتا ہے ان میں ایک شافعیوں

کی مسجد ہے۔

سرائے میں ہر قوم کے لوگ آباد ہیں اور مُغلوں کا وہ خاندان بھی ہے جو کسی زمانے میں یہاں کا حکمراں تھا۔ چرکسی، رومی، روسی، مسلمان ہر ایک کے الگ الگ محلّے ہیں۔ عراقی، مصری، اور شامی بھی آباد ہیں۔

دارالسلطنت کا قاضی بدرالدین الاعرج ہے شافعی مدرسین میں صدرالدین سلیمان بڑے فاضل ہیں اور مالکی علماء میں شمس الدین المصری ہیں۔

شہر میں حاجی نظام الدین کی خانقاہ ہے جہاں ہماری دعوت ہوئی۔ امام نعمان الدین خوارزمی کی خانقاہ بھی ہے۔ خوارزمی صاحب سے میری ملاقات ہوئی، بزرگ ترین مشائخ ہیں۔

سلطان اوزبک ہر جمعہ کو خوارزمی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔

خوارزمی صاحب کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ اُمراء اور سلاطین پر توجہ نہیں کرتے عام مسلمان، غربا اور مساکین پر زیادہ توجہ اور محبت کرتے ہیں۔

کرامت

میں نے خوارزم جانا چاہا تو خوارزمی صاحب نے فرمایا:

"ابھی چند دن اور ٹھہرو۔" میں نے اصرار کیا تو مسکرا کر فرمایا: "ٹھہرنا تو ضرور پڑے گا۔"

آخر مجھے ٹھہرنا پڑا کیونکہ اسی عرصے میں میرا غلام [illegible] میرے ایک ساتھی ترخان سے آئے تو غلام اُن کے ساتھ تھا مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ یہ خوارزمی صاحب کی کرامت تھی۔

خوارزم

ترکی کے شہروں میں خوارزم بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی اور مردم شماری بہت زیادہ ہے بازاروں میں اتنی بھیڑ رہتی ہے کہ بیچ بیچ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ ایک دن بازار لگا تو ایک طرف سے دوسری طرف جانا مشکل ہو گیا اور واپس آنے میں بھی مشکل ہوئی لوگوں نے کہا کہ جمعہ کے دن اس بازار میں آنا جانا مشکل نہیں ہوتا۔

سرا سے خوارزم تک آنے میں چالیس دن کا سفر ایک جنگل میں طے کرنا پڑا جہاں چارے کی کمی کے سبب گھوڑوں کی جگہ اونٹوں سے کام لینا پڑا۔ مسافر چلتی گاڑیوں میں کھانا کھاتے تھے اور سوتے تھے فقط دو گھنٹے ٹھہرتے تھے آشِ جو کھاتے تھے اور گوشت کے کباب ڈال کر اوپر سے دہی ملا لیتے تھے۔ راستہ میں گڈھوں کا پانی جو بارش کے زمانے میں جمع ہو جاتا ہے پینا پڑا۔ خوارزم کے لوگ بڑے مہمان نواز اور پابند صوم و صلوٰۃ ہیں جو لوگ نماز نہیں پڑھتے انھیں شرعی سزا دی جاتی ہے۔ خوارزم کے قریب دریائے جیحون بہتا ہے یہاں سلطان کا ماتحت ایک امیر ہے قتلو دمور نام ہے جس نے مدرسوں اور مضافات کو ترقی دینے میں بڑی محنت کی ہے۔

خوارزم سے زیادہ خلیق اور با مروّت آدمی دنیا کے کسی حصّے میں نہیں ہیں۔ یہاں کے موذن لوگوں کو بلا بلا کر مسجد تک لاتے ہیں، اگر کوئی جماعت میں شریک نہیں ہوتا

وہ رکھ دیتے ہے جو ہر ایک مسجد میں لٹکا رہتا ہے خیر لی جاتی ہے اور جرمانہ الگ ہوتا ہے جس کی رقم مسجد کے کاموں یا مساکین و فقراء کے کھلانے میں خرچ کی جاتی ہے

دریائے جیحون جس کا میں نے ذکر کیا ہے اس کا پانی سردی میں جم جاتا ہے اور پانچ مہینے جما رہتا ہے جس پر پار اُترنا آسان ہوتا ہے گرمی میں کشتی سے جانا پڑتا ہے۔

حضرت نجم الدین کبرےٰ کا مزار اسی شہر میں ہے جس میں ہر ایک کو کھانا ملتا ہے حضرت جلال الدین سمرقندی کی خانقاہ بھی یہیں ہے۔ مشرق سے مغرب تک خوارزم کے خربوزوں کی نظیر نہیں ملتی۔ بخارا اور اصفہان کا خربوزہ بے شک اس سے ملتا جلتا ہے

خوارزم کے خربوزے کا چھلکا بہت سبز اور اندر سے بہت سُرخ نکلتا ہے۔ مٹھاس کا ٹھکانا نہیں عجیب بات یہ ہے کہ اسکی پھانکیں دھوپ میں سکھا لیتے ہیں اور خوارزم سے ہندوستان اور چین تک لے جاتے ہیں۔

جس زمانے میں میرا قیام ہندوستان میں تھا تو جو کوئی تاجر باہر کی چیزیں لاتا خوارزم کے سوکھے خربوزے کو میں ضرور پوچھتا۔ شاہ ہند کو بھی میرا اتنا خیال تھا کہ اگر تحفتاً خربوزے آتے تو مجھے ضرور بھیج دیا کرتا تھا۔

زمخشر

خوارزم سے چار میل زمخشر کی آبادی ہے ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری کا مزار اسی جگہ ہے جس پر گنبد بنا ہوا ہے۔ زمخشر کے علماء میں مولانا جمال الدین، مولانا زین الدین المقدسی، مولانا رضی الدین یحییٰ، مولانا فضل اللہ رضوی مشہور لوگوں میں سے ہیں۔ یہ سب معتزلہ عقید کے ہیں مگر سلطان اور امیرِ شہر کے خوف سے بول نہیں سکتے کیونکہ یہ دونوں اہلِ سُنت ہیں۔

خوارزم اور زمخشر میں کوئلہ نہیں جلاتے لکڑیاں کے گٹھے لاتے ہیں اور پھونک پھونک کر جلاتے ہیں ہندوستان میں بھی لکڑی اور اُپلوں کا رواج ہے جسکا ذکر آگے چل کر کروں گا۔

چین کے لوگ پتھر کا کوئلہ جلاتے ہیں، راکھ ہو جاتا ہے تو پانی ملا کر دھوپ میں سکھاتے ہیں اور پھر جلاتے ہیں جب تک بے کار نہیں ہو جاتا کام لیتے رہتے ہیں۔

خوارزم سے جانے لگا تو میں نے اونٹ کرایہ کیے سردی زیادہ تھی اس لیے میرے خادموں نے گھوڑوں پر جھولیں ڈالیں اور سوار ہوئے۔ اب ہمارا اٹھارہ دن تک ریگستان میں سفر رہے گا راستے میں فقط ایک بستی ملے گی جسکا نام کات ہے۔

امیرِ خوارزم نے رخصتی خلعت پہنائی اور ایک خلعت قاضی نے پہنائی پھر فقہاء نے ساتھ ساتھ دور تک جا کر ہمیں رخصت کیا، چار دن چلکر کات پہنچ گئے۔ (باقی آئندہ)

خط و کتابت کرتے وقت اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیے

بچوں کی کوششیں

بندر بادشاہ: شیر مرگیا۔ نئے بادشاہ کی تلاش ہوئی۔ جنگل کے درندوں اور چرندوں نے جلسہ کیا کہ نیا بادشاہ کیسے بنائیں۔ قرار یہ پایا کہ سب اپنے اپنے کرتب دکھائیں جس سے سب خوش ہوں وہ بادشاہ بنے۔

ہاتھی نے سونڈ میں پانی بھر کر فوارہ چلایا سب بولے واہ، واہ چیتے نے لمبی لمبی چھلانگیں ماریں سب بولے واہ، واہ، ہرن نے چوکڑی بھری سب بولے واہ، واہ۔ گھوڑے نے دوڑ لگائی سب بولے واہ، واہ۔

بندر کی باری آئی تو وہ ناچنے لگا۔ اس کے ناچ سے سب بہت خوش ہوئے۔ اور بولے اچھا تم ہی ہمارے بادشاہ بنو۔ چنانچہ اس کے سر پر تاج رکھ کر تخت پر بٹھا دیا۔

لومڑی کو بندر کا بادشاہ بننا برا لگا۔ وہ آہستہ سے بولی "آؤ تمھیں سیب کھلاؤں" بندر ساتھ ہو لیا۔

ایک شکاری نے ایک پنجرے میں سیب لٹکا رکھا تھا۔ بندر سیب دیکھ کر پنجرے میں گھس گیا پنجرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

لومڑی ہنسنے لگی۔ بندر جھلا کر بولا "تو بڑی فریبن ہے" جلد دروازہ کھول! ورنہ چیتے سے پھڑوا ڈالوں گا" ——— لومڑی بولی۔ واہ رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔ پنجرے میں پھنسے ہیں۔ تھوڑی دیر میں گلے میں رسی اور ہاتھ میں ڈگڈگی ہوگی۔ لیکن خیال اب بھی یہی ہے کہ ہم تخت پر بیٹھے ہیں۔

میاں بندر تم میں اتنی بھی عقل نہیں ہے کہ سیب کے درخت اور پنجرے میں تمیز کر سکو ہم پر حکومت کیا کروگے؟ یہ کہہ کر لومڑی چل دی۔ بندر چڑچڑ کرتا وہیں رہ گیا۔

منی باجی

راج کماری کے سات باغ: کسی دیس میں ایک راجہ رہتا تھا۔ اس کا ایک لڑکا تھا۔ راجا کا لڑکا بڑا ہو چکا تھا۔ راجا نے اپنے لڑکے کی شادی کرنی چاہی دوسرے دیس میں ایک راج کماری رہتی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ راج کمار سے راج کماری کی نسبت طے ہو گئی۔ راج کمار کے دیس میں دشمن بھی تھے۔ ان کے دل میں حسد پیدا ہوا۔ انھوں نے راج کمار کو ایک بدصورت راج کماری کی تصویر دکھائی اور کہنے لگے یہ تمہاری شادی اس راج کماری سے ہونے والی ہے۔ راجکمار کا دل اداس ہو گیا۔ لیکن وہ اپنے باپ کے آگے

کچھ نہ کہہ سکا۔ بس چپ چاپ رہا۔ آخرکار ایک دن شادی ہو گئی۔ راج کماری اپنے جہیز میں سات باغ لائی۔ جو سات رنگ کے تھے۔ راج کمار نے راج کماری کا منھ نہ دیکھا۔ اس طرح کئی دن گزر گئے۔ راج کماری بہت ہوشیار تھی۔ اس نے سوچا خاموشی سے کام نہیں چلے گا۔ کوئی نہ کوئی تدبیر کرنا پڑے گی۔ راجکماری نے محل میں سات سرنگیں کھدوائیں۔ یہ سرنگیں ان ساتوں باغوں میں نکلتی تھیں۔ باغ میں کام کرنے والے نوکروں کو لالچ دے کر اپنا بنا لیا اور کہا راجکمار اگر باغ دیکھنے آئے تو مجھے آکر بتانا۔ اتفاق سے راجکمار ایک دن لال رنگ کے باغ میں گیا۔ لال رنگ کے باغ کی ہر چیز لال تھی۔ اور نوکروں نے راجکماری کو آکر اطلاع دے دی۔ راجکماری سج دھج کر باغ میں گئی۔ اور جھاڑیوں میں چھپ چھپ کر راجکمار کو دیکھنے لگی۔ راجکمار کی نظر راجکماری پر پڑی۔ اس نے سمجھا کہ شاید باغ میں کوئی پری ہو گی راجکمار چلا گیا۔ اسی طرح جس رنگ کے باغ میں جاتا راجکماری اسی رنگ کا لباس پہن کر باغ میں آجاتی۔ اور چھپ چھپ کر دیکھتی۔ آخری دن راجکمار ساتویں باغ میں گیا۔ اس باغ کا رنگ سفید تھا۔ راج کماری سفید کپڑے پہن کر باغ میں پہنچی۔ راجکمار نے سوچا اس پری کو پکڑ لوں۔ راج کماری کو پکڑنا چاہا۔ راجکماری دوڑی دوڑی سرنگ کے راستے سے آنے لگی۔ تاکہ راز نہ کھل جائے۔ راجکمار اپنے رستے چلا گیا۔ لیکن راجکماری کے دوڑنے میں چوٹ لگی۔ وہ گھر آئی اور اپنے کمرے میں جاکر سو گئی۔ راجکمار محل میں آیا کمرے میں گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ باغ کی وہی پری پلنگ پر سو رہی ہے۔ جو اس نے باغ میں دیکھی تھی۔ راجکمار نے راجکماری کو جگایا۔ اور کہا سچ سچ تم انسان ہو یا پری ہو۔ اب راجکماری نے پوری کہانی راجکمار کو سنائی۔ راجکمار نے راجکماری سے معافی مانگی اور قسم کھائی کہ آئندہ کبھی لوگوں کی باتوں میں نہیں آئے گا۔ راجکمار نے اپنے دشمن کو جھوٹ بولنے کی سزا دی اور راجکمار اور راجکماری ہنسی خوشی رہنے لگے۔

زینب بیگم بستی

لڑکے کی محنت کہتے ہیں الہ آباد کے کسی گاؤں میں ایک غریب آدمی کی جھونپڑی تھی۔ بے چارہ بہت ہی غریب تھا۔ گھر میں ایک بیوی تھی، بچے تھے۔ اندر دو بھائی بہن تھے۔ بھائی کا نام جمیل تھا۔ اس کی بہن کا نام جمیلہ تھا۔ اس کا باپ صبح سے شام تک کام کر کے گھر آتا اور جیسے تیسے اپنا خرچ چلاتا خدا کا کرنا ایک دن وہ بھی مر گیا۔ اس کا بیٹا بہت رویا اس کی ماں نے اسے بہت دلاسا دیا اور سمجھایا کہ تم گھر سے باہر نکلو اور کہیں سے کما کر لاؤ۔ خیر صاحب بیٹا گاؤں کے زمیندار کے پاس گیا۔ زمیندار نے اس کو نوکر رکھ لیا، لڑکے نے بہت محنت سے بہت ایمانداری سے کام کیا۔ زمیندار نے خوش ہو کر اس کی تنخواہ بڑھا دی. لڑکے نے دھیرے دھیرے بہت ترقی کر لی پڑھنا لکھنا بھی سیکھ لیا —— اب تو یہ بہت ہی امیر ہو گیا اور بہت مزے سے گزر بسر ہونے لگی۔ لوگ اس کی تعریف کرتے تھے۔ پڑھ لکھ وہ بہت بڑا آدمی بن گیا۔

احمد نظیم

آدھی ملاقات

ساری دنیا میں ہل چل مچی ہوئی ہے کہ انسان چاند پہنچ چکا ہے۔ انسان کی اس فتح پر صرف امریکہ ہی نہیں دوسرے بہت سارے ممالک بھی خوشیاں منا رہے ہیں۔

میں آپ کی توجہ ایک بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ میرے شہر کے تقریباً ہر بزرگ کا یہی خیال تھا کہ انسان چاند تک نہیں پہنچ سکتا۔ پھر جب انسان چاند فتح کر چکا اور وہاں سے واپس بھی لوٹنے لگا۔ اب بھی ہمارے بزرگوں کو اس خبر پر یقین نہیں آیا اور جنھیں آیا وہ یہی کہتے رہے کہ تینوں خلا باز زمین پر زندہ سلامت نہیں آ سکتے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ دعائیں بھی مانگ رہے تھے کہ راکٹ اور خلا باز راستے ہی میں فنا ہو جائیں۔ جب شہر میں راکٹ کے برباد ہونے کی جھوٹی افواہ پھیلی تو ان بزرگوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ یہ سب اس لیے کہ ان بزرگوں کا خیال ہے کہ چاند تک جانے کی کوشش خدا اور قدرت سے ٹکرانا ہے۔ اس لیے کامیابی ہرگز نہیں ہو سکتی۔

میں اس خط کے ذریعے آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ جہاں آپ اپنے پرچے "پیام تعلیم" میں خلائی کارناموں کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہیں تھوڑی سی جگہ میں بزرگوں کی اس غلط فہمی کو دور کریں۔ میں نے پڑھے لکھے لوگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت کا مطلب ہے "کوشش

[illegible] کرکے پر انسان چاند تک پہنچ [illegible]
کی بھی وضاحت کریں۔

مختار احمد محمد ابراہیم [illegible]
مالیگاؤں (ناسک)

ارے صاحب! اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ پہلے ہی کہہ چکا ہے ہم نے تمھارے لیے آسمان اور زمین کو مسخر کیا ہے۔ اسلام علم کی ترقی میں روک لگاتا تو اتنے بڑے سائنس داں طبیب کیمسٹ کبھی پیدا نہ ہوتے۔ یورپ نے انھی کی بنائی ہوئی بنیادوں کو بنیاد بنا کر ترقی کی ہے۔ اس کے قدم ترقی کی طرف ہیں اور ہم ان جاہلانہ باتوں میں الجھے ہوئے ہیں۔

ایڈیٹر

بہت ہی افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اب آپ پرچہ بھیجنا بند کر دیں۔ یہ پرچہ ممبروں کو پسند نہیں ہے ایک صاحب نے لائبریری کے لیے اپنے نام یہ جاری کرایا تھا جس کا خریداری نمبر ۵۶۹ ہے ممبروں کا کہنا ہے کہ یہ پرچہ کمیونسٹ خیال کا ہے۔ اس پرچے میں اسلام کی باتوں کو چھوڑ کر گاندھی اور لینن کی باتیں ہمیشہ رہا کرتی ہیں۔ یہ پرچہ مسلمان بچوں کا دماغ بدل کر رکھ دے گا۔ اس لیے اس پرچے کو بند کیا جا رہا ہے۔

محمد علی لائبریری گلونا۔

پیام تعلیم کوئی مذہبی یا سیاسی پرچہ نہیں ہے بچوں کا تعلیمی پرچہ ہے۔ اس میں ہر طرح کی معلومات فراہم کی جاتی ہیں اب یہ بات ناپسند کرتے ہیں پرچہ نہیں خریدتے ہیں تو یہ آپ کی خوشی۔

ایڈیٹر

[illegible] ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بارے میں جو باتیں

[illegible] رسالہ میں اکٹھا کی ہیں اگر ہم انھیں سے کچھ سبق

[illegible] سیکھیں تو کتنا اچھا ہو ___ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے

[illegible] زیادہ جاننے کی خواہش ہے۔ شاید کچھ دنوں

پہلے آپ نے "ذاکر نمبر" نکالا تھا اور وہ ختم بھی ہوگیا۔

اگر آپ آیندہ "ذاکر نمبر" نکالیں جیسا کہ آپ نے

خیال ظاہر فرمایا ہے تو مجھے بھی ایک کاپی مرحمت فرمادیں شکر گزار

ہوں گا۔ محمد معین الدین۔ خریداری ع ۱۲۸۳

گذشتہ ماہ پیام تعلیم کا "ذاکر صاحب صدر جمہوریہ ہند

کی یاد میں" خاص نمبر ملا تھا۔ اب جولائی کا تازہ شمارہ بھی

موصول ہوا ___ آپ نے بے حد خلوص کے ساتھ

صدر ہند آنجہانی کی یاد میں یہ مخصوص نمبر نکال کر تمام اردو داں

حضرات کے لیے قابل فخر یادگار قایم کی ہے۔ آپ نے اور

تمام فن کاروں نے نیز مقتدر ادبا و شعرا نے ذاکر نمبر دوم

میں اعلیٰ معیاری مضامین پیش کیے ہیں۔ انتخاب مضامین

بہت خوب ہے۔ ہر تخلیق میں سچی محبت اور عقیدت کوٹ

کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ آنجہانی صدر محترم کے لیے آپ

نے ان کی زندگی میں تو ایک شاہکار تحفہ پیش کیا ہی تھا اب

ان کی وفات حسرت آیات پر بھی آپ نے بلند پایہ یادگار نمبر

نکال کر اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے مبارک

ہو

مہر

جولائی کا پیام تعلیم ماشاء اللہ بے حد پسند آیا۔

بڑی طاقت کو چھوڑ سکتا ہے" "لال شہزادہ" وہ بے قصور تھا

بے حد پسند آئیں۔ لینن والے مضمون کا تو جواب ہی نہیں بیچ

پوچھیے تو ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کیے اٹھنے

کو دل نہ چاہا۔ بے حد دل چسپ پیرائے میں بیان کیا اندر کی

تصویریں اچھی نہ لگیں۔ اتنے سال ہوگئے مصور صاحب

نے اپنا انداز نہ بدلا۔ تصاویر ایسی ہونی چاہییں کہ اصلی لگیں

جیتی جاگتی۔ کارٹون کا سلسلہ بھی شروع کر دینا چاہیے۔

سید حسن مہر مراد آبادی

آپ کا ذاکر نمبر دیکھا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مضمون

نگاروں کی تعریف کروں جنھوں نے اتنے مختصر عرصہ میں اتنے

خوبصورت مضامین لکھے یا آپ کی جنھوں نے ایسے خوبصورت

مضامین جمع کیے۔ بہرحال نمبر قابل تعریف ہے۔ خلیق انجم اشرفی

محترم معظم مرحوم صدر ذاکر حسین صاحب کے

اچانک انتقال کر جانے پر ہم لوگوں کو بہت غم ہوا۔ ہمارے

یہاں ۳ مئی تاریخی دن ہوگیا۔ ہمارے بھانجے اسعد اقبال احمد

کا ختنہ ۸ بجے صبح میں ہوا تھا۔ اس لیے اس کے ختنے کی تاریخ

ہم لوگوں کو ہمیشہ یاد رہے گی جس طرح صدر جمہوریہ ہند کے

انتخاب کے بعد ایک خاص نمبر نکالا تھا اس سے زیادہ آب و

تاب کے ساتھ ایک یادگار نمبر نکال لیے۔ مضامین سبھی پسند آئے۔

نظمیں بھی خوب رسیلی ہیں۔ خاص طور سے "برسات" "ننھے

میاں کا خواب" "لینن اپنے بچپن میں" "آسٹریلیا کے چند انوکھے

جانور" وغیرہ وغیرہ۔ خالدہ خاتون ملک بسنوی دربھنگہ

اِدھر اُدھر سے

بنا پروں کے اُڑیے

بچپن میں آپ نے اپنی امّی دادی اماں سے پریوں یا دیووں کے ہوا میں اڑنے کی کہانیاں سنی ہوں گی۔ یہ سب خواب و خیال کی باتیں تھیں۔ پر اب تو نیا زمانہ ہے اور اب بات ہوائی جہازوں سے بھی آگے بڑھ گئی ہے کہیں آگے ماورا ب جناب آپ بھی اڑ سکتے ہیں۔ مزہ یہ کہ بغیر پروں کے اڑ سکتے ہیں۔ پرندوں کی طرح آپ کو پر پھڑپھڑانے کی مطلق حاجت نہ ہوگی۔

ایک خبر ہے کہ نئے قسم کی راکٹ بیٹی ایجاد ہوئی ہے بیٹی ایجاد کرنے والی فرم امریکہ کی ہے۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ ایک ہوائی اڈے پر اس بیٹی کا تجربہ کیا گیا۔ اس بیٹی کو لگا کر ایک آدمی پچیس فٹ کی اونچائی پر ۸۰ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتا رہا ہے۔ دو فٹ لمبا اور ایک فٹ قطر کا جیٹ انجن اس بیٹی میں لگا ہوا ہے۔ انجن میں مٹی کے تیل جیسا کوئی ایندھن استعمال ہوتا ہے۔

ایک ناتربیت یافتہ نوجوان نے ہوائی جہاز چلایا

بیس سال کا ایک نوجوان جس نے کبھی ہوائی جہاز نہیں چلایا تھا۔ پرنس جارج (برٹش کولمبیا) کے ہوائی اڈے پر ہوائی جہاز کو سلامتی کے ساتھ اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔

ہوا یہ کہ جہاز کے پائلٹ یا ہوا باز کا دل کی حرکت بند ہونے سے اچانک انتقال ہو گیا۔ یہ نوجوان فوراً اس کی جگہ آ گیا اور جہاز کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ ایک اور ہوائی جہاز نے اس کی رہنمائی کی اور کنٹرول ٹاور اسے ہدایتیں دیتا رہا۔ انسان اس طرح کے ناگہانی حادثوں کے وقت ہوش حواس اور سوجھ بوجھ سے کام لے تو بہت سی آفتیں ٹل جاتی ہیں۔

کھلاڑی بھی بکنے لگے

ایک نئی بات سنیے کھلاڑیوں کی خرید فروخت بھی ہوتی ہے اور جناب انگلستان میں ہوتی ہے۔ وہاں اگست میں فٹ بال کھیلنے کا سیزن شروع ہوتا ہے۔ اور فٹ بال کے مشہور کھلاڑیوں کی خرید فروخت کا سلسلہ زور شور سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس سال کھلاڑیوں کے دام پچھلے سال کے مقابلے میں بہت چڑھ گئے۔ انگلستان کے مختلف کلب کھلاڑیوں کی خریداری پر اب تک ۱۵ لاکھ ۳۰ ہزار پونڈ خرچ

کر چکے ہیں۔ اب خاص خاص کھلاڑیوں کی قیمتیں بھی سنیے

۱- ایئن کلارک ۳۰ لاکھ ۴۵ ہزار روپیے۔

۲- کولن سمتھ ۱۹ لاکھ روپیے۔

۳- سمروس پولش ۱۶ لاکھ روپیے۔

۴- جم اسمتھ ۱۹ لاکھ روپیے۔

ان کے علاوہ چھ اور کھلاڑیوں کو بارہ لاکھ سے ۱۴ لاکھ تک خرید اگیا۔

قسمت کا دھنی

ابھی کچھ دنوں پہلے ایک ہندوستانی کو امریکہ سے ۔۔ دہ کروڑ روپیہ ملاہے۔ اب سے کوئی چالیس برس پہلے (۱۹۲۹ء میں)، اتر پردیش کے ایک صاحب ٹھاکر چندروپ سنگھ امریکہ چلے گئے۔ اور وہاں کے مشہور شہر شکاگو میں کاروبار کرنے لگے۔ کاروبار میں انھوں نے بہت ترقی کی اور کروڑوں روپیے کمائے۔ انھوں نے شادی نہیں کی۔ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے ایک وصیت لکھی جس کے مطابق مرنے کے بعد ساری جائداد کا وارث اپنے بھائی گمبھیر سنگھ صاحب کو مقرر کیا۔

چندروپ سنگھ صاحب کا گذشتہ ۱۲ر مارچ کو شکاگو میں انتقال ہوا۔ اور اس طرح ان کی چودہ کروڑ روپے کی بھاری جائداد قانونی طور پر ان کے بھائی کے حصے میں آئی ہے۔ جس کے تمام متعلقہ کاغذات شکاگو کے اٹارنی گمبھیر سنگھ صاحب کے پاس بھیج دیئے ہیں۔

گمبھیر سنگھ صاحب سچ مچ قسمت کے دھنی ہیں۔ اس وقت اس کی عمر ۷۵ سال ہے۔ وہ لکھیم پور کھیری میں

ایک زراعتی فارم چلاتے ہیں۔ ان کا لڑکا جوالا سنگھ آگرہ کی ایک فوجی ورک شاپ میں پینٹر کا کام کرتا ہے۔

۱۶ سو مغلئی کھانوں کا سراغ مل گیا۔

مغل بادشاہوں کی اور باتوں کے ساتھ ان کے کھانے بھی مشہور تھے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ غریبی آتی گئی۔ لوگ ان کھانوں کو بھی بھول بھال گئے جو باورچی یہ کھانے پکاتے تھے۔ وہ پڑھے لکھے تو ہوتے نہ تھے۔ پکانے کی ترکیبیں اپنی اولاد کو بتا جاتے تھے۔ اس طرح یہ فن سینہ بسینہ چلتا تھا۔

مگر رنجیت ہوٹل کے اسسٹنٹ مسٹر ککڑ نے کمال کیا۔ اس فن پر تین قلمی کتابیں ڈھونڈھ نکالیں یہ کتابیں فارسی زبان میں ہیں۔ ان میں دیمک لگ گئی ہے۔ اس لیے انھیں پڑھنے اور سمجھنے میں انھیں بیس برس لگ گئے۔ اب انھوں نے اس کے بہت سے حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کرلیا ہے۔ اب تک جتنے حصے کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ اس کے مطابق خالی نان یا روٹی کی ۲۵ قسمیں ہیں۔ بریانی کی ۵۰، دو پیازہ کی ۷۵، کباب کی ۸۰، قورمے کی ۳۰، پراٹھوں کی ۵۰، اور دال کھچڑی کی ۳۰۔ جیسے ان کتابوں میں کل سولہ سو کھانوں کی ترکیبیں ہیں۔

ککڑ صاحب نے ان میں سے کچھ کھانوں کا تجربہ بھی کیا۔ ۱۹۶۸ء میں انکٹاڈ کانفرنس ہوئی تھی دنیا بھر کے نمایندے اس میں شریک ہوئے تھے۔ اس موقع پر یہ مغلئی کھانے پیش کیے گئے تھے اور بہت پسند کیے گئے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ کے لیے ۔۔۔ پرس ۔۔۔ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔
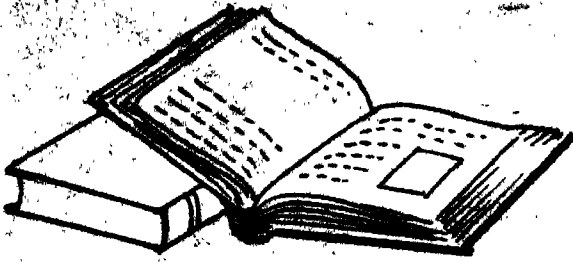
کتابوں کی باتیں

اعتمادیہ سالانہ نمبر (بیادِ غالب)

ضخامت ۲۲۸ صفحے۔ سائز ۱۸×۲۲

لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ ٹائٹل پر مرزا غالب کی رنگین تصویر۔ بلاک کی تصویروں کے پانچ صفحے اس کے علاوہ۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ

اینگلو عربک ہائر اسکول، اجمیری گیٹ دہلی ۶

اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول کا یہ سالانہ پرچہ ہر سال نکلتا ہے۔ بڑی شان سے نکلتا ہے ہر بار اس میں کوئی نہ کوئی خاص بات ہوتی ہے۔ اب کے یہ غالب کی یاد میں نکلا ہے اس میں مرزا غالب کی زندگی پر ان کی شاعری پر اچھے اچھے مضمون ہیں بڑوں کے بھی اور بچوں کے بھی سب سے پہلا مضمون مرزا محمود بیگ صاحب کا ہے۔ (غالب بہ سلسلۂ استادانِ سخن) یہ اپنی جگہ خود ایک شاہ کار ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر تنویر احمد، عبدالصمد سیفی پریمی، غلام احمد فرقت، خواجہ احمد فاروقی اور دوسرے بھاری بھرکم لوگوں نے رسالے کو نوازا ہے اور اس سے رسالے کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ طالب علموں نے بھی اپنے اپنے مضمون بڑی محنت اور سلیقے سے لکھے ہیں۔

رسالہ ہمیشہ کی طرح اردو، ہندی، انگریزی تین زبانوں میں نکلا ہے۔ ہندی اور انگریزی میں زیادہ تر مضمون غالب کے بارے میں ہیں۔ رسالے کے چیف ایڈیٹر محمد قاسم صدیقی صاحب ہیں۔ رضا احمد صدیقی صاحب (یازدہم) ابو سعید صاحب (یازدہم) ریاض الحق صاحب راشد (یازدہم) ان کے معاون ہیں۔ ان سب کی محنت اور سلیقہ شعاری نے رسالے کو یادگاری چیز بنا دیا ہے۔ محمد قاسم صاحب ہمارے جانے پہچانے بزرگ ہیں بہت عرصے سے یہ کام ان کے سپرد ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے کیا مضمونوں کے اعتبار سے اور کیا ظاہری سج دھج اور شان کے اعتبار سے نمونے کا رسالہ بنا دیا ہے۔

اعتمادیہ (حصہ دوم) یہ رسالہ آٹھویں درجے تک کے بچوں کا ہے۔ مضمون بھی زیادہ تر انھی کے معیار کے ہیں غالب کا حصہ اس میں بھی غالب ہے لکھنے والوں میں شفیع الدین نیّر اور مولانا مقبول احمد سیوہاروی کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ ذاکر صاحب کی ایک کہانی "آخری قدم" اور غلام حیدر ایم اے کا مضمون دونوں "پیام تعلیم" کے "ذاکر نمبر" سے نقل کیے گئے ہیں۔

یہ پرچہ ۸۸ صفحے کا ہے ۲۰ صفحے اردو کے اور باقی ہندی کے۔ مجموعی اعتبار سے یہ پرچہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ بھی ویسا ہے۔ ٹائٹل پر بھی مرزا [illegible] تصویر ہے یہاں [illegible] ذاکر صاحب کی اور آخر

پیام تعلیم

امین میاں کے دونوں بچے

ریاستہائے [illegible] مدھیہ پردیش، بہار، جموں وکشمیر، اڑیسہ، ہریانہ کے
تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

جلد ۶، اکتوبر ۱۹۶۹ء شمارہ ۱۰

ایڈیٹر:۔ محمد حسین حسان ندوی

صدر دفتر:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

شاخ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ۔ علی گڑھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے سالانہ چندہ ۶ روپے۔

فہرست

پچھلے پرچے میں آپ نے تایا جان یوسف ناظم صاحب کا مضمون پڑھا تھا "کیوں میں ہم بھی ہیں" اس پرچے میں اپنے ایک اور پرانے مضمون نگار محترم اظہر افسر صاحب کا مزے دار مضمون پڑھیے۔ ستمبر کے پرچے میں ہم نے اسی مضمون کا ذکر تو کیا تھا۔ اظہر صاحب بہت ہی مصروف آدمی ہیں۔ انھوں نے آپ کی خاطر اتوار کی چھٹی اس مضمون کی نذر کردی۔ رات کے دس بجے مضمون ڈاک میں ڈال کر اطمینان کا سانس لیا۔

پچھلے پیام تعلیم میں چاند کے سلسلے کے دوسرے مضمون "چاند کی سیر کی جھلکیاں" "چاند کی مہم" خلا کا مسافر (کہانی) وغیرہ بھی کافی پسند کیے گئے۔ علقمہ شبلی صاحب، جناب کیف احمد صدیقی صاحب، جناب حافظ باقوی صاحب کی نظموں نے تو سچ مچ اس سلسلے میں اور بھی جان ڈال دی ہم ان تینوں کے شکر گزار ہیں۔

نئی تصویری کہانی نیلم اور قزح بھی سبھی بچوں کو اچھی لگی، کہانی جوں جوں آگے بڑھے گی دلچسپی بڑھتی جائے گی۔ اس کا اندازہ اس مہینے کی قسط سے ہو جائے گا۔

گھمنڈی اونٹ چھوٹوں نے بڑوں نے سب نے پسند کیا۔ ٹیگور، بارش، مینڈک تینوں مضمون بڑے پیامیوں نے خاص طور پر پسند کیے ٹیگور کا نمبر پہلا رہا۔ اور ہاں جاوید اشرف کی نظم بھی بہت مزے کی رہی۔

محترمہ آصفہ مجیب اور محترم پروفیسر محمد مجیب صاحب پچھلے دنوں اپنے صاحبزادے (محمد امین صاحب) سے ملنے ترکی تشریف لے گئے تھے۔ ہماری درخواست پر محترمہ آصفہ مجیب نے پیام تعلیم کے لیے مختصر سا سفرنامہ لکھا ہے۔ بہت دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ اس کی پہلی قسط اس پرچے میں پڑھیے۔ آپ کے سالنامے کے لیے بھی انشاء اللہ کوئی اچھی سی چیز مرحمت فرمائیں گی۔

پچھلے پرچے میں ہم نے کہا تھا کہ چاند پر پہلا قدم رکھنے کے بعد اس دنیا کا باسی آگے قدم بڑھائے گا دور دور کی خبر لائے گا۔ زہرہ اور مریخ پر کمند پھینکے گا۔ زہرہ اور مریخ کے حالات کی کھوج تو پہلے سے ہو رہی ہے پر اب اس میں نئی زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارے محترم بزرگ جناب غلام ربانی صاحب نے زہرہ پر ایک مضمون مرحمت فرمایا ہے۔ یوں سمجھیے کہ وقت کی چیز ہے۔ اس کا دوسرا حصہ اگلے نمبر میں پڑھیے۔

اس مہینے (اکتوبر) میں ہمارے باپو (گاندھی جی) کی پیدائش کو سو سال ہو جائیں گے۔ یہ پورا سال گاندھی شتابدی کا سال تھا۔ وقتاً فوقتاً باپو کی تعلیمات یا ان کی بتائی ہوئی باتوں کے سلسلے میں تمام دنیا کے ملکوں میں تقریبیں منائی گئیں۔ اب اس مہینے دہلی میں اور دہلی سے باہر زیادہ دھوم دھام رہے گی۔ باہر کے مہمان بھی آئیں گے۔ آزادی کی لڑائی کے بہت بڑے ہیرو اور باپو کے دلی دوست خان عبدالغفار صاحب بھی تشریف لائیں گے۔

ابھی ابھی پیام تعلیم کے دفتر سے ایک اطلاع ملی پربھنی میں ایک اسکول ہے ذاکر حسین ہائی اسکول۔ وہ رسالے کا خریدار رہا ہے۔ ذاکر صاحب کو قدرت نے استاد پیدا کیا تھا۔ اسی کام پر انھوں نے اپنی زندگی نچھاور کردی۔ عیش و آرام تج دیا۔ آخر عمر میں انھیں بڑے بڑے مرتبے حاصل ہوئے پر ان کا اپنا مشن

تو کچھ اور ہی تھا۔ تعلیم، بچوں کی تعلیم، بڑوں کی تعلیم، ایسی تعلیم جس سے پڑھنے والوں میں صحیح انسانیت پیدا ہو۔ اخلاقی قدریں رچیں بسیں۔ تعمیری ذہن پیدا ہو عجیب بات ہے کہ پربھنی جیسے دور دراز مقام کے صاحب دل حضرات نے ایسا صحیح اور نیک اقدام کیا۔ ذاکر صاحب کے نام پر اپنے اسکول کا نام رکھا۔ ہم ان کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ خدا کرے اس نیک مثال سے دوسرے بھی سبق حاصل کریں۔ یو پی والوں کے لیے تو یہ عبرت کا مقام ہے۔ ذاکر صاحب آندھرا میں پیدا ہوئے تھے۔ آندھرا والے ہم سے زیادہ انھیں اپنانے کو تیار ہیں۔ تازہ مثال آپ کے سامنے ہے۔

پچھلے پرچے میں ہم نے ایک درخواست کی تھی۔ پیام تعلیم کو اب کافی لوگ جان گئے ہیں۔ بچوں کے لیے اسے مفید سمجھتے ہیں۔ پیام تعلیم کے ہمدرد بزرگ اور ساتھی مقامی طور پر اگر کوشش کریں تو کامیابی یقینی ہے، ہماری یہ درخواست ابھی شایع بھی نہیں ہوئی تھی کہ سورت کے محترم آدم بھائی پٹیل صاحب کا نوازش نامہ ملا۔ انھوں نے بغیر ہماری درخواست کے محض اپنی ہمدردی کی بدولت کوششیں شروع کر دی ہیں۔ ابھی تک تین اسکولوں کو خریدار بنا سکے۔ اور اسکولوں کے لیے کوشش جاری ہے۔ انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔ ہمارے لیے یہ بہت نیک شگون ہے خدا کرے آدم بھائی پٹیل جیسے ہمدرد ہر شہر ہر گاؤں میں پیدا ہو جائیں۔

آدم بھائی پٹیل کے تین خریداروں کے علاوہ اس مہینے شاہد صاحب (انچارج شاخ بمبئی) نے چھ خریدار مرحمت فرمائے۔ مبشر احمد صاحب ورنگل، اقبال نصیب صاحب برہان پور، یزدانی صاحب حیدر آباد، مولانا بدرالدین صاحب جامعہ نگر، محمد طاہر صاحب نانپارہ، محمد ذہین صاحب (انچارج شاخ مکتبہ جامع مسجد) آفاق احمد صاحب دکارگن مکتبہ) نے ایک ایک خریدار فراہم کیا۔ عبدالحمید صاحب پربھنی، ام زیڈ انصاری صاحب جمشید پور محمد کمال صاحب منگلور، محمد ہارون صاحب بریلی سید رؤف صاحب پارسی ناگی اپولہ، مولانا دلاور خاں بسم اللہ خاں کوپر گاؤں احمد نگر، محمد میران صاحب بھٹکل عبداللہ صاحب عطا سرائے پٹنہ خود خریدار بنے ہیں اور وہاں بی بی رضا ہائی اسکول گلبرگہ۔ خالد ہائر سکنڈری اسکول بریلی مڈل اسکول دھارڈ بلڈانہ ہائر سکنڈری اسکول جامعہ اور ٹیچرس کالج جامعہ نے اپنی لائبریریوں کے لیے ایک سال کے لیے پیام تعلیم کی خریداری منظور فرمائی ہے۔

○

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔

پیام تعلیم سال بھر تک آپ کے پاس آتا رہا ہے۔ اس کے دل چسپ مضمون اور مزیدار کہانیاں آپ کو پسند آئی ہوں گی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ نہ صرف اس کے خریدار بنے رہیں گے۔ بلکہ اپنے دوستوں کو بھی خریدار بنائیں گے۔ اس لیے ۲۵ اکتوبر تک آپ سالانہ چندہ ۶ روپے منیجر صاحب پیام تعلیم کے نام بھیج دیجیے۔ آپ کا خریداری نمبر۔۔۔۔۔۔ ہے۔ اگر آپ نے ۲۵ اکتوبر تک منی آرڈر نہیں بھیجا تو آپ کا نام خریداری سے خارج ہو جائے گا۔

جناب سعادت نظیر

پودا

ایک ذرا سا پودا ہوں میں — باغ کا رہنے والا ہوں میں
دھرتی کی ہوں گود کا پالا — اور گگن کی آنکھ کا تارا
چاند نے میرا روپ بنایا — سورج نے پروان چڑھایا
ابر نے مجھ کو دودھ پلایا — اور ہوا نے مجھے جھلایا
ہری ہے میری ڈالی ڈالی — ان پر ہے پھولوں کی لالی
ڈالی ڈالی کلیاں چٹکیں — اور خوشی سے چڑیاں چہکیں
تتلی ہر سو گھوم رہی ہے — ننھی کلیاں چوم رہی ہے
بھونرا مجھ پر منڈلاتا ہے — آکر گیت سنا جاتا ہے
ڈھلتے ہی سورج سو جاتا ہوں — خواب میں اپنے کھو جاتا ہوں

اوس سے دنیا جب ڈھلتی ہے
آنکھ مری اس دم کھلتی ہے

چاند پر سفر کی تیاری

جناب اظہر افسر

افراد
چچا
چچی

چچا :- (باہر سے آتے ہوئے) - چاند - چاند - میں نے کہا چاند کہاں ہو تم -

چچی :- یہ کیسے بلا رہے ہیں آپ ؟

چچا :- ارے تمھیں بلا رہا ہوں اور کیسے بلا رہا ہوں -

چچی :- آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں -

چچا :- شرمندہ کرنے کی کیا بات ہے میں تو تمھیں جدید سائنسی تحقیقات کی رو سے بلا رہا ہوں -

چچی :- "سائنسی تحقیقات کی رو سے" یعنی ؟

چچا :- یہ تم نہیں سمجھو گی خیر رہنے دو، پہلے چلو، چلنے کی تیاری کرو -

چچی :- چلنے کی تیاری ؟

چچا :- ہاں! یہ کیا کر رہی ہو ؟

چچی :- آج تریاں بکنی ہیں نا - تریاں چھیل رہی ہوں -

چچا :- بھئی جلدی کرو نہیں تو عمر بھر تریاں ہی چھیلتی رہو گی -

چچی :- تو کچھ بولیے نا، آپ نے تو پریشان کر دیا - لو رکھ دیں میں نے تریاں، کہاں جانا ہے، بریلی جانا ہے -

چچا :- بریلی نہیں، چاند پر جانا ہے چاند پر -

چچی :- چا - چا - چا -

چچا :- ہاں - ہاں چاند پر "چا چا چا" کیا کر رہی ہو، اب تک میں نے سوا دو ارب ڈالر خرچ

کیسے ہیں۔

پچی:۔ آپ نے ؟

چچا:۔ ہاں میں نے یعنی امریکہ نے، ایک ہی بات ہے، جب کہیں چاند پر چلنے کا بندوبست ہو سکا۔ سو میرے تین دوست ہیں آرم سٹرانگ، آلڈرن اور کولنس۔ یہ تینوں ابھی ۱۶ رجولائی ۱۹۶۹ء کو چاند کی طرف جاکر اور چاند کی اچھی طرح سیر کرکے واپس آچکے ہیں۔

پچی:۔ ہاں یہ تو میں نے سنا تھا کہ انسان چاند پر اُتر چکا ہے۔

چچا:۔ اتر چکا ہے اور واپس بھی ہو چکا ہے اور اب پھر جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں نے ان لوگوں سے ساری خط کتابت کر لی ہے، اس بار میں بھی جا رہا ہوں۔ گھور گھور کے کیا دیکھ رہی ہو۔ میں تمھیں بھی لے جاؤں گا۔

پچی:۔ ہم لوگ چاند پر جائیں گے ؟

چچا:۔ نہ صرف جائیں گے بلکہ وہاں کی خوب سیر کریں گے، وہاں سے خوب بہت سی چیزیں لائیں گے۔

پچی:۔ تمھارے یہ تینوں دوست کیا لائے وہاں سے۔

چچا:۔ انھوں نے تو صرف وہاں کی خاک اور چند پتھر پسند کیے اور وہی لے آئے، میں لاؤں گا جو کچھ لاؤں گا۔ میرا مطلب ہے ہم دونوں لائیں گے جو کچھ لائیں گے۔

پچی:۔ کون کون جا رہا ہے۔

چچا:۔ تین چار آدمی اور ہیں۔ مگر سب باہر کے ہیں، ہندوستان سے صرف ہم دونوں ہی ہیں۔ کسی اور سے ذکر نہ کرنا، ہاں واپس آنے کے بعد چاہے جس سے کہتی پھرنا۔

پچی:۔ شہزادی اور اس کی بچّی کو بھی لے لیں گے جی، یا فاطمہ بیگم کو۔

چچا:۔ ہُنھ فاطمہ بیگم کو لے لیں گے۔ زیادہ جھنجھٹ بالکل نہیں۔ میں نے تمھارا اور اپنا انتظام بڑی مشکل سے کیا ہے۔ اوخوہ کیا کیا مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں۔

پچی:۔ آپ نے مجھ سے اب تک تو کچھ کہا نہیں۔

چچا:۔ اچھا ہوا جو نہیں کہا۔ ورنہ سارے خاندان کو ساتھ لے چلنے پر ضد کرتیں۔

پچی:۔ خیر چھوٹے کو تو لے چلیں گے جی۔

چچا:۔ بے کار باتیں نہ کرو۔ چاند پر پہنچنا کوئی کھیل ہے؟ چاند یہاں سے ڈھائی لاکھ میل دور ہے۔

پچی:۔ ڈھائی لاکھ میل دور! یہ چاند جو نظر آتا ہے ہمیں۔

چچا:۔ ہاں ۲ لاکھ ۳۹ ہزار میل۔

پچی:۔ اسی چاند پر ہم جا رہے، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔

چچا:۔ میری طبیعت تو بہت ٹھیک ہے، دیکھو کھانسی بھی نہیں ہے۔

پچی:۔ ڈھائی لاکھ میل دور ہم کیسے جائیں گے جی۔

چچا:۔ (قہقہہ لگاتا ہے) اسی کا تو میں نے انتظام کر لیا ہے۔ اپالو "۱۱" چاند کی سیر کرکے آچکا

ہے۔ اب ہم اپالو ۱۲ میں جائیں گے۔ تم نے
باتوں باتوں میں سب کچھ بھلا دیا۔ چلو چلو
جلدی کرو۔

چچی:۔ کم از کم دو تین جوڑے آپ کے اور دو تین
جوڑے اپنے تو رکھ لوں۔

چچا:۔ سنو سنو یہاں آؤ۔ چاند پر جانے کے لیے
بالکل الگ کپڑے ہوتے ہیں اور خاص لباس
ہوتا ہے۔ یہ کرتے پاجامے دوپٹے وہاں نہیں
چلیں گے۔ میں نے تمھارے لیے اور اپنے
لیے خاص لباس منگوالیا ہے۔

چچی:۔ رہنے دو جی وہ میلا ہو جائے گا تو یہ بدل
لیں گے۔ اے ہے میرا پیارا پیارا چاند۔

چچا:۔ وہ تمھارا پیارا پیارا چاند اب ویسا نہیں
رہا ہے۔

چچی:۔ کیوں کیا ہوا۔

چچا:۔ وہ گول گول خوبصورت چاند جس کے آج تک
سبھی گن گاتے تھے، پتہ ہے وہاں کیا ہے؟
ایسی زمین جس میں ہزاروں شگاف ہیں، گڑھے
ہیں اور رخنے ہیں، وہاں نہ ہرے بھرے درخت
ہیں، نہ ہریالی ہے، نہ پہاڑ ہیں، نہ دریا ہیں۔

چچی:۔ سچ!

چچا:۔ ہاں بس ایک لق و دق صحرا ہے کھوبڑ کھابڑ
چٹیل میدان ہے، دھول ہے پتھر ہیں، نہ
ندی نالے نہ آبشار۔

چچی:۔ نہیں نہیں جی ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

چچا:۔ دیکھو ایک کام کرو۔ اب آگے میں جو کچھ
کہوں اسے چپ چاپ سنتی جاؤ۔ اپنی طرف
سے کچھ نہ بولو۔

چچی:۔ کچھ نہ بولوں؟

چچا:۔ ہاں بالکل نہیں۔ بس بغیر سوچے سمجھے ہاں
ہاں کہتی جاؤ، ورنہ مجھے غصہ آجائے گا۔

چچی:۔ اچھا۔ اچھا۔

چچا:۔ میرے تینوں دوست مسٹر آرم سٹرانگ، مسٹر الڈرن اور
مسٹر کولنس اپالو ۱۱ میں جس کی تیاری میں تین لاکھ آدمیوں
سے کام لیا گیا تھا۔ ۱۶ جولائی کو روانہ ہوئے اس
راکٹ کی تیاری میں ۵۰۱ ملین ڈالر خرچ ہوئے
اور آنے جانے میں ۳۵ ملین ڈالر کا خرچہ آیا۔

چچی:۔ یہ تو بہت روپیہ ہوا۔

چچا:۔ بہت۔ بہت اندازے سے بھی زیادہ، میرے
ہر دوست کی پیٹھ پر ۱۲۰ پونڈ کا ایک بنڈل
تھا جس میں گیس، سیال ٹنکیاں، بجلی پیدا
کرنے کی مشینیں، پیغام بھیجنے اور وصول
کرنے کے آلات، ریڈیو اور ٹرانسسٹرز سب
تھے، انھوں نے وہاں سے تصویریں بھی
بھیجیں اور انھی مشینوں کی بدولت زمین
پر رہنے والوں سے بات چیت بھی کی۔

چچی:۔ آئی ہئی!

چچا:۔ ہاں لو میں تمھیں اپنے دوست آرمسٹرانگ
کا خط ہی نہ سنا دوں، دیکھو یہ وہ خط ہے
جو اس نے مجھے لکھا ہے "سنو، میرے

دوست کائنات کے بنتے وقت چاند زمین کا
ایک حصہ تھا۔ لیکن طرح طرح کی جغرافیائی
اور فلکیاتی تغیرات اور دل بدل کی وجہ سے
یہ زمین سے جدا ہوگیا اور زمین کے گرد
مداری گردش میں مصروف ہوگیا۔ یوں سمجھو کہ
زمین کے چاروں طرف چہل قدمی کرنے لگا۔
چاند زمین کا چھٹا حصہ ہے، اور یہ ۱/۶ حصہ
الگ ہو جانے کی وجہ سے زمین میں ایک
بہت بڑا گہرا گڑھا ہوگیا اس گڑھے پر پانی
نے قبضہ کر لیا۔ اور سائنس داں کہتے ہیں یہ
بحرالکاہل ہے۔"

چچی:۔ بحرالکاہل۔

چچا:۔ ہاں اور عجیب بات یہ ہے کہ بحرالکاہل کا رقبہ اور چاند کا رقبہ بالکل ایک ہے، اور چاند کی قوتِ کشش بھی زمین کی قوتِ کشش سے ۱/۶ ہے، یہی وجہ ہے کہ ۱۲۰ پونڈ کا آدمی چاند پر پہنچ کر صرف ۲۰ پونڈ کا رہ جاتا ہے۔

چچی:۔ دبلا تو نہیں ہوتا۔

چچا:۔ نہیں جسم تو وہی رہتا ہے مگر وزن ایک دم گھٹ جاتا ہے اس لیے چلنے پھرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے پھدک پھدک کر چلنا پڑتا ہے۔

چچی:۔ توبہ توبہ۔

چچا:۔ اور سنو لکھتا ہے "چاند کے چاروں طرف ہوا کی کوئی چادر نہیں اس لیے وہاں آواز کا بھی پتہ نہیں"۔

چچی:۔ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔

چچا:۔ کوئی نہیں۔

چچی:۔ پھر بات چیت کیسے کرتے ہوں گے۔

چچا:۔ کوئی ہوگا تو بات چیت بھی کریں گے کسی نے بات کی تو صرف ہونٹ ہلیں گے مگر آواز سنائی نہ دے گی۔

چچی:۔ تو جو لوگ جائیں گے وہ لوگ کیسے بات کریں گے۔

چچا:۔ وہ لوگ ریڈیائی سسٹم کے ذریعہ بات چیت کریں گے۔ انہی مشینوں کے ذریعہ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ سورج کی گرمی اور خلا کی خنکی دونوں براہِ راست چاند کی سطح پر اثر ڈالتی ہیں۔ اس لیے دن میں گرمی ۲۱۰ درجہ فارن ہائٹ تک پہنچ جاتی ہے اور رات میں سردی اس قدر پڑتی ہے کہ جسم کا خون جم جاتا ہے۔ خیر تم خط سنو، لکھا ہے یہ تو آپ جانتے ہیں کہ چاند زمین کے گرد اپنے محور پر چوبیس گھنٹے گھومتا رہتا ہے۔ اس کو اپنے محور پر گھومنے کے لیے ۲۹ یا ۳۰ دن لگتے ہیں۔ اس لیے زمین والوں کو ہمیشہ چاند کا ایک ہی رخ نظر آتا ہے۔ دوسرا رخ نظروں سے اوجھل رہتا ہے اور اس لیے چاند کی سطح پر چودہ دن مسلسل روشن دن رہے گا۔ چودہ دن مسلسل رات۔

چچی:- چودہ دن تک دن رہے گا اور چودہ دن تک رات؟

چچا:- ہاں اب سن لو کہ چاند جس کا قطر ۲۱۶۰ میل ہے اس پر اس قدر ہزاروں رخنے گڑھے اور شگاف کیوں ہیں۔

چچی:- کیوں ہیں؟

چچا:- شہاب ثاقب یعنی ٹوٹنے والے تارے ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کرتے ہوئے یہاں آکر گرتے ہیں اور ہر دفعہ ایک بڑا گہرا شگاف ڈالتے ہیں۔

چچی:- ٹوٹنے والے تارے زمین کی طرف بھی تو آتے ہیں جی۔

چچا:- ہاں ہاں یہ شہاب ثاقب زمین کی طرف بھی آتے ہیں۔ مگر زمین کے گرد کرۂ ہوائی کا غلاف جو ہے۔ جب یہ کرۂ ہوائی کے غلاف میں داخل ہوتے ہیں تو اوپر ہی اوپر جل کر راکھ ہو جاتے ہیں ورنہ اس زمین کا حشر بھی چاند جیسا ہوتا۔

خیر میرے دوست مسٹر آرمسٹرانگ نے لکھا ہے گیارہ سال نو ماہ اور سولہ دن کی مسلسل کوششوں کے بعد انسان آخر چاند پر پہنچ گیا۔

چچی:- انسان نہیں آپ کا دوست۔

چچا:- ہاں میرا یہی مطلب ہے یعنی اس کا یہی مطلب ہے، یعنی میرا مطلب ہے۔ خیر تم آگے سنو۔ ۴ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو پہلا اسپتنک خلا میں چھوڑا گیا تھا۔

چچی:- ہاں۔

چچا:- اور ۱۲ر اپریل ۱۹۶۱ء کو یوری گگارن نے پہلی بار خلا میں دور دراز سفر کیا اور اب ۲۱ر جولائی کو ہندوستانی وقت کے مطابق صبح آٹھ بج کر ۲۶ منٹ اور ۴۰ سکنڈ پر میرے دوستوں نے چاند پر قدم جما دیا۔ ساٹھ کروڑ لوگوں نے ٹیلی وژن پر انھیں دیکھا۔ جن لوگوں کو اخبار کے ذریعہ اور ریڈیو کے ذریعہ چاند کی اس فتح کی خبر پہنچی ان کی تو کوئی گنتی ہی نہیں ہے۔

چچی:- ہاں۔

چچا:- میرے دوست نے لکھا ہے چاند پر انسان کا پہنچنا صرف سائنس ہی کی فتح نہیں بلکہ انسان کے عزم اور ارادہ کی فتح ہے ہم لوگ چاند سے خاک اور پتھر کے نمونہ لائے ہیں۔ اور انھی چیزوں سے تحقیق و جستجو کے کئی نئے باب کھلیں گے۔

چچی:- دیکھو جی برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔

چچا:- ہاں ہاں کہو۔

چچی:- یہ باتیں تو وہ ہیں جو چھوٹا کل اخبار سے پڑھ کر سنا رہا تھا۔

چچا:- بھئی وہ ـ وہ۔ دیکھو انھی باتوں پر مجھے غصہ آجاتا ہے۔

چچی:- اچھا اچھا جانے دیجیے۔ بولیے میں کیا کیا

سامان رکھوں۔ آپ کہہ رہے تھے نا وہاں سخت سردی پڑتی ہے اور گرمی بھی سخت ہوتی ہے۔

چچا:۔ ہاں ہاں۔

چچی:۔ تو کچھ کپڑے گرم رکھتی ہوں کچھ کپڑے معمولی ہلکے پھلکے، دو صندوق ہوں گے، ایک آپ کے سامان کا ایک میرے سامان کا ایک صندوق کھانے پینے کے سامان کا۔

چچا:۔ کھانے پینے کے سامان کا۔

چچی:۔ ہاں مسالے دار کریلوں کا سالن، انباڑے کی بھاجی اور روغنی روٹی۔

چچا:۔ بس بس ٹھیک ہے۔ پھر بھی زیادہ نہ پکانا وہاں جا کر دیکھیں گے کہ وہاں کے حالات میں کیا پک سکتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں۔

چچی:۔ کیا سوچ رہے ہیں آپ ؟

چچا:۔ بھئی تم سوچ رہی ہو یہاں سے کیا کیا لے جاؤں۔ میں سوچ رہا ہوں وہاں سے کیا کیا لاؤں۔

چچی:۔ کیا لائیں گے آپ وہاں سے ؟

چچا:۔ یہ لوگ تو مٹی اور پتھر لے کر آئے ہیں، میں سونا چاندی اور جواہرات لاؤں گا۔ اب تو سمجھو اپنے دن پھر گئے ——— پھر گئے اپنے ——— اپنے دن۔

چچی:۔ اے جی کیا دن دن کر رہے ہو اتنا دن چڑھ آیا اب اٹھو گے نہیں، کب تک سوتے رہو گے۔

چچا:۔ دن ؟

چچی:۔ اور کیا۔ اٹھیے آج دفتر جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟ چلیے اٹھیے۔

چچا:۔ اَی ہئی۔ کیسے اچھے خواب سے جگا دیا تم نے۔

چچی:۔ خواب سے۔

چچا:۔ اور کیا، میں تمھیں چاند کی سیر کرانے کے لیے لے جا رہا تھا، ہم دونوں چاند پر جانے والے تھے اور وہاں سے میں سونا چاندی اور جواہرات لانے والا تھا۔

چچی:۔ سچی ؟

چچا:۔ اور کیا۔

چچی سونا چاندی اور جواہرات ؟

چچا:۔ ہاں۔

چچی:۔ تو پھر سے سو جائیے۔ سو جائیے۔ ہاں ہاں۔ سو جائیے۔

چچا:۔ اچھا۔ (خراٹے شروع ہوتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

پچھلے پرچے میں مینڈک والے مضمون کے مضمون نگار کا نام غلط چھپ گیا تھا۔ صحیح نام "قدیر جاوید پریکی ہے"

جنابِ آزاد بارانوی

خوشی میں غم بدل جائے اگر ہم ایک ہو جائیں	زمیں پر خلد[1] اُتر آئے اگر ہم ایک ہو جائیں
جہالت، مفلسی، بے روزگاری ختم ہو جائے	سماج اپنا سنور جائے اگر ہم ایک ہو جائیں
ہر اک وہ کام جو معلوم ہوتا ہے بہت مشکل	بہت آسان ہو جائے اگر ہم ایک ہو جائیں
ابھی اپنی یہ حالت ہے کہ ڈرتے ہیں زمانہ سے	زمانہ ہم سے تھرّائے اگر ہم ایک ہو جائیں
بہت ہیں ہم میں اب بھی بھیم و ارجن، حیدر و خالد	نہ کوئی سامنے آئے اگر ہم ایک ہو جائیں
نہ ہو بجلی کو یہ جرأت کہ تاکے آشیاں اپنا	نہ پھر صیاد ادھر آئے اگر ہم ایک ہو جائیں

بڑی بے چین ہوں گی گاندھی آزاد کی روحیں

انھیں کتنا سکوں آئے اگر ہم ایک ہو جائیں

[1] بہشت

محترمہ آصفہ مجیب

چند دن انقرہ میں

اب کی گرمیوں میں مجھے اپنے بیٹے محمد امین کے پاس انقرہ جانے کا سنہرا موقع ہاتھ آیا۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں وہاں رہتے ہیں۔

انقرہ بہت پہلے کبھی ترکی کا دارالسلطنت تھا پھر مصطفیٰ کمال پاشاہ نے ۱۹۲۰ء میں اس کو نئے ڈھنگ سے آباد کیا۔ پہلے اس کا نام انگورہ تھا اب یہی ترکی کا دارالسلطنت ہے۔

دلی سے ہمارا جہاز پین امریکن ساڑھے تین بجے رات کو روانہ ہوا۔ امریکن سیاحوں کا ایک بڑا گروہ سفر پر جا رہا تھا۔ اس میں بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں اور بچے سبھی شامل تھے۔ کچھ اور بھی مسافر تھے۔ نیند کوسوں دور تھی۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی مگر خوشی میں کچھ پتہ نہیں چلا۔ یہی لو اور امید لگی تھی کہ خدا، امین اور اس کی بیوی بچوں سے اب جلد ملائے گا۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو آسمان کے کنارے افق سے سپیدۂ صبح نمودار ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دودھیا روشنی جھلکنے لگی میلوں کا راستہ ہوائی جہاز نے کیسا دم بھر میں طے کیا۔ لیجیے صبح ہو گئی ہم طہران پہنچ گئے۔ ہوائی اڈے پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ جو مختلف سمتوں میں جا رہے تھے۔ کوئی پون گھنٹہ بعد ہمیں انقرہ جانے والا جہاز ملا یہ جہاز اتر رہا تھا تو ہم نے دیکھا ایک آدمی دونوں ہاتھوں میں نارنجی رنگ کی دو گول گول تختیاں سی لیے ہاتھ ہلا ہلا کر گویا جہاز کا استقبال کر رہا ہے۔ ہم اترے تو وہاں نو بجے تھے ابھی صبح ہی تھی۔ ہندوستانی حساب سے ہماری گھڑی میں بارہ بجے تھے "یہاں سورج دیر میں نکلتا ہے"۔

نظر اٹھائی تو دیکھا امین کی بیوی سوزانہ۔ چار برس سے کچھ اوپر بچی رخسانہ، اس سے چھوٹا لڑکا نسیم ارسلان اوپر کٹہرے کے پاس سے ہٹ کر ہماری طرف لپکے دونوں بچے مجھے اور مجیب صاحب کو ایسے چپٹے جیسے پہلے سے جانتے پہچانتے ہوں۔ حالانکہ بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔ سب سے مل کر اور بچوں کی میٹھی میٹھی باتیں جو سنیں تو سفر کی تکان کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ نہ نیند کی کمی کا کچھ احساس ہوا۔ امین کے ایک دوست بھی ساتھ تھے سب موٹریں بیٹھ کر گھر آئے۔ یہ نئی آبادی میں ایک پہاڑی پر بنا ہے۔ دو منزلہ ہے۔ اوپر کے حصے میں یہ لوگ ہیں۔ نیچے مالک مکان رہتے ہیں۔ ادھر زیادہ تر امریکن اور ترک آباد ہیں۔ یہ حصہ غازی عثمان پاشا کہلاتا ہے۔ بہت صاف ستھرا اور خوشنما ہے۔ پہاڑیوں پر گھروں کے اردگرد شمشاد کے اونچے سر سبز پیڑ شان سے کھڑے ہیں۔

کچھ زینے چڑھ کر ہم پھلواری میں آئے جو مالک مکان نے لگائی ہے، طرح طرح کے پھول کھلے ہیں کہیں پھلوں کے درخت اور ترکاریاں ہیں اور ہرا بھرا چمن ہے۔ میاں بیوی دونوں کو باغبانی کا بہت شوق ہے۔ خوب محنت اور دیکھ بھال کرتے ہیں۔

بلٹیا نے جو میرا ہاتھ پکڑا تو چلو چلو کہتی ہوئی اوپر تک میرے ساتھ گئی۔ اپنے کھیل کھلونے دکھا کر، دلچسپ حرکتوں اور پیاری پیاری باتوں سے خوش کر رہی تھی اور اس کی خوشی کا بھی اظہار ہو رہا تھا۔ وہ اُردو جرمن اور ترکی تین زبانیں بولتی ہے۔ مجھ سے، مجیب صاحب سے اور امین سے اُردو بولتی۔ ماں اور بھائی سے جرمن، ترکی کے لوگوں سے ترکی چھانٹتی۔ بھیّا کو صرف اپنی ماں کی بولی جرمن ہی آتی ہے۔ وہ جرمنی میں زیادہ رہا بھی تھا۔ اور ابھی تھوڑے دن ہوئے ترکی آیا، مجھ سے جرمن بولنے لگا۔ میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑا۔ میں اس سے اردو بولتی رہی، خوب تماشا تھا۔ اس سے دوستی بڑھانے کے لیے میں نے دو چار جرمن الفاظ سیکھنا شروع کر دیے۔

"این اولوٹمکٹ" ایک موٹر آتی ہے۔
"کپُٹ" ٹوٹ گیا۔
"سشَ" ختم ہو گیا۔
"ہائس" گرم۔

کبھی موقع سے اور کبھی اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بے موقع ہی بول پڑتی۔ وہ خاص نظروں سے مجھے دیکھ کر مسکراتا، وہی الفاظ دہراتا۔ پاس آ کر بہت زور روں سے باتیں کرنے لگتا۔ میں بغیر سمجھے ہی گردن ہلا کر ہاں ہاں کرتی اور ہنسی بھی آتی۔ قیاس سے تھوڑا بہت مطلب سمجھ لیتی۔ اب وہ دو چار لفظ اُردو کے بھی سمجھنے لگا۔ کچھ مشق بلٹیا کی وجہ سے ہو جاتی۔ غرض تین مختلف زبانوں کی کھچڑی سے بڑا تماشا رہتا۔ بہت مزہ آتا۔

مکان آرام کا ہے، دو سونے کے کمرے دو غسل خانے۔ بیٹھنے اور کھانے کا کمرہ ایک ہی ملا ہے کافی بڑا ہے۔ اس کے پاس صاف ستھرا باورچی خانہ ایک کوٹھری، باورچی خانے میں گیس کا چولھا ہے۔ بجلی کی کیتلی چائے بنانے کو۔ گرم اور ٹھنڈے پانی کے الگ الگ نل لگے ہیں، کپڑا دھونے کی مشین ہے، ان سب چیزوں کی وجہ سے کام میں بڑی آسانی رہتی ہے۔ اور منٹوں میں ہو جاتا ہے۔

گھر کا قصہ امین نے یوں بیان کیا کہ جب ہم مکان تلاش کرنے نکلے بلٹیا بھی ساتھ تھی۔ یہ مکان دور ہی سے آنکھوں میں جچ گیا۔ کرایہ پوچھا تو بہت تھا۔ ہم ہچکچا گئے۔ لیکن مکان کی مالکہ کو بلٹیا پر اتنا پیار آیا کہ ان کا جی چاہا کہ یہ بچی یہیں ان کے پاس رہے۔ انھوں نے کرایہ گھٹا دیا اور ہم یہاں آ گئے۔ کرایہ آٹھ سو لیرا ہے۔ جیسے ہندوستان میں روپیہ ہوتا ہے۔ یہاں لیرا ہوتا ہے۔ ہندوستان کے حساب سے ایک لیرا تقریباً نئے ۵، پیسوں کے برابر ہے۔ اس میں سَو قرص (پیسے)، ہوتے ہیں۔

مالکۂ مکان بلٹیا کو بہت چاہتی ہیں وہ ان کے پاس گھنٹوں کھیلا کرتی ہے اور شرارتیں کرتی ہے۔ وہ خوش ہوتی ہیں اور ان سب ہی کا بڑا خیال کرتی ہیں۔

ہر وقت ہر بات اور ضرورت کی فکر رکھتی ہیں یہی حال ہم لوگوں کے ساتھ رہا۔ بہت مہربانیاں کیں، ان میں بڑا خلوص ہے۔ دونوں میاں بیوی بڑی خوبیوں کے مالک ہیں ان سے مل کر ترکوں کے اخلاق۔ مروت اور طرزِ تپاک کا اندازہ ہوتا ہے ان کی ایک دوست یا عزیز مجھ سے ملیں تو ایسے گلے لگ گئیں جیسے کوئی اپنا عزیز مل گیا۔ مجھے یہی محسوس ہوا ان کی خوشی دیکھ کر۔ یہاں گاؤں والے جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو "سلام علیک" کہتے ہیں اور شہر والے "مرحبا" کہتے ہیں جب رخصت ہوتے ہیں تو "گلے گلے" کہتے ہیں شاید اس کا مطلب یہ ہوا کہ پھول کی طرح کھلو اور شاداب ہو۔

انقرہ پہاڑ کی طرح ہے سمندر کی سطح سے تین ہزار فٹ اونچا۔ موسم بڑا خوش گوار ہے۔ گرمی نام کو نہیں۔ جب پانی برستا ہے تو اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ جاڑوں میں خوب برف پڑتی ہے۔ گھروں کو گرم رکھنے کا اچھا انتظام ہے۔ کشمیر کی طرح شمشاد کے اونچے اونچے پیڑوں نے بڑا حسن پیدا کر دیا ہے کہیں دو دو چار چار کہیں قطار کے قطار عجیب بہار دکھاتے ہیں۔ شام کو بجلی جلتی ہے تو سارا شہر ایسا جگمگا اٹھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہر طرف چراغاں ہی چراغاں ہے۔ یہاں کے لوگ خوب صورت ہیں، خوب گورا رنگ ہے لباس انگریزی ہے۔ کچھ عورتیں ایک لانبا کوٹ اوپر سے پہن لیتی ہیں لانبے موزے اور سر کو ریشمی رومال سے ڈھک لیتی ہیں۔ کوئی کوئی برقع بھی پہنے ہوتی ہیں۔ گاؤں والیوں کے کپڑے بدقطع ہوتے ہیں کمر سے ایک تھیلا سا لٹکا ہوتا ہے جس کے نیچے کی طرف دو پائنچے الگ ہو جاتے ہیں جیسے شلوار کی مہری، لیکن وہ شلوار کبھی نہیں کہی جا سکتی۔ آستینوں دار کوٹ یا قمیص، سر پر رومال بندھا ہوا، کبھی کبھی ٹوکری میں کچھ سامان لیے باہر نظر آتی ہیں۔ ہندوستانی گاؤں کی عورتیں جو لہنگے پہنتی ہیں۔ ان میں بھی کچھ خوبصورتی اور شان ہوتی ہے، اس میں تو کچھ بھی نہیں۔ دیکھ کر جی گھبراتا ہے۔ سڑکیں چوڑی اور اچھی بنی ہیں موٹریں فراٹے بھرتی ہیں۔ بسیں کبھی چلتی ہیں۔ ٹیکسی بڑی آسانی سے ہر جگہ ہر وقت مل جاتی ہے۔ اسے یہاں "ڈولمس" کہتے ہیں۔ اس کی پہچان کے لیے بیچ میں اس کے گرد ایک نقشی پٹی بناتے ہیں۔ دور سے معلوم ہوتا ہے جیسے موٹر کو ہار پہنا دیا ہے۔ سیر و تفریح کے لیے باغ ہیں۔ بچوں کے لیے باغ اور پارک بہت اچھے ہیں۔ ان میں چھوٹی چھوٹی جھیلیں ہیں کھیل کود کا سامان جھولے وغیرہ ہیں۔ جیسے جامعہ نرسری اور مدرسے ابتدائی میں ہیں۔ پھلوں کی کثرت ہے اور زیادہ مہنگے بھی نہیں۔ لال لال خوب بڑی "اسٹابری" خوبانی سے ملتا ہوا ایک پھل بڑا میٹھا ہوتا ہے جسے یہاں شکرپارے کہتے ہیں۔ چشمے کا پانی پیا جاتا ہے جو بہت میٹھا اور ہاضم ہے۔ آدمی شیشے کی بڑی سی بوتل میں بھر کر اسے ایک جال میں رکھتا ہے اور پیٹھ پر لاد کر گھروں میں بڑے سے مٹکے میں ڈال جاتا ہے۔ اگر کسی وقت پانی ختم ہو جائے اور آدمی نہ آئے تو اس سے کچھ چھوٹی بوتلیں پانی سے بھری بازار میں مل جاتی ہیں۔ پانی کی قیمت دی جاتی ہے۔

(باقی آئندہ)

جناب غلام حیدر ایم اے

نیلم اور فرّخ

(۲)

مگر یہ بات شہزادے کے دل کو اس طرح لگ گئی تھی کہ وہ کسی طرح راضی نہ کیا جا سکا۔ آخر بیمار پڑ گیا۔ بیماری بڑھتی رہی۔ بادشاہ نے ہر طرف سے حکیم بلوائے وید بلوائے۔ اچھی اچھی دوائیں تیار کروائیں۔ مگر شہزادے کی حالت خراب ہی ہوتی گئی۔ کچھ دن بعد وہ اتنا کمزور ہو گیا کہ اب اس کے دوست بھی اُسے نہ پہچان سکتے تھے۔ فرخ کا باپ بہت پریشان رہنے لگا۔ آخر بادشاہ کے وزیر نے اُسے مشورہ دیا۔

بادشاہ:۔ وزیر صاحب، فرّخ کی طبیعت تو کسی طرح سنبھل ہی نہیں رہی ہے۔

وزیر:۔ حضور، شہزادے کی طبیعت اب دواؤں سے ٹھیک نہیں ہو سکتی۔

بادشاہ:۔ تو پھر کیا کیا جائے۔

وزیر:۔ شہزادے پر جو دھن سوار ہوئی ہے اسے پورا ہونا چاہیے حضور۔

بادشاہ:۔ تم کہتے ہو میں اسے شہزادی نیلم کے ملک جانے کی اجازت دے دوں؟ تم نے آج تک کسی کو وہاں سے زندہ واپس آتے سنا ہے؟

وزیر:۔ مگر حضور آپ یہ تو سوچیے کہ یہاں بھی تو شہزادے کی جان خطرے سے باہر نہیں ہے۔ پھر کیوں

آپ اسے اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع نہیں دے دیتے۔

چار ناچار بادشاہ نے اجازت دے دی۔ اور اُسی دن سے شہزادے کی طبیعت بہتر ہونی شروع ہو گئی۔ چند ہی دن میں فرخ بھلا چنگا ہو گیا اور آخر ایک دن دور دراز ملک کے سفر کے لیے چل کھڑا ہوا۔

جب شہزادہ چلا ہے تو اس کے ماں باپ روتے ہوئے کافی دور تک اس کے ساتھ آئے۔ شہر کی دیوار تک اس کے تمام دوست اور ساتھی چلے اور تمام شہریوں نے اُسے الوداع کہا۔

شہزادہ چلتا رہا، چلتا رہا وہ جنگلوں سے پہاڑوں سے، دریاؤں سے اور ویرانوں سے گذرتا چلا جاتا تھا۔ کبھی بھوکا، کبھی پیاسا، کبھی جنگلی جانوروں سے لڑتا، کبھی ان سے بچتا بچاتا، اپنی دھن میں مگن چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ اسے کچھ ایسا لگا کہ سامنے کچھ دور

کوئی عجیب سا جانور لیٹا ہے۔ وہ تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا اس چیز کے پاس پہنچا۔ اور جب اس نے غور سے دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہاں تو ایک آدمی لیٹا تھا۔ موٹا، بہت موٹا، بلکہ بہت ہی موٹا۔ شہزادے نے اتنی موٹی چیز اس سے پہلے کبھی دیکھی نہ تھی۔ اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ آدمی ہو سکتا ہے۔ بس وہ تو مٹی کا ایک بہت بڑا سا ٹیلا لگ رہا تھا۔ مگر وہ آدمی تھا بڑا دل چسپ۔ جیسے ہی اِن موٹو میاں نے شہزادے فرخ کو اپنے پاس دیکھا وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

موٹو میاں:۔ اگر تمھیں کسی ملازم کی ضرورت ہو تو تم مجھے ملازم رکھ سکتے ہو۔

فرخ:۔ مگر میں تم جتنے موٹے آدمی کا کروں گا کیا۔

موٹو میاں:۔ کیوں، اگر میں اس سے تین ہزار گنا موٹا اور ہو جاؤں، جو وقت آنے پر میں ہو بھی سکتا

ہوں، لیکن تمھاری خدمت اچھی طرح انجام دیتا رہوں تب تمھیں میرے مٹاپے سے کیا پریشانی ہو سکتی ہے ؟

فرّخ :- یہ بات تو ٹھیک ہے ۔ اچھا چلو میرے ساتھ ۔

اور دونوں چل پڑے ۔ کچھ دور آگے گئے تھے

فرّخ :- کیا سن رہے ہو ؟

کنیت :- سب کچھ ، جو کچھ اس وقت دنیا میں ہو رہا ہے میں سن رہا ہوں ۔ میں سب کچھ سن سکتا ہوں ۔ ہلکی سے ہلکی آواز میرے کان میں آجاتی ہے ۔ میں گھاس کے اُگنے کی آواز تک سن لیتا ہوں ۔

کہ انھیں ایک آدمی ملا ، ویسے تو اس میں کوئی بات خاص نہیں تھی مگر اس کے کان بہت ہی بڑے بڑے تھے ۔ وہ اپنے ایک کان کو زمین پر لگائے لیٹا تھا ، جیسے بڑے غور سے کچھ سن رہا ہو ، شہزادے کو اُس کی یہ حرکت کچھ عجیب سی لگی ۔

فرّخ :- تم کون ہو ، اور یہ کیا کر رہے ہو ۔

آدمی :- میرا نام کنیت ہے ، اور میں سن رہا ہوں ۔

فرّخ :- اچھا اگر یہ بات ہے تو بتاؤ کہ اُس بوڑھی ملکہ کے دربار میں اس وقت کیا ہو رہا ہے جس کی ایک بہت خوبصورت شہزادی ہے ؟

کنیت :- ہاں میں سن رہا ہوں ۔ میرے کان میں اس تلوار کی آواز آرہی ہے جس سے وہاں ایک شہزادے کو قتل کیا جا رہا ہے ۔

فرّخ :- اچھا ٹھیک ہے ، تم میرے کام آسکتے ہو ۔ چلو میرے ساتھ چلو ۔ وہ تینوں چل پڑے ۔

ابھی وہ بہت دور نہ گئے تھے کہ ایک میدان میں انھیں ایک آدمی کے دو بہت بڑے بڑے پیر نظر آئے - ہاں وہ تو صرف پیر تک ہی دیکھ سکے، پھر کچھ اور دور چل کر انھیں پتہ چلا کہ ان پیروں کے ساتھ ٹانگیں بھی جڑی ہوئی ہیں، لیکن باقی جسم اور سر وغیرہ تو وہاں نہیں نظر آرہے تھے - پھر وہ اور آگے چلے، چلتے رہے چلتے رہے، کئی گھنٹے چلنے کے بعد انھیں جسم بھی مل گیا اور پھر شام ہوتے ہوتے اس آدمی کا سر بھی نظر آیا -

شہزادے فرخ کو اِس آدمی کو دیکھ کر بہت ہی حیرت ہوئی۔

فرخ :۔ تم آدمی ہو یا شیطان کی آنت، جس کا کوئی سرا ہی نہیں ہے۔ کیا نام ہے تمھارا ؟

آدمی :۔ میرا نام لمبو خاں ہے۔ اور یہ تو کچھ لمبائی نہیں، اگر میں چاہوں تو اور بھی لمبا ہو سکتا ہوں۔ میری پوری اونچائی اونچے سے اونچے پہاڑ سے تین گنی ہو گی۔ خیر اگر تم مجھ سے کوئی خدمت لینا چاہتے ہو تو میں اس کے لیے خوشی سے تیار ہوں۔

فرخ :۔ اچھا، آؤ چلو، تم بھی میرے ساتھ۔ تمھیں بھی کہیں نہ کہیں کام میں لایا جا سکتا ہے۔

آگے کیا ہوا؟ یہ جاننے کے لیے نومبر کا شمارہ دیکھیے۔

نتیجہ دماغی ورزش

دیکھیے اس طرح زمین چار حصوں میں تقسیم ہو گی چاروں حصّے شکل میں بھی برابر ہیں اور پیمائش میں بھی۔

اگر ہم کسی رات آسمان کو غور سے دیکھتے رہیں تو معلوم ہوگا کہ پورا آسمان گھوم رہا ہے اور ستارے آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ ستارے سپاہیوں کے دستوں کی طرح آگے بڑھتے ہیں اس طرح کہ کوئی تارا اپنے ساتھیوں سے آگے پیچھے یا اِدھر اُدھر نہیں ہونے پاتا۔ ہزاروں برس گزر گئے اور لوگ یہی سوچتے رہے کہ یہ اَن گنت روشنیاں کیا ہیں، کہاں ہیں اور کتنی دور ہیں۔

آخر ایک زمانہ آیا، جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان ستاروں میں بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے ساتھیوں سے بچھڑ جاتے ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ یہ ستارے ٹھیک طرح چلتے چلتے کسی جگہ رُک جاتے اور کچھ دن ٹھہرنے کے بعد اُلٹے چلنے لگتے ہیں یعنی جدھر سے آئے تھے۔ اُدھر کو واپس جانے لگتے ہیں۔ کچھ دور چل کر رک جاتے اور پھر اپنے پہلے راستے پر لگ جاتے ہیں۔ ان کی اس بے ڈھنگی چال نے لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دیا۔ مگر آدمی میں سمجھ ہے۔ اس نے ان کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ آخر کار معلوم کر لیا کہ آسمان پر پانچ ستارے ایسے ہیں جو اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر اِدھر اُدھر سیر کرتے پھرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا نام سیارہ رکھا گیا۔ پہلے زمانے میں جو سیارے معلوم کیے گئے وہ عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل ہیں۔ ان میں سے ہم دوسرے ستارے یعنی زہرہ کا حال بیان کرتے ہیں۔

دن چھپتے ہی شام کو مغرب کی طرف ایک بڑا ستارہ دکھائی دیتا ہے، یہ اتنا روشن ہوتا ہے کہ آسمان کا کوئی ستارہ اس کی برابری نہیں کر سکتا یہی زہرہ ہے۔ اس کو انگریزی میں وینس، اور ہندی میں شکر کہتے ہیں۔

تمام ستارے صورت شکل میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں۔ ان میں سیاروں کو معلوم کرنا مشکل ہے۔ مگر زہرہ ایک ایسا سیّارہ ہے جس کے پہچاننے میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ یہ سیّارہ کبھی سر پر نہیں دکھائی دے گا۔ مشرق کی طرف بھی نظر نہیں آئے گا صرف مغرب میں افق سے اوپر دکھائی دے گا۔ اسے شام کا ستارہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی روشنی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ جب یہ اپنے کمال پر پہنچتا ہے تو اس کی روشنی زمین پر بھی پڑتی ہے اور اس میں ہم کو اپنا سایہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

زہرہ بڑی شان سے مغرب میں چمکتا ہے پھر رفتہ رفتہ نیچے ہوتا جاتا ہے، پھر دو مہینے بعد مشرق میں سورج نکلنے سے پہلے دکھائی دیتا ہے۔ اس کو صبح کا ستارہ بھی کہتے ہیں۔

زہرہ سورج کے آس پاس ہی دکھائی دیتا ہے۔
شام کو سورج چھپنے کے بعد مغرب میں اور صبح کو سورج
نکلنے سے پہلے مشرق میں اپنی بہار دکھاتا ہے۔ پہلے
زمانے میں لوگوں کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ شام کا ستارا
اور صبح کا ستارا دونوں ایک ہی ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھیے کہ یہ ستارہ جب شام کو
دکھائی دیتا ہے تو صبح کو نظر نہیں آتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا
کہ زہرہ کسی دن صبح اور شام دونوں وقت دکھائی دے۔

یہ سیارہ سال کے بڑے حصے میں دکھائی نہیں
دیتا۔ بلکہ ایک سال اور سات مہینے میں نظر آیا کرتا ہے
جس دن تم زہرہ کو کسی جگہ دیکھو تو سمجھ لو انیس مہینے پہلے
یہ سیارہ اسی جگہ تھا اور آئندہ انیس مہینے بعد پھر اسی
جگہ دکھائی دے گا۔

بات یہ ہے کہ ہماری زمین کی طرح زہرہ بھی
سورج کے گرد چکر لگاتا ہے۔ زمین ۳۶۵ دن میں
ایک گردش کرتی ہے اور زہرہ ۲۲۴ دن میں سورج
کا چکر لگاتا ہے۔ اس لیے ہر سال ہم اس کو نہیں
دیکھ سکتے۔ حساب لگانے سے معلوم ہوا کہ انیس مہینے
میں ایسا موقع آتا ہے کہ ہم زہرہ کو دیکھتے ہیں۔

اب تک جتنے سیارے معلوم ہوئے ہیں ان
میں زہرہ ہماری زمین سے زیادہ قریب ہے جسامت
میں بھی زمین کے لگ بھگ ہے۔ اس کے علاوہ اور
بھی کئی باتوں میں زمین سے ملتا جلتا ہے، اس لیے خیال
کیا جاتا ہے کہ شاید زہرہ میں بھی خدا کی ایسی مخلوق ہو جو
ہم سے ملتی جلتی ہو۔ بچو! ہم نے وعدہ کیا ہے کہ تم کو
زہرہ کی سیر کرائیں گے۔ مگر سفر کرنے سے پہلے اس
دنیا کا کچھ حال سن لو۔

زہرہ سورج کے گرد ۲۲۴ دن میں گردش
کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کا سال ۲۲۴
دن کا ہوتا ہے اور انھی سات مہینوں میں وہاں کے
موسم بدلتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے زہرہ کے موسم
ہمارے موسموں سے چھوٹے ہوتے ہیں۔

جس طرح ہماری زمین کرۂ ہوائی کے غلاف
میں لپٹی ہوئی ہے، اسی طرح زہرہ کے گرد بھی سینکڑوں
میل تک ہوا موجود ہے اور اس میں ہر وقت بادل
چھائے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بادل اتنے گھرے ہیں کہ
وہاں سے آسمان دکھائی نہیں دیتا۔ ہمارے آسمان
پر رات کو تاروں کا باغ کھلتا ہے۔ زہرہ ان تاروں
بھری رات سے محروم ہے۔ وہاں آسمان اور تارے
دکھائی نہیں دیتے۔

سورج سے زہرہ کا فاصلہ ہماری زمین
کی نسبت کم ہے۔ یعنی زہرہ سورج سے زیادہ قریب
ہے۔ اگر ہم زہرہ پہنچ جائیں تو وہاں کا سورج ہمارے
سورج سے دُگنا بڑا ہوگا۔ اس کی روشنی بھی ہماری دھوپ
سے دگنی تیز ہوگی، اور اس میں حرارت بھی دگنی ہوگی۔
کسی شخص کو اگر کسی سیارے یا ستارے کا نام معلوم
ہو جائے تو وہ ستارہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ اب
جس دن زہرہ تم کو نظر آئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ تمھارا
دوست آسمان سے تم کو دیکھ رہا ہے۔

جناب محمد امین ایم ۔ اے
دُلہن جو پگھل گئی
"بکومی! بکومی! بکومی! تم کہاں ہو؟"

دادی اور پوتا دریا کے کنارے ذرا دم لینے کو بیٹھ گئے۔ چلتے چلتے تھک گئے تھے، بوجھ بھی کچھ کم نہ تھا۔ درخت کے سائے میں تھوڑی دیر بیٹھ کر آرام کر لینا اچھا تھا۔

"دادی دیکھو سامنے ہپّو ہے" لڑکے نے کالی پیٹھ اور بھدی ناک دیکھ کر ہپّو پوٹمس (دریائی گھوڑا) کی طرف اشارہ کیا جو پانی کی سطح سے اوپر آ رہا تھا۔

"اور دیکھو اس کی بغل میں ایک مگرمچھ ہے" دادی اماں نے پانی کے دوسرے جانور کو دیکھ کر کہا۔

"دادی کہیں وہ باہر تو نہیں آ جائیں گے؟" لڑکے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ مگرمچھ کے سفید سفید تیز دانت دکھائی دے رہے تھے۔ دریائی گھوڑا بھی کسی کو کچل کر مار سکتا تھا

"نہیں بیٹے وہ سب سو رہے ہیں، وہ زیادہ تر پانی میں ایسے ہی پڑے رہتے ہیں ڈرو نہیں" دادی دریا سے ایک چھوٹی سی مچھلی نکال رہی تھیں۔

"کیا یہ دونوں ایک دوسرے سے لڑیں گے۔؟" لڑکا جانتا تھا کہ افریقہ کے بہت سے جانور ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں۔

"نہیں بیٹے یہ نہیں لڑنے والے، دریائی گھوڑا اور گھڑیال دونوں مل جل کر رہتے ہیں، یہ دونوں دوست ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بہت دنوں پہلے دنیا میں جانور ہی جانور پائے جاتے تھے دریائی گھوڑا اس وقت بادشاہ تھا اور یہ گھڑیال اس کی رانی تھی۔ کیا میں تم کو ایک کہانی سناؤں؟ میں نے بھی یہ کہانی اپنے گاؤں میں سنی تھی اس وقت سنی تھی جب میں تمھاری طرح چھوٹی تھی۔"

لڑکا بہت خوش ہوا، دادی سے کہا: "دادی اماں ضرور سنائیے۔"

"ایک وادی میں ایک بیوہ عورت تن تنہا رہتی تھی ایک دن اس کی جھونپڑی کے پاس سے مویشیوں کا ایک گلہ گزرا۔ رات میں کھانا پکاتے وقت اس نے ایک عجیب و غریب آواز سنی اس نے جاکر دیکھا تو قریب ہی ایک جھاڑی میں ایک ننھا سا بچھڑا پڑا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُدھر سے گزرتے ہوئے کوئی گائے بیاہ گئی تھی، گلے والے نے دیکھا نہیں اور گلّے کو ہنکا لے گیا۔

"یہ بچھڑا میرے لیے تحفہ ہے اللہ میاں نے آسمان سے بھیجا ہے میں تو جانوں یہ میرے مرحوم لاڈلے کے بدلے میں آیا ہے۔ میں اسے اپنے بچے سے کم نہ سمجھوں گی۔"

یہ بول بیوہ عورت کے دل سے نکلے تھے۔ بچھڑے کو اُٹھا کر وہ اپنی جھونپڑی میں لے گئی اپنی گائے کا دودھ اسے پلایا۔ پھر اس کو اٹھا کر وہ باہر لے گئی جہاں وہ نرم نرم گھاس کی پھنگیاں چن چن کر کھاتا۔ وہ اس بچھڑے کی اس طرح پرورش کرنے لگی گویا یہ اس کا حقیقی بچہ ہے

بچھڑا بڑا ہونے لگا اور ایک دن وہ جوان ہو کر پورا سانڈ بن گیا۔

ایک دن بادشاہ کے آدمی ادھر سے گزر رہے تھے انھوں نے اسے دیکھ لیا دیکھتے ہی بولے:۔

"اے عورت یہ سانڈ ہمارے ہاتھ بیچ دے، منہ مانگے دام ملیں گے۔"

"یہ عام سانڈوں جیسا نہیں ہے۔" عورت نے جواب دیا۔

"اس کا نام بکدی ہے مجھے یہ بہت عزیز ہے اور

میرے بچے کی جگہ لینے کے لیے خدا نے اسے آسمان سے بھیجا تھا۔
بکوی کو بیچنے کا سوال ہی نہیں۔"

بادشاہ کے آدمیوں نے محل میں جاکر کہا :۔

" بادشاہ سلامت ! اِدھر وادی میں ایک بیوہ
عورت رہتی ہے اس کے پاس خوب موٹا تازہ اور عمدہ قسم
کا ایک سانڈ ہے ، دیکھنے کی چیز ہے ۔ اس کا گوشت نرم
اور ملائم ہوگا، اسے آپ کے علاوہ کسی اور کو نہیں کھانا چاہیے"

دوسرے دن قصائی کو لے کر بادشاہ کے چھ
آدمی وہاں پہنچے اور انھوں نے بیوہ عورت سے کہا:۔

" بادشاہ کا حکم ہے کہ یہ سانڈ دے دو آج اُن
کے یہاں محل میں دعوت ہے ۔ تمھیں گوشت میں سے ایک
حصّہ ملے گا اس کے لیے تم جتنے دام مانگوگی ملیں گے" یہ
الفاظ سن کر عورت رو پڑی ۔

" بکوی کی جدائی بھلا میں کیسے برداشت کروں گی،
لیکن ادھر بادشاہ کا حکم بھی ہے میں کیسے انکار کر دوں۔"
یہ کہہ کر وہ زار زار رونے لگی۔

بادشاہ کے آدمی سانڈ کی طرف بڑھے۔ بکوی
خاموش تھا، اس کے سینگ ابھی پوری طرح نہیں نکلے
تھے لیکن جتنے بھی نکلے تھے وہ سخت اور نوکیلے تھے جب
وہ زمین کو کھرچتا اور آوازیں نکالتا تو بڑا ڈر لگتا۔ آدمیوں
نے اس کے قریب آنے کی ہمت نہیں کی۔ اس کو پکڑتے
اور رسی کا پھندہ گلے میں ڈالتے وہ ڈرے۔

" اپنے سانڈ سے کہو کہ وہ چپ کھڑا رہے" بادشاہ
نے حکم دیا ہے کہ ذبح ہی اسے ہم لے آئیں۔

" بکوی ! بکوی !" عورت نے روتے ہوئے کہا
" بیٹے میں کیا کروں۔ بادشاہ کا حکم نہیں ٹال سکتی
ان کے آدمی تمھاری گردن میں رسی ڈال رہے ہیں، تم
چپ ہو جاؤ۔"

عورت کی آواز سنتے ہی سانڈ اتنا سیدھا ہوگیا
گویا کہ وہ ایک میمنا ہے۔ اس کے گلے میں رسی پڑ گئی اور
اس کی ٹانگوں کو بھی اس طرح جکڑ دیا گیا کہ وہ چل تو سکتا
تھا لیکن رسی کے شکنجے سے نکل نہیں سکتا تھا۔

بادشاہ کے محل میں قصائی اور اس کے آدمیوں
نے جانور کو زمین پر پٹخ دیا۔ چھری سے اسے ذبح کرنے کی
کوشش کی، حیرت کی بات یہ کہ چھری کی دھار اس کی
کھال میں نہیں گھستی تھی۔ واقعی یہ تو بڑے غضب کا سانڈ
ہے معلوم ہوتا ہے آسمان کے خدا نے ہی اسے بھیجا تھا

" حضور! عورت کو بلوائیے" قصائی نے بادشاہ
سے کہا۔

" جب تک وہ آکر خود نہیں کہے گی، ہماری چھری
کام نہیں کرے گی۔"

اور یہ بات سچ تھی۔ گڑگڑا گڑگڑا کر جب
تک کہ عورت نے منت سماجت نہیں کی بکوی نے اپنے آپ کو
ذبح نہیں ہونے دیا۔

جیسا کہ وعدہ تھا، بادشاہ نے عورت کو گوشت
کا ایک حصّہ دینے کی کوشش کی۔

" میں بھلا بکوی کا گوشت کیسے کھا سکتی ہوں"
اس نے کہا۔

" وہ تو مجھ کو اپنی اولاد جیسا پیارا تھا۔"

" پھر بھی تمھیں کچھ نہ کچھ تو لینا چاہیے" بادشاہ

نے نرمی سے کہا۔ اس کے بعد اس کے آدمیوں نے ایک بڑے گھڑے میں بھر کر چربی عورت کے گھر پہنچا دی۔

بیوہ عورت کسی طرح اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس نے گھڑا اٹھا کر اپنی جھونپڑی کے پیچھے کہیں ڈال دیا۔ وہ کبھی بھول کر بھی اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی پر جب کبھی اس کو یاد ستاتی تو مجبوراً چربی کو دیکھ دیکھ کر روتی اور کہتی :۔

"میرے پیارے میرے لاڈلے بکومی! اب بھلا میں تم کو کیسے پا سکتی ہوں؟"

لیکن اس کی جھونپڑی میں عجیب و غریب واقعات پیش آنے لگے۔ صبح کو جب وہ سو کر اٹھتی تو دیکھتی کہ اس کا سارا کام کاج مکمل ہے۔ فرش صاف ہے گھڑے میں پانی بھرا رکھا ہے۔ چولھے پر کھانا پک رہا ہے۔

"بھلا یہ سب کون کرتا ہے؟"

گتھی کسی طرح نہیں سلجھتی تھی۔

ایک رات اس نے طے کیا کہ سوئے گی نہیں اور دیکھتی بھالتی رہے گی۔

وہ رات بھر جاگتی رہی آخر جب پو پھوٹی تو جھونپڑی کے پیچھے اس نے ہلکی سی آواز سنی۔ بکومی کی چربی جس گھڑے میں رکھی تھی اسی میں سے یہ آواز آرہی تھی، پھر اس نے دیکھا کہ اس میں سے ایک جوان لڑکی نکل رہی ہے۔

لڑکی نے فرش صاف کیا، پانی لاکر رکھا پھر آگ جلائی۔ عورت یہ سب کچھ دیکھ کر چیخ پڑی۔ آواز سن کر لڑکی گھڑے میں گھسنے کے لیے بھاگی۔

"مجھ سے کیوں چھپ رہی ہو؟ تم میرے پیارے بکومی کی اولاد ہو"

عورت نے شرافت سے کہا۔

"میرے ساتھ رہو میں بالکل تنہا ہوں، تم میری لاڈلی ہو اور میں تمھیں بھی بکومی کہہ کر پکاروں گی"

اس کے بعد وہ عورت اور خوب صورت لڑکی وادی میں ہنسی خوشی رہنے لگیں۔ شروع میں بکومی کو کسی نے نہیں دیکھا جھونپڑی سے باہر وہ محض پانی لینے یا ایندھن کی لکڑیاں چننے جاتی۔

لیکن ایک دن صبح ہی صبح جبکہ کام کے لیے لڑکی باہر گئی ہوئی تھی ادھر سے گزرتے ہوئے ایک مسافر نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ قصبے کا سوداگر تھا اس وقت اپنے لیے اور اپنے خچر کے لیے پانی چاہتا تھا۔ بکومی نے اپنے گھڑے سے اُسے پانی دے دیا۔

"وادی میں جو بیوہ عورت ہے اس کے ساتھ ایک بڑی خوب صورت لڑکی رہتی ہے"

اس نے جلدی سے جاکر بادشاہ کو خبر کی۔

"لڑکی اتنی خوب صورت ہے کہ اس کو نظر بھر دیکھنے کی خوشی میں، میں پانی پینا بھی بھول گیا۔ وہ دلہن بنانے کے قابل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ محل ہی اسے زیب دیتا ہے"

یہ سنتے ہی بادشاہ بے قرار ہوگیا اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اس لڑکی کو محل میں حاضر کیا جائے۔ عورت بھی اس کے ساتھ آئی، وہ ڈری ہوئی

تھی۔ اس نے دیکھا کہ بادشاہ بکومی پر لٹو ہے تو وہ سمجھ گئی کہ وہ اسے اپنی ملکہ بنانا چاہتا ہے۔

"تمہاری بکومی میں سورج کی مانند چمک دمک ہے میں اسے اپنی رانی بنانا چاہتا ہوں، جتنی گائیں مانگو گی میں تمہیں دوں گا۔ تم امیر ہو جاؤ گی۔"

حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ کا دل قابو میں نہیں تھا وہ اس کی ساری بیویوں سے کہیں زیادہ حسین تھی

بادشاہ سلامت! مجھے انکار نہیں۔ میری لڑکی کو آپ ملکہ بنانا چاہتے ہیں شوق سے بنائیے۔" عورت نے بے چارگی سے کہا۔

"لیکن اس میں ایک راز ہے اور وہ راز اس نے خود مجھے بتایا ہے۔" بادشاہ کے قریب جا کر اس کے کان میں اس نے چپکے سے کہا:

"گھڑے میں میرے چہیتے سانڈ کی جو چربی رکھی تھی، بکومی اس سے پیدا ہوئی ہے، سورج کی دھوپ اور گرمی وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ جلتی ہوئی آگ پر کھانا بھی پک رہا ہو تو اسے کبھی اس پر جھکنا نہیں چاہیے ورنہ سمجھ لیجیے کہ وہ بہت نازک ہے اور فوراً پگھل جائے گی۔"

یہ کتنے اچنبھے کی بات تھی! بادشاہ نے سوچا لیکن کیا کرے وہ بھی مجبور تھا۔ لڑکی کو وہ دل سے چاہنے لگا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ یہ راز وہ کسی کو نہ بتائے گا اور برابر اس پر نظر رکھے گا۔

"بکومی پکتے ہوئے سالن پر کبھی نہیں جھکے گی میری سب سے بڑی ملکہ رہے گی۔ دوسری بیویاں گھر کا سارا کام کریں گی۔"

شادی ہو گئی اور شاندار دعوتیں ہوئیں بادشاہ کی دوسری بیویاں اس بات سے خوش نہیں تھیں کہ ان کے سر پر ایک نئی نویلی دلہن کو لا کر بٹھا دیا گیا ہے لیکن وہ بھی مجبور تھیں اور بادشاہ کے حکم کو ٹال نہیں سکتی تھیں۔

دن اور مہینے گزرتے گئے ایک دن بادشاہ نے اپنی ساری بیویوں کو بلا کر کہا۔

"میں آج شکار کھیلنے جا رہا ہوں اور سب غور سے سن لو! میرا یہ حکم ہے کہ بکومی کا درجہ سب سے اونچا ہے، اور وہ میری سب سے بڑی بیوی ہے تم لوگ اس کی مرضی کے مطابق کام کرنا۔ اس کے علاوہ اس بات کا خیال رکھنا کہ دھوپ میں پانی لینے کے لیے باہر نہ جائے، اس کا بھی خیال رکھنا کہ چولہے پر پکتے ہوئے سالن پر وہ جھکنے نہ پائے۔"

لیکن بادشاہ نے وضاحت نہیں کی کہ آخر اس کا راز کیا ہے۔

سب بیویاں خاموش رہیں اور جیسے ہی بادشاہ باہر گیا سب نے آکر بکومی کو گھیر لیا۔

"مانا کہ تم ہم سب کی سردار ہو۔" سب نے چیختے ہوئے کہا۔ "لیکن تم تو تنہا ہو، ہم بہت ساری ہیں اب جبکہ ہمارا شوہر بھی نہیں ہے تو تمہیں ہمارا کام کرنا ہو گا نہ یہ کہ ہم تمہارا کام کریں۔ ہم نے تمہاری بہت خدمت کی ہے لیکن آج پانی جا کر لاؤ گی، کھانا بھی تم ہی پکاؤ گی۔"

جب دریا پر پانی لینے کے لیے وہ پہنچی تو بادلوں نے سورج کو ڈھک لیا اس لیے اسے گرمی نہیں لگی لیکن پھر سب نے اسے مجبور کیا کہ آگ کے پاس جائے جہاں دوپہر کا سالن اُبل رہا تھا۔

"بکومی سالن کو چلاؤ آخر تم ایسی کیا نازک ہو کہ ذرا سی گرمی تم نہیں برداشت کر پاؤ گی۔"

بادشاہ نے یہ تو کسی کو بتایا نہیں تھا کہ بکومی کہیں پگھل نہ جائے۔

غریب بکومی ظاہر ہے کہ اتنی ساری بیویوں کے خلاف تنہا کیا کر سکتی تھی، وہ اُبلتے سالن پر جھکی اور اس نے نکلتی بھاپ کے بیچ سے چلایا۔

یک بیک ساری بیویاں ڈر کے مارے چیخ پڑیں اس لیے کہ انھوں نے دیکھا کہ ان کے گھر کی چہیتی بیوی غائب ہو رہی ہے۔ آگ پر رکھتے ہی مکھن جس طرح پگھلتا ہے وہ بھی بالکل اسی طرح پگھل رہی تھی۔

جہاں بکومی کھڑی تھی ایک سیکنڈ میں وہاں پیلی پیلی چکنائی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ چکنائی کا ڈھیر بڑھتا گیا، یہ پھیلنے لگا پھر ایک چشمہ کے مانند بادشاہ کے محل سے بہہ نکلا اور اس کے بعد میدان سے ہو کر وہ جا کر دریا میں مل گیا۔

پیلی ندّی کے پیچھے پیچھے بیویاں دوڑیں اور انھوں نے خود دیکھا کہ وہ دریا میں جا کر مل گئی۔

"چربی جم کر سخت ہو گئی" ایک بیوی نے حیرانی سے کہا۔

ارے دیکھو تو اس کی شکل گھڑیال جیسی ہو رہی ہے۔ ہائے بکومی نے اپنا حلیہ گھڑیال جیسا بنا لیا۔"

سب نے یہ تماشا دیکھا۔ ہر ایک کو یہ یقین کہ دریا کے ٹھنڈے پانی میں جو جانور تیر رہا ہے وہ بکومی کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں۔

یہ کہانی تم کو کتنی عجیب سی لگی ہوگی۔ لیکن بادشاہ یعنی بکومی کا شوہر جب واپس آیا اور اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ اس سے زیادہ تعجب میں ڈالنے والا ہے۔

کھانا اور پانی مانگنے سے پہلے اس نے اپنی چہیتی بیوی کو آواز دی۔

"بکومی! بکومی! اِدھر آؤ۔ تم کہاں ہو؟" اس نے محل میں چاروں طرف ڈھونڈھا۔ اس کی ساری بیویاں اس کے اردگرد جمع ہو گئیں لیکن بکومی کہیں ہو تو آئے۔ اس کی وہ بیوی جو پہلے مہارانی تھی ہمّت کر کے بولی:

"بادشاہ سلامت! اصل بات چھپانے سے کیا فائدہ۔ جب آپ یہاں سے گئے تو ہم نے مجبور کیا کہ بکومی چولھے پر چڑھے ہوئے سالن کو چلائے۔ ہم نے اس سے کہا کہ ابلتے ہوئے سالن کو جھک کر چلاؤ اس نے جیسے ہی یہ کیا وہ پگھل گئی گویا کہ وہ مکھن تھی پھر وہ ایک پیلا پیلا سا نالہ بن گئی اور بہہ کر دریا میں جا ملی۔"

بادشاہ بے چین ہو اٹھا۔ اسی لمحہ وہ بھاگ کر دریا پر پہنچا۔

"بکومی! بکومی! بکومی! تم کہاں ہو؟"

اس کی آنکھیں ڈب ڈبا آئیں اس لیے کہ وہ واقعی اس لڑکی کو دل و جان سے چاہتا تھا۔

بکومی کا کہیں پتہ نہیں، البتہ ایک جوان گھڑیال دریا کے کنارے تیر رہا تھا۔

بادشاہ کو حیرت ہوئی جب گھڑیال نے اس سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"میرے پیارے شوہر! دیکھو میں یہاں ہوں۔ دریا کے ٹھنڈے پانی میں بکومی آگ سے اور دوپہر کی دھوپ کی گرمی سے محفوظ رہ سکتی ہے۔"

خوشی میں چیخ کر بادشاہ اس کی بغل میں پانی کے اندر کود پڑا اور پھر کیا ہوا؟ یہ تو واقعی بڑی حیرت کی بات ہے۔

جیسے ہی وہ پانی میں داخل ہوا اُس کا جسم (ہپوپوٹیمس) دریائی گھوڑا بن گیا۔ اس وقت سے لے کر یہ دونوں؛ بادشاہ اور اس کی چہیتی ملکہ — دریائی گھوڑا اور گھڑیال پانی میں اطمینان سے اور آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، کبھی آپس میں لڑتے نہیں، دن میں جب بہت گرمی ہوتی ہے تب بھی وہ بھول کر خشکی پر نہیں آتے۔

لطیفہ

پہلا: اگر تم نے سمندر میں ڈبکی لگائی تو کہاں تک پہنچ سکو گے۔

دوسرا: موت کے فرشتے تک۔

خالد ریاض قاضی

جناب کیف احمد صدیقی
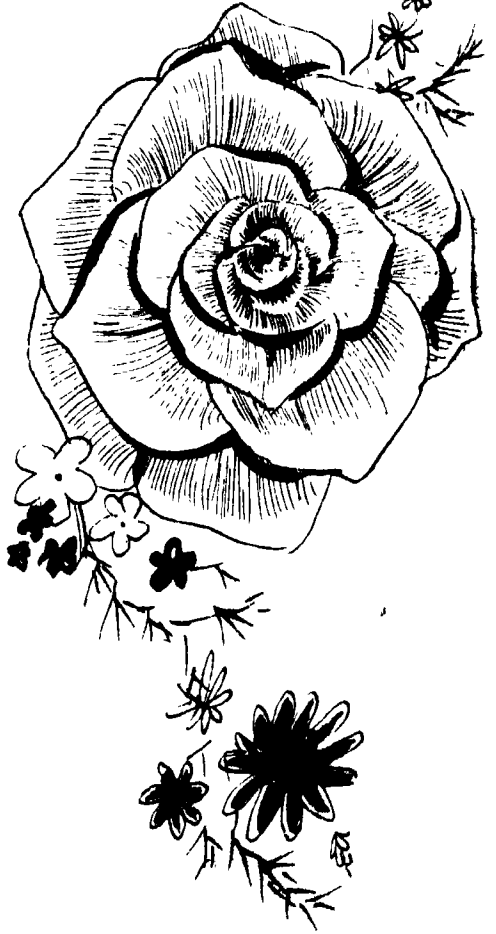
گلاب

سار ی دنیا میں لاجواب ہو تم
انتخابوں کا انتخاب ہو تم
امن وانسانیت کی آب ہو تم
اے گلستانِ ہند کے بچّو!
مسکراتے ہوئے گلاب ہو تم

تم ہو ہندوستاں کے مستقبل
تم سے روشن ہے جادۂ منزل
آرزوں کے ماہتاب ہو تم
اے گلستانِ ہند کے بچّو!
مسکراتے ہوئے گلاب ہو تم

کامیابی کی شاہراہوں میں
مادرِ ہند کی نگاہوں میں
جگمگاتے حسین خواب ہو تم
اے گلستانِ ہند کے بچّو!
مسکراتے ہوئے گلاب ہو تم

دُور دنیا سے تیرگی[1] کردو
سارے عالم میں روشنی کردو
علم و حکمت کے آفتاب ہو تم
اے گلستانِ ہند کے بچّو!
مسکراتے ہوئے گلاب ہو تم

تم سے دنیا میں شانتی پھیلی
مردہ قوموں میں زندگی پھیلی
اپنے مقصد میں کامیاب ہو تم
اے گلستانِ ہند کے بچّو!
مسکراتے ہوئے گلاب ہو تم

[1] اندھیرا

مہاتما گاندھی

بالاسندرم

دل کی سچی اور پاک آرزو ہمیشہ پوری ہوتی ہے میں نے خود اس اصول کی صحت کا بارہا تجربہ کیا ہے۔ غریبوں کی خدمت کرنے کی مجھے ہمیشہ آرزو رہی ہے۔ اس کی بدولت میں ان میں مل جل کر رہا اور انھی کا ہو رہا۔

نٹال انڈین کانگریس میں افریقی، ہندی اور محرر وغیرہ شامل تھے۔ لیکن بے سیکھے مزدور اور پابند مزدور ابھی شامل نہیں کیئے گئے تھے۔ ابھی تک کانگریس ان کی نہ تھی۔ ان لوگوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ چندہ دے کر اس کے کارکن بنیں کانگریس انھیں صرف اس طرح اپنا سکتی تھی کہ ان کی خدمت کرے۔ اس کا ایک موقع آیا۔ لیکن سچ پوچھیے تو ابھی تک نہ کانگریس اس موقع سے فایدہ اٹھانے کے لیے تیار تھی اور نہ میں تھا۔ ابھی مجھے وکالت شروع کیے دو تین ہی مہینے ہوئے تھے اور کانگریس بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تامل چیتھڑے لگائے اپنا پھٹیا (صافہ) ہاتھ میں لیے میرے سامنے کھڑا کانپ رہا ہے اور رو رہا ہے۔ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں اور اس کے منہ سے خون بہہ رہا ہے، مجھے اس شخص کا سارا حال اپنے محرر سے معلوم ہوا جو خود تامل تھا۔ آنے والے کا نام بالاسندرم تھا اور یہ نٹال کے ایک مشہور یورپی یا انگریز کے یہاں پابند مزدور تھا۔ اس کے آقا نے غصے میں آپے سے باہر ہو کر اسے اتنا مارا کہ اس کے دو دانت ٹوٹ گئے۔

میں نے اسے ڈاکٹر کے پاس بھیجا۔ ان دنوں وہاں صرف انگریز ڈاکٹر تھے۔ میں ایک تصدیق نامہ چاہتا تھا جس سے معلوم ہو کہ بالاسندرم کو کس قسم کی چوٹ آئی ہے۔ مجھے یہ تصدیق نامہ مل گیا اور میں نے فوراً بالاسندرم کو مجسٹریٹ کے یہاں لے جاکر بیان حلفی داخل کرا دیا۔ مجسٹریٹ اسے پڑھ کر آگ ہو گیا اور اس نے فوراً آقا کے نام سمن جاری کر دیا۔

میری ہرگز یہ خواہش نہیں تھی کہ آقا کو سزا دلاؤں۔ میں تو صرف بالاسندرم کو اس کے پنجے سے چھڑانا چاہتا تھا۔ پابند مزدوروں کے متعلق جو قانون تھا وہ میں نے پڑھا تھا۔ اگر معمولی نوکر بغیر پہلے سے اطلاع دیئے نوکری چھوڑ دے تو اس کا آقا اس پر دیوانی میں مقدمہ چلا سکتا ہے۔ مگر پابند مزدور کی حالت بالکل دوسری تھی۔ اس پر ایسی صورت میں فوجداری میں

مقدمہ چلایا جاتا تھا اور اگر وہ مجرم قرار پائے تو اسے قید
کی سزا ہوتی تھی۔ اس لیے سر ولیم ہنٹر نے کہا تھا کہ
پابند مزدوری غلامی سے کم نہیں۔ پابند مزدور بھی غلام
کی طرح اپنے آقا کی ملک ہوا کرتا تھا۔

بالاسندرم کو چھڑانے کی صرف دو تدبیریں
تھیں۔ یا تو پابند مزدوروں کے محافظ (ایک سرکاری
عہدہ دار جس کا کام یہ تھا کہ پابند مزدوروں کی نگرانی
اور ان کے حقوق کی حفاظت کرے) سے درخواست
کی جاتی ہے کہ اس کے معاہدے کو منسوخ کر دے یا
اسے کسی اور شخص کی ماتحتی میں دے دے یا خود سندرم
کے آقا سے کہا جاتا کہ وہ اسے سبک دوش کر دے۔ میں
نے اس کے آقا کے پاس جا کر کہا "میں یہ نہیں چاہتا
تھا کہ آپ پر مقدمہ چلاؤں اور آپ کو سزا دلاؤں۔
میرے خیال میں آپ کو خود یہ احساس ہوگا کہ آپ نے
اس شخص کو بری طرح مارا ہے۔ میرے اطمینان کے لیے
یہی کافی ہے کہ آپ اس کی خدمات کسی اور کے ہاتھ
بیچ دیں۔ اس پر وہ فوراً راضی ہوگیا۔ اس کے بعد
میں محافظ سے ملا۔ اس نے بھی رضامندی ظاہر کی
مگر اس شرط پر کہ میں خود بالاسندرم کے لیے کوئی
نیا آقا ڈھونڈوں۔

میں نے تلاش شروع کر دی۔ یہ شرط تھی کہ
آقا صرف فرنگی ہی ہو کیونکہ ہندوستانیوں کو پابند
مزدور رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ ان دنوں میری ملاقات
بہت کم فرنگیوں سے تھی۔ ان میں سے ایک سے میں

میں نے اس مہربانی کا دل سے شکریہ ادا کیا۔ مجسٹریٹ
نے بالاسندرم کے پہلے آقا کو مجرم قرار دیا اور
فیصلے میں لکھ دیا کہ وہ (باہمی تصفیہ کی بنا پر) بالاسندرم
کی خدمات کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنے پر راضی ہوگیا
ہے۔

بالاسندرم کے معاملے کی خبر ہر پابند مزدور
کو ہو گئی اور میں ان مزدوروں کا دوست سمجھا جانے لگا۔
مجھے اس رابطے کے پیدا ہونے سے بڑی خوشی ہوئی۔
میرے دفتر میں پابند مزدوروں کا تانتا بندھ گیا اور
مجھے ان کے رنج و راحت سے واقف ہونے کا بہترین
موقع ملا۔

اس معاملے کی گونج دور دراز مدراس تک
سنی گئی۔ اس صوبے کے مختلف حصے کے مزدور جو
معاہدہ کر کے نٹال جایا کرتے تھے اپنے بھائیوں کے
ذریعہ سے جو افریقہ میں تھے اس سے واقف ہو گئے۔

خود اس معاملے میں کوئی غیر معمولی بات نہیں
تھی۔ لیکن پابند مزدوروں کو یہ دیکھ کر کہ نٹال میں ایک
شخص ان کی مدد کے لیے کھلم کھلا ان کا ساتھ دینے
کے لیے موجود ہے، بڑی خوشی ہوئی اور ان کا دل امید
سے بھر گیا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ جب بالاسندرم میرے
دفتر میں آیا تھا تو اپنا پھنٹا (صافہ) ہاتھ میں لیے تھا۔
اس بات کا ایک افسوسناک پہلو تھا جس سے ہم لوگوں کی
ذلت ظاہر ہوتی تھی۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ مجھے عدالت

چاند کی سیر

جناب بختیار احمد

غبارہ دھیرے دھیرے اوپر اڑتا جا رہا تھا، اوپر اور اوپر ——— جب کافی دور جا نکلا تو بہت چھوٹا دکھائی دینے لگا۔ بچے یہ تماشا دیکھ کر خوشی میں تالیاں بجانے لگے۔ مگر نیّر بہت اداس تھا۔ اصل میں دھاگے سے بندھا ہوا گیس والا یہ غبارہ اسی کا تھا اور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ہوا کے کندھے پر اڑ رہا تھا۔ جب یہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو پارک میں اس کا جی بھی نہ لگا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر پہنچ کر بھی ماہتابی رنگ کا یہ بڑا سا غبارہ اسے بار بار یاد آرہا تھا۔ نیّر کو غباروں کا بڑا شوق تھا۔ تیوہاروں میں جب کبھی اسے پیسے ملتے تو ٹافی اور مٹھائی کے بدلے وہ رنگ برنگ کے غبارے خرید لاتا۔ روشنی میں یہ غبارے قمقموں کی طرح رنگین اور خوبصورت دکھائی دیتے۔ اور جب پھٹتے تو پٹاخے کی آواز پیدا کرتے۔

ماں اس کا اداس چہرہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئی۔ پر اصل بات معلوم ہونے پر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے نیّر کو دوسرے غبارے منگوانے کا لالچ دیا۔ مگر اس کے دل کا بوجھ کم نہ ہوا۔ آخر ماں نے کہانی سنانے کا وعدہ کیا۔ تب کہیں غبارے والی بات اس کے دل سے اُتری۔ کہانی سننے کا شوق اسے بچپن سے تھا۔ اور کہانی سننے کے شوق میں وہ اپنا غم بھول گیا۔ ماں نے بڑی اچھی کہانی سنائی چوری چھپے ہم نے بھی سن لی۔ اب آپ کو سناتے ہیں۔

سینکڑوں برس پہلے کی بات ہے۔ جب راکٹ اور جہاز نہیں بنے تھے۔ ہوائی سفر کے بارے میں تو کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

انھی دنوں ایک سہ پہر کو چند بچے چار بڑے غبارے لائے اور ایک کھٹولے کے چاروں پایوں سے ان چاروں غباروں کو مضبوطی سے باندھ دیا۔ پھر چاروں دلیر بچے کھٹولے پر سوار ہو گئے۔ غباروں میں گیس بھرا ہوا تھا کھٹولا دھیرے دھیرے زمین سے اوپر اٹھنے لگا۔ بلندی پر پہنچ کر یہ اڑن کھٹولا جیسے ہوا کی گود میں آگیا اور تیزی سے اڑنے لگا۔ بچوں نے نیچے کی طرف دیکھا۔ زمین کی ہر چیز چھوٹی نظر آرہی تھی۔ مکان اور عمارتیں ان کے بنائے ہوئے گھروندے لگتے تھے۔

اتنا کہہ کر ماں چپ ہو گئی ۔ اور نیرؔ کھٹولے میں بیٹھے بچوں کے بارے میں سوچ رہا تھا ۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ خود بھی اڑن کھٹولے پر سوار ہو اور اسی اونچائی سے زمین کا نظارہ کر رہا ہو ۔ پھر اچانک اس نے محسوس کیا کہ غبارے پھٹ گئے ہیں اور وہ ان بچوں کے ساتھ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح قلابازیاں کھاتا ہوا زمین کی طرف آرہا ہے ۔ اتنے میں اس کی ماں نے کہانی پھر شروع کر دی ۔

"اڑن کھٹولا اڑتا رہا ۔ شام ہو گئی تو دن بھر کا تھکا ماندہ سورج پچھم میں آہستہ آہستہ ڈوبنے لگا ۔ بچوں نے جب پورب کی طرف نظر دوڑائی تو پیارا چاند نکل چکا تھا ۔ اس کی دودھیا چاندنی بڑی خوبصورت لگ رہی تھی ۔ چاند جب کافی اونچائی پر آگیا تو اس میں بیٹھی ہوئی بڑھیا نے زمین کے ننھے مسافروں کو دیکھا ۔ وہ ان کے حوصلے اور بہادری کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی ۔ بڑھیا کا چرخہ چل رہا تھا ۔ اور وہ دیکھ رہی تھی کہ زمین کے نونہالوں کا خلائی قافلہ چاند کی جانب بڑھا چلا جا رہا ہے ۔ جب اس نے بچوں کے بھولے بھالے اور پیارے چہرے دیکھے تو اسے ترس آنے لگا ۔ اور اس نے فوراً اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اڑن کھٹولے کو حفاظت سے چاند پر لے آئیں ۔ حکم ملتے ہی پروں والے سپاہی ہوا میں تیرنے لگے ۔"

"ممی ! مگر بڑھیا کے پاس سپاہی کہاں سے آئے ؟ نیرؔ بیچ میں پوچھ بیٹھا ۔

"بڑھیا اصل میں چاند کی رانی تھی ۔ وہاں کی ہر چیز پر اس کا حکم چلتا تھا" ماں نے جواب دیا اور کہانی سنانے لگی "پھر آن کی آن میں پروں والے سپاہیوں نے اڑن کھٹولے کو سہارا دے کر رانی کے پاس لا حاضر کیا ۔ بچوں کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ وہاں کی ہر چیز چاندی کی طرح چمکدار اور خوبصورت تھی ۔ پیڑ، پودے جانور اور پرندے سبھی کچھ تھے مگر انسان کا کہیں نام و نشان نہیں تھا ۔ بھولے بھالے خوبصورت بچوں کو دیکھ کر رانی بہت خوش ہوئی اور زمین کے ننھے مسافروں کو اپنا مہمان بنا لیا ۔ اور یہ چاروں اپنا مزے سے وہاں رہنے لگے ۔ بلی کا ایک بچہ تو ان ننھے مسافروں کا دوست بن گیا ۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی ان بچوں کے ساتھ کھیلے ۔ اور زمین کے دوسرے بچوں کے بارے میں باتیں کرے ۔ مگر یہ تو تبھی ممکن تھا جب وہ بھی انسان کا بچہ ہوتا ۔ یہ خیال آتے ہی وہ بھاگا بھاگا رانی کے پاس پہنچا ۔ اور اسے اپنے دل کی بات بتائی ۔

تھوڑی دیر بعد رانی کا جادو والا چرخہ ایک بار تیزی سے گھوما اور بلی کا بچہ ایک خوبصورت انسان کا بچہ بن گیا ۔

"زمین کے ننھے مسافروں کی نظر اس بچے پر پڑی تو بہت خوش ہوئے ۔ اور اب چار کی جگہ پانچ بچے مل کر کھیلنے لگے ۔

تھوڑے دنوں بعد واپسی کی تیاری شروع ہوئی تو رانی نے ایک الوداعی دعوت کا اہتمام کیا ۔ محل کے بڑے ہال میں سب جمع تھے ۔ پانچوں بچے میز میں بیٹھے تھے ۔ میز پر مزے دار کھانے اور عمدہ میوے سجائے جا رہے تھے ۔ اچانک نہ جانے کہاں سے ایک موٹا چوہا نکل کر بھاگا ۔ اسے دیکھتے ہی چاندی جیسا [illegible]

ماں

جناب مائل خیر آبادی

"اے بھائی یہ مقام جعرانہ ہے نا!"

"ہاں اے محترم خاتون یہ جعرانہ ہی ہے۔ وہ کیا غرض ہے جو آپ کو یہاں لائی۔"

"اے سنجیدہ انسان مجھے توقع ہے کہ تو مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دے گا۔ میں یہاں اپنے بیٹے سے ملنے آئی ہوں۔"

"آپ کے بیٹے کا کیا نام ہے؟"

"میرے بیٹے کا نام محمدؐ ہے۔"

"محمدؐ! آپ کے بیٹے کا نام محمدؐ ہے؟ اس نام کے تو کئی لوگ یہاں ہیں، آپ ذرا وضاحت فرمائیں۔"

"میں محمدؐ بن عبداللہ سے ملنے آئی ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ میرے بیٹے پر اللہ نے اپنی سب سے بڑی رحمت نازل فرمائی ہے۔"

"یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" بے شک اے محترم خاتون! ان پر اللہ نے سب سے بڑی نعمت نازل فرمائی ہے۔ مگر ان کی والدہ محترمہ کا انتقال تو ان کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ معاف فرمائیے گا۔ آپ اس عمر میں داخل ہو چکی ہیں جس میں انسان کا دماغ اس کے بس میں نہیں رہتا۔

"اے سنجیدہ انسان تو نے بھی وہی بات کہی جو کئی اور آدمیوں سے اپنے متعلق سن چکی ہوں، مگر تو نے اچھے الفاظ میں کہی جو کچھ کہا۔ دوسرے لوگوں سے جب میں نے اپنے بیٹے محمد بن عبداللہ کے بارے میں پوچھا تو وہ مسکرا دیے پھر مجھ سے تو نہیں آپس میں کہنے لگے کہ اس بڑھیا پر جنون کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ واللہ میں سچ کہتی ہوں۔

"اچھا تو تم مجھے محمد بن عبداللہ کے پاس لے چلو!"

"میرے ساتھ آئیے۔"

"مرحبا! اللہ تیرے چہرے کو روشن کرے۔"

اس مختصر سی گفتگو کے بعد معمر خاتون اس سنجیدہ شخص کے ساتھ ہو لی۔ وہ زیر لب کہتی جاتی تھی۔ لوگ مجھے مجنوں سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ میں اپنے بیٹے سے ملوں گی تو سب حیران رہ جائیں گے۔ میرا بیٹا مجھے ضرور پہچان لے گا۔ شیماء کہتی تھی "ماں! آپ کا بیٹا محمدؐ آپ کو بہت یاد کرتا ہے" ہاں وہ ضرور یاد کرتا ہوگا۔ کیسا شریف ہے وہ۔ اس نے میرے دودھ کی لاج رکھ لی۔ اس نے میرے قبیلے کے تمام قیدیوں کو فدیہ لیے بغیر آزاد کر دیا۔ بے شک اس کے ساتھی بھی نہایت شریف ہیں سب نے اس کی تائید کی تھی۔"

"محترمہ! آپ زیر لب کیا فرما رہی ہیں۔ کچھ الفاظ میں سن رہا ہوں لیکن مفہوم سمجھ میں نہیں آتا!"

"تم مجھے میرے بیٹے کے پاس لے چلو سب سمجھ جاؤ گے۔"

"وہ دیکھو سامنے لوگ بیٹھے ہیں وہ ہیں محمدؐ بن عبداللہ۔ اللہ کے آخری رسول، ان پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔"

یہ سن کر معمر خاتون سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس نے
ایک نظر مجمع پر ڈالی پھر اچانک اس پر والہانہ کیفیت طاری ہو گئی۔
"یہی ہے میرا بیٹا محمدؐ۔ خدا کی قسم میں نے پہچان لیا۔ نہ
میری آنکھوں نے مجھے دھوکا دیا اور نہ میرے ذہن نے"۔
وہ والہانہ انداز میں بڑھی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم جعرانہ کے اسی مقام پر اپنے ساتھیوں میں گوشت
تقسیم فرما رہے تھے۔ (ان سب پر اللہ کی رحمت ہو) آپ
نے دفعتاً اس معمر خاتون کو دیکھا۔

آپؐ "میری ماں" کہتے ہوئے آگے بڑھے معمر
خاتون "میرا بیٹا۔ میرا بیٹا" کہتی ہوئی اس طرح چلی آ رہی تھی
جیسے کوئی غیبی کشش آپ سے آپ اسے اس طرف کھینچ
رہی ہو۔ اس کے پاؤں اس کی عجلت کا ساتھ نہ دے
سکے۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اٹھتے ہی تمام صحابہؓ کی
نظروں نے حیرت و استعجاب کے ساتھ اس منظر کو دیکھا
جو انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سب دم بخود سوچ رہے
تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ کا تو انتقال ہو چکا
ہے۔ پھر یہ کون خاتون ہیں جن کی طرف حضور بے تاب ہو کر
بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ سمجھ کوئی نہ سکا۔ لیکن سب نے
آگے بڑھ کر اس معمر خاتون پر سایہ کر لیا۔ اللہ کے رسول
نے اپنی چادر دی "اس پر میری ماں کو بٹھا دو"۔ لوگوں کو
اور زیادہ حیرت ہوئی کہ یہ شرف اس خاتون کے سوا کسی کو
نصیب نہ ہوا۔

"شیماء نے تجھ کو اور تیرے ساتھیوں کو سلام کہا ہے"۔
"ان پر بھی سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت اور آپ پر
بھی، صحابہؓ کے مجمع میں ایک گونج پیدا ہوئی۔ معمر خاتون نے
ایک نظر سب پر ڈالی۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

"شیماء یہ بھی کہتی تھی کہ تجھ پر اللہ نے سب سے بڑی رحمت
اور نعمت اتاری لیکن میں دیکھتی ہوں کہ تو بے حد دبلا ہو رہا ہے"۔
"ماں مجھے اللہ نے اپنا رسول بنایا ہے میں نبوت کے
بوجھ سے دبا جا رہا ہوں کیا آپ میری نبوت کی تصدیق فرمائیں گی"۔
"کیوں نہیں، کیوں نہیں، میں گواہی دیتی ہوں کہ محمد بن عبداللہ
اللہ کا رسول ہے۔ اے میرے بیٹے ایسی فیاضی ایک نبی اور
اس کے ساتھی ہی کر سکتے ہیں۔ ہوازن کی لڑائی میں جب شیماء اور
اس کے ساتھی سینکڑوں بنو سعد قید ہو کر آئے تو محض میرے
دودھ کی بدولت فدیہ لیے بغیر انھیں آزاد کر دیا گیا۔ اے
میرے بیٹے تو بھی شریف ہے اور تیرے ساتھی بھی"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی کی اس وقت انتہا نہ تھی لیکن
یہ معما ہنوز معما ہی تھا کہ یہ خاتون حضور کی ماں کیسے ہو سکتی ہے۔
جب کہ آپ کی والدہ محترمہ کا انتقال آپؐ کے بچپن ہی میں ہو چکا ہے۔
"شیماء یہ بھی کہتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کا بوجھ جس بندے
پر ڈالا اس کے جسم پر گوشت نہ چڑھ سکا۔ سچ کہا تھا شیماء نے"۔
"میں نے پا لیا میں نے پا لیا"۔ اچانک حضرت ابوبکر صدیقؓ
کی زبان سے نکلا۔ سب ان کی طرف دیکھنے لگے۔ حضرت صدیقؓ
کی اصابت رائے اور معاملہ فہمی کا سب کو اعتراف تھا ہی، پوچھنے
لگے کون ہے یہ بزرگ خاتون۔ جناب ابوبکر صدیقؓ نے حضورؐ سے نہایت
ادب سے عرض کیا "یا رسول اللہ اب سمجھ میں آیا۔ واللہ یہ حلیمہ سعدیہ ہیں"۔
حضورؐ نے صدیق اکبرؓ کی بات سن کر ان کی طرف دیکھا فرمایا۔
بے شک یہ حلیمہ سعدیہ ہیں قبیلہ ہوازن کی سب سے زیادہ معزز خاتون
میری ماں۔ انھوں نے مجھے چار برس پالا۔ اللہ ان پر اپنی رحمت نازل

جناب محمد عبید اللہ شریف

ابھی کوئی ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے ۵ ۱/۶۸ میں ذاکر صاحب نے سنبل پور یونی ورسٹی (اڑیسہ) کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر اے این کھوسلہ چانسلر سنبل پور یونی ورسٹی نے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے سنگِ بنیاد رکھنے کی درخواست کرتے وقت ایک مختصر تقریر کی تھی۔ اس تقریر کا خلاصہ پیامیوں کے لیے نیچے دیا جارہا ہے۔

"سنبل پور یونی ورسٹی اور ریاست اڑیسہ کی تعلیمی ترقی کے لیے یہ ایک نیک شگون ہے کہ اس یونی ورسٹی کا سنگ بنیاد ہمارے محبوب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین رکھ رہے ہیں جو بذات خود ایک ممتاز عالم ادیب۔ انسان دوست۔ مدبّر اور سیاست داں ہیں۔

"ڈاکٹر ذاکر حسین کی بے مثال قومی خدمات مشہور ہیں لیکن یہ بہتر ہوگا کہ آج کے اس موقع پر موصوف کی اعلیٰ شخصیت اور خدمات کا ایک وسیع خاکہ پیش کیا جائے

"ڈاکٹر ذاکر حسین ۸ر فروری ۱۸۹۷ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اسکول اور یونی ورسٹی کی تعلیم یوپی میں حاصل کی۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے ایم اے کی ڈگری لینے کے بعد برلن یونی ورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد دہلی، کلکتہ، الہ آباد، علی گڑھ اور قاہرہ یونی ورسٹی سے موصوف کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ اور کل ہی (۴ر جنوری ۱۹۶۸ء) مدورائی یونی ورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری دی گئی۔

"آپ ۲۲ سال تک یعنی ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۸ء تک جامعہ ملیہ دہلی کے وائس چانسلر رہے اور ۸ سال تک یعنی ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء تک مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر رہے۔ ۱۹۵۷ء تک آپ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن اور راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔

"جولائی ۱۹۵۷ء سے مئی ۱۹۶۲ء تک بہار کے گورنر رہے اور مئی ۱۹۶۲ء سے اپریل ۱۹۶۷ء تک ہندوستان کے نائب صدر اور ۱۹ مئی ۱۹۶۷ء سے صدر جمہوریۂ ہند ہیں۔

"۱۹۵۴ء میں آپ کو پدما بھوشن اور ۱۹۶۳ء میں بھارت رتن کے سب سے بڑے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

"ڈاکٹر ذاکر حسین مختلف قومی اور بین الاقوامی تعلیمی کمیٹیوں کے صدر اور انڈین پریس کمیشن کے صدر رہ چکے ہیں۔ کئی ملکوں کا دورہ کر چکے ہیں۔ آپ متحدہ عرب جمہوریہ

مراقش - الجیریا - تیونس - کویت - سعودی عرب - اُردن
مصر - یو - ایس - اے اور سوویت یونین کا دورہ کر چکے
ہیں - ہمارے دور کے بہت بڑے عالموں اور ادیبوں میں
آپ کا شمار ہے - آپ کئی کتابوں کا ترجمہ کر چکے ہیں اور
کئی کتابیں آپ نے لکھی ہیں -

" ہندی - اُردو - فارسی - انگریزی اور جرمن زبانوں
پر آپ کو عبور حاصل ہے - آپ نے تعلیمی میدان میں جو
کارنامے انجام دیے ہیں وہ واقعی بہت بڑے ہیں

" ڈاکٹر ذاکر حسین گاندھی جی کے سچے پیرو ہیں
رحم دلی - سادگی - ہم دردی - سچائی اور عدم تشدد پر عقیدہ
رکھتے ہیں - جمہوریت - عالمی بھائی چارگی اور سماجی انصاف
آپ کی زندگی کے نمایاں پہلو ہیں - آپ ہر طرح سے
ہندوستان کے ایک سچے سپوت ہیں - "

(انگریزی سے ترجمہ و تلخیص)

بالاسندرم صفحہ ۳۲ سے

اور ہر اجنبی ہندوستانی کے لیے زبردستی
یہ قاعدہ بنا دیا گیا تھا کہ جب وہ کسی فرنگی کے سامنے
جائے تو اپنی پگڑی یا ٹوپی یا پھیٹا (صافہ) اتار کر جائے
صرف سلام دینا ہے دونوں ہاتھوں سے کیوں نہ کیا جائے
کافی نہ تھا - بے چارا بالاسندرم یہ سمجھا کہ اسے میرے
سامنے بھی اسی طرح آنا چاہیے - میرے لیے یہ پہلا
موقع تھا کہ کوئی اس طرح میری تعظیم کرے - مجھے بڑی
شرمندگی ہوئی اور میں نے اس سے کہا کہ پھیٹیا (صافہ)
باندھ لے - اس نے کچھ تامل کے بعد میری بات مانی -
مگر اس کے چہرے سے پتا چلتا تھا کہ اسے بڑی خوشی
ہوئی -

یہ بات میرے لیے ہمیشہ ایک معمہ رہی کہ
لوگ اپنے ہم جنسوں کی ذلت میں اپنی عزت کیوں سمجھتے
ہیں -

چاند کی سیر صفحہ ۳۴ سے

بچّہ چوہے پر جھپٹ پڑا - یہ دیکھ کر سبھوں کی آنکھیں
حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں - رانی نے تب اصل
بات ظاہر کر دی - پھر بلی کے بچّے کو اس کی
اصلی صورت میں بدل کر اس سے بولی -

" صرف جسم بدلنے سے طور طریقہ نہیں
بدلتا - تم ایک جانور ہو - چاہے لاکھ بھیس بدلا
کرو - تمھاری عادتیں نہیں بدل سکتیں " - اس
کے بعد اس نے زمین کے ننھے مہمانوں کو رخصت
کیا - چاروں اسی اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر خیریت
کے ساتھ نیچے آ گئے " ماں نے کہانی ختم کی
اور نیّر میاں کی طرف دیکھا - پر وہ تو آنکھیں موندے
نندیا پور کی سیر کر رہے تھے -

ترجمہ
محمد حسین حسان

ابو نواس اور اس کی بیوی

(تیونس کی ایک لوک کہانی)

یہ بات اب تو کچھ خواب و خیال سی معلوم ہوتی ہے
مگر کچھ برسوں پہلے ملکوں پر حکومت کرنے کا جو ڈھنگ تھا
وہ آج کل کی حکومت کے ڈھنگ سے الگ الگ تھا۔ پہلے
بادشاہ نواب یا راجہ ہوتے تھے ان کے امیر ہوتے تھے،
درباری ہوتے تھے۔ باقاعدہ دربار سجتا تھا۔ اس دربار میں
عالم فاضل ادیب، شاعر سبھی جمع ہوتے تھے اور رہتا ایک
آدھ مسخرا بھی ہوتا تھا۔ تیونس کے سلطان کے دربار میں
بھی ایک مسخرا تھا۔ ابو نواس۔

ابو نواس ایک دن تیونس کے سلطان کی خدمت
میں روتا پیٹتا آیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔
سسکیاں لے رہا تھا۔ بے چارے کی بیوی اللہ کو پیاری
ہو گئی تھی۔

بادشاہ سچ مچ بہت غمگین ہوا اپنے محل کی سب سے خوب صورت بن بیاہی لڑکی سے اس کا بیاہ کر دیا اور اپنی طرف سے ایک ہزار اشرفیاں نقد دیں۔ شادی کے تحفے کے طور پر۔

اب تو دونوں بہت خوش، بہت ہی خوش زندگی خوب ہنسی خوشی گذرنے لگی مگر کب تک، ہوتے ہوتے ایک دن ساری پونجی ختم ہو گئی ـــــ اب کیا کریں ـــــ بہت حیران۔ بہت پریشان۔

اچانک ابونواس کو ایک بات سوجھی اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"تم یہیں رہو میں بادشاہ سلامت کی خدمت میں جاتا ہوں اور ان سے کہتا ہوں کہ تم مر گئی ہو اور میرے پاس کفن کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔"

بیوی بولی: "واہ واہ کیا خوب سوجھی۔ اگر تم بادشاہ سلامت سے سیدھی سیدھی بات کرتے کہتے کہ میں قلاش اور کنگال ہو گیا ہوں۔ بادشاہ سلامت نے جو کچھ دیا تھا وہ ختم ہو گیا ہے تو تم خالی ہاتھ لوٹتے ایک پائی بھی نہ ملتی۔"

ابونواس نے کالی مرچیں پیس آنکھوں میں لگائیں۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔ وہ روتا بلبلاتا بادشاہ کے پاس پہنچا اور اس کے قدموں پر اوندھے منھ گر گیا۔

بادشاہ گھبرا گیا: "ارے ارے ابونواس خیریت تو ہے کیا حادثہ پیش آ گیا؟"

ابونواس ہچکیاں لیتے ہوئے بولا: "کیا بتاؤں بادشاہ سلامت میری بیوی مر گئی ہے اور میرے پاس کفن خریدنے کے لیے پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔"

بادشاہ بہت اداس ہو کر بولے: "ہاں میاں ابونواس ایک دن ہم سبھی کو مرنا ہے۔ اچھا لو یہ سو اشرفیاں کفن دفن کا انتظام کر لینا۔" ابونواس نے شکریہ ادا کیا اور گھر کی راہ لی۔ وہ اب بھی رو رہا تھا مگر دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔

گھر پہنچا تو بیوی بولی۔ "پر یہ سو اشرفیاں کیے دن چلیں گی۔ اچھا ٹھہرو تم یہیں رہو میں ملکہ کے پاس جاتی ہوں۔ اس سے کہوں گی کہ تم مر گئے ہو اور میرے پاس ایک کوڑی نہیں جو اس کے لیے کفن خریدوں۔"

ابونواس کی طرح اس نے بھی آنکھوں میں کالی مرچیں ملیں۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں رخساروں پہ آنسو بہنے لگے۔ روتی دھوتی ملکہ کے پاس پہنچی اور دھڑ سے اس کے قدموں پر گر گئی۔

ملکہ بے چاری حیران پریشان جلدی سے بولی:

"ہے ہے کیا بات ہے؟ سب خیریت تو ہے؟"

ابونواس کی بیوی سسکیاں لے کر بولی: "میری اچھی ملکہ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ میرا سہاگ اجڑ گیا میرا شوہر مر گیا۔ میرے پاس اتنا بھی نہیں ہے جو اس کے لیے کفن دفن کا انتظام کر دوں۔"

ملکہ کو بڑا ترس آیا۔ اسے فوراً سو اشرفیاں دیں اور کہا جاؤ کفن دفن کا انتظام کرو۔"

ابونواس کی بیوی اب بھی روئے جا رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے پر دل؟ ـــ

دل ہنس رہا تھا۔

شام کو سلطان ملکہ کے پاس گیا۔ کچھ اداس اداس سا۔ کہنے لگا" کچھ سنا تم نے بے چارے ابو نواس کی بیوی مر گئی۔"

ملکہ فوراً بول اٹھی "اے اے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کی بیوی نہیں مری ہے خود ابو نواس مرا ہے یہ غلط خبر آپ کو کس نے سنائی۔"

سلطان نے کہا " تم غلط کہہ رہی ہو خود ابو نواس نے آکر بتایا کہ اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔"

ملکہ اپنی بات پر اڑی رہی "کیا خوب! مجھے خود اس کی بیوی نے بتایا سب کے سامنے بتایا کہ ابو نواس کا انتقال ہو گیا۔"

اب تو دونوں الجھن میں پڑ گئے۔ سلطان نے اپنا نوکر ابو نواس کے گھر بھیجا اور کہا: دیکھ کر آؤ ان دونوں میں سے کون مرا ہے۔

نوکر لوٹ کر آیا سلطان کے سامنے ادب سے سر کو جھکایا اور بولا " عالی جاہ میں ابو نواس

کے گھر گیا تھا ابونواس بڑی طرح رو رہا تھا۔ چارپائی
پر اس کی بیوی کی میت تھی بالکل بے حس و حرکت
میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ اس میں کوئی غلطی
نہیں ہو سکتی۔"

یہ سنتے ہی ملکہ نے اپنا نوکر دوڑایا کہ صحیح صحیح
خبر لائے نوکر لوٹ کر آیا ملکہ اور بادشاہ کے سامنے ادب
سے سر جھکایا اور بولا: "میں حکم کے مطابق ابونواس کے
گھر گیا۔ اس کی بیوی بڑی طرح رو رہی تھی ابونواس
کی لاش بے حس و حرکت پلنگ پر پڑی تھی۔ یہ اپنی
آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں
کھا سکتیں۔"

اب تو دونوں کی الجھن اور بڑھی بادشاہ سلامت
نے حکم دیا ہماری سواری لاؤ ہم خود ابونواس کے گھر
جائیں گے۔

بادشاہ سلامت اور ملکہ دونوں شاہی سواری
میں بیٹھ کر ابونواس کے گھر پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ابو
نواس اور اس کی بیوی کی لاشیں ایک ہی پلنگ پر
پاس پاس پڑی ہیں اوپر سے چادر ڈھکی ہے۔

سلطان چلا کر بولا:۔ دونوں مرے پڑے ہیں!
بھلا یہ کیسے ممکن ہے!! جو کوئی بھی مجھے سچی سچی بات
بتائے گا میں اسے ایک ہزار اشرفیاں انعام دوں گا"

اتنا سننا تھا کہ ابونواس صاحب اچانک
اٹھ کر بیٹھ گئے اور ہاتھ بڑھا کر زور سے بولے: "سرکار
ان ہزار اشرفیوں کا تو بس میں ہی مستحق ہوں۔ میرے علاوہ
اور کوئی بھی ٹھیک ٹھیک بات بتا ہی نہیں سکتا"

بادشاہ اور ملکہ نے مسخرے ابونواس کی
اس دیدہ دلیری پر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

(فائنڈنگ آوٹ)

جناب نثار اعظمی

کتنا دل چسپ ہے پیارا ہے پیامِ تعلیم
کس مصور نے سنوارا ہے پیامِ تعلیم

دوست ملتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں کیسے کیسے
ہر گھڑی دوست ہمارا ہے پیامِ تعلیم

ذہن و دل کے لیے تفریح کے ساماں اس میں
خالی وقتوں کا سہارا ہے پیامِ تعلیم

جیسے ہر ماہ نکلتا ہے نئی شان سے چاند
یوں ہی اک ماہ کا پارا ہے پیامِ تعلیم

کتنی دل چسپ ہیں نظمیں و مضامیں اس کے
اردو پرچوں میں نیارا ہے پیامِ تعلیم

اس کو بچے ہی نہیں پیر و جواں پڑھتے ہیں
سب کی آنکھوں کا ستارا ہے پیامِ تعلیم

ہر ورق میں ہیں نصیحت کی سبق کی باتیں
ایک تعلیمی اشارا ہے پیامِ تعلیم

اس میں چھوٹے بڑے فن کار بھی لکھتے ہیں
شوق نے سب کے نکھارا ہے پیامِ تعلیم

جی میں آتا ہے کہ بس پڑھتے ہی جائیں اس کو
ایک دل چسپ نظارا ہے پیامِ تعلیم

اے پیامی! اٹھو اس کے لیے کچھ کام کرو
بند ہو؟ کب یہ گوارا ہے پیامِ تعلیم

اس کو ہر شہر میں ہر گاؤں میں پھیلانا ہے
یہ دل و جان ہمارا ہے پیامِ تعلیم

پرندوں کی چند انوکھی عادتیں

جیسے ہماری آپ کی ایک دنیا ہے۔ چرندوں، پرندوں اور درندوں کی ایک دنیا ہے۔ اس دنیا میں آپ کو بھانت بھانت کے پنکھ پکھیرو۔ بھانت بھانت کے پرندے اور درندے ملیں گے۔ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے۔ آئیے آج ہم پرندوں کی دنیا کی کچھ انوکھی باتیں بتائیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا۔ چڑیوں کے ننھے بچوں کے جسم پر عام طور پر روئیں ہوتے ہیں لیکن رام چڑیا اور چند دوسرے ایسے پرندے بھی دنیا میں موجود ہیں۔ جن کے جسم پر روئیں نہیں ہوتے۔ چڑیوں کے لیے یہ کہنا کہ وہ اڑ نہیں سکتیں کیسی عجیب کیسی انوکھی سی بات لگتی ہے۔ لیکن دنیا کے بعض پرندے سچ مچ نہیں اڑ پاتے جیسے پینگوئن، شترمرغ، آسٹریلیا کا ایمو وغیرہ۔

جسامت اور وزن کے اعتبار سے اس وقت دنیا کا سب سے بڑا پرندہ شترمرغ ہے۔ اکثر اس کا قد آٹھ فٹ سے بھی زیادہ اور وزن تین سو پونڈ تک ہوتا ہے۔

اس کے متعلق ایک عام روایت مشہور ہے۔ یہ ریت میں اپنا سر چھپا لیتا ہے۔ پر یہ صحیح نہیں ہے ہاں اس کی رفتار کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ درست ہے۔ شترمرغ سچ مچ بہت تیز دوڑتے ہیں۔ ان کی رفتار پچاس میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

ان کے انڈے کا وزن تین پونڈ ہوتا ہے۔

ان کا بچہ چالیس یا پچاس دن میں انڈے سے نکلتا ہے۔ انڈے دینے کے بعد انڈوں کو زیادہ تر نر ہی سیتا ہے۔ مادہ کا کام ختم ہو جاتا ہے۔

اور بھئی دنیا کی سب سے چھوٹی چڑیا کی لمبائی

کل سواد وا انچ ہے ۔ انگریزی زبان میں اس ننھی چڑیا کو (Humming Bird) اور اردو میں پھدکی یا پھل سنگھی کہتے ہیں۔ اس کے بازو صرف ایک انچ کے ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ پھولوں کے رس پر زندہ رہتی ہے ۔ لیکن یہ بات غلط ہے ۔ ننھے بھنگے، شہد کی مکھی اور مکڑی بھی اس کی خوراک میں شامل ہیں ۔ یہ ایک سکنڈ میں کم سے کم ۶۷ بار اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی ہے ۔اس کے اڑنے کی رفتار شتر مرغ کے دوڑنے کی رفتار سے کم نہیں ہوتی ۔ یعنی پچاس میل فی گھنٹہ ۔

امریکہ میں یہ چڑیا سردیوں کے موسم میں وسط امریکہ کی طرف نکل جاتی ہے ۔ وسط امریکہ تک پہنچنے کے لیے یہ پانچ سو میل کا سفر کرتی ہے کہیں ٹھہرتی نہیں مسلسل اڑتی رہتی ہے ۔

لسٹے قدموں واپس ہونا آپ نے سنا ہے ۔ یہ چڑیا الٹے پروں واپس آتی ہے ۔ بہت بڑے پھولوں کے اندر یہ اڑتی اڑتی داخل ہوتی ہے ۔ چونچ سے کھانے کے دوران اس کے پر پھڑپھڑاتے ہی رہتے ہیں اور یہ جیسے ہوا میں لٹکی رہتی ہے ۔ اور اسی طرح پر پھڑپھڑاتے پھڑپھڑاتے یہ الٹی ہو کر پھول سے باہر نکلتی ہے ۔ یعنی پہلے دم نکلتی ہے، پھر پیٹ کا حصہ اور پر، سر بعد میں نکلتا ہے ۔

لگ بھگ سبھی چڑیاں اپنے اپنے گھونسلے بنا کر رہتی ہیں ۔ انھی میں انڈے دیتی ہیں ۔ اور انھی میں وہ ان انڈوں کو سیتی ہیں ۔ پر کچھ چڑیاں دوسری چڑیوں کے گھونسلوں میں انڈے دے آتی اور ان انڈوں سے جو بچے نکلتے ہیں ان گھونسلوں کی چڑیاں ان بچوں کی پرورش کرتی ہیں ۔

کاؤ برڈ اسی قسم کی چڑیا ہے ۔ یہ چڑیا فطرتاً بہت کاہل ہے ۔ اس کا رنگ کالا ہوتا ہے ۔ دیکھنے میں گندی معلوم ہوتی ہے ۔ خوراک کی تلاش میں یہ چڑیا کھیتوں سے آگے نہیں بڑھتی ۔ بیلوں کے پیچھے چلتی ہے اور ان کے کھروں سے کھرچی ہوئی زمین کے اندر سے نکلے ہوئے کیڑے مکوڑوں کو کھا کر آسودہ ہو جاتی ہے ۔

ان چڑیوں کا جوڑا ایک ساتھ نہیں رہتا ۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے ہیں ۔ انڈے دینے کے وقت یہ چڑیا دوسری چھوٹی چڑیوں کے ایسے گھونسلے کی تلاش کرتی ہے جن میں انڈے ہوں اور اس وقت اس میں گھونسلے کی چڑیا موجود نہ ہو ۔ ایسے گھونسلے میں یہ انڈے دے کر اڑ جاتی ہے ۔ انڈے گھونسلے کے دوسرے انڈوں میں مل جاتے ہیں ۔ اگر اتفاق سے گھونسلے میں چڑیا موجود ہو تو یہ قریب کی جھاڑیوں اور پیڑ کے پتوں میں چھپ کر گھونسلا خالی ہونے کا انتظار کرتی ہے ۔ اور جب چڑیا گھونسلے سے اڑ جاتی ہے تو یہ اس کے گھونسلے میں انڈے دے آتی ہے ۔

اگر اتفاق سے کوئی گھونسلا خالی نہیں ملتا تو وہ زمین پر اپنا انڈا گرا دیتی ہے ۔ گھونسلوں کے دوسرے انڈوں سے اس کا انڈا بڑا ہوتا ہے ۔ رابن کے گھونسلوں میں یہ خاص طور سے انڈے دیتی ہے ۔

ننھی چڑیا جب اپنے گھونسلے میں انڈوں پر
بیٹھتی ہے تو اسے انڈوں میں کسی زیادتی کا ہلکا سا احساس
ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑے پس و پیش کے بعد وہ مطمئن
ہو کر انڈوں کو سینا شروع کر دیتی ہے۔

جب انڈوں سے بچے نکلتے ہیں تو ننھی چڑیا
کا ننھا دماغ یہ اندازہ نہیں کر پاتا کہ ایک بچہ دوسروں
سے کہیں بڑا ہے۔ وہ ان کو بھرانا شروع کرتی ہے۔
اور دن بھر بھراتی رہتی ہے۔ بچے چونچیں کھولتے ہیں
لیکن ان میں ایک چونچ سب سے زیادہ بھوکی دکھائی
دیتی ہے اور یہ دوسری چونچوں کے آگے اور اوپر
رہتی ہے۔ چڑیا اسی چونچ کو زیادہ بھراتی ہے۔ دوسرے
بچے بھوکے رہ کر کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بڑا بچہ
چھوٹے اور کمزور بچوں کو ڈھکیلتا ڈھکیلتا گھونسلے
کے کنارے پر لے آتا ہے اور بچے نیچے گر کر ختم ہو جاتے
ہیں۔ پھر گھونسلے میں تنہا رہ کر یہ بچہ بڑھتا رہتا ہے
اور ایک دن خود اُڑ جاتا ہے۔

لیکن دوسری چڑیوں کو اگر اپنے گھونسلے
میں اپنے نیلے انڈوں کے درمیان کوئی دھبے والا انڈا
دکھائی دیتا ہے تو وہ چیخ پڑتی ہیں اور غصے سے پاگل
ہو کر اس انڈے کو چونچ سے پھوڑ ڈالتی ہیں۔ لیکن
زرد رنگ کی Wan Bler اس انڈے کو اپنے
گھونسلے میں ہی دفن کر دیتی ہے۔

کاؤبرڈ کا انڈا اپنے گھونسلے میں دیکھ کر
وہ اس انڈے پر اور اپنے انڈوں پر ایک دوسری
چھت بنا لیتی ہے اور پھر نئے سرے سے انڈے
دیتی ہے۔ پرانے انڈے اس چھت کے نیچے دب
کر ختم ہو جاتے ہیں۔

عام طور سے جب مادہ چڑیا انڈے سیتی ہے
تو نر گھونسلے کی نگرانی کرتا ہے۔ اور مادہ کے لیے
خوراک مہیا کرتا ہے۔ مادہ کے انڈے سینے کے دوران
جنگی عقاب جب مادہ کے لیے خوراک لاتا ہے تو گھونسلے
کے پاس نہیں جاتا۔ گھونسلے سے تھوڑے فاصلے
پر رک کر مدھم آواز میں مادہ کو پکارتا ہے۔

مادہ HORN BILL دھنیل یا دھنیش

اس وقت تک اپنے ٹھکانے سے باہر نہیں نکلتی جب
تک بچے ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ یہ چڑیا درختوں کی
کھوہ میں انڈے دیتی ہے۔ نر کھوہ کے سامنے ایک
دیوار اٹھا کر مادہ کو اس کے اندر قید رکھتا ہے۔
دیوار میں صرف اتنا سوراخ ہوتا ہے کہ مادہ اپنی چونچ
باہر نکال سکے۔ اس سوراخ کے ذریعے نر اپنی مادہ
کو کھانا پہنچاتا رہتا ہے۔ جب انڈوں سے بچے نکل
آتے ہیں تو نر بچوں کو اسی طرح قید رکھ کر ان کی پرورش
کرتا ہے۔

(باقی آئندہ)

جناب رفیق شاستری۔ ام۔ اے

پنچ تنتر کی کہانیاں

تب بندر نے مگرمچھ کو گنگا دت مینڈک کی یہ کہانی سنائی :۔

"ایک کنویں میں گنگا دت نام کا ایک مینڈک رہتا تھا۔ وہ اپنے غول کے مینڈکوں کا سردار تھا۔ ایک دن وہ اپنے غول کے مینڈکوں کی کسی حرکت سے ناراض ہو کر کنویں سے باہر آگیا اور سوچنے لگا کہ اس کا بدلہ وہ کیسے لے۔

یہ سوچتا ہوا وہ ایک سانپ کے بل تک آگیا بل میں ایک کالا سانپ رہتا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ اس سانپ سے کہا جائے کہ وہ مینڈکوں کے اِس پورے غول کا صفایا کر دے۔ اس نے سوچا کہ دشمن سے دشمن کی کاٹ کرانا بڑی مصلحت کی بات ہوتی ہے، ویسے ہی جیسے کانٹے سے کانٹا نکالا جاتا ہے۔

یہ خیال آتے ہی وہ بل کے اندر گھس گیا اور سانپ کو اس کا نام لے کر پکارنے لگا۔ سانپ یہ عجیب آواز سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ "یہ آواز میرے کسی دوست کی تو ہو نہیں سکتی، تو پھر یہ کون بل میں گھسا آرہا ہے۔" اس نے سوچا کہ جب تک کسی کی عادت، چال چلن اور اخلاق وغیرہ کا حال معلوم نہ ہو اُس سے الگ ہی الگ رہنا چاہیے۔ اُسے خیال آیا کہ کہیں یہ کسی سنپیرے کی چال نہ ہو اور اس نے مجھے پکڑنے کا یہ نرالا ڈھنگ نکالا ہو۔ وہ بل کے اندر تھوڑا اور کھسک گیا اور وہیں سے بولا :۔

"کون ہے بھائی مجھے کیوں بلا رہے ہو؟"

مینڈک بولا :۔

"میں ہوں گنگا دت مینڈکوں کا سردار۔ تم سے دوستی کرنے تمھارے دروازے پر آیا ہوں۔"

سانپ بولا :۔

"بھلا یہ بھی کیا بات ہوئی کہ مینڈک سانپ سے دوستی کرنے آئے۔ یقین نہیں آتا کہیں آگ اور گھاس میں دوستی ہو سکتی ہے۔ کھانے والے کی بھلا نوالے سے کیا دوستی۔ کہیں شکاری اور شکار میں بھی دوستی ہوئی ہے۔"

گنگا دت بولا :۔

"بھائی تم ٹھیک کہتے ہو، مگر پہلے میری پوری

بات تو سنو! میں مینڈکوں کا سردار ہوں۔ میرے غول کے مینڈکوں نے میرے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے۔ میں انھیں اس کا مزہ چکھانا چاہتا ہوں۔ میں ان سب سے بدلہ لینے کے لیے تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں ــــ" سانپ بولا:۔

"مگر تم رہتے کہاں ہو؟" مینڈک بولا:۔

"کنویں میں"

سانپ نے دریافت کیا: کنواں پکّا ہے یا کچّا، پکّے کنویں میں میں کیسے اُتروں گا اور کیسے بل بناؤں گا"

مینڈک نے جواب دیا:" بھائی! آپ اس کی فکر نہ کریں یہ سب میں کرا دوں گا۔ اس کنویں میں پہلے ہی سے بل بنا ہوا ہے وہاں بیٹھ کر تم آرام سے مینڈکوں کو کھا سکتے ہو"

سانپ بوڑھا ہو چلا تھا۔ پیٹ بھرنے کے لیے مشکل سے شکار کر پاتا تھا اس نے سوچا بوڑھاپے میں بغیر دوڑ بھاگ کے اس طرح شکار کرنے میں بڑا مزہ رہے گا۔ وہ مینڈک کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا اور گنگا دت کے پیچھے پیچھے کنویں کی طرف چل پڑا۔

بوڑھے سانپ نے دھیرے دھیرے اُن تمام مینڈکوں کا صفایا کر دیا جن کی گنگا دت سے دشمنی تھی جب ایسے تمام مینڈک ختم ہو گئے تو بوڑھے سانپ نے گنگا دت سے کہا:۔

"بھائی! گنگا دت جتنے مینڈک تمھارے دشمن تھے میں ان سب کا صفایا کر چکا ہوں، اب میرے پیٹ بھرنے کے لیے کیا انتظام سوچا ہے" گنگا دت نے جواب دیا۔

" اب یہی ہو سکتا ہے کہ جس راستے ہم تمھیں لائے تھے اسی راستے ہم تمھیں پرانے بل تک پہنچا دیں۔ تم وہاں پہلے کی طرح آرام سے رہنا اور مزے کرنا"

بوڑھا سانپ بولا:" اب میں وہاں کیسے رہ سکتا ہوں۔ اس بل پر تو اب کسی اور سانپ کا قبضہ ہو چکا ہو گا"

گنگا دت بولا:" تو پھر کیا کیا جائے" بوڑھا سانپ بولا:۔

" بس یہ کیا جائے کہ تم روزانہ میرے لیے ایک مینڈک بھیج دیا کرو نہیں تو میں ایک ہی وار میں سب مینڈکوں کو صاف کر دوں گا"

گنگا دت کو اب اپنی بھول کا احساس ہوا جو اپنے سے زیادہ طاقت ور دشمن کو دوست بناتا ہے اس کی یہی حالت ہوتی ہے۔ مجبوراً اس نے یہی فیصلہ کیا کہ جو مینڈک بچ رہے ہیں ان میں سے باری باری ایک ایک کو بھیجوں گا۔ جب سب کچھ لٹ رہا ہے اس وقت آدھا بھی بچا لینا غنیمت ہے۔

دوسرے دن سے سانپ نے دوسرے مینڈکوں کو بھی چٹ کرنا شروع کیا اور دھیرے دھیرے سارے مینڈکوں کا خاتمہ ہونے لگا۔ ایک دن سانپ نے گنگا دت کے لڑکے پر بھی ہاتھ صاف کر دیا۔ گنگا دت اپنے بچے کے غم میں رو پڑا۔ اُسے روتا دیکھ کر اس کی بیوی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی:۔

"اب رونے سے کیا فائدہ؟ جو اپنے بھائی بندوں کو برباد کراتا ہے وہ ایک دن خود بھی برباد ہو جاتا ہے۔ اپنے عزیز و اقارب ہی نہیں رہیں گے تو پھر کون ہماری مدد کو آئے گا۔"

اگلے دن بوڑھے سانپ نے گنگا دت کو بلا کر کہا:

"میں بھوکا ہوں، اس کنویں کے مینڈک تو سب ختم ہو چکے ہیں اب تم میرے کھانے کا کوئی اور انتظام کرو۔"

گنگا دت کو ایک ترکیب سوجھی اس نے سانپ سے کہا کہ اس کنویں میں تو اب ایک بھی مینڈک نہیں رہا اب میں دوسرے کنویں سے مینڈکوں کو بلا کر لاتا ہوں تب تک تم یہیں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔

بوڑھا سانپ مینڈک کی بات سے بہت خوش ہوا اور کہنے لگا: "بھائی گنگا دت تم میرے بھائی ہو اس لیے میں تمھیں نہیں کھا سکتا۔ اگر تم دوسرے کنوؤں سے میرے لیے مینڈک لا دیا کروگے تو میں تمھاری باپ کے برابر عزت کرنے لگوں گا۔"

گنگا دت موقع پاتے ہی کنویں سے باہر نکل آیا پھر بہت دن اس کنویں کا رُخ نہیں کیا۔ بوڑھا سانپ اس کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ جب بہت دن گزر گئے تو اس نے پاس کے بل میں رہنے والی گوہ سے کہا۔

"تم باہر جا کر گنگا دت کو ڈھونڈو اور جہاں کہیں ملے تو اُسے میرا یہ پیغام دو کہ اگر دوسرے مینڈک اس کنویں میں آنا پسند نہیں کرتے تو اس کے لیے زیادہ پریشان نہ ہو اور کنویں میں واپس چلے آؤ۔ تمھارے بغیر میرا دل نہیں لگتا۔"

گوہ باہر نکل کر گنگا دت کو ڈھونڈنے لگی اور ایک دن ایک تالاب کے کنارے اُسے پا لیا اور اس سے بولی:۔

ارے گنگا دت تمھارا دوست وہ بوڑھا سانپ کنویں میں بیٹھا کب سے تمھارا انتظار کر رہا ہے تمھارے بغیر اس کا دل نہیں لگتا۔ چلو ذرا اس کے دل کو تسلی دے آؤ بے چارہ بہت اداس رہتا ہے۔

گنگا دت نے کہا۔ نہیں اب تو میں وہاں کبھی قدم بھی نہیں رکھوں گا۔ اس دنیا میں بھوکے آدمی کا کوئی بھروسا نہیں۔ تم بوڑھے سانپ سے کہہ دینا کہ اب میں وہاں کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔"

یہ کہانی سُنانے کے بعد بندر نے مگرمچھ سے کہا کہ میں بھی گنگا دت کی طرح اب کبھی تمھارے ساتھ واپس نہیں چلوں گا۔ مگرمچھ آنکھوں میں آنسو بھرے روتے ہوئے بولا

"ارے دوست یہ کیا کہہ رہے ہو، غضب ہو جائے گا میں تو تمھاری عزت اور خاطر کر کے اپنے کالے کرتوتوں کا بدلہ کرنا چاہتا ہوں اگر تم میرے ساتھ نہیں چلوگے تو میں یہیں بھوک سے جان دے دوں گا۔"

بندر بولا: "ارے احمق میں اس لمبے کان والے گدھے جیسا بے وقوف نہیں ہوں جو ایک بار بچ کر بھی پھر خود موت کے منہ میں جا پڑوں۔" مگرمچھ نے پوچھا "وہ کیا؟"

تب بندر نے مگرمچھ کو گدھے کی یہ کہانی سنائی:۔

باقی نومبر کے پیام تعلیم میں۔

لانا مقبول احمد سیوہاروی

ت

چھوٹا سا خوب صورت شہر ہے، ہم شہر کے باہر
ے تالاب کے کنارے پر اُترے جس کا پانی سردی
ے جما ہوا تھا لڑکے اس پر دوڑ رہے تھے اور پھسل
ہے تھے۔ کات کے قاضی کو ہماری خبر پہنچی تو وہ
ر شیخ محمود الخیومی ملنے آئے پھر قاضی واپس گئے
امیر شہر کو لائے جس نے ہماری شان دار دعوت
۔ دعوت میں فوجی افسر بھی شریک تھے۔

امیر نے مجھے ایک جوڑا اور عمدہ گھوڑا دیا
ہم کات سے رخصت ہوگئے پھر چھ راتیں
ے ایسی سرزمین سے ہوکر جہاں نہ چارہ تھا نہ
ن تھا گزرے۔ یہاں سے بخارا فقط ایک دن کا
ستہ ہے، ہر طرف باغ اور میوے کے درخت
جن کے بیچ نہریں بہتی تھیں۔

یہاں پھلوں میں سے عجیب آلو بے جسے
استے ہیں اور ہندوستان اور چین تک لے جاتے ہیں
آلو بخارا، تازہ کھایا جائے تو میٹھا ہوتا ہے
ترش ہوجاتا ہے۔ یہ میوہ بخارا کے سوا میں
ہیں نہیں دیکھا۔ بخارا کی شہرت امام المحدثین

ابو عبداللہ بن محمد اسماعیل بخاری کے نام کے سبب
ہوئی۔ کسی زمانے میں یہ شہر پایۂ تخت تھا، اب
ویران ہے۔ اس کی مسجدیں۔ بازار سب ٹوٹ
پھوٹ کر برابر ہوگئے ہیں۔ چنگیز خاں نے اسے
برباد کر دیا۔ اور جب تک دنیا کی تاریخ باقی
ہے ظالموں کی فہرست میں چنگیز خاں کا نام باقی
رہے گا۔

حضرت امام بخاری کے مرقد پر میری حاضری
ہوئی۔ قبر پر کتبہ لگا ہوا تھا۔

"یہ محمد بن اسماعیل بخاری کی قبر ہے
جن کی تصنیفات یہ ہیں۔"

نیچے تمام تصنیفات کا نام تھا۔ بخارا کے
دوسرے علماء کی قبریں اور ان کی تصنیفات کی یادداشت
میں نے لکھی تھی۔ ہندوستان کے بحری سفر میں لٹیروں نے
سامان لوٹا تو وہ یادداشت بھی ضائع ہوگئی۔

بخارا سے نخشب گئے اور مولانا حسام الدین
یاغی سے ملاقات ہوئی۔

سلطان ماوراء النہر :- ماوراء النہر کا سلطان جس کا

نام طرشیری ہے بڑا عادل اور صاحب مرتبہ انسان ہے۔ اس کی فوجی قوت بھی بہت مضبوط ہے۔ شاہ ہند سلطان عراق۔ سلطان اوزبک خاقان چین اسے ہدیئے بھیجتے ہیں اور اس کی دولت وشوکت سے متاثر ہیں۔ اس کے بھائی کا نام کبک ہے یہ مسلمان نہیں ہے۔ شاہ کبک کا ایک لطیفہ بڑا دلچسپ ہے۔

اس نے ایک مرتبہ اپنے شہر کے عالم کو بلایا جن کا نام بدرالدین المیوانی تھا بڑے واعظ تھے۔ شاہ کبک ان سے کہنے لگا۔

"مولانا آپ کا دعویٰ ہے کہ قرآن پاک میں ہر چیز کا ذکر ہے بتائیے میرا نام بھی ہے یا نہیں"

مولانا نے برجستہ جواب دیا۔ ارشادِ باری ہے:۔

"فِی اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ"

دیکھ لیجیے کبک موجود ہے۔ اس دن سے شاہ کبک مولانا کی اور مسلمانوں کی عزّت کرنے لگا۔

اسی کا ایک لطیفہ یہ ہے کہ دربار میں کسی عورت نے آکر فریاد کی کہ فلاں امیر نے زبردستی مجھ سے دودھ چھین کر پی لیا اور میرے بچے بھوکے رہ گئے ہیں۔ کبک نے کہا "میں ابھی امیر کا پیٹ کسواتا ہوں۔ اگر دودھ نکلا تو ایسی سزا دوں گا کہ یاد کرے گا"

ہرچند عورت نے کہا میں نے دودھ معاف کیا اور حلال کر دیا اور اب کوئی دعوے نہیں ہے۔ مگر بادشاہ نے امیر کا پیٹ کسوایا اور دودھ نکل پڑا تو سزا دی۔

یہ بات بیچ میں آگئی ذکر سلطان ماوراءالنہر کا ہو رہا تھا۔

میں چھاونی میں ٹھہرا ہوا تھا ایک دن صبح کی نماز کے بعد مسجد میں کسی نے مجھ سے کہا۔ سلطان مسجد میں ہے۔ میں نے دیکھا تو وہ مصلّے پر بیٹھا تھا۔ اٹھا تو میں سلام کے لیے آگے بڑھا شیخ حسن اور فقیہ حسام الدین الیاغی نے میرا تعارف کرایا۔ سلطان ترکی میں بولا۔

"آپ بخیریت ہیں تندرست ہیں آپ کا تشریف لانا مبارک"

مسجد سے دربار جانے لگا تو پیادہ پا تھا راستہ میں ضرورت مند اپنی اپنی ضرورتیں بتلاتے جاتے تھے اور فریادی دکھ درد سناتے جاتے تھے۔ جب کوئی شکایت کرتا تو سلطان غور سے سنتا۔ امیر غریب، عورت مرد سب کے لیے اجازت تھی۔ نہ اکتاتا تھا نہ جھڑکتا تھا شاہی خیمہ میں پہنچ گیا تو مجھے طلب کیا۔ بادشاہ کرسی پر بیٹھا تھا جس پر ریشم کا غلاف چڑھا تھا۔ سر سے ایک گز اونچا یاقوت سے مرصع تاج لٹکا ہوا تھا۔ دائیں بائیں امراء بیٹھے تھے سامنے شہزادے تھے جن کے ہاتھوں میں سونے کے کڑے تھے شاہی خیمہ کے دروازے پر نائب وزیر سکریٹری اور صاحب العلامہ تھے میں اندر گیا تو چار عہدہ دار جن میں صاحب العلامہ تھے میرے ساتھ ہو گئے صاحب العلامہ میرے اور بادشاہ کے درمیان ترجمان تھے۔

بادشاہ نے مجھ سے مدینہ منوّرہ۔ مکہ مکرمہ، بیت المقدس، مدینۃ الخلیل۔ مصر۔ دمشق۔ ملک الناصر اور شاہانِ عراق کے حالات پوچھے۔

ظہر کی نماز کا وقت آیا تو بادشاہ اٹھا نماز
میں میرا اور بادشاہ کا ساتھ رہا۔ شدید سردی
کا موسم تھا مگر بادشاہ روزانہ عشاء اور صبح کی
نماز مسجد میں پڑھتا تھا۔ صبح کی نماز کے بعد سورج
کے طلوع تک وظائف پڑھتا رہتا تھا۔ نمازی آتے
تھے تو ہر ایک سے گرم جوشی سے مصافحہ کرتا تھا۔
کھجور اسے بہت پسند تھی اگر کوئی ہدیتاً کھجور
لاتا تو اسے قبول کر لیتا اور نمازیوں کو تقسیم کر دیتا۔

"ایک واقعہ ایسا ہے جس سے
نصیحت حاصل کرنی چاہیے"

ایک مرتبہ شاہی غلام بادشاہ کا مصلّیٰ لے کر آیا
اور جس جگہ بادشاہ نماز پڑھا کرتا تھا بچھا دیا۔
امام حسّام الدین یاغی سے کہا۔ سلطان وضو فرما رہے
ہیں ذرا تاخیر فرمائیے
امام نے جواب دیا۔ نماز خدا کی ہے
بادشاہ کی نہیں ہے اور موذن سے کہا تکبیر پڑھو
سلطان آیا تو دو رکعتیں ہو چکی تھیں بادشاہ سب
سے پیچھے کھڑا ہو گیا نماز ختم ہو گئی تو امام سے
مصافحہ کیا اور محراب کے سامنے بیٹھ کر مجھ سے
ہنس کر کہا۔
"وطن جانا تو لوگوں کو بتانا کہ ایک عجمی
درویش نے خدا کے حکم کے سامنے سلطان ترک
کی پرواہ نہ کی تھی"
"شیخ ہر جمعہ کو وعظ کہتا ہے اور بادشاہ کو
اچھی باتیں کرنے کی رغبت اور بری باتوں سے
نفرت ایسے انداز پر دلاتا ہے کہ بادشاہ پر رقت
طاری ہو جاتی ہے، رو پڑتا ہے۔ بادشاہ اسے
کچھ دینا چاہتا ہے تو انکار کر دیتا ہے نہ اس کا
کھانا کھاتا ہے۔ جب کبھی میں نے شیخ کو دیکھا
بدن پر ایک پھٹے ہوئے روئی کے چوغے کے
سوا کچھ نہ دیکھا۔ اور جب ایک دن میں نے کہا
آپ کا لباس بہت شکستہ ہو گیا تو بولے۔ یہ
چوغہ میں نے اپنے لڑکے سے مانگ لیا ہے پچاس
سال ہو گئے ہیں خدا سے میں نے عہد کیا ہے کہ کبھی
کسی سے کچھ نہ لوں گا۔ کسی سے لیتا تو تم سے لیتا۔
جب میں یہاں سے رخصت ہونے لگا تو
سلطان نے سات سو سونے کے سکے دیے ایک
سمور کا چوغہ دیا جس کی قیمت ایک سو اشرفی سے
کم نہ تھی۔ دو گھوڑے دیے اور دو اونٹ ہندوستان
پہنچنے کے دو سال بعد مجھے معلوم ہوا کہ بھائی نے
اس کے خلاف بغاوت کی اور حکومت چھین لی۔
سمرقند ایک وادی کے کنارے پر آباد ہے
بہت خوب صورت شہر ہے۔ اگرچہ شہر کا بڑا حصّہ
ویران ہے مگر پھر بھی سمرقند کے محلات دیکھنے کے
قابل ہیں۔ سمرقند والوں کے عادات و اخلاق شریفانہ
اور کریمانہ ہیں پردیسیوں سے محبت کرتے ہیں۔
سمرقند کے باہر قثم ابن عبّاس رضی اللہ عنہ
کا مزار مبارک ہے۔ یہ شہر ان ہی کے ہاتھ
پر فتح ہوا ہے۔

باقی آئندہ۔

مسلمیٰ جاوید (پٹنہ)

بھلائی کا بدلہ

(اودھ کی ایک لوک کہانی)

بڑی بوڑھیاں دن کے کام سے چھٹی پاکر رات کو آرام کرنے اپنے بستر پر لیٹتی ہیں تو اب بھی ان کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی پوتیاں، پوتے اور پر پوتے جمع ہوکر دادی اماں اور نانی اماں کی رٹ لگا کر کہتے ہیں کہ گیدڑ اور کتے والی، کہانی سنایئے اور نانی اماں یا دادی اماں اپنے پوپلے منہ، لرزتی آواز اور تھرتھراتی زبان سے ٹھہر ٹھہر کر یوں کہانی شروع کرتی ہیں ۔

کہانی جیسی جھوٹی اور شکر جیسی میٹھی کہ سننے والے کو عذاب اور کہنے والے کو ثواب ۔

بہت پرانے زمانے کی بات ہے اتنے پرانے زمانے کی بات ہے کہ گیدڑ آبادی میں اور کتے جنگلوں میں رہا کرتے تھے ۔ کہتے ہیں کہ جب کتے کبھی آبادی میں آتے اور گیدڑوں سے ملاقات ہوتی تو گیدڑ ان کتوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے ۔ ان کو طرح طرح کی پکی ہوئی چیزیں کھلاتے، بھنا ہوا گوشت کھلاتے، تیز چٹ پٹی ترکاریاں کھلاتے، مٹھائیاں کھلاتے، صراحیوں کا ٹھنڈا پانی پلاتے، دودھ پلاتے ۔ کتے ان سب چیزوں کو کھا کر بڑا اچنبھا محسوس کرتے ۔

یہ بے چارے تو جنگلوں میں رہتے تھے ۔ ان کے پاس یہ سب چیزیں کہاں سے آتیں ۔ وہ تو گرا پڑا اور مرا ہوا کوئی جانور مل جاتا تو اس کا گوشت کھا جاتے تھے ۔ کوئی جنگلی پھل آسانی سے زمین پر انھیں پڑا مل جاتا تھا تو اسے کھا لیتے تھے ۔ پورے پیٹ تو انھیں کبھی کھانے کو ملتا ہی نہ تھا ۔ کبھی آدھا پیٹ، کبھی چوتھائی اور کبھی کبھی بالکل ہی فاقہ ۔ پانی بھی بڑا خراب ملتا تھا ۔ جوہڑوں اور تالابوں کا سڑا ہوا گدلا پانی، اسی کو پی کر کسی نہ کسی طرح جیتے تھے ۔ بالکل دبلے پتلے مریل اور بیمار ۔ بڑی مشکل سے دوڑا جاتا تھا ۔ بدن میں طاقت ہی کہاں تھی جب گیدڑوں سے ملاقات ہوتی اور ان کے اس طرح کے ٹھاٹھ باٹھ، کھانے پینے کی

چیزوں کو دیکھتے، بڑھیا بھنا ہوا گوشت دیکھتے، صاف ستھرا پانی دیکھتے آرام سے رہنے کی جگہوں کو دیکھتے تو منھ میں پانی بھر آتا۔ سب مل کر سوچتے کہ ہم بھی اسی طرح کی آرام والی جگہوں کو کسی طرح سے پا جاتے۔

ایک بار کچھ کتّے گیدڑوں سے ملنے آئے۔

گیدڑوں نے بڑی خاطر کی، اچھی سے اچھی چیزیں کھانے اور پینے کے لیے سامنے لا رکھیں۔ مگر ان سبھوں نے کسی چیز کو بھی منھ نہ لگایا۔ گیدڑ بڑے حیران ہوئے۔

"کھاؤ بھائی یہ سب چیز شوق سے کھاؤ" گیدڑوں نے کہا۔

"کیا کہیں بھائی کوئی چیز بھی ہم سے کھائی نہیں جاتی" کتّے بولے۔

"کیوں! کیا اس میں سے آپ لوگوں کو کچھ بھی پسند نہیں ہے" ایک گیدڑ نے کہا۔

"پسند کیوں نہیں ہے۔ مگر بھائی ہم سب بہت بیمار ہیں اور ہم سے کوئی چیز بھی کھائی نہیں جاتی" ایک کتا بولا۔

"کیا آپ سبھی بیمار ہیں" ایک گیدڑ نے پوچھا۔

"ہاں یہی تو بات ہے۔ اس بیماری سے ہماری ساری قوم پریشان ہے" ایک کتّے نے کہا۔

"تو آپ اپنا علاج کیوں نہیں کراتے کسی سیانے سے" گیدڑ بولا۔

"کیا بتائیں بھائی ہمارے یہاں کوئی بھی سیانا علاج کرنے والا نہیں ہے" کتّے نے افسوس سے کہا۔

"ہمارے یہاں تو بہت سارے سیانے اور علاج کرنے والے ہیں، جھاڑ پھونک کرنے والے ہیں" ایک گیدڑ بولا۔

"بھائی یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات ہے" کتّے نے روندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو آپ سب یہیں آ کر اور رہ کر علاج کرائیے" کئی گیدڑوں نے کہا۔

"دوستو! ہم سب یہاں علاج کے لیے چلے آئیں گے اور علاج میں وقت لگے گا۔ ایسے میں ہم سب کو خطرہ ہے کہ باہر سے کوئی آ کر جنگل میں ہمارے سارے سامان پر قبضہ کرلے اور ہم لوٹ کر جائیں تو ہمیں وہاں کچھ نہ ملے" کتوں نے کہا۔

"ہاں اس کا ڈر تو ضرور ہے" ایک گیدڑ بولا۔

ایک ہوشیار کتّے نے کہنا شروع کیا۔

"بھائی آپ سب بھی ہماری ہی برادری سے ہیں اور محبت کرتے ہیں، دکھ درد کو سمجھتے ہیں کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ۔۔۔" یہاں پر وہ رک گیا۔

"کیا نہیں ہوسکتا۔ اور ہم سب آپ کے لیے کیا کرسکتے ہیں، بتائیے" ایک گیدڑ بولا۔

"مجھے شرم معلوم ہوتی ہے۔ آپ سب اتنے ہمدرد ہیں اور اس کے لیے آپ کو تکلیف دوں"

"ارے بھائی ہمدردوں ہی کو تو تکلیف دی جاسکتی ہے" گیدڑ نے کہا۔

"تو اگر ایسا ہو جاتا کہ صرف تھوڑے دنوں کے لیے آپ سب ہماری جگہوں پر چلے جاتے۔ وہاں بھی

کوئی تکلیف نہیں ہے۔ کھانے کو پھل ہیں، ترکاریاں ہیں۔
گھومنے اور سیر کرنے کو لمبے چوڑے میدان ہیں۔ رہنے کو
ٹھنڈی ٹھنڈی سی گھاٹیاں ہیں۔ پینے کو چشموں کا ٹھنڈا
میٹھا پانی ہے۔ بس صرف اس غرض سے کہ ہمارے سامان
کی آپ کی وجہ سے حفاظت رہے گی، کوئی دوسرا قبضہ
نہ کر سکے گا۔ ہم سب بس علاج کرا کے واپس آجائیں گے۔
اور آپ سب اپنی جگہ آجائیے گا۔" ایک کتا خوب سمجھا کر
بولا۔

"ویسے ہم کو آبادی میں رہنا کوئی زیادہ پسند نہیں۔
مگر مشکل یہی ہے کہ ہماری بیماری کا علاج یہیں پر ہوتا ہے
چند دن بیماری کے ہم کسی نہ کسی طرح کاٹ لیں گے۔ پھر
آپ سب واپس آجائیے گا۔" ایک بڑا کائیاں کتا بولا۔

"یہ کوئی مشکل بات تو نہیں ہے، دوستی میں کیا
کچھ نہیں کیا جاتا اور پھر دوستوں ہی سے امید بھی رکھی
جاتی ہے۔" تیسرا کتا بولا۔

"ہاں کوئی مشکل بات تو نہیں ہے، ہم سب آپ
کے لیے اتنی بات کر سکتے ہیں۔ جیسے ہی علاج کے بعد
آپ سب ٹھیک ہوں ہم کو بتلا دیں۔" ایک گیدڑ نے کہا۔

"بے شک بے شک، جیسے ہی ہمارا علاج ختم ہوا
ہم سب آجائیں گے اپنی اپنی جگہ پر۔" کتے بولے۔

ایک شام کو جنگل سے آبادی کی طرف تمام کتے
پلے اور کتیاں آرہی تھیں اور دوسری طرف گیدڑ گدڑیاں
اور ان کے بچے جنگل کو جا رہے تھے۔

اب جب کبھی گیدڑوں کا آنا آبادی میں ہوتا تو
... [illegible] کتے خوب کھا کھا کر موٹے ہوتے جا رہے
ہیں اور خود ان کی حالت خراب اور پتلی ہو رہی ہے۔

کتے کہتے: "ہاں ہاں بھائی آپ سب کی وجہ
سے ہمارا علاج بڑا اچھا چل رہا ہے۔ سیانے نے
کہا ہے کہ بہت جلد تم کو چھٹی مل جائے گی۔ جیسے ہی
چھٹی ملی ہم سب اپنی جگہوں پر آجائیں گے۔ آپ اطمینان
رکھیں۔"

ادھر گیدڑوں کی حالت خراب ہو رہی تھی۔
بھوک سے ادھ موئے ہو رہے تھے۔ اس وقت سے
روز ہی شام کو وہ آبادی کے قریب میں آکر کہتے ہیں۔
ہوا۔ ہوا۔ (یعنی علاج ختم ہوا۔)
اور کتے ادھر سے گلا پھاڑ کر چلاتے ہیں:
"نہہ، ابھی نہ، نہہ ابھی نہ" (بھوں بھوں
بھوں) یعنی علاج ابھی ختم نہیں ہوا۔

اگر کوئی بھولا بسرا گیدڑ آبادی میں چلا آتا
ہے تو مسٹنڈے کتے دوڑ پڑتے ہیں اور [illegible] ہوئے
اس کو جنگل کی طرف لے آتے ہیں۔

جناب جمشید اشرف

دماغی ورزش

شہر میں ایک دکاندار تھا، محنتی دیانت دار اپنی ایمانداری کی وجہ سے وہ بہت جلد امیر ہو گیا۔ خوب دولت جمع ہو گئی۔ اس دکاندار کو باغبانی کا بہت شوق تھا لیکن اس کا گھر اس قابل نہ تھا کہ اس میں پھول اگا سکے۔ اب جب وہ امیر ہو گیا تو اس نے سوچا کہ مجھے ایک ایسا گھر خریدنا چاہیے جس میں میں باغبانی کر سکوں۔ اچھے اچھے پھول اُگا سکوں۔ تلاش کرنے پر اس کو ایک ایسا گھر مل بھی گیا۔ یہ گھر تھا تو چھوٹا مگر اس میں باغبانی کے لیے کافی زمین تھی اور وہ زمین کے ایک کونے میں بنا ہوا تھا۔ مکان اور زمین کا نقشہ کچھ یوں تھا۔
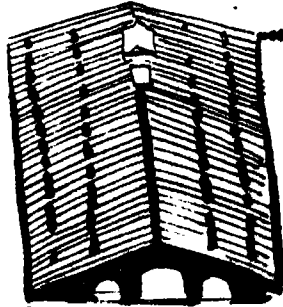
دکاندار بہت خوش ہوا اور اس نے وہ گھر خرید لیا۔

اس کے چار لڑکے تھے۔ ان سب کو بھی باغبانی کا بہت شوق تھا۔ لڑکوں نے جب اتنی جگہ دیکھی تو اپنے والد سے کہا۔ ابا یہ زمین ہم میں تقسیم کر دیجیے تاکہ ہم سب اپنی اپنی پسند کے پھول بو سکیں۔ پھر آپ دیکھیے گا کہ کس نے پھول عمدہ اور اچھے بوئے ہیں۔ باپ نے کہا "اچھی بات ہے تم اس زمین کو تقسیم کر لو۔ لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔" لڑکوں نے پوچھا "وہ کیا؟"

باپ نے کہا۔ "اس زمین کو تم اس طرح تقسیم کرو کہ چار بالکل برابر اور بالکل ایک جیسے قطعے نکل آئیں وہ تم آپس میں بانٹ لو۔"

لڑکوں نے کہا اچھی بات ہے۔ ہم اس کے چار بالکل برابر اور بالکل ایک جیسے حصے کر لیتے ہیں۔ مگر بھئی یہ تو بڑا بے ڈھب سوال ہو گیا۔ مکان اس طرح ایک کونے میں بنا ہوا تھا کہ چار حصے تو ہو جاتے تھے مگر ایک جیسی شکل کے نہ ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنے والد کے سامنے یہ پریشانی پیش کی۔ باپ نے ہنس کر کہا۔ بھئی کوشش کرو چار حصے ہو سکتے ہیں۔

لڑکے سوچ میں پڑ گئے۔ سوچتے رہے سوچتے رہے۔ آخر ایک لڑکے کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی اور اس نے زمین کے چار حصے اس طرح کر دیے کہ وہ پیمائش میں بھی برابر تھے اور شکل میں بھی بالکل برابر تھے۔

لیکن بھئی کس طرح؟ ذرا آپ بھی تو سوچیے۔ اور خوب غور کرنے کے بعد اپنا جواب صفحہ نمبر ۲۰ پر دیے ہوئے جواب سے ملائیے۔

ایک افیونی:۔ کسان سے (جو بیج بو رہا تھا) حرام خور
بلیک مارکیٹر (چوری سے مال چھپانے والا)

کسان:۔ ارے ارے مجھے گالیاں کیوں دے رہے ہو۔

افیونی:۔ ملک میں قحط پڑا ہے اور تو غلہ زمین میں چھپا رہا ہے۔

"مبشر احمد"

دو لڑکے باغ میں گھومنے کی غرض سے گئے اور راستہ بھول گئے۔ شام ہونے کے قریب تھی کہ انھیں باغ کا چوکیدار مل گیا اور انھیں ان کے گھر کی طرف لے جانے لگا۔ اس پر ایک لڑکے نے چوکیدار سے کہا

لڑکا:۔ ابھی ہمیں گھر نہ لے جاؤ بلکہ دو تین گھنٹے یہیں ٹھہر جاؤ۔

چوکیدار:۔ کیوں؟

لڑکا:۔ کیونکہ ابھی گھر جانے پر ہمیں ابا دیر سے گھر آنے پر ماریں گے۔ اگر رات کو دیر سے گئے تو وہ ہمیں پا کر خوش ہوں گے اور مٹھائیاں دیں گے۔

"محمد یحییٰ"

ایک منہار:۔ چوڑیوں کی ایک گٹھڑی کمر پر لادے چلا جا رہا تھا۔ راستے میں ایک چور نے اس کی گٹھڑی پر ایک لاٹھی مار کر پوچھا "اس میں کیا ہے"

منہار:۔ اگر ایک لاٹھی اس پر اور مار دو تو کچھ بھی نہیں ہے صرف بوجھ ہی بوجھ ہے۔

استاد:۔ دل لگا کر پڑھنے سے کیا فائدہ ہے؟
جناب آپ کی مار کھانے سے نجات مل جاتی ہے۔

"محمد صغیر خاں"

لڑکا:۔ ابا میں ان ماسٹر صاحب سے نہ پڑھوں گا۔

باپ:۔ کیوں بیٹا؟

لڑکا:۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ افریقہ کہاں ہے کل مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

"محمد عاشق"

بچہ:۔ (دسترخوان پر گھر کے لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں)

بچہ:۔ ابا! ابا!...... کیک

ابا:۔ بیٹے کھاتے وقت بات چیت نہیں کرتے۔

بچہ:۔ جی! ابا حضور۔

ابا:۔ (کھانے کے بعد) کہو کیا کہہ رہے تھے۔

بچہ:۔ ابا حضور آپ کے کیک میں۔ ایک کیڑا تھا۔ "سعید"

بچوں کی کوششیں

بوجھو تو جانیں

رسالوں کے نام تلاش کرو۔

۱۔ سلیم تندور سے روٹی لے آیا۔

۲۔ اپی آم خالی اوقات میں نہ کھایئے۔

۳۔ پھول اور کلی انیل نے توڑی تھیں۔

۴۔ ایک چھوٹا فیتہ لے آؤ۔

ملکوں کے نام تلاش کرو:۔

۱۔ الائچی نہ کھاؤ۔

۲۔ کیلے من بھر ہیں کہ نہیں؟

۳۔ قتل کا مجرم نہ پکڑا جا سکا۔

۴۔ آج آپا نسرین کے گھر گئی ہیں۔

سید قمر الحسن لکھنوی

ملکوں ملکوں میں مزاج پرسی کے فقرے۔

کیسے ہو۔ (انگریزی)

کیسے گزرتی ہے۔ (فرانسیسی)

خدا تمہیں صبر عطا کرے۔ (روسی)

تمہاری عمر دراز ہو۔ (ہسپانی)

آپ کو پسینہ تو خوب آتا ہے۔ (مصری)

خوشیاں مناتے نظر آؤ۔ (یونانی)

تمہارا سایہ دراز ہو۔ (ایرانی)

تم پر سلامتی ہو۔ (عربی)

تم نے خوب کھایا ہاضمہ تو درست ہے (یونانی)

تمہارے خاندان پر امن کا سایہ ہو۔ (ایرانی)

تندرستی ہو۔ (افغانی)

کیوں کر بسر ہوتی ہے۔ (جرمنی)

مزاج اچھا ہے۔ (ہندستانی)

تم پر سلامتی ہو صبح یا شام یا رات۔ (ترکی)

ع۔ ع۔ قریشی ہنیگن گھاٹ

[illegible]

محبت کی بازی

رسول پور میں ایک کسان رہتا تھا۔ اس کا نام شیر خاں تھا۔ وہ بڑا گھمنڈی تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔

گاؤں کے لوگوں سے شریفوں کی طرح بات نہ کرتا تھا۔ نہ تو وہ کسی کے گھر ہی جاتا۔ نہ راستے میں کسی کو سلام کرتا۔ گاؤں کے لوگ بھی اسے گھمنڈی سمجھ کر

اس سے نہیں بولتے تھے۔

اس گاؤں میں ایک نیا آدمی کسی کام کے سلسلے میں آیا اور رہنے لگا۔ اس کا نام تھا بھلّو میاں۔ وہ سیدھا آدمی تھا۔ وہ سب کی کچھ نہ کچھ مدد کیا کرتا تھا۔ اس لیے سبھی کسان اس کی عزت کرتے تھے اور اپنے کاموں میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے۔

گاؤں کے کسانوں نے بھلّو میاں سے کہا۔ "بھائی بھلّو میاں! تم کبھی شیر خاں کے گھر مت جانا۔ اس سے دور ہی رہنا۔ وہ بہت جھگڑالو آدمی ہے۔"

بھلّو میاں نے ہنس کر کہا۔ "شیر خاں نے اگر مجھ سے جھگڑا کیا تو میں اسے مار ہی ڈالوں گا۔"

کسان یہ سن کر ہنس پڑے۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ بھلّو میاں بہت مہربان آدمی ہے۔ مارنا تو دور رہا کسی کو گالی تک نہیں دے سکتا۔ لیکن یہ بات کسی نے شیر خاں سے کہہ دی۔ شیر خاں غصّہ سے لال ہو گیا۔ وہ اسی دن سے بھلّو میاں سے جھگڑا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے بھلّو میاں کے کھیت میں اپنے بیل چھوڑ دیے۔ بیل بہت دور تک کھیت چر گئے۔

"بھلّو میاں کچھ نہ بولے۔"

دوسرے دن شیر خاں نے بھلّو میاں کے کھیت کی نالی توڑ دی۔ پانی دوسری طرف بہنے لگا۔ بھلّو میاں نے آکر چپ چاپ نالی ٹھیک کر لی۔ اسی طرح شیر خاں برابر بھلّو میاں کو پریشان کرتا رہا۔ لیکن بھلّو میاں نے ایک بار بھی اسے جھگڑنے کا موقع نہ دیا۔

ایک دن بھلّو میاں کے بڑے بھائی نے لکھنؤ کے میٹھے خربوزے بھیجے۔ بھلّو میاں نے سبھی کسانوں کے ہاں ایک ایک خربوزہ بھیج دیا۔ لیکن شیر خاں نے اس کا خربوزہ یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں بھیک منگا نہیں ہوں۔

برسات کا موسم تھا۔ شیر خاں ایک گاڑی اناج لے کر دوسرے گاؤں سے آرہا تھا۔ راستہ بہت خراب تھا۔ اس کی گاڑی نالے میں پھنس گئی۔ شیر خاں کے بیل دبلے تھے۔ وہ گاڑی کو کیچڑ سے نکال نہ سکے۔ جب گاؤں میں اس بات کی خبر پہنچی تو سب لوگ بولے "شیر خاں بڑا ہی خراب آدمی ہے اسے رات بھر نالے میں پڑا رہنے دو۔" لیکن بھلّو میاں نے اپنے طاقتور بیل ساتھ لیے۔ اس طرف چل پڑا۔ لوگوں نے اسے روکا اور کہا۔ "بھلّو میاں! شیر خاں نے تمھارا بہت نقصان کیا ہے تم تو کہتے تھے کہ وہ لڑے گا تو اسے مار ڈالوں گا۔ پھر تم آج اس کی مدد کرنے کیوں جاتے ہو۔؟"

بھلّو میاں نے کہا "میں آج سچ مچ اسے مار ڈالوں گا۔ دیکھ لینا" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل پڑا۔

جب شیر خاں نے بھلّو میاں کو بیل لے کر آتے دیکھا تو اکڑ کر بولا "تم اپنے بیل لے کر واپس چلے جاؤ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔"

بھلّو میاں نے کہا "تمھارے من میں آئے تو گالی دو چاہو تو مجھے مارو۔ لیکن اس وقت تم پریشانی میں ہو۔ تمھاری گاڑی پھنسی ہے اور رات ہونے والی ہے۔ میں تمھاری بات اس وقت نہیں مان سکتا۔"

بھلّو میاں نے شیر خاں کے بیلوں کو کھول کر اپنے بیل گاڑی میں جوت دیئے۔ اس کے طاقتور بیلوں نے

گاڑی کو کھینچ کر اسے باہر نکال دیا۔ شیر خاں گاڑی لے کر گھر آ گئے۔

اب وہ گھمنڈی نہیں تھا —— گھمنڈی شیر خاں تو مر چکا تھا۔ سچ مچ بھلو میاں نے اسے مار ڈالا۔ شفقت اور محبت کی تلوار سے!!

بھلو میاں نے بازی جیت لی تھی۔

قرار احمد خاں آزاد۔ اکبر پور

عقل مند بوڑھا:-

ایک دفعہ کسی بادشاہ نے یہ اعلان کیا کہ وہ سونے سے بھرا ہوا تھیلا اپنی رعایا میں اس شخص کو دے گا۔ اس کو کوئی حیرت انگیز کہانی سنا دے گا۔ لیکن یہ کہانی سچی نہ ہو۔ ورنہ وہ انعام حاصل نہ کر سکے گا۔ دوسرے دن ملک بھر سے لوگ اچھی سے اچھی کہانیاں لے کر آئے لیکن بادشاہ نے بتایا کہ یہ ناممکن ہے کہ یہ کہانیاں سچی نہ ہوں۔ لہذا انعام کوئی نہیں پا سکتا ہے۔ آخر ایک بوڑھا لمبا مرتبان ہاتھ میں لیے ہوئے حاضر ہوا اور عرض کیا۔

بادشاہ سلامت! آپ کے والد صاحب نے میرے والد صاحب سے یہ سونے سے بھرا ہوا مرتبان ادھار لیا تھا۔ اس شرط پر کہ جناب اس کی رقم مجھے چکا دیں گے۔

بادشاہ نے جوں ہی اس مرتبان کی طرف دیکھا فوراً بول اٹھا "یہ بالکل ناممکن بات ہے"۔

تب بوڑھا بولا۔ "اگر یہ ناممکن بات ہے تو — میں نے صاف طور پر سونے سے بھری ہوئی تھیلی جیت لی ہے اور اگر میری یہ کہانی سچی ہے تو محترم والد صاحب کی رقم چکا دیں"۔

بادشاہ یہ جواب سن کر شش و پنج میں پڑ گیا اور اپنی رعایا میں یہ اعلان کروا دیا کہ بوڑھا انعام جیت گیا ہے۔ بوڑھا انعام پا کر خوشی خوشی اپنے گھر روانہ ہو گیا۔

نیاز احمد میر

جامعہ کے مدرسوں میں الیکشن کی دھوم دھام

اگست اور ستمبر کے مہینے میں جامعہ کے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں خوب چہل پہل رہتی ہے۔ ان کی انجمنوں کے چناؤ عام طور پر انھی مہینوں میں ہوتے ہیں۔ ہفتہ دو ہفتے پہلے الیکشن کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور دن پر دن ان میں تیزی آتی جاتی ہے۔ ہر امیدوار اور اس کے حمایتی ووٹروں کو اپنے موافق کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرتے ہیں۔ پھر جلسے ہوتے ہیں۔ ان میں دھواں دار تقریریں ہوتی ہیں۔ الیکشن مینی فسٹو پیش کیے جاتے ہیں یعنی ہم کامیاب ہو گئے تو سب کی بھلائی کے لیے کیا کیا کام کریں گے۔ ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے اشتہار تقسیم ہوتے ہیں۔ پوسٹر لگائے جاتے ہیں۔ ان پوسٹروں کی ڈرائنگ بچے اپنے شوق سے بناتے ہیں۔ بہت دلچسپ بہت مزے دار۔ ایسا لگتا ہے جیسے دیواروں پر بچوں کی ڈرائنگ کی نمائش لگی ہو۔

۱۲ر اگست کو مدرسہ ثانوی کا الیکشن ہوا۔ کیسا کچھ جوش و خروش تھا۔ الہٰی توبہ! اور جب ووٹ پڑ چکے تو نتیجے کا انتظار تھا جو اسی دن سنایا جانے والا تھا۔ امیدوار اور ان کے ہمدردوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ آخر شام کو نتیجہ سنا دیا گیا اور ان خوش نصیبوں نے کامیابی حاصل کی۔

نائب صدر عنایت اللہ، سکریٹری پرویز علی خاں، ایڈیٹر المنصور۔ انصر سعید ایڈیٹر اُمنگ زیبا نسرین۔ کھیل کے ناظم صابر علی۔ لائبریرین سید محمد عاقل۔

ہم ان سب امیدواروں کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

مدرسۂ ابتدائی کے بچوں کی انجمن کا نام "بچوں کی حکومت ہے"، اور بھئی بچے اپنی حکومت کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا کام جو ٹھہرا۔

اس مرتبہ بچوں کی حکومت کے صدر کا الیکشن ۶ر ستمبر کو ہوا۔ پانچ امیدواروں کے درمیان مقابلہ تھا۔

۶ر ستمبر کو سنیچر کے دن سویرے تڑکے بچے مدرسے میں آ گئے، اس سے پہلے انھوں نے رات بھر دیواروں پر پوسٹر چپکائے۔ چادروں پر ہر امیدوار کا نام اور چلتے ہوئے فقرے۔ لکھ کر انھیں جگہ جگہ لٹکایا۔

ساڑھے آٹھ بجے جلسہ شروع ہوا۔ جلسے میں امیدواروں کی تقریریں ہوئیں مضمون پڑھے گئے نظمیں پڑھی گئیں آخر میں معمول کے مطابق ہر امیدوار نے اپنے منصوبے بتائے اپنے ارادے ظاہر کیے۔ جلسے کے بعد تمام امیدواروں کے الگ الگ جلوس نکلے۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے پولنگ شروع ہوئی اور ۱۲ بجے تک جاری رہی اور جناب نتیجہ بھی ہاتھ کے ہاتھ یعنی ایک بجے سنا دیا گیا۔ محمد عیسیٰ صاحب کو سب سے زیادہ (۲۹۰) ووٹ ملے۔ پھر کیا تھا۔ لڑکوں نے عیسیٰ صاحب کو ہار پہنائے، پٹاخے چھوڑے۔ کرسی پر بٹھا کر جلوس نکالا۔ اور زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔

محمد عیسیٰ صاحب مبارک ہو۔ دیکھیے منصب نشینی کی تقریب میں ہمیں بھی یاد رکھیے گا۔

ادھر ادھر سے

ڈولفن کی سواری

حال ہی میں نوو ورسسک میں ایک خلافِ معمول بات ظہور میں آئی۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ لوگ سمندر کے کنارے بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے۔ اچانک کسی نے شور مچایا "ڈولفن" "ڈولفن"! سمندر کے کنارے پر موجود لڑکے بہت جوش میں آ گئے اور فوراً پانی میں کود پڑے۔ ڈولفن رک گئی جیسے یہ سوچ رہی ہو کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ تیر کر ساحل پر چلی آئے یا سمندر میں لوٹ جائے۔ چند لمحوں کے بعد اس نے لڑکوں کی سمت میں تیرنا شروع کر دیا۔ چند منٹ کے بعد لڑکوں نے جانور کو گھیر لیا۔ لڑکے ڈولفن کے ساتھ پانی میں چھینٹے اڑاتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوڑتے رہے، اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے رہے اور ایک الھڑ لڑکا تو ڈولفن کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور اس پر سوار کئی میٹر تک تیرتا ہوا چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کے بعد ڈولفن واپس سمندر میں چلی گئی۔

(تاس)

لوہا اور شیشا کھانے کا شوق

بین الاقوامی ریکارڈ محض میچوں اور ورزشی مقابلوں میں ہی نہیں ٹوٹا کرتے کبھی کبھی اکثر بالکل غیر کسرتی لوگوں کو بھی کوئی نہ کوئی نیا عالمی ریکارڈ قائم کرنے کا شوق چرایا کرتا ہے۔ کوئی کباب کھانے میں نام پیدا کرتا ہے، کوئی سگریٹ پینے میں، بعض مٹکوں شراب پی جانے کو ہی ذریعۂ عزت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ مگر غالباً سب سے انوکھا شوق وفاقی جمہوریہ جرمنی کے مشہور سلڈورف کے ایک اکتالیس سالہ بازی گر مسٹر کارل نیگماں کو ہے۔ یہ صاحب بڑی رغبت کے ساتھ لوہے اور شیشے کی چیزیں کھانے کے عادی ہیں ان دنوں وہ اس میدان میں اپنے ایک سویڈش (سویڈن کے رہنے والے) حریف سے بازی لے جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں جو ایک دن ڈھائی سیر لوہا نگل گیا تھا۔ ان کی مرغوب غذاؤں میں بلب، ریزر بلیڈ ریکارڈ اور نوک دار کیلیں سبھی کچھ شامل ہے۔ بسا اوقات وہ ایک دن میں پچاس بلب چٹ کر جاتے ہیں۔ چونکہ بہت سے لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ نیگماں سچ مچ یہ چیزیں ہضم کر جاتا ہے اس لیے ایک دفعہ انھوں نے اس کے پیٹ کا ایکسرے کروانے کی شرط رکھی۔ جب انھوں نے کیمرے کے سامنے آنے سے پہلے شیشے کی ایک ڈیڑھ میٹر طبی ٹیوب نگل لی تو ڈاکٹر صاحب کو اس کی حیرت انگیز صلاحیت کی تصدیق کرنی پڑی۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ عام طور سے انسان جب کوئی ایسی چیز نگل جاتا ہے تو وہ سخت گھبراتا ہے۔ اس کی یہی گھبراہٹ اسے نقصان پہنچاتی ہے۔ جو لوگ نڈر اور نچنت رہتے ہیں۔ ان کے معدے

اور انتڑیوں میں بہت سی رطوبت پیدا ہو کر انھیں گھائل ہونے سے بچا دیتی ہے۔ اگر کوئی چیز آنت میں اٹک جائے تو باریک کٹی ہوئی گوبھی ثابت نگلنے سے بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ جرمن شفا خانوں میں بھی اکثر ایسی ہی ترکیبیں استعمال کی جاتی ہیں۔ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ اگر آدمی گھبرائے نہیں تو ۹۰ فیصدی صورتوں میں ایسی چیزیں فطری راستے خارج ہو جاتی ہیں۔ ورنہ آپریشن کے بغیر چارہ نہیں۔

بونوں کا کلب

لیجیے جناب ایک مزے کی خبر سنیے۔ بونوں نے بھی اپنا کلب کھول دیا۔ یہ کلب ایوا اور اولٹو اینگل نے جرمنی کی مشہور بندرگاہ ہمبورگ میں کھولا ہے جو وفاقی جمہوریہ جرمنی میں تمام ٹھنگنے لوگوں کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ اب تک پچاس سے زیادہ بونے اس کلب کے ممبر بن چکے ہیں۔ یہ دونوں میاں بیوی جو خود بونے ہیں ان مشکلات کا جو روزگار کے مسئلے سے شروع ہوتے ہیں اور روزمرہ زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتے ہیں۔ خوب تجربہ کر چکے ہیں۔ اپنے بونے پن کی وجہ سے یہ رہنے سہنے کی تمام مروجہ سہولتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ انھیں اپنا لباس بھی خاص آرڈر دے کر بنوانا پڑتا ہے۔ یورپ کے ملکوں میں تو آج کل سلے سلائے کپڑوں کا رواج ہے۔ اس لیے یہ کپڑے انھیں نہایت مہنگے پڑتے ہیں۔ ہمبورگ کی شہری حکومت ٹیکسوں کے سلسلے میں ان کے ساتھ خاص رعایت کرتی ہے۔ اور آئندہ انہیں خاص قسم کی گاڑیاں خریدنے کے لیے مالی امداد بھی فراہم کرے گی۔ بونے تو ہمارے دیس میں بھی خیر سے بہت کافی ہیں۔ خدا کرے یہ خبر ان کے کانوں تک پہنچ جائے۔

بلیاں بھی مہنگے داموں بکنے لگیں

اڑیسہ کے صوبے میں ایک ضلع ہمبل پور ہے۔ وہاں چوہوں نے سر اٹھایا ہے۔ اتنے بڑھ گئے ہیں، اتنے بڑھ گئے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ یہ چوہے اناج کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ لوگوں نے ان کا قلع قمع کرنے کے لیے زہر استعمال کیا پر یہ تدبیر کچھ ایسی کارگر نہ ہوئی لوگوں نے سوچا صرف بلیاں ہی انھیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتی ہیں۔ بس پھر کیا تھا، وہاں اب ایک ایک بلی دس دس روپے میں بک

ایک انوکھی بستی سو میٹر اونچے میناروں پر

چند سالوں کے اندر اندر فولاد لوہے اور کنکریٹ کی ٹہنیوں والا یہ درلوسیکل عمارتی پیڑ وفاقی جمہوریہ جرمنی کے شہر اسٹوٹگارٹ میں تین چار ہزار انسانوں کی رہنے سہنے کی ضرورتیں پوری کرنے لگے گا۔ اس کا نقشہ تیار کرنے والوں کو یہ بھی امید ہے کہ ان کی ایک سو میٹر اونچی ڈیلوسیکل ایجاد شہروں کی گندگی اور کثافت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک معقول ذریعہ ثابت ہو گی۔ ان کے خیال میں بڑے بڑے شہروں میں فلک بوس عمارتوں کے سپاٹ بلاک کھڑے کرنے کی بجائے ایسے سڈول مینار تعمیر کیے جائیں جو کافی بلندی پر جانے کے بعد رہائشی مکانوں کی شکل و صورت اختیار کریں تو گھروں کے نیچے جنگلات لگا کر اندرونی شہر کی ہوا کو بھی دیہاتوں کی سی فرحت و تازگی کا مالک بنایا جا سکتا ہے۔ مالی اعتبار سے بھی اس منصوبے کے قابل عمل ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ ساری شاخ در شاخ باہم پیچیدہ عمارتوں پر کم و بیش پچیس کروڑ جرمن مارک کی لاگت آئے گی۔

Payam - I - Taleem
NEW DELHI-25.

اِن کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
کرمے دادا	۱/۷۵	دہلی	۱/۵۰
سمندر کے نیچے	۲/-	ہماری پارلیمنٹ	۱/۵۰
سمندر کے کنارے	۱/۱۲	برف کا گھر	۰/۸۷
میر انیس	۱/۲۵	برف کے تیرتے پہاڑ	۰/۳۰
میر تقی میر	۱/-	آستین کا سانپ	۰/۵۰
ابو خاں کی بکری	۲/۵۰	الٹی دوا	۰/۵۰
انوکھا عجائب خانہ (مکمل)	۱/۱۰	بادشاہ کے کپڑے	۰/۵۰
تین اناڑی	۱/۴۰	زمین کی گردش	۰/۵۰
ستاروں کی سیر	۱/۰۵	سونے کی چڑیا	۱/[illegible]
خرگوش کا سپنا	۱/۵۰	چمپاوت کا آدم خور شیر	۰/۳۵
جن حسن عبدالرحمٰن (مکمل)	۴/-	ایک ٹانگ کا بادشاہ	۰/۳۰
آدمی کی کہانی	۱/۲۵	انوکھی ملاقات	۰/۳۵
بڑے دادا کی کہانی	۰/۵۶	جلو مرغابی	۱/-
چٹانوں کی کہانی	۱/۵۰	گلابو جوتھیا	۰/۴۵
دادا نہرو	۱/۵۰	ظالم کسان	۰/۳۵

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دہلی ۶

[illegible] پریس دہلی

پیام تعلیم

[illegible] جموں و کشمیر کے
[illegible] کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ پیام تعلیم نئی دہلی

شمارہ ۱۱   نومبر ۱۹۶۹ء   جلد ۶

ایڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار، دہلی ۶

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علیگڑھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے   سالانہ چندہ چھ روپے

فہرست

یہ نومبر کا پرچہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اگلا پرچہ دسمبر کا ہوگا۔ اور پھر ـــــ؟ پھر کیا وہی سالنامہ۔

سالنامے کی تیاری شروع ہو چکی ہے۔ مضمون نگاروں کو شاعروں کو خط لکھے جا رہے ہیں۔ کچھ مضمون آ چکے ہیں۔ ان کی کتابت ہو رہی ہے۔ جامعہ کے حلقے میں اور جامعہ سے باہر بزرگ اور ساتھی آپ کے سالنامے کے لیے اچھے اچھے مضمون، اچھی اچھی کہانیاں لکھ رہے ہیں، اچھی اچھی نظمیں لکھ رہے ہیں۔

نظموں کے سلسلے میں پیام تعلیم کے شاعر صاحب نے ایک بات کی خاص طور پر درخواست کی ہے۔ وہ یہ کہ نظم کہنے سے پہلے محترم شاعر حضرات ایسی بحروں انتخاب کریں جو شگفتہ ہوں اور جن میں ترنم ہو۔ پیامی انھیں مزے لے کر اور گا کر پڑھ سکیں یہ بھی نہ ہو کہ ایک شعر ایک بحر کا ہے دوسرا کسی اور بحر کا۔

ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ آپ کا یہ سالنامہ ہر لحاظ سے شاندار ہو، دلچسپ ہو، اس میں کہانیاں بھی ہوں، ڈرامے بھی ہوں، معلوماتی مضمون بھی ہوں، ہنسنے ہنسانے والی باتیں بھی ہوں۔

ہمارے منیجر صاحب کا خیال ہے کہ سالنامہ رجسٹری سے بھیجا جائے۔ یہاں سے بہت احتیاط سے بھیجا جاتا ہے۔ پھر بھی بہت سی شکائتیں آتی ہیں۔ پیام تعلیم پر خرچ کا بہت بوجھ پڑ جاتا ہے۔ اس لیے ان کی درخواست ہے کہ پیامی رجسٹری کے ۷۵ پیسے بھیج دیں۔ نئے خریدار یا خریداری کی مدت ختم ہونے کے بعد دوبارہ چندہ بھیجنے والے پیامی یہ ۷۵ پیسے ضرور بھیجیں کہ سالنامہ یقینی طور پر انھیں مل جائے۔

ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اکتوبر کا پرچہ آپ سب کو پسند آیا۔ پیامیوں نے ہر مضمون کی تعریف کی ہے۔ نیلم اور فرخ کی کہانی کی تعریف میں تو اتنے خط آئے ہیں، اتنے خط آئے ہیں کہ شمار سے باہر ہیں۔ اس پرچے میں تیسری قسط چھپ رہی ہے۔ یعنی ستمبر سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے۔ ان سب پرچوں کو محفوظ رکھیے۔ نئے خریدار ہونے والے پیامی بہتر ہے کہ ستمبر ۱۹۷۹ء سے اپنی خریداری کا سلسلہ شروع کریں تاکہ پوری کہانی ان کے پاس محفوظ ہو جائے۔

تعلیم اور تفریح کے علاوہ اس پرچے میں مسجد اقصیٰ پر ایک مستند عالم کا مضمون پڑھیے۔ جناب محمد امین صاحب کی کہانی "نوبیا" پڑھیے۔ ۲ مزے دار ڈرامے، گڑیا کی شادی اور ہارون رشید کا انصاف پڑھیے۔ سمندری جانور وہیل کا حال پڑھیے۔ نظمیں اور لطیفے پڑھیے۔

اب کی ٹائٹل پر مولانا جلال الدین رومی کے مزار کی تصویر چھپ رہی ہے۔ یہ "القرہ میں چند دن" کی دوسری قسط کے سلسلے میں ہے محترمہ آصفہ مجیب اللہ صاحبہ کے لیے بھی ایک اچھی سی چیز لکھ رہی ہیں۔ اور ہاں بھئی ایک دلچسپ معلوماتی مضمون اجتبا ندوی صاحب لکھ رہے ہیں۔

پچھلے مہینے محترم اجتبا ندوی استاد مدرسہ ثانوی جامعہ نے آٹھ خریدار مرحمت فرمائے۔ دو خریدار عادل جعفری صاحب داندوں اور ایک بزمی بھارتی صاحب انچارج شاخ علی گڑھ (نجم انصاری) نے۔ محمد اسد اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر بلڈانہ۔ محترمہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ گرلس اسکول شولاپور۔ جناب ہیڈ ماسٹر صاحب اردو اسکول ناگوتھنا قلابہ، جناب ہیڈ ماسٹر صاحب اردو اسکول منور دتھانہ جناب ہیڈ ماسٹر صاحب اردو اسکول ہکا د بلڈانہ نے ایک سال کی خریداری منظور فرمائی ہے۔ ان کے علاوہ ہمارے پرانے مضمون نگار جناب خلیق انجم نرفی دہلی، ہبتہ اللہ صاحب کھنڈوا قاضی وہاب الدین صاحب برہان پور خود خریدار بنے ہیں۔ مدرسہ ثانوی جامعہ میں خریدار ہونے والے بچوں کے نام ہم اگلے پرچے میں دیں گے۔

ان صفحوں میں ہم ایک بات کا ذکر بار بار کر چکے ہیں۔ پیام تعلیم کے کم سے کم پانچ خریدار بنانے والے بزرگوں اور ساتھیوں کی خدمت میں پیام تعلیم ایک سال کے لیے مفت نذر کیا جائے گا۔ اور اگر وہ خریدار ہیں تو وہ جس کے نام چاہیں رسالہ جاری کر دیا جائے گا۔

اچھا بھئی اب دو خوش خبریاں بھی سن لیجیے۔ شاہد علی خاں صاحب انچارج مکتبہ جامعہ بمبئی کو تو آپ خوب جانتے پہچانتے ہیں۔ پیام تعلیم پر ان کی مہربانیوں کا ذکر اکثر ہوتا رہتا ہے پچھلے مہینے (اکتوبر میں) ان کی شادی خانہ آبادی کی تقریب خیر و خوبی کے ساتھ عمل میں آرہی ہے۔ ہم انھیں اپنی اور آپ کی طرف سے دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

دوسرے صاحب قیصر سرمست دھیلا کم ہیں۔ یہ بھی آپ کے پرچے کے پرانے مضمون نگار ہیں۔ معلوماتی مضامین بہت انوکھے اور دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں یہ بھی پچھلے مہینے ماشاءاللہ ایک سے دو ہو گئے۔ قیصر صاحب ہماری اور آپ کی طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

جناب حافظ باقوی

پھولوں کی ٹہنی

اے نازک پھولوں کی ٹہنی
کتنی ہری پوشاک ہے پہنی
تو نے گلوں کے گہنے پہنے
تیری سج دھج کے کیا کہنے
تیرے بدن میں کتنی لچک ہے
تیرے گلوں میں کتنی مہک ہے
تجھ سے صبا کرتی ہے شرارت
تو بھرتی ہے اس میں نکہت
سارے چمن کو لہکاتی ہے
لہکاتی ہے، مہکاتی ہے
لاکھ چلے طوفان کہ آندھی
تجھ کو نہیں ہے خوف ذرا بھی
تیز ہوا کے زور سے جھک کر
تن جاتی ہے اپنے تنے پر
سب دکھ ہر دم سہتی ہے تو
ہنستی کھیلتی رہتی ہے تو
کوئی لچکنا تجھ سے سیکھے
اور مہکنا تجھ سے سیکھے
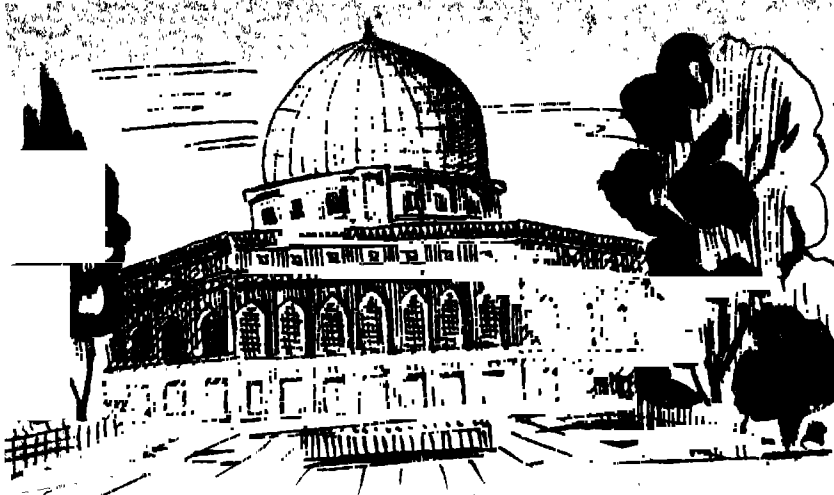
۲۱ر اگست (۱۹۶۹ء) کی تاریخ مسلمانوں کے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے بڑی منحوس تاریخ تھی۔ فلسطین کی مشہور مسجد، مسجد اقصیٰ میں یہودیوں نے آگ لگا دی۔ ساری دنیا میں غصّے اور رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں کے لیے تو یہاں کی متبرک جگہیں پہلے قبلے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مسلمان پہلے اسی کی طرف منھ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں خاص کر عرب ملکوں نے اس حادثے کو بہت شدت سے محسوس کیا۔

یہ مسجد اقصیٰ کیا چیز ہے، اور یہاں کے دوسری مقدس جگہوں کی تاریخی اور مذہبی حیثیت کیا ہے۔ ہماری درخواست پر محترم اجتباء ندوی (استاد مدرسہ ثانوی جامعہ) نے آپ کے لیے یہ اچھا سا مضمون لکھا ہے۔ اجتباء صاحب اپنی تعلیم کے سلسلے میں تین چار سال تک دمشق (شام) میں رہے ہیں۔ بیت المقدس دمشق سے قریب ہی ہے۔ لگ بھگ پچاس میل کا فاصلہ ہے، گھنٹے سوا گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں۔ اجتباء صاحب کئی بار بیت المقدس ہو آئے ہیں۔ انھوں جیسے آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ اسی لیے اتنا دلچسپ ہے۔ مضمون ذرا لمبا ہو گیا ہے اگلا حصہ دسمبر میں پڑھیے۔

ایڈیٹر

مغربی ایشیا میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ بہت پرانا بہت ہی پرانا، لاکھوں برس پرانا، انسان نے ؞روں سے نکل کر میدانوں کی طرف قدم رکھا۔ ھونپڑیاں بنائیں، گاؤں بسائے قصبے آباد کیے ر ترقی کرتے کرتے شہروں کی بنیاد ڈالی اور شاید سب سے پہلے پہل یہی شہر آباد ہوا۔

اس شہر کا پہلا نام "ایلیا" تھا بعد میں یروشلم ہوا اور اب اسے بیت المقدس کہتے ہیں۔ یہ شہر ملک اردن کی راجدھانی عمان سے ۸۰ میل کے فاصلے پر ہے۔

بیت المقدس بڑا خوبصورت اور عجیب
شہر ہے، وادیوں اور میدانوں سے گذرتے ہوئے
سرسبز و شاداب بلند پہاڑیاں نظر آتی ہیں، اونچی،
نیچی، ہموار، ناہموار پہاڑیاں، ان پر ہر قسم کے پھلدار
درخت اُگے ہوئے ہیں۔ زیتون کے درخت تو
بڑے سلیقہ سے لائینوں میں کھڑے ہوئے، جیسے
شہر میں ہر داخل ہونے والے کو خوش آمدید کہہ
رہے ہوں۔

ایک پہاڑ تو صرف زیتون کے درختوں
کا ہے۔ اسی لیے اس کا نام "جبل الزیتون" (زیتونی
پہاڑ) پڑ گیا ہے۔ زیتون کے درخت خوبصورت
پھلوں سے لدے ہوئے، ہرے، سرمئی، نیلے
اور سفیدی مائل نگاہوں کو بڑے بھلے لگتے ہیں۔

جنوب مشرق کے پہاڑ "ناریا" پر مسجد اقصیٰ
اور قبۃ الصخرہ کے آسمان کو چھونے والے گنبد اور
محراب دور سے نظر آتے ہیں۔ پہاڑیوں کے نیچے
چشمہ ہے۔ اس کا پانی بہت صاف و شفاف ہے
جیسے آئینہ اور ٹھنڈا جیسے برف۔

بیت المقدس شہر بڑا صاف ستھرا ہے۔
سڑکیں کشادہ، گلیاں روشن مگر تنگ، بازار و
در عمدہ، بہت سلیقے سے بنائے گئے ہیں چھت والے
تاکہ خریداروں کو بارش اور دھوپ کی تکلیف کا
احساس نہ ہو، دکانیں قرینہ سے سجی ہوئیں،
ہر قسم کا سامان اور ہر طرح کا اسباب، زیتونوں کی
لکڑی کے قلم دان، گل دان، رحل، تختیاں، کھلونے
اور گڑیاں۔ ان پر ہاتھی دانت اور سیپ کے
دلکش نقش و نگار، بازار میں چلے جایئے تو کچھ خریدنے کو
جی نہ چاہے۔ ہر سامان کو دیکھئے، خریدنا نہ خریدنا آپ
کی مرضی پر ہے۔ دکان دار بڑے با اخلاق، خوش
سلیقہ اور خوش مزاج، چہرہ پر تلخی نہ جھنجھلاہٹ،
گرمی نہ غصّہ، خوش خوش جایئے اور خوش خوش
واپس آجایئے۔

بیت المقدس ایک قدیم مضبوط شہر پناہ
سے گھرا ہوا ہے۔ اس میں داخل ہونے کے لیے سات
دروازے ہیں۔ ان میں سے صرف چار ہی کھلے
رہتے ہیں۔ اور زیادہ تر لوگ مشرقی دروازے۔
"الباب المشرقی" سے داخل ہوتے ہیں۔ روشن
اور ہموار مگر پُر پیچ گلیوں سے گذرتے ہوئے مسجد اقصیٰ
یا کلیسا قیامت تک پہنچ جایئے۔ اگر کہیں راستہ
بھول گئے، تو گلیوں میں گھنٹوں چکر لگا کر ہر مرتبہ
مسجد اقصیٰ کے کسی دروازے کے سامنے پہنچ
جایئے گا، ہر گلی مسجد اقصیٰ کے کسی نہ کسی دروازے
پر ختم ہو جاتی ہے۔ عمارتیں نئی پرانی ملی جلی، آرام دہ
اور پُر فضا، نئی اور پرانی تہذیب کی آئینہ دار۔

اسی یروشلم میں آج سے تقریباً پانچ ہزار
برس پہلے دو اجنبی (ایک مرد اور ایک عورت)
داخل ہوئے۔ کلدانیوں کی راجدھانی بابل کے
رہنے والے تھے، عقیدہ، دین، اخلاق اور نیکی

کے بچانے کے لیے انھیں بابل کی زمین تنگ نظر آئی۔ تو اہلِ وطن سے رخصت ہو کر اس پُر امن اور پُر سکون شہر بنانا کی جو آگے چل کر پیغمبروں کا شہر کہلایا اور دنیا کے تین بڑے آسمانی مذہبوں یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے لیے یکساں طور پر قابلِ احترام ٹھہرا۔

یہ دونوں اجنبی حضرت ابراہیمؑ تھے اور ان کی بیوی سائرہ تھیں، حضرت ابراہیمؑ کی ایک دوسری بیوی حضرت ہاجرہ تھیں۔ ان سے ایک لڑکے حضرت اسمٰعیلؑ ہوئے، حضرت ابراہیمؑ ان دونوں کو ایک بے آب و گیاہ سرزمین میں لے جا کر چھوڑ آئے تھے۔ یہیں بعد میں مکہ مکرمہ آباد ہوا، اور تھوڑے عرصہ کے بعد خدا کی عبادت کے لیے کعبہ کی تعمیر کی۔

حضرت ابراہیمؑ کی پہلی بیوی ساحرہ سے حضرت اسحاقؑ تھے، ان دونوں باپ بیٹوں نے ں کر "ماریا پہاڑ" پر ایک چھوٹا سا عبادت خانہ ایا تھا، اور اس میں بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ نرت اسحاقؑ کے لڑکے یعقوبؑ تھے، ان کا دوسرا م اسرائیل تھا، ان کے بارہ ۱۲ بیٹے تھے۔ انھی اولاد کو یہود کہتے ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کے ایک لڑکے حضرت فؑ مصر کے بادشاہ ہوئے تو اپنے والد اور الوں کو مصر بلا لیا۔ وہاں یہ لوگ رہ بس گئے عرصہ بعد زمانے کی گردش نے اس خاندان کو بڑی بے چارگی اور بے بسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا، لیکن خدا نے موسیٰ علیہ اسلام کے ذریعہ ان کو اس مظلومی اور بے کسی سے نجات دلائی۔ اور یہ لوگ "بیت المقدس" دوبارہ واپس آگئے۔ اور بنی اسرائیل کے نام سے شہرت اور عزت حاصل کی۔

بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر سموئیلؑ نے ان کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو منظم اور پائیدار بنانے کی خاطر ایک لائق اور دانش مند نوجوان حضرت داؤدؑ کو ان کا بادشاہ مقرر کیا، حضرت داؤدؑ بڑے نیک پرہیزگار اور عبادت گذار تھے۔ حضرت ابراہیمؑ و اسحاقؑ کے بنائے ہوئے "معبد" (عبادت گاہ) کے کھنڈروں کو تلاش کر کے اسی جگہ "معبد ربّانی" عمدہ اور پختہ تعمیر کے لیے ایک لاکھ ٹیلنٹ سونا (ٹیلنٹ سوا من کے قریب ہوتا تھا) دس لاکھ ٹیلنٹ چاندی اور بے حساب لوہا، تانبہ اور پیتل جمع کیا تھا۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ ان کے جانشین انھی کے صاحبزادے حضرت سلیمانؑ ہوئے، اور اپنی حکومت کے چوتھے سال "ھیکل سلیمانی" کے نام سے (۹۴۵ ق م) اسی سرمایہ سے ایک معبد (عبادت گاہ) کی تعمیر شروع کی، ایک لاکھ ۸۳ ہزار آدمی روزانہ کام کرتے تھے۔ اس طرح ساڑھے سات برس کی مدت میں یہ "معبد" (عبادت گاہ) بن کر تیار ہوا۔

اس زمانے کی یہ سب سے خوبصورت

بی جگہ جہاں پانی ہو نہ سبزہ

دل کش اور دل فریب عمارت تھی۔ یہ آلِ اسرائیل
کی مرکزی عبادت گاہ تھی، یہ ھیکل ۴۲۴ سال
تک باقی رہا، پھر مصر کا فرعون شیشک کسی وجہ
سے یہودیوں سے ناراض ہوا اور بیت المقدس
پر حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں ھیکل کو سخت نقصان پہنچا۔
۵۸۶ ق م میں بابل کے زبردست
بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس پر یلغار کی
اور ھیکل کو توڑ پھوڑ کے برابر کر دیا۔ لاکھوں
یہودیوں کو گرفتار کر کے بابل لے گیا۔ آل
اسرائیل (یہودیوں) کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ
اور حادثہ تھا، ان کے پیغمبر ھیکل کی بے حرمتی
اور قوم کی ذلت و رسوائی پر نوحہ خوانی اور
بیت المقدس کی تباہی پر ماتم کرتے تھے، اور
یہود کے گناہ اور بداعمالی کی پاداش میں عذاب
الٰہی سمجھتے تھے اور ہمیشہ انھیں ڈراتے رہتے
تھے۔

شاید آلِ اسرائیل کی اس رسوائی اور
ذلت پر ترس کھا کر شاہ ایران نے بابل پر حملہ کیا
اسرائیلی قیدیوں کو رہائی دی، اور دوبارہ ھیکل
کی تعمیر کی اجازت دی۔ ھیکل بن کر تیار ہوا لیکن
اب اس میں پہلی جیسی خوبصورتی، دل کشی، دل
فریبی اور نقش و نگار کہاں، وہ پہلی شان و شوکت
اور آن بان کھو چکا تھا، اسرائیلی پیغمبروں کی نشانیاں
تبرکات اور تحفے بھی بخت نصر کے حملہ کی نذر
ہو چکے تھے، تاہم یہ پانچ سو سال تک یہودیوں
کی عظمت اور مرکزیت کا نشان بنا رہا۔
۲۰ ق م، روم کے عظیم بادشاہ ہیرودیس
نے ھیکل سلیمانی کی پرانی اور ٹوٹی پھوٹی عمارت
کو نئے سرے سے بنوانا شروع کیا، اور یہودیوں
کی بڑی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ ھیکل بہت
عمدہ، خوبصورت، مضبوط اور شاندار سنگ مرمر
اور رنگین شیشوں سے مزین و آراستہ کیا گیا۔

(باقی آیندہ)

قُلی نے کہا: بومبا! کیا تم ہو؟

افریقہ میں کبھی بہادروں کی کمی نہیں رہی ہے۔ جیسے دنیا کے دوسرے حصوں میں۔ لیکن بومبا سے بڑھ کر کوئی بہادر گزرا ہے یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ پرانے بہت ہی پرانے زمانے سے لوگ یہ کہانی سنتے آئے ہیں۔

بومبا مغربی افریقہ میں سینے گل کے ایک بادشاہ کا لڑکا تھا۔ اس کے دادا بھی بادشاہ تھے اور اس وقت ان کی بڑی شہرت تھی۔ ان کا نام بقری تھا اور ان پر خدا کی بڑی عنایتیں تھیں۔ بقری اتنا بہادر اور نیک تھا کہ آسمان کا خدا اس کے لیے بادلوں کے اندر سے سونے کا عظیم اسٹول بھیج دیا تھا۔ سونے کا یہ اسٹول گویا تخت تھا۔ اسی پر بیٹھ کر مغربی افریقہ کے بادشاہ اپنی سرزمین پر حکومت کرتے چلے آئے ہیں۔

بقری نے ایک دن دیکھا کہ کالے بادل چھا گئے ہیں اور ان بادلوں میں اسے سونے کا اسٹول نظر آیا۔ منٹوں میں وہ اس کے قدموں میں آگیا۔ اس اسٹول کے ساتھ سونے کی بنی ہوئی ایک چھوٹی چیز جڑی ہوئی تھی۔ اس چمکیلی چیز میں زبردست جادو تھا۔

اس کی شکل کیا تھی اس سے کوئی بحث نہیں۔ اصلی بات یہ تھی کہ اسے ہاتھ میں لے کر اس کا مالک جیسے بھی چاہے اپنی شکل بدل سکتا ہے۔ یہی اس جادو کا کمال تھا کہ اسے ہاتھ میں لے کر جو چاہے کر لیجیے۔ یہاں تک کہ اس کی مدد سے اپنے آپ کو بھی غائب کر سکتا تھا۔

آج کل جو لوگ وہاں رہتے ہیں۔ ان میں سے بھی بعضوں نے سنہرے اسٹول کو دیکھا ہے۔ ابھی تک یہ موجود ہے۔ کم سے کم افریقہ میں خصوصاً مغربی افریقہ میں تو اسے دیکھا ہی گیا ہے۔ عوام میں اب بھی اس کا چرچا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ وہی سنہرا اسٹول ہے جسے آسمان کے خدا نے بقری کے لیے بادلوں کے ذریعے نازل کیا تھا۔

جب بادشاہ بقری مرگیا تو سونے کا اسٹول اور اس کا جادو اس کے لڑکے کو ملا۔ اور جب وہ مرگیا تو یہ دونوں چیزیں اس کے لڑکے (بقری کے پوتے) بومبا کے حصّے میں آنی چاہیے تھیں۔ جو اس کہانی کا ہیرو ہے۔ مرنے سے پہلے بومبا کے باپ نے ایک جوان کے پاس انھیں امانت رکھ دیا تھا لیکن بومبا کے چچا قولی نے انھیں چھین لیا تھا۔

"بومبا بھی سونے کے اسٹول پر بیٹھے گا۔ بومبا ہمارا بادشاہ ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے!"

جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تھا تو ہر ایک کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ بومبا ابھی کچی عمر کا لڑکا ہی تھا۔ لیکن ہر ایک اسے بہت چاہتا تھا۔ وہ ایک بہادر شکاری تھا۔ اپنی عمر کے دوسرے جوانوں کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ عقل مند تھا۔ اس لیے ہر ایک کی خواہش اور تمنا تھی کہ جلد سے جلد

وہ ان کا بادشاہ بن جائے۔ لیکن اس علاقے میں ایک ایسا آدمی تھا جو سونے کے اسٹول کو ہمیشہ کے لیے ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا نام تولی تھا۔ یہ آنجہانی بادشاہ کا بھائی تھا اور بومبا کا چچا۔

"بومبا ابھی بچہ ہے۔ وہ ہمارا بادشاہ کیا بنے گا۔ میں تولی اپنے بھائی کی جگہ حکومت کروں گا" تولی نے یہی باتیں لوگوں سے کہیں اور سب طرف اس کا ڈھنڈھورا پٹوا دیا۔

اس طرح تولی فوج کا مالک بن بیٹھا ہزاروں سپاہی اس کے حکم پر چلنے لگے۔ اس لیے کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کوئی اس کو بادشاہ نہ مانے۔ لیکن دل میں چور تھا اور جیسے ہی اس نے سنہرے اسٹول پر اپنی گدی سنبھالی تولی کو ڈر محسوس ہوا۔ کون جانتا تھا کہ جنتا اس کے خلاف بغاوت نہ کر بیٹھے؟ اور کہے آخر بومبا کو اس کی جگہ کیوں نہ بادشاہ بنا دیا جائے؟ لہٰذا وہ اس پھیر میں رہا کہ اس کانٹے کو کسی طرح راستے سے ہٹا دے۔ اس نے نوجوان شہزادے کو شاہی قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ اس پر سخت پہرہ بٹھا دیا۔ تولی اس کے خلاف سازش پہ سازش کرتا رہا کہ اس کو مار دے لیکن ہر بار اس کے سپاہیوں نے خبر کی "ہم بومبا کو نہیں مار سکے۔ جب ہم نے اس کو گھیرنے کی کوشش کی وہ غائب ہو گیا۔ ایک مرتبہ اس کی جگہ ہم کو چوہا ملا جو بھاگ کر دیوار کے ایک بل میں گھس گیا۔ دوسری بار اس کی جگہ ایک مکڑا تھا۔ وہ بھی بھاگ گیا"

بومبا کے پاس سونے کا جادو تھا جو اپنے اپنے دادا بقری سے وراثت میں ملا تھا۔ اس جادو کی مدد سے وہ آسانی کے ساتھ ہر جال سے نکل جاتا تھا۔

ہو سکتا ہے یہ بات بھی ہو کہ تولی کے سپاہی جان بوجھ کر اسے مارنا نہ چاہتے ہوں۔ ممکن ہے دل ہی دل میں وہ اسے چاہتے ہوں۔

"یہاں ہمارا رہنا خطرے سے خالی نہیں" بومبا نے آخر کار ایک رات اپنے وفادار غلام سنگا سے کہا "اپنے چچا کے قریب رہنا ٹھیک نہیں کہیں وہ ہمیں مروا نہ دے"

جب سارے محافظ سو گئے اور سناٹا ہو گیا تو چپکے سے بومبا قلعہ سے باہر نکل گیا۔ اسے ایک پوشیدہ راستہ معلوم تھا۔ سنگا بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل آیا۔ بومبا کا شکاری کتا بھی ساتھ میں تھا۔ اس کا اپنا کوئی محافظ دستہ نہیں تھا لیکن اپنے دو وفادار دوستوں کو ساتھ لے کر وہ جنگل کی طرف چل پڑا۔

چلتے چلتے یہ چھوٹا سا قافلہ پڑوس کے دوسرے بادشاہ کے علاقے میں داخل ہوا۔ یہ بادشاہ بومبا کے باپ کا دوست تھا۔

"اے بادشاہ میں آپ کی پناہ میں آیا ہوں۔ میرا غلام اور میرا وفادار کتا بھی ساتھ ہے۔" بومبا

نے قدم چومتے ہوئے کہا۔

"میری یہ بھی گذارش ہے کہ آپ مجھ کو فوجی امداد دیں تاکہ میں اپنے چچا سے سنہرا اسٹول حاصل کر سکوں۔ سلطنت جب مجھے واپس مل جائے گی تو میں اس کا بدلہ چکا دوں گا۔"

لیکن سب جانتے تھے کہ قولی کے پاس بڑی زبردست فوج ہے اور اس سے لڑنا آسان نہیں۔ اس لیے اس بادشاہ کی ہمت نہیں پڑی اور اس نے انکار کر دیا۔ بومبا مایوس ہو گیا۔ پر وہ اپنے ارادے کا پکا تھا۔ حق اس کے ساتھ تھا۔ وہ سنہرے اسٹول کو حاصل کرنے کے لیے جنگ ضرور کرے گا۔ یہ بات اس نے جی میں ٹھان لی تھی۔ وہ دوسرے ملک میں گیا۔ وہاں کے بادشاہ کا نام الکبیر تھا۔

"الکبیر کے پاس بڑی فوج ہے"۔ بومبا نے سگا سے کہا "ہو سکتا ہے کہ ہماری مدد کے لیے آمادہ ہو جائے"۔ اور پھر وہ سیدھا اس کے محل میں داخل ہو گیا۔ جہاں وہ اپنی سو بیویوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر بنا بیٹھا تھا۔

"اے بادشاہ! میرا نام بومبا ہے"۔ نوجوان نے مخاطب ہو کر کہا "میں بقری کا پوتا ہوں جسے آسمان کے خدا نے سونے کا ایک عظیم اسٹول دیا تھا۔ میں بقری کے لڑکے کا لڑکا ہوں۔ میرے باپ نے بھی اسٹول پر بیٹھ کر حکومت کی ہے۔ میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ میرے چچا قولی نے سلطنت غصب کر لی۔ مجھے فوجی امداد چاہیے تاکہ اپنی سلطنت واپس لے سکوں"۔

"بقری کے پوتے! بومبا! میں تمھیں خوش آمدید کہتا ہوں"۔ الکبیر نے گرم جوشی سے مہمان کا استقبال کیا۔

"تم یہاں رہو۔ ہمارے مہمان ہو لیکن قولی کے خلاف چڑھائی کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میرا بھلا اس سے کیا جھگڑا ہے"۔

بومبا کو افسوس ہوا لیکن بادشاہ کی مہمانی اس نے قبول کر لی۔ کھانے کے لیے اس کے سامنے دلیا آیا جس میں نمک بہت تیز تھا۔ یہ مزے میں اتنا نمکین تھا اور اتنا کھاری تھا جتنا سمندر کا پانی۔

"اے لڑکی میرے لیے تازہ پانی لاؤ"۔
اس نے غلام زادی سے کہا جو کھانا لائی تھی۔
"جلدی جاؤ اور پانی لاؤ۔ یہ دلیا اتنا نمکین ہے گویا کہ سمندر کا کھارا پانی"۔

"یہاں تازہ پانی نہیں ہے، چھوٹے سرکار"۔ لڑکی نے سر ہلاتے ہوئے کہا "سامنے پہاڑیوں پر تازہ پانی ملتا ہے لیکن وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں"۔ پھر اس نے بتایا کہ تازے پانی کے چشموں پر ایک بھاری فیر رہتا ہے۔

"جب اس کو ایک جوان لڑکی بھینٹ دی جاتی ہے تو وہ تازے پانی کو قصبے تک بہنے دیتا ہے۔ پھر ہم کو چند مہینوں کے لیے پانی مل جاتا

ہے۔ علاوہ پانی لینا ہو تو پھر ایک جوان لڑکی
کی بھینٹ دینی پڑے گی۔"

اور جناب ذرا بوما کی ہمت تو دیکھو۔
اپنے کتے تلاوم کو لے کر اور اپنا تیر نکیلا اور
نوکیلا بلم ساتھ میں لے شیر کو مارنے کے لیے وہ
سیدھا پہاڑیوں کی طرف نکل کھڑا ہوا۔

شیر اس وقت سو رہا تھا۔ بوما نے
جاکر اپنا بلم اس کے دل میں پیوست کر دیا۔
مرتے مرتے شیر نے پورے الکبیر کے قصبے کو سر پر
اٹھا لیا۔ مرد اور عورتیں غرض سارا قصبہ دوڑ
پڑا کہ یہ کیا ہنگامہ ہے۔

پہاڑی پر چشمے کے سامنے انھوں نے
دیکھا کہ شیر مرا پڑا ہے۔ پاس میں ریت کے اندر
بلم گڑا ہے۔ ایک کتا اس سے بندھا ہوا ہے۔
شیر کے سر پر ایک سینڈل بھی رکھا ہوا ہے۔
منٹوں میں یہ خبر گرم ہو گئی۔ جوان لڑکیاں
خوشی میں جھوم اٹھیں "شیر ختم ہو گیا" سب نے
شور کر کر کے خوب گایا بجایا "خدا کا شکر ہے کہ اب ہماری
جان نہیں جائے گی۔"

بادشاہ نے بھی خوشیاں منائیں۔ اب سب
کو اطمینان ہو گیا کہ تازہ پانی میٹھے چشموں سے بہہ
بہہ کر آتا رہے گا اور پانی کی کوئی کمی نہیں پڑے گی۔
"کس بہادر نے یہ جواں مردی کا کام کیا ہے؟"
الکبیر نے سب سے پوچھا "اسے چاہیے کہ وہ سامنے
آجائے تاکہ ہم اسکو انعام واکرام دیں۔" اس
قصبے کے کئی جوان شکاریوں نے سوچا کہ اپنی شہرت
جمانے کا اچھا موقع ہے۔ وہ بھی بھیڑ کے ساتھ چل
پڑے۔ مرے ہوئے شیر کے پاس پہنچ کر الکبیر نے
آواز دی "دیکھو سامنے شکاری کا بلم ہے۔ اس کی
حفاظت کے لیے اس کا کتا موجود ہے۔ شکاری کا
ایک سینڈل بھی شیر کے سر پر ہے۔ یہ سب چیزیں
جس کی ہیں اسے چاہیئے کہ سامنے آجائے۔"

یکے بعد دیگرے کئی شکاری آئے۔ لیکن
ہر ایک کو دیکھ کر کتا غراتا تھا۔ چند جو بہادر تھے
اور کتے سے ڈرے نہیں وہ جب آگے بڑھے اور
انھوں نے بلم کو نکالنے کی کوشش کی تو وہ چیں
بول گئے۔ بلم درخت کے مانند مضبوطی سے گڑا
تھا گویا کہ زمین میں اس کی جڑیں پیوست ہوں۔
شیر کے سر پر جو سینڈل تھا وہ بھی کسی کے پیر
میں فٹ نہیں ہوا۔

"بوما نے شیر کو مارا ہے۔" بگانے چیخ
کر کہا۔ اور یہ جوان ہیرو آگے بڑھا۔ اسے دیکھ
کر کتے نے دم ہلا دی۔ چھوتے ہی بلم زمین سے
نکل آیا۔ سینڈل بھی اس کے پیر میں فٹ ہو گیا۔
سب نے دیکھا کہ دوسرا سینڈل پہلے ہی سے اس
کے دوسرے پیر میں موجود ہے۔ الکبیر نے تعریف
کے پل باندھ دیئے "بوما واقعی بہادر ہے
اس نے ہمیں شیر سے نجات دلا دی۔ بوما کا

ہم تمھیں کیا انعام دیں؟"

"اے بادشاہ! مجھے ایک چیز کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے اور وہ یہ کہ قولی سے مجھ کو سنہرا اسٹول واپس لینا ہے۔"

لیکن الکبیر قولی کا نام سنتے ہی دہل جاتا تھا اور اس کی طاقت دیکھ کر اس کے خلاف جنگ کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔

"ایک کام اور ہے اسے پورا کر دو۔" اس نے بومبا کو جواب دیا۔ "یہاں سے شمال میں ایک دوسری سلطنت ہے۔ وہاں کے مویشی سفید ہیں۔ اور ہمیں بہت پسند ہیں۔ ایسے مویشی اور کہیں نہیں ملتے۔ تم وہاں جاکر کچھ سفید مویشی ہمارے لیے لادو۔ پھر ہم سونے کا اسٹول واپس دلانے میں تمھاری مدد کریں گے۔"

بومبا ایسا تو تھا نہیں کہ رات میں جا کر چپکے سے چوری کر لائے۔ وہ تو لڑنا جانتا تھا۔ اس زمانے کی رسم کے مطابق وہ اس بات کے لیے تیار تھا کہ الکبیر کے سپاہیوں کی رہنمائی کرے اور جنگ جیت کر وہ سفید مویشی لادے۔

جنگ ٹھن گئی۔ بومبا شیر کی طرح لڑا اور جنگلی جانور کی طرح بادشاہ پر جھپٹ پڑا۔ فتح اس کے سر رہی۔

بومبا جتنا بہادر تھا۔ اتنا ہی شریف بھی تھا۔ جنگ جیتنے کی وجہ سے سارے سفید مویشی اس کے تھے۔ لیکن اس نے ان میں سے صرف آدھے لیے۔ اس نے الکبیر کے سپاہیوں کو لوٹ مار کرنے اور غلام بنانے سے بھی روک دیا۔

سپاہی برہم ہوگئے۔ وہ خالی ہاتھ گھر نہیں لوٹنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کھلے بندوں یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہمارا سردار دغاباز ہے۔ انھوں نے الکبیر سے شکایت کی کہ نصف مویشی پر اس نے ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ بومبا کو موت کی سزا دی جائے۔

الکبیر نے قولی کے خلاف جنگ کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اسے ٹالنے کا یہ اچھا بہانہ تھا۔

اصرار پہ اصرار اور مطالبہ پہ مطالبہ کیے جانے پر وہ اس بات کو مان گیا کہ بہادر جوان کو ریگستان میں مرنے کے لیے جلا وطن کر دیا جائے۔

لیکن لڑکیاں اور الکبیر کے قصبے کی نئی بیویاں نہیں مانیں۔

"بومبا نے ہم کو شیر سے بچایا ہے۔ اسے ہم مرنے نہیں دیں گے۔ ہم اپنے گھروں کی پروا نہیں کریں گے۔ نہ ہم بچے پیدا ہونے دیں گے۔"

شاہی چراگاہوں سے گھوڑے پکڑ پکڑ کر وہ بھی گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ گئیں۔ ہوا کی تیزی سے وہ بومبا اور اس کے محافظ دستے کے قریب ٹپ ٹپ کرتی پہنچ گئیں۔

"بغیر نئی بیویوں کے ہم لوگ کیسے رہیں گے

الکبیر نے کہا: "بومبا لوٹ آنا چاہیئے۔"

پھر اس نے اس کے پاس یہ کہلوا کر بھیجا۔

"بومبا! میں نے غلطی کی۔ واپس آجاؤ۔ میں تم کو اپنی فوج دوں گا تاکہ تم اپنا سنہرا اسٹول حاصل کرو۔"

بومبا نے پھر چڑھائی کر دی۔ الکبیر کے سپاہیوں کے بلم سورج کی روشنی میں چمکنے لگے۔ عورتوں نے گا گا کر اور دعائیں دے دے کر ان کو رخصت کیا سب کے حوصلے بلند تھے۔ بیویوں اور لڑکیوں نے بومبا کے بارے میں سپاہیوں کے ذہنوں کو بدل دیا۔

فوج لے کر جب بومبا اپنے وطن پہنچا تو ایک طرف اس نے فوج کو کھڑا کر دیا۔ خود کتے کی شکل بنا کر وہ قولی کے قلعہ میں گھس گیا۔

"یہ کیسا کتا ہے؟" قولی نے اس کتے کو دیکھتے ہی کہا۔ "دیکھنے سے یہ بومبا کا کتا معلوم ہوتا ہے لیکن وہ بھلا کہاں ہوگا۔ وہ تو اپنے مالک کے ساتھ کبھی کا مر چکا ہوگا۔ جبھی تو وہ کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔"

"کیا تم کتے ہو؟ یا یہ کہ ایک جوُجوُ ہو؟" قولی نے اس سے اس طرح پوچھا گویا کہ کتا سوال کا جواب دے گا۔

افریقہ کے دوسرے ملکوں کی طرح اس ملک میں بھی جوُجوُ کے جادو سے سبھی ڈرتے تھے۔

کتا فوراً غائب ہوگیا۔ اس کی جگہ بومبا موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی خوف کے مارے اس کا حلیہ بگڑ گیا۔

"بومبا! کیا تم ہو؟" اس نے چیختے ہوئے کہا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ جب تم یہاں سے بھاگ گئے تھے تو ریگستان میں بھٹکتے ہوئے کہیں مر گئے ہوگے۔"

"چچا جان! یہ میں ہی ہوں۔ اور دیکھ لیجیے میں زندہ ہوں۔" اس کے چہرے کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ وہ وہاں کھڑا رہا تاکہ قولی اسے اچھی طرح دیکھ لے۔ اور سنہرے جادو کو بھی سمجھ جائے جو کہ آسمانی خدا نے بقری کو دیا تھا۔ اب بھی بھلا اس میں کوئی شک تھا کہ سنہرے اسٹول کا وہ سچا حق دار نہیں تھا۔

"الکبیر کی بھاری فوج لے کر میں آیا ہوں۔ وہ شہر کے باہر تیار کھڑی ہے۔" اس نے کہا۔ "آج رات میں اپنے آباؤاجداد کا سنہرا اسٹول تم سے چھین لوں گا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ آج رات کو تمہیں مرنا ہے اور میں تمھیں کسی طرح چھوڑوں گا نہیں۔"

جنگ چھڑ گئی۔ قولی کی فوج نے مقابلہ کیا لیکن سچ یہ ہے کہ وہ بہت بہادری سے نہیں لڑی۔ شاید سپاہی پوشیدہ طور سے بومبا کے استقبال کے لیے دل ہی دل میں خوش تھے۔ چنانچہ آخر میں فتح بومبا کی رہی۔ ملک کے کونے کونے میں خوشی کے نعرے گونج اٹھے۔

بومبا نے تخت چھین لیا۔ وہ واپس آگیا

باقی ص۳۶ پر

[1] روشنی اور نور سے بھرا ہوا۔ [2] صد، سَو۔ صدق سچائی۔ صفا پاک صاف [3] دل کا گھر [4] من و تو میں اور تو کا فرق

جناب خواجہ معین الدین ام۔ اے۔ بی ایڈ

بچوں کی راست بازی

فتح علی میسور کے سلطان تھے، ٹیپو سلطان کے نام سے مشہور تھے۔ وہ بڑے ہی نڈر اور بلا کے بہادر تھے۔ انگریز اُن کے نام سے چونک جاتے تھے۔ ان کے دو کم سن شہزادے تھے۔ ایک کا نام خلیق اور دوسرے کا مجاہد تھا۔ خلیق کی عمر دس سال کی تھی، مجاہد آٹھ سال کا تھا۔ سلطان ان دونوں کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے۔

ٹیپو سلطان کو ایک بار انگریزوں سے لڑتے لڑتے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں نے اوّل تو مرہٹوں سے ساز باز کیا اور کہا کہ دکن میں ٹیپو کی بڑھتی ہوئی قوت ہم دونوں کے لیے خطرے سے خالی نہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم الگ الگ ہو کر سلطان کا مقابلہ کریں تو ہم میں سے کوئی بھی تنہا میدان میں اس کے مقابل کھڑا رہنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم دونوں مل کر ٹیپو کا مقابلہ کریں۔ مرہٹوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ انگریزوں نے سلطان کے کئی پہاڑی قلعے ان سے چھین لیے۔ اس سے سلطان مجبور ہو کر سرنگا پٹنم پہنچے تاکہ وہاں کچھ تازہ دم فوج جمع کریں اور پھر انگریزوں سے لڑکر اپنے قلعے واپس لے لیں۔ لیکن ان کی تمام کوششیں بے کار ہوئیں، تب سلطان نے انگریزوں کے پاس امن کا پیام بھیجا — انگریزوں نے دیکھا کہ سلطان اب دب کر ہمارے سامنے آرہے ہیں اس لیے اس موقع کو غنیمت جان کر انھوں نے صلح کی شرطیں سخت کردیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ سلطان اپنی آدھی سلطنت انگریزوں کے حوالے کردیں۔ دوسری شرط تھی کہ سلطان اس جنگ کا پورا خرچ اپنے خزانے سے ادا کریں، تیسری شرط یہ تھی کہ سلطان پھر کبھی انگریزوں سے جنگ نہ کرنے کا وعدہ کریں اور اس کی ضمانت میں اپنے دونوں شہزادوں کو انگریزوں کی نگرانی میں دے دیں۔ سلطان نے سب شرطیں منظور کرلیں کیونکہ اس کے سوا ان کے پاس اور کوئی صورت نہ تھی۔

آخری شرط بہت کڑی تھی۔ سلطان نے سوچا۔ اگر شہزادوں کی جگہ کوئی اور دو بچوں کو انگریزوں کے حوالے کردیں تو شہزادوں کی جان کو کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ اور اگر طاقت جمع ہوجائے تو وہ انگریزوں سے دوبارہ جنگ بھی کرسکیں گے۔ اس لیے انھوں نے شہزادوں

فرخ، موٹو میاں، کنیت اور لمبو خاں آگے چل پڑے۔

ابھی وہ کچھ ہی دور گئے تھے کہ انھیں چلچلاتی دھوپ میں ایک آدمی بیٹھا ملا۔ ان کا مارے گرمی کے بُرا حال تھا۔ پسینہ چوٹی سے ایڑی تک بہہ رہا تھا اور وہ آدمی ایسے بیٹھا تھا جیسے بہت سخت سردی میں لوگ دھوپ کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں۔ ویسے بھی وہ سردی کی وجہ سے تھر تھرا رہا تھا۔ اس کے دانت سے دانت بج رہے تھے اور بات کرنا بھی مشکل تھی۔ سردی کے مارے اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ فرخ حیران رہ گیا۔

فرخ :۔ کیوں بھائی، تمھیں کیا تکلیف ہے؟ سورج اتنی تیزی سے چمک رہا ہے، ہمارا گرمی کے مارے بُرا حال ہے اور تم سردی سے تھر تھرا رہے ہو۔

آدمی :۔ بس یہی تو میری مصیبت ہے۔ جتنا سورج گرم ہوتا جاتا ہے۔ میری سردی بڑھتی جاتی ہے۔ بس مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ ایک برف کا بڑا سا گولا ہے جو ہر صبح کو نکل آتا ہے۔ اور جوں جوں اوپر چڑھتا ہے میرے جسم میں پھریری سی آتی رہتی ہے۔ دوپہر کو سردی سے میری ہڈیوں کا گودا تک جمنے لگتا ہے۔ پھر جب عام لوگوں کو سردی لگنی شروع ہوتی ہے تو میرے جسم میں گرمی آنی شروع ہوتی ہے۔ جب برف پڑتی ہے میں گرمی سے بھننے لگتا ہوں۔ جسے لوگ برفیلی ہوائیں کہتے ہیں وہ مجھے لو کے تھپیڑے لگتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ میں برف کی آگ سے بھی گھراتا ہوں اور آگ کی ٹھنڈ سے بھی پریشان رہتا ہوں۔ میری جان عذاب میں ہے۔

فرخ :۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ تمھارا نام کیا ہے؟

آدمی :۔ مجھے بے وقت خاں کہہ سکتے ہیں۔

فرخ :۔ اچھا۔ ہاں تو بے وقت خاں اگر تم کوئی اور کام نہیں کرتے تو چلو میرے ساتھ میں تمھیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔

اب پانچوں کے پانچوں آگے بڑھ گئے۔ کچھ دور جا کر جو چیز انھیں نظر آئی وہ بھی ایک آدمی تھا۔ جو ایک کنوئیں کے کنارے پر بیٹھا اندر جھانک رہا تھا، جیسے وہ وہیں سے بیٹھا کنوئیں کے اندر کی

کوئی چیز اپنی آنکھوں سے ہی ڈھونڈ رہا ہو۔

فرّخ:۔ کیوں بھائی تم اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟

آدمی:۔ میں کنوئیں کے نیچے پڑی ہوئی چیزیں دیکھ رہا ہوں۔ میری آنکھیں اتنی تیز ہیں کہ میں ہر چیز دیکھ سکتا ہوں گھنے جنگلوں کے پار کی چیز مجھے نظر آجاتی ہے۔ پہاڑوں کے پیچھے چھپے ہوئے منظر مجھے نظر آجاتے ہیں۔ اونچے سے اونچے پہاڑ پر اور گہری سے گہری کھائی میں چھپی چیز میری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ بس صحیح بات یہ کہ دنیا کی کوئی چیز میری آنکھوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔

فرّخ:۔ تمھارا نام کیا ہے؟

آدمی:۔ مجھے سوآنکھا کہتے ہیں۔

فرّخ:۔ اچھا تو پہلے ہم تمھارا امتحان لیں گے۔

آدمی:۔ ضرور۔

فرّخ:۔ اچھا تو بتاؤ، تم نے اس کنوئیں میں کیا دیکھا؟

سوآنکھا:۔ یہ کنواں بہت گہرا ہے۔ کم سے کم دو سو ہاتھ نیچے اس میں پانی شروع ہوتا ہے۔ پھر کوئی تین سو ہاتھ گہرا پانی ہے جو بالکل کالا ہے۔ پانی کے نیچے کوئی پچاس ہاتھ گہری کیچڑ اور کائی کی تہہ ہے۔ اس کے بعد پتھر کا فرش ہے۔ ہاں اس فرش پر ایک لوہے کا بالکل کالا بکس پڑا ہے۔ اس بکس پر ایک ایک انچ کے قریب زنگ چڑھا ہوا ہے۔

فرّخ:۔ کیا تم یہ بھی دیکھ کر بتا سکتے ہو کہ اس بکس میں کیا ہے؟

سوآنکھا:۔ یہ بکس، ہیرے اور زیوروں سے بھرا ہے۔

فرّخ نے لمبو خاں سے کہا کہ وہ اس بکس کو نکال لیں۔ پہلے لمبو خاں کنوئیں میں اتر گئے جب ان کے پیر پتھر کے فرش پر لگ گئے تو ان کے گھٹنے کنوئیں سے باہر ہی تھے۔ وہ کھڑے تو ہو گئے مگر جھک کر تہہ تک ہاتھ پہنچانے میں ان کی اتنی لمبائی ہی آڑے آئی۔ پیچھے کھلوں نے

تحریر آصفہ مجیب

(۲)

گوشت اور ترکاریاں بہت مہنگی ہیں۔ کوئی ترکاری ایک کلو پانچ لیرا سے شاید کم نہیں۔ گوشت ایک کلو سولہ لیرا کا۔ ایسی ہی مرغی گراں ملتی ہے لیکن گوشت مرغی کچھ لیجیے صاف ستھری بنی پیک کی ہوئی مل جاتی ہے۔ دم بھر میں تیار نہ بنانے صاف کرنے کا جھگڑا نہ بکھیڑا۔ سوزانہ نے بڑے مزے کا نفیس کھانا پکا کر کھلایا۔ انگریزی ہندوستانی سب ہی قسم کا کھانا پکانا جانتی ہے۔ اور اپنی ملنے والیوں سے نئی چیزوں کی ترکیبیں پوچھ کر بڑی جلدی سیکھ لیتی ہے۔ دن بھر سارا کام بڑی پھرتی سے کرتی ہے۔ کسی وقت میں تھوڑی مدد کرتی تھی تو وہ منع کرتی "نہیں امی جان آپ نہ کیجیے میں کروں گی۔"

میں کہتی "میرا جی نہیں مانتا۔" سوزانہ مسکراتی۔ اس جواب پر ایک دن اس نے کہا "اردو کا یہ جملہ بہت پسند ہے "جی نہیں مانتا۔"

یہاں گھریلو کاموں کے لیے ملازم نہیں ملتے۔ طور سے ہفتہ میں ایک دو بار کوئی ملازمہ کچھ دیر کے آکر گھر کی صفائی وغیرہ کر جاتی ہے اور اپنی اجرت لے کر چلی جاتی ہے۔ ویسے گرد و غبار نہیں ہوتا۔ بغیر جھاڑے سب صاف پڑا رہتا ہے۔ نہ کہیں مکھی مچھر نظر آئے۔

ایک دن میوزیم دیکھنے گئے۔ اس کی عمارت بلندی پر ہے۔ سنگ مرمر کی بہت سیڑھیاں ہیں۔ جن کے دونوں طرف شیر بنے ہیں۔ بہت شان سے بیٹھے ہیں۔ سامنے اتاترک مصطفےٰ کمال کا سیاہ پتھر کا مجسمہ گھوڑے پر سوار نصب ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ان کا مقبرہ نظر آتا ہے۔ میوزیم کے ہال میں جا کر تو نظر حیران تھی کہ کیا کیا دیکھیں۔ ایسے ایسے نقش و نگار کے قالین کہ آدمی دیکھتا رہ جائے۔ ترکی خواتین کے پرانے زمانہ کے جھم جھم کرتے لباس ان کے مجسمے بنا کر پہنائے تھے جو شیشے کی الماریوں میں کھڑے تھے۔ سونے چاندی کے زیور۔ سادے اور جڑاؤ شیشے کے کیس میں سجے تھے۔ لکڑی کی کھڑاویں۔ شالیں جلد دار۔ تانبے کی بڑی بڑی نقشیں سینیاں، رکابیاں، پیالے، شمع دان، سلفچی۔ لکڑی کا نفیس کام کا سامان الگ۔ صندوق، تخت، دروازے، دوسری طرف نظر اٹھائی تو شیشے کے کیس میں بہت

شش خط لکھی ہوئی قلمی کتابیں قرآن شریف۔ سونے سے
مرصع۔ ایک جگہ عالموں اور فقیروں کے لباس۔ عمامے۔
ٹوپیاں وضع وضع کی، کئی کمروں میں چکر لگا کر دیکھا ہر چیز
سے ترکی کی پرانی تہذیب فن۔ اور رہن سہن کا پتہ چلتا تھا۔
دیکھتے دیکھتے ہم تھک گئے اور شوق پورا نہ ہوا۔ کونیا جانے
کا پروگرام بنا۔ یہاں ایک بڑے بزرگ مولانا جلال الدین
رومی کا مزار ہے۔ آپ میں سے بہت سے ان کے
بارے میں جانتے ہوں گے کبھی ان کی مشہور مثنوی سنی
ہوگی۔ یہ ایک خاص لَے سے پڑھی جاتی ہے۔ تو کلام
کی تاثیر اور بڑھ کر بہت سی اچھی اور سچی باتوں کے دھیان
میں جو اشاروں اور مثالوں سے بتائی گئی ہیں آدمی کو
جیسے اس میں ڈبو دیتی ہے۔

امین کے دوست کبیر صاحب نے بڑی عنایت
کی ہم لوگوں کو اپنی موٹر پر لے گئے۔ ان کی بیگم صاحبہ
اور بیٹے بھی ساتھ تھے۔ لمبا سفر تھا اسی دن واپس
آنا تھا۔ اس لیے بچوں کو نہیں لیا کہ پریشان ہوں گے۔
ان کی وجہ سے ان کی ماں بھی رہ گئیں۔

کونیا شہر انقرہ سے ڈھائی سو کلو میٹر کے فاصلہ
پر ہے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا ساتھ لے لیا اور صبح نو
بجے گھر سے چلے۔ راستہ میں موٹر کے پہیوں میں ہوا
بھروائی اور سب جانچ کرائی کہ ٹھیک ہے۔ خوش
قسمتی سے موسم خوش گوار تھا۔ بادل چھائے تھے۔ کبھی
ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگتی پکی سڑک پہاڑیوں پر بل کھاتی
اور کہیں میلوں تک سیدھی چلی گئی ہے۔ راستہ میں
گل پاشی ایک بڑی جھیل پڑی۔ اس سے سینچائی کا کام
لیا جاتا ہے۔ یہ علاقہ بہت زرخیز ہے۔ گیہوں کے
کھیت لہلہا رہے تھے۔ کئی گاؤں پڑے۔ ہر گاؤں
میں بچوں کے اسکول ہیں۔ پچھلے دس برس میں حکومت
نے بائیس ہزار اسکول کھولے۔ اور ستائیس اٹھائیس ہزار
مسجدیں لوگوں نے چندہ کر کے بنوائیں۔

دو جگہ موٹر روک کر ہم نے تھرماس سے
گلاسوں میں چائے لے کر پی۔ چائے نے بڑا مزا دیا
اور بنی بھی اچھی تھی۔ ایک بجے کونیا پہنچ گئے۔
وہاں کوئی مناسب جگہ کھانا کھانے کی تلاش کرنے
لگے۔ ایک پارک میں جس کا تھوڑا حصہ پھول پتیوں سے
ڈھکا تھا۔ میز کرسیاں لگی تھیں وہاں اترے۔ معلوم
ہوتا ہے یہ مسافروں ہی کے لیے بنایا گیا ہے۔ اور
لوگ بھی تھے۔ وہاں کھانا کھا کر مزار پر گئے۔

پہلے ایک صحن ہے۔ ایک طرف جوتے ایک
آدمی کو سپرد کر کے ہال میں داخل ہوئے یہ بہت بڑا
ہے۔ سیدھی طرف مزار بنے ہیں۔ پہلا مزار حسام الدین
چلپی کا ہے۔ انھوں نے مولانا کی مثنوی لکھی تھی۔ اس
طرح کہ وہ بولتے جاتے تھے اور یہ لکھتے جاتے تھے۔
اس کی ایک تصویر بھی لگی ہے۔ دونوں آمنے سامنے
بیٹھے ہیں۔ مولانا کا ایک ہاتھ زرا سا اٹھا ہے۔ ان
پر ایک کیفیت طاری معلوم ہوتی ہے حسام الدین
چلپی بڑی محویت سے سر جھکائے قلم ہاتھ میں لیے
لکھ رہے ہیں۔ ان کے بعد مولانا روم کا مزار ہے۔

اونچا بنا ہے۔ اس پر بہت قیمتی کامدار قبر پوش پڑا ہے۔
آخر میں ان کے بیٹے کا ہے۔ فاتحہ پڑھ کر آگے
بڑھے۔ ہال کے دائیں طرف ایک اور راستہ جاتا ہے۔
اس کے تین طرف کمرے بنے ہیں۔ جہاں اس زمانہ کا
پورا نقشہ دکھایا ہے۔ ایک کمرے میں بڑے بڑے بزرگ
بیٹھے تھے۔ ایک میں گانے والے، ہال کے بیچ میں
رقص ہوتا تھا۔ پوری محفل کا نقشہ ایک تصویر میں بھی
کھینچا ہے جو سامنے دیوار میں لگی ہے۔ اوپر کا حصہ خواتین
کے لیے بنا ہے۔ ہال کے باہر بھی کئی کمرے ہیں جن میں
پلنگ چوکی جائے نماز وغیرہ بچھا کر مولانا کے رہنے سہنے
کا طریقہ اور مشاغل بتائے ہیں۔ اور بہت لوگ
زیارت کرنے آئے تھے۔ کچھ خواتین کوٹ اور برقع
پہنے تھیں۔ حالانکہ دوپہر کا وقت تھا اور گرمی تھی۔
یہاں ہر سال عرس ہوتا ہے۔ زائرین کی تعداد ہر سال
بڑھتی جاتی ہے۔ ایک نقشہ لگا ہے جس میں اس کا
حساب معلوم ہوتا ہے۔ پچھلے سال ۱۹۹۶ء میں چار
کھ پچیس ہزار آدمی زیارت کرنے آئے۔ دور دور کے
ی تھے۔ پھر ایک مسجد دیکھی جو مزار کے قریب بنی ہے۔
ہ ترکی کے بادشاہ سلطان سلیم ثانی کی بنوائی ہوئی
ہے۔ گنبد بہت بڑا ہے مگر باہر سے اتنا اونچا نہیں
ہے جیسے ہندوستان میں ہمایوں کے مقبرے میں ہے۔
س میں صحن نہیں ہے۔ یہاں ظہر کی نماز پڑھی۔
اتین کے لیے الگ ایک حصہ ہے۔ میں نے دیکھا دو
تین میرے بعد پہنچیں اور انھوں نے وہیں نماز پڑھی۔

ایک اور پرانی مسجد ہے۔ جو ترکی کے بادشاہ علاء الدین
خلجی نے بنوائی تھی۔ مگر اندر سے ہم اسے نہیں دیکھ
پائے۔ علاؤالدین بادشاہ کے محل کے ٹوٹے پھوٹے
آثار رہ گئے ہیں۔

اب ہمیں جانے کی جلدی تھی۔ اس لیے کہ شام
ہی شام انقرہ پہنچنا چاہتے تھے۔ واپسی میں امین نے
موٹر چلائی۔ تھوڑی دیر کبیر صاحب کے صاحبزادے
نے۔ ہم اچھے وقت انقرہ پہنچ گئے، جھٹ پٹا ہو رہا تھا۔

ترکی کے کافی لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع
ملا۔ مجیب صاحب کے انقرہ آنے کی ایک سے دوسرے
کو خبر ہوئی اور ملاقاتوں دعوت پارٹیوں کا سلسلہ
بڑھ رہا تھا۔ ہندوستانی سفیر کے یہاں لنچ اور ریسپشن
میں گئے۔ وہاں ہندوستانی بھی ملے۔ ہندوستانی
فرسٹ سیکرٹری کے یہاں ایک روز ڈنر پر گئے۔ یہاں
بعض ترکی کے ان لوگوں سے ملے جو ہندوستان
آچکے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ انھوں نے
کشمیر کی بھی سیر کی۔ جتنے ترکی کے لوگ ہمیں ملے
ان میں اتنا خلوص اور اپنائیت ہے کہ مل کر بڑی
خوشی ہوتی ہے۔ اور پھر ملنے کو جی چاہتا ہے۔

پروفیسر بلکان صاحب جو ترکی یونیورسٹی
میں آرٹس کے شعبہ کے پروفیسر ہیں۔ اور ان کی
بیوی دونوں بہت اچھے اخلاق کے ہیں۔ انقرہ سے
جانے سے ایک دن پہلے ایک جگہ دعوت میں مسز
بلکان نے ہمیں دوسرے دن اپنے یہاں چائے پر

...یا۔ اُس روز میری طبیعت ذرا خراب تھی۔ مگر میرا ان سے ملنے کو اتنا جی چاہتا تھا کہ ان کے گھر پہنچ گئی۔ دومنزلہ مکان تھا بہت سی سیڑھیاں چڑھنا پڑیں۔ وہاں آج پروفیسروں کا جمگھٹا تھا خواتین بھی تھیں۔ چائے کے بعد سب پروفیسر ایک طرف مل بیٹھے۔ ان میں پروفیسر چغتائی بھی تھے جو دینیات کے شعبے کے پروفیسر ہیں۔ سب لوگ اس طرح گھل مل گئے جیسے ایک خاندان کے ہوں۔ جب ہم جانے لگے تو مسز بلکان نے کہا کہ ترکی میں جب کوئی لمبے سفر پر جا رہا ہو۔ رخصت کے وقت ایک رسم ادا کی جاتی ہے۔ سواری کے پیچھے پانی بہاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سفر پانی کی طرح آسانی سے روانی سے طے ہو اور جانے والا پھر خیریت سے واپس آئے۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی اس بات سے اور ہم شوق سے دیکھنے لگے کہ کیسے کرتی ہیں۔ وہ ایک جگ میں پانی لائیں۔ جب ہم سب سے خدا حافظ کہہ کر موٹر میں بیٹھ گئے۔ وہ سڑک پر پانی لیے کھڑی تھیں۔ جوں ہی موٹر چلی انھوں نے اس جگہ پر پیچھے کی طرف پانی بہا دیا۔ ہم سر گھما کر دیکھ رہے تھے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح پروفیسر چغتائی یونی ورسٹی دکھانے کے لیے مجیب صاحب کو لینے آئے وہاں لائبریری کی نئی عمارت بن رہی ہے اور اس کے ساتھ مسجد بھی۔

یہاں مسجدوں میں ایک یا دو اونچے اونچے مینار ہوتے ہیں۔ پانچوں وقت موذن مینار پر چڑھ کر اذان دیتے ہیں۔ اذان دینے کا انداز اور آواز اتنی سہانی اور خوش گوار ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے سُنیں ہی جائیں۔ اسی طرح مدینہ شریف میں سنی تھی۔

میلاد شریف اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ دسویں پندرھویں کسی نہ کسی گھر میں میلاد ہوتا ہے۔ اس کے بعد زوردار چائے کی پارٹی۔

۲۸ جون کو ہم بہت سی خوشگوار یادیں اور مسرتیں لیے ہوئے انقرہ سے روانہ ہوئے۔ جہاز لیٹ تھا دیر تک سب ایروڈروم پر بیٹھے رہے۔ دونوں بچوں نے خوب ادھم مچایا۔ کبھی اِدھر بھاگیں کبھی اُدھر۔ اتنی بڑی جگہ۔ ان پر نگاہ رکھنا مشکل تھا اور بچے بھی شامل تھے۔ امین نے کہا کھیلنے دیجیے یہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔ اتنے میں بٹیا نے پاس آکر پوچھا "بھیا کہاں ہے" سب گھبرا کے کھڑے ہو گئے۔ بھیا غائب تھا۔ ماں پریشان پھر رہی تھی۔ امین اِدھر اُدھر بھاگے۔ دیکھا تو حضرت وہیں کہیں ذرا دور پہ ایک امریکن لڑکے کے ساتھ جھولے والی کرسی پر بیٹھے مزے میں جھولا جھول رہے ہیں۔ امین پکڑ لائے تب جان میں جان آئی۔ چلتے وقت سب کو چھوڑتے بڑا دکھ ہوا امین کی بچی بہت روئی کہتی تھی میں بھی چلوں گی۔ جی چاہتا تھا اسے چپکے سے گود میں دبا کر جہاز پر بیٹھ جاؤں۔ مگر چار و ناچار چھوڑ کر چلے آئے۔ جہاز کی کھڑکی سے میں ان کو تک رہی تھی۔ دونوں بچے بڑے زوروں میں ہاتھ ہلا رہے تھے بلکہ ساری
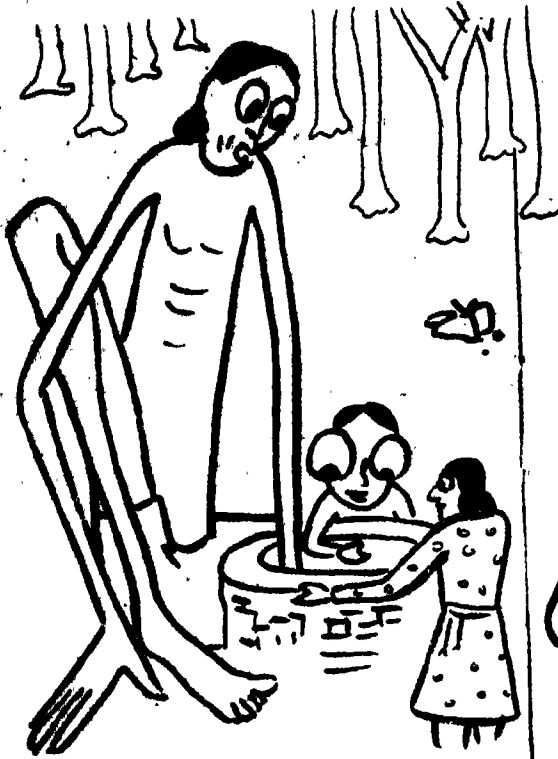
میاں کا بتایا ہوا بکس وہاں موجود ہے۔ پھر وہ کنوئیں
سے باہر نکل آئے اور باہر بیٹھ کر انھوں نے کنوئیں
میں ہاتھ ڈال دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ کیچڑ اور سنگ
سے بھرا ہوا بکس نکال لائے۔ بکس کھولا گیا تو پچ

پھر وہ تو ایسے چمک دار ہیرے جواہرات اور سونے کے زیوروں سے بھرا ہوا تھا جنھیں دیکھ کر آنکھیں چندھیا جائیں۔

شہزادہ فرخ نے یہ سوچ کر وہ بکس وہیں کہیں دبا دیا کہ جب واپس ہوگا تو اسے وہاں سے نکال لے گا۔ فرخ نے سوا آنکھا میاں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا اور وہ سب کے سب چل پڑے۔

اب انھیں راستہ میں کوئی اور نہیں ملا۔ آخر انھیں اس خوبصورت شہزادی کے شہر کی دیواریں اور محل کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ شہزادہ فرخ آج بہت ہی خوش تھا۔ جیسے ہی وہ شہر میں داخل ہوا ہے۔ وہ سیدھا ملکہ کے محل کی طرف چلا گیا اور فوراً اس نے ملکہ سے کہا۔

جناب نثار نگری

(بڑے پیامیوں کے لیے)

بچپن کے دوست

لب پر تمہارے آتے ہیں جب نام دوستو
بچپن کے یاد آتے ہیں ایام دوستو

پنچھی کی طرح اُڑتے تھے آزاد ہو کے ہم
کھاتے تھے کھیلتے تھے بہم شاد ہو کے ہم
کچھ رنج و غم سے ہم کو نہ تھا کام دوستو

واقف نہ تھے جہاں کے نشیب و فراز سے
ہم کتنے بے نیاز تھے ہستی کے ساز سے
آغاز جانتے تھے نہ انجام دوستو

کیا خوب تھی ہماری وہ ننھی سی کائنات
ہر روز، روزِ عید تھا ہر شب شبِ برات
باقی ہے اب وہ صبح نہ وہ شام دوستو

مسلک ہمارا پیار تھا ہم سب تھے ایک دل
مذہب سے بے خبر تھے مگر پھر بھی نیک دل
اب دل میں بس کے رہ گئے اوہام دوستو

بچپن نہیں رہا وہ فسانے نہیں رہے
وہ دن نہیں رہے وہ زمانے نہیں رہے
ملتا نہیں ہے دل کو اب آرام دوستو

بچپن کے وہ بکھر گئے جب سے حسین خواب
آلام زندگی کو ملے، دل کو اضطراب
اک تازہ واردات ہے ہر گام دوستو

تھا وقت کا تقاضا کہ ہم تم بچھڑ گئے
وہ پیار وہ خلوص کے نقشے بگڑ گئے
اس میں نہیں کسی پہ بھی الزام دوستو

کہتا ہے دل ملیں گے پھر ایک بار ہم تمام
مٹ جائیں گے دلوں سے جدائی کے غم تمام
آئے گا پھر بہار کا ہنگام دوستو

زہرہ

جناب غلام ربانی حیدرآباد

یہ سیارہ روشنی کا ڈلا سا معلوم ہوتا ہے۔
مگر جب اسے دوربین سے دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک چھوٹا سا چاند ہے اور ہمارے چاند کی طرح شکلیں بدل بدل کر دکھاتا ہے۔ کبھی ہلال کی ایک پھانک سی نظر آتی ہے۔ پھر بڑھتے بڑھتے آٹھویں چاند کی طرح نصف دائرہ روشن ہوجاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد چودھویں کے چاند کی طرح پوری ٹکیا دکھائی دیتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ گھٹنے لگتا ہے۔ گھٹتے گھٹتے اتنا باریک ہوجاتا ہے کہ دکھائی نہیں دیتا۔ چاند یہ ساری شکلیں ایک مہینے میں بدلتا ہے، زہرہ انیس[19] مہینے میں (یہ شکلیں) بدلتا ہے۔

جب زہرہ کی روشنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اس وقت چاند کی طرح اس کا چہرہ روشن نہیں ہوتا بلکہ ہلال کی طرح کا ہوتا ہے، بات یہ ہے کہ اس وقت وہ زمین کے بہت قریب ہوتا ہے، اس وقت اس کی روشنی آسمان کے ہر ستارے سے بیس گنی سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے۔ یہ سیارہ دن میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

زہرہ ہماری زمین کی نسبت سورج سے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے وہ زیادہ شعاعیں حاصل کرتا ہے۔ حساب سے معلوم ہوا کہ زمین کے مقابلے میں ۱٫۱۹ گنا زیادہ روشنی اور حرارت حاصل کرتا ہے۔ یہاں کا درجۂ حرارت کھولتے ہوئے پانی سے کچھ زیادہ ہے۔

چاند کی طرح ابھی زہرہ کا جغرافیہ تیار نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ زہرہ کے گرد سیکڑوں میل تک ہوا کا موٹا غلاف ہے۔ دنیا کی طاقتور سے طاقتور دوربین بھی زہرہ کی سطح کا حال نہیں بتاسکتی۔

یہ ایک خشک اور گرم دنیا ہے جس میں طوفانی ہوائیں اس زور سے چلتی رہتی ہیں کہ وہاں کی گرد سے ساری فضا تیرہ[1] و تار ہوجاتی ہے اور وہاں کی سطح دکھائی نہیں دیتی۔

ہماری زمین ۲۴ گھنٹے میں اپنے گرد پھر جاتی ہے۔ اس محوری گردش سے دن رات پیدا ہوتے ہیں۔ زہرہ کی محوری گردش کا حال اب تک معلوم نہیں ہوا۔ دوربینوں کے ذریعہ اب تک اس کے جتنے فوٹو لیے گئے، ان سے معلوم ہوا کہ زہرہ کا ایک ہی رخ ہمیشہ سورج کے سامنے رہتا ہے جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ وہاں آدھے

۱؎ اندھیری

سے ایک طرف ہمیشہ دن رہتا ہے اور دوسری طرف رات رہتی ہے۔

ستاروں کا علم جاننے والوں میں اب کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہو گئے ہیں، جو اس کی محوری گردش کو مانتے ہیں۔ بعض کے خیال میں یہ سیارہ تیس دن میں اپنے گرد پھر جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو زہرہ کا ایک دن ہمارے تیس دن کے برابر ہوتا ہے۔

تم کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ آسمان کے ان سب سیاروں کے وزن بھی معلوم کر لیے گئے ہیں۔ بھلا ان کو تولنے کے لیے اتنی بڑی ترازو اور وزنی باٹ کہاں سے آئے ہوں گے، پھر اس ترازو کو کون اٹھا سکتا ہے، یہ سب باتیں خیالی نہیں ہیں، بلکہ واقعی ہیں۔ تم نے اپنی کتاب میں کشش ثقل کا حال تو پڑھا ہوگا۔ ہماری زمین زہرہ سے کسی قدر بڑی ہے، اس لیے یہاں کشش بھی زیادہ ہے۔ زہرہ چونکہ زمین سے چھوٹا ہے، اس کی کشش بھی کم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہاں پر ہر چیز کسی قدر ہلکی ہوگی۔ حساب سے معلوم ہوا کہ زہرہ کی کشش ہماری زمین کی کشش کا $\frac{9}{10}$ ہے۔ یعنی جس چیز کا وزن یہاں دس من ہے زہرہ پر اس کا وزن نو من ہوگا۔

وہاں ہمارا جسم بھی کچھ ہلکا ہلکا لگے گا۔ وہاں بھاگ دوڑ اور کود پھاند میں بڑی آسانی ہوگی۔ جو لڑکا یہاں پندرہ فٹ لمبا کودتا ہے۔ زہرہ پر وہ سترہ فٹ کی چھلانگ لگائے گا۔ فٹ بال کے کھیل میں مزہ آئے گا۔ جو لڑکا یہاں ۹۰ فٹ لمبی کِک لگاتا ہے۔ وہاں وہ سو فٹ لمبی کِک لگائے گا۔

ہماری زمین کو خدا نے چاند سا ایک خوب صورت بیٹا دیا ہے، ہم اسے چاند ہی کہتے ہیں مریخ سیارہ بھی ہمارا پڑوسی ہے اس کے دو چاند ہیں مشتری کے گرد چار چاند چکتے ہیں۔ زحل کا خاندان بہت بڑا ہے۔ اس کے آٹھ چاند ہیں۔ مگر زہرہ کو ایک چاند بھی نہیں ملا ہے۔ یہ انوکھی دنیا ہے جس میں نہ آسمان ہے نہ چاند تارے۔

نیچے کے دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدت خریداری ختم ہو جاتی ہے۔

○

ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔

براہ کرم مبلغ ۶ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا۔ اور افسوس کے ساتھ اسے بند کر دیں گے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے۔ آپ کا خریداری نمبر ہے [illegible]

جناب مشہود مفتی

پرندوں کی چند انوکھی عادتیں

(۲)

انڈوں سے نکلے ہوئے چڑیا کے بچے دبلے پتلے ہوتے ہیں۔ ان کی چونچ نازک اور کم زور ہوتی ہے۔ پھر یہ انڈے کا سخت چھلکا توڑ کر کس طرح باہر نکلتے ہیں؟ جب بچہ انڈے سے نکلنے والا ہوتا ہے تو بچے کی بدنما چونچ کے اوپری حصے پر ایک سخت اور چھوٹا سا دانت ہوتا ہے جس سے وہ انڈے کو توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ باہر نکلنے کے دو ایک دن کے اندر یہ دانت جھڑ کر گر جاتا ہے۔

بچہ نکلنے کے بعد انڈے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چڑیا خود کھا لیتی ہے اور بڑے ٹکڑوں کو گھونسلے سے دور پھینک دیتی ہے تاکہ دشمن کو بچوں یا گھونسلے کا سراغ نہ مل سکے۔

چڑیوں کی خوراک بھی بہت ہوتی ہے چڑیا دن میں اپنے وزن سے آدھے کے برابر ضرور کھا جاتی ہیں بچوں کے لیے چڑیاں دن بھر دانا لاتی رہتی ہیں۔ ایک بار چڑیوں کے ماہر ڈاکٹر آرتھر نے ایک چھوٹی چڑیا کے پھیرے شمار کیے تھے۔ اپنے بچوں کو بھرانے کے لیے اس ننھی سی چڑیا نے صبح سے شام تک اپنے گھونسلے کے ۲۷۰ پھیرے کیے تھے۔

چڑیا کے گھونسلے میں پہنچتے ہی تمام بچے اپنی گردنیں اٹھا کر اور چونچیں کھول کر چوں چوں کرنے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں چڑیا کے لیے یہ معلوم کرنا کہ کس بچے کا پیٹ بھرا ہے اور کون بھوکا ہے بہت مشکل ہے۔ چڑیا، بچے کے حلق میں خوراک ڈال کر غور سے دیکھتی ہے۔ اگر ٹکڑا اس کے حلق سے فوراً نیچے اتر جاتا ہے تو وہ اس کو اور کھلاتی ہے۔ اگر حلق سے ٹکڑا فوراً نیچے نہیں اترتا تو وہ اس کے حلق میں چونچ ڈال کر ٹکڑا نکال لیتی ہے۔ اور دوسرے بچے کے حلق میں ڈال دیتی ہے۔ قدرت کی طرف سے بچوں کے حلق کا نظام ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اگر بھوک نہ ہو تو ٹکڑا یا خوراک دیر تک حلق میں دکھائی دیتا ہے اور اس بھید سے چڑیا واقف ہوتی ہے۔

ننھی چڑیوں کے بچے ہفتے دو ہفتے میں گھونسلے سے نکلنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ لیکن بڑے پرندوں کے بچے سال کے زیادہ حصے تک گھونسلے ہی میں

ہتے ہیں جیسے عقاب وغیرہ کے بچے۔ بہت سی چڑیاں تو انڈے سے نکلنے کے بعد ہی اڑنے اور اپنی حفاظت آپ کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ یہ چڑیاں ایسے انڈوں سے نکلتی ہیں جن کو چڑیاں سیتی نہیں۔ جیسے میگا پوڈس اور جنوبی پیسفک کی ماؤنٹ بلڈنگ برڈ۔

بچوں کے پر تہوں کی شکل میں ان کے بازو میں چھپے رہتے ہیں جب بچہ ایک چوتھائی بڑھ جاتا ہے تو دھیرے دھیرے اس کے پروں کی تہیں کھلنے لگتی ہیں۔ رام چڑیا اور ککو کے بچوں کے پر اس وقت کھلتے ہیں۔ جب وہ پوری طرح بڑے ہو جاتے ہیں جب تک ان کے پر نہیں کھلتے یہ چڑیاں بالکل گوشت کی بڑی سی بوٹی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے پر کھلنے کا وقت آتا ہے تو چند گھنٹوں کے اندر کھل جاتے ہیں اور چند گھنٹوں پیشتر والی یہ گوشت کی بوٹی خوبصورت چڑیا بن جاتی ہے۔

چھوٹی چڑیاں عموماً بیتالیس پچاس میل کی رفتار سے اڑتی ہیں۔ کبوتر پچپن ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرتے ہیں۔ آبی بطخیں ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار رکھتی ہیں۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا کی سب سے تیز اڑنے والی چڑیا کون ہے۔ متعدد چڑیوں کی رفتار ایک سی ہوتی ہے۔ چھوٹی چڑیاں جو فطرتاً تیز ہوتی ہیں۔ ان کی پرواز بھی تیز ہوتی ہے۔ ایسی چڑیاں ایک سو ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتی ہیں۔ لیکن عام طور سے تیز ترین اڑنے والے پرندے شکاری پرندے ہیں مثلاً شاہین، عقاب۔ شکار کا پیچھا کرنے کے دوران ان کی رفتار ۱۷۰ سے ۲۰۰ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

کچھ چڑیاں پانی کے اندر بھی اڑتی ہیں۔ جیسے MURRES۔ اس چڑیا کے پر پانی کے اندر اسی طرح حرکت کرتے ہیں ہے جیسے فضا میں اڑتی ہوئی چڑیا کے۔ ایک دوسری چڑیا OUZEL ہے جو غوطہ لگا کر پانی کی تہہ میں اتر جاتی ہے اور اس طرح گھومتی پھرتی ہے جیسے کھیتوں میں چڑیاں گھومتی ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ پانی کے اندر پروں کو پھیلا کر اڑتی ہے۔

آپ نے چڑیوں کو پیڑ کی شاخ پر بیٹھے بیٹھے سوتا ہوا دیکھا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سوتے میں شاخ سے نیچے نہیں گرتی ہیں۔ چڑیا جب شاخ پر بیٹھتی ہے تو پنجے شاخ کے گرد خود بخود لپٹ جاتے ہیں۔ یہ انتظام قدرت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کے پنجے مڑنے کا تعلق اس نس سے ہے جو چڑیا کے ٹخنوں کے جوڑ سے اوپر ہوتی ہے۔ چڑیا جب شاخ پر بیٹھنے لگتی ہے تو اس کے بوجھ سے جوڑ پر سے اس کے ٹخنے جھکنے لگتے ہیں اور اس نس کے ذریعہ

نیچے کھینچ کر گول ہو جاتے ہیں اور مضبوطی سے شاخوں کے گرد لپٹ جاتے ہیں اور چڑیا گر نہیں پاتی۔

موسم کے اعتبار سے بہت سی چڑیاں اپنے ٹھکانے بدلتی رہتی ہیں۔ ان کا نیا ٹھکانا سیکڑوں میل دور ہوتا ہے لیکن ان کو راستے سے پوری پوری واقفیت ہوتی ہے۔ اس میں ان کی فطری صلاحیت کے علاوہ اور بھی چیزیں مددگار ہوتی ہیں۔ اپنے سفر میں اڑتے وقت زمین کی مقناطیسی لہروں سے انھیں ہدایت ملتی ہے۔ دریا اور پہاڑوں کے سلسلے ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ نئے پرندے پرانے اور تجربہ کار ساتھیوں کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ یہ سفر عموماً رات میں ہوتا ہے۔ ان کی اڑان کافی بلندی پر ہوتی ہے چونکہ سفر رات کا ہوتا ہے اس لیے ہم انھیں دیکھ نہیں پاتے۔ سفر کے دوران ان کی پرواز کی رفتار تعجب خیز ہوتی ہے۔ سمندر کو پار کرتے ہوئے۔ چھوٹی سے چھوٹی چڑیا بھی سینکڑوں میل تک بغیر کہیں رکے ہوئے اڑتی ہے۔ طویل اور دور دراز کے سفر میں پانی کی ضرورت پڑتی ہے لیکن آبی چڑیوں کو پانی کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ سمندر کا کھاری پانی پی لیتے ہیں بالکل اس طرح جس طرح ہم میٹھا پانی پیتے ہیں۔

ہر چڑیا کا اپنا ایک محدود زمین کا ٹکڑا ہوتا ہے جس پر صرف اسی کی عملداری ہوتی ہے۔ وہ گاگا کر اپنی عملداری کا اعلان کرتی رہتی ہے۔ اگر اس کی حد میں دوسری چڑیا آجاتی ہے تو وہ اسے مار کر بھگا دیتی ہے۔ چڑیاں عموماً اپنا قبضہ زمین کے اس ٹکڑے پر رکھتی ہیں جہاں انھیں پیٹ بھرنے کی آسانی ہوتی ہے یعنی ان کی خوراک کی چیزیں انھیں آسانی سے مل جاتی ہیں — جس طرح بہت سے گھروں کا ایک مشترکہ لان یا پارک ہوتا ہے جسے ہر ایک استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اسی طرح پرندوں میں بھی زمین کا ایک مخصوص ٹکڑا ہوتا ہے۔ جو ہر چڑیا استعمال کر سکتی ہے۔ زمین کے اس ٹکڑے پر کوئی چڑیا اپنا قبضہ نہیں جتا سکتی۔

جناب کمل پرکاش

خرگوش میاں

خرگوش میاں ہیں دیکھو کھڑے
ہے چھوٹی دم اور کان بڑے
رنگ مٹیلا آنکھیں لال
بڑی تیز ہے ان کی چال
اینٹھ رہے ہیں اپنی مونچھیں
آؤ ان کا حال تو پوچھیں
ارے رے یہ تو بھاگ چلے
پوچھیں گے پھر اگر ملے

گڑیا کا بیاہ

عباس صدیقی۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ

ردار:۔

نازؔ:۔ دس بارہ سال کی لڑکی جس کی گڑیا کا بیاہ ہو رہا ہے۔

مہ
رفہ
یسہ
یسہ
} شہناز کی ہم عمر سہیلیاں

منظر:۔

(ایک عام قسم کا کمرہ جہاں گڑیا کے بیاہ کا سامان کچھ تو ترتیب سے رکھا ہے اور کچھ ادھر اُدھر بکھرا پڑا ہے۔)

عارفہ:۔ (گھبرائی ہوئی سی آتی ہے) ارے کچھ سنا تم نے! انیسہ خبر لائی ہیں کہ دولہا کی برات آدھے راستے تک پہنچ چکی ہے۔ یہاں تو ابھی کچھ بھی تیار نہیں۔

ہناز:۔ ہائے اللہ اب کیا ہوگا! انیسہ مقی ذرا تم ہاتھ بٹاؤ۔ سارا سامان بکھرا پڑا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دادی جان آکر ساری چیزیں الٹ پلٹ کر گئیں

نسیمہ:۔ ہائے گھبراتی کیوں ہو۔ ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ جما دیتے ہیں۔ تم ذرا باہر کا انتظام سنبھالو۔

شہناز:۔ کیوں، انیسہ برات میں کتنے لوگ ہوں گے؟

انیسہ:۔ خاصے لوگ ہیں۔ لیکن مجھے تو دو چار بوڑھے بھی نظر آئے۔

نفیسہ:۔ ہائے اللہ۔ بوڑھے! بوڑھوں کا بھلا گڑیا کے بیاہ میں کیا کام؟ ارے نہیں وہ کوئی راہ چلتے لوگ ہوں گے۔

نسیمہ:۔ کہیں شاہدہ کے دادا جان اور ان کے دوست احباب تو نہیں؟

شہناز:۔ وہ بے چارے کیوں آنے لگے۔ ان سے تو ٹھیک سے چلا بھی نہیں جاتا۔

شہناز:۔ اچھا بھئی۔ آتے ہیں تو آئیں۔ بٹھا دیں گے انھیں ایک کونے میں۔

ارے عارفہ تم کھڑی کیا کر رہی ہو جاؤ چولہا

سنبھالو۔ چائے جلدی سے تیار کرو۔ بسکٹ
اور کیک کو ہاتھ نہ لگانے دینا۔ کم بخت
ندیدے بچے صبح سے بسکٹ اور کیک کی
تاک میں بیٹھے ہیں۔

انیسہ:۔ ارے کچھ سنا تم نے! باجوں کی آواز آرہی ہے۔

شہناز:۔ (خوش ہوکر) ارے سچ باجوں ہی کی آواز تو
ہے۔ بڑا مزا آئے گا۔
ارے ذرا اقبال میاں کو تو دوڑاؤ۔ دیکھیں
کتنے لوگ آرہے ہیں۔

نفیسہ:۔ اونہہ۔ تمھیں تو بس لوگوں کی فکر ہوگئی۔
ارے آگئے دس بیس لوگ زیادہ تو کیا قیامت
آجائے گی۔

شہناز:۔ ایسی بات نہیں نفیسہ۔ کہیں چائے کم نہ پڑ جائے۔
بڑی مشکل سے دو ہی کلو شکر تو ملی ہے۔ زیادہ
لوگ آگئے تو بڑی پریشانی ہوجائے گی۔

انیسہ:۔ ہائے اللہ! تو کیا دو کلو شکر میں میٹھا پکوان
بھی ہوگا اور چائے بھی بنے گی؟

شہناز:۔ ارے۔ میٹھے پکوان کے لیے الگ سے شکر
رکھی ہے۔

عارفہ:۔ رکھی ہے! یعنی کہ میٹھا ابھی تیار ہی نہیں ہوا؟

نسیمہ:۔ میٹھا تیار ہے بابا۔ میں نے خود تیار کیا ہے۔

عارفہ:۔ ٹھیک ہے۔ تو چلو میٹھا الگ الگ طشتریوں
میں جمادیں۔

انیسہ:۔ (باہر سے آکر) ارے غضب ہوگیا تم یہاں
بیٹھی فضول بک بک کر رہی ہو اور ادھر
باورچی خانے میں میٹھے کا صفایا ہو رہا ہے۔
سارے پیٹو بچے تشتریاں بھر بھر کر نکال
رہے ہیں اور چٹ کر رہے ہیں۔

شہناز:۔ ہائے اللہ۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ میں صبح
سے دیکھ رہی ہوں کہ یہ سارے بچے بس باورچی
خانے کے پاس ہی منڈلا رہے ہیں۔ سارے
عارفہ تم ذرا ناہید باجی کو تو بلاؤ۔

عارفہ:۔ نا بابا۔ ناہید باجی ڈانٹ دیں گی۔

شہناز:۔ اچھا انیسہ تم جاؤ۔ ان سے کہنا۔ سب بچے
میٹھے کا ناس مار رہے ہیں۔ بس ذرا دیر کے
لیے آجائیں۔ انھیں دیکھتے ہی سب بھاگ
جائیں گے۔

نسیمہ:۔ اچھا شہناز تم نے قاضی کو بھی بلایا؟

شہناز:۔ قاضی کو ہم تھوڑی بلاتے ہیں۔ دولھا والے
خود ہی ساتھ لاتے ہیں۔

نفیسہ:۔ تو کیا سچ مچ کا قاضی آرہا ہے؟

شہناز:۔ نہیں رے۔ وہ جو عارفہ کی چھوٹی منی کو پڑھانے
کے لیے آتے ہیں۔ وہ آرہے ہیں۔

نسیمہ:۔ تو کیا وہ سچ مچ کا نکاح پڑھائیں گے؟

شہناز:۔ پتہ نہیں کیا کریں گے۔ مگر شاہدہ نے انھیں
بلا بھیجا ہے۔

عارفہ:۔ (ناہید دوڑتی ہوئی آتی ہے) ارے شہناز
باجی آرہی ہیں۔ مگر ان کے ساتھ دادی جان

بھی آرہی ہیں۔ انیسہ ذرا تم چلی جاؤ اور دادی
جان سے کہو کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا
ہے۔ وہ نماز کے لیے چلی جائیں تو پھر گھنٹہ
بھر کی فرصت ہو جائے گی۔

عارفہ:۔ مگر برات تو ابھی تک نہیں پہنچی ؟ باجوں کی
آواز بھی نہیں آرہی ہے۔

شہناز:۔ ارے ہاں سچ باجوں کی آواز بھی نہیں آرہی
ہے۔ ذرا اقبال میاں کو تو دوڑاؤ کہیں راستے
میں کچھ گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔

انیسہ:۔ گڑبڑ کیا ہوتی۔ میں خود دیکھ آئی ہوں۔
برات ادھر ہی آرہی تھی۔

نسیمہ:۔ ارے وہ کسی اور کی برات ہوگی۔ ہماری
برات ہوتی تو اب تک پہنچ نہ جاتی!

نفیسہ:۔ (باہر سے آتی ہے) لو سنو۔ شاہدہ کے
گڈے کی برات تو ابھی گھر سے نکلی ہی نہیں۔
وہ کسی اور کی برات تھی؟

شہناز: وہ دیکھو اقبال آرہے ہیں۔ شاید کچھ خبر
لائے ہیں۔

(اقبال آتے ہیں)

اقبال: ایک خوش خبری لایا ہوں۔

شہناز: خوش خبری! کیسی خوش خبری؟

اقبال:۔ شاہدہ کے گڈے کا انتقال ہو گیا۔ بے چارے
شادی سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شہناز: مذاق نہ کر میرے بھیا۔ سچ سچ بتا کیا
بات ہے؟

اقبال:۔ ارے ہاں۔ میں سچ ہی تو کہہ رہا ہوں۔
شاہدہ کے بھیا ایاز میاں ملے تھے۔
انھوں نے کہا۔ گڈے میاں ٹوٹے پھوٹے
پڑے ہیں اور اعجاز میاں نیا گڈا لانے
بازار گئے ہیں۔

شہناز:۔ (سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ سب سہیلیاں گھیر کر
اسے تسلی دیتی ہیں)

انیسہ:۔ پریشان نہ ہو شہناز۔ ذرا دیر ہو جائے گی۔
مگر وہ لوگ آئیں گے ضرور۔

نسیمہ:۔ مگر شہناز کی امی نے تو صرف مغرب تک
کا وقت دیا ہے۔ وہ لوگ مغرب کے
بعد آئے تو؟

نفیسہ:۔ وہ دیکھو شاہدہ کی چھوٹی بہن شاہینہ
آرہی ہیں۔ شاید کچھ پیام لائی ہیں۔

شاہینہ: (سب کو سلام کرتی ہے۔)
شاہدہ باجی نے آپ سب کو سلام کہا ہے۔
اور کہا ہے کہ برات آج نہ آسکے گی۔

سب ایک ساتھ: ہائے اللہ اب کیا ہوگا؟

شہناز: ہوگا کیا سب تباہ ہو جائیگا میٹھا سالن بچے چٹ
کر جائینگے پلاؤ ستیاناس ہو جائیگا، بسکٹ کیک چوہے کھائیں گے۔

انیسہ:۔ مگر برات آج کیوں نہ آئے گی؟

شاہینہ: بات یہ ہے کہ فیروز میاں نے گڈے
کے ہاتھ پیر، سر دھڑ سب کچھ توڑ تاڑ کر

رکھ دیا ہے۔ اب اعجاز میاں دوسرا گڈا لانے بازار گئے ہیں۔ آج کے آج نیا گڈا دولھا کیسے بنایا جائے گا ؟

شہناز: بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت آ گئی۔ اب ناہید باجی، امی جان اور دادی جان کو کون سمجھائے گا۔ آج کی چھٹی اور پیسہ تو غارت ہو گیا۔ خدا جانے اب کب موقع ملے گا۔

انیسہ: اچھا چلو۔ کل کا کل دیکھا جائے گا۔ سب مل کر میٹھا تو کھا لیں۔

شہناز: (ناامید ہو کر) چلو ورنہ میٹھا بھی صاف ہو جائے گا۔

(سب مل کر جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

بچوں کی راست بازی کا بقایا

کو طلب کیا اور تنہائی میں ان پر اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔

شہزادوں نے جب یہ بات اپنے باپ کے منھ سے سنی تو دونوں نے یک زبان ہو کر کہا: "ٹیپو سلطان کے لیے ایسا کرنا سزاوار نہیں۔ یہ تو کھلا دھوکا ہے جس میں بیٹھے بٹھائے دو بے گناہ بچوں کی جان چلی جائے گی، بابا آپ نے جب وعدہ کیا ہے تو اس پر قائم رہیے۔ اللہ بڑا ہے۔ انشاءاللہ ہماری جانوں کو کوئی جوکھم نہ ہو گا۔"

ٹیپو نے جب یہ بات اپنے بیٹوں سے سنی تو وہ بہت خوش ہوا۔ ان کی راست بازی کی داد دی اور بغیر کسی خوف کے انھوں نے شہزادوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

لطیفہ

جج: گواہ سے "کیا تم نے گولی چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

گواہ: "نہیں حضور میں نے صرف آواز سنی ہے۔"

جج: تب تمھارا بیان قابلِ اعتبار نہیں ہے۔"

(گواہ منھ پھیر کر زور سے ہنستا ہے)

جج: (غصے سے) "یہ عدالت کی بے عزتی کیوں کی؟"

گواہ: "کیا حضور نے مجھے ہنستے ہوئے دیکھا ہے؟"

جج: "نہیں میں نے تو صرف آواز سنی ہے۔"

گواہ: "تو آپ کی بات قابلِ یقین نہیں ہے۔"

محمد یحییٰ

بہادر بومبا کا بقایا۔

ہے۔ وہی ہمارا عظیم اور سچا بادشاہ ہے۔"

اور عظیم سنہرے اسٹول پر جب اس نے اپنی گدی سنبھالی تو سپاہیوں نے بھی نعرے بلند کیے۔

اس وقت سے لے کر اب تک اشنتی قبیلے کے لوگ جو مغربی افریقہ میں رہتے ہیں۔ بومبا کے بارے میں اس کے ایک سے ایک بہادری کا رنامے سناتے چلے آئے ہیں۔

عزیزہ مہ نور (بنگلور)

وھیل — جو مچھلی نہیں ہے۔

آپ مچھلیوں کے بارے میں تو بہت کچھ جانتے ہوں گے۔ آیئے آج وھیل کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ کیا وھیل مچھلی نہیں ہے؟ نہیں بھئی، وھیل مچھلی کہاں سے آئی! اس کا تعلق تو دودھ پلانے والے جانوروں کے گروہ سے ہے۔ انسان بھی تو اسی گروہ میں ہے۔

سائنسی رو سے وھیل کو مچھلی کہنا بالکل غلط ہے۔ ہم اسے صرف پانی کا جانور کہہ سکتے ہیں۔ وھیل اور مچھلی میں کئی بنیادی فرق ہیں، دونوں میں بس اتنی یکسانیت ہے کہ وھیل بھی مچھلی کی طرح پانی میں رہتی ہے۔ اور ان کی شکل صورت مچھلی سے ملتی جلتی ہے۔

مچھلی کی رگوں میں ٹھنڈا خون دوڑتا ہے اور وھیل انسان کی طرح گرم خون والے جانور ہیں۔ یہ باقاعدہ پھیپھڑوں کے ذریعے کھلی ہوا میں سانس لیتے ہیں اور سانس لینے کے لیے ان کو ہر ۵ منٹ بعد اپنا سر پانی سے اوپر کر کے نتھنوں کے ذریعے ہوا اندر لینی پڑتی ہے۔ لیکن مچھلیاں پانی میں گھلی ہوئی ہوا سے آکسیجن حاصل کر لیتی ہیں۔ پھر مچھلیاں انڈے دیتی ہیں ان سے بچے نکلتے ہیں۔ لیکن مادہ وھیل بچے دیتی ہیں۔ انھیں اپنا دودھ پلا کر پالتی ہیں۔

وھیل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کے دانت ہوتے ہیں۔ دوسری وہ جس کے دانت نہیں ہوتے بلکہ اوپر کے جبڑے میں بے حساب تکونی ہڈیاں سی لٹکی ہوتی ہیں۔ یہ قسم قوی ہیکل ہوتی ہے اس کے شکار کرنے کا طریقہ انوکھا ہے۔ یہ وھیل پہلے اپنے منھ میں پانی بھر لیتے ہیں۔ پھر اپنے منھ میں لگی ہوئی جالی سے پوری طاقت کے ساتھ نشانے پر پانی کی دھار کھینچ مارتے ہیں۔ اور بھئی شکار زخمی ہو کر منھ میں آجاتا ہے۔

وھیل کی جلد سے بالکل نیچے چربی کی ایک موٹی تہہ ہوتی ہے۔ یہ تہہ اس کو ٹھنڈے پانی میں رہتے ہوئے بھی اپنی جسمانی حرارت برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ وھیل کی ایک اور خصوصیت ہے۔ مچھلی کی طرح ہر چھوٹے بڑے تالابوں یا دریاؤں

میں نہیں رہتے صرف سمندروں میں رہتے ہیں۔

وھیل بحرالکاہل جنوبی میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہاں رہنے والے "نیلے وھیل" کی لمبائی ۳۱ ہزار میٹر اور وزن ۰۰۰،۳۰ ٹن تک ہوتا ہے۔ وھیل کے قوی ہیکل ہونے کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ اوسطاً ایک وھیل کے جبڑوں کی ہڈی کا وزن ۲ ٹن، کھوپڑی کا ۱/۲ ۴ ٹن، خون کا ۸ ٹن، گوشت کا ۵۶ ٹن، زبان کا ۳ ٹن اور چربی کی تہہ کا ۲۸ ٹن ہوتا ہے۔

وھیل کا گوشت تو نہیں کھایا جاتا، پر وھیل سے انسان کو فایدے بہت پہنچتے ہیں۔ انھی فایدوں کے سبب امریکہ اور دوسرے کئی ملکوں میں وھیل کا شکار کاروبار یا پیشے کے طور پر کیا جاتا ہے جبھی تو وھیل کا شکار اتنی کثرت سے ہونے لگا کہ ان کی نسل کے خاتمے کا اندیشہ ہو گیا اور اس ڈر سے کہ کہیں یہ سرے سے غائب ہی نہ ہو جائیں کئی ملکوں مثلاً دکنیڈا، ڈنمارک، فرانس، اور جنوبی افریقہ وغیرہ جہاں یہ شکار جاری ہے) نے مل کر ایک ادارہ "آئی، ڈبلیو، سی" (INTERNATIONAL WAHLING Commision) قایم کر لیا۔

اس ادارے نے ۱۹۶۶ء سے یہ قانون جاری کر دیا ہے کہ سالانہ صرف ۵۰،۰۰۰ وھیلوں کا شکار کیا جا سکتا ہے۔ یہ ادارہ مختلف خاندان کے وھیلوں کی عمر، لمبائی اور نسل بڑھانے کے وقفے وغیرہ کا مطالعہ کرنے والوں کو مدد دیتا ہے۔ خود بھی اپنے خاص عملے کے ذریعے یہ کام انجام دیتا ہے۔ اس ادارہ سے ہر بار اگلے سال شکار کے لیے وھیلوں کی تعداد مقرر کر دی جاتی ہے اور اس کے ممبر ملکوں کو شکار کی ہوئی وھیلوں کی تعداد یہاں پر باقاعدہ درج کرانی پڑتی ہے۔

وھیل کا شکار پہلے وھیل کی ہڈی اور تیل حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ چربی سے تیار کیا ہوا تیل جلانے کے کام آتا تھا اور ہڈیوں کی کمرپیٹیاں فیشن کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ بیمار "سپرم وھیل" کی انتڑیوں میں پایا جانے والا مادہ "ایمبرگس" جو بہت قیمتی ہے خوشبو بنانے میں استعمال ہوتا تھا۔ آج کل وھیل کے کئی اور فایدے نکل آئے ہیں۔

اب شکار کیے ہوئے وھیلوں کے گوشت ہڈیوں اور چربی کو پہلے علیحدہ کر کے گوشت ابال لیا جاتا ہے۔ پھر گوشت اور ہڈیوں کو ملا کر مرغیوں اور مویشیوں کی غذا تیار کی جاتی ہے۔ "مارگیرن" بنانے، چند دوائیاں اور کیمیائی کھاد FERTILSER) تیار کرنے میں بھی وھیل کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ دوسری بڑی لڑائی کے زمانے میں وھیل کے تیل سے دھماکا پیدا کرنے کا سامان بھی تیار کیا جاتا تھا۔

پہلے وھیل کا شکار بہت مشکل، خطرناک

اور جوکھم کا کام تھا۔ اس وقت نشانہ باندھ کر صرف
ہاتھ کی مدد سے ہارپون (وھیل کو مارنے کا آلہ اور
ایک لوہے کی سلاخ) پھینکا جاتا تھا لیکن سنہ ۱۹۶۳ء
میں ناروے کے ایک سائنس داں "سوینڈ فائن"
نے "ہارپون بندوق" ایجاد کرلی۔ اس ایجاد کے بعد
وھیل کا شکار آسان اور محفوظ ہوگیا۔ اب چھوٹی
چھوٹی دخانی کشتیوں میں برقی ہتھیار لگا کر ان کا
شکار آسانی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

یہ کشتیاں ایک کیبن والی موٹر بوٹ جتنی
بڑی ہوتی ہیں اور ریڈیو اور راڈر کے ذریعے اپنے
مرکزی جہاز سے رابطہ رکھتی ہیں۔ ان کے اوپر کے
حصہ میں "ہارپون گن" نصب ہوتی ہے۔ اس میں
۱۰۰ کلوگرام وزنی ہارپون لگے ہوتے ہیں۔ اس
ہارپون کے سرے پر بارودی گولا بھی لگا ہوتا ہے۔
اس بندوق سے ۱۶ سے ۲۵ میٹر کے فاصلے کے
اندر تاک کے گئے نشانہ پر ہارپون چلا کر وھیلوں کو
مارا جاتا ہے۔

آج کل ان کشتیوں میں ہوا کے پمپ بھی
لگے ہوتے ہیں۔ ان سے مردہ وھیلوں کے پیٹ میں
ہوا بھر دی جاتی ہے تاکہ مرکزی جہاز تک لاتے
وقت وہ پانی کے اوپر ہی اوپر تیرتے رہیں۔ یہ
مرکزی جہاز بھی کچھ چھوٹے موٹے نہیں ہوتے
بلکہ ایک اچھی خاصی فیکٹری ہوتی ہے۔ ان میں ایک
ہی وقت میں تیس میٹر لمبے نہ صرف تین سے زیادہ
وھیل لائے جاسکتے ہیں بلکہ بیس ہزار ٹن تیل بھی رکھا جاسکتا
ہے جو اسی جہاز پر وھیل کی چربی سے نکالا جاتا ہے
اتنا ہی نہیں تقریباً سات سو ملازم بھی آٹھ مہینوں
تک اپنی ضرورت کی عام چیزوں سمیت یہاں رہ
سکتے ہیں۔

اس جہاز کے بالائی حصہ میں مردہ وھیل
کی چربی الگ کرکے ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے
کیے جاتے ہیں۔ اس کام کے لیے آج کل بھاپ
سے چلنے والے آرے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ آرے
صرف چالیس منٹ میں اس قوی ہیکل جسم کو کاٹ
کر رکھ دیتے ہیں۔

اب یہ شکار اتنا فائدہ مند اور مقبول
ہوگیا ہے کہ آسٹریلیا، برازیل اور کچھ دوسرے
ملکوں نے سمندر کے ساحل پر بھی وھیل فیکٹریاں
بنا لی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک وھیل کا شکار کرنے
سے چالیس ہزار روپے کا فائدہ ہوتا ہے اور
ایک بار کی مہم سے اندازاً چار سو پچاس لاکھ روپے
ملتے ہیں۔

وھیل کے مسلسل شکار کے سبب اس
کی نسل کے خاتمے کا خطرہ تو ہے لیکن آئی ڈبلیو
سی کے اندازے کے مطابق پچھلے سال بحر منجمد
شمالی میں کوئی ۳۱ ہزار بانوے وھیلوں کا شکار
کیا گیا اور حیرت کی بات ہے کہ اب بھی وہاں
کوئی ساڑھے بیس ہزار وھیل موجود ہیں۔ ●●●

جناب آرزو باراتوی

آزادی کی صبح

ہر طرف چھائی ہے رحمت کی گھٹا آج کے دن
ہم پہ مائل بہ عنایت ہے خدا آج کے دن

کتنے پر کیف ہیں یہ ارض[1] و سما[2] آج کے دن
حسن ہر چیز میں ہے جلوہ نما[3] آج کے دن

س قدر آج عنادل[4] کے گلے ہیں شیریں
کیا معطر ہے گلستاں کی ہوا آج کے دن

شب تاریک[5] گئی صبح درخشاں آئی
مہر پُر نور نمودار ہوا آج کے دن

س سے حاصل ہوئی تاریخ وطن کو زینت
اُس نئے باب کا آغاز ہوا آج کے دن

ینکڑوں سال کی لعنت سے ملی ہم کو نجات
ملک محکوم تھا مختار ہوا آج کے دن

ل نفرت کو کریں، داغ کدورت دھوئیں
کچھ نہ ہو دل میں محبت کے سوا آج کے دن

ہد ہو کے بہر حال ہمیں رہنا ہے
آؤ یہ باندھ لیں پیمانِ وفا آج کے دن

یوں ہی ہم شاد رہیں ایسے ہی آزاد رہیں
بس نکلتی ہے یہی دل سے دعا آج کے دن

[1] زمین [2] آسمان [3] ظاہر [4] عندلیب کی جمع بلبلیں [5] اندھیری رات

جناب م ندیم

ہارون رشید کا انصاف

ڈرامے میں کام کرنے والے
ہارون رشید
لکڑہارا
علی صیقل
داروغہ، سپاہی اور درباری وغیرہ

[پہلا ایکٹ]

پہلا منظر

[پردہ اٹھتا ہے۔ خلیفہ ایک تخت پر بیٹھا ہے۔
دو خادم پنکھا جھل رہے ہیں
لکڑہارا دو سپاہیوں کے ساتھ حاضر ہوتا ہے]

لکڑہارا:۔ [زمین چومتا ہے] خدا خلیفہ کو سلامت رکھے حضور مجھ پر ظلم ہوا ہے۔ انصاف چاہتا ہوں۔

خلیفہ:۔ تم کو جو شکایت ہے صاف صاف کہو تمہارے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ اگر خلیفہ کے بیٹے نے بھی تمہارے ساتھ ظلم کیا ہوگا تو اس کو بھی سزا دی جائے گی۔ بتاؤ تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟

لکڑہارا:۔ حضور میں ایک غریب لکڑہارا ہوں، صبح سے شام تک جنگل میں، دھوپ اور گرمی میں مارا مارا پھرتا ہوں، لکڑیاں اکٹھا کرتا ہوں اور ان کو بیچ کر اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔۔۔ حضور جس آدمی نے مجھ پر ظلم کیا ہے وہ شہر بغداد کا مشہور حجّام ہے۔۔۔۔

خلیفہ:۔ کیا نام ہے اس کا؟

لکڑہارا:۔ حضور اس کا نام علی صیقل ہے۔

خلیفہ:۔ کیا کیا ہے اس نے تمہارے ساتھ؟

لکڑہارا:۔ حضور، اس کے ہاتھ میں وہ کمال ہے کہ وہ لوگوں کے سر کے بال اپنے تیز اُسترے سے آنکھیں بند کر کے مونڈ سکتا ہے، کیا مجال کہ کہیں ذرا بھی خراش آ جائے۔۔۔ شہر بغداد

کے سارے بڑے چھوٹے لوگ اس کو جانتے
ہیں اور مانتے ہیں۔ قاضی، مفتی، اور کوتوال
اس کے دوست ہیں۔۔۔!

خلیفہ:۔ تو بہت ہوشیار ہے اپنے فن میں!

لکڑہارا:۔ مگر حضور، اس نے میری حجامت تو بغیر
استرے کے بنا ڈالی۔ مجھے دھوکا دیا۔۔۔
اور میری فریاد کسی نے نہیں سنی۔۔۔ قاضی سے
شکایت کی، مفتی کے پاس جا کر رویا، کوتوال
کے پاس بھی گیا۔۔۔ مگر سب نے مجھے
ہی قصور وار ٹھہرایا۔۔۔ اب آپ ہی انصاف
کر سکتے ہیں۔۔۔!

خلیفہ: تمہارے ساتھ ضرور انصاف ہوگا۔ مگر
پہلے تم پوری بات تو بتاؤ!

لکڑہارا:۔ بات یہ ہے حضور والا کہ میں پچھلے جمعہ کو اپنے
گدھے پر لکڑیاں لاد کر شہر میں بیچنے لایا۔۔۔
علی صیقل نے مجھے بلایا اور پوچھا "اس
گدھے پر لدی ہوئی سب لکڑیوں کی کیا قیمت
ہوگی؟ میں نے قیمت بتائی۔۔۔ تھوڑے
مول تول کے بعد سودا طے ہوگیا۔۔۔ میں نے
لکڑیوں کا گٹھا اتار کر علی صیقل کی دکان پر رکھ
دیا۔ اس پر وہ چالاک حجام بولا کہ ساری لکڑیوں
کی قیمت طے کی ہے۔ اس میں گدھے کی کاٹھی
بھی شامل ہے۔ وہ بھی لکڑی ہی ہے۔ میرا
اور اس کا اس بات پر جھگڑا ہوا۔ بہت سے

اسی کی بات ٹھیک بتائی، اس طرح میرے
گدھے کی کاٹھی اس چالاک آدمی نے اتروالی
۔۔۔ میں قاضی شہر، مفتی اور کوتوال کے
پاس گیا، سب نے یہی کہا کہ علی صیقل نے
ٹھیک ہی کیا۔

خلیفہ:۔ (مسکراتے ہوئے) میاں لکڑہارے، ہمیں
تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔
علی صیقل نے سودا گدھے پر رکھی ہوئی ساری
لکڑیوں کا کیا تھا۔۔۔ اس لحاظ سے اس کو
کاٹھی لینے کا حق پہنچتا ہے۔ خیر گھبراؤ نہیں۔۔۔
میرے قریب آؤ، تمہارے کان میں ایک
بات کہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔

(لکڑہارا خلیفہ کے قریب آجاتا ہے خلیفہ اس
کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ لکڑہارا خوش ہوتا ہے
زمین چومتا ہے اور واپس جاتا ہے۔)

(دوسرا منظر)

(خلیفہ تخت پر بیٹھا ہے۔۔۔ دو خادم پنکھا جھل
رہے ہیں۔۔۔ سامنے کی قطاروں میں کچھ درباری
بیٹھے ہیں۔

لکڑہارا داخل ہوتا ہے۔۔ (زمین کو چومتا
ہے)

لکڑہارا:۔ خلیفہ کی دہائی ہے۔۔۔ علی صیقل نے میرے
ساتھ زیادتی کی ہے۔ مجھے اپنی دکان سے

خلیفہ :- (مسکرا کر) اچھا تمہارے ساتھ انصاف ہوگا۔ (داروغہ سے مخاطب ہو کر) علی صیقل کو فوراً حاضر کیا جائے!

(علی صیقل حاضر ہوتا ہے)

علی صیقل :- (زمین چومتا ہے) حضور کا اقبال بلند ہو۔

خلیفہ :- میاں لکڑہارے اب بیان کرو کیا بات ہے!

لکڑہارا :- حضور والا بات یہ تھی کہ میں آج علی صیقل کی دوکان پر حجامت بنوانے گیا۔۔۔ اور میں نے کہا "میاں علی صیقل کیا میری اور میرے ساتھی کی حجامت بنا دو گے۔؟" علی صیقل نے ہامی بھری اور کہا "ہاں میں تمھاری اور تمھارے ساتھی کی حجامت بنا دوں گا۔۔۔ اپنے ساتھی کو بھی لے آؤ۔۔!" میں اپنے ساتھی گدھے کو لے گیا اور کہا "یہ رہا میرا ساتھی اس کی حجامت بنا دو" اس پر علی صیقل بہت بگڑا مجھے برا بھلا کہا اور دھکے دے کر نکال دیا۔۔۔

خلیفہ :- علی صیقل کیا یہ بات سچ ہے کہ تم نے دونوں کی حجامت بنانے کی ہامی بھری تھی؟

علی صیقل :- حضور والا۔۔۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ میں نے ہامی بھری تھی۔۔۔ مگر آپ ہی انصاف کیجیے کہ آج تک کسی معقول آدمی نے نامعقول جانور گدھے کو ساتھی اور دوست کہا ہے اور اس کی حجامت بنوانے پر اصرار کیا ہے۔۔

خلیفہ :- مگر یہ تو قول و قرار کا معاملہ ہے اگر لوگ اپنے قول قرار سے پھر جایا کریں تو پھر کون کس پر اعتبار کرے۔۔۔ کیا تم نے سنا ہے کہ کسی معقول آدمی نے گدھے پر لدی ہوئی لکڑیوں کے ساتھ گدھے کی کاٹھی کو بھی لکڑیوں کے ساتھ لینے پر اصرار کیا ہے؟ ۔۔۔ تمھارے اور لکڑہارے کے درمیان جو بات طے ہوئی ہے اس کو پورا کرنا تم پر فرض ہے۔ اب میاں لکڑہارے کی باری ہے۔ تم کو گدھے کی حجامت بنانا پڑے گی۔

علی صیقل :- مگر۔۔ مگر حضور والا میں نے آج تک کسی گدھے کی حجامت نہیں بنائی۔۔ میں سارے بغداد میں بدنام ہو جاؤں گا۔۔ لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔۔۔

خلیفہ :- (غصہ سے) اگر تم گدھے کی حجامت نہیں بناتے تو سخت سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔۔۔

علی صیقل :- (خوف سے کانپتا ہے) نہیں۔۔۔ نہیں حضور والا میں حجامت بناؤں گا۔

خلیفہ :- میاں لکڑہارے اپنا گدھا لاؤ۔۔۔ اور یہ لو اشرفیوں کی تھیلی تم بہت دلچسپ مقدمہ لائے ہو۔ یہ اس کا انعام ہے۔

لکڑہارا :- (اشرفیوں کی تھیلی لیتا ہے۔ زمین چومتا ہے۔ درباری ہنستے ہیں)۔۔۔

(پردہ گرتا ہے۔)

(مسلسل)

سمرقند والے پیر اور جمعرات کو مزار پر حاضر ہوتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ نذریں مانتے ہیں۔ گائے، بھیڑ، روپیہ پیسہ درگاہ کے خادموں کی نذر کرتے ہیں۔ مزار مبارک پر گنبد ہے جس کے چار ستون ہیں۔ اور ہر پائے کے ساتھ دو ستون رنگین متصل ہیں۔ یہ امدادی ستون سنگ مرمر کے ہیں۔ دیواریں بھی سنگ مرمر کی ہیں۔ جن پر سونے کی منبت کاری اور نقش و نگار ہیں۔ گنبد کی چھت سیسہ کی ہے۔

مزار پر آبنوس کا کٹہرا ہے جس کے پایوں پر چاندی چڑھی ہوئی ہے۔ اوپر چاندی کی تین قندیلیں ہیں۔ باہر ایک بڑی نہر ہے جو خانقاہ میں ہوکر گزرتی ہے۔ نہر کے کنارے پر انگور اور چنبیلی کی بیلیں پھیلی ہوئی ہیں۔ خانقاہ میں بہت سے کمرے ہیں جن میں مسافر اور درویش ٹھہرتے ہیں۔ تاتاریوں نے اس درگاہ کی بے ادبی نہیں کی اور وہ بھی حاضری دیتے اور نذر و نیاز چڑھاتے ہیں۔

میرے زمانے میں اس کی نگرانی امیر غیاث الدین محمد عبدالقادر عباسی کے سپرد تھی۔ یہ عباسی خاندان سے ہیں اور خلیفہ مستنصر باللہ کی اولاد میں ہیں۔

سلطان ماوراء النہر نے جن کا ذکر ابھی ابھی تم نے پڑھا ہے۔ انھیں مقرر کر دیا ہے۔

سمرقند کا قاضی صدر جہاں ہے بڑا عالم اور صاحب اخلاق ہے۔ میرے قیام ہند میں ہندوستان گیا تھا۔ مگر ملتان سے آگے نہ پہنچا کہ انتقال ہوگیا۔

سمرقند سے نسف ہوکر ہمارا قافلہ ترمذ پہنچا۔ قدیم ترمذ دریائے جیحون کے کنارے بہت بڑا اور دولت مند شہر تھا۔

یہ وہ شہر ہے جہاں امام ترمذی پیدا ہوئے اور جن کی کتاب ترمذی شریف نصاب حدیث میں شامل ہے۔

یہاں کے لوگ سر کے بال دودھ سے

دھوتے ہیں اور ہر ایک حمام میں دودھ کے بھرے
ہوئے برتن رکھے رہتے ہیں۔ ہندوستان والے تل
کے تیل سے سر کی مالش کرتے ہیں۔ اور کھلی سے دھوتے
ہیں۔ اس لیے ان کے بال اور داڑھیاں لمبی ہوتی ہیں۔

بلخ ۔ یہ شہر اجاڑ اور غیر آباد ہے پھر بھی اس
کی عمارتیں اتنی خوب صورت مضبوط اور
پرکشش ہیں کہ ویرانی محسوس نہیں ہوتی۔ مسجد اور
مدرسوں کے نقش و نگار اب تک باقی ہیں۔ اکثر عمارتوں
میں لاجوردی منبت کاری اب بھی باقی ہے۔ تہائی
مسجدیں منہدم ہو گئی ہیں۔ کسی نے تاتاریوں سے
کہہ دیا تھا کہ مسجد کے کسی ستون کے نیچے خزانہ
ہے۔ جس کے لالچ میں ستونوں کو گرا دیا اور مسجدوں
کو مسمار کر دیا۔

بلخ کے باہر حضرت عکاشہ بن محصن الاسدی
کا مزار ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی
تھے۔

مزار کے ساتھ ایک بڑی خانقاہ بنی ہوئی
ہے۔ خانقاہ کے باہر پانی کا تالاب ہے۔ اس کے
کنارے اخروٹ کا ایک درخت ہے۔ گرمیوں میں
لوگ اس کے سایے میں آرام کرتے ہیں۔

ایک اور مزار ہے جسے خرقیل علیہ السلام
کا مزار بتاتے ہیں۔ بلخ میں حضرت ابراہیم ادھم کا
محل بھی ہے۔ بلخ سے چل کر قہستان کے پہاڑوں
سے گزرے۔ جہاں بہت سی خانقاہیں ہیں۔ پانی کی
نہروں سے درخت بہت ... بکثرت تھے۔ پھر ہرات گئے جو اس وقت خراسان
کا سب سے زیادہ آباد اور بڑا شہر ہے۔

ہرات کا سلطان حسین معز الدین ابن
سلطان غیاث الدین غوری ہے (...ء) بڑا
دلیر اور بہادر انسان ہے۔

ہرات کے صالح لوگوں میں مولانا نظام الدین
بڑے پایہ کے بزرگ ہیں۔ شاہی خاندان سے
ہیں۔ درویشی اختیار کر لی ہے۔ حسین کے چچا زاد
بھائی ہیں۔

ہرات سے ہم جام پہنچے۔ جام میں شہتوت
کثرت سے ہیں۔ ریشم بہت ہوتا ہے۔ شہاب الدین
احمد الجام یہاں کے مشہور بزرگوں میں ہیں۔ پھر
طوس پہنچے جسے امام غزالی کا شہر کہا جاتا ہے۔

یہاں سے مشہد الرضی پہنچے جہاں علی بن
موسے الکاظم کا مزار مبارک ہے، یہاں پھلوں
کی کثرت ہے۔ پانی کی چکیاں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔
مشہد الرضی کے قریب مدرسہ اور مسجد بھی ہے۔
مزار کے قریب لکڑی کا چبوترہ ہے جس پر چاندی
کے پتر جڑے ہوئے ہیں اور چاندی کی قندیلیں ہیں
گنبد کا دروازہ چاندی کا ہے۔ جس پر زریں قسم کا
پردہ پڑا رہتا ہے۔ برابر میں ہارون الرشید عباسی
کی قبر ہے۔ ہارون الرشید عباسی کی قبر ایک بلند
مقام پر ہے۔ جہاں شمع دان رکھے جاتے ہیں۔

یہاں سے سرخس ہوتے ہوئے زادہ پہنچے۔
سرخس میں پانی بہت کم ہے۔ کنوؤں سے نکالا جاتا ہے۔ ایک نہر ہے جو خشک رہتی ہے۔ بارش ہو جاتی ہے تو بہنے لگتی ہے۔ زادہ قطب الدین حیدر کا شہر ہے۔ حیدری انہی بزرگ سے نسبت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ہاتھوں میں گلے میں اور کانوں میں لوہے کے کڑے ڈالتے ہیں۔

نیشاپور:۔ خراسان کے شہروں میں نیشاپور بھی بڑا شہر ہے۔ باغات کی کثرت ہے۔ بازار بھی اچھے ہیں۔ وسط بازار میں مسجد ہے۔ جو نہایت عمدہ ہے۔ ریشم کا کپڑا نیشاپور میں تیار ہوتا ہے جو ہندوستان تک جاتا ہے۔ یہاں سے بسطام کا سفر ہے۔ جہاں حضرت بایزید بسطامی کا مزار مبارک ہے۔ شیخ ابوالحسن خرقانی کا مزار بھی بسطام میں ہے۔

بسطام سے قندوز اور میلان کے متبرک مقامات کی زیارت کی۔ ہم یہاں چالیس دن ٹھہرے تاکہ یہاں کی سرسبز چراگاہوں میں ہمارے اونٹ اور گھوڑے کھاپی کر تر و تازہ ہو جائیں۔

ہمارے طویل قیام کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ سردی شروع ہو چکی تھی۔ سردیوں کے موسم میں ہندوکش سے گذرنا مشکل ہے اور ہندوکش پار کیے بغیر ہندوستان پہنچ نہیں سکتے تھے۔

گرمی آئی تو ہندوکش سے گذرے۔ برف جگہ جگہ جمی تھی۔ ہم اپنے لبادے بچھا دیتے تھے۔ تاکہ اونٹ ان پر پاؤں رکھتے ہوئے آگے بڑھ سکیں
بجلان سے نکل کر اندراب گئے۔

اندراب:۔ کسی زمانے میں اندراب اچھا خاصا شہر تھا۔ اب اس کے نشانات مٹ گئے ہیں۔ جب ہم اندراب کے ایک گاؤں میں پہنچے تو وہاں محمد المہروی ایک عالم سے ملاقات ہوئی، جنھوں نے کوہ ہندوکش تک ہمارا ساتھ دیا۔ پہاڑ پر ہمیں ایک چشمہ ملا۔ جس کا پانی اتنا گرم تھا کہ جب ہم نے منہ دھویا تو ہماری کھال جل گئی۔ اور بہت دن تک دکھتی رہی۔

اندراب کے بعد ہمیں ایک شہر ملا۔ اسے پنج بیر کہتے ہیں۔ نہر کے کنارے پر آباد ہے۔ نہر کا پانی سمندر کے پانی کی طرح نیلا نظر آتا ہے۔ یہ نہر بدخشاں کے پہاڑ سے نکلی ہے۔ اور یہاں ہیرے ملتے ہیں۔ جنھیں بلخش کہتے ہیں۔

چیک نشائی:۔ چیک نشائی میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی جنھیں ابوالولیا کہتے ہیں۔ ساڑھے تین سو سال کی عمر بتائی جاتی ہے۔ میں جب ان کی خدمت میں گیا تو بغل گیر ہو کر ملے۔ ان کا جیسا نرم بدن آج تک میں نے کسی کا نہ دیکھا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے بال اور دانت ہر پچاس سال کے بعد نئے نکل آتے ہیں۔ میں نے ان سے باتیں اور کچھ سوالات کیے۔ مگر مجھے ان کی باتوں پر یقین نہ آیا۔

غزنی:- غزنین میں محمود سبکتگین کی قبر دیکھی اور فاتحہ پڑھی، سردی کے موسم میں غزنی والے قندھار چلے جاتے ہیں۔ پہلے یہ بڑا شہر تھا اب گاؤں ہے۔ اس کے باشندے افغان ہیں۔ افغان اپنے کو بنی اسرائیل کی اولاد بتاتے ہیں۔

جولائی کے مہینے میں جب کہ بارش کا پانی گڑھوں میں جمع ہوجاتا ہے۔ سندھ کا صحرا پندرہ دن میں طے کیا اور ۱۲ ستمبر ۱۲۲۳ء کو پنجاب میں دریائے سندھ پر پہنچ گئے۔

اگلے پرچے سے اپنے دیس کے سات سو برس پہلے کے حالات پڑھیے گا۔

جناب محمد رفیق شاستری ام۔ اے

پنچ تنتر کی کہانیاں

شہری گدھا جنگلی دوست! (مسلسل)

بندر نے تب مگرمچھ کی یہ کہانی سنائی۔

کسی جنگل میں گھنے بالوں والا ایک شیر رہا کرتا تھا۔ اس شیر کی خدمت کے لیے ایک گیدڑ ہر وقت ساتھ لگا رہتا تھا۔ اتفاق کی بات ایک بار شیر کا سامنا ایک ہاتھی سے ہوگیا۔ مست ہاتھی نے شیر کو کافی زخمی کر دیا۔ بے چارے شیر کی ایک ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ اور جنگل کے یہ بادشاہ سلامت شکار کرنے سے لاچار ہو گئے۔

مگر شکار کیے بغیر جنگل میں زندگی کیسے گزرتی۔ گیدڑ میاں کا حال تو اور بھی بُرا تھا۔ بے چارہ شیر کی ہاں میں ہاں ملا کر اس کے بچے کھچے پر اپنا پیٹ پالتا تھا۔ اب شیر صاحب شکار سے معذور ہو گئے تو دونوں کی آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔

ایک دن شیر نے گیدڑ سے کہا کہ ذرا دوڑ بھاگ کر کے کسی طرح کوئی جانور میرے قریب لے آ تو میں اس کا شکار کر لوں۔ جانور پاس آ جائے تو اس پر ہاتھ صاف کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مگر کوئی جانور آسانی سے میرے پاس بھلا کاہے کو آئے گا! جا ذرا کوشش تو کر۔ دیکھ یہ اچھی طرح جان لے کہ ہم دونوں کا بھلا انھی ترکیبوں سے ہو سکتا ہے۔

گیدڑ شکار کی تلاش میں قریب کے گاؤں میں گیا۔ وہاں اس نے تالاب کے کنارے لمبے کان والے گدھے کو ہری ہری گھاس چرتے دیکھا۔ گیدڑ اس کے پاس گیا اور کہنے لگا: "گدھے بھیا آداب! بہت دنوں بعد دکھائی دیئے۔ اتنے دبلے کیوں دکھائی دے رہے ہو۔ خدا نہ کرے دشمنوں کا مزاج تو ناساز نہیں ہے؟"

دھوبی میاں کے دن رات ظلم سہتے سہتے بہت دن بعد گدھے میاں کو ایک ہمدرد ملا تھا جو اس سے اس کی خیریت پوچھ رہا تھا۔ گیدڑ کی چکنی چپڑی باتوں سے اس کا جی خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ "بھائی گیدڑ کیا بتاؤں۔ دھوبی کے ظلم سے عاجز ہوں۔ ایک تو وہ بہت سارا گٹھر میری پیٹھ پر لاد

دیتا ہے اور اس پر ستم یہ کہ اگر ایک قدم بھی ڈھیلا پڑتا ہے تو پھر ڈنڈے سے تواضع کی جاتی ہے۔ گھر پر بھوکا ہی مرتا ہوں۔ جب کبھی گھاٹ پر آتا ہوں تو تھوڑی دیر یہی مٹی ملی گھاس چر کر پیٹ بھرتا ہوں۔ میرا تو یہی روز کا حال ہے۔ دنیا میں کوئی میرا حال پوچھنے والا نہیں۔ خیر سے تمھیں کیسے میری خیریت پوچھنے کی فکر ہوئی۔"

گیدڑ بولا: "بھائی گدھے اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اگر جانور ہی جانور کے کام نہ آئے گا تو بھلا کون آئے گا۔ میں اِدھر سے گذر رہا تھا تمھاری حالت پر ترس آیا تو ذرا رک کر خیریت پوچھ لی۔ مگر تم یہاں پڑے کیوں ہو۔ پاس ہی جنگل میں ہری اور ملائم گھاس کا پورا میدان پڑا ہے۔ وہاں آرام سے رات دن گھاس چرنا۔ اس طرح تمھیں دھوبی کے ظلم سے چھٹی ملے گی۔ وہاں پڑے چین کی بانسری بجانا اور مجھے دعائیں دینا۔"

گدھے کو گیدڑ کی یہ بات پسند تو بہت آئی مگر جنگل کا نام سن کر اس کے دل میں خوف بھی پیدا ہوا۔ کہنے لگا۔ "بھائی گیدڑ ہم انسانوں کے بیچ رہنے والے جانور ہیں۔ انسان کے ظلم سہنے کی ہمیں عادت ہو گئی ہے۔ جنگل میں تو بھیانک اور خونخوار جانور رہتے ہیں۔ وہاں کوئی جانور مجھے مار کر نہ کھا جائے۔"

گیدڑ بولا: "نہیں بھائی ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس جنگل میں میری حکومت ہے۔ کیا مجال جو کوئی تمھارا بال بیکا کر سکے۔ تمھاری طرح نہ جانے کتنے گدھوں کو میں دھوبیوں کے ظلم سے نجات دلا چکا ہوں۔ چل کر دیکھ لو وہاں تمھیں کئی گدھے ملیں گے جو آرام سے بسر کر رہے ہیں ——— تم جانور ہو کر ایک جانور کی زبان کا کچھ تو اعتبار کرو۔"

گدھے میاں گیدڑ کی باتوں میں آگئے اور گیدڑ کے پیچھے پیچھے اس جگہ آگئے جہاں بھوکا شیر شکار کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ شیر ابھی اپنا پنجہ اٹھا ہی رہا تھا کہ گدھے میاں دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

گیدڑ اس پر بہت جھنجھلایا اور شیر سے کہنے لگا۔ کس دم خم پر ہاتھی سے لڑے تھے۔ میں تو محنت کر کے اتنی دور سے گدھا پکڑ کر لایا اور اس کا بھی تم سے شکار نہ کرتے بنا۔

شیر شرمندہ ہوا۔ مگر کہنے لگا۔ تم میرے پنجے کا حال جانتے ہو۔ بڑے بڑے ہاتھیوں کو میں نے اس سے پچھاڑا ہے۔ مگر اس بار میں ابھی شکار کے لیے تیار نہیں ہو پایا تھا۔ بھلا گدھے کی کیا مجال جو میرے پنجے سے نکل جائے۔

گیدڑ بولا: "اچھا خیر میں ایک بار اور کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ گدھے کو میں پھر لاؤں گا ——— مگر دیکھنا اس بار وار خالی نہ جائے۔"

گدھے کی تلاش میں گیدڑ پھر نکل پڑا۔ اس نے دیکھا کہ گدھے میاں پھر اسی تالاب کے کنارے گھاس چر رہے ہیں۔

گیدڑ کو دیکھ کر گدھا بولا "بھئی تم خوب
جل مجھے لے گئے تھے۔ ایک ذرا سا چوک جاتا تو میں
خاتمہ ہو جاتا۔ بھلا وہ کون سا جانور تھا جو مجھے دیکھ
کر اٹھ آیا تھا اور جس کے بھاری پنجے کا بوجھ اب
تک مجھے اپنی پیٹھ پر محسوس ہو رہا ہے"۔

گیدڑ نے ہنستے ہوئے کہا "انسانوں کے
بیچ رہتے ہوئے تم جانوروں کی زندگی اور اس کے
آداب بالکل بھول چکے ہو۔ تم جس سے ڈر کر بھاگ
آئے وہ بھی ایک گدھا ہی ہے۔ جنگل کی ہری ملایم
گھاس چر کر ذرا موٹا تگڑا ہو گیا ہے۔ اس نے تو دوستی
کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ مگر تم ٹھہرے بڑے شہری تمھیں
وحشیوں کی "زوردار محبت" کا پتہ نہیں ہے۔ چلو وہ
بے چارہ تم سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔
بہت دنوں سے اس کی تم جیسے کسی شہری گدھے
سے ملاقات نہیں ہوئی ہے"۔

گدھے میاں ٹھہرے بڑے گدھے۔ گیدڑ
کی باتوں میں پھر آگئے اور اس کے ساتھ پھر جنگل
کی راہ لی۔ وہاں پہنچتے ہی شیر اس پر لوٹ پڑا اور
اس کی تکا بوٹی کر کے رکھ دی۔ گدھے کو مار کر شیر
تالاب میں نہانے چلا گیا۔ اور اسے آنے میں ذرا دیر
ہو گئی۔ گیدڑ میاں وہاں رکھوالی کرنے لگے۔ وہ کئی
دن کے بھوکے تو تھے ہی۔ سامنے کھانا دیکھ کر ان
سے نہ رہا گیا۔ گیدڑ میاں نے ادھر ادھر دیکھ موقع
پاتے ہی گدھے کے کان اور دل گردے پر ہاتھ
صاف کر دیا۔

شیر جب واپس آیا تو اس نے دیکھا گدھے
کے کان ندارد ہیں۔ اور دل گردے بھی غائب ہیں۔
غصے میں آکر اس نے گیدڑ سے کہا۔ کم بخت تو نے
گدھے کا کان اور دل گردہ کھا کر میرا کھانا جوٹھا کیوں
کیا۔

گیدڑ بولا "مہاراج مجھ کو یہ الزام مت
دیجیے۔ بھلا اس گدھے کے پاس کان اور دل تھے ہی
کہاں۔ اگر کان اور دل ہوتے تو ایک بار یہاں سے بچ
نکلنے پر وہ بھلا دوبارہ واپس کیوں آتا۔

شیر کو گدھے کی بات پر یقین آگیا اور دونوں
نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

یہ کہانی سنانے کے بعد بندر نے مگرمچھ سے
کہا۔ کم بخت تو نے میرے ساتھ دغا کی تھی۔ وہ تو کہو
کہ شیخی بگھارنے میں سچ بات منہ سے نکل گئی۔ شیخی میں
سچ بات جس کے منہ سے نکل جاتی ہے اس کا وہی حشر
ہوتا ہے جو یدھشٹر کمہار کا ہوا تھا۔

مگرمچھ نے پوچھا وہ کمہار کی کہانی کیا ہے؟

تب بندر نے مگرمچھ کو کمہار اور راجہ کی یہ کہانی
سنائی۔

راجہ اور کمہار:۔ ایک گاؤں میں یدھشٹر
نام کا ایک کمہار رہتا تھا۔ مٹی کے برتن بنا کر اپنی گذر بسر

کرتا تھا۔ ایک دن کی بات کہ ایک ٹوٹے گھڑے سے ٹکرا کر وہ گر گیا اور گھڑے کا ایک نوکیلا ٹھیکرا اس کے ماتھے میں گھس گیا۔ کافی گہرا گھاؤ لگا تھا۔ خون بہنے لگا۔ مرہم پٹی کرنے سے وہ زخم تو کچھ دن میں ٹھیک ہو گیا۔ مگر ماتھے پر ایک مستقل نشان پڑ گیا۔

ایک بار گاؤں میں سخت کال پڑا۔ جب لوگ گاؤں چھوڑ کر جانے لگے تو یہ یدھ شٹر بھی وہاں سے نکلا۔ دوسرے دیش میں آکر اس نے راجہ کے یہاں ملازمت کر لی۔ راجہ نے ایک دن جب کمہار کے ماتھے پر زخم کا گہرا نشان دیکھا تو وہ سمجھا کہ یہ کوئی بہادر شخص ہے جسے لڑائی میں دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اتنا گہرا زخم لگا ہوگا۔ راجہ نے کمہار کو فوج میں ایک اعلیٰ افسر بنا دیا۔ راجہ کا لڑکا اور سپہ سالار یدھ شٹر کی اس ترقی پر جلتے تھے لیکن راجہ کے ڈر سے وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔

کچھ دن بعد راجہ کی فوج کو ایک مہم پر روانہ ہونا پڑا۔ لڑائی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہاتھی پر جھول اور ہودے کسے جا رہے تھے۔ گھوڑوں پر زین کسی جا رہی تھی اور فوجی بگل لوگوں کو لڑائی کے میدان کی طرف چلنے کے لیے تیاریاں کرنے کا اعلان کر رہا تھا۔ اس وقت راجہ نے کہیں یدھ شٹر سے یہ دریافت کر لیا کہ تمھاری پیشانی پر زخم کا نشان کیسا ہے۔ بھلا کس جنگ میں تمھارے یہ چوٹ لگی تھی۔

کمہار نے سوچا کہ اب راجہ اور اس میں اتنی بے تکلفی پیدا ہو چکی ہے کہ راجہ کو اگر اس حقیقت کا پتہ لگ بھی جائے تب بھی وہ اس پر اسی طرح کی مہربانی کرے گا۔ کمہار نے شیخی میں آکر راجہ سے سچ بات بتا دی کہ یہ کسی ہتھیار کا زخم نہیں ہے اور میں تو ایک کمہار ہوں۔ ایک دن شراب کے نشے میں جب میں گھر سے باہر جا رہا تھا تو میں گھر میں بکھرے ہوئے گھڑوں کے ٹھیکروں سے ٹکرا کر گر گیا اور ایک نوکیلا ٹھیکرا میرے ماتھے میں دھنس گیا۔ یہ نشان اسی کا ہے۔

راجہ یہ بات سن کر بہت شرمندہ ہوا اور طیش میں آکر بولا۔ تو نے دھوکا دے کر اتنا بڑا عہدہ حاصل کیا ہے۔ تو ابھی میری سلطنت سے باہر چلا جا۔ کمہار نے بہت منت سماجت کی مگر سب بے سود۔ راجہ نے اس کی کسی بات پر کان نہ دھرا اور کہنے لگا کہ تمھاری حالت تو اس گیدڑ کی طرح ہے جو شیروں کے بچوں میں پل کر بھی ہاتھی سے لڑائی کے لیے تیار نہیں ہوا تھا۔

یدھ شٹر کمہار نے پوچھا وہ کیسے۔

تب راجہ نے کمہار کو شیر اور گیدڑ کی یہ کہانی سنائی۔

(باقی آیندہ)

جناب [illegible] ام۔اے

بچوں کا کردار

(بڑے پیامیوں کے لیے)

دیکھو بہاریں گلشن کلیاں، غنچے، پھول
ہمک رہی ہے ڈالی ڈالی فرش بنا ہے مخمل
رنگ برنگی چمک رہی ہے دھرتی کی پوشاک
پھیلا ہوا ہے ایک اجالا سرخ ہوا ہے آنچل

بل کھاتی لہراتی ندیاں اونچے نیچے قصبے
شوق کے باعث جھلک رہا ہے لبوں پہ ایک تبسم
قدم قدم پر دیپ جلے ہیں ڈگر ڈگر ہے روشن
کھیل رہے ہیں ننھے منے خوشی سے مل کر باہم

رنگ و نسل کا فرق نہیں کچھ گورے ہیں کچھ کالے
ذہن ہیں خالی بغض و حسد سے نہیں کسی سے بیر
مشرق کا ہو یا مغرب کا ان کو سب سے پیار
ان کی نظر میں سارے جہاں میں کوئی نہیں ہے غیر

درسِ محبت دیتے ہیں ہر گام پہ یہ معصوم
ان کی قدریں یک جہتی کی ایک ہے زندہ مثال
ہنستے ہیں تو پھول نچھاور ٹھنک پڑیں تو پیار
بچوں کا کردار ہے سچ مچ امن کی پیاری ڈھال

جناب نادم عثمانی

حاسد راجہ کا انجام

(تھائی لینڈ کی ایک لوک کہانی)

بہت دنوں کی بات ہے تھائی لینڈ کے علاقے میں ایک راجہ حکومت کرتا تھا۔ یہ راجہ بہت ظالم حاسد اور نا عاقبت اندیش تھا۔ مگر وہاں کی جنتا بہت خوش اخلاق اور شریف تھی۔

ایک دن راجہ اپنے محل میں بیٹھا تھا۔ اس وقت پڑوس کے ایک دوسرے راجہ کی سوجھ بوجھ شرافت اور اس کے ملک کی سرسبزی و شادابی اور ترقی کا ذکر چھڑا ہوا تھا۔

راجہ اپنے پڑوسی راجہ اور اُس کے ملک کی تعریف سن کر جل گیا۔ اس نے اپنے وزیر سے کہا۔

"میری ایک خواہش ہے، اس خواہش کا پورا ہونا ضروری ہے"

وزیر نہایت ہی شریف اور سمجھ دار تھا وہ اپنے راجہ کی نا عاقبت اندیشی اور نادانی سے بخوبی واقف تھا اس نے پوچھا۔

"سرکار وہ خواہش کیا ہے جس کا پورا ہونا ضروری ہے"

راجہ نے کہا: "میری دلی آرزو اور تمنا ہے کہ اپنے پڑوسی راجہ کا سر ایک تھال میں رکھا ہوا اپنے سامنے دیکھوں"

وزیر چونکہ ہوشیار اور عاقبت اندیش تھا۔ اس لیے اس نے کہا:۔

"سرکار! میری رائے میں ایسی تمنا ایسی خواہش مناسب نہیں ہے۔ آپ کے اور اس پڑوسی راجہ کے درمیان کسی قسم کا جھگڑا اور اختلاف نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ایسے خیال کا دل میں جگہ دینا ٹھیک نہیں ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اس خیال کو دل سے نکال دیں بلکہ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ کسی اور کے سامنے ہرگز ظاہر نہ کریں"

راجہ وزیر کی یہ نصیحت سن کر لال پیلا ہو گیا۔ وزیر کی بات بالکل نہ مانی اور اپنے اس خیال کا اظہار اپنے فوجی افسروں دربار کے دوسرے لوگوں سے کر دیا۔

یہ خبر ہوا کی طرح پوری حکومت میں پھیل گئی۔ ہوتے ہوتے پڑوسی راجہ کے کانوں میں بھی اس

[illegible]

کی [illegible]

[illegible] کا راجہ عقل مند سن رسیدہ اور تجربہ کار تھا۔ اس نے اپنے وزیر کو فوراً بلا کر تھائی لینڈ کے راجہ کے ارادے سے باخبر کیا اور کہا:۔

"اس حاسد ناعاقبت اندیش راجہ نے جو ارادہ کیا ہے کامیاب ہو گیا تو ہمارے ملک کی عزت و شہرت میں بٹہ لگے گا۔ اس حاسد کی تمنا خاک میں ملانے کے لیے کوئی تدبیر ضروری ہے۔ ساتھ ہی وزیر سے تاکید کہ میرے اور تیرے سوا کسی کو اس بات چیت کا علم نہ ہونے پائے۔"

راجہ نے حکم دیا کہ "ایک ہزار جہاز تیار کیے جائیں اور ہر جہاز کو ضروری ہتھیاروں سے مسلح کیا جائے۔"

اور پھر راجہ نے اپنے ملک میں اعلان کر دیا کہ راجہ اپنے دیس کے جزیروں میں تفریح کے لیے جانے والا ہے۔ جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تو راجہ ہزار جہاز اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ تھائی لینڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھائی لینڈ کے راجہ کو اپنے پڑوسی راجہ کے آدھمکنے کا علم اس وقت ہوا جب وہ تھائی لینڈ کی حد میں قدم رکھ چکا تھا۔ آنے والے راجہ نے اپنی فوجیں تھائی لینڈ میں اتار دیں۔ ان فوجوں نے تھائی لینڈ کے راجہ کو گرفتار کر لیا اور محل پر قبضہ کر لیا۔ راجہ کے امیر وزیر اور درباری بھاگ کھڑے ہوئے۔ حملہ آور راجہ نے سبھوں کو امان دینے کا اعلان کر دیا۔ خود تھائی لینڈ کے تخت پر براجمان ہو گیا۔

اس کے بعد تھائی لینڈ کے راجہ کو اور اس کے وزیر کو راجہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ راجہ نے سوال کیا۔

"تم لوگوں نے ایسی تمناکیوں کی جس کا پورا ہونا تمہارے بس سے باہر تھا۔ اور اگر تم اپنی خواہش پوری کر بھی لیتے تو تم کو اس سے کوئی فائدہ نہ تھا۔"

تھائی لینڈ کے راجہ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

اس کے بعد نیک دل راجہ نے حکم دیا۔

"چونکہ اس ناعاقبت اندیش راجہ نے صرف میرا سر چاہا تھا۔ لہٰذا اس پاداش میں صرف اس کا سر کاٹ لیا جائے۔"

چنانچہ راجہ کا سر اتار لیا گیا اور اس کے ملک کی کسی چیز کو بھی ذرہ برابر بھی نقصان نہ پہنچایا گیا۔ پھر فاتح راجہ نے وزیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے سمجھ دار، عاقبت اندیش اور نیک دل وزیر! خدا تمھیں جزائے خیر دے۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ تم نے اپنے راجہ کو نیک مشورہ دیا تھا۔ لیکن اس نے اپنی نادانی اور جہالت سے تمہارے مشورے کو ٹھکرا دیا جس کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ اب میں تم کو پورا اختیار دیتا ہوں کہ تم جسے چاہو اپنا راجہ بناؤ۔"

"میں اپنے ملک کو واپس جا رہا ہوں۔ دیکھ لو تمہارے ملک کی تمام چیزیں جوں کی توں موجود ہیں۔"

یہ کہہ کر راجہ اپنے تمام سپاہیوں اور ساتھیوں سمیت اپنے

جناب سید اشرف جامعی

دماغی ورزش

آیئے آپ کو آج ایک دلچسپ کھیل سکھائیں۔ آپ اپنے ساتھیوں کو یہ کھیل دکھا کر حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔ آپ اپنے ساتھی سے کہیے کہ تم (خواہ کتنی بھی لمبی) تین رقمیں لکھو تو میں بغیر جوڑے فوراً اس کا ٹوٹل بتا سکتا ہوں۔

آپ کا ساتھی حیران ہو کر کہے گا "نہیں بھائی کیوں گپ ہانکتے ہو!"

اچھا تو آجاؤ میدان میں ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔

آپ کا دوست فوراً جیب سے قلم نکال کر کاغذ پر بڑی سے بڑی (جتنی بھی بڑی وہ رقم لکھ سکتا ہے) لکھنے لگے گا۔

مگر میری بھی ایک شرط ہے!

وہ کیا؟ آپ کا دوست فوراً پوچھے گا۔

وہ یہ کہ جب تم تین رقمیں لکھ لوگے تو ٹوٹل تو میں فوراً بتا دوں گا لیکن ان تین رقموں میں دو رقموں کا اضافہ میں بھی کروں گا۔

کوئی بات نہیں ــــ آپ کا دوست کچھ سوچ کر کہے گا۔ آپ دو کی بجائے تین رقمیں بھی لکھ لیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اچھی بات ہے تو پھر لکھو۔

آپ کا دوست آپ کو تین رقمیں لکھ کر دے گا۔ اب آپ کو اس کا ٹوٹل بتانا ہے۔ آپ یوں کریں کہ آپ کا دوست جو رقم لکھے اس میں سے تیسری رقم میں جو ہندسے ہوں ان میں اکائی میں سے ۲ کا ہندسہ گھٹا دیں اور یہ ۲ کا ہندسہ رقم کے آخر میں بائیں طرف لکھ دیں۔ جیسے آپ کے دوست نے تیسری رقم یہ لکھی ۲۶۵۴۳۱۲۔ آپ نے اکائی میں سے ۲ نکال کر یہ ۲ آخر میں لکھ دیے۔ اس طرح ٹوٹل ۲۲۶۵۴۳۱۰ یہ ہوا۔ اور یہ اس رقم کا ٹوٹل ہوتا ہے۔ آپ اپنے دوست سے کہہ سکتے ہیں کہ لو بھئی یہ ٹوٹل ہے۔ اب مجھے اپنی شرط پوری کرنے دو۔

آپ یوں کریں کہ ہر ہندسہ کے نیچے ایک ایسا ہندسہ لکھ دیں جس سے اس کا ٹوٹل ۹ ہو جائے۔

[illegible] نے یہ رقم لکھی۔

۹ ۴ ۶ [illegible]

۴ ۲ ۷ ۹ ۵ ۰ ۱

۲ ۶ ۵ ۴ ۳ ۱ ۲

آپ پہلی رقم میں ۶ کے ہندسے کے نیچے ۳، ۵ کے نیچے ۴، ۲ کے نیچے ۷، ۷ کے نیچے ۲، ۶ کے نیچے ۳، ۴ کے نیچے ۵ اور ۹ کے نیچے ۰ لکھ دیں اس طرح ہر ہندسہ ۹ ہو جائے گا۔

اسی طرح اپنے دوست کی دوسری رقم کے نیچے ۱ کے نیچے ۸، ۰ کے نیچے ۹، ۵ کے نیچے ۴، ۹ کے نیچے ۰، ۷ کے نیچے ۲، ۲ کے نیچے ۷، اور ۴ کے نیچے ۵ لکھ دیں۔ یعنی اس طرح۔

آپ کے دوست نے رقم لکھی۔ ۹ ۴ ۶ ۷ ۲ ۵ ۶

آپ نے اضافہ کیا۔ ۰ ۵ ۳ ۲ ۷ ۴ ۳

آپ کے دوست کی رقم ۴ ۲ ۷ ۹ ۵ ۰ ۱

آپ نے اضافہ کیا۔ ۵ ۷ ۲ ۰ ۴ ۹ ۸

آپ کے دوست کی رقم۔ ۲ ۶ ۵ ۴ ۳ ۱ ۲

اور آپ اس کا ٹوٹل پہلے ہی بتا چکے ہیں۔

یعنی ۲۲ ۶ ۵ ۴ ۳ ۱۰

اب آپ اپنے دوست سے کہیے کہ لو بھئی جوڑ کر دیکھ لو۔ ٹوٹل وہی ہوگا جو میں بتا چکا ہوں۔ آپ کا دوست جب جوڑ کر دیکھے گا تو بہت حیران ہوگا۔ کیونکہ آپ کا دعویٰ بالکل سچا تھا۔ ٹوٹل بالکل وہی ہے جو آپ عدد لکھنے سے پہلے بتا چکے ہیں۔ ہے نا حیرت کی بات۔

لیکن ایک گُر کی بات اور بتا دوں۔ آپ اس کھیل کو بار بار نہ دکھائیں۔ ورنہ آپ کا دوست آپ کی چالاکی تاڑ جائے گا۔!
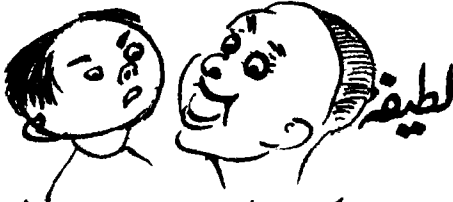
میں گرمیوں کی چھٹی میں دوسری بار گھر آیا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی شاہد نے ایک دم مجھ سے کہا کہ بھیا مجھے تیس تک کے پہاڑے یاد ہیں۔ میں نے اچنبھے سے کہا۔ ارے تمھیں تو کل تک گنتی بھی ٹھیک سے یاد نہیں تھی۔ پھر اتنے پہاڑے کیسے یاد کر لیے۔ اس نے کہا۔ آپ کو یقین نہیں تو سنیئے۔ میں نے کہا سناؤ۔ اس نے شروع کیا۔

۵ یکم پانچ ۵

۵ دونی دس ۱۰

۵ تیاں پندرہ ۱۵

۵ چوکے بیس ۲۰

۵ پنجے پچیس ۲۵

۵ چھکا تیس ۳۰

شاہ نواز خاں

بچوں کی کوششیں

لالچ کا نتیجہ

ایک مسافر تھا وہ سوچ رہا تھا میرے پاس اتنے سارے پیسے ہیں اگر میں کسی سرائے میں یہ رات کی رات کو گزار دوں تو خدشا ہے کہ کسی رہزن کسی چور یا کسی غنڈے کو شک ہو جائے اور وہ میرے پیچھے لگ جائے۔ پھر اتنے سارے پیسے جو میں نے بڑی محنت سے کمائے ہیں زور زبردستی چھین لے اور کہیں میری جان کا بھی دشمن نہ ہو جائے۔

وہ انھی سب خیالوں میں ڈوبا ہوا اسٹیشن کے باہر نکل آیا۔ اور ایک قہوے خانے میں پہنچا۔ قہوہ خانے کے مالک کو شریف اور ہمدرد سمجھ کر اس نے اپنا راز اس سے کہہ ڈالا اور کہا میرے بھائی اگر ممکن ہو تو رات گزارنے کی کوئی اطمینان بخش جگہ بتاؤ تاکہ میں وہاں رات گزار دوں۔ صبح سویرے کسی گاڑی سے میں اپنے گاؤں چلا جاؤں گا۔

مالک کے دل میں پیسے کا لالچ پیدا ہوا۔ اس نے موقع غنیمت جان کر ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں یہ میرا دالان ہے نہایت اطمینان بخش آپ میرے ساتھ چلیے میں بستر کیے دیتا ہوں۔ آپ وہاں اطمینان سے سویئے صبح چلے جایئے گا۔

مالک نے دکان بند کی اسے ساتھ لے کر دالان میں آیا۔ بستر کر کے سو جانے کی ہدایت کی۔ اور خود سونے کے لیے اندر گھر میں چلا گیا۔ اور پھر اپنی بیوی کو اس راز سے آگاہ کیا۔ اور کہا کہ تم چھرا نکال کر رکھو میں اس کے سو جانے کا انتظار کرتا ہوں اور پھر اس کا کام تمام کر دوں گا۔

ادھر یہ بے چارا مسافر کافی دیر تک لیٹا رہا۔ لیکن اسے نیند نہ آئی۔ اس نے سوچا اس طرح لیٹے رہنے سے فایدہ ہی کیا ہے۔ بہتر ہے کہ پلیٹ فارم ہی پر ٹہل لوں گا۔ اور وہ اٹھا اور اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

اتفاق ایسا کہ اسی رات مالک کا بیٹا بھی کہیں سفر سے آنے والا تھا جس وقت وہ اجنبی شخص اسٹیشن پر پہنچا ایک گاڑی آئی اور اسی گاڑی سے مالک کا بیٹا اترا۔ اور اپنے گھر کی طرف چلا۔ دالان میں آیا دیکھا کہ چارپائی پر بستر لگا ہوا ہے۔ اس نے سوچا اپنا ہی تو گھر ہے۔ ماں باپ سوتے

[illegible] ہیں۔ بہتر ہے کہ
[illegible] جاؤں گا۔ اور وہ اسی
[illegible] کر سو گیا۔ راستے کی
تھکاوٹ [illegible] میں مدہوش ہو گیا۔

اندر مالک نے اپنی بیوی سے کہا۔ بیگم اٹھو اور تم میرے پیچھے پیچھے چلو مجھے امید ہے کہ وہ مسافر سو گیا ہو گا۔ اب زیادہ دیر کرنا ٹھیک نہیں۔

وہ دونوں دالان میں آئے اپنے سوتے ہوئے لڑکے کو مسافر سمجھ کر دو ٹکڑے کر ڈالا۔ لیکن جب اس کی تلاشی لی تو دو چار روپیہ کے سوا کچھ اور نہ پایا۔ مالک نے اپنی بیوی سے کہا چراغ لے آؤ۔ اندھیرے میں صحیح پتہ نہیں چل رہا ہے۔ بیوی چراغ لائی مالک نے چراغ کی روشنی میں اسکا چہرہ غور سے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ یہ تو میرا بیٹا ہے۔ دونوں بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے لیکن اب کیا ہوتا ہے۔ لالچ نے دونوں کو یہ دن دکھایا۔

سید سجاد احمد دربھنگوی

ہمدردی:۔ ناصر بہت نیک لڑکا تھا۔ اس کے ابا کا انتقال ہوئے قریب ڈیڑھ سال ہوا تھا۔ اس کی امی محلے کے بچوں کو پڑھا کر گھر کا خرچ چلاتی تھیں۔ ناصر بہت ذہین اور سمجھ دار لڑکا تھا۔ ہر سال امتحان میں اول آنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ اب وہ ساتویں کلاس میں پہنچ چکا تھا۔ سالانہ امتحان قریب تھا اور گھر میں فیس کے لیے ایک پیسہ نہ تھا۔ اس کی امی اب بوڑھی ہو چکی تھیں۔ اس لیے پڑھائی کا سلسلہ لشتم پشتم چل رہا تھا۔ گھر کا سارا بوجھ ناصر کے اوپر تھا۔ آج جب اسے اسکول سے چھٹی ملی تو وہ سیدھا اپنے دوست نعیم کے گھر گیا اور بولا: "نعیم بھائی ایک کام ہے بولو کرو گے یا نہیں؟"

"کیوں نہیں کہو کیا بات ہے" نعیم بولا۔

"نعیم بھائی میرے پاس فیس کے لیے پیسے نہیں ہیں اگر تمھارے پاس ہوں تو دے دو پھر لوٹا دوں گا"

ناصر دھیمی آواز میں بولا۔ نعیم دوڑا ہوا اپنی ماں کے پاس گیا اور بولا "امی کچھ پیسے دے دیجیے۔ میرا دوست ناصر بے چارا بہت غریب ہے۔ اس کے پاس فیس کے لیے پیسے نہیں ہیں اگر آپ کے پاس ہوں تو دے دیجیے" نعیم کی امی اس کی اتنی اچھی باتیں سن کر جھٹ اپنے کمرے میں گئیں۔ بکس کھولا۔ اس میں سے انھوں نے دو روپے کے نوٹ نکالے اور دوڑی ہوئی نعیم کے پاس گئیں اور کہا "نعیم لو یہ ناصر کو دے دو" نعیم دوڑ کر ناصر کے پاس گیا اور کہا ناصر یہ لو۔

ناصر روپے پاکر بہت خوش ہوا۔ اس نے نعیم کا شکریہ ادا کیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر ناصر نے ایک ٹوکری لی اور پھل والے گودام میں پہنچ کر اس نے بارہ آنے کے پھل خریدے اور بازار میں بیٹھ کر نہایت ایمان داری سے فروخت کرنے لگا۔ اسی طرح اس نے چار پانچ روز تک پھل فروخت کیے۔ اب اس کے پاس پانچ روپے ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے اس نے نعیم کا قرض ادا کیا۔ اور دوسرے دن فیس بھی جمع کر دی۔

رشید احمد اعظمی

آزاد بارانوی - باراں۔

پیام تعلیم ماہ ستمبر اب میرے ہاتھوں میں آیا ہے۔ اب تک بچّوں کے مطالعے میں تھا ۔۔۔۔۔۔ اس بار تو خلائی سفروں اور چاند پر پہنچنے کی کوششوں پر آپ نے جتنا مواد اس چھوٹے سے پرچے میں جمع کر دیا ہے۔ وہ حقیقتاً کوزہ میں سمندر ہے۔ آپ کا مضمون تو اس سلسلہ میں اس قدر معلوماتی اور قابلِ قدر ہے کہ کیا کہوں۔ میں نے کسی رسالے اور اخبار میں اتنی معلومات یک جا نہیں دیکھیں۔ جتنی آپ نے ایک مضمون میں جمع کر دی ہیں۔

غلام حیدر صاحب، محمد امین صاحب اور جاوید اشرف صاحب کی کوششیں بھی قابلِ تحسین ہیں۔ ابھی پورا پرچہ نہیں پڑھ پایا ہوں۔

خلیق انجم اشرفی

ستمبر کے پیام تعلیم میں عزم انسانی کی بے مثال فتح پر ہمہ رنگ اور دلچسپ مضامین نظم و نثر پیش کر کے آپ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ پیام تعلیم واقعی پیام تعلیم ہے۔ یہ شمارہ ہر لحاظ سے بہت اچھا ہے تمام مضامین بے حد پسند آئے۔ جناب علقمہ شبلی کی نظم چھوٹے بچوں کو بہت پسند آئی۔ تایا جان اور آپ کا مضمون خاصے کی چیزیں ہیں۔

چاند کی فتح واقعی بڑی خوشی بڑی حسرت کی بات ہے۔ انسانی جدوجہد اور انتھک کوشش کی بڑی شاندار کامیابی ہے۔

جہانگیر احمد شمسی کلکتہ

آپ کا ستمبر ۶۹ء کا پیام تعلیم نظر نواز ہوا۔ وقت کے حساب سے آپ نے ٹائٹل بہت ہی خوبصورت اور معلوماتی دیا ہے۔ دیگر اسی سلسلے میں علقمہ شبلی کی نظم اور جناب تایا جان کا، جو کہ نہ جانے کیوں اب اپنے آپ کو تایا جان یوسف ناظم کہلوانا پسند نہیں کرتے، مضمون "ہم سب کیو میں کھڑے ہیں" بہت اچھا ہے۔

نیلم اور فرح کہانی اچھی ہے۔ مگر اس مضمون کی تصاویر سب بے کار، کیا کوئی نئے آرٹسٹ صاحب تشریف لائے ہیں۔ اور آپ کا مضمون "چاند کی مہم" واقعی تعریف کے لائق ہے۔ تسلسل اور معلومات اس مضمون کی خوبی ہے۔

واقعی یہ رسالہ اس وقت بالکل ایسا لگ رہا ہے کہ چاند سے شائع ہوا ہے۔ اب اگر آپ کا ارادہ "چاند نگر" سے کوئی رسالہ شائع کرنے کا ہو تو اس کا نام رکھیے گا "پیام چاند"۔

افضل ...

پیام تعلیم ملا۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی
دل باغ باغ ہو گیا۔ سرورق کی تصویر ایک یادگاری
تصویر ثابت ہوگی کیونکہ تصویر میں وہ پہلا شخص ہے
جس نے چاند پر پہلا قدم رکھا ہے۔ خیر پیام تعلیم پاتے
ہی ایک ایک کر کے تمام مضامین اور نظمیں پڑھ ڈالیں۔
آپ کا لکھا ہوا مضمون "چاند کی مہم" پڑھ کر ہماری
بہت سی معلومات بڑھی اور بہت سی غلط باتوں
کی تصحیح ہوئی۔ آپ ایسے اچھے مضمون لکھنے پر مبارک
باد قبول کریں۔ جناب دینا ناتھ گردھر کی "چند دلچسپ
جھلکیاں" کافی دلچسپ اور معلوماتی ہیں اور نظم میں
جناب کیفی احمد صدیقی کی نظم "مبارک باد" پسند آئی
ان کے لکھنے والوں کو مبارک باد قبول ہوں۔

بدر وفا جامعی شیدائی، سہسرامی

ستمبر کا پیام تعلیم نظر سے گزرا۔ واقعی آپ
نے اسے "چندا ماموں نمبر" نکال دیا۔ میری طرف
سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

"آدھی ملاقات" میں یہ پڑھ کر بے حد افسوس
ہوا کہ بہت سے ممبر اسے کمیونسٹ خیال کا پرچہ تصور
کرتے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے، بکواس ہے۔ یہ
پرچہ نہ تو مذہبی ہے اور نہ سیاسی۔ بلکہ یہ ایک
بچوں کا تعلیمی پرچہ ہے جو ہمیشہ بچوں کو علم کی روشنی
دکھاتا رہے گا۔

سید حمید حسن قمر

پیام تعلیم نظر نواز ہوا۔ نیلم اور فرخ، گھمنڈی
اونٹ، چاند کی مہم، پنچ تنتر کی کہانیاں بہت پسند آئیں۔

نیاز احمد میر سری نگر۔

اگست کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ٹائٹل دیکھ کر
دل باغ باغ ہو گیا۔ اس شمارے میں خاص طور پر
"چاند پر انسان کا پہلا قدم" "کھلونوں کی جنگ" "خرگوش"
"ڈاکٹر صاحب" "آسٹریلیا کے جانور" "عربی وقت" "ہوا میں
پانی اور پاس ہو جاؤ" "نظم" یہ سب بے حد پسند آئیں۔
یہ آپ کی دن رات محنت کا نتیجہ ہے جو کہ ہر ماہ
ہر شمارہ انوکھے انداز میں پیش ہوتا ہے۔

عبدالواحد کلیمی میل وشارم۔

"ذاکر صاحب" کا ہم نوا ہو گیا ہوں۔ بقول
حفیظ الدین صاحب، وہ کیمیا گر تھے تو واقعی ہماری
بدقسمتی ہے کہ ہم اس کیمیا گر کے فیض سے محروم ہو گئے۔
سید محمود نجمی صاحب نے ہمارے ذاکر صاحب کے استادانہ
اور شاگردانہ تعلق کو اجاگر کیا ہے وہ بھی قابلِ رشک
ہے۔ عبداللہ ولی بخش قادری نے "صدر انجمن کی
تلاش" میں مجھ جیسے کمزور کو بھی لگا دیا ہے۔ انھیں تو انجمن
نظر آتی ہے اور مجھے انجمن کا بھی کہیں پتہ نہ لگ سکا۔
مولانا مقبول احمد نے "موت کی روشنی" میں تاریخ کے
جن یادگار دو بزرگوں سے ہمارا تعارف کرایا اس کے
لیے بھی وہ قابلِ مبارک باد ہیں۔ بھوپالی کی ایک بات
کہنا تو برکت علی فراق ہی کا کام تھا۔ سعید انصاری نے

نام :- نیاز احمد میر عمر :- ۱۵ سال۔
مشغلے :- پیام تعلیم اور بچوں کے دوسرے رسالے پڑھنا
فٹ بال کھیلنا، آٹوگراف جمع کرنا، ڈاک کے
ٹکٹ جمع کرنا۔
پتہ :- ۲۳/۷ میر منزل جواہر نگر۔ سری نگر (کشمیر)

نام :- شمیم عالم عمر :- ۱۴ سال
مشغلے :- پیام تعلیم، الحسنات، نور، اور دوسرے
ادبی رسالے پڑھنا، ڈرائنگ بنانا۔
پتہ :- شری پور۔ ۳۔ ڈاک خانہ۔ شری پور۔
کالی پہاڑی۔ ضلع بردوان۔ (مغربی بنگال)

نام :- احسان المظفر عمر :- ۱۶ سال
مشغلے :- پیام تعلیم اور دوسرے رسالے پڑھنا۔
فٹ بال کھیلنا، قلمی دوستی کرنا۔
پتہ :- احسان المظفر۔ شاہی محلہ۔ ڈاک خانہ
اردل ضلع گیا (بہار)

نام :- عزیز احمد [illegible]
مشغلے :- کہانی لکھنا، کرکٹ [illegible]
بیڈمنٹن کھیلنا [illegible]
پتہ :- عزیز احمد عزیز۔ [illegible] اسکول
مرغا سانی آسنسول [illegible]

نام :- محمد رفعت اللہ رفیع ۔ عمر :- ۱۶ سال۔
مشغلے :- اچھی اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ رسالے
پڑھنا، قلمی دوستی کرنا۔
پتہ :- شاہد منزل ۱۴/۴/۴۷ منڈی بازار۔ ورنگل

نام :- محمد عظیم الدین فاروقی عمر :- ۱۶ سال
مشغلے :- افسانے لکھنا، کیرم کھیلنا، گیت، غزلیں
نظمیں سننا اور سنانا۔
پتہ :- محلہ قاضی پورہ، ڈاک خانہ، کلم نوری
ضلع پربھنی (مہاراشٹرا)

نام :- خالد رشید چکدر نوی ناشاد عمر :- ۱۶ سال
مشغلے :- کہانیاں، مضمون اور افسانے لکھنا، ادبی
پرچوں کا مطالعہ کرنا۔ قلمی دوستی کرنا
پتہ :- خالد رشید۔ کرڈا ہاؤس۔ عالم گنج۔
(پٹنہ)

دو ہزار برس پرانا سرنگ والا پیڑ گر گیا۔

کیلی فورنیا (امریکہ) کے نیشنل پارک میں ایک عجیب درخت تھا۔ بہت پرانا بہت ہی پرانا۔ لوگ تو کہتے ہیں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے بھی پہلے کا۔

امریکہ کے لوگوں کی اور دوسرے ملکوں کے سیاحوں کی نہ جانے کتنی پیڑھیاں اسے "سرنگ والے پیڑ" کے نام سے جانتی ہیں۔ لیکن اس کا اصلی نام تو "سی کویا" ہے۔ یہ نام ایک امریکن ریڈ انڈین سردار "سی کویاہ" کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس سردار نے لگ بھگ ڈیڑھ سو (١٨٢١ء) برس پہلے اپنی زبان کے لیے حروف تہجی ایجاد کیے تھے۔ اسی لیے اس کو یہ اعزاز بخشا گیا۔ اس عظیم الشان اور اپنی نوعیت کے غیر معمولی درخت کا نام اس کے نام پر رکھا گیا۔

یہ درخت کچھ زیادہ اونچا نہیں۔ کل ۱۰، فٹ اونچائی ہوگی۔ اسی نیشنل پارک میں اس سے بھی زیادہ اونچے پیڑ ہیں۔ ۳۰۰ فٹ تک اونچے۔ اس کی خصوصیت یہ تھا اور [illegible] اس کے تنے کی جڑ میں بہت بڑا سوراخ یا سرنگ ہے۔ ہے نا عجیب و غریب بات۔ غالباً تاریخی عہد سے پہلے اس جنگل میں آگ لگی ہوگی پیڑ تو جیسے تیسے بچ گیا مگر نیچے جڑ کی طرف آرپار سوراخ ہوگیا ——— ١٨٨١ء میں اس سوراخ کو بڑا کر دیا گیا۔ اب اس سوراخ کی چوڑائی تین میٹر اور لمبائی ۹ میٹر ہوگئی۔ اچھی خاصی سرنگ سی بن گئی۔ اتنی چوڑی کہ ایک بڑی سے بڑی موٹر آسانی سے گذر سکے۔ اب تم خود اندازہ لگاؤ۔ اس پیڑ کی گولائی کتنی ہوگی۔ اپنے دیس میں برگد کا پیڑ تم نے دیکھا ہوگا۔ بھلا کتنا موٹا ہوتا ہے اس کا تنا پہ امریکہ کے اس تاریخی پیڑ کے مقابلے میں بڑے سے بڑے موٹے سے موٹے پیڑ کی موٹائی کچھ بھی نہیں۔ جبھی تو اس نیشنل پارک کی سیر کرنے والا جب تک اس عجیب و غریب پیڑ کی زیارت نہ کرلے اپنی سیر کو ادھورا سمجھتا ہے۔ ان گنت لوگ اسی پیڑ کو دیکھنے اس جنگل میں آتے ہیں۔ مگر اب تو اس کا نام ہی نام رہ گیا۔ اس سال یہ زمین پر آرہا ——— یہ ہوا کیسے۔ کہتے ہیں اس سال اس علاقے میں برف باری بہت ہوئی۔ تقریباً

دو گئی ہوئی۔ یہ دو ہزار سال کا بوڑھا درخت برف کے
اس بوجھ کو سہار نہ سکا۔ اور زمین پر آ رہا۔ مگر اس پارک
میں کام کرنے والے ماہرین مطمئن نہیں ہیں۔ وہ اس کے
گرنے کے اسباب کی کھوج کر رہے ہیں۔ اس بات کی
کھوج بھی کر رہے ہیں کہ اس پارک یا جنگل میں درختوں
کے اس بادشاہ کی ٹھیک ٹھیک عمر کتنی تھی۔

امریکن رپورٹر

بہاردین غار:۔ ترکمانیہ میں لوگوں نے اِس
بہاردین غار کو قدرتی عجوبے کا نام دیا ہے۔ یہ غار
"کوپت داغ" پہاڑوں میں عاشق آباد سے ۱۰ کلومیٹر
کے فاصلے پر ہے۔

غار کی بڑی بڑی محرابیں بجلی سے روشن کی جاتی
ہیں۔ یہ روشنی مدھم ہوتی ہے۔ اُس کی سیڑھیاں نچلی طرف
جاتی ہیں۔ پھر آپ کو دھندلے میں دیواروں سے گھری
ہوئی ایک شفاف جھیل دکھائی دیتی ہے۔ یہ جھیل ۲۰۰ میٹر
لمبی اور ۲۰ میٹر سے زیادہ چوڑی ہے۔ کناروں کے قریب یہ
نسبتاً پایاب ہے لیکن کناروں سے دور ۱۴ سے ۱۶ فٹ
تک گہری ہے۔ اِس زیر زمین جھیل میں پانی ہمیشہ گرم رہتا
ہے۔ —— اس غار و جھیل کا پتہ پہلے پہل کوئی بیاسی
سال پہلے (۱۸۰۰ء میں) چلا تھا۔ لوگوں نے اس عجوبہ
کے متعلق دل چسپ قصے لکھے ہیں اور مریض یہاں نہانے
اور اپنی بیماریوں کا علاج کرنے کے لیے آتے رہتے ہیں۔

اس غار کی ایک خصوصیت اور بھی ہے۔ یہ
چمگادڑوں کی بستی ہے۔ یہاں تقریباً ۱۵ ہزار چمگادڑ
ہیں۔ یہ چمگادڑ عاشق [illegible]
پاس کے دیہات میں [illegible]
کو نقصان پہنچانے والے دوسرے کیڑوں کو تباہ کرتے
ہیں۔ ہر ہفتے سینکڑوں سیاح اس غار
کو دیکھنے آتے ہیں۔ وہ اس کے [illegible] منظر سے
لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور زمین کے نیچے کی اس
غیر معمولی جھیل کے گرم پانی میں نہا سکتے ہیں۔ (ماخوذ،
شعبۂ اطلاعات روسی سفارت خانہ دہلی)

مصنوعی پیروں والا پینگوئیں:۔

ہنوور (ڈاڈ) یہ پینگوئیں تین سال سے
وفاقی جمہوریۂ جرمنی کے شہر ہنوور کے چڑیا گھر میں گمنام
زندگی بسر کر رہا تھا۔ اچانک اس کے بائیں پاؤں کو
کوئی ایسا روگ لگا جو جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ چڑیا
گھر کے منتظموں نے اسے ہنوور میں اپاہج بچوں کے
مشہور و معروف شفاخانے میں پہنچا دیا۔ یہاں سرجنوں
نے معائنہ و تشخیص کے بعد آپریشن کے ذریعے۔ اسے
کاٹ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ جب زخم اچھا ہو گیا تو ڈاکٹروں
نے اس کے پیر کی ایک نقلی مصنوعی رال سے بنوا کر
چڑھا دی۔ کچھ دنوں کے بعد یہ بے چارہ چلنے پھرنے
اور تیرنے کا عادی ہو گیا۔ اور راتوں رات دنیا کے
اس سب سے پہلے مصنوعی ٹانگ والے پینگوئیں کی شہرت
سارے ملک میں پھیل گئی۔ اسے دیکھنے کے لیے روزانہ
سینکڑوں لوگ ہنوور کے چڑیا گھر پہنچا کرتے ہیں۔

پیام تعلیم

ریاست ہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں و کشمیر کے
تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۹ء جلد ۶

ایڈیٹر محمد حسین حسّان ندوی

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، بمبئی ۳

شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے سالانہ چندہ چھ روپے

فہرست

بچوں سے باتیں

اس مرتبہ عید الفطر دسمبر کے دوسرے ہفتے میں ہوگی۔ پیامِ تعلیم آپ کے پاس کبھی کا پہنچ چکا ہوگا۔ رمضان کے تیس روزوں کے بعد ہر روزہ دار اس عید کے موقع پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے روزے رکھنے کی اور عبادت کرنے کی توفیق دی۔ اسی لیے عید کا دن اس کے لیے سچ مچ بڑی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ ہم بھی اس خوشی میں آپ کے شریک ہیں، اور اپنے سب بھائیوں کو اور پیامِ تعلیم کے قدردان بزرگوں کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔

شاید آپ کو معلوم ہو مخدوم و محترم قبلہ ذاکر صاحب مرحوم جامعہ ملیہ کے امیر یا چانسلر تھے۔ ان کے انتقال سے امیر جامعہ کی جگہ خالی ہو گئی تھی۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس اہم عہدے کے لیے محترم جسٹس ہدایت اللہ صاحب چیف جسٹس سپریم کورٹ کو موزوں سمجھا گیا ہے۔ ہم اس سلسلے میں محترم ہدایت اللہ صاحب کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ جامعہ کے کارکنوں کو بھی مبارک باد دینا چاہیے کہ ایسی موزوں شخصیت کو اپنا امیر بنایا۔ ہمیشہ کی طرح اب کے بھی ۲۹ر اکتوبر کو جامعہ میں کانووکیشن یا سندیں تقسیم کرنے کا جلسہ بہت دھوم دھام سے منایا گیا۔ محترم امیر جامعہ چیف جسٹس ہدایت اللہ صاحب نے صدارت فرمائی اور کے پی۔ اس مینن صاحب نے کانووکیشن ایڈریس پڑھا۔ جامعہ کے مختلف کالجوں سے سندیں لینے والے طالب علموں کو اچھی اچھی نصیحتیں فرمائیں۔

جامعہ کے سب سے اچھے طالب علم کو نہرو انعام (مبلغ ایک ہزار روپیے) بھی اسی جلسے میں دیا جاتا ہے۔ اس سال اس انعام کی مستحق عزیزہ ریحانہ بیگم قرار پائیں۔ یہ جامعہ کے ثانوی مدرسے میں پڑھتی ہیں۔ ہم عزیزہ ریحانہ بیگم کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔ ثانوی کے استادوں کو بھی، ریحانہ کے والدین خصوصاً محمد عرفان نوری صاحب کو بھی جس گھر کا ماحول اچھا ہو بچے اسی طرح پروان چڑھتے ہیں۔ عزیزہ ریحانہ کی تصویر اور ان کا مختصر حال شاید ہم اگلے پرچے میں دے سکیں۔

اکتوبر ۱۹۷۰ء کو جامعہ کی عمر خیر سے ۵۰ سال کی ہو جائے گی۔ ۱۹۴۶ء میں جامعہ نے اپنا جشنِ سیمیں بہت شان و شوکت بہت اہتمام سے منایا تھا۔ یہ جشن، جشنِ زریں ہوگا۔ پہلے سے بھی کہیں زیادہ اہتمام سے منایا جائے گا۔ تیاریاں ابھی سے شروع ہو گئی ہیں۔ جامعہ کے طالب علم دیس کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ سب بھائی اس تیاری میں ہاتھ بٹائیں گے۔

اس خیال سے کہ جشنِ زریں کی تیاریوں میں ڈھیل نہ پیدا ہو اس سال تعلیمی میلا بھی نہیں منایا گیا۔ لیکن مدرسہ ثانوی کے پرنسپل جناب عبد الحق خاں صاحب نے گاندھی ٹرافی کے مقابلوں کو ملتوی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کئی دن تک ان مقابلوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخری دن ۱۴ر نومبر ۶۹ء کو بڑی دھوم دھام رہی۔ اس دن آخری مقابلے تھے۔ انعام بھی اسی موقع پر تقسیم کیے گئے۔ ہم اس تقریب کی کامیابی پر عبد الحق صاحب اور ان کے ساتھیوں کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔ ان مقابلوں کی دلچسپ تفصیل اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

یہ پرچہ سال کا آخری پرچہ ہے۔ اگلا پرچہ سالنامہ ہوگا۔ اس سال آپ کے سالنامے کے علاوہ ذاکر حسین یادگار نمبر، جام نمبر غیر معمولی طور پر پسند کیے گئے۔ عام پرچوں کو بھی آپ نے بچوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے بزرگوں نے قدر کی

قدردانوں نے بہت سراہا۔ ہم ان سب کے شکر گزار ہیں۔ ہمارے راستے میں مالی مشکلیں نہ ہوں تو ہم آپ کے پیام تعلیم کو بہت آگے ۔ بہت آگے لے جانے کا حوصلہ اور امنگ رکھتے ہیں۔ اور ان مشکلوں کو دور کرنا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جی ہاں۔ صرف آپ کے ہاتھ میں۔

اس سال حضرت بابا گورونانک کی پیدائش کا پانچ سوواں سال منایا جا رہا ہے۔ حضرت بابا صاحب پنجاب میں پیدا ہوئے تھے مگر ان کی بتائی ہوئی اچھی اور سچی باتیں ساری دنیا کے لیے تھیں۔ اس پرچے میں ان پر مجاہد حسین زیدی صاحب کا مضمون پڑھیے۔ ایک مضمون اور ایک نظم گاندھی جی پر پڑھیے۔ اور ایک مضمون ذاکر صاحب پر بھی۔ مقصد یہ ہے کہ ان بزرگوں کی یاد تازہ رہے اور ان کی بتائی ہوئی اچھی اچھی باتیں کانوں میں پڑتی رہیں۔

لکھنؤ میں میر تقی میر کی یادگار میں ایک اکادمی قائم ہے۔ یہ اپنی علمی ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ایک کام اور بھی کرتی ہے۔ یو.پی کے مصنفوں کی، شاعروں کی، ادیبوں کی انعام اور وظیفے کی شکل میں حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اس سال اکادمی نے ہمارے محترم شاعر اور مضمون نگار جناب حرمت الاکرام صاحب کی خدمت میں بھی ۲۵۰ روپے کا وظیفہ پیش کیا ہے۔ محترم حرمت الاکرام صاحب مبارک باد قبول فرمائیں کہ ان کی ادبی خدمت قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی۔ سالنامے میں ان کی ایک بڑی اچھی نظم پڑھیے گا۔

سالنامے کی تیاری کا سلسلہ جاری ہے۔ بہت سے مضمون آچکے ہیں، بہت سی نظمیں آچکی ہیں۔ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ دعا کیجیے کہ ہم آپ کی خواہشوں اور امنگوں کے مطابق اسے نکال سکیں، وقت پر نکال سکیں۔

اور ہاں دیکھیے۔ رجسٹری کے ۵۰ پیسے فوراً بھیج دیجیے تاکہ سالنامہ یقینی طور پر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ راستے میں غائب نہ ہو جائے۔

اس مرتبہ محترمہ ہیڈ مسٹریس عبدالسلام مسلم گرلس انٹر کالج مراد آباد نے سالانہ چھ پرچوں کی خریداری منظور فرمائی ہے۔ انجمن ہائی اسکول روہن (دھاروار) سکریٹری سوراج سبھا پرائمری اسکول لٹواں (رتناگری)، لیڈی ہوابائی گرلس ہائی اسکول بمبئی۔ اردو بوائز اسکول رام درگ (بلگام)، بزم اطفال لائبریری پیرار نے ایک ایک سال کی خریداری منظور کی ہے۔ محترمہ انور جہاں صدیقی نے پچھلے سال کی طرح اس مرتبہ بھی پانچ خریدار مرحمت فرمائے ہیں۔ ان کے علاوہ نسیم صاحب شولاپوری، مارشل طارق عظیم نگینہ، محترمہ عبداللہ شرقی مدراس، عزیزہ منور غفار جامعہ نگر۔ مس غزالہ بیگم الہ آباد، شاہد فیروز آباد، جناب جبار حیدر الہ آباد، ابوالبرکات صاحب فیض آباد، مس شہناز فاطمہ نے خود خریداری قبول فرمائی ہے۔

آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ آپ کے پرچے کے قدردانوں کی تعداد کچھ نہ کچھ بڑھ رہی ہے۔ پر یہی رفتار بہت دھیمی ہے۔ بہت سست! ہم ان صفحوں میں آپ کی توجہ برابر اس طرف دلاتے رہتے ہیں۔ اب اپنی کوششوں کو ذرا اور تیز کر دیجیے۔ عید کے اس مبارک تہوار اور نئے سال کی خوشی میں ہمارے لیے یہی آپ کا بہترین تحفہ ہوگا۔

ضروری بات

اگلا پرچہ سالنامہ ہوگا۔

جناب محمد عبداللہ شرقی

یتیم بچّے کی عید

وہ دیکھو فلک پر نیا چاند آیا
وہ دیکھو نظر عید کا چاند آیا

وہ دیکھو، بڑی عید آئی ہماری
دلوں میں تھی جس کے لیے بے قراری

وہ بچّوں کے دل کھل گئے ہیں خوشی سے
وہ ہیں منتظر صبح کے شام ہی سے

بھلا پوچھنا کیا ہے ان کی خوشی کا
نیا رنگ ہے ہر مکاں، ہر گلی کا

گلی میں ہیں کچھ مال داروں کے بچے
ہیں ساتھ ان کے غربت کے ماروں کے بچے

نہیں فرق آپس میں کرتے ذرا وہ
نہیں جانتے کچھ خوشی کے سوا وہ

ہے ان کا بھی کیا بادشاہی زمانہ
نہ آفت اٹھائی، نہ دکھ درد جانا

مگر کیا بھروسا جہاں کی خوشی کا ـ نہیں غم سے خالی کبھی دل کسی کا
کٹی رات ساری، ہوا اب جو تڑکا ـ اٹھا اپنے بستر سے جھٹ ایک لڑکا
گیا ماں کے نزدیک اور اس سے پوچھا ـ "بتاؤ کب آئیں گے گھر میرے ابّا
کروں انتظار آخر ابّا کا کب تک ـ نئے کپڑے میرے نہیں آئے اب تک

میرے حق میں یہ عید آئی ہے کیسی
نہ کپڑے نئے ہیں، نہ جوتا، نہ ٹوپی"

یہ سنتے ہی دل ماں کا غم سے بھر آیا ـ کلیجے سے بیٹے کو اپنے لگایا
کہا اس سے "جلدی تمھیں کیا ہے بیٹا ـ نہایت ہی معصوم دل ہے تمھارا
بہت دن ہوئے جب کہ ابّا تمھارے ـ ہمیں چھوڑ کر اس جہاں سے سدھارے
مگر کس لیے تم ہو غمگین بیٹا ؟ ـ کہ ماموں تمھارے تمھیں دیں گے جوڑا
نہا لو ذرا چل کے رکھّا ہے پانی ـ وہ دیکھو، چچا جان لائے ہیں ٹوپی
وہ لو، ماموں ابّا چلے آ رہے ہیں ـ وہ جوڑا تمھارے لیے لا رہے ہیں
بڑے زور کی ہو گئی عید اب تو ـ کرو دُور غم کو، ہنسو اور بولو
ابھی تم تھے غمگیں، ہوئے اب تو شاداں ـ کیا پَل کے پَل میں خدا نے یہ احساں

بھلا اس کی قدرت کو کیا کوئی جانے
نہیں ہے وہ ایسی سمجھ میں جو آئے

جناب مجاہد حسین زیدی

گرونانک

بابا نانک سکھوں کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے گرو اب سے کوئی پانچ سو سال پہلے ۱۴۶۹ء لاہور کے قریب ایک گاؤں تلونڈی میں پیدا ہوئے۔ ان کے پتا کا نام کالو تھا۔ وہ ذات کے بیدی کشمیری تھے اور گاؤں میں ایک چھوٹی سی دکان کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ پٹواری تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا بڑا ہو کر ایک بیوپاری بنے۔ اسی لیے انھوں نے نانک کو اپنے ایک ہمسائے سید حسن سے فارسی پڑھنے اور ایک پاٹ شالہ میں ہندی اور گورمکھی سیکھنے کے لیے بھیجا مگر بابا نانک جی پاٹ شالہ میں نہ لگتا تھا۔ ان کو بچپن سے فقیروں اور سادھوؤں سے بہت دلچسپی تھی۔ تلونڈی کے پاس گھنے جنگلوں میں اکثر سادھو اور فقیر آکر ٹھہرتے تھے۔ بابا نانک سب کام کاج چھوڑ کر ان کے پاس بیٹھے رہتے اور ان سے باتیں کرتے رہتے۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو باپ نے سوچا کہ وہ ان کا ہاتھ بٹائیں اور کوئی کام دھندا شروع کریں۔ پہلے مویشی چرانے کے لیے بھیجا لیکن وہ جانوروں کی دیکھ بھال کرنے کی بجائے سادھوؤں کے پاس جا بیٹھتے۔ بارہ برس کے تھے کہ انھوں نے باپ کے حکم سے کھیتی باڑی کا کام شروع کیا۔ لیکن جب بھی موقع ملتا ہل اور بیلوں کو چھوڑ کر چل دیتے۔ اس کے بعد بابا نانک کو دکان پر بٹھا دیا گیا۔ مگر وہاں بھی ان کا جی نہ لگا۔ آخر چودہ سال کی عمر میں ان کی شادی بٹالہ ضلع گورداسپور کے رہنے والے مولا کی بیٹی سکھانی بی بی سے کر دی گئی۔ ان سے دو لڑکے بھی پیدا ہوئے لیکن بیوی بچوں کی وجہ سے بھی بابا نانک کی طبیعت میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اب بھی دنیا سے اتنے ہی بے پروا اور پہلے کی طرح فقیروں کے دوست بنے رہے۔

بابا نانک کی ایک بہن تھیں۔ نانکی جی۔ ان کے پتی جے رام پنجاب کے حاکم دولت خاں لودھی

کے یہاں ملازم تھے۔ بابانانک کے پتانے لوگوں کے صلاح مشورہ سے انھیں اپنے بہنوئی کے یہاں سلطان پور بھیج دیا۔ جے رام کے کہنے پر دولت خان نے باباناک کو بھی توشہ خانہ کے حساب کتاب کے لیے ملازم رکھ لیا۔ باباناک کو جو تنخواہ ملتی اس میں سے تھوڑا سا رکھ کر باقی سب غریبوں کو بانٹ دیتے اور رات رات بھر خدا کی یاد کیا کرتے۔ ایک دن نہ جانے ان کے جی میں کیا بات سمائی کہ صبح سویرے ندی پر نہانے گئے اور ایسا غوطہ لگایا کہ کہیں پتہ نہ لگا۔ لوگ سمجھے کہ بابانانک ڈوب گئے مگر تین دن کے بعد گھوم پھر کے وہ پھر سلطان پور آگئے۔ واپس آکر انھوں نے اپنی ساری پونجی خدا کی راہ میں بانٹ دی اور کہتے ہیں کہ توشہ خانہ سے بھی بہت سی چیزیں خیرات کر دیں۔ لیکن جب خان نے اس کا حساب مانگا تو پائی پائی ٹھیک نکلی۔

اب بابانانک نے تلونڈی گاؤں کے رہنے والے مردانہ ڈوم کو ساتھ لے کر جنگل کی راہ لی۔ مردانہ رباب بہت اچھا بجاتا تھا۔ اس کے ساتھ پنجاب کا دورہ کر ڈالا۔ اس کے بعد دکھن میں لنکا تک، پورب میں کامروپ اور پوری تک اور پچھم میں ایران اور عرب تک کا دورہ کیا۔ راستے میں وہ فقیروں سے ملتے باتیں کرتے اور خدا کو ڈھونڈنے کی نئی راہیں سیکھتے اور سکھاتے جاتے تھے۔ کہتے ہیں جب وہ مکہ پہنچے تو کعبہ کی طرف پاؤں کر کے لیٹ گئے۔ لوگوں نے ٹوکا کہ خدا کے گھر کی طرف پاؤں مت کرو۔ تو جواب دیا۔ بھائی میرے پاؤں اس طرف کر دو جدھر خدا نہ ہو۔

واپسی پر جب بابانانک پنجاب واپس پہنچے تو بابر کی فوج کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ لیکن جیسے ہی بادشاہ کو ان کی بڑائی کا پتہ لگا تو اس نے عزت کے ساتھ انہیں چھوڑ دیا۔ یہاں سے بابانانک ڈیرہ غازی خاں میں متھصن کوٹ کے مقام پر مٹھا شاہ کے پاس سے ہوتے ہوئے کرتارپور آئے اور سادھوؤں کے کپڑے اتار کر معمولی کپڑے پہنے اور لوگوں کو ہدایت دینے لگے۔

گرونانک کی تعلیم بہت سادہ اور دل میں اتر جانے والی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ پیدا کرنے والا ایک ہے اور اس کی نظر میں سب برابر ہیں، اس نے ہر ایک کے دل میں اپنا نور پیدا کیا ہے۔ نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان۔ خدا سے ملنے کا طریقہ صرف اس کا دھیان ہے۔ دکھاوے کی باتیں اور دکھاوے کی عبادت سب بے کار ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ دنیا کے دھندے میں رہ کر بھی اپنے من کو صاف رکھے یہی سچا دھرم ہے اور یہ سچا دھرم صرف گرو کے کہنے پر چلنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

۱۵۳۹ء میں بابانانک نے وفات پائی۔

جب باباجی کی موت کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے ایک چیلے لہنا کو انگد کا خطاب دے کر اپنا

قایم مقام بنایا اور اس دنیا کو چھوڑنے کی تیاری شروع کر دی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑا تھا کہ مرنے کے بعد جلایا جائے یا دفن کیا جائے۔ بابا نانک نے حکم دیا کہ مرنے کے بعد دائیں طرف ہندو پھول رکھ دیں اور بائیں طرف مسلمان۔ اگلے روز جس کے پھول ہرے بھرے ہوں وہ اپنے من کی بات پوری کرے۔ اس کے بعد خدا کی تعریف کی اور جب بھجن گائے جا رہے تھے۔ باباجی ہمیشہ کے لیے میٹھی نیند سو گئے۔ کہتے ہیں اگلے دن جب چادر اٹھائی تو دونوں طرف کے پھول ہرے بھرے تھے لیکن جسم غائب تھا۔ سچ یہ ہے کہ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو برابر سمجھتے تھے اور دونوں ان کو بہت چاہتے تھے۔

گرو نانک جی نے ہندوستان میں خدا کے ایک ہونے کی تعلیم کو پھیلایا اور سب انسانوں کو پریم اور میل جول کا سبق پڑھایا۔ ان کے اس بہت بڑے اور نیک کام کا اثر یہ ہے کہ ہندوستان کی سب قومیں ان کو محبت اور عظمت سے یاد کرتی ہیں۔ بابا نانک نے اپنی تعلیم کے ماننے والے کو سکھ کا لقب دیا تھا یعنی سیکھنے والا یا شاگرد۔ اس لیے گرو نانک کے ماننے والے سکھ کہلاتے ہیں۔ وہ کتاب جس میں بابا نانک کے قول اور ان کی تعلیم لکھی ہوئی ہے۔ گرنتھ صاحب کہلاتی ہے اور یہ سکھوں کے مشہور گردوارے دربار صاحب امرتسر میں موجود ہے۔

حضرت بابا نانک کے میٹھے اور سچے قول

(۱) اے خدا تو غریبوں کی دولت ہے۔ جن کا کوئی گرو نہیں ہے۔ ان کا تو گرو ہے۔ جن کی کوئی عزت نہیں ہے۔ ان کی تو عزت ہے جن کی کوئی طاقت نہیں ہے۔ ان کی تو طاقت ہے۔ اے گوہر تابدار، اے میرے خدا تو اندھوں کے لیے روشنی ہے۔

(۲) آدم خور پانچ بار نماز ادا کرتے ہیں اور جو چھری لہراتے ہیں جنیو پہنتے ہیں۔ ان کے ماتھے پر کیسر کا ٹیکہ ہوتا ہے۔ ان کے کولھوں پر بے سلی لنگوٹی ہوتی ہے۔ لیکن ان کے ہاتھ میں چھری ہوتی ہے یہ لوگ دنیا کا گلا کاٹنے والے ہوتے ہیں۔

(۳) ہم سالوں تک بڑی بڑی وزنی اور مقدس (پاک) کتابیں پڑھتے رہتے ہیں اور زندگی بھر پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمارا خدا صرف ایک ہی چیز کو توجہ کے قابل سمجھتا ہے اور وہ ہے ہمارا دل، باقی سب بے کار اور بے سود باتیں ہیں۔

(۴) وہ مقدس (پاک اور متبرک) کتابیں پڑھتے ہیں اور پھر لڑتے ہیں۔ وہ زر و مال (سونے چاندی اور مال و دولت) اور پتھروں کی پوجا کرتے ہیں اور پھر بگلوں کی طرح جھوٹی سرمستی میں مگن ہو جاتے ہیں ان کا سارا جسم پارسائی (پرہیزگاری) سے آراستہ ہوتا ہے مگر ان کے منھ میں جھوٹ ہوتا ہے۔

جناب سعادت نظیر
صبح
رات جہاں میں اور سماں تھا
چھایا تھا ہر سمت اندھیرا
نیچے جگنو، اوپر تارے
کیسے اچھے! کیسے پیارے!
صبح گگن پر سورج ابھرا
پھیل گیا ہر سمت اُجالا
اور ہوئی ہے دنیا روشن
پورب، پچھم، اُتر، دکھن
نیلے، پیلے، بھورے، اودے
رنگ برنگ کے ہر سُو پودے
ہر ڈالی پر چڑیاں چہکیں
ہر کیاری میں کلیاں مہکیں
پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں
اور پھلوں سے پیڑ لدے ہیں

جناب احسان الحق

سدا بہار مہاتما

دہلی گیٹ سے سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ جائیے۔ ایک صاف ستھری سڑک آپ کو گاندھی سمادھی کی طرف لے جائے گی۔ لیکن سمادھی تک پہنچنے سے پہلے آپ کو ہرے بھرے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آئے گا۔ کچھ پودے ایسے ہوتے ہیں جو سدا ہرے بھرے رہتے ہیں۔ پھل پھول دیتے رہتے ہیں۔ یہ جھنڈ ایسے ہی پودوں کا ہے۔ اور اس کے پیچھے ایک خوب صورت سی دو منزلہ عمارت ہے جس میں ایک سدا بہار مہاتما نے ڈیرا لگا رکھا ہے۔ بہت دن ہوئے۔ تمہارے جنم لینے سے پہلے۔ یہ مہاتما ایک پرارتھنا کے جلسے سے اس طرح رخصت ہوا تھا کہ پھر کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ لیکن وہ اتنے بہت سے اصول سلیقے سے جینے کے اتنے بہت سے گُر، اور پریم کا ایک ایسا چراغ اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے جس کی لَو، اندھیرے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے چمکتی جاتی ہے۔

تو اس دو منزلہ عمارت میں موہن داس کرم چند گاندھی کی زندگی کی ساری کہانی تصویروں، ان کے خطوں اور ان کی چیزوں کے ذریعہ دکھائی گئی ہے۔ یہ گاندھی میوزیم ہے۔ جہاں ہر تصویر کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ جہاں ہر خط کے پیچھے بھارت کی تاریخ ہے۔ جہاں اس درویش کی اچھی اور سچی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جسے کچھ لوگ گاندھی جی کہتے تھے۔ کچھ مہاتما کہتے۔ اور کچھ پیار سے باپو پکارتے تھے۔

میوزیم دو بڑے بڑے کمروں میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ اندر آئے سر اٹھایا۔ سامنے رابندر ناتھ ٹیگور کے سنہری لفظ دکھائی دیتے ہیں "یہ وہ انسان ہے جو ہزاروں غریبوں کی جھونپڑیوں تک پہنچا۔ ان سے ان کی زبان میں باتیں کیں جو سچائی کا پتلا تھا۔ اور اسی لیے بھارت کے لوگوں نے اسے مہاتما کا نام دے دیا۔"

سامنے شیشے کی الماری ہے۔ اس میں بالکل معمولی سیدھی سادی کھڑاویں رکھی ہیں۔ جن لوگوں کو باپو کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ان کو آج

بھی ان کھڑاؤں سے جیسے ہوئے دبلے پتلے لیکن مضبوط قدم اٹھنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کھٹ کھٹ کھٹ' کی یہ آواز وہ آواز ہے جس نے بندوقوں اور مشین گنوں کی آواز کو دبا دیا تھا۔

ایک طرف باپو کی عینک ہے۔۔۔ ہے تو معمولی۔ جو ہم اور آپ لگاتے ہیں۔ لیکن باپو نے اس عینک سے نہ صرف نظر کے سامنے کی چیز دیکھی تھی بلکہ بھارت کے مستقبل کو بھی پڑھا تھا۔

قلم ہے جس نے مفلسی اور چھوت چھات کے خلاف جہاد کیا تھا۔

آپ اور آگے بڑھے۔ بائیں ہاتھ کے کمرے سے کہانی شروع ہوئی۔ پوربندر کے اس گھر کی تصویر سامنے آئی جہاں ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو موہن داس کرم چند گاندھی نے جنم لیا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ جو کبھی آپ جیسا بچہ تھا وہ بڑا ہوتا گیا۔ پڑھائی کا زمانہ شروع ہوا۔ بڑوں کا ادب کرنا سیکھا۔ جھوٹ سے نفرت سیکھی چوری کو پاپ جانا۔ اور ہر کام کو سلیقے سے کرنے کی عادت کو اپنایا۔ پڑھائی ختم ہوئی۔

آپ نے نمائش کے کمرے میں دو قدم آگے بڑھائے۔ وہی دبلا پتلا کمزور سا لڑکا۔ اب بڑا ہو گیا۔ کوٹ پتلون میں مسکراتا ہوا نوجوان آپ کے سامنے ہے۔ لندن جانے کی تیاریاں ہیں۔ پڑھنے کے لیے دیس سے باہر جانا ان دنوں بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔

جوں جوں آپ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ باپو کی زندگی کی کہانی کھلتی چلی جاتی ہے۔ انگریزوں کے ساتھ تصویریں ہیں۔ جنھوں نے باپو کی محبت کے سامنے اپنا سب کچھ قدموں پر رکھ دیا ہے۔

جنوبی افریقہ کی تصویریں ہیں۔ جہاں باپو کو پہلی دفعہ جینے کا مقصد معلوم ہوا تھا۔ جہاں انھوں نے سفید رنگ کے لوگوں کو کالے رنگ کے لوگوں سے نفرت اور چھوت کا برتاؤ کرنے کے خلاف جان کی بازی لگائی تھی۔

آپ کے سامنے اب اسی کمرے کی دوسری دیوار آجاتی ہے — یہاں سے باپو کی زندگی کا ایک دوسرا موڑ شروع ہوتا ہے۔

یہاں گاندھی ٹوپی جنم لیتی ہے۔ دیس کے مسئلے بدلتے ہیں۔ ایک مذہب کے لوگ دوسرے مذہب والوں سے نفرت کیسے کر سکتے ہیں؟

"اگر تم اپنے بھائیوں سے نفرت کرو گے تو میں اس وقت تک کے لیے کھانا پینا چھوڑ دوں گا جب تک تم نفرت کرنا نہیں چھوڑو گے۔"

لیجیے باپو نے مرن برت رکھ لیا۔ بن کھائے ہفتوں گذر گئے ہیں لیکن چہرے کی مسکراہٹ وہی ہے۔ ہمت وہی ہے۔ لیکن مستقبل پر نظریں جمی ہیں۔ ۲۱ دن کے فاقوں نے نڈھال کر دیا ہے۔ بستر پر لیٹے ہیں اور سرہانے ایک خوب صورت سی کالی گہری آنکھوں والی چھوٹی سی لڑکی بیٹھی ہے۔ باپو اس

کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں۔ آپ اس لڑکی کو غور سے دیکھئے اندرا گاندھی سے کتنی صورت ملتی ہے۔ لیکن صورت کیوں نہ ملے؟ یہ ہماری پردھان منتری ہی تو ہیں۔ یہ تصویر تو برسوں پرانی تصویر ہے۔
آیئے اب اور آگے چلیں۔

دیکھیے اس فوٹو میں باپو شانتی نکیتن میں ہیں ٹیگور سے کتنی گہری باتیں ہو رہی ہیں۔ دونوں نے دیس کی آزادی کے خواب دیکھے ہیں۔ اب ان کو سچ کر دکھانے کے پروگرام بن رہے ہیں۔

لیکن انگریزی راج ہے۔ اور راج سنگھاسن کون ہے جو اپنی مرضی سے چھوڑنے پر تیار ہو جائے! اب انگریزی سرکار کے خلاف لڑائی شروع ہو گئی۔ بھلا وطن کی آزادی کی آگ دنیا کے کسی دیس میں کسی زمانے میں کسی راجہ کے دبائے دب سکی ہے! بندوق اور جہاز اگر دشمن کے پاس ہیں تو ہمارے پاس بھی اہسا کا عدم تشدد کا ایٹم بم ہے۔

یہ دیکھو براد داجیل کی تصویر ہے جس میں رہ کر باپو نے اپنی جنوبی افریقہ کی کہانی لکھی تھی۔ اور یہ دوسری لمبی سی تصویر جو سامنے دکھائی دے رہی ہے۔ اس میں بھارت کے لاکھوں لوگ باپو کے خیالات سننے، ان کی نصیحتیں سننے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے۔ آدمی ہی آدمی نظر آ رہے ہیں۔
اب ہم اور آگے بڑھتے ہیں۔

یہ تصویر ۱۹۳۹ء کی ہے۔ باپو کی پتنی باندھی ہیں۔ ان کے تھکے ہوئے پیر دھو رہی ہیں۔ پدیاترا (پیدل سفر) سب کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لیکن باپو نے تو ہمیشہ لوگوں کو قریب سے جاننے کی کوشش کی تھی۔ ان کے دکھ درد میں حصہ لینے کی کوشش کی تھی۔ اور اس کے لیے گھر گھر پیدل چل کر جانا ضروری ہے۔

اب ہمارے بائیں طرف ہاتھ کی بنائی ہوئی باپو کی ایک تصویر ہے۔ بڑا سا فریم ہے۔ تصویر کے رنگ ہلکے ہیں۔ اس کے نیچے کچھ لکھا بھی تو ہے؟ یہ تصویر رنگوں سے نہیں بلکہ مونگ پھلی کے چھلکوں سے بنی ہے۔

دونوں دروازوں کے بیچ میں جو حصّہ ہے اس پر لکڑی کا بنا ہوا ایک اسٹیچو لٹک رہا ہے۔
ایک پتلا مگر مضبوط ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا ہوا ہے۔ ایک موٹا سا پیر زمین پر جما ہوا ہے۔ اور دونوں کے بیچ میں اس آدمی کا جسم ہے جس نے ہر ظلم کے خلاف آواز اٹھائی تھی جس نے ہر موقع پر سچ بولا تھا۔ اور جو اپنے بدن کو صرف ایک بالیک سی دھوتی میں لپیٹے نوکیلی سنگینوں کے سامنے اس طرح بڑھتا تھا جیسے لوہے کی زرہ بکتر پہنے ہو۔

اب ہم بیچ کے ہال سے ہوتے ہوئے دوسرے کمرے میں آتے ہیں یہاں غلامی کے

آخری دنوں کی تصویریں ہیں۔ انگریزی سرکار کے
افسر ہیں، والسرائے ہے۔ سڑکوں پر ہزاروں لاکھوں
لوگ نعرے لگا رہے ہیں۔

برسہا برس کی غلامی کی زنجیریں ایک
دبلے پتلے، بکری کا دودھ پینے والے۔ اہنسا کے
پجاری نے توڑ دی ہیں۔

تصویریں، فوٹو، چتر۔ ایک کے بعد ایک
اپنی کہانی آپ سناتے چلے جاتے ہیں۔ غلامی کی
لمبی چوڑی کالی سڑک آزادی کی اونچی منزل پر آکر
ختم ہو جاتی ہے۔

اور پھر ایک تصویر میں باپو اپنا ڈنڈا سنبھالے
آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور وہ کہہ رہے ہیں کہ میں
ایسے بھارت کے لیے کام کر رہا ہوں۔ جس کا
غریب سے غریب آدمی اس کو اپنا ملک سمجھے گا۔
اور جس کے بنانے میں اس کا ہاتھ ہوگا۔

آزادی کے جھنڈے آسمان سے باتیں
کرنے لگتے ہیں۔ باپو کسی کرسی پر نہیں بیٹھتے۔ وہ
اب بھی پدیاترا پر نکلتے ہیں۔ وہ اب بھی اچھوتوں
کو پاک استھانوں تک پہنچانے کی کوشش میں لگے
ہوئے ہیں۔ وہ اب بھی پرارتھنا میں لوگوں کو جینے کا
سلیقہ سکھاتے ہیں۔

اور پھر ہم اس جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں یہ
کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ باپو ہمیں سب کچھ دے
کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ ان کی راکھ ایک برتن
میں رکھی ہے۔ ریل کے ڈبے کھڑے ہیں۔ یہ ان
کی استھی (ہڈیوں) کو لائے تھے۔

واپس لوٹتے ہیں تو آپ کو باپو کے تین
بندر دکھائی دیتے ہیں۔ ایک کان بند کیے ہے۔
دوسرا آنکھ بند کیے ہے اور تیسرا منھ بند کیے ہے۔

میوزیم کا ایک حصہ ختم ہو گیا ہے۔ میں
پہلی منزل سے نیچے اترا۔ نیچے ایک طرف تھیٹر ہے۔
جہاں باپو کی زندگی پر بنائی ہوئی فلمیں دکھائی جاتی
ہیں اور دوسری طرف ایک بڑی سی لائبریری
ہے۔ اس لائبریری میں گاندھی جی پر ۱۲ ہزار
سے زیادہ کتابیں ہیں۔ ہزاروں رسالے اور میگزین
ہیں۔

یہ سب کچھ تو ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہونا بھی
چاہیے تھا۔ لیکن بات جو نہرو چاچا نے کہی تھی۔
بڑی سچی تھی۔ انھوں نے کہا تھا "آپ باپو کو
میوزیم کی چار دیواری کے اندر کیسے بند کر سکتے ہیں
دراصل سارا ہندوستان ان کا میوزیم ہے"

انھوں نے تو ادھ مرے لوگوں میں زندگی
کی روح پھونکی تھی۔ انھوں نے ان کی آنکھوں میں
چمک پیدا کی تھی۔ انھوں نے سر اٹھا کر چلنے کی ادا
سکھائی تھی۔

آج باپو ہم میں نہیں ہیں۔ لیکن فخر سے گردن
اٹھا کر چلنے کا سبق ہم نے ان ہی سے سیکھا تھا۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

جناب وقار خلیل

باپو نے کہا تھا

حق محبت ہے، حق عبادت ہے
یہ کہانی نہیں حقیقت ہے
صبح کا نام پیار، پھول، وفا
جہل[1]، فتنہ، فساد ظلمت[2] ہے
لوگ کہتے ہیں جس کو ستیا گرہ
وہ سچائی کی ایک طاقت ہے
علم حاصل کرو کہ دنیا میں
علم دانش[3] ہے، علم دولت ہے
وہ جو چرخا ہے، اس کے چکر میں
آشتی[4]، صلح اور محبت ہے
پیار کو زندگی بنا کے چلو!!
اس سے عظمت ہے اور شوکت ہے
انکساری، خلوص، جہد[5] و عمل
یہی انسانیت کی جنت ہے
کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا!
سب برابر ہیں، سب میں عظمت ہے
وعدہ کر لو، انھیں نہ بھولو گے
تم کو "باپو" سے گر عقیدت ہے

[1] جہالت [2] تاریکی، اندھیرا [3] عقل [4] دوستی [5] کوشش۔

مولانا اجتباء ندوی

ہیرودس نے ھیکل کے اصل نقشے میں کچھ تبدیلی بھی کردی اور اسے سیاست و عدالت کا مرکز بنادیا، اس سے ھیکل بڑا، وسیع اور دلکش و دل فریب بن گیا۔

لیکن ھیکل کی یہ آخری بہار تھی، ہیرودس کے بعد جو رومی حاکم اس کے جانشین ہوئے وہ بڑے ظالم اور سخت گیر تھے۔ یہودی ان سے پریشان ہوکر بغاوت اور سرکشی پر آمادہ ہوگئے۔

رومیوں نے بیت المقدس (یروشلم) کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور تین برس تک مسلسل ان کا محاصرہ دگھراؤ جاری رہا، لڑائی، بھوک اور فاقہ سے یہودیوں کا بہت سخت جانی و مالی نقصان ہوا، رومی شہر میں داخل ہوگئے، اور اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا، ھیکل سلیمانی کو توڑ پھوڑ دیا، صرف یک دیوار ھیکل کی یادگار کے طور پر باقی رکھی، جو بعد میں "دیوارِ گریہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔

یہودی اپنے ھیکل اور مقدس یادگار اور مقدس توریت کی تباہی و بربادی پر اس دیوار کے پاس کھڑے ہوکر آنسو بہاتے اور روتے چلاتے تھے۔

ھیکل کی آخری تباہی اور بے حرمتی اگست ۷۰ء میں ہوئی اور اس کے بعد سے یہودیوں کا شیرازہ بکھر گیا، زوال اور بے چارگی کا دور شروع ہوا۔

بعد کے رومی بادشاہوں نے یہودیوں کو وہاں رونے سے بھی منع کردیا تھا، اور اس جگہ کوڑا کرکٹ اور گندگی ڈالا کرتے تھے۔ لیکن مسلمان ترکی بادشاہ سلطان سلیم نے وہاں سے گندگی اور کوڑا کرکٹ ہٹوا کر یہودیوں کو دوبارہ رونے کی اجازت دے دی۔ اور جون ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر یہودی قبضہ تک یہ روایت باقی تھی۔

جب رومی بادشاہ قسطنطین عیسائی ہوگیا۔ تو بیت المقدس عیسائی شہر میں تبدیل ہوگیا، اور عیسائیوں کے قدیم ترین گرجا گھر "کنیسۃ القیامۃ" کی تعمیر ہوئی۔ یہ عمارت بڑی مضبوط، فلک بوس

قلعہ نما اور رنگ برنگے شیشوں اور سنگ مرمر سے آراستہ ہے۔

اسی گرجا گھر میں امیر المومنین، عمر فاروق رضؓ نے عیسائیوں کے امان کے لیے عہد نامہ لکھا تھا جو اس کی لائبریری میں اب تک موجود ہے اور گرجا گھر کے بڑے پادری کے پاس بیت المقدس کی وہ کنجی بھی محفوظ ہے۔ جسے باشندوں نے حضرت عمر رضؓ کے حوالے کیا تھا۔

حضرت عمر رضؓ گرجا گھر ہی میں تھے کہ نماز کا وقت آگیا، پادریوں نے اسی جگہ نماز پڑھ لینے کی درخواست کی، مگر امیر المومنین نے فرمایا کہ اگر میں نے یہاں نماز پڑھ لی تو اسے مسجد میں تبدیل کر دیا جائے گا، اور گرجا گھر کے دروازے سے دس قدم ہٹ کر نماز ادا کی، آج وہاں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے، اسلام کی عظمت کا نشان اور اسلام کی رواداری، انصاف و سادگی کی آئینہ دار۔

بیت المقدس کو مسلمان عربوں نے ۶۳۸ء میں فتح کیا، ماریا پہاڑی" کے ۳۵ ایکڑ وسیع رقبہ میں "مسجدِ ابراہیمی" اور معبدِ ربانی" کو تلاش کر کے مسجد اقصیٰ تعمیر کی اور بنوامیہؓ کے تاجدار عبدالملک بن مروان نے مسجد اقصیٰ اور گنبدِ صخرہ کی نئے سرے سے تعمیر کے لیے اپنی حکومت کے خزانے کھول دیئے۔

اس کی تعمیر میں قیمتی پتھر، نادر سنگ مرمر، رنگین خوش رنگ اور خوش نما شیشوں کا استعمال کیا۔ دیواروں پر خوب صورت حروف میں قرآنی آیتیں کندہ کرائیں۔

پہاڑ ماریا کے پھیلے ہوئے ۳۵ ایکڑ رقبے کو حرم شریف قرار دیا، اور اس کے جنوب میں مستطیل شکل میں مسجد تعمیر کی گئی۔ اس کے مشرق میں مسجد عمر اور چند گز کے فاصلے پر مسجد فاطمہ ہے، اس میں صرف عورتیں نماز پڑھتی ہیں، اور مردوں کا داخلہ منع ہے۔

مسجد کے صحن میں ایک حوض ہے جو کبھی وضو کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس سے سو گز کے فاصلے پر قبۃ الصخرہ کے زینے شروع ہو جاتے ہیں۔

صخرہ چٹان کو کہتے ہیں، اسی چٹان سے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج ہوئی تھی، اور یہی مسجد اقصیٰ ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ عبدالملک بن مروان نے اس چٹان پر بہت شاندار خوب صورت اور دل کش اور دل فریب گنبد بنوایا۔

اس کے ٹھیک مشرق میں حضرت سلیمانؑ کی قبر ہے، اور اس سے متصل جنوں کا قید خانہ ہے۔ اس میں حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں قصور وار جنوں کو قید کر دیا جاتا تھا۔

گنبد سے قریب ایک برج میں زنجیر لٹک رہی ہے۔ جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ انصاف کی زنجیر ہے۔

گنبد کے مغربی جانب ایک کمرہ میں ہماری

جنگِ آزادی کے عظیم رہنما اور ہماری جامعہ کے بانی رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کا مزار ہے۔ آپ کا انتقال لندن میں ہوا تھا۔ مفتی فلسطین الحاج امین الحسینی کی خواہش پر مسجدِ اقصیٰ کے حرم میں دفن کیے گئے۔

مسجد کے مشرق میں ایک میوزیم ہے، اس میں قدیم نادر، نایاب اور قیمتی یادگاریں ہیں، کلامِ پاک کے خوبصورت اور قدیم نسخے، پرانے زمانہ کے برتن بادشاہوں کے لباس اور صخرہ میں جلی ہوئی موم بتیاں بطور نمونہ و یادگار محفوظ ہیں۔

پورا حرم بڑا بارونق، دل کش، خوش نما، پُرسکون امن و آشتی اور سلامتی کا گہوارہ اور مرکز معلوم ہوتا ہے، اس پر سے شہر بڑا بھلا لگتا ہے۔ نیچے جنوب میں گہری گھاٹیاں اور وادیاں ہیں، جن میں جا بجا پانی کے چشمے غاروں میں سے بہتے ہیں۔ کہیں کہیں قدیم گرجاگھروں، عبادت گاہوں اور عمارتوں کے کھنڈر اور ملبے بھی نظر آتے ہیں۔

شمال مشرق میں پُرامن قدیم شہر بیت المقدس ہے اور اس مقدس شہر میں عرب مسلمان اور عیسائی رہتے ہیں۔ جنوب مشرق میں نیا یروشلم ہے، جدید طرز کی نئی اور خوب صورت عمارتیں، بلند گھنٹہ گھر، اونچی اونچی عبادت گاہیں ہیں۔ یہ حصہ یہودیوں کا ہے۔ اور نام نہاد اسرائیلی حکومت کے قبضہ میں ہے۔

قدیم و جدید شہر کے درمیان ایک قد آدم دیوار تھی۔ جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد یہودیوں نے پرانے شہر پر قبضہ کر کے دیوار توڑ دی۔ منصوبہ یہ ہے کہ قدیم و جدید شہر کو ملا کر یہودی شہر بنا دیا جائے، اور مسلمانوں اور عیسائیوں کی مقدس یادگاروں کو توڑ پھوڑ کے نئے سرے سے ہیکل سلیمانی کی بنیادوں کو تلاش کیا جائے اور اس پر ہیکل تعمیر کیا جائے۔ یہ منصوبہ اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے جب کہ مسجدِ اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کی صبح ۷ بجے مسجدِ اقصیٰ میں آگ لگانا اس منصوبے کی پہلی کڑی تھی، اس مجرمانہ حرکت سے نہ صرف مسجد کی بے حرمتی ہوئی بلکہ مسجد کے جنوبی حصہ کو شدید نقصان پہنچا، اس کے قیمتی جھاڑ فانوس، عمدہ زرکاری، اور نقش و نگار اور قیمتی سرمایہ، سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتح کا یادگار نشان اور شاندار و نادرۂ روزگار منبر جل کر خاکستر ہو گیا۔

یہ مسجدِ اقصیٰ نہ صرف مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے بلکہ خدا کے بیشتر پیغمبروں، بزرگوں، ولیوں اور بادشاہوں اور [illegible] کی دعوت و تبلیغ، فتح و نصرت، تعمیر و آرائش، تمناؤں، امنگوں اور دعاؤں کی جولاں گاہ اور مرکز رہی ہے۔ اس کی بے حرمتی ان سب کی بے حرمتی ہے۔ اور اس کی بے عزتی و تخریب ان سب کی دل آزاری اور ان کی آرزوؤں کا خون ہے

جناب اعجاز اختر

میناکی دُم

ایک مینا تھی۔ یہ بہت بھوکی تھی۔ اپنی بھوک مٹانے کے لیے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اچانک اسے ایک گھر میں دودھ کی پیالی رکھی نظر آئی دل للچا گیا، پھر سے اڑ کر پیالی پر جا بیٹھی۔ اور دودھ پینے لگی۔ دودھ پیتے میں اس کی دم ہوا میں لہرا رہی تھی۔

اچانک ایک بڑی بی گھر میں آئیں۔ انھوں نے مینا کو دودھ پیتے دیکھا بہت لال پیلی ہوئیں اور اس کو پکڑنے دوڑیں مگر مینا کی لہراتی ہوئی دم ہی پکڑ سکیں۔ مینا نے اپنے پر مارے اپنی دم چھڑانے کے لیے۔ مگر مینا دم تو نہ چھڑا پائی اور پر پھڑپھڑانے میں دودھ کی پیالی گر گئی۔ سب دودھ گر گیا۔ مینا نے اپنی دم کو اور زور سے کھینچا اور وہ فوراً آزاد ہو گئی۔ مگر یہ کیا ؟ اس کی دم تو بڑھیا کے ہاتھ میں رہ گئی تھی! چہ۔ چہ۔ کتنی خوبصورت دم تھی۔

"اچھی بڑی بی! میری دم واپس کر دو"

مینا نے التجا کی۔ مگر بڑی بی نہ مانیں کہنے لگیں۔ "میں تمھاری دم تب واپس کروں گی جب تم میرا دودھ واپس کر دو گی"

اب بے دم کی مینا کیا کرتی۔ پھر سے اڑی اور گائے کے پاس پہنچی۔

"اچھی گائے۔ اچھی گائے!! مجھے تھوڑا سا دودھ دے دو۔ اگر تم مجھے دودھ دو گی تو یہ دودھ میں بڑی بی کو دوں گی۔ اور بڑی بی مجھ کو دم واپس کر دیں گی۔ مجھے بغیر دم کے اپنے امی ابا کے سامنے جاتے شرم آتی ہے!"

"میں ضرور تمھیں اپنا دودھ دوں گی" گائے نے جواب دیا " مگر پہلے تم تھوڑی سی گھاس لا دو"

مینا پھر سے اڑی اور چراگاہ کے پاس پہنچی۔

"اچھی چراگاہ! کیا تم مجھے تھوڑی سی گھاس دو گی۔ تم گھاس دو گی تو میں وہ گھاس گائے کو دوں گی۔ میں گائے کو گھاس دوں گی تو وہ مجھے دودھ دے گی۔ میں دودھ بڑی بی کو دوں گی تو وہ میری دم واپس

کردیں گی۔ مجھے بغیر دم کے اپنے امّی ابّا کے پاس جاتے
شرم آتی ہے!"

"میں تمھیں گھاس دوں گی" چراگاہ نے کہا۔
"مگر پہلے تم مجھے پانی لا دو۔"

مینا پھر سے اڑی اور اُڑتی اُڑتی ایک
سقّے کے پاس پہنچی۔

"اچھے سقّہ میاں۔ اچھے سقّہ میاں۔ کیا
تم مجھے تھوڑا سا پانی دوگے؟" مینا نے گڑگڑا کر کہا۔

"تم مجھے پانی دوگے تو میں وہ چراگاہ کو دوں
گی۔ میں چراگاہ کو پانی دوں گی تو وہ مجھے گھاس دے
گی۔ چراگاہ مجھے گھاس دے گی تو میں وہ گھاس گائے
کو دوں گی وہ مجھے دودھ دے گی۔ میں دودھ
بڑی بی کو دوں گی اور وہ مجھ کو دم واپس کریں گی۔
مجھے بغیر دم کے اپنے امّی ابّا کے پاس جاتے شرم
آتی ہے۔"

"میں تمھیں پانی ضرور دوں گا مگر میں بھوکا
ہوں۔" سقّہ نے کہا: "پہلے مجھے انڈا لا دو۔"

مینا پھر سے اڑی اور مرغی کے پاس جا پہنچی۔

"ہلے بی کٹ کٹ کٹاک۔ اے بی کٹ کٹ کٹاک
مجھے ایک انڈا دو۔" مینا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اڑتے
اڑتے اس کی سانس پھول گئی تھی نا۔

"تم مجھے انڈا دو گی تو میں اسے سقّہ کو دوں
گی۔ انڈا سقّہ کو دوں گی تو وہ مجھے پانی دے گا۔
سقّہ مجھے پانی دے گا تو وہ پانی میں چراگاہ کو دوں
گی۔ چراگاہ کو پانی دوں گی تو وہ مجھے گھاس دے گی۔
میں وہ گھاس گائے کو دوں گی تو میری دم مجھے
مل جائے گی۔ اور جب مجھے دم مل جائے گی تب
میں اپنے امّی ابّا کے گھر جا سکوں گی۔ مجھے بغیر دم کے
اپنے امّی ابّا کے گھر جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

مرغی نے مینا کو دیکھا۔ "چہ چہ۔ واقعی بے چاری
بغیر دم کے کتنی بُری لگتی ہے۔ اور پھر وہ ایسی حالت میں
اپنے امّی ابّا کے پاس جائے گی تو وہ اسے ڈانٹیں گے۔
شاید بغیر دم کے پہچان بھی نہ سکیں۔" مرغی کو ترس
آ گیا۔ اور اس نے فوراً ایک انڈا دے دیا۔

مینا انڈا لے کر پھر سے اڑی اور اسے سقّہ کو
دیا۔ سقّہ نے اسے پانی کی ایک پیالی دی۔ مینا پانی لے
کر پھر سے اڑی اور چراگاہ کو دیا۔ چراگاہ نے اسے
گھاس دی۔ مینا یہ گھاس لے کر پھر سے اڑی اور
گائے کو دی۔ گائے نے اسے دودھ کی ایک پیالی دی۔

مینا دودھ کی پیالی لے کر اڑی اور بڑی بی کے
گھر پہنچی۔ دودھ بڑی بی کو دے دیا۔ بڑی بی بہت
نیک تھیں۔ انھوں نے وعدے کے مطابق دم واپس کر
دی۔ بلکہ مینا کو اپنی دم باندھنے میں مدد بھی دی۔
مینا نے دو تین بار اڑ کر دیکھا کہ دم اچھی طرح لگ گئی
یا نہیں اور وہ بڑی بی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنے
امّی ابّا کے پاس اڑ گئی۔ اب اسے دم مل گئی تھی۔
پھر اپنے امّی ابّا کے سامنے جاتے کیوں شرماتی؟"

جناب کیف احمد صدیقی

ہمارے استاد

کتنی محنت سے پڑھاتے ہیں ہمارے استاد
ہم کو ہر علم سکھاتے ہیں ہمارے استاد
توڑ دیتے ہیں جہالت کے اندھیروں کا طلسم
علم کی شمع جلاتے ہیں ہمارے استاد
منزلِ علم کے ہم لوگ مسافر ہیں مگر
راستہ ہم کو دکھاتے ہیں ہمارے استاد
زندگی نام ہے کانٹوں کے سفر کا لیکن
راہ میں پھول بچھاتے ہیں ہمارے استاد
دل میں ہر لمحہ ترقی کی دعا کرتے ہیں
ہم کو آگے ہی بڑھاتے ہیں ہمارے استاد
سب کو تہذیب و تمدن کا سبق دیتے ہیں
ہم کو انسان بناتے ہیں ہمارے استاد
آدمیت کی ہو تعلیم کہ درسِ اخلاق
سارے آداب سکھاتے ہیں ہمارے استاد
ہم کو دیتے ہیں وہ ہر لمحہ پیامِ تعلیم
اچھی باتیں ہی بتاتے ہیں ہمارے استاد
خود تو رہتے ہیں بہت تنگ و پریشان مگر
دولتِ علم لٹاتے ہیں ہمارے استاد
ہم پہ لازم ہے کہ ہم لوگ کریں ان کا ادب
کس محبت سے پڑھاتے ہیں ہمارے استاد

جناب واحد پریمی

ایک فسانہ ایک حقیقت

(اپالو ۱۱ کی کامیابی پر)

میں نے یہ بچپن میں سنا تھا
اڑن کھٹولے ہوتے ہیں
جن پر دیو، پری اور جن
رات کو اڑتے پھرتے ہیں
لیکن آج خلاؤں میں
انساں کو اڑتا دیکھ رہا ہوں
اور تو اور اس خاک نشیں[1] کو
چاند پہ چلتا دیکھ رہا ہوں
یعنی کل کا جھوٹا فسانہ
آج بنا ہے ایک حقیقت

[1] خاک پر بیٹھنے والے یعنی زمین پر رہنے و

جناب غلام حیدر

نیلم اور فرخ

(مسلسل)

فرخ :- میں اب تمھارے ملک میں آگیا ہوں جو بھی کام چاہو تم مجھے بتا سکتی ہو، اگر میں نے تمھارے بتائے ہو سارے کام پورے کر دیے تو پھر تمھیں شہزادی نیلم کی شادی میرے ساتھ کرنی ہوگی۔

ملکہ :- اچھا، میں تمھیں تین کام بتاؤں گی۔ اور اگر تم نے میرے تینوں کام پورے کر دیے تو نیلم کی شادی تمھارے ساتھ ضرور کر دی جائے گی۔ لیکن اگر تم ان میں سے کوئی ایک کام بھی پورا نہ کر سکے تو تمھیں فوراً قتل کروا دیا جائے گا۔ کہو منظور ہے؟

فرخ :- تم بتاؤ۔ پہلا کام کیا ہے؟

ملکہ :- میری ایک انگوٹھی بحرِ قلزم میں کہیں گر پڑی ہے۔ تمھیں اُسے ڈھونڈھ کر لانا ہے۔

شہزادہ فرخ اپنے پانچوں ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ اور انھیں بتایا۔

فرخ :- پہلا ہی کام کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بحرِ قلزم میں کہیں ملکہ کی انگوٹھی گر گئی ہے مجھے اسے ڈھونڈ کر ملکہ کو دینا ہے۔ اب تم سب سر جوڑ کر بیٹھو اور بتاؤ کہ اسے کیسے ڈھونڈا جائے۔

بس فوراً سوانکھا خاں کھڑے ہوئے اور

انھوں نے کہا۔

سوانکھا :۔ "میں دیکھ کر بتاؤں گا کہ وہ کہاں پڑی ہے۔" اور تھوڑی دیر میں چیخا ۔ "میں نے دیکھ لی ۔ وہ تہہ میں ایک پتھر پر پڑی چمک رہی ہے۔"
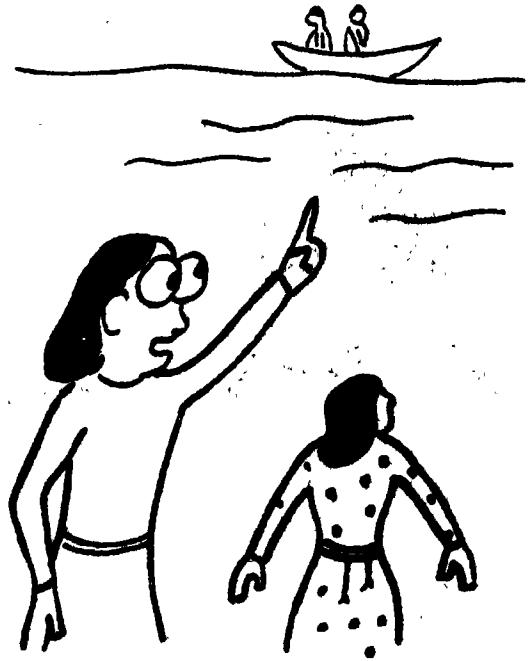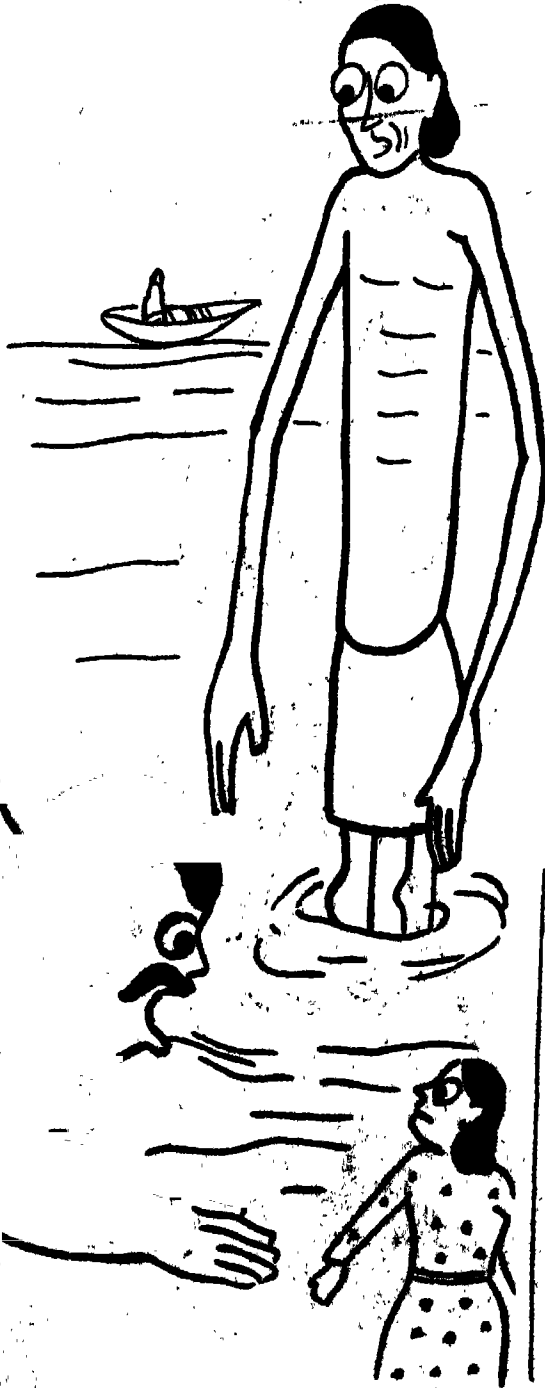
لمبو خاں :۔ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے ۔ "میں اسے نکال لاؤں گا ۔ چاہے وہ پاتال میں کیوں نہ پڑی ہو ۔ مگر بس میں پہلے اسے ایک بار دیکھ لوں ۔"

موٹو میاں :۔ یہ کیا مشکل بات ہے ۔ میں مدد کروں گا تمھاری ۔

اور وہ سب کے سب سمندر کے کنارے پہنچ گئے ۔ موٹو میاں سمندر کے کنارے پر منھ کے بل لیٹ گئے اور پانی سے منھ لگا کر انھوں نے سمندر کا پانی پینا شروع کر دیا ۔ موٹو میاں سڑاپ سڑاپ پانی پیتے رہے ۔ ان کا پیٹ پھولتا رہا ۔ سمندر خالی ہوتا چلا گیا ۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں

پڑی ہوئی مچھلیاں، پانی کے جانور، چمک دار پتھر، اور پھر کائی سے ڈھکے ہوئے پتھر نظر آنے لگے۔

پھر سوانکھا خاں نے اشارے سے لمبو خاں کو بتایا کہ کئی میل دور پتھر پر انگوٹھی پڑی ہوئی ہے جب لمبو خاں پھر بھی انگوٹھی نہ دیکھ سکے تو انھوں نے سوانکھا خاں کو اپنے بائیں ہاتھ پر بٹھا لیا اور تھوڑا سا جھک کر ہاتھ آگے کو بڑھا دیے۔ سوانکھا خاں انھیں بتاتے رہے اور انھوں نے دوسرے ہاتھ سے ٹٹول کر انگوٹھی اٹھا لی۔

شہزادہ فرخ بہت خوشی خوشی انگوٹھی لے کر ملکہ کے پاس گیا۔ دوسری طرف موٹو میاں نے اپنے پیٹ کا سارا پانی سمندر میں پھر اگل دیا۔

فرخ:۔ ملکہ! میں تمھاری انگوٹھی ڈھونڈھ لایا ہوں۔ پہلا کام پورا ہو گیا ہے۔ اب اگلا کام بتاؤ۔

ملکہ :- "تم حیرت ناک آدمی ہو!" ملکہ بڑی حیران تھی کہ یہ کام اس نے بالکل ناممکن سمجھ کر فرخ کے سپرد کیا تھا۔ یہ تو اس نے پورا کر دیا۔ "خیر تم نے یہ کام تو پورا کر دیا، اب دوسرا سنو۔

دوسرا سوال ملکہ نے فرخ سے کیا کیا؟ یہ جاننے کے لیے سالنامے کا انتظار کیجیے۔

لطیفہ۔

مجسٹریٹ :- (چور سے) اگر تم جھوٹ بولوگے تو کہاں جاؤ گے ؟

چور :- جہنم میں ۔

مجسٹریٹ :- اگر سچ بولوگے تو ؟

چور :- جیل میں ۔

عادل فرید (کٹک)

ناب مشہود مفتی

پرندوں کی انوکھی عادتیں

چوہا، بلّی اور بہت سے جانوروں کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ وہ اپنے بچّوں کو منھ میں دبا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ بہت تو نہیں ہاں چند پرندے بھی اسی طرح اپنے بچّوں کو لے کر اڑتے ہیں۔ خطرے کے وقت جل کوّے کی مادہ اپنے بچے کو رانوں میں دبا کر اڑجاتی ہے اور کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر بچے کو رانوں سے جدا کرتی ہے۔ مادہ بطخ بھی بچے کو اپنی چونچ میں دبا کر اڑتی ہے۔

پرندوں میں دیکھنے اور محسوس کرنے کی قوت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ ہماری آنکھیں منھ پر ہوتی ہیں اور ہم دونوں آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن الّو وغیرہ کو چھوڑ کر زیادہ تر چڑیوں کی آنکھیں سر کے دونوں جانب ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان کے دیکھنے کا انداز ہم سے مختلف ہوتا ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے اکثر چڑیاں کسی چیز کو بغور دیکھنے کے لیے گردن کی جنبش سے سر کو کتنا تیز ہلا کر دیکھتی ہیں۔ قدرت نے ان کو تیز نظر بنا کر ان کی زندگی آسان بنا دی ہے۔ نیچے زمین پر پڑے ہوئے دانے اور کیڑوں مکوڑوں سے پیٹ بھرنے والی چڑیاں قوتِ بینائی ہی کے بل بوتے پر زندہ رہتی ہیں۔ شکاری پرندوں کی بینائی عام چڑیوں سے کہیں زیادہ اور حیرت انگیز ہوتی ہے۔ باز اور شکرے جیسے پرندوں کی نگاہیں تو بہت ہی تیز ہوتی ہیں۔ "عقاب جیسی آنکھوں" والی ترکیب آپ نے سنی ہوگی۔ عقاب کی تیز نگاہی کا ایک سچا واقعہ پرندوں کے ماہر MR. E. H. ELON کی زبانی سنیے۔

"میں جھیل کے کنارے کھڑا تھا اور آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا انتہائی بلندیوں پر ایک عقاب بے انتہا تیز رفتاری سے اڑ رہا تھا۔ اڑتے اڑتے یکایک اس نے اپنا رخ بدلا اور بالکل ترچھے رخ پر جھپٹتا ہوا۔ مجھ سے بہت دور جھیل کے کنارے کی طرف ٹوٹ پڑا۔ جب وہ اوپر اٹھا تو اس کے پنجوں میں مچھلی تھی۔ اور جس مقام سے اس نے مچھلی پکڑی تھی وہ اتنا دور تھا کہ

دوربین سے بھی اس کے پنجوں میں پھنسی ہوئی مچھلی نہیں دکھائی دے سکتی تھی ۔ اس واقعہ کے بعد میں نے اس جگہ کا جہاں سے عقاب نے مچھلی پکڑی تھی ۔ اور اس مقام کا جہاں وہ بلندیوں پہ پرواز کر رہا تھا ۔ بہت احتیاط اور حساب سے دونوں مقاموں کا درمیانی فاصلہ ناپا ۔ یہ فاصلہ تین میل تھا ۔ اب آپ خود اس کی تیز نگاہی کا اندازہ کر لیجیے ۔"

گدھ کی نگاہیں اور سونگھنے کی قوت دونوں بہت تیز ہوتی ہیں ۔ گدھ بھی بلندیوں سے نیچے پڑے ہوئے مردہ جسم کو دیکھ لیتا ہے ۔ ایک بار ماہر حیوانات ALAN DEROC اپنی تجربہ گاہ کے قریب اس طرح زمین پر پڑ گئے جیسے مردہ ہو ۔ ان کی تجربہ گاہ سطح زمین سے کچھ بلندی پر تھی ۔ آدھے گھنٹے کے اندر انھیں مردہ سمجھ کر گدھوں نے گھیر لیا ۔

پرندے رنگوں کی تمیز بھی رکھتے ہیں ۔ بہت سے رنگ ایسے ہوتے ہیں جو انھیں بخوبی نظر آجاتے ہیں، جیسے سرخ، سبز اور زرد رنگ نیلے رنگ کی تمیز پرندہ بہت کم کرتا ہے ۔ تجربہ کرنے والوں نے کبوتروں کی آنکھوں پر نیلے اور بنفشی چشمے لگائے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ بالکل نہیں دیکھ سکتے ۔ لال، سبز رنگ کے چشمے سے کبوتر بہ آسانی دیکھ لیتے ہیں ۔ اس طرح مرغیوں پر بھی تجربہ کر کے دیکھا گیا ہے ۔ مرغی خانے میں دانہ ڈال دیجیے ۔ اور پھر جتنی جگہ میں دانہ بکھرا ہو اس پر نیلی روشنی ڈال دیجیے ۔ مرغیاں اس روشنی کے اردگرد گھومیں گی ۔ دانہ انھیں نظر نہ آئے گا ۔ صرف الو ہی ایک ایسا پرندہ ہے جو نیلے رنگ کی تمیز کر لیتا ہے ۔

چڑیوں کی آنکھوں سے متعلق بہت سے سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ زناٹے دار ہوا کے جھونکے چڑیوں کی آنکھیں کیسے برداشت کرتی ہیں ۔ چڑیاں تو کھلے آسمان کی بلندیوں پر بہت تیز اڑتی ہیں ۔ اور ان کی آنکھوں پر شدید ہوا کا اثر بھی پڑنا چاہیے ۔ یہ بھی قدرت کی کاریگری ہے کہ پرندوں کی آنکھوں کے کونوں میں ایک تیسرا پپوٹا ہوتا ہے جس کی جھلی سے بہ آسانی آرپار دیکھا جا سکتا ہے ۔

اڑتے وقت پرندوں کے اس پپوٹے کی جھلی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور آنکھیں تیز ہوا کے اثر سے محفوظ رہتی ہیں ۔ پانی کے اندر ہم دیکھ نہیں پاتے لیکن رام چڑیا شاخ پر بیٹھے بیٹھے پانی کے اندر کی مچھلی دیکھ لیتی ہے ۔ اور غوطہ لگا کر پکڑ لاتی ہے ۔ غوطہ خور شکاری چڑیوں کی آنکھوں کی بناوٹ کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ پانی میں داخل ہوتے ہی ان کی آنکھوں کے اگلے کونے ان کو پانی کے اندر دیکھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں ۔ آنکھوں کے ان حلقوں سے پرندہ

جناب اظہر افسر

ایلورا اور اجنٹا کی سیر

(پس منظر موٹر کار کی آواز)

حامد:۔ چچا جان آج کا دن بڑا اچھا ہے۔

چچا:۔ اچھا! وہ کیوں؟

حامد:۔ ایک عرصے سے ایلورا اور اجنٹا کی سیر کی آرزو تھی شکر ہے آج پوری ہو رہی ہے۔

چچا:۔ دیکھو بھئی پہلے تو ہم کوئی وعدہ نہیں کرتے۔ کرتے ہیں تو جلد سے جلد پورا بھی کر دیتے ہیں۔

منّی:۔ اب اور کتنی دور ہیں ایلورا کے غار چچا جان۔

چچا:۔ بس اب تھوڑی دیر میں پہنچنے ہی والے ہیں۔ یہ غار اپنے شہر اورنگ آباد سے چودہ میل دور ہیں۔ اور خلد آباد کا جو پیارا شہر ابھی ابھی گذرا ہے نا تو ایلورا کے یہ غار جو سوا میل کی دوری پر پھیلے ہوئے ہیں۔ خلد آباد سے ایک میل کے فاصلے پر ہیں۔

حامد:۔ سنتے ہیں چچا جان یہ غار بہت پرانے ہیں۔

چچا:۔ ہاں بہت پرانے ہیں۔ اس بستی کا نام پہلے ایلاپوری تھا۔ پہاڑی سلسلے میں اندر ہی اندر تراشے ہوئے یہ کوئی ۳۴ غار ہیں۔ ان ۳۴ غاروں میں سے ۱۲ غار بودھی ہیں، ۱۷ برہمنی ہیں اور ۵ جینی ہیں۔ سب سے خوبصورت غار "کیلاش" ہے۔ تم نے مہاتما بدھ کا نام تو سنا ہوگا۔

حامد:۔ جی ہاں ہم نے تاریخ میں پڑھا ہے چچا جان کہ اودھ کے شمال میں کپل وستو نامی شہر میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کوئی ۵۶۰ سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔

منّی:۔ اور یہ کہ ان کا اصلی نام سدھارتا تھا۔

چچا:۔ ہاں جوانی کے زمانے میں یہ دنیا سے ایسے بیزار ہوئے کہ اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ کر جنگل کی طرف نکل گئے۔ کئی سال بعد انھیں ایک پیپل کے درخت کے نیچے خدا کے درشن ہوئے۔ (جسے بودھی کہتے ہیں) اسی دن سے ان کا نام گوتم بدھ ہو گیا۔ گوتم بدھ کو

ساکیہ منی بھی کہتے ہیں

حامد۔ جی ہاں کیونکہ گوتم بدھ ساکیہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔

چچا۔ بودھی حاصل ہونے کے بعد گوتم بدھ نے اپنے مذہب کو پھیلانا شروع کیا۔ اس مذہب کے ماننے والے بودھ یا بودھی کہلاتے ہیں۔ ایلورا کے یہ غار پہلے پہل انھی لوگوں نے بنائے۔ یہ غار پہلی صدی عیسوی سے لے کر چھٹی صدی عیسوی اور گیارھویں عیسوی تک تعمیر کئے گئے ہیں۔ لو بھئی باتوں باتوں میں وہ غار بھی آگئے۔ دیکھو یہاں سے ان غاروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

[illegible]مد۔ یہ تو بالکل گھروں جیسے ہیں۔

[illegible]ا۔ ہاں ذرا ان کی چھتوں کو دیکھو اور ان ستونوں کو بھی کیسے خوبصورت ہیں۔

[illegible]مد۔ ستونوں اور دیواروں پر طرح طرح کی مورتیاں بنی ہیں۔

[illegible]۔ چھت پر بھی تو دیکھو کس نفاست سے نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔

[illegible]۔ اوفوہ۔ کیا باریک جال ہے۔

[illegible]مد۔ کیسے عمدہ نقش و نگار ہیں۔

[illegible]۔ پتھر ہی پتھر میں دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں پرانی طرز کی گاڑیاں اور جانور بنے ہوئے ہیں۔

[illegible] کیسے صاف بنائے

گئے ہیں

چچا۔ یہی تو کمال ہے۔ ان لوگوں نے پتھر کو بھی ایسے استعمال کیا ہے جیسے موم۔ اور پھر یہی کام دو دو تین تین منزلہ غاروں میں کیا گیا ہے۔ غار نمبر ۱۲ اس کی بہت عمدہ مثال ہے۔ آؤ سب سے پہلے غار نمبر ۱۰ میں چلتے ہیں۔

حامد۔ اوہو۔ یہ تو ایک عالی شان محل معلوم ہوتا ہے۔

منّی۔ بھئی واہ، کیا ستون ہیں کیا اونچی چھت ہے۔

حامد۔ اور کیا چوڑی چوڑی غلام گردشیں ہیں کیا وسیع صحن ہے۔

چچا۔ یہ غار وشوکرما کہلاتا ہے۔ یہ خوب صورت ستون جو تم لوگ دیکھ رہے ہو، چودہ چودہ فٹ بلند ہیں۔ وہ دیکھو بالکل سامنے مہاتما بدھ کا بت ہے۔ انھیں بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔

منّی۔ کتنا اونچا پتھر کا بت ہے۔ آو حامد قریب سے دیکھیں۔

حامد۔ منّی تمھارا سر تو بت کے گھٹنے تک ہی پہنچا ہے۔

منّی۔ تم کون سے اونچے ہو۔ تمھارا کندھا لگ رہا ہے [illegible]

حامد: بہت بڑا بت ہے۔
منی: چچا جان پیاس لگی ہے۔
چچا: تم کو پیاس لگی ہے تو آؤ یہاں پانی پی لو۔
اِدھر ایک چھوٹا سا خوب صورت چشمہ بھی ہے۔
حامد، منی: ہاں ہاں چچا جان ضرور پئیں گے۔
چچا: بھئی یوں تو ہر غار میں پانی کا چشمہ ہے مگر
اس دسویں غار کے چشمے کا پانی آج تک
نہایت صاف اور میٹھا ہے۔ کھدی ہوئی
مورتیاں دیکھنے کے لائق ہیں۔ مگر اب آؤ
غار نمبر ۱۶ میں چلتے ہیں۔ یہ غار راون کی کھائی
کہلاتا ہے۔ دیکھو اس غار کے سامنے چار
ستون ہیں اور اندر بارہ ستون ہیں۔ ہال
چھپن فٹ چوڑا ہے اور چھپن فٹ لانبا ہے۔
دیکھو ستونوں پر پھولوں کے کیسے پیارے
پیارے گلدستے ہیں۔
حامد: جی ہاں۔ سچ مچ چچا جان۔
چچا: واہ، واہ ستونوں پر بھی کیسی پیاری مورتیاں
تراشی گئی ہیں۔ اور کس ادا سے کھڑی ہیں۔
یہ مورتیاں بھئی واہ۔
حامد: بڑی پیاری پیاری مورتیاں ہیں۔
چچا: اِدھر دیکھو۔ یہاں اس تصویر میں شیو جی اور
پاربتی جی، دونوں ایک اونچے چبوترے پر
چوسر کھیل رہے ہیں۔ اِدھر راون کیلاش
[illegible]

رہا ہے۔ کیلاش پر پاربتی اور شیو ہیں۔
پاربتی ڈر کر شیو جی سے لپٹ گئی ہیں شیو جی
اپنے پیر سے کیلاش کو دبا رہے ہیں تاکہ
راون اٹھا نہ سکے۔
منی: یہ راون ہے نا چچا جان جس کے دس سر اور
بیس ہاتھ بنائے گئے ہیں۔
چچا: ہاں۔ سر پہ تاج ہے اور تاج پر گدھے
کا سر بنا ہوا ہے۔
منی: ارے! اِدھر تو بہت سی تصویریں ہیں۔
او ہو ہو۔
چچا: یہاں لکشمی جی کنول کے پھول پر بیٹھی
ہیں اور دوسری مورتیاں پانی کے گھڑے
لیے کھڑی ہیں۔
منی: لکشمی جی کے چار ہاتھ ہیں سیدھے ہاتھ
میں سنکھ ہے۔
حامد: اے لیجیے ہاتھی لکشمی جی کو اشنان بھی کرا رہے
ہیں۔
چچا: اِدھر وشنو جی کی بیٹھی ہوئی مورتی ہے ان
کے دونوں طرف سری دیوی اور بھو دیوی
ہیں۔ آس پاس چار آدمی چنور لیے کھڑے
ہیں۔ اُدھر بہت سے مرد اور عورتیں ہیں۔
یہاں دیکھو وشنو جی اور لکشمی جی ایک تخت
پر بیٹھے ہیں۔ نیچے سات بونے ہیں جن میں
سے [illegible]

ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں۔

حامد:۔ واہ وا، واہ۔ بہت عمدہ۔

چچا:۔ اب چلو سب سے وسیع اور سب سے بڑے غار کی طرف چلیں۔

منّی:۔ وہ کون سا غار ہے چچا جان۔

چچا:۔ وہ ہے غار نمبر ۱۷۔

حامد:۔ اوہ ہو کتنا وسیع غار ہے۔

چچا:۔ اسے کیلاش یا رنگ محل بھی کہتے ہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی میں کہا جاتا ہے کہ راشٹر کوٹ کے راجا کرشنا رائے اوّل کے حکم سے جو سنہ ۷۶۸ سے ۷۷۲ تک حکمران تھا۔ ایک بہت بڑے پہاڑی سلسلے میں تراشا گیا تھا۔

حامد:۔ ہاں کرشنا رائے اوّل کا دور ہم تاریخ میں پڑھ چکے ہیں۔ اوہو کتنا بڑا صحن ہے۔

چچا:۔ سامنے دیوار ہے، بے شمار ہاتھی اپنے سروں پہ دوسری منزل کو لیے کھڑے ہیں۔ وسیع صحن دو حصّوں میں بٹا ہوا ہے۔ شمالی حصّہ اور جنوبی حصّہ ہر حصّے میں ایک بہت بڑا ہاتھی کھڑا ہے اور نقش و نگار سے آراستہ صحن کے ہر حصّے میں ایک بہت بڑا ستون ہے۔

منّی:۔ کتنے خوب صورت ہاتھی ہیں چچا جان۔

چچا:۔ ہاں یہاں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جیسا ہاتھی ویسا ستون اور نقش و نگار اور مورتیاں، ایک طرف بنائی گئی ہیں۔ صحن کے دوسرے حصے میں بھی بالکل ایسا ہی ہاتھی ستون اور مورتیاں ہیں۔

منّی: یہ کیسی تصویریں ہیں چچا جان۔

چچا:۔ یہاں تصویروں ہی تصویروں میں بتایا گیا ہے کہ نرسنگھ ہرن کشیپ کو چیر رہے ہیں۔ ادھر چتربھوجی شیوجی اور نندی کی مورتیاں ہیں اُدھر انپورنا جی ہاتھوں میں پانی کا لوٹا، مالائیں اور پھول لیے کھڑی ہیں۔ کرشن جی کا پیر کالے ناگ پر ہے۔ کالا ناگ سات پھن کا ہے۔

حامد:۔ جی ہاں۔ اوہوہ۔

چچا:۔ اِدھر شیو پاروتی ہیں۔ پاروتی جی نے اپنے بال کیسے سنوارے ہیں۔

منّی: ان مورتیوں میں سب کے بال بالکل نئے طریقے سے سنوارے گئے ہیں۔

چچا:۔ (ہنستے ہیں) ہاں آج جو بال بنانے کا نیا فیشن نکالا گیا ہے، وہ انھی مورتیوں سے لیا گیا ہے۔ اِدھر شیوجی کی تصویر ہے۔ سیدھے کاندھے پر ترشول ہے۔ بائیں ہاتھ میں کُنڈل ہے۔ سیدھے ہاتھ میں ڈمرو ہے۔ سامنے پاروتی جی ہیں۔

حامد:۔ گلے میں ناگ بھی تو ہے۔

چچا:۔ ادھر دیکھو کتنا خوب صورت مور ہے۔

چچا:- اور اُدھر پوری برات چلی جا رہی ہے ۔ لوگوں کا ہجوم ہے ۔ پالکی میں راجہ کی سواری جا رہی ہے ۔ اِدھر ہاتھیوں کی قطاریں اُدھر ہرن ہیں ۔ کچھ دوڑ رہے ہیں کچھ سو رہے ہیں ۔

حامد:- ادھر چچا جان شاید چشمے کا منظر ہے جس کے کنارے درخت ہیں، بیلیں ہیں پرندے ہیں ۔

چچا:- ہاں بعض تصویریں یہاں رنگین بھی ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے اِس غار کی تصویروں کو آٹھویں صدی عیسوی میں رنگا گیا ہے ۔ اِدھر دیکھو، یہاں سے وہاں تک رامائن کے منظر دیئے گئے ہیں ۔ رامائن تو تم نے پڑھی ہو گی ۔

حامد:- ہاں چچا جان اس کا ایک حصّہ تو ہمارے کورس کی کتاب میں بھی ہے ۔ یہاں راون سیتا جی کو چرا کر لے جا رہا ہے ۔

چچا:- اِدھر رام اور راون کی لڑائی ہو رہی ہے ۔ اُدھر سے ہنومان بھی مدد کو آ رہا ہے ۔ پھر یہاں سیتا جی کی رہائی دکھائی گئی ہے ۔ اس طرح تصویروں اور مورتیوں سے بھرپور یہاں ۳۴ غار ہیں جن میں گنیش غار، رامیشور غار، نیلکنٹھ کا غار تیلی کا گھانہ کمہار واڑہ، گولن کا غار، سیتا کی نہانی اور جینی غار ہیں ۔ جگنا تھ سبھا اور پارس ناتھ کے دیول ہیں ۔ چلو اب چلیں شام تک اجنٹا کے غار بھی تو دیکھ لینے ہیں ۔

حامد:- جی ہاں ۔ چلیے ۔

(کار کی آواز ابھرتی ہے)

چچا:- اجنٹا کے غار اورنگ آباد شہر سے چونسٹھ میل دور ہیں ۔ تم نے حامد تاریخ میں ہیون تسانگ کا نام پڑھا ہے ۔

حامد:- جی ہاں ۔ یہ ایک چینی سیاح تھا جو ۶۲۹ء میں ہندوستان آیا تھا ۔

چچا:- یہی سیاح بیان کرتا ہے کہ اجنٹا چالوکیہ راجا پُل کشن اوّل کی راجدھانی تھا اور پہلا غار خیال کیا جاتا ہے کہ پہلی صدی قبل مسیح سے ساتویں صدی عیسوی تک تعمیر کیے گئے ہیں ایک عجیب بات ہے ۔

حامد:- وہ کیا چچا جان ۔

چچا:- یہ غار نصف دائرہ لیے ہوئے ایک طویل پہاڑی سلسلے میں بنائے گئے ہیں، مگر اٹھارویں صدی عیسوی تک کسی کو ان غاروں کا پتہ نہ تھا ۔ ۱۸۱۹ء میں انگریزی سپاہیوں کا ایک دستہ مرہٹوں سے لڑائی کے زمانے میں اس جنگل سے گزرا ۔ ان غاروں کو قدرتی سمجھ کر ان سپاہیوں نے پناہ لی اور اندر داخل ہوئے ۔ تو یہ دیکھ کر حیران

رہ گئے کہ یہ غار مورتیوں اور نقش و نگار سے آراستہ ہیں اور ایسی ایسی تصویریں بنی ہوئی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

حامد: اب ہم کہاں سے گزر رہے ہیں چچا جان۔

چچا: اجنتا کے غاروں میں داخل ہونے کے لیے یہ نواب نظام علی خاں کی بنائی ہوئی فصیل ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ اس کے تین دروازے ہیں۔ سرائے دروازہ، پھول دروازہ اور سیونا دروازہ۔ یہ سرائے دروازہ ہے۔ ایلورا کی طرح بدھ مذہب کے پیروں نے یہاں ۲۹ غار تراشے ہیں۔ ان غاروں میں پانچ بڑے بڑے عبادت خانے ہیں اور ۲۴ خانقاہیں ہیں۔ ان خانقاہوں اور عبادت خانوں میں رنگین تصویروں کے علاوہ پتھر میں تراشی ہوئی بے شمار مورتیاں ہیں پھول پتے اور دوسری کاری گری کے نفیس نمونے ہیں۔

منّی: اب ہم ۲۹ غار دیکھیں گے چچا جان۔

چچا: نہیں بھئی ان ۲۹ غاروں میں سے صرف غار نمبر ایک، غار نمبر دو، غار نمبر نو، دس، سولہ اور سترہ ہی میں، واضح مورتیاں تصویریں اور نقش و نگار رہ گئے ہیں۔ باقی غاروں میں زمانے کے ہاتھوں سب کچھ ختم ہو گیا۔ پھر بھی ان تصویروں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں ہندوستان کا فنِ مصوری کس قدر ترقی اور عروج پر تھا۔

(کار کی آواز ختم ہو جاتی ہے)

چچا: آؤ اب ہم غاروں کی طرف چلتے ہیں۔ یہ پہلا غار ہے۔

حامد: سچ مچ کیا نقش و نگار ہیں۔

منّی: کیا بیل بوٹے ہیں۔

چچا: ذرا ان انسانی مورتیوں کو دیکھو۔

حامد: ایسا معلوم ہوتا ہے چچا جان کہ اب بول پڑیں گی۔

چچا: ادھر دیکھو ایک راجا جو بھکشو ہو گیا تھا۔ اپنے ہی محل کے دروازے پر بھکشا مانگنے آیا ہے۔ رانی بھکشو کی آواز پہچان کر تھال میں کھانا بھیج رہی ہے۔ تصویر میں رانی کے چہرہ پر جذبات کو کس خوبی سے ظاہر کیا گیا ہے۔

حامد: ہاں چچا جان واہ واہ۔

منّی: رانی کا زیور سر کا تاج اور مالائیں بھی تو دیکھیے۔

چچا: بھکشو کے چہرے پر روحانی عظمت ہے۔ پہرہ دار جو دروازہ کے درمیان بیٹھا ہے اس کی لٹکتی ہوئی مونچھیں اور چہرہ بھی تو دیکھو۔

حامد:۔ جی ہاں، رنگ بھی کیسے عمدہ اور موزوں ہیں۔

چچا:۔ پہلے پتھر پر مورتیاں اور نقش و نگار بنائے گئے ہیں پھر ان پر خاص مسالہ پوت کر اس پر رنگ کیا گیا ہے۔

منّی:۔ اور رنگ بھی ایسا کہ آج تک قایم ہے۔

چچا:۔ یہی تو اجنتا کی خوبی ہے۔

منّی چچا جان یہاں دو بیل آپس میں لڑ رہے ہیں واہ کتنے عمدہ بیل ہیں۔

چچا:۔ اِدھر مہاتما بدھ کو نہلایا جا رہا ہے۔ ایک طرف خادم کھڑے ہیں۔ دوسری طرف فقیر ہیں۔ ایک آدمی کپڑے لیے کھڑا ہے۔ چلو اب دوسرے غار میں چلیں۔

منّی چلیے۔

چچا:۔ یہ دیکھو۔ یہاں ناگ راجہ کی بیٹی اُندتی جھولا جھول رہی ہے۔ سہیلیاں آس پاس کھڑی ہیں۔ اُدھر ناچنے والی عورتیں اپنے فن کو پوری خوبی سے دکھا رہی ہیں۔

حامد:۔ چھت کے بیل بوٹے کتنے عمدہ ہیں۔

چچا:۔ یہ غار نمبر ۹ ہے۔ ذرا یہاں کی بہار دیکھو۔ کیسی انوکھی مورتیاں طرح طرح کے پھول اور گل دستے ہیں۔ حامد اور منّی اِدھر آؤ اِدھر۔ ان تصویروں کو قریب سے کبھی نہ دیکھنا چاہیے۔ ان تصویروں کو دیکھنے کے لیے کم سے کم سات فٹ کے فاصلے سے کھڑا ہونا چاہیے۔ یہاں سے دیکھو پھر تمھیں تصویروں کی اصلی خوبی اور خوبصورتی دکھائی دے گی۔

حامد:۔ واہ وا واہ، چچا جان ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کبھی پتھر میں بنی ہوئی ایسی عجیب و غریب تصویریں دیکھ سکیں گے۔

چچا:۔ اب آؤ غار نمبر ۱۶ میں چلیں۔

منّی:۔ اوہو کتنا بڑا کتبہ لگا ہے یہاں۔

چچا:۔ ہاں یہ کتبہ راجہ ہری سینا کے وزیر نے لگوایا تھا۔ اس میں قدیم سنسکرت زبان میں لکھی ہوئی ۲۷ سطریں ہیں۔ آؤ اندر چلیں۔ یہاں بھی اور غاروں کی طرح بیل بوٹے نقش و نگار اور تصویریں ہیں۔ اِدھر ساری مذہبی کہانیوں کو تصویروں میں دکھایا گیا ہے۔ اور یہ غار نمبر ۱۷ ہے۔

منّی جی۔

چچا: اِدھر دیکھو یہ ایک راجہ کے محل کا نقشہ ہے۔ راجا تخت پر بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے رانی بیٹھی ہے۔

منّی کتنے خوبصورت راجا رانی ہیں۔

چچا:۔ آس پاس محل کی دوسری عورتیں ہیں۔ ذرا اس عورت کی طرف دیکھو جو ستون کے پیچھے سے جھانک رہی ہے۔ راجا کے تخت کے پاس دو عورتیں چنور لیے

کھڑی ہیں۔ سامنے ایک مسخرہ ہے دو بڑے آدمی کھانے کے تھال لیے ہوتے ہیں۔
ذرا عورتوں کے بالوں کی بناوٹ دیکھو۔

مُنّی بالکل جیسے ہماری بڑی آپا بناتی ہیں۔

چچا: (ہنستے ہیں) ہاں ہاں بالکل۔ اچھا بھئی اب چلو واپس چلیں۔ شام ہو چلی ہے گھر بھی لوٹنا ہے۔

حامد: چلیے، چلیے۔

مُنّی جانے کو جی تو نہیں چاہتا۔

چچا: ہاں یہ تو ہے۔ ان غاروں کو جتنی دیر اور جتنا دیکھو کم ہے۔ آؤ۔

حامد: مگر چچا جان آج کی یہ ایلورا اور اجنتا کی سیر ہمیشہ یاد رہے گی۔

مُنّی بے شک ہمیشہ یاد رہے گی۔ ہم زندگی بھر نہ بھولیں گے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

پرندوں کی چند انوکھی عادتیں (۔ کا بقایا)

پانی کے باہر بالکل نہیں دیکھ سکتا۔

چڑیاں اپنی آنکھوں کو برائے نام ہی گردش دے سکتی ہیں۔ متحرک چیزوں سے باخبر رہنے کے لیے وہ برابر اپنا سر گھماتی رہتی ہیں۔

جناب محمد طاہر بی اے بی ٹی (نانپارہ)

بندر کی قربانی

ایک جنگل کے کنارے ایک بستی میں کسی شخص نے بہت اچھا پھلوں کا باغ لگوایا۔ زمانے کا انقلاب دیکھیے۔ بستی ویران ہوگئی اس میں بھی ایک جنگل اُگ آیا۔ اس طرح وہ باغ بھی جنگل میں شامل ہوگیا۔

بندروں کا ایک گروہ گھومتا پھرتا اِدھر جا نکلا وہ باغ انھیں بہت پسند آیا اور وہ وہیں رہ پڑے۔ خوب پھل کھاتے اور آزادی سے رہتے۔

ایک دن ایک ریچھ بھی اِدھر آ نکلا۔ اس نے بندروں کو اس باغ میں رہتے دیکھا۔ اسے بڑا رشک ہوا۔ اس نے بھی کچھ پھل کھانے چاہے۔ بندروں کو یہ بہت بُرا لگا اور انھوں نے ریچھ کو مارنا شروع کر دیا ایک سمجھ دار بندر نے منع کیا کہ یہ ہمارا مہمان ہے۔ اس کی خاطر مدارات کرنی چاہیے۔ لیکن بندروں نے اس کی بات نہ سنی اور ریچھ کو مار پیٹ کر باغ سے نکال دیا۔

ریچھ مار کھا کر اپنے ساتھیوں میں پہنچا اور بولا۔ بھائیو! بڑے افسوس کی بات ہے، ہم ریچھ اتنے طاقت ور ہو کر ایسے جنگل میں رہیں اور بندر جو ہم لوگوں سے کہیں کمزور ہیں۔ باغ میں رہیں اور میوے کھائیں ہمیں ان پر حملہ کرکے باغ سے نکال دینا چاہیے اور خود باغ پر قبضہ کر لینا چاہیے سب ریچھوں نے اس کی بات مان

دوسرے دن ریچھ بندروں کے باغ پر چڑھ دوڑے۔ پیڑوں پر چڑھ چڑھ کر بندروں کو مارنے لگے بندر ریچھوں کا مقابلہ نہ کر سکے کچھ جان سے مارے گئے کچھ زخمی ہوئے باقی سب جان بچا کر بھاگ گئے۔

جنگل میں سارے بندر ایک مقام پر اکٹھا ہوئے اور جس بندر نے انھیں ریچھ کو مارنے سے منع کیا تھا اس سے معافی مانگی اور کہا: "ہم نے آپ کا کہنا نہیں مانا اسی کی یہ سزا ہم کو ملی ہے"

بندر نے کہا: "بھائیو! جو ہوا سو ہوا، اب پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں لیکن اگر اب بھی تم لوگ کہنے پر چلو تو باغ تمھیں دوبارہ مل سکتا ہے اور تم ریچھوں کا نام و نشان مٹا سکتے ہو"

بندر بولے "اس سے اچھی کیا بات ہوسکتی ہے ہم آپ کے کہنے پر ضرور عمل کریں گے، آپ ہمیں وہ بات بتائیں۔"

اس نے کہا "تم لوگ مجھے خوب مارو، میرے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالو اور مجھے اسی باغ کے پاس ڈال آؤ۔"

بندروں نے کہا: "واہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں ہم آپ پر کیسے ہاتھ اٹھا سکتے ہیں۔"

تب وہ بندر بولا: "بھائیو! اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

مجبوراً بندروں نے دکھی دل سے اپنے ہمدرد اور رہنما کو پیٹا، اس کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے اور اس کو لا کر اس باغ میں ڈال آئے۔

باغ کے پاس بندر نے چلا چلا کر رونا شروع کیا۔ ریچھوں نے اس کے چلانے کی آواز سنی اور یہ دیکھنے کو آئے کہ کیا بات ہے بندر نے ان سے کہا۔

"میں نے جو ریچھ کو مارنے کو منع کیا تھا اس کی وجہ سے سب بندر مجھ سے ناراض ہوگئے اور مجھے مار پیٹ کو یہاں ڈال گئے ہیں کہ تم جن کے ہمدرد ہو انھی کے ساتھ رہو۔"

ریچھوں نے اس سے پوچھا کہ اب تم کیا چاہتے ہو۔ بندر بولا: "اب میں ان سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ مجھے وہ جگہ معلوم ہے جہاں وہ چھپے ہیں، تم سب لوگ میرے ساتھ چل کر انھیں مار ڈالو تب ہی میرا دل ٹھنڈا ہوگا۔"

ریچھ بندر کے کہنے کے مطابق چلنے کو تیار ہوگئے۔

وہ دوسرے دن صبح کے وقت ان کو جنگل کے کنارے ایک ریتیلے اور چٹیل میدان میں لے گیا۔ ایک ریچھ زخمی بندر کو اپنی پیٹھ پر لادے آگے آگے چلتا تھا اور بندر راستہ بتاتا تھا کہ آگے چلو۔ صبح کے ٹھنڈے وقت میں وہ ان کو ریگستان میں بہت دور تک لے گیا۔ جب بھی ریچھ پوچھتے کہ بندر کہاں ہیں تو وہ یہی جواب دیتا کہ ابھی اور آگے چلو۔ یہاں تک کہ دن کے بارہ بج گئے۔ سخت گرمی پڑنے لگی اور لو چلنے لگی گرمی سے ریچھ سخت پریشان ہوگئے۔ پیاس سے زبان باہر نکلنے لگی تو انھوں نے بندر سے پھر پوچھا۔

"تم بتاتے کیوں نہیں کہ بندر کہاں ہیں؟"

اب بندر نے جواب دیا۔

"بندر یہاں کہاں ہیں؟ تمھاری موت تم کو یہاں لائی ہے۔ اب تم میں سے کوئی بھی یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتا، میں اپنی قوم کا بدلہ لینے کے لیے تم کو یہاں لایا ہوں۔"

یہ سنتے ہی ریچھوں نے فوراً اس بندر کو مار ڈالا۔ لیکن اس کے بعد وہ خود بھی گرمی اور پیاس سے تڑپنے لگے۔ ان کے جسموں میں جیسے آگ لگ گئی۔ دور دور تک سایہ کا یا پانی کا پتہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر وہ وہیں جھلس کر ختم ہوگئے۔

جب بندروں نے دیکھا کہ باغ خالی پڑا ہے تو انھوں نے پھر آکر اس پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح ایک بندر کی قربانی سے باقی سب بندروں کو آزادی اور سکون حاصل ہوا۔

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

ہندوستان

لیجیے جناب ابن بطوطہ صاحب گھومتے گھامتے ہلکوں ملکوں کی سیر کرتے آخر آپ کے دیس ہندوستان پہنچ گئے۔ اب ان سے سات سو برس پہلے کے ہندوستان کا آنکھوں دیکھا حال سنیے۔ اس وقت حکومت کیسی تھی، اس دیس کے لوگ کیسے تھے۔ کس طرح رہتے تھے۔ آپس کے میل جول کے کیا طریقے تھے۔ شادی بیاہ، تیج تیوہار، غرض تہذیب و تمدن کا اس وقت کیا انداز تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ سلسلہ آپ پوری دلچسپی اور غور سے پڑھیں گے۔

"ایڈیٹر"

سنہ ۳۴ھ محرم کی پہلی تاریخ تھی کہ ہم دریائے سندھ پہنچ گئے۔ اُسے پنج آب بھی کہتے ہیں۔ یہاں سے سلطان محمد شاہ کی حکومت شروع ہوتی ہے۔

ملتان کا حاکم قطب الملک ہے۔ ہماری اطلاع قطب الملک کو پہنچ گئی تھی۔ ملتان سے دہلی تک پچاس دن کا راستہ ہے۔ مگر بادشاہ تک پانچ دن میں خبر پہنچ جاتی ہے۔

ڈاک کا انتظام گھوڑوں سے بھی ہوتا ہے۔ اور پیدل بھی ہوتا ہے۔ ہر چار کوس پر گھوڑے بدل دیتے ہیں۔ اور تازہ دم گھوڑے ڈاک لے کر سرپٹ دوڑنے لگتے ہیں۔

پیدل ڈاک کے ہرکارے

پیدل ڈاک کی ہر ایک میل میں تین چوکیاں ہیں۔ اور ہر چوکی پر ہرکارہ کمر کسے تیار کھڑا رہتا ہے۔ ہرکارے کے پاس برچھا ہوتا ہے جس کی نوک پر گھنگھرو بندھے رہتے ہیں۔ ان گھنگھروں کی آواز سنتے ہی چوکی پر بیٹھا ہوا ہرکارہ چوکس ہو جاتا ہے۔ اور ڈاک کا تھیلا لے کر پوری قوت سے بھاگ پڑتا ہے۔ یہ ڈاک گھوڑوں سے پہلے پہنچ جاتی ہے۔ جب کبھی بادشاہ کے لیے خراسان کے میوے آتے ہیں تو اسی ڈاک سے آتے ہیں۔ کبھی کبھی سنگین مجرم بھی چارپائی پر باندھ کر ہرکارے اٹھاتے

ہیں جب میں دولت آباد تھا۔ تو اسی ڈاک سے
بادشاہ کے لیے گنگا کا پانی آیا کرتا تھا۔

گینڈا:۔

دریائے سندھ پار کر کے بانس کا جنگل آیا۔
راستہ اسی جنگل سے ہو کر جاتا تھا۔ ہم نے جنگل میں
گینڈا دیکھا۔ نہایت خوفناک شکل تھی۔ سیاہ رنگ تھا۔
اور ڈیل ڈول بڑا تھا، گینڈا ہاتھی سے چھوٹا ہوتا ہے۔
.... گینڈے کی
پیشانی پر ایک سینگ ہوتا ہے۔ تین بالشت لمبا
ایک بالشت چوڑا۔

جب یہ جنگل سے نکلا ایک سوار سامنے
آگیا۔ گینڈے نے گھوڑے کے سینگ مارا اور
سوار کی ران چیر کر اسے گرا دیا پھر جنگل میں گھس گیا۔
شام کے وقت ایک گینڈا پھر دکھائی دیا۔
یہ گھاس چر رہا تھا۔ ہم نے اسے مارنا چاہا مگر وہ
بھاگ گیا۔ ایک دفعہ بادشاہ کے ساتھ بھی گینڈا
دیکھا تھا میں ایک ہاتھی پر سوار تھا۔ اور بادشاہ
بھی ہاتھی پر سوار تھا۔ بانس کے جنگل میں چلے جا رہے
تھے۔ پیدل سپاہی گینڈے کو گھیر کر لائے اور مار
ڈالا۔ پھر اس کا سر کاٹ کر کیمپ میں لائے۔

دوسری منزل چل کر ہمیں ایک شہر ملا۔
جسے جنانی کہتے ہیں۔ شہر کے بازار بہت خوبصورت
ہیں۔ اس شہر میں سامرہ قوم آباد ہے۔ سامرہ قوم
والے کسی کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے اور کھاتے
وقت انھیں کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ ان کا سردار ونار نام
کا ایک آدمی ہے۔

میرا سفرنامہ پڑھنے والوں کو یاد ہوگا کہ
سکندریہ میں مجھ سے شیخ برہان الدین نے فرمایا تھا
"جب تو ہندوستان جائے گا تو میرے بھائی
فرید الدین سے ملاقات ہوگی اور سندھ میں رکن الدین
سے" یہاں میری ملاقات شیخ رکن الدین سے ہوئی
یہ حضرت شیخ بہاؤالدین قریشی ملتانی کی اولاد ہیں۔

سیہوان:۔

یہاں سے ہم سیہوان پہنچے۔ یہ ریگستانی
شہر ہے۔ ببول کے سوا کسی درخت کا نام نہیں
ہے۔ نہر کے کنارے پر خربوزوں کی کاشت ہوتی
ہے۔ جوار اور مٹر کی روٹی کا یہاں زیادہ رواج ہے۔
مچھلی بہت ہے، دودھ بھی خوب ملتا ہے۔ سیہوان
والے ریگ ماہی بھی کھاتے ہیں۔

ریگ ماہی پاؤں سے چلتی ہے دم
نہیں ہوتی۔ ریت کھود کر نکالی جاتی ہے گوہ
سے ملتی جلتی صورت ہوتی ہے۔ مجھے تو بڑی کراہت
ہوتی تھی نہ جانے یہ لوگ کیسے کھا لیتے ہیں۔

یہاں گرمی سخت پڑتی ہے۔ ہم لوگ
رومال بھگو کر سر پر ڈالتے تھے تب چین آتا
تھا۔ جامع مسجد کے امام شیبانی ہیں۔ انھوں نے
مجھے وہ پروانہ دکھایا جسے حضرت عمر ابن عبدالعزیز
نے ان کے دادا کو خطیب مقرر کرتے وقت دیا تھا۔

شیبانی کے خاندان میں یہ پروانہ محفوظ چلا آتا ہے۔ اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے قلم کے الفاظ الحمدللّٰہ وحدہٗ پروانہ کے سرنامہ پر ہیں۔ اس شہر میں عمر بغدادی سے ملاقات ہوئی لوگ کہتے ہیں ان کی عمر ایک سو چالیس سال کی ہے۔

لاہری:-

یہاں سے ہم لاہری بند پہنچے - لاہری سمندر کے کنارے بہت خوب صورت شہر ہے۔ یہاں یمن اور فارس کے سوداگر بکثرت آتے ہیں۔ اس لیے خوش حال اور دولت مند بھی ہے۔ علاء الملک نے بتایا کہ اس شہر کی آمدنی ساٹھ لاکھ ہے ۔۔۔۔ شہر سے سات کوس پر ایک میدان ہے۔ جسے تارنہ کہتے ہیں۔ میدان میں ان گنت مورتیاں ہیں۔ جانوروں کی، آدمیوں کی، ثابت بھی اور ٹوٹی ہوئی۔ پتھر کے گیہوں، پتھر کے چنے، برتن گھریلو سامان، ایک پتھر کا گھر ہے جس کے بیچوں بیچ چبوترہ ہے چبوترے پر پتھر کا ایک آدمی کھڑا ہے۔ جس کا سر ذرا لمبا ہے، منھ ایک طرف پھرا ہوا - دونوں ہاتھ کمر پر بندھے ہوئے ہیں۔

مشہور ہے کہ پہلے کسی زمانے میں یہ بہت بڑا شہر تھا، خدا کی پھٹکار پڑی اور تباہ ہو گیا۔ ہاتھ بندھا یہاں کا بادشاہ ہے۔

اس گھر کو راجا کا محل کہتے ہیں جگہ جگہ ہندی زبان میں کتبے دیواروں پر کندہ ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بربادی ایک ہزار برس پہلے ہوئی تھی۔

پانچ دن میں علاء الملک کا مہمان رہا اور اس نے میری بڑی خاطر کی لاہری بندسے ہم بھکر پہنچے، یہاں میری ملاقات امام عبداللہ حنفی قاضی شہر ابو حنیفہ اور شمس الدین محمد شیرازی سے ہوئی۔ شیخ شمس الدین نے بتایا کہ ان کی عمر ایک سو بیس[۱۲۰] سال کی ہے۔

اوچھ:-

یہاں سے اوچھ گئے۔ اوچھ دریائے سندھ کے کنارے بڑا شہر ہے۔ عمارتیں صاف ستھری ہیں۔۔۔ شہر کا حاکم جلال الدین اچھا آدمی ہے۔ یہاں میری ملاقات سید جلال الدین علوی حیدری سے ہوئی جنھوں نے مجھے لباس بھی دیا۔

ملتان:- اوچھ سے ملتان آئے ملتان سندھ کی راج دھانی ہے۔ یہاں کا حاکم قطب الملک ہے۔ شہر میں جانے سے پہلے ایک دریا ہے جسے کشتی سے عبور کرتے ہیں۔ یہاں ہر ایک کے سامان کی تلاشی لی جاتی ہے۔ تجارتی مال پر چوتھائی رقم محصول لیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی گھوڑا ساتھ ہو تو سات دینار لیتے ہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ نہ جانے کتنا محصول دینا پڑے، سامان اگرچہ مالیت میں زیادہ نہ تھا۔ مگر دیکھنے میں بہت زیادہ معلوم ہوتا تھا۔

باقی آئندہ

جناب اشفاق گوہر

کتاب

کہتے ہو تم جس کو کتاب — علم کے گھر کا دروازہ ہے
اس کا ہر ہر لفظ گہر ہے — جو اس کو پڑھ لے وہ امر ہے

اس میں ہزاروں راز چھپے ہیں — اس کو علم کا یم کہتے ہیں
جو پڑھتا ہے اس کی سطریں — علم کی اس پہ لگتی ہیں مہریں

اے میرے اسکول کے بچّو — تم اس سے ہی دل کو لگاؤ
اچھی کتابیں پڑھنا سیکھو — علمی کتابیں پڑھنا سیکھو

دولت ہے اک اچھی کتاب — پڑھ کر تم بن جاؤ نواب
اس دولت کو چھوڑ نہ دینا — رُخ اپنا تم موڑ نہ لینا

تم بھی بنو گے نہرو چاچا — ہوگا تمہارا گھر گھر چرچا
تم گاندھی آزاد بنو گے — دنیا میں تم نام کرو گے

لیکن! ہیں یہ ساری باتیں — پڑھنے لکھنے کی سوغاتیں
قدرت کا انعام کتابیں — عزت کا پیغام کتابیں

منھ کو ان سے موڑ نہ لینا — ان کا پڑھنا چھوڑ نہ دینا
پڑھتے رہو گے تم جو کتاب — قدر کریں گے سب احباب

" اشرف "

" ہوں !"

" للہ بتا دو نا، تم نے تو تنگ کر دیا کتنی دیر سے پریشان کر رہے ہو۔" ثمینہ نے عاجزی سے کہا۔

" عجیب ہو؟ کہا نا میں تم سے کچھ نہیں لوں گا۔ پھر تم مجھ سے کتنی چھوٹی ہو۔ مجھے تحفہ دیتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آئے گی؟" اشرف نے اپنی بزرگی جتائی۔

" بہت اچھا دادا جان! مگر بہتر یہی ہے کہ آپ اس چھوٹے بڑے کے پھیر میں نہ پڑیں بس خاموشی سے اپنی پسند بتا دیجیے تاکہ میں یہاں سے دفان ہو جاؤں۔" ثمینہ نے شوخی سے کہا۔

" اگر تمھیں دینے لینے کا ایسا ہی ارمان ہے تو جو تمھاری مرضی آئے وہ لے آؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا مجھے ہر چیز پسند ہے۔" اشرف پیچھا چھڑا کر بھاگا۔ ثمینہ بہت دیر سے اس کی جان کو آئی ہوئی تھی۔ ثمینہ بھی مسکرائی ہوئی اٹھ گئی وہ اس وقت خلافِ معمول اشرف سے بہت خوش تھی ورنہ اشرف کے اس طرح پیچھا چھڑانے پر وہ اس کی جان کو آجاتی۔

ثمینہ اشرف کی تایا زاد بہن تھی۔ آج اشرف کی سال گرہ تھی۔ اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے وہ اشرف کے گھر چار دن سے ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی۔ اس وقت وہ ریشمی پھولدار فراک میں بہت بھلی لگ رہی تھی، بالکل چینی کی گڑیا۔

اشرف سے اس کی ذرا نہ بنتی تھی۔ بنتی بھی کیسے۔ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ اتنا ہی فرق تھا جتنا دن اور رات میں ہو سورج اور چاند میں جو کبھی ایک ساتھ نہیں نکل سکتے۔ اشرف بہت ہی سنجیدہ طبیعت کا تھا۔ بڑوں کا ادب اور ان کا حکم ماننا اس کا پہلا فرض تھا ۔۔۔۔۔ ثمینہ ٹھہری چنچل اور شریر، ضد میں بھی اپنی مثال نہیں رکھتی تھی۔ کوئی بات من میں سما جائے تو ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر اپنی ضد سے باز آنا اس نے نہ سیکھا تھا۔ نتیجہ میں مار پھٹکار، ڈانٹ ڈپٹ ملتی مگر یہ

سب اس کے لیے بے معنی ہوتیں — پھر بھلا یہ دن اور رات کا ملاپ کس طرح ممکن تھا۔

ثمینہ گھر میں اکیلی تھی اس لیے ماں اور دادی کی بے حد چہیتی تھی۔ بچپن میں وہ اس کی ہر جا و بے جا خواہش بلا چوں وچرا پوری کر دیتے تھے۔ مگر اب وہ اپنی بات منوانے کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اپنی مرضی کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتی تھی۔ ماں باپ اب بہت پریشان تھے۔ بچپن کی ڈالی ہوئی عادت اتنی پختہ ہو جائے گی انھیں وہم و گمان بھی نہیں تھا ۔ وہ ثمینہ کے ہر وقت کے بے جا مطالبوں، ضد اور غراروں سے بے حد عاجز آچکی تھیں۔ مگر ان کی سمجھ میں اس کی اصلاح کی کوئی ترکیب نہیں آرہی تھی۔

آخر ایک دن ان کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں، وہ سیدھی اشرف کے والد کے پاس آئیں — ثمینہ کے دل میں کسی کا خوف تھا تو وہ ایک چچا کی شخصیت تھی۔ ان کی بات نہ ماننے کی ہمت اس میں نہ تھی۔ ویسے وہ ان کی دلچسپ باتوں کو دل سے پسند بھی کرتی تھی۔ اشرف کے والد نے اپنی بھابی سے وعدہ کرنے کو تو کر لیا مگر ابھی تک انھیں اس کے سمجھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اصل میں وہ کسی اچھے موقع کی تلاش میں تھے۔ آج ان کے لڑکے اشرف کی سالگرہ تھی انھوں نے سوچا اس سے اچھا موقع اور کیا ہوگا۔ لہٰذا انھوں نے ثمینہ کو اس وقت گھیر لیا جب وہ کہیں [illegible]

"کیوں بھئی ثمینہ باجی کہاں چلیں؟"

"چچا جان! امی کے ساتھ ذرا بازار تک جا رہی ہوں!" ثمینہ نے جلدی جلدی جوتے کے فیتے کستے ہوئے جواب دیا۔

"اب یہ بھی بتا دو کہ بازار سے کیا لینے جا رہی" چچا جان نے مسکرا کر دوسرا سوال جڑ دیا۔

"کچھ نہیں — بس ایسے ہی" ثمینہ خواہ مخواہ شرما گئی

"خیر نہ بتاؤ۔ مگر ہمیں پتہ ہے جو تم ہم سے چھپا رہی ہو" چچا جان معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے "کہو تو بتا دوں کہ بڑی بی اشرف کے لیے کوئی تحفہ خریدنے جا رہی ہیں"

"ارے آپ کو کیسے پتہ چلا، میں نے ابھی امی کو بھی نہیں بتایا" ثمینہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اشرف سے اسے امید تھی کہ اس نے اُن سے اپنی بات چیت کا ذکر ان سے نہ کیا ہوگا۔

"بس یہ نہ پوچھو۔ تمھیں پتہ نہیں ہم اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں" چچا جان اپنی آواز میں رعب پیدا کر کے بولے پھر ذرا رازدارانہ لہجہ میں پوچھا "ہاں اب تو بتا دو کیا لینے جا رہی ہو؟"

"اشرف سے تو میں نے بہت پوچھا" انھوں نے کچھ بتایا ہی نہیں۔ ویسے مجھے پتا ہے کہ اشرف کو ٹافیاں بہت پسند ہیں۔ اسی کا ڈبا لینے جا رہی تھی" ثمینہ نے بھولے پن سے جواب دیا۔

او، اگر اشرف کی طرف سے میں تم سے کوئی فرما[illegible]

کروں تو پوری کروگی؟" چچا جان ثمینہ کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"ضرور۔ ضرور" ثمینہ خوش ہوگئی "آپ ہی بتا دیجیے۔ ان نواب صاحب سے تو میں پوچھتے پوچھتے ہار گئی۔ مگر انھیں نہ بتانا تھا نہ بتایا۔"

"لیکن ثمینہ باجی میں بھی ایسی آسانی سے نہیں بتاؤں گا پہلے پورا کرنے کا وعدہ کرو" چچا جان مسکرا کر بولے۔

"آپ بتلایئے تو سہی میں ضرور پورا کروں گی" ثمینہ بڑے اعتماد سے بولی۔

"اور اگر نہیں پورا کرسکیں تو؟" چچا جان نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا جملہ نا تمام چھوڑ دیا۔

"اگر میرے بس میں ہے تب تو ضرور پورا کروں گی ورنہ مجبوری ہے اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں جس بات پر اڑ جاؤں وہ امی ابا سے کروا کر ہی دم لیتی ہوں" ثمینہ نے بڑے غرور سے کہا۔

"نا بابا نا۔" چچا جان مسکرائے۔ "نہ مجھے کچھ تمھارے ابا سے لینا نہ امی سے۔ مجھے تو وہ چیز تم سے اور صرف تم سے چاہیے ہے۔ ہاں اتنی گارنٹی ہے وہ چیز تمھارے اختیار میں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس میں بہت ہمت اور حوصلہ کی ضرورت ہے۔"

"جب آپ کو معلوم ہے کہ وہ بات میرے اختیار میں ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ میں جو بات زبان سے نکال دوں اس کو آخری وقت تک کرکے ہی دم لیتی ہوں تو پھر کہنے میں کیوں پس و پیش ہے۔ آپ مطمئن رہیے میں انشاء اللہ اپنا وعدہ پورا کروں گی۔ اس کے لیے چاہے مجھے کتنی ہی محنت کیوں نہ کرنا پڑے" ثمینہ نے اعتماد سے کہا۔

"اچھا ایسی بات ہے۔ تو آؤ" چچا جان نے خواہ مخواہ حیرت ظاہر کی اور اسے لے کر اپنے کمرے میں آئے جہاں ثمینہ کی دو سہیلیاں۔ پروین اور شاہین بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ انھیں دیکھ کر خاموش ہوگئیں۔ چچا جان اپنے پلنگ پر بیٹھ گئے اور اپنے پاس ہی ثمینہ کو بٹھا لیا۔

"ہاں چچا جان بتایئے نا" ثمینہ نے اکتا کر اس خاموشی کو توڑا جو چچا جان کے سوچنے سے پیدا ہوگئی تھی۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ اگر تم میری خواہش پوری نہ کرسکیں تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔"

"آپ کو تو صرف افسوس ہی ہوگا مگر میرے لیے وہ ڈوب مرنے کا مقام ہوگا کہ ایک چیز میرے اختیار میں ہے اور میں اسے پورا نہیں کرسکتی۔ پھر بھی میں آپ کو اتنا یقین دلاتی ہوں کہ میں اگر آپ کی خواہش پوری نہ کرسکی تو کبھی آپ کے گھر میں قدم نہیں رکھوں گی" ثمینہ نے بڑے جوش سے کہا۔

"اب تو میں اپنی خواہش کا اظہار کبھی نہیں کروں گا" چچا جان مسکرا کر بولے "نا بابا نا۔ مجھ سے یہ کبھی نہ ہوگا اگر خدانخواستہ تم میری خواہش پوری نہ کرسکیں تو میں کیا کروں گا ایک ہی تو میری ننھی منی گڑیا سی بھتیجی ہے۔ اس کے لیے بھی میں اپنے گھر کے دروازے

بند کرلوں۔"

"پھر نہ بتائیے۔" ثمینہ نے رندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا بابا ناراض نہ ہو۔ میں اپنی خواہش بتائے دیتا ہوں۔" چچا جان نے ثمینہ کا ہاتھ پکڑ کر پھر اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور چشمہ کو اپنی ناک پر جماتے ہوئے بولے۔

"اچھا بھئی سنو! میری صرف اتنی سی خواہش ہے کہ اشرف کے سالگرہ کے تحفہ میں تم مجھ سے ایک روزہ رکھنے کا وعدہ کرلو۔"

"روزہ!" ثمینہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ تو سمجھے ہوئے تھی کہ نہ معلوم چچا جان کون سی ایسی بات کہیں گے جو انھیں اس کے پورا ہونے کی توقع نہیں ہے مگر چچا جان نے کہی بھی تو کیا بات جو اس کی عین تمنا تھی۔ روزہ رکھنے کو تو اس کا بھی ایک مدت سے دل چاہتا تھا۔ گھر میں سب کو روزہ رکھتے دیکھتی تو خود بھی بے چین ہو جاتی۔ مگر بھوک کی برداشت نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اگلے سال روزہ رکھنے کا سوچ کر دل کو تسلی دے لیتی تھی۔ اب اپنی مدت کی آرزو کو اس بہانے یوں پورا ہوتے دیکھ کر خوش ہوگئی مگر اچانک ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا اور وہ پھر اداس ہوگئی۔ اس نے سوچا چچا جان نے محض اس کے ناراض نہ ہونے کی وجہ سے یہ بہانہ بنایا ہے۔ ورنہ وہ اتنی سی بات کے لیے اتنے ناامید کیوں ہوتے۔ نہ وہ بے یقینی سے بولی۔

"اچھا جائیے نہ بتائیے۔" اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے تمھیں یقین نہیں آیا۔" چچا جان حیرت سے بولے اور پھر اسے بٹھا لیا۔ "واقعی میں تم سے روزہ ہی رکھنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔"

"مگر چچا جان آج کل روزوں کے دن کہاں ہیں؟" ثمینہ کی سہیلی پروین نے پہلی بار مداخلت کی۔ وہ بڑی دلچسپی اور حیرانی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"اوہ! تم لوگ رمضان شریف کے روزے سمجھ رہی ہو۔ مگر میں ان روزوں کے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔" چچا جان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر کون سے روزے کی بات کررہے ہیں؟" ثمینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"میں تم سے ایک ایسا روزہ رکھنے کے لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر تم اسے رکھ لو تو دنیا کی سب سے خوش نصیب لڑکی بن جاؤ۔ کوئی بھی لڑکی اس دنیا میں تمھارے مقابلہ پر نہ نکلے۔" چچا جان اپنی بات کا اثر دیکھنے کو خاموش ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر کہنا شروع کیا۔ "پھر دولت، عزت، شہرت سب تمھارے قدم چومے اور مزے کی بات یہ کہ اس روزہ میں نہ کھانے کی قید ہے نہ پانی کی نہ سحری کے لیے جاڑوں کی سرد رات میں اٹھنا پڑتا ہے نہ افطار کے لیے مغرب کی اذان کا بے چینی سے انتظار کرنا پڑتا ہے کہ کب اذان ہو اور ہم کھانے پر ٹوٹیں۔ اس روزہ کی سحری

زندگی میں صرف ایک مرتبہ کھائی جاتی ہے جو مرتے
دم تک برقرار رہتی ہے۔ رہا افطار تو وہ نہ زندگی میں
ہوتا ہے نہ مرنے کے بعد ہاں اس کا اجر اللہ تعالیٰ
دنیا میں تو دیتا ہی ہے مگر مرنے کے بعد تو خاص طور
سے اپنے ہاتھ سے وہ انعام دے گا جس کا تم تصور
بھی نہیں کر سکتیں۔ پھر اس انعام کو دیکھ کر تمھاری اور
سہیلیاں بھی تمنا کریں گی کہ کاش ہم نے بھی یہ روزہ
رکھا ہوتا تو آج اللہ میاں ہمیں بھی انعام دیتے لیکن
بس وہ تلملاتی ہی رہ جائیں گی۔ کیونکہ اس وقت تک
تو بہت دیر ہو چکی ہوگی اور وہ انعام پانے کا وقت
ہوگا سحری کرنے کا نہیں۔"

ثمینہ، پروین اور شاہین تینوں حیرت بنی چچا
جان کی تقریر سن رہی تھیں۔ مگر جس روزے کے متعلق
چچا جان یہ تقریر کر رہے تھے وہ تینوں میں سے ایک
کے بھی پلے نہیں پڑا تھا۔ وہ سب حیران و پریشان
اپنے جی میں سوچ رہی تھیں کہ آخر وہ کون سا روزہ ہے
جو نہ کھانے سے ٹوٹتا ہے نہ پانی سے اور جو ساری
عمر کے لیے رکھا جاتا ہے۔ آخر شاہین نے ہی اپنی
حیرت کم کرنے کے لیے پہل کی۔

"چچا جان! پھر تو وہ روزہ بہت ہی سخت
اور مشکل ہوگا جو تمام زندگی کے لیے رکھا جاتا ہے؟"

"ہاں! یہ تو سچ ہے کہ یہ روزہ بہت سخت
اور مشکل ہے۔ مگر ناممکن نہیں۔ انسان کوشش
کرے تو اس روزہ کو رکھنے میں کامیاب ہو سکتا
ہے بس ذرا اسے اپنے نفس کو مارنا پڑے گا۔" چچا
جان نے تینوں کو بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا اور
چند لمحوں بعد پھر کہنا شروع کیا۔ "اور یہ جان کر تمھیں
اور بھی حیرت ہوگی کہ اس روزہ میں صرف ایک بات
کا دھیان رکھنا پڑتا ہے یا یوں سمجھو کہ تمھیں ایک
بات کا روزہ رکھنا پڑے گا۔"

"ایک بات کا؟" تینوں کے منھ سے بے ساختہ
نکلا۔

"ہاں صرف ایک بات کا!" چچا جان کے چہرے
پر ایک لطیف سی مسکراہٹ لہریں لینے لگی۔ انھوں
نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ساری دنیا میں اپنی مثال
قایم کرنے، عزت، دولت شہرت حاصل کرنے کے لیے
اور عقبیٰ میں اللہ تعالیٰ سے انعام پانے کے لیے تمھیں
ایک اور صرف ایک بات کا ہر وقت دھیان رکھنا پڑے
گا۔ ایک بات کا ہمیشہ پابند رہنا پڑے گا۔"

"آخر وہ کون سی بات ہے؟" پروین نے
بے تابی سے پوچھا۔

"واہ بھئی! اگر ایسے بتا دیا تو مزہ ہی کیا رہے
گا۔ پہلے روزہ رکھنے کا وعدہ کرو پھر بتاؤں گا۔"
چچا جان نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اچھا چچا جان فرض کیجیے وہ روزہ ہم سے
بھولے سے ٹوٹ جاتا ہے تو پھر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"
یہ سوال ثمینہ نے کیا۔

"شاباش! یہ تم نے بہت عمدہ سوال کیا۔"

چچا جان نے ثمینہ کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔
"بھئی بھول چوک تو انسان سے ہوتی ہی رہتی ہے۔ آخر غلطی کا پتلا جو ٹھہرا۔ اللہ تعالیٰ بھی رمضان شریف میں بھولے سے کھانے والے انسان کو معاف کر دیتا ہے۔ مگر اسی شرط پر کہ بندہ روزہ کا خیال آتے ہی فوراً اس چیز کو تھوک کر کلّی کر لے۔ اسی طرح اس روزہ میں بھی اگر تم سے بھول چوک ہو جائے تو فوراً اس غلطی کو دوبارہ نہ کرنے کا دل میں تہیہ کر لینا۔"

"اچھا چچا جان اب بتائیے وہ کیا بات ہے جس کا ہمیں روزہ رکھنا ہے۔ میں روزہ رکھنے کو تیار ہوں۔" ثمینہ نے چچا جان کے خاموش ہوتے ہی بڑے اعتماد سے اپنے روزہ رکھنے کا اعلان کر دیا۔

"شاباش!" چچا جان نے ثمینہ کی پیٹھ تھپتھپائی اور پھر پروین اور شاہین کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ان دونوں نے بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر روزہ رکھنے کی حامی بھر لی۔

"سوچ لو اب بھی موقع ہے۔" چچا نے تینوں پر ایک گہری نظر ڈالی۔

"چچا جان اب بتا بھی ڈالیے۔" ثمینہ نے بے صبری سے کہا: "آپ پہیلیاں بجھا رہے ہیں اور ہم اشتیاق میں مرے جا رہے ہیں۔"

"بھئی تمھاری مرضی میں تو تمھیں ایک موقع اور دے رہا تھا۔" چچا جان ثمینہ کے اضطراب پر بے ساختہ مسکرا پڑے۔

"اچھا بھئی سنو! وہ بات جس نے تمھیں پریشان کر رکھا ہے اور جس کا تمھیں روزہ رکھنا ہے وہ صرف اتنی سی بات ہے کہ ہمیشہ اپنے بڑوں کا کہنا مانو۔ وہ جو کہیں اسے تم ہر ممکن طریقے پر پورا کرو۔ خواہ وہ بات تمھیں بھلی لگے یا نہ لگے۔"

"ارے!" ایک بار پھر تینوں پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ان کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ تو نہ معلوم کیا سوچے ہوئے تھیں۔ انھیں تو ایسا لگا کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔ "واقعی چچا جان بس اتنی سی بات تھی یا آپ مذاق کر رہے ہیں؟" ثمینہ نے حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے لہجہ میں پوچھا۔

"کیوں بھئی اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے؟" چچا جان تینوں کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولے "کیا آج تم تینوں نے میری کسی بھی بات پر یقین نہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے؟"

"مگر چچا جان! اگر ہم آپ کی بات مان بھی لیں تو بھی وہ اتنی ڈھیر ساری مـ - - - - - - - - - - -

- - - "ہاں ہاں" وہ سب حاصل ہو جائیں گی تم ایک پر عمل کر کے تو دیکھو۔" چچا جان نے شاہین کی بات بیچ سے اچک لی۔ "میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل سچ ہے ذرا بھی جھوٹ نہیں۔ اگر تم نے میرے کہنے پر عمل کیا تو ساری دنیا میں چاند کی طرح چمکو گی۔ عزت دولت شہرت سب تمھاری لونڈی غلام ہوں گی۔ اور یہ سب کچھ صرف ایک بڑوں کا کہنا ماننے سے حاصل ہوگا۔

تمھیں نہیں معلوم تمھارے بزرگ جو کچھ بھی تم سے کہتے ہیں وہ صرف تمھاری بھلائی کے لیے کہتے ہیں۔ مارتے پیٹتے وقت بُرا بھلا کہتے وقت بھی ان کی نظروں میں تمھاری بھلائی ہی ہوتی ہے۔ وہ ہر صورت میں تمھاری بھلائی چاہتے ہیں۔ ان کی باتوں پر ناراض ہونے اور بُرا ماننے کی بجائے ٹھنڈے دل سے سننا چاہئیں۔ ان کی ذرا ذرا سی باتوں پر عمل کرنا چاہیے۔ یہی معمولی معمولی باتیں تمھیں ترقی کے دوراہے پر لا کھڑا کریں گی تمھیں ترقی کی راہ پر دیکھ کر وہ کتنا خوش ہوں گے اور جب وہ سب تم سے خوش ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کیوں نہ خوش ہوگا۔ اس خوشی میں وہ تمھیں جو نہ دے دے وہ تھوڑا ہے۔"

" واقعی چچا جان آپ نے تو دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔" ثمینہ نے حیرت سے کہا۔ وہ اس انکشاف سے بہت زیادہ متاثر نظر آ رہی تھی۔

" پھر بھی اگر تم لوگوں کو یقین نہ آ رہا ہو تو ایسا کرو کہ یہ روزہ ایک دن کے لیے تجربہ کے طور پر رکھ کر دیکھ لو۔ ایک دن میں تمھیں اس کے نفع نقصان کا اندازہ ہو جائے گا۔ فائدہ نظر آئے تو اس روزے کو بڑھا کر زندگی بھر کے لیے رکھ لینا۔" چچا جان نے اپنا تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر اپنے روزے میں تھوڑی سی ترمیم کر دی اور تینوں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

" ہاں تو بتاؤ کیا ارادہ ہے؟"

" چچا جان! آپ خیال اور ارادہ ظاہر کرنے کی تو آپ نے گنجایش ہی نہیں چھوڑی۔ آپ تو ہم سے پہلے ہی وعدہ لے چکے ہیں۔ اب تو ہم یہ انوکھا روزہ رکھیں گے اور ضرور رکھیں گے بس آپ دعا کیجیے کہ ہم اس میں بھول چوک نہ کرنے پائیں۔" تینوں نے اعلان کیا۔

" آمین! خدا تمھیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔" چچا جان نے کچھ اس انداز سے بزرگانہ انداز میں دعا دی کہ تینوں لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ چچا جان نے خود بھی ان کا ساتھ دیا اور گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولے۔

" اچھا اب جاؤ سالگرہ کا وقت قریب آگیا ہے۔" اور خود بھی مسکراتے ہوئے اٹھ گئے۔

جناب رفیق شاستری

پنج تنتر کی کہانیاں

گیدڑ بچہ (مسلسل)

راجہ نے کمہار کو تب گیدڑ اور شیر کی یہ کہانی سنائی:-

ایک جنگل میں شیر شیرنی کا ایک جوڑا رہا کرتا تھا۔ شیرنی نے دو بچے دیئے۔ شیر روزانہ ہرن کا شکار کر کے شیرنی کے لیے گوشت لے آتا تھا۔ ایک دن شام تک جنگل کی خاک چھاننے پر بھی کوئی شکار ہاتھ نہ لگا۔ یوں ہی خالی ہاتھ گھر واپس آ رہا تھا کہ راستے میں اسے گیدڑ کا ایک بچہ ملا۔ اسے بچے پر ترس آیا اور اسے وہ زندہ ہی گھر اٹھا لایا اور شیرنی کے سامنے ڈالتے ہوئے اس سے کہا۔ آج کوئی شکار تو ملا نہیں۔ راستے میں یہی بچہ ملا۔ میں اسے زندہ ہی لے آیا ہوں۔ اگر تمھیں بھوک بہت ستا رہی ہو تو اسے مار کر کھا لو۔ صبح پھر کوئی شکار لا دوں گا۔"

شیرنی بولی۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ جس نادان بچے پر تمھیں ترس آیا اسے بھلا میں کیسے کھا سکتی ہوں۔ میں تو اسے اب اپنے بچے کی طرح پالوں گی۔ یہ گیدڑ کا بچہ بھی شیرنی کا دودھ پی کر میرے جیسا ہی طاقتور ہو جائے گا۔ یہ میرے بچوں کے ساتھ کھیلا کرے گا۔

شیر شیرنی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اس تیسرے گیدڑ کے بچے کو بھی پالنے لگے اور تینوں سے یکساں محبت کرنے لگے۔

ابھی کچھ ہی دن گذرے تھے کہ اس جنگل میں ایک موٹا ہاتھی آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی شیر کے دونوں بچے غراتے ہوئے اس کی طرف لپکے۔ ہاتھی کو دیکھ کر گیدڑ کے بچے کے تو ہوش اڑ گئے۔ اس نے شیر کے دونوں بچوں کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ وہ کہنے لگا "ہاتھی ہمارا دشمن ہے۔ ہمیں دشمن سے دور ہی رہنا چاہیے"۔ یہ کہہ کر اس نے گھر کا رخ کیا۔ شیر کے بچوں کا بھی اس سے حوصلہ پست ہوا۔ وہ بھی گھر کی طرف لوٹ آئے۔

گھر پہنچ کر شیر کے بچوں نے گیدڑ کے بچے

کی شکایت کی اور بندلی پر اسے خوب پھٹکارا اور اس کا مذاق بھی اُڑایا۔ گیدڑ کا بچہ یہ لعن طعن سن کر غصّہ ہوا اٹھا۔ اور وہ ان دونوں کو بھی جلی کٹی سنانے لگا۔ شیرنی نے اسے اکیلے میں بلا کر کہا ”تمھیں ان بچّوں کی بات پر اتنا غصّہ نہیں دکھانا چاہئے وہ چھوٹے ہیں ناسمجھ ہیں۔ ان کی بات پر تمھیں دھیان نہیں دینا چاہیے۔“

گیدڑ بچہ شیرنی کے سمجھانے بجھانے پر اور بھی بھڑک اٹھا۔ وہ کہنے لگا ”بھلا میں کس بات میں ان دونوں سے کم ہوں جو اس طرح کی بات سنوں۔ بہادری میں عقل مندی میں یا ہنر میں آخر میں کس بات میں ان سے کم ہوں۔ میں کیوں ان کی اس طرح کی بات سنوں۔ میں ان کو اس کا مزا چکھاؤں گا اور ان کا خون پی جاؤں گا۔“

شیرنی گیدڑ بچے کی یہ بات سن کر بہت ہنسی اور بولی ”تو بہادر بھی ہے عقل مند بھی ہے، خوب صورت بھی ہے۔ مگر جس گھرانے میں تو پیدا ہوا ہے۔ وہاں ہاتھی نہیں مارے جاتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں تجھے سب کچھ بتا دوں۔ بیٹا تم شیر کے نہیں گیدڑ کے بچے ہو۔ میں نے اپنا دودھ پلا کر تمھیں پالا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں بچے اس حقیقت کو سمجھیں تمھاری بھلائی اس میں ہے کہ تم یہاں سے بھاگ نکلو اور اپنی برادری کے لوگوں میں جا ملو۔ نہیں تو یہ دونوں بچے تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

یہ سن کر وہ گیدڑ بچہ وہاں سے بھاگ نکلا اور گیدڑوں کی غول میں شامل ہو گیا۔

کہانی سنانے کے بعد راجہ نے کمہار سے کہا ”اس سے پہلے کہ دوسرے شہزادوں کو تمھاری اصلیت کا پتہ چلے تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اگر ان لوگوں کو پتہ چل گیا کہ تم کوئی بہادر سورما نہیں ہو بلکہ ایک معمولی کمہار ہو اور تمھارے ماتھے کا یہ نشان مٹکے کا ٹکڑا لگ جانے کی وجہ سے لگا ہے تو وہ تم کو زندہ سلامت نہ چھوڑیں گے۔ اب تمھاری خیر اسی میں ہے کہ تم اس گیدڑ بچے کی طرح جا کر کمہاروں کی برادری میں شامل ہو جاؤ۔“

بندر سے اتنی کہانی سننے کے بعد مگرمچھ کچھ پریشان ہوا مگر اس سے پہلے کہ مگرمچھ یاں کچھ کہیں بندر مگرمچھ سے کہنے لگا ”تو نے عورت کے کہنے میں آکر میرے ساتھ دغا کی ہے۔ عورتوں کا کبھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ کیا تو نے لنگڑے اور برہمن عورت کی کہانی نہیں سنی ہے؟“

مگرمچھ نے کہا نہیں تو۔

بندر نے پھر مگرمچھ کو لنگڑے اور برہمن عورت کی یہ کہانی سنائی۔

کسی جگہ ایک برہمن اور اس کی بیوی بہت میل جول سے رہتے تھے۔ مگر برہمن کی عورت برہمن کے گھر والوں سے جلتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتی تھی۔ روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آکر برہمن نے سوچا کیوں نہ ماں باپ اور بھائی بہن کا ساتھ چھوڑ کر کہیں دور الگ جاکر رہا جائے۔ بس پھر کیا تھا۔ برہمن اپنی بیوی کے ساتھ سفر پر نکل پڑا۔

راستہ لمبا تھا جنگل میں پہنچنے پر برہمن عورت کو پیاس لگی۔ برہمن پانی لینے چلا گیا۔ دور سے پانی لانے میں دیر لگی۔ وہ پانی لے کر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ عورت مری پڑی ہے۔ برہمن رونے چلانے لگا اور بھگوان سے گڑ گڑا کر دعا مانگنے لگا۔ اس کے اس طرح آہ وزاری کرنے سے دیوتاؤں کو اس پر رحم آگیا۔ اور غیب سے آواز آئی "اے برہمن اگر تجھے اپنی بیوی سے اتنی ہی محبت ہے اور تو اسے زندہ دیکھنا چاہتا ہے تو تجھے اپنی آدھی زندگی اُسے دینی ہوگی۔ برہمن یہ بات مان گیا اور عورت زندہ ہوگئی۔ دونوں نے پھر سفر شروع کر دیا۔

بہت دور جانے پر ایک شہر ملا۔ شہر سے باہر ایک باغ تھا۔ اس باغ میں برہمن نے اپنی بیوی کو چھوڑ کر کہا "تم یہیں رہو میں شہر جاکر کھانے کا کچھ سامان لے آؤں"۔

برہمن کے جانے کے بعد عورت وہاں اکیلی رہ گئی۔ اسی وقت باغ کے کنویں پر ایک لنگڑا آیا۔ وہ لنگڑا ضرور تھا مگر تھا بہت خوب صورت۔ برہمن کی عورت اس سے بولی "میں اس برہمن کے ساتھ بہت تنگی میں زندگی گذار رہی ہوں گھر سے نکلنے کے بعد آرام نہیں ملا ہے۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو تاکہ مجھے ان مشکلوں سے نجات مل سکے۔

برہمن جب کھانا لے کر واپس آیا تو برہمن کی عورت نے اس سے کہا۔ یہ لنگڑا بھی بھوکا ہے۔ اسے بھی اپنے حصّے میں سے دے دو۔

جب آگے چلنے لگے تو برہمن عورت نے کہا "سفر میں بات چیت کرنے کے لیے کوئی نہیں ہے۔ اس لنگڑے آدمی کو ساتھ لے لیا جائے بات چیت میں سفر اچھا کٹے گا"۔

برہمن بولا "یہاں اپنا ہی بوجھ اٹھانا مشکل ہو رہا ہے۔ اس لنگڑے کا بوجھ خواہ مخواہ کیوں اٹھایا جائے"۔

مگر عورت نہ مانی۔ اس کی ضد کے آگے برہمن کو جھکنا پڑا۔ اور لنگڑا بھی آگے کے سفر میں اُن کا ساتھی بن گیا۔ دونوں نے اسے ایک پٹارے میں بند کر لیا۔ اور اپنے سر پر لاد کر آگے بڑھے۔

کچھ دور جاکر لنگڑے نے برہمن کو دھوکا دے کر کنویں میں گرا دیا اور یہ سمجھ کر کہ وہ مر گیا ہے وہ لنگڑا اور عورت وہاں سے آگے بڑھے۔

کچھ دور جاکر جب وہ ایک شہر کی حد میں

داخل ہوئے۔ تو سرحد کے پہرہ داروں نے تلاشی لی۔ پٹارے میں ایک لنگڑے آدمی کو بند دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے۔ ہوتے ہوتے یہ بات راجہ کے کانوں تک پہنچی۔ راجہ کے پوچھنے پر عورت نے بتایا یہ لنگڑا اس کا شوہر ہے۔ گھر والوں سے تنگ آکر ہم لوگوں نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ راجہ نے اپنے ملک میں رہنے کی اجازت دے دی۔

اِدھر کا قصّہ سنیئے جس کنویں میں برہمن گرا ہوا تھا۔ اُدھر سے ایک سادھو کا گذر ہوا۔ سادھو نے کنویں میں سے کسی کے چلانے کی آواز سنی جھانک کر دیکھا تو ایک آدمی چلاّ رہا تھا۔ اس نے کنویں سے اس برہمن کو نکال لیا۔ برہمن کنویں سے نکل کر گھومتا پھرتا اسی شہر میں پہنچا۔ برہمن کی عورت نے جب اسے دیکھا تو اسے فکر ہوئی۔ اس نے راجہ سے کہا۔ یہ شخص ہمارے گھر والوں کا پرانا دشمن ہے۔ اسے شہر بدر کرا دیا جائے۔

راجہ کو یہ سن کر غصّہ آیا۔ اس نے برہمن کو پھانسی دینے کا حکم دے دیا۔

پھانسی کا حکم سن کر برہمن نے راجہ سے کہا "مہاراج اس عورت نے مجھ سے کچھ لے رکھا ہے۔ مرنے سے پہلے آپ مجھے وہ چیز دلوا دیجیے۔"

راجہ نے عورت سے کہا "تم نے اس آدمی سے جو بھی چیز لی ہو وہ واپس کر دو۔"

عورت بولی "مہاراج یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے اس کی کوئی چیز نہیں لی۔"

تب برہمن نے اسے یاد دلایا کہ اس نے اس کی آدھی جان لے رکھی ہے اور تمام دیوتا اس کے گواہ ہیں۔

عورت نے دیوتاؤں کے ڈر سے آدھی جان واپس کرنے کا وعدہ کر لیا اور وعدہ کرنے کے ساتھ ہی اس کی جان نکل گئی۔

عورت کے مرنے کے بعد برہمن نے سارا قصّہ راجہ کو بتا دیا۔

یہ کہانی سنانے کے بعد بندر نے پھر مگرمچھ سے کہا "تم بھی عورت کے غلام بن گئے ہو۔ جس طرح یہ راجہ بن گیا تھا۔

مگرمچھ نے پوچھا وہ کیسے۔ تب بندر نے مگر کو یہ کہانی سنائی

آگے کا دلچسپ حال جنوری میں پڑھیے۔

اگلا پرچہ سالنامہ ہے۔

انتظار کیجیے۔

جناب خلیق انجم اشرفی

فرض شناس

موت حقیقت ہے بڑی تلخ حقیقت ہے۔ ہر آنے والے کو آخر جانا ہے۔ یوں تو ہر موت غم ناک ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کا سوگ کنبے کے چند آدمی یا محلے کے چند سو یا چند ہزار آدمی مناتے ہیں لیکن بعض شخصیتوں کی موت پوری انسانیت کو سوگوار بنا دیتی ہے ذاکر صاحب کا شمار ایسی ہی شخصیتوں میں ہے۔

ذاکر صاحب کی جدائی پر ہر شخص اس لیے سوگوار نہیں تھا کہ وہ جمہوریۂ ہند کے صدر تھے بلکہ اُن کی شخصیت کی عظمت کا، بڑائی کا راز ان کے اپنے کردار میں پوشیدہ تھا۔ شرافت، خدمت کا جذبہ رواداری، محبّت، شفقت، انکسار، خلوص، سنجیدگی بردباری، ضبط و صبر اور فرض شناسی کی خصوصیات ان کی شخصیت میں اس طرح رچ بس گئی تھیں کہ ان سے الگ ان کی شخصیت کا تصوّر ممکن ہی نہیں۔

ایک تراشے ہوئے ہیرے کا ہر پہلو دوسرے سے زیادہ تاب ناک اور روشن نظر آتا ہے اسی طرح ذاکر صاحب کی شخصیت کا ہر پہلو دوسرے سے ... اور دل کش اور تاب ناک تھا۔

ان کی شخصیت کا غالباً سب سے زیادہ تاب ناک پہلو اُن کی فرض شناسی تھی۔ اسی فرض شناسی نے ان میں خدمت اور خلوص کے جوہر پیدا کر دیے تھے۔ ان کی تمام زندگی ملک اور قوم کی خدمت میں گزری، فرض کی ادائگی اور لوگوں کی خدمت ہی ان کے لیے عبادت تھی اور اس طرح ان کی تمام زندگی یوں سمجھیے کہ خدا کی بہترین عبادت میں گزری انسان کے پیدا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کے دُکھ درد کو اپنا کر اس کا مداوا کرنے کی کوشش کرے۔

ذاکر صاحب کی فرض شناسی کا ایک واقعہ تو آپ پیامِ تعلیم کے صفحوں میں بار بار پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح انھوں نے اپنی چہیتی بیٹی "ساقیہ ریحانہ" کی بے ہوشی اور پھر انتقال کی خبر سُن کر بے مثال صبر و ضبط سے کام لیا تھا، فرض کو محبّت پر ترجیح دی تھی، یہ بے حسی نہ تھی بلکہ فرض شناسی کا ایک مظاہرہ تھا ایسا مظاہرہ جسے خدا ہمیں آپ کو سب کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

ذاکر صاحب نے جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا جامعہ کے لیے اُن کی محبّت کا جذبہ اتنا قوی تھا کہ جب جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے تو کئی یونیورسٹیوں نے انھیں وائس چانسلر کا ...

پیش کیا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ:

"میں قرول باغ کے مدرسہ (جامعہ ملیہ) کا مُلّا رہنا پسند کرتا ہوں"۔

ذاکر صاحب خود فرض شناس تھے فرض کی بجا آوری میں کسی کو تساہل کرتے دیکھتے تو اچھے ڈھنگ سے اسے سیدھی ڈگر پر لے آتے۔ ایک مشہور واقعہ ان کے گھر کے ایک نوکر کا ہے، یہ بہت سست اور کاہل تھا صبح کو دیر تک بستر پر پڑا اینڈتا رہتا تھا۔ گھر والے اس کی اس عادت سے بہت نالاں تھے جب انھوں نے اُسے نکالنے کا ارادہ کیا تو ذاکر صاحب نے منع فرمایا کہ ایسا نہ کرو اور اس کو مجھ پر چھوڑ دو۔

دوسرے دن صبح وہ کندھے پر تولیہ ڈال کر اور ہاتھ میں پانی کا جگ لے کر اس نوکر کے پلنگ کے پاس پہنچے اور بولے:

"اُٹھیے صاحب! منہ ہاتھ دھو لیجیے، ناشتہ تیار ہے"۔

نوکر نے آنکھیں کھول کر ذاکر صاحب کو دیکھا تو بھاگ کر چھپ گیا اور پھر جلدی سے ناشتہ لگا دیا۔ اس کے بعد کسی کو اس سے کوئی شکایت نہ ہوئی۔ یہ بھی دیکھیے کہ نوکر کو راہ پر لگانے کے لیے انھوں نے کس حکمتِ عملی سے کام لیا اور وہ اپنے کام میں کیسا چاق بن گیا۔

ذاکر صاحب کی زندگی کا بیشتر اور بہترین حصہ [illegible]

تو ان کی ساری زندگی ایک اچھے اور شفیق استاد کی زندگی ہے اسی لیے جب وہ بہار کے گورنر، نائب صدر جمہوریۂ ہند اور پھر صدر جمہوریۂ ہند بنے تو عملاً تو طالب علموں سے دور ہو گئے لیکن باوجود اس کے طالب علموں کی بہبودی کا انھیں ہر وقت خیال رہتا تھا، ادھر کچھ عرصے سے طالب علموں میں جو بدنظمی اور ہنگامہ پسندی پیدا ہو گئی تھی اس سے بہت تکلیف پہنچی تھی ایک بار انھوں نے اسی بدنظمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"طلباء فرض کو اوّلین مقام دینے کا خیال رکھیں" فرض کی ادائیگی کا انحصار حقوق کے حصول پر نہیں۔ ملک کا مستقبل طلباء کی فرض کی ادائیگی کی خواہش اور قابلیت پر منحصر ہے ورنہ کسی کے حق کے لیے ان کا کوئی بھی مطالبہ مہمل ہوگا"

ان کے اس جملے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ فرض کی ادائیگی کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

ذاکر صاحب جب صدر جمہوریۂ ہند منتخب ہوئے تو وہ ستّر سال کے ہو چکے تھے، انکی صحت جواب دے چکی تھی اور ایک انتہائی اہم ذمّہ داری ان کے شانوں پر آ پڑی تھی، لیکن انھوں نے جس خوش اسلوبی سے آخری دم تک اس اہم عہدہ کی ذمّہ داریوں کو نبھایا وہ اُن کی فرض شناسی کی تابندہ مثال ہے۔

پچھلے سال یوم جمہوریہ کے موقع پر ان کی صحت [illegible]

کرنے پر بھی انھوں نے سلامی لی۔ کچھ ہی روز پہلے دل کا دورہ پڑ چکا تھا اس لیے ڈاکٹر بہت فکرمند تھے اور انھوں نے اسی شرط پر ذاکر صاحب کو سلامی لینے کی اجازت دی کہ وہ جب تک کوئی تکلیف محسوس نہ کریں اپنا ایک پیر ہلاتے رہیں تاکہ ڈاکٹروں کو یہ معلوم رہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں اور اگر گھبراہٹ محسوس کریں تو پیر ہلانا بند کردیں۔ ذاکر صاحب مستقل طور پر یہ تکلیف دہ فرض انجام دیتے رہے۔

محترمہ شاہجہاں بانو (بیگم ذاکر صاحب) کا بیان ہے کہ انتقال سے چند روز پہلے وہ دن بھر کے کاموں سے فارغ ہو کر شام کے سات بجے کھانا کھانے بیٹھے تو انتہائی اہم کاغذات دستخط کے لیے آ گئے۔ بیگم صاحبہ نے کہا کہ کھانا کھا کر یہ کام کر دیجیے گا لیکن ذاکر صاحب بھلا فرض کے تقاضے کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے کھانا چھوڑ کر اٹھ گئے اور فرمایا: "اسی کام کی تو روٹی کھاتا ہوں بھلا اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں"

"کام عبادت ہے" آب زر سے لکھے جانے کے قابل یہ جملہ ساری زندگی ان کے لبوں پر رہا اور اسی سے وہ اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کی ہمت بڑھاتے رہے اور ان میں فرض کی ادائیگی اور لگن اور جذبہ پیدا کرتے رہے۔

زندگی پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بستر ہے۔ اس بستر کو لیٹنے کے قابل بنانے کے لیے ان کانٹوں کو چننا [illegible]

ہمت، بڑے صبر اور مسلسل کوشش کی ضرورت ہے بقطار تھک جاتی ہیں، ہاتھ زخمی ہو جاتے ہیں لیکن انھی تھکی قطروں سے زندگی کو روشنی ملتی ہے۔ انھی زخمی ہاتھوں سے ٹپکے ہوئے لہو کے قطرے زندگی کی سیج کے پھول بن جاتے ہیں یہ ایک مقدس فرض ہے لیکن اگر کوئی شخص اس فرض کو محض اپنی زندگی کے لیے مخصوص نہ کرے تمام انسانوں کے لیے عام کردے تو وہ صحیح معنوں میں انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ ذاکر صاحب نے تمام عمر یہی کیا ہے وہ خوا ہڈی کی پلیٹ میں پڑے روٹی کے جلے کچے ٹکڑوں او پھینکی ہوئی سبزی کو اس لیے کھالینے کا واقعہ ہو کہ ا طرح انکا کھانا دوسروں کے کام آسکتا ہے یا گومتی کے بھیانک سیلاب میں آفت زدوں کی امداد کے لیے کا کرتے ہوئے بیمار پڑ جانے کا یا جامعہ کی بہبودی کے لیے ہر بڑے عہدے کی پیش کش ٹھکرا دینے کا، ہر جگہ وہی فرض شناسی وہی دوسروں کی زندگی کے کانٹوں کو پھولوں میں بدلنے کا جذبہ نظر آتا ہے۔

نصف صدی سے زیادہ عرصے تک ملک و قوم کی بہ کے لیے مسلسل محنت کرتے کرتے وہ تھک چکے تھے۔ آگے قد بڑھانے کے لیے دم لینے کو ٹھہر گئے ہیں، دم لینے کے بعد ان کا سفر بھی جاری رہے گا۔ وہ ہماری نظروں سے بے شک اوجھل ہ لیکن ان کی شخصیت ایک مینارۂ نور کی طرح جہل، فرقہ پر فرض سے غفلت و تساہل کی تاریکیوں کو دور کرتی رہے گی ا ہندوستانی عوام خصوصاً طالب علم اس مینارۂ نور کی روشنی میں ا منزل کی طرف بڑھتے جائیں گے۔

بچوں کی کوششیں

ہاتھی ہوتا ساتھی اپنا

ہاتھی ہوتا ساتھی اپنا
بڑا مزہ پھر مجھ کو آتا
لمبے چوڑے کان ہلاتا
سونڈ اٹھاتا سونڈ گراتا
صبح صبح وہ گھر آجاتا
تو میں اس کو کہاں بٹھاتا
کیا کھاؤ گے بولو ہاتھی
سن کر بھی وہ چپ ہوجاتا
جو میں دیتا وہ کھا جاتا
سونڈ ہلا کر کچھ بتلاتا
ڈر جاتے سب میرے ساتھی
چلاتے بس ہاتھی ہاتھی
میں کہتا وہ میرا ساتھی
چلو یہاں سے ساتھی ہاتھی
سونڈ پکڑ کر اس پر چڑھتا
پر وہ مجھ کو نہیں گراتا

قمر احمد آزاد (رہتاسوی)

خلیفہ کے بچوں کی عید: یہ اب سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ عرب میں ایک بار عید آئی لوگوں نے پہلے ہی سے عید کی تیاریاں شروع کردیں۔ اپنے بال بچوں کے لیے اچھے سے اچھے کپڑے بنوائے اور خوب قیمتی سامان خریدا۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے صاحب زادوں نے سوچا۔ ہمارے باپ تو خلیفہ ہیں۔ وہ ہمارے لیے ان سے کہیں اچھے سامان خریدیں گے۔ ایسے کپڑے بنوائیں گے کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔ لیکن ہوتے ہوتے عید بالکل قریب آگئی۔ عید کا چاند بھی دیکھا جا چکا۔ پر ان کے گھر کوئی سامان نہ آیا۔ تو یہ بھی اپنی والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کہنے لگے "امی جان کل عید ہے ہمارے تمام ساتھیوں کے لیے اچھے اچھے کپڑے بنے ہیں ہم کیا پہنیں گے؟" ان کی والدہ نے کہا "کیا تمھارے پاس کپڑے نہیں ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "کپڑے تو ہیں لیکن سب پرانے ہیں۔ کوئی ایک جوڑا بھی صحیح سلامت نہیں ہے سب میں پیوند لگے ہیں۔"

والدہ نے فرمایا "تو کیا ہوا، تم وہی کپڑے پہن کر عید کی نماز پڑھ آنا۔"

لیکن بچے کہاں ماننے والے تھے۔

"نہیں امی جان! ہمارے لیے بھی کپڑے بنوا دیجیے نیا جوتا لا دیجیے، سب لوگ نئے کپڑے پہنیں گے اور ہم لوگ خلیفہ کے بیٹے ہو کر پھٹے پرانے کپڑوں میں عید کریں۔"

بے چاری ماں بچوں کو رات بھر سمجھاتی رہیں لیکن وہ نہ

مانے اور اپنی بات پر اڑے رہے۔ جب وہ کسی طرح نہ مانے تو فجر کی نماز پڑھ کر تمام بچوں کو ساتھ لے کر حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں گئیں۔ دیکھا تو خلیفہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے جانماز پر بیٹھے ہاتھ اٹھائے گڑگڑا کر دعا مانگ رہے ہیں۔ ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہے۔

حضرت فاطمہ نے جب ان کو اس حال میں دیکھا تو ان کا دل بھر آیا۔ اور آنکھوں میں آنسو لا کر ان سے کہا۔ مسلمانوں کے سردار! آج عید کا دن ہے۔ تمام مسلمان خوشیاں منا رہے ہیں۔ اور آپؒ ان کے سردار ہو کر رو رہے ہیں۔

خلیفہ نے جب ان کی آواز سنی تو سر اوپر اٹھایا اور حضرت فاطمہ سے فرمایا! فاطمہ! رمضان شریف کا مہینہ گذر گیا کتنا مبارک مہینہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے گناہوں سے توبہ کرنے نیکیاں کمانے اور اپنی اصلاح کرنے کا کتنا اچھا موقع دیا تھا۔ اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا ہم نے اس مبارک مہینے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ہم نے اتنی نیکیاں کمائیں جو قیامت کے دن ہمارے کام آسکیں یا پورا مہینہ گنوا دیا۔ یہ کہتے ہی آپؒ بے ہوش ہو گئے۔ حضرت فاطمہ نے جلدی سے پانی کے چھینٹے دیئے۔ تب جا کر آپؒ کو ہوش آیا۔ اور پوچھا "فاطمہ تم میرے پاس کیوں آئیں" انھوں نے کہا "بچے رات ہی سے ضد کر رہے ہیں کہ آج عید ہے ہمارے لیے نئے کپڑے بنوا دیجیے۔ میں نے ان کو بہت سمجھایا۔ لیکن وہ مانتے ہی نہیں۔"

حضرت عمرؒ بولے "فاطمہ تم ہی بتاؤ کہ میں ان کے لیے نئے کپڑے کیسے بنوا سکتا ہوں۔ میں بیت المال سے روزانہ صرف دو درہم لیتا ہوں۔ اب اس رقم سے اگر میں ان کے لیے کپڑے بنوا دوں تو دوسری ضرورتیں کیسے پوری ہوں گی۔ یہ سن کر حضرت فاطمہ نے فرمایا۔ "آپ خلیفہ ہیں۔ بیت المال کی ساری رقمیں آپ کے ہاتھوں میں ہیں اگر آپ چاہیں تو رقم بیت المال سے لے سکتے ہیں" خلیفہ نے فرمایا "بیت المال کوئی میرا اپنا خزانہ تو ہے نہیں۔ وہ تمام مسلمانوں کا ہے۔ میں تو صرف اس کا رکھوالا ہوں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ بچوں کے کپڑے بنوانے کے لیے تمام مسلمانوں کی امانت میں خیانت کروں۔ اور اس طرح بچوں کو خوش کر کے اللہ تعالیٰ کو ناراض کروں۔"

یہ سن کر حضرت فاطمہ کچھ دیر سر جھکائے کچھ سوچتی رہی اور پھر بولیں۔ "آپ اگلے مہینے کا وظیفہ پیشگی لے لیں۔ مہینہ لشتم پشتم کسی طرح کٹ ہی جائے گا اور ان کی ضد بھی پوری ہو جائے گی۔ خلیفہ نے کہا "فاطمہ تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں ابھی ایک مہینہ اور زندہ رہوں گا۔ موت کا کیا ٹھکانہ جب بھی آجائے ممکن ہے آج ہی مر جاؤں تو آخر میں اگلے مہینے کا وظیفہ کس برتے پر لوں۔ تم جاؤ بچوں کو سمجھا دو"

یہ سن کر حضرت فاطمہ واپس چلی گئیں اور بچوں سمیت پھٹے پرانے کپڑوں میں عید کی۔

شیخ سانڈو کا سودہ

کمال الدین صدیقی صاحب گنج

ماہنامہ "پیام تعلیم" کا ماہ نومبر ۶۹ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ شمارہ بہت اچھا لگا۔ مولانا اجتبا ندوی کا "مسجدِ اقصیٰ" عزیزہ مسرور کا "وصیل جو مچھلی نہیں" محترمہ آصفہ مجیب کا "انقرہ میں چند دن" غلام ربانی کا "زہرہ" اور جناب مشہود مفتی کا "پرندوں کی چند انوکھی عادتیں" نہایت ہی معلوماتی مضامین ہیں۔ کہانیوں میں جناب محمد امین کی "بہادر بومبا" م۔ ندیم کی "ہارون رشید کا انصاف" نادم عثمانی کی "حاسد راجا کا انجام" جیسی کہانیاں بہت پسند آئیں۔

آپ اس اردو کش دور میں۔ بچّوں کے لیے اتنا اچھا جریدہ نکال رہے ہیں۔ یہ آپ کی اولوالعزمی کا ہی ثبوت ہے۔

کہانی، نظم اور دیگر تخلیقات کے آخر میں یا شروع میں آپ اگر مصنفوں کے نام کے ساتھ ہی ان کے پتے بھی شائع کریں تو پیامی بھائی بہنوں کو ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے کی اچھی خاصی سہولت دستیاب ہو جائے گی۔

عبدالواحد میل وشارم

نومبر ۶۹ء کا پرچہ زیر نظر ہے۔ طباعت اور کتابت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ خط بھی کشادہ ہے۔ طبیعت بہت خوش ہوتی ہے۔ کمزور بصارت والا بھی آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آیندہ بھی اسی طرح کتابت اور طباعت ہوگی۔ مضامین اور کہانیاں دو قسطوں سے زیادہ طویل نہ ہوں تو بہتر ہے۔ مختصر افسانہ نویسی اُردو ادب میں زیادہ مقبول ہے۔ اسی طرح بچّوں کے ادب میں بھی مختصر افسانہ نویسی زیادہ پسند کی جائے گی۔ اکتوبر اور نومبر کے پرچے میں محترمہ آصفہ مجیب کا مقالہ "انقرہ میں چند دن" میری اس بات کی تائید کرنے کے لیے کافی ہے۔ محترمہ اگر چاہتیں تو اس سفرنامہ کو اور طول دے سکتی تھیں مگر ظاہر ہے کہ مختصر مختصر جملوں میں انھوں نے اپنی مسرتوں کا اظہار کرکے ہمیں بھی اپنے گھریلو ماحول میں دلچسپی لینے کا سبق دے دیا۔ "ابو نواس اور اس کی بیوی" تو مجھے بہت پسند آئی۔ آپ نے ترجمہ کرنے میں بڑا کمال کیا ہے۔ اب یہ کہانی غیر زبان کی نہیں اپنی ہی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

مہرور دلوی تھانہ

نومبر کے پرچے میں تمام مضامینِ نظم و نثر بہت معیاری، کارآمد اور لایق تعریف ہیں سرورق اور تصویریں بہت عمدہ ہیں مگر مجھے مسجد اقصیٰ کی تصویر دیکھ کر جی خوش ہو رہا ہے ----- چاند

کی مہم پر آپ کے ابتدائی اور موجودہ مضامین بہت
معلومات سے لبریز ہیں۔ چاند کی خبروں کی اشاعت
کا سہرا۔ پیام تعلیم کے سر رہا۔ جس نے روس کے
لونا ۹ سے امریکہ کے اپولو ۱۱ تک باقاعدہ بروقت
اور مفصل خبریں شایع کی ہیں۔

نسیم محمد جان آرہ

"پیام تعلیم" کے دو شمارے ملے۔ شکریہ۔
مجموعی طور پر پسند آیا۔

خالدہ خاتون ملک وستوی دربھنگہ

"پیام تعلیم" برابر موصول ہو رہا ہے۔
اس رسالے میں RECENTTOPICS پر
مضامین، دیکھ کر قدرتاً خوشی ہوئی۔ جیسے ذاکر
صاحب کے انتقال پر اتنے مضامین، چاند پر انسانی
قدم [illegible] پر، اور مسجد اقصیٰ کے اس حادثۂ عظیم
پر مضامین آپ نے شایع کیے۔ بہت بہت مبارکباد
پیش کرتا ہوں۔ آپ کو اور آپ کے ادارے کو
پیام تعلیم کو اور بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش
کریں۔

ایچ۔ اسلم گیا

اکتوبر کا رسالہ مل گیا۔ ٹائیٹل کا یہ نیا انداز
بڑا ہی دل کش ہے ...... لطیفوں کا سلسلہ دیکھ کر
بڑی ہی مسرت ہوئی۔ مضمونوں میں سب سے
زیادہ پر مذاق اور دل چسپ - میرے خیال میں
چاند پر سفر کی تیاری ہے اور سارے مضامین اور
نظمیں بھی، تعریف کے قابل ہیں۔ پیام تعلیم بچوں
میں صلاحیت پیدا کرنے والا پرچہ ہے ... اسی لیے
تو بچوں بچیوں کو بہت محبوب ہے۔

خلیق انجم اشرفی دہلی

اُردو ادب کی خدمت (خصوصاً بچوں کے)
جس ڈھنگ سے ہو رہی ہے۔ قابل ستائش ہے۔
مضامین معلومات سے پُر ہوتے ہیں۔ اور بچوں کو
نئی باتوں سے روشناس کرانا اس کا کام ہے۔ میں نے
اس کی شکایت آپ سے ایک بار اور بھی کی تھی کہ
بچوں کو الفاظ کے صرف محدود احاطے میں نہ رکھنا چاہیے
بلکہ ان کو اُردو ادب سے بھی روشناس کرنا فرض ہے
اور اس فرض کی ادائگی آپ نے صرف بڑے بچوں تک
محدود رکھی ہے۔ آگے بھی قدم بڑھانا ہے۔

مختار بارہ بنکوی ہیڈ ماسٹر میونسپل ہائی اسکول کانپور

نومبر کا پیام تعلیم نظر نواز ہوا۔ پسند آیا۔ لیکن
میری ناچیز رائے میں کتابت بہت جلی ہے۔ اگر کچھ
مضامین کی کتابت خفی (نسبتاً باریک) رہے تو زیادہ
مواد اتنے ہی صفحوں میں آسکتا ہے۔ میرے خیال میں
آپ اس پر غور فرمائیں۔

محمد انوار عالم شمسی - بہار شریف۔

ہم نے نومبر کے پیام تعلیم کو اچھی طرح سے
مطالعہ کیا۔ اور سرورق ہی کو دیکھ کر طبیعت پھڑک
اٹھی۔ آپ کی محنت کی داد دینے کو جی چاہتا ہے

ادھر اُدھر

اپالو نمبر ۱۲ خلاء کی طرف :-

کیپ کنیڈی - ۱۰ - نومبر - اپالو نمبر گیارہ کی کامیاب اُڑان کے بعد اب چودہ نومبر کو اپالو نمبر بارہ چاند کی طرف روانہ ہو جائے گا - اپالو نمبر ۱۲ کے کمانڈر چارلس کونریڈ جونیئر ہیں (عمر ۳۹ سال) یہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء میں امریکہ کی دو شخصی جیمنی خلائی مشینوں میں اُڑان کر چکے ہیں -

چارلس کونریڈ کے ساتھی - رچرڈ ایف گارڈن جونیر (۴۰ سال) نے اپالو نمبر ۱۲ کے کمان ماڈیول کے پائلٹ ہیں - یہ ۱۹۶۶ء میں ایک جیمنی مشق میں خلائی پرواز کر چکے ہیں - تیسرے صاحب ایلن امل بین ان کے لیے یہ پہلی خلائی پرواز ہوگی -

اپالو نمبر ۱۲ اپالو نمبر گیارہ کے مقابلے میں زیادہ دیر تک چاند پر ٹھہرے گا - (غالباً ۳۵ گھنٹے) اور تین بار چاند پر گھومے پھرے گا - اس مرتبہ وہ اپنے ساتھ ہندوستان کا جھنڈا بھی لے جائے گا - امریکی حکومت نے ہندوستانی حکومت سے یہ درخواست بھی کی ہے کہ اپالو نمبر بارہ کی اڑان کے وقت خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو مدد کا ہاتھ آگے بڑھائے -
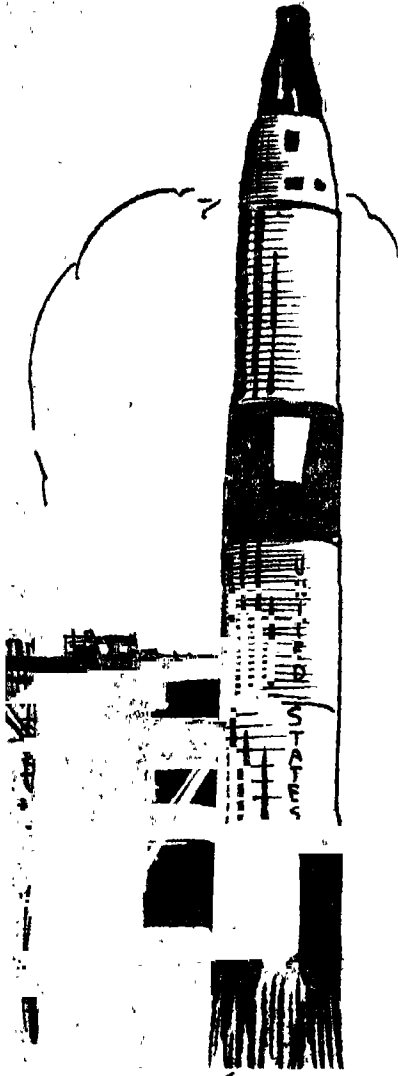
گوئٹے کا نام آپ نے سنا تو ہوگا - جرمنی کا مشہور فلسفی شاعر ہے - اس کی ایک مشہور تصنیف فاوسٹ کا دنیا کی تمام مشہور زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے - ابھی تھوڑے دن ہوئے لندن میں فاوسٹ کے مسودے کی ۲۶ سطروں کا ایک لاکھ چودہ ہزار روپے میں نیلام ہوا - یہ ۲۶ سطریں خود گوئٹے کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں اور کاغذ کے آدھے شیٹ میں آگئی ہیں

بچوں کی پسندیدہ تفریح گاہ:

ہمبورگ (جرمنی) کے ایک صاحب تھے یونیورسٹی میں قانون پڑھاتے تھے۔ مگر بڑھئی کے کام میں زیادہ لطف آتا تھا آخر پڑھائی چھوڑ کر آپ جنوبی وفاقی جمہوریۂ جرمنی کے بڑھئی کا کام سکھانے کے ایک مدرسے میں تربیت (ٹریننگ) حاصل کرنے میں ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنا ایک ورکشاپ بھی کھول لیا ہے۔ وہ چھوٹے بڑے کندوں کو چھیل کر کاٹ کر طرح طرح کے فرضی جانور، انجن، ڈبے، گڑیوں کے گھر، مینارے اور دوسری عجیب و غریب چیزیں تیار کرتے ہیں۔ جب انھوں نے پہلے پہل یہ کام شروع کیا تو اس کی حیثیت محض ایک مشغلے سے زیادہ نہ تھی مگر اس اثناء میں ہمبورگ اور جرمنی کے کئی دوسرے شہروں کے لوگوں نے ان کی بنائی ہوئی چیزیں بچوں کے پارکوں کی زیب و زینت کے لیے خریدنا شروع کر دی ہیں تب سے یہ پارک بچوں کی پسندیدہ تفریح گاہیں بن گئے ہیں۔ انھیں لکڑیوں کی ان چیزوں پر چڑھنے اترنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ کچھ عرصہ سے دوسرے ملکوں سے بھی ان کے پاس لکڑی کے ان بھاری بھرکم کھلونوں کی فرمائشیں آنے لگی ہیں۔

(تصویر ٹائٹل کے دوسرے صفحے پر دیکھیے)

دریائی گھوڑے بھی بکنے لگے

وفاقی جمہوریہ جرمنی کے اہم تجارتی مرکز فرانکفورٹ (مائن) کے چڑیا گھر کے لوٹی اور گریسل دنیا بھر میں دریائی گھوڑوں کی نسل بڑھانے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کے ہاں تیرھواں بچھڑا پیدا ہوا جس کا نام "فرٹز" ہے اس تصویر میں ماں بچھڑا دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ ان دونوں کا مجموعی وزن سوا سو من سے کم نہیں۔ زیادہ تر بچے جاپان، امریکہ اور ارجنٹائن کے چڑیا گھروں کی ملکیت ہیں۔ جرمنی میں چار سے زیادہ نہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دو کو ان کے آبائی وطن یعنی افریقہ بھی بھجوایا جاچکا ہے۔ کیونکہ انھیں منگوانے کا خرچ خود پکڑوانے سے کافی کم پڑتا ہے۔ یوں تو ان وزنی جانوروں کا شکار کچھ مشکل نہیں مگر افریقی باشندوں نے ان کا اتنا شکار کھیلا کہ اب ان کی نسل صرف دشوار گزار دریاؤں میں محدود ہو گئی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں چھان بین سے معلوم ہوا کہ ان کا گوشت انسانی خوراک کے لیے بہت موزوں ہے۔ ہر جانور میں ۱۵ اگھریلو بیلوں کے برابر گوشت نکلتا ہے چنانچہ بڑے پیمانے پر ان کی باقاعدہ پرورش سے افریقی باشندوں کی خوراک کا مسئلہ بھی کافی حد تک حل ہو سکتا ہے۔

(اطلاعات جرمنی)

DECEMBER 1969

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25